بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء — فون ۳۵۲۰۹

جلد ۲۹ — شمارہ ۱ — جنوری ۱۹۶۶ء

(ماہنامہ)

سب رس

(حیدرآباد دکن)

نگران:

پروفیسر عبدالمجید صدیقی

مجلسِ مشاورت:

۱۔ میر حسن

۲۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

۳۔ رمن راج سکسینہ

معتمد:

محمد اکبرالدین صدیقی

زرِ سالانہ ہند و پاک سے .... چھ روپے ۶

״ ״ ششماہی .... تین روپے ۳

״ ״ غیر ممالک سے .... دس روپے

״ ״ فی پرچہ .... پچاس پیسے ۵۰

مہتمم ادارہ ادبیاتِ اردو کے اہتمام سے نیشنل پرنٹنگ پریس میں چھپکر ایوانِ اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات

جنوری ۱۹۶۶ء سے "سب رس" کا انتیسواں سال شروع ہو رہا ہے، اور اس زمانے میں جبکہ اردو کی سرپرستی کرنے والے کم سے کم اور اس کی بقا کا شور کرنے والے بڑھتے جا رہے ہیں۔ یہ بات کم اہم نہیں کہ "سب رس" پابندی سے شایع ہوتا رہا۔ سب رس کا مقصد تفریح سے زیادہ علمی اور ادبی ہے، اور اس نے دکن کے ادب کو منظر عام پر لانے کا فرض انجام دیا ہے لیکن عام اردو ادب سے بھی اس نے تغافل نہیں برتا۔ اس امر کی بہت کچھ کوشش کی گئی کہ اس کے حجم میں اضافہ کر دیا جائے لیکن سرپرستوں کی طرف سے حوصلہ افزائی نہیں ہوئی۔ اور یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

اگست سے "منشی بچن سناؤں" کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا جو ابھی تک جاری ہے اور اس شمارہ میں نصرتی کی دو دکنی اور ایک فارسی غزل پیش کی جا رہی ہے۔ گذشتہ شمارہ میں سید علی خلیفہ حضرت جانم کی غزلیں پیش کی گئیں اور رن سنگار خساں کا کلام بھی پیش کرنے کا وعدہ تھا لیکن چند مجبوریوں کی وجہ سے پیش نہ ہو سکا، یہ آیندہ کسی وقت پیش ہوگا۔ اگلے شمارے میں وجہی کی غزلیں پیش کی جائیں گی۔

اس شمارے سے "چند دکنی مثنویاں" کے تحت ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی صاحب کا مستقل مضمون شایع کیا جا رہا ہے اس میں تسلسل قایم رکھنے کی کوشش کی جائے گی اور صفحات کے نشانات بھی رسالے سے علٰحدہ ہوں گے تاکہ بعد کو یہ کتابی شکل میں منتقل کر لئے جا سکیں۔

دسمبر میں حیدرآباد کی صحافت سے تعلق رکھنے والی بزرگ ہستیاں اٹھ گئیں مولانا محمد افضل شریف برسوں سے تبلیغ کا کام انجام دے رہے تھے ان کا دائرہ اثر زیادہ تر تعلیم یافتہ عیسائی طبقہ تھا کئی عیسائیوں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، اور ان کے لئے انھوں نے متعدد مضامین اور کتابیں لکھیں۔ "دیندار" کی اشاعت کا مقصد بھی یہی تھا، مگر ان کی صحافتی زندگی کا آغاز رسالہ "ارتقا" سے ہوا جو بالکل علمی اور ادبی پرچہ تھا۔ یہ ۱۹۲۳ء میں جاری ہوا تھا، اور ادارہ ادبیات اردو اور سب رس کے بانی ڈاکٹر زور مرحوم بھی اس کے معاونین میں تھے افضل شریف مرحوم نے زندگی کے ابتدائی دور سے آخر تک علم و ادب کی خدمت کی۔

دوسری ہستی حافظ محمد مظہر صاحب کی تھی۔ حافظ صاحب کے کئی ارکان خاندان نے حیدرآباد میں متعدد علمی، ادبی اور سماجی خدمات انجام دی ہیں۔ محمد مرتضیٰ مرحوم کے بعد حافظ محمد مظہر صاحب نے ان کے کام کو آگے بڑھایا۔ وہ عہد آصفی میں باب حکومت (جنرل ایڈمنسٹریشن) میں منتظم تھے اور وہیں سے وظیفہ حسن خدمت حاصل کیا، لیکن ضعیفی میں بھی علمی کام برابر انجام دیتے رہے ایک عرصہ تک روزنامہ صحیفہ کی ادارت کا فرض انجام دیا حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے معتمد رہے، آخر میں مجلس علمائے دکن کے رکن بھی۔ "روح ترقی" نامی ایک رسالہ ۱۹۲۶ء میں جاری کیا جس میں اکثر سیاسی اور معاشرتی مضامین ہوتے۔ حافظ صاحب نے ۲۰ دسمبر کو (۸۴) سال کی عمر میں وفات پائی۔ خدا ان ہستیوں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو توفیق صبر۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ

دکنی کی چند اہم غیر مطبوعہ لغات

زبانوں کے عروج و زوال کی داستان میں "لغات" کا بڑا اہم حصہ ہوتا ہے۔ لغات ہی کی بدولت زبان کی ترقی یا تنزل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ "زبان" جتنی زیادہ ترقی یافتہ ہوگی اس کی لغتیں اتنی ہی طویل و کثیر ہوں گی۔ آج انگریزی زبان کی ترقی کا اندازہ ویبسٹر کی اس ڈکشنری سے ہوگا جس کا ایڈیشن ہر سال بدلنا پڑتا ہے۔ چونکہ ہر سال انگریزی زبان میں ہزاروں نئے الفاظ اور محاورات داخل ہوتے جاتے ہیں اور ہر سال اس کی مستند لغت کا نیا ایڈیشن نکلتا ہے۔

قدیم دور ہی سے "لغتیں" اردو زبان کے ارتقا میں سنگ میل ثابت ہوئیں۔ آٹھویں نویں صدی ہجری ہی سے جب اردو زبان کی تصانیف منظرِ عام پر آنے لگیں اردو لغات کا بھی ڈول پڑنے لگا۔ اردو کے پہلے شاعر امیر خسروؔ کی لغت "خالق باری"[1] مشتبہ سہی، لیکن اسی زمانے کے لگ بھگ کی لغات "آداب الفضلا" ۸۲۲ھ (مصنفہ بدرالدین محمد دہلوی) اور "شرف نامہ" (مصنفہ قوام فاروقی، مرید شرف الدین یحییٰ منیریؒ) اس حقیقت کے غماز ہیں کہ اردو نظم و نثر کے ابتدائی آثار کے ساتھ اردو لغات کی تدوین کا کام بھی شروع ہو چکا تھا۔ اس کے بعد عبدالواسع ہانسوی نے "غرائب اللغات"[2] لکھی جس میں قدیم اردو الفاظ کے مترادفات فارسی میں لکھے تھے۔

چودھویں صدی عیسوی سے سترھویں صدی عیسوی تک "شمالی ہند" میں جو اردو کا گہوارہ اور مولد تھا اردو کا چراغ فارسی کے مقابل ماند پڑنے لگا، کیونکہ دہلی کے ملوک بادشاہوں کے بعد مغل حکمرانوں نے فارسی کے ساتھ برج بھاشا کی سرپرستی شروع کی۔ اس کے برخلاف دکن کی بہمنیہ، بعد میں عادل شاہی، قطب شاہی، نظام شاہی، عماد شاہی اور

---

[1] "خالق باری" کے بارے میں اب کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں رہی۔

[2] "غرائب اللغات" کی تصحیح سراج الدین علی خاں آرزو نے کی تھی، اور اسے "نوادر الالفاظ" کا نام دیا تھا۔ حال میں ڈاکٹر عبداللہ نے "غرائب اللغات" اور "نوادر الالفاظ" کو مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

بریدشاہی سلطنتوں نے اس نوخیز زبان کو پروان چڑھایا، اور اردوئے قدیم کا وہ دور شروع ہوا جو دکنی کے نام سے اب محققین اور ماہرین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔

اس دور کا جس کی شروعات خواجہ بندہ نوازؒ کے ہاتھوں ہوئیں، ابوالحسن تاناشاہ اور ولی کے زمانے میں خاتمہ ہوا۔ اس چار سو سال کے طویل عرصے میں نظم و نثر دونوں ہی نے ترقی کی۔

دکنی ادیبوں نے جہاں نظم میں جملہ اصناف غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی، بارہ ماسہ اور ریختی برتے وہیں نثر کی جملہ اصناف میں اپنی جدتِ طبع کی جولانیاں دکھائیں۔ اس دور کے ذخیرہ میں انشائیہ بھی ہے، قصّے بھی ہیں، تاریخ و سیر بھی ہے، سفرنامے اور حدیث و تفسیر کی کتب ہیں وہیں "لغات" بھی ہیں۔ ابھی تک دکنی کی لغتوں کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی تھی، اس لئے دکنی کی کوئی لغت منظرِ عام پر نہیں آسکی، لیکن کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ سالار جنگ، ادارۂ ادبیاتِ اردو، اور بعض خانگی کتب خانوں کی فہرستیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ دکن میں لغت نویسی کے فن نے بھی خاصی ترقی کی تھی۔ ان لغتوں کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ شمالی ہند کی معیاری یا جدید اردو کے برعکس بالکل دکنی خصوصیات کے پیشِ نظر لکھی گئیں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ جس طرح قدیم انگریزی اور جدید انگریزی کی سرحدیں الگ الگ ہیں، اسی طرح قدیم اردو (دکنی) اور جدید معیاری[1] اردو کے درمیان بھی حدِ فاصل قائم ہے۔ یہ دوراہہ کبھی تو سنگم[2] بنتا ہے، کبھی دو مخالف سمتوں[3] میں بٹ جاتا ہے اور بسا اوقات متوازی خطوط میں چلتا رہتا ہے۔

رازق باری

[4] اس طرح کی خالص دکنی لغتوں میں سب سے اہم لغت "رازق باری" ہے، جس کے مخطوطے کتب خانہ آصفیہ، ادارۂ ادبیاتِ اردو، اور کتب خانہ سالار جنگ، نیز انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ میں نے ان کو خالص "دکنی" اس لئے کہا کہ اس میں دکنی کی پوری صوتی اور لسانی خصوصیات کارفرما ہیں۔ مثلاً:

معیاری اردو	دکنی	معیاری اردو	دکنی	معیاری اردو	دکنی	معیاری اردو	دکنی
آنسو	انجھو	اندھا	اندھلا	دیدار	درس	سیر	اگھانا
نکالنا	کاڑنا	دیکھنا	دسنا	کہنا	کنا	نفع	نفا
دوم	دُسرا	ہوا	باو	قفل	کلف	نقصان	ٹوٹا
سوم	تسرا	یار	سجن	برتن	باسن		

---

۱ جیسے ولی اورنگ آبادی کے ہاں دونوں رجحانات ملتے ہیں۔ ۲ ملاحظہ کیجئے "خالص دکنی شعرا" جیسے سرور ڈنڈا، سلیمان خطیب، نذیر دہقانی، [illegible] کا کلام

۳ متوازی خطوط کی مثال فورٹ ولیم کالج کے ترجمے اور دکنی ترجمے ہیں۔ جبکہ بعض دکنی دیوانوں اور نقادوں وغیرہ نے صاف اعتراض کیا کہ شمالی ہند کی زبان دکھنیوں کے لئے قابلِ فہم نہیں تھی۔

۴ ملاحظہ ہو فہرست کتب خانہ آصفیہ۔ نشان ۳۴۰۲ جدید

اس کے صفحات کی جملہ تعداد (۲۳) ہے۔ ادارہ ادبیات اردو کے نسخہ میں مصنف کے نام کے اشعار محذوف ہیں۔ مذکورہ صاحب نے فہرست مخطوطات میں لکھا تھا کہ یہ لغت مطبع مظہر العجائب سے سنہ ۱۲۹۰ھ میں چھپی تھی۔ کتب خانہ سالارجنگ، آصفیہ اور انڈیا آفس کے نسخوں میں مصنف کے نام کے اشعار اس طرح آئے ہیں ؎

واؔلہ اتنے موتی رولا — فرس لغت کے معنی بولا[1]
جن نے پایا ذہنِ صافی — "رازق باری" اس کو کافی

واؔلہ نام کے تین بزرگ گذرے ہیں:۔

(۱) سید محمد واؔلہ موسوی خراسانی، مولد خراسان، باپ کے انتقال کے بعد ہندوستان آئے، چندروز وہاں رہ کر حیدرآباد پہنچے، یہیں شادی کی اور مدت دراز تک امیرانہ زندگی بسر کی، پھر ترچناپلی گئے وہیں ۱۱۸۰ھ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں۔

(۲) علی قلی خاں واؔلہ داغستانی، مولد اصفہان، سنہ ولادت ۱۱۲۴ھ۔ محمد شاہ کے زمانے میں دہلی آئے، اور وہیں ملازم ہوئے۔ سنہ ۱۱۷۰ھ میں دہلی میں انتقال کیا۔

(۳) واؔلا تخلص، نام سید ابوسعید، سنہ ۱۱۹۰ھ میں رحمت آباد مدراس میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶۶ھ میں انتقال کیا۔ ملتان پیٹھ کی مسجد کے صحن میں مدفون ہیں۔ باقر آگاہ کے شاگرد اور غلام غوث خاں اعظم کے استاد تھے۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے اسے سید محمد واؔلہ موسوی کی تصنیف بتایا ہے، جن کی ایک اور تصنیف "طالب و موہنی" کا مخطوطہ ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے اور زیور طباعت سے آراستہ ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون مصنفہ "ریاست میسور میں اردو"[2] ہاشمی صاحب کی اس تحقیق کو غلط بتاتی ہیں۔ ان کے خیال میں علی محمد واؔلہ اور علی قلی واؔلہ ولایتی ہیں، یعنی ان کے مولد خراسان اور اصفہان ہیں۔ لہٰذا ان کے خیال میں یہ نہیں ہوسکتے۔ انھوں نے صاف تو نہیں لکھا، لیکن گمان ظاہر کیا ہے کہ یہ "سید ابوسعید" واؔلہ کی تصنیف ہوسکتی ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ "ابوسعید" کا تخلص "واؔلا" ہے "واؔلہ" نہیں اور لغت میں "واؔلہ" لکھا ہے۔ لطف یہ کہ اسی کتاب میں موصوفہ کے شوہر جناب محمد خان اسے سید محمد واؔلہ کی تصنیف مانتے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

"میرے علم میں اردو کے دو لغت ہیں، ایک "خوانِ یغما" جس کو شاہ طاہر وفات ۱۷۰۳ء کرنول میں لکھا ہے۔
دوسری "رازق باری" جسے سید محمد واؔلہ موسوی نے سنہ ۱۱۷۰ھ میں ارکاٹ میں لکھا۔"

قیاس بھی یہی چاہتا ہے کہ یہ سید محمد واؔلہ کی تصنیف ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے:۔

ابتداء:۔ رازق باری حق ہے جان — نمونہ — اوسکا دوست نبی پہچان

---

[1] انڈیا آفس کے کتب خانے میں، نیز سالارجنگ میں "کھولا" ہے۔ [2] ملاحظہ ہو "ریاست میسور میں اردو" صفحہ ۹۰۔

آل اولاد در یار اصحابؒ — قرآن حق نے بھیجا کتاب
راے فروست دونوں عقل — افسانہ کہا ہے کہانی نقل
حب ہے مہر دانش ہے گیان — خیال تصور دونوں بیان
یار سجن ہمسر ہے پیار — حُسن خوبی درس دیدار
جنگ وو رزم ضرب ملڑائی — خلاخن کیا ہے گوپھن بھائی
وسط ـ گلنا کیا ہے بوسیدن جان — تولنا ہے سنجیدن مان
تافتن کیا ہے مل دینا — دوسرے معنی جھکنا کتا
اشک سرشک ہے دونوں انجو — افسوں کیا ہے منتر جادو
تراوش کیا ہے باسن رسنا — عکس آرسی جو ہے دسنا
لٹ ہے گیسوا ور ہے زلف — کلید ہے کنجی تفل ہے کلف

قادر باری[1] :ـ مصنف فیاض عسکری متوطن مدراس۔ تاریخ تصنیف سنہ ۱۲۱۰ھ۔ یہ لغت بھی دکنی ہی کی ہے۔ نمونہ یہ ہے :ـ

بعد شوال آئے ذی قعدہ — اوسکی پیچھے سیج ماہ ذی الحجہ
اپنے بیٹوں پر کیا ہوں بس — تھے برس یک ہزار دو سو دس سنہ ۱۲۱۰ھ

غرایب ہدا[2] :ـ اس کا حال جناب محمد خاں لکچرار اردو کے مضمون[3] سے معلوم ہوتا ہے۔ موصوف نے مصنف کے بھی تفصیلی حالات لکھے ہیں۔ اس کا مصنف ایک نو مسلم "خان جہاں" تھا۔ خان جہاں پیدائشی برہمن تھا۔ ٹیپو کے زمانے سنہ ۱۷۸۳ء میں مسلمان ہوا۔ بعد میں وزیر پورنیا کی وساطت سے دوبارہ برہمن بننے اور برہمنوں میں اپنا پہلا مقام پانے کی کوشش کی، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ محمد خاں صاحب نے اس پر بڑا تفصیلی مضمون لکھا ہے۔ موصوف ہی کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ خالص دکنی کی لغت ہے کیونکہ اس میں ایسے خالص دکنی الفاظ ملتے ہیں جن کا چلن شمالی ہند کی معیاری اردو میں نہیں پایا جاتا، یہاں تک کہ دکنی ادب میں کنڑی اور تلگو الفاظ کا جو ذخیرہ شامل ہو گیا تھا اس کے نمونے بھی اس لغت میں ملتے ہیں، جیسے :ـ

دکنی	معیاری	دکنی	معیاری	دکنی	معیاری	دکنی	معیاری
اکروٹ	اخروٹ	انبلی	املی	اگیٹھی	انگیٹھی	اولجاولے	جڑواں، توام

---

[1] قادر باری، مخطوطہ آصفیہ، نمبر ۳۹۹۴ جدید مصنفہ فیاض عسکری۔

[2] ملاحظہ ہو "ریاست میسور میں اردو" صفحات ۵۵ تا ۱۰۲۔

[3] اس کے حالات "تاریخ خداداد میسور" میں بھی ملتے ہیں۔

دکنی	معیاری	دکنی	معیاری	دکنی	معیاری	دکنی	معیاری
تاوق	بالائے بیچ زبان	دھوپ کالہ	تابستان	ٹھنڈ کالہ	سردی کا موسم	تیریا	شناور بید
ٹھیوا	نگیں (وہ مقام جس میں جوہر جڑا ہوتا ہے)	چاکو	کارد، چاقو	لڑکی	تز دگر غلہ کان کالو	کونبی	دہقان
		ڈڈی	تلچھٹ				

خالص کنڑی الفاظ، جیسے :—

کنڑی	اردو	کنڑی	اردو	کنڑی	اردو	کنڑی	اردو
انی مدھڈا	میٹھی لکڑی	اوی چادلہ	جڑوان	ایتم	سنجیتق	انٹوال کائی	ریٹھہ
بیٹی	بیکار	ہوسکارا	(ہانٹوکا	ہوموتر	سلسل بول	تکڑی	نصف ربع۔
ہنگادرتا	پارسا عورت		ایک زیور)	کیپل	قریہ۔ دیہات		گنئیا

ان لغات کے علاوہ جناب محمد خاں صاحب نے اور تین لغات کی تفصیل دی ہے جو مندرجہ ذیل ہیں :—

(۱) خواہی بنما — شاہ طاہر ۱۷۰۳ء۔

(۲) دلیل ساطع — محمد مہدی، تخلص آصف، متوطن مدراس ۱۸۰۲ء۔

(۳) فرہنگ چپا سخن — گذارش خاں شاعر، متوطن مدراس ۱۸۱۲ء۔

آج کل دکن میں دو اور اصحاب دکنی کی مستند لغت تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ ایک تو صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ جناب ڈاکٹر مسعود حسین خاں، آندھرا پردیش اکاڈیمی کی خواہش پر موصوف اپنے ساتھی ڈاکٹر غلام عمر خاں کی مدد سے دکنی کی یہ لغت تیار کر رہے ہیں۔ دوسرے ولایت احمد صاحب ناصری جو دکھنی ہونے کے ناتے بہت سے دکنی الفاظ سے واقف ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ڈاکٹر صاحب تحریری اور ادبی دکنی کی لغت لکھنے میں مصروف ہیں اور ولایت احمد ناصری صاحب بول چال کی دکنی مدون کر رہے ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ سر اکبر حیدری کے زمانے میں جناب اشعار احمد صاحب ولد مختار احمد نے ایک دکنی لغت مرتب کیا تھا موصوف کا انتقال ہو جانے کی وجہ سے یہ لغت طبع نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر مسیح الزماں
(الہ آباد)

ہاشم علی برہان پوری

ہاشم علی برہان پوری کے مرثیوں کا نسخہ ابھی تک صرف اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانے میں ملتا ہے اس کتب خانے کی فہرستِ مسودات میں ہاشم علی کے بارے میں جو اندراج ہے اُسے جیلانی کامران نے اردو میں ترجمہ کر کے اس طرح درج کیا ہے[1]:-

"ہاشم علی کا زمانہ ولی اور حاتم سے پہلے کا زمانہ ہے۔ یہ مرثیہ نگار عہدِ جہانگیر میں مشہور تھا۔ برہان پور میں مقیم تھا اور سنہ ۱۰۶۵ھ میں بقیدِ حیات تھا۔ شیخ احمد فاروقی کے حلقۂ ارادت سے تعلق رکھتا تھا جن کا سنِ انتقال سنہ ۱۰۳۴ھ مطابق سنہ ۱۶۲۵ء ہے اور جن کا مقبرہ سرہند میں ہے۔ ہاشم علی کے بارے میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۰۳۰ھ مطابق سنہ ۱۶۲۱ء میں دربار نزدیک مرثیہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے بہت مقبول تھا۔"

اسی بنیاد پر انھوں نے ہاشم علی کو سترھویں صدی عیسوی کے نصف اول کا شاعر قرار دیا ہے[2]۔

مرتب فہرستِ مخطوطات کو کسی وجہ سے ہاشم علی کے زمانے کے متعلق بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہاشم علی کے مجموعۂ مراثی دیوانِ حسینی کے مرثیہ نمبر (۲۰) کے آغاز میں یہ عبارت درج ہے:-

"از جملۂ تفضلات امام شہیدؑ کہ برایں عاصی شدہ آنست کہ برادرِ ایمانی حافظ فضل الدین در عالمِ رویا بہ تاریخ بیستم ماہ مبارک رمضان یک ہزار و یک صد و چہل و ہشت مشاہدہ نمود....."

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۶ء میں ہاشم علی زندہ تھے۔ ایک اور مرثیے کے آخر میں یہ بند ملتا ہے:-

جب منجم نے کیا اس دردنامے کا حساب — تب وفات و سن آیا تب رقم اندر کتاب
شوق کہ تو تاریخ کوں سینے میں دل ہوتا کباب — ختم کر ہاشم علی قاسم کی شادی کر بہ بین

اس سے اس مرثیہ کی تاریخِ تصنیف ۱۱۶۰ھ م ۱۷۴۷ء ظاہر ہوتی ہے۔ ان دو اندرونی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ہاشم علی ۱۷۳۶ء سے ۱۷۴۷ء تک ضرور مرثیے کہتے رہے۔ فہرستِ مخطوطات کے مرتب نے معلوم نہیں کس بنا پر انھیں تقریباً ایک سو سال پہلے کا

---

[1] "استاد ہاشم علی" نشست تاب۔ ۱۹۶۱ء

[2] جیلانی کامران، مجموعہ شعری روایت کا جائزہ اور مرثیہ نگار ہاشم علی۔ نقوش لاہور۔

شاعر قرار دیا ہے۔ قطعی طور پر اس کا ثبوت بھی کہیں نہیں ملتا ہے کہ وہ برہان پور ہی میں ساری زندگی رہے یا کہیں اور بھی گئے۔ کہیں کہیں پر ان کے مرثیوں میں ایسے مصرعے ضرور موجود ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دکن میں نہیں ہیں، لیکن ان کے مرثیے دکن پہونچتے ہیں اور داد حاصل کرتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار حسب ذیل ہیں ؎

ہاشم علی عجب نہیں یو مرثیے کوں سن کر — تجھ پر خلیفہ قادر تحسین کرے دکن میں

......

ہاشم علی لے آئے محباں نے یو خبر — دکن سے ہو کے تیرے سخن کربلا چلے

......

ہاشم علی لکھتا تو یہ کر دُ دلھن کی یا ماں — اس غم سے ہے جگر خوں اور چشم اشک ریزاں

گجرات میں پڑھے جب یہ مرثیے تو یا ماں — سن کر چلے ہیں رو نے کفنی دکن کوں اپنے

اس اقتباس کے پہلے شعر سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہاشم علی اور قادر ایک دوسرے کے ہم عصر ہیں۔ قادر کا زمانہ خود ان کے ایک شعر میں نظم ہوا ہے ؎

سن گیارہ سو پر انچاس سال — سنہ با تا قادر اکا لکھو میں لالی[1]

گیارہ سو انچاس ہجری عیسوی سال کے مطابق ۱۷۳۷ء ہوتا ہے۔

ہاشم علی کے مرثیوں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت دکن کے باہر بھی عزاداری کا رواج عام ہو چکا تھا اور گجرات کے شہروں میں بھی مراسم عزا بجا لائے جاتے تھے۔ ان مرثیوں میں بعض کے عنوانات ہی سے ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک مرثیہ ”مرثیۂ شہیدا“ کے عنوان سے ہے جس میں کچھ دور کے بعد یہ عبارت لکھی ہے:-

”ازیں جا دہ استادہ شدہ بروئے تلاوت بخوانند“۔

اسی طرح زیارت اور چالیسویں کے مرثیوں کی ابتدا میں حسب ذیل عبارت ہے:-

”در بیان روز سیوم کہ در اصطلاح ریختہ پھول و روز زیارت گویند و ایں مرثیہ مخصوص آں روز است۔“

”مرثیۂ چہلم کہ بہ اصطلاح اہل ہند چالیسواں گویند و مناسب است کہ در آں روز یا شب خواندہ شود۔“

اس کے علاوہ ان کے مرثیوں میں بھی جا بجا ایسے اشعار ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعض خاص موقعوں پر پڑھنے کے لئے مخصوص تھے ؎

لے چلے شہ کا کنوارا یا رسولؐ — یہ تمہارا تھا پیارا یا رسولؐ

یہ جنازے ساتھ جاتے سب کہ — یا حسینؑ کا کرتے نعرہ یا رسولؐ

......

شہ کا لے کے چلو علم یاراں — سر میں کر کے قدم چلو یاراں

......

آج تابوت شہ لیجاتے ہیں — سارے طفلاں یتیم جلتے ہیں

......

[1] نصیر الدین ہاشمی ”یورپ میں دکنی مخطوطات“ ص ۲۳۶۔

پکھوسند کا آج یاراں لے چلے تابوت کوں　　　　فاطمہؑ کا گھر ہے ویراں لے چلے تابوت کوں
آج ہے چہلم عزیزاں غم کرو ......　　　　شاہِ دیںؑ کا آخری ماتم کرو
دل سوں آہِ سرد کوں ہر دم بھرو　　　　اربعین اس مقتدا کا آج ہے

علم یا تابوت کے ساتھ جلوس کی شکل میں ان مرثیوں کو پڑھتے ہوئے چلنے کا بیان عزاداری کے طریقوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ آخری اقتباس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہاشم علی کے زمانے میں محرم سے لے کر صفر کی بیس تاریخ تک عزاداری کا رواج ہو چکا تھا۔

ہاشم علی نے اپنی تمام عمر مرثیہ گوئی میں صرف کی اور اپنے مرثیوں کو ردیف وار ایک مجموعے میں جمع کرکے اس کا نام "دیوانِ حسینی" رکھا جس کا قلمی نسخہ ادنبرا یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے (نسخہ نمبر ۳۰۹)۔ ہمارے اس بیان کا دارومدار اسی نسخے کی مائکروفلم پر ہے جو پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کی ملکیت ہے۔

"دیوانِ حسینی" میں دو سو انتیس[۲۲۹] مرثیے ہیں۔ ڈاکٹر زور کا خیال ہے کہ "دیوانِ حسینی" کا ادنبرا کا نسخہ ہاشم علی کے تمام مرثیوں کا مجموعہ نہیں ہے[1]۔ لیکن "دیوانِ حسینی" کے علاوہ ہاشم علی کے مرثیوں کا کہیں اور پتہ اب تک نہیں لگ سکا۔ اس دیوان میں مرثیوں کی ترتیب ردیف وار ہے، لیکن اگر انھیں موضوعات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان میں شہدائے کربلا کے مرثیوں کے علاوہ حضرت رسولِ خدا، جناب فاطمہؑ، حضرت علیؑ، امام حسنؑ وغیرہ کے بھی مرثیے ہیں۔ چند عنوانات حسب ذیل ہیں :-

(۱) بے پدر ماندن حضرت زین العابدینؑ بعد شہادتِ پدر و گرفتار آمدن با اہلبیت کرام۔
(۲) برگشتن ذوالجناح از معرکہ بعد شہادت آں شہسوارِ کربلا۔
(۳) بیان تشریف آوردن حضرت سیدۃ النساء در دشتِ کربلا بعد از شہادت حضرت امام حسینؑ۔
(۴) در بیان بُردن اہلِ بیت محترم بعد از شہادت امام حسینؑ بسوئے شام۔
(۵) در بیان شکوہ نمودن زینبؑ خاتون بہ حضرت امیرالمومنین۔
(۶) بیان بُردن شامیان بے ایمان سرِ مبارک امام حسینؑ بجانب شہرِ شام نزد یزید نافرجام۔

جس طرح مرزا نے حضرت حُرؑ، حضرت قاسمؑ اور حضرت علی اصغرؑ کے حال میں الگ الگ مرثیے لکھے ہیں اسی طرح ہاشم علی کے بھی بہت سے مرثیے ایسے ہیں جو واقعاتِ کربلا میں سے یا تو کسی ایک کے حال میں ہیں یا کسی ایک واقعے کے سلسلے سے ذکر کرتے ہیں۔ اس طرح کے مرثیے پسرانِ مسلمؑ، جناب سکینہؑ، حالِ اسیری حضرت عابدؑ، جناب زینبؑ کی حضرت علیؑ سے فریاد وغیرہ ہیں۔ جناب قاسمؑ اور حضرت علی اصغرؑ کی شہادتوں کا موضوع ہاشم علی کے نزدیک مرثیے کا خاص موضوع ہے، اس لئے ان پر انھوں نے متعدد مرثیے لکھے ہیں۔ خاص طور پر جناب قاسمؑ سے متعلق طرح طرح سے زورِ طبع دکھایا ہے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل مطلعے لکھے جاتے ہیں :-

مطلع :-　　(۱) افسوس ہے ہزار کہ نوشہ گزر گیا　　　　روتی دلہن کوں چھوڑ کے گونگھٹ میں کدھر گیا

---

[1] ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم، اردو شہ پارے۔ جلد اول صفحہ ۱۶۶۔

(۲) قاسمؑ کہے دکھاؤ شتابی لگن مرا　　مجھ ہاتھ میں لے آؤ بندھاؤ کنگن مرا
(۳) بھوتی ہر شفق میں شہ کے ماتم کا ہلال　　غم کی رت لایا ہے کھلتے گل تہا فنکا ہتا
(۴) اے بجوی شاہزادہ کا دکھاتے ہیں لگن　　کھول تیر اتو شتابی سوں بتا ہم کو کنگن
(۵) چھنک اٹھی دلھن یکایک ملی انکھیاں نیند سوں　　دیکھ کر سینے میں دلھا کتی گریاں نیند سوں
مفردہ:— (۶) ہوئے گا کربلا میں شہ کا لگن صباح　　قاسمؑ کے ہاتھ میاں تے بندھاویں کنگن صباح
(۷) آج قاسمؑ کوں ہے لگن کا فراق　　ہائے دل میں رہا دلھن کا فراق
(۸) ہائے قاسمؑ چلا ہے ابن حسنؑ　　روتے جلوے میں چھوڑا اپنی دلھن
(۹) اے نور چشم مصطفیٰ قاسمؑ بچھانے کیوں نہیں　　روتی کہے نوشہ کی ماں نوبت دمعراتے کیوں نہیں
(۱۰) دیکھو محباں ہلال ماتم ہوا نمایاں گگن میں تمتیں　　دلوں میں ندیاں لوہو کی بہنیں جلیں آیل کر یوں میں تم میں
(۱۱) کہو یاراں حسن نہیں کہ قاسمؑ کوں بچھانے ہیں　　اکیلی چھوڑ دلھن کوں دہ نوشہ آج جاتے ہیں
(۱۲) گرے جب شہید ہو کے قاسم حسنؑ　　گھونگھٹ میں، تو اس کوں روئی دلھن

ہاشم علی کے مرثیوں میں رزم کے بیانات نہیں کے برابر ہیں۔ ان کے طویل مرثیوں میں رخصت کے مناظر تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں جن سے سننے والوں پر درد و غم طاری ہو۔ جناب علی اصغرؑ کا ذکر جن مرثیوں میں کیا گیا ہے وہ بھی درد انگیز ہیں۔ چند مرثیے تو ایسے ہیں جو پورے کے پورے ہی فریاد و نالہ پر مشتمل ہیں اور ان کے عنوانات ہی ان کی نوعیت کی وضاحت کرتے ہیں۔ مثلاً ایک مرثیے کا عنوان ہے:—

"در بیان شکوہ نمودن زینب خاتونؑ بہ حضرت امیر المومنینؑ"

ایک اور مرثیہ ہے جس میں جناب شہربانو کی فریاد و فغاں لکھی گئی ہے۔ مرثیہ مربع ہے اور اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

شہربانو یوں پکاریں ہائے داور کیا کروں　　بے کسی میں کاں محمدؐ کاں ہیں حیدرؑ کیا کروں
فاطمہؑ خیر النساء ہیں آج حاضر کیا کروں　　تشنہ لب مارا پڑا ہے رن میں سرورؑ کیا کروں

ایک دوسرا مربع مرثیہ جس میں آخری مصرع ترجیع کی صورت میں ہر بند میں آتا ہے، یہ ہے ؎

آج پر خوں کفن ترا اصغر　　آج سوکھا دہن ترا اصغر
لال ہے گل بدن ترا اصغر　　حیف یو بالپن ترا اصغر
. . . . . .
آج کیوں ان منا ہے میرا لال　　لعو بھرے ہیں ترے یہ دونوں گال
آج سویا ہے کیوں تو گردن ڈال　　حیف یو بالپن ترا اصغر

. . . . .

کس کا اب پالنا جھلاؤں گی　　لوری دے کے کسے سلاؤں گی
کس کو چھاتی ستی لگاؤں گی　　حیف یو بالپن ترا اصغر

اندازِ بیان کی ندرت، تشبیہوں اور استعاروں کی سجاوٹ سے ہاشم علی نے اپنے مرثیوں کو خوبصورت بنایا ہے۔ ان میں ادبی محاسن پیدا کئے ہیں اور رمزو اشارے سے شعریت پیدا کی ہے۔ لیکن ایسے موقعوں پر بھی وہ مرثیے کا بنیادی پہلو نہیں بھولتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مضامین دردناک کا ہونا مرثیے کا لازمی جز ہے، اس لئے وہ مرزا کے رزمیہ مناظر اور آمد و رجز کی شان و شوکت پیشِ نظر ہونے کے باوجود بھی اس کی طرف راغب نہیں ہوتے اور اپنے مرثیوں کو اظہارِ رنج و غم کے دائرے سے باہر نہیں جانے دیتے۔ ایک مرثیے کے یہ چند بند دیکھئے ؎

پھر بسنتی ہو شفق میں شہ کے ماتم کا ہلال　　غم کی رت لایا ہے کھلنے گل شہادت کے نہال
سب شہیداں لہو میں بھیگے کربلا میں آج لال　　رن میں قاسم پھاگ کھیلیں کا کیا ہے گا خیال
. . . . . .
کیوں پڑی ہے دھوم دیکھو کربلا کے بن منے　　کیوں رہی ہے جوم ہر اک کوں اجل اس رن منے
آہ و زاری بوم پڑتے شور ہے لوگن منے　　بن بنا جاتا ہے دولھا خون دل اپنا اچھال
. . . . . .
تھی جبیں اُس دن کے ماتھے رخ اوپر گرد و غبار　　دیکھئے دولھا لہو میں لت پت وہ حسنؑ کا یادگار
ہے رنگیلا لال سارا اپنے لہو میں گل انار　　ہائے دیکھو اس بنے کے گال اپر لگنا گلال
. . . . . .
وہ نویلی آج دولھن کھول گھونگھٹ سر بسر　　اپنے شہ کے لہو میں ہو کے لال پوچھے تب خبر
کاں گرے ہیں ہائے لے سر ہم کھڑے ہیں منتظر　　جو جو کر زخمی پڑے ہیں رن منے ہو کر نڈھال

اس مرثیے میں ہولی کے تلازمے نے ایک کیفیت پیدا کر دی ہے۔ شادی کا سُرخ جوڑا، میدانِ قتال میں خون میں نہا کر شہید ہونا اور ہولی کھیلنے والوں کا رنگ سے تربتر ہونا ایک دوسرے سے ایسے مماثل ہیں کہ ایک سے دوسرے کی طرف خیال جا سکتا ہے۔ ان دونوں میں جو شادی و غم کا تضاد ہے وہ جذبات کو ابھارنے اور غم والم کو بڑھانے کا اچھا ذریعہ بنا ہے۔ ہاشم علی نے اس تلازمے سے کام لے کر اردو کے رثائی ادب کو وسعت بخشی ہے۔

ہاشم علی کے بعض مرثیوں میں مکالموں کی اچھی مثالیں ہیں۔ ایک مربع مرثیے میں انھوں نے نئی نویلی دلھن جنابِ فاطمہ کبریٰ اور حضرتِ قاسم کا اس وقت کا منظر پیش کیا ہے جب وہ میدانِ جنگ کے لئے رخصت ہو رہے ہیں۔ نئی بیاہی عورت کی شرم و حیا اور تھوڑے عرصے کی قربت کے بعد زندگی بھر کی جدائی کا سامنا ایسی جذباتی کشمکش کا منظر ہے جسے ہاشم علی نے بڑے فنکارانہ انداز سے پیش کیا ہے ؎

جلوے سے اٹھ کے رن کو چلا تب کہی دلھن　　دامن پکڑ کے لاج سوں انجھواں بھرے نین
مت چھوڑ کر سدھار و تم اس حال میں ہمن　　تم بن رہے گا ہائے یہ سونا بھون مرا
. . . . . .

جانے ہو چھوڑ رن کی طرف مجھ کو تم رُلا   شیو شرم کا ہنوز یہ سرسوں گھونگھٹ کُھلا
کرتے نہیں محبت و جانے میا بُھلا   اس زندگی سوں آج بھلا ہے مرن مرا
قاسم کھڑا نغار و تے نیو سُن و دلھن کی بات   نمناک اپنا دیکھ کے دامن دلھن کے ہات
تب آہ دردناک سوں بولا دلھن کے سات   اے بوستانِ راحت و سرو چمن مرا
مجھ کوں نہیں ہے تیری جدائی پہ اختیار   تیرے فراق سات تھے جاتا ہوں اشکبار
میں کیا کروں صلاح نہیں حکم کردگار   حق نے کیا ہے دل میں مقرر رہن مرا
دے کر نشانی رو تے لگایا اسے گلے   دو لوں کے دل نگھل کے لہو ہو کے بہہ چلے
رخصت ہوا ہے رن کوں چلا پھر کے نیو ملے   دولھن کہی کہ ہائے گیا من موہن مرا

"دیوانِ حسینی" میں زیادہ تر مرثیے غزل کی شکل میں ہیں۔ سلاموں کی تعداد بھی کافی ہے۔ یہ مرثیے زیادہ لمبے بھی نہیں اور ان میں تسلسل بھی نہیں پایا جاتا۔ اسی لئے بیشتر مرثیوں میں کسی خاص واقعے یا کسی شہید کا بیان نہیں۔ جو مرثیے کسی خاص موضوع سے متعلق ہیں۔ مثلاً چاندرات، یا چہلم، یا شب شہادت، ان میں موضوع کی یکسانیت تو موجود ہے لیکن کسی خاص واقعے کا مسلسل بیان نہیں ملتا۔ بہرحال مجموعی حیثیت سے ہاشم علی اپنے خصوصیات اور مقدارِ کلام کی وجہ سے مرثیہ گوئی کی تاریخ میں اہم درجہ رکھتے ہیں۔

سید احتشام احمد ندوی

آزاد کی تشبیہوں اور استعاروں کی فنی عظمت

مولانا محمد حسین آزاد کی تحریریں اردو ادب کی پیشانی کا نور ہیں۔ ان کی انشا پردازی اور حسنِ زبان کا اعتراف تمام ناخدایانِ ادب کرتے ہیں، مگر افسوس ہے کہ اس عظیم شخصیت پر اب تک کوئی معیاری کام نہیں کیا گیا۔ یوں تو آزاد کی عظمت کے بہت سے گوشے اور پہلو ہیں۔ وہ ایک ادیب، ناقد، تذکرہ نگار، ڈرامہ نگار اور جدید شاعری کے مؤسس کی حیثیت سے معروف ہیں، مگر میں یہاں ان کے حسنِ بیان کے ایک گوشے یعنی ان تشبیہوں اور استعاروں کی عظمت کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا، جو ہمیں ان کی نثر میں ملتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آزاد کے اسلوب کی بنیادی اہمیت ان کی تشبیہوں اور استعاروں کی وجہ سے ہے اور ان رنگین تشبیہوں سے وہ اپنے پورے پورے اسلوبِ کلام کو زعفران زار بنا دیتے ہیں۔ اپنے اس فنی کمال کے باعث وہ واقعات کی مجسم تصویر پیش کر دیتے ہیں اور پڑھنے والا ایسا محسوس کرنے لگتا ہے کہ جیسے وہ انھیں خود دیکھ رہا ہے۔ اسی بنیاد پر حامد حسن قادری ان کے اسلوب کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ:—

"چھوٹے چھوٹے فقرے، تشبیہ و استعارہ کی لطافت و برجستگی، بیان کی سلاست و روانی، الفاظ کی شیرینی اور موسیقیت سب مل کر سادگی و پرکاری کا عجب و نادر نمونہ پیش کرتے ہیں، اور یہ اسلوب آزاد کی ہر تحریر میں موجود ہے، اسی کو سہل ممتنع کہتے ہیں کہ بظاہر بہت آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن لکھ کر دیکھیے تو صفحہ دو صفحے لکھنے مشکل ہیں۔"[۱]

حامد حسن قادری، آزاد کے اسلوب کو تخیلی قرار دیتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ آزاد کی تشبیہوں اور استعاروں میں جو بلند پروازی اور ذہانت و طباعی نظر آتی ہے اس کو انھوں نے تخیلی طرز قرار دیا ہے۔ اس کی تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ ان کے اسلوب میں ان کی خیالی تشبیہیں اور استعارے ایک تصویر کشی پیدا کر دیتے ہیں، مگر وہ کوئی خیال بنا کر اس کی تشبیہ نہیں پیش کرتے، بلکہ جو حقائق موجود ہیں ان کو اپنی قوتِ تخیل و فکر سے ایک ایسی تشبیہ کا زیور پہناتے ہیں جو

---

[۱] "داستانِ تاریخ اردو" مصنفہ حامد حسن قادری۔ طبع دوم۔ آگرہ ص ۳۹۸۔

ان حقائق کو مصور کردیتا ہے۔ یہ طرزِ ادا مستحسن ہے۔ چنانچہ اچھا فنکار وہی ہے جو اتنی صلاحیت رکھتا ہو کہ کسی شئے پر لکھتے وقت اسے اس طرز سے پیش کرے کہ پڑھنے والے کی نگاہوں میں اس کا نقشہ آجائے۔ آزاد کی اس عظمت کو مولانا شبلی نے بڑی اچھی طرح پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"آزاد کی کتاب آئی، جانتا ہوں کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں، تاہم ادھر ادھر گپیں بھی ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔"

علامہ شبلی نے یہ تبصرہ ان کی کتاب "سخندانِ فارس" پر کیا تھا۔

تعجب ہے کہ قادری صاحب نے "سادگی" کا وصف آزاد کے اسلوب میں بیان کیا، حالانکہ ان کے یہاں سادگی کہاں پرکاری ہی پرکاری ہے۔ چنانچہ وہ خود ہی اپنی اس بات کو رد کر جاتے ہیں اور ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:۔

"اگرچہ آزاد کی زبان کو صنائع و بدائع کی دستکاری نے قلم لگایا ہے، پھر بھی منہ سے پھول جھڑتے ہیں"۔[1]

حسنِ تشبیہ کے بارے میں علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ:۔

"ہر تشبیہ ابتدا میں نادر اور پرلطف ہوتی ہے، لیکن بار بار کے استعمال سے اس کی تازگی اور ندرت جاتی رہتی اور بے اثر ہوجاتی ہے۔ اسی لئے شاعر کا فرض یہ ہے کہ نادر اور جدید تشبیہیں اور استعارے ڈھونڈ کر پیدا کرے۔ بڑے بڑے شعراء کا معیارِ کمال یہی ہے کہ ان کے کلام میں اچھوتی تشبیہیں اور استعارے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً بوسہ کو ایشیائی شعراء شیریں، شکریں، انگلوسوز کہتے آئے ہیں، لیکن یورپ کا جادو طراز کہتا ہے:۔

"وہ ایک بیانِ وفا ہے جو مجسم بن جاتا ہے۔ ایک رازِ پنہاں ہے، جو سامعہ کے بجائے ذائقہ سے کہا جاتا ہے۔ ایک نسیم ہے، جو دل کی خوشبو لاتی ہے۔ لذت آلود نگاہیں ہیں، جو سمٹ کر نقطہ بن گئی ہیں"۔[2]

بے شک ہم آزاد کی تشبیہوں کو دنیا کے کسی بھی عظیم شاعر و ادیب کی تشبیہوں کے مقابلہ میں پیش کرسکتے ہیں۔ ان کی تشبیہوں اور استعاروں کی جدت اور ندرت لائقِ صد آفریں ہے، ان کی قوتِ تخیل بہت جاندار اور قوتِ پرواز غیر معمولی بلند ہے، ان کی تشبیہیں اور استعارے اتنی جدت و ندرت کے حامل ہیں کہ جن کے سامنے بڑے بڑے شاعر نہیں ٹھہر سکتے۔

---

[1] "داستانِ تاریخِ اردو" مصنفہ حامد حسن قادری، طبع دوم۔ آگرہ ص ۳۹۸۔
[2] "انتخابِ شبلی" مرتبہ علامہ سید سلیمان ندوی۔ اعظم گڈھ سنہ ۱۹۵۰ء ص ۶۳۔

ارسطو نے کہا تھا کہ "بہترین تشبیہ وہ ہے جو دو ایسی چیزوں میں پیش کی جائے جو باہم زیادہ سے زیادہ مناسبت رکھتی ہوں"۔ اس کے برعکس عرب ناقدوں کا خیال ہے کہ "بہترین تشبیہ وہ ہے جو دو ایسی چیزوں میں پیش کی جائے جو باہم بالکل ہی بعید اور غیر متعلق ہوں"۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا ادیب دونوں قسم کی تشبیہیں پیش کرتا ہے اور اس کی تشبیہوں کا حسین و دلفریب چمن ہر قسم کے پھولوں سے مزین نظر آتا ہے۔

آزاد کی ہر تحریر میں اصل حسن ان ہی نادر تشبیہوں اور استعاروں کا ہے جو در اصل ایک جیتی جاگتی تصویر پیش کر دیتی ہیں۔ اس موضوع یا حقیقت کو جس پر آزاد قلم اٹھاتے ہیں، ان کا قلم ابر گہربار ہے جس سے حسن تخیل کی بارش ہوتی ہے اور دیکھتے دیکھتے تشبیہوں اور استعاروں کا ایک حسن زار نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔

"آب حیات" میں تمہید اور اختتام ابواب کے حصے تو تشبیہوں کا ایک خزانہ ہیں۔ اس کے علاوہ نیرنگ خیال بھی اس کیفیت کا حامل ہے۔ ذیل میں بطور مثال کے چند تشبیہیں اور استعارے پیش کئے جاتے ہیں:—

(۱) "انشاء اللہ خاں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں دریائے لطافت لکھ کر ایجاد کی شاخ میں ظرافت کے پھول کھلائے۔

(۲) زبان اردو کی عام فہمی دیکھ کر مذہب نے بھی اپنی برکت کا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔"

اردو زبان کے بارے میں انگریزوں کی توجہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:—

(۳) "ادھر دانائے فرنگ جو کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعے پر دوربین لگائے بیٹھا تھا، اس نے دیکھا نظر باز تاڑ گیا کہ لڑکا ہونہار ہے، مگر تربیت چاہتا ہے۔

(۴) اردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں اگا مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا۔

(۵) حضرت عشق نے شاعری کی اور محبت نے نکاح پڑھا۔

(۶) امید کی آواز آئی، قریب پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ امید نہ تھی، دغا آواز بدل کر بولی تھی۔ وہاں تو موت منہ کھولے بیٹھی تھی۔"

خانخاناں کے بچپن کے مصائب کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:—

(۷) "الٰہی تیری قدرت! عجب وقت ہوگا، شام غریباں اس کو کہتے ہیں۔ رات، قیامت کی رات گذری ہوگی اور دن ہوا تو روز محشر۔

(۸) شیخ سعدیؒ کی زبان پر جوش طبیعت نے ایک چشمہ کھول دیا، اس میں فصاحت نے شربت اور سلاست نے دودھ بہایا۔"

سوداؔ کے بارے میں فرماتے ہیں:—

(۹) ان کے قصیدوں کی کڑک دمک نے ہند کی زمین کو آسمان کر دیا۔"

اپنے استاذ ذوق کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

(۱۰) "جب وہ صاحبِ کمال عالمِ ارواح سے کشورِ اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغِ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا، جن کی خوشبو شہرتِ عام بن کر جہاں میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو تراوت بخشی، وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آبِ حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔

(۱۱) مضامین کے ستارے آسمان سے اتارے ہیں، مگر اپنے لفظوں کو ایسی شان و شکوہ کی کرسیوں پر بٹھایا ہے کہ پہلے سے بھی اونچے نظر آتے ہیں۔

(۱۲) جو لفظ ان سے ترکیب پا کر نکلے ہیں خود بخود زبانوں پر ڈھلک آتے ہیں جیسے ریشم پر موتی۔

شاہ حاتم کے "منتخب کلام دیوان زادہ" کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

(۱۳) "وہ صاحبزادہ بھی پانچ ہزار سے زیادہ کا مال بغل میں دبائے بیٹھا ہے۔

فارسی ترکیبیں :۔

(۱۴) "مصری کی ڈلیوں کی طرح دودھ کے ساتھ منہ میں آتی تھیں، انھیں گھلایا۔" یعنی میر و سودا وغیرہ نے۔

جنوبی ہند کی زبانوں کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

(۱۵) ان کی شاعری اور انشاپردازی کہتی ہے کہ یہ گٹھلی کسی لذیذ میوہ کی ہے اور سنسکرت سے اسے لگاؤ نہیں۔"

ان میں سے ہر تشبیہ اور استعارہ انوکھا اور ندرت کا حامل ہے جس کو پڑھتے ہی آدمی کے ذہن و فکر میں حسن کی کیفیت اور بیان کا لطف عجیب عالم پیدا کر دیتا ہے۔ یہ تشبیہیں حقائق کو مصور کر کے نگاہوں کے سامنے کر دیتی ہیں، اسی فنی عظمت میں اردو ادب میں آزاد کا کوئی ہمسر نہیں۔

ابو رفاعہ سعید انصاری (جبل پور)

دیوانِ نیاز

اردو شعر و ادب کی تدریج و ترقی میں صوفیائے کرام نے جو حصہ لیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ زیرِ نظر دیوان ایک صوفی شاعر شاہ نیاز کی تصنیف ہے۔

حضرت شاہ نیاز احمد صاحب نیازؔ حسنی قادری سرہندی الاصل اور بریلوی المدفن حضرت شاہ رحمت اللہ صاحب سرہندی کے صاحبزادے ہیں۔ سرہند میں تقریباً سنہ ۱۱۴۰ ہجری میں پیدا ہوئے اور دہلی میں نشو و نما پائی۔ حضرت مولانا فخر الدین دہلوی، چشتی، نظامی کے زمانے میں دہلی میں علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل کی۔ ۱۷ سال کی عمر میں فارغ ہوئے اور ۱۹ سال کی عمر میں حضرت مولانا موصوف کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مرشد کے حکم سے بانس بریلی آکر مقیم ہو گئے۔ پھر رامپور میں حضرت شاہ عبد اللہ بغدادی قادری (جو حضرت غوث الاعظمؓ کی اولاد میں سے ہیں) کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بقیہ مدت ریاضت میں متوکلانہ زندگی بسر کی اور بانس بریلی میں ۶ جمادی الثانی سنہ ۱۲۵۰ ہجری کو ۷۷ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

ان کی وفات کی تاریخ ایک ایرانی شاعر نے کہی ہے۔ قطعہ تاریخ وفات درج ذیل ہے ؎

شہ نیاز احمد امامِ اہلِ راز — کاشفِ رمزِ حقیقت از مجاز
در شریعت بود ماہِ برجِ دیں — بر سرِ اورنگِ طریقت شاہباز
ناگہاں اندر ندائے ارجعی — گوش فرمود از جنابِ کارساز
روحِ پاکِ او بعلیین نشست — در مقامِ قربِ حق در فرشِ ناز
از جمادی دو و بیست و ششمیں — کو سوئے خلدِ بریں آمد فراز
سالِ وصلش ہاتفی گفتا زِ دل — قلبِ ایزد خاص احمد شہ نیاز

۱۲۵۰ ہجری

بانس بریلی میں ہر سال شاہ صاحب موصوف کا عرس ہوتا ہے۔ آپ کے مریدین میں کابل، شیراز اور بدخشان تک کے لوگ شامل ہیں۔

شاہ نیاز، اردو و فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ حضرت موصوف کا کلام سنہ ۱۸۹۲ء میں مطبع نامی لکھنؤ سے

شایع ہوا تھا۔ اس وقت راقم کے پیش نظر شاہ نیاز کا ایک مطبوعہ دیوان ہے جو مطبع نول کشور کانپور سے ستمبر سنہ ۱۹۰۴ء میں آٹھویں بار شایع ہوا ہے، اس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی زمانے کے رجحان پر ایک غائر نظر پڑتی ہے۔

زیر نظر دیوان دو حصوں میں منقسم ہے:-

پہلا حصہ فارسی غزلیات۔ مثنویات اور مستزاد پر مشتمل ہے۔ اس میں غزلوں کی تعداد ۹۴ ہے۔ غزلوں کے بعد تین مثنویاں ہیں۔ پہلی مثنوی حمد ومناجات اور دعا میں ہے۔ دوسری مثنوی میں دنیا اور انسان کی تخلیق اور آدم کو خلیفۃ الارض بنائے کا ذکر ہے۔ تیسری مثنوی وحدت الوجود پر ہے۔ اس کے بعد ایک مستزاد ہے۔ صفحہ ۳۰ پر شاہ نیاز کی ایک غزل پر منشی اصغر علی صاحب کی تضمین ہے۔ غزل کا مطلع یہ ہے ؎

مست گشتم از دو چشم ساقیِ پیمانہ نوش　　　الفراق اے ننگ و ناموس الوداع اے عقل وہوش

دیوان کے صفحہ ۳۸ پر فارسی میں شاعر کا مختصر حال ہے، جس کے آخر میں شاہ صاحبؒ کی تاریخ وفات کا وہ قطعہ درج ہے جو اوپر نقل کیا جاچکا ہے۔ سب سے آخر میں شاہ نیاز کی ایک مناجات ہے۔

شاہ نیاز کا کلام معرفت کے رنگ میں ہے اس لئے تصوف کی اصطلاحات نہایت بے تکلفی سے استعمال کی گئی ہیں۔ فارسی اشعار کے درمیان عربی اشعار وفقروں کے پیوند ان کی عربی میں اعلیٰ دستگاہ کا ثبوت ہیں۔

دیوان کا دوسرا حصہ صفحہ ۴۲ سے شروع ہوتا ہے اور شاہ نیاز کے اردو کلام پر مشتمل ہے، اس میں ۶۳ غزلیں ہیں۔ غزلیات کے اختتام پر صوفیانہ رنگ میں ہولی پر ہندی ابیات ہیں، ان ابیات کی تعداد ۲۸ ہے۔

کلام کے غائر مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ نیاز کو زبان وبیان پر زبردست قدرت حاصل تھی۔ فارسی کلام کی طرح اردو کلام بھی معرفت کے رنگ میں ہے۔ اس بلند پایہ کلام کی سب سے بڑی خصوصیت زبان کی سادگی اور روانی ہے۔ غزلوں میں لکھنوی رنگ کے عاشقانہ اشعار بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ذیل میں نیاز کے کلام کی چند خصوصیات مثالوں کے ساتھ پیش کی جارہی ہیں:-

زلفوں کو عموماً شاعر سانپ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ان کی زہرناکی مشہور ہے۔ میر نے کہا ہے ؎

ان سے بچتے رہو تو بہتر ہے　　　میر کا ٹا جئے نہ کالوں کا

نیاز کہتے ہیں کہ اگر سو بار بھی افعی نے ڈس لیا ہو، اور آدمی بچ گیا ہو تو وہ بھی معشوق کی زلف سے نہیں بچ سکتا ؎

مارا تمھاری زلف کا ہرگز نہ بچ سکے　　　سو بار بچ رہے جو یہ افعی ڈسا ہوا

چہرۂ معشوق کو مہر سے اور زلفوں کو بادل سے تشبیہ دینے کا انداز ملاحظہ کیجئے ؎

تمھارے مکھڑے کو پیچھے زلفوں کے دیکھ کر کیا مثال کیجے　　　برائے گفتن مگر یہ کہئے کہ مہر زیر سحاب دیکھا

عاشق کی آنکھوں کی سرخی کی توجیہہ یوں کرتے ہیں کہ معشوق عاشق سے کہتا ہے کہ میرے ہاتھ کی مہندی کا رنگ چھوٹ کر تیری آنکھوں میں پہنچ گیا ہے ؎

دیکھ میرا مونہہ اشک اس نے کہا شب مجھ کو دیکھ
تیری آنکھوں میں گئی میری حنا سب چھوٹ چھوٹ

رعایتِ لفظی اور تشبیہہ کا لطف ذیل کے اشعار میں ملاحظہ کیجئے ؎

گرتے گرتے تخت گاہِ چشم سے
رل گئے مٹی میں یہ خاقانِ اشک

ہیں جواہر خانہ یا آنکھیں نیاز
جس سے نکلے ہیں دُرِ غلطانِ اشک

شاہ نیاز کے کلام میں تصوف و معرفت کا رنگ نمایاں ہے اور عاشقانہ اشعار بھی عشقِ حقیقی سے متعلق ہیں۔

عشقِ حقیقی میں من و تو کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ نہ کوئی اپنا رہتا ہے نہ بیگانہ ؎

عشق میں آ، عجب مزہ دیکھا
خویش و بیگانہ آشنا دیکھا

عشق کی آمد ہوش و خرد اور صبر و شکیب کو رخصت کر دیتی ہے ؎

جوں ہی آمد آمدِ عشق کا مجھے دل نے مژدہ سُنا دیا
خرد و حواس و شکیب نے وہیں کوس کوچ بجا دیا

دل میں یار کا جلوہ پنہاں ہے۔ اس کو دل ہی میں دیکھنا چاہئے۔ بہ قول کسے ؎

دل کے آئینہ میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

اس مضمون کو نیاز اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

اے دل کہیں نہ جائیو زنہار دیکھنا
اپنے ہی بیچ یار کا دیدار دیکھنا

عشق کا تیر لگنے سے آدمی موت و حیات کو بھول جاتا ہے ؎

کس پیار کی نگاہ کا دل میں لگا خدنگ
مرگ و حیات اپنی ہوئیں دونوں ایک رنگ

عاشقِ حقیقی کے چہرے پر نقاب ہے۔ وہ اگر بے نقاب ہو کر باہر آ جائے تو ہوشیار خود فراموش ہو جائیں۔ جلوۂ حقیقی کو دیکھ کر ہر فرد اپنے جادہ سے ہٹ جاتا ہے۔ صنم پرست برہمن بھی بُت فراموش کر جاتا ہے اور کبکِ دری اپنی چال بھول جاتا ہے ؎

پردے کو ٹک اک مُنہ سے اگر یار اُٹھا دے
ہو جائیں زِ خود مردمِ ہشیار فراموش

یہ چہرۂ زیبا جو برہمن کبھی دیکھے
ہو جائے اسے بُت کی پرستار فراموش

گر کبکِ دری چال تری بانکی یہ دیکھے
رہ جائے اوچک اور کرے رفتار فراموش

......

اللہ کا عاشق اس کی دید کا طالب ہے، اور زاہد حور و قصور کا ۔ حافظؔ نے کہا ہے ؎

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ یار　　فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

نیازؔ کہتے ہیں ؎

بھاتا نہیں ہے واعظ جز دیدِ حق سجھے کچھ　　تجھ کو رہے مبارک حور و قصور تیرا

وہ ذاتِ بے نشان مختلف نشانیوں میں آکر بے نشان ہوگئی ہے ۔ ان نیرنگیوں سے طالبِ دیدار کو حیران نہیں ہونا چاہئے ؎

نیرنگیوں سے یار کی حیراں نہ ہوجیو　　ہر رنگ میں اسی کو نمودار دیکھنا

دیر و حرم میں خدا کا جلوہ ہے، اور عاشقِ صادق اس امتیاز سے بالاتر ہوتا ہے عرفیؔ کہتا ہے ؎

؏ پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

یہ سب ادیان و مِلل ہیں شاخہائے یک درخت　　ایک جڑ سے ہیں یہ نکلیں ڈالیاں سب پھوٹ پھوٹ

جدھر الحرم ہے صنم بھی وہی ہے　　حرم دیر میں ایکساں دیکھتا ہوں

وحدت کا راز کثرت میں مخفی ہے ؎

وحدت کے ہیں یہ جلوے نقش و نگارِ کثرت　　گر سرِّ معرفت کو پاوے شعور تیرا

دنیا ایک طلسم بود و عدم ہے، اور یہ طلسم آخر تک نہیں کھلتا ۔ میر دردؔ کہتے ہیں ؎

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا　　خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

نیازؔ کہتے ہیں ؎

نہیں ہے دھوکا کچھ اس میں اے دل کہ ہے یہ دھوکا طلسم عالم
جو کچھ سنا تھا سو ہے فسانہ جو کچھ کہ دیکھا سو خواب دیکھا

نیازؔ کا دیوان چونکہ بارہا چھپا ہے اور اس کے نسخے تقریباً تمام کتب خانوں کی زینت ہیں اس لئے زیادہ کلام کی پیش کشی طوالت کا موجب ہوگی ۔

محمد اکبر الدین صدیقی

میٹھے سجن سناؤں

نصرتی

نصرتی، ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ – ۱۰۳۷ھ) کے عہد میں پیدا ہوا، اور محمد عادل شاہ کے عہد میں اس نے شعر گوئی شروع کی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اس پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس میں اس کی مثنویوں:— (۱) گلشن عشق (۲) علی نامہ اور (۳) تاریخ اسکندری کے ساتھ ساتھ اس کے قصاید اور غزلیات کا ذکر کیا ہے لیکن اس کی غزلوں کا مجموعہ دستیاب نہ ہو سکا، البتہ چرخیات کے تین نسخے میرے علم میں ہیں جنھیں ڈاکٹر ابو النصر محمد خالدی صاحب مرتب کر رہے ہیں۔

محمد عادل شاہ (۱۰۳۷–۱۰۶۷) کا دربار دکنی سے زیادہ فارسی گو شعرا کا ملجا و ماویٰ تھا۔ مرزا محمد مقیم سلمی شیرازی، محمد رضا مشہدی، حکیم محمد ابن آتشی اور دوسرے ایسے کئی شعرا تھے جن کے کلام کے مجموعے یہاں کے کتب خانوں آصفیہ اور سالار جنگ میں محفوظ ہیں۔ ان کے سامنے نصرتی کا چراغ نہ جل سکا لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس نے ابتداً فارسی میں شعر کہے، اور چونکہ صاحب ذوق تھا، اس لئے اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں بھی لکھیں، چنانچہ اس کی ایک فارسی غزل دستیاب ہوئی ہے! اسی زمین میں مرزا صائب نے غزل لکھی تھی، ممکن ہے کہ یہ غزل صائب نے ہندوستان آنے کے بعد نظیری کی اس غزل کو پیش نظر رکھ کر لکھی ہو جس کا مطلع ہے ؎

قاصد دل آزردہ تراز آبلہ دارد　　　می آید از ان کوی مند تیش گلہ دارد

نظیری ۱۰۲۱ ہجری میں احمد آباد میں انتقال کر چکا تھا۔ صائب ۱۰۳۵ کے قریب ہندوستان آکر پہلے کابل کے صوبہ دار ظفر خاں احسن کے پاس ملازم، پھر مصاحب ہوا، بعد میں دونوں گہرے دوست بن گئے اور شاہجہاں کی طلبی پر وہ کابل سے ظفر خاں احسن کے ساتھ دہلی اور پھر بادشاہ کی معیت میں ۱۰۳۹ میں برہان پور پہنچا اور شہنشاہ ۱۰۴۱ میں دکن سے واپس ہوئے تو ظفر خاں کو کشمیر کی صوبہ داری پر بھیجا، صائب نے جو ظفر خاں کے ہمراہ تھا اپنے محسن سے اجازت حاصل کی اور ۱۰۴۲ میں وطن واپس ہوا۔ اصفہان جاکر ۱۰۸۱ھ میں انتقال کیا۔

صائب نے نظیری کی زمین پر ایک غزل لکھی ہے جس کا مطلع ہے ؎

از گرم روان خار مغیلاں گلہ دارد　　　ایں خواست کشتہ خطر از آبلہ دارد

یہ خیال اس لئے بھی پیدا ہوتا ہے کہ صائب نے نظیری کی شاعری کا ان الفاظ اعتراف کیا ہے ۔ کہتا ہے ؎

صائب چہ خیال است شوی ہمچو نظیری　　　　عرفی بنظیری نرساند سخن ما

بعد کو مرزا نے اپنی رائے بدل دی اور کہا کہ ؎

بلبل خوش نوائے نیشاپور　　　　مجمل از طبع بے نظیر مست

یہ تعلّی سے زیادہ حقیقت ہے ۔

صائب کی نثر گماں گلہ دارد ۔ مغیلاں گلہ دارد ۔ کی زمین میں بعد کو مرزا عبدالقادر بیدل نے بھی غزل لکھی لیکن گمان غالب یہ ہے کہ بیدل کی یہ غزل نصرتی تک نہ پہنچ سکی ، یا ممکن ہے کہ کہی نہ گئی ہو ، اس لئے کہ ۱۰۸۵ھ میں وہ شہید کر دیا گیا تھا ، اور مرزا بیدل نے ۱۱۳۳ھ میں دہلی میں انتقال کیا ، اس طرح صائب کی غزل پر ہی اس نے غزل کہی ہوگی ۔

فارسی شاعری میں نزاکت خیال اور طرز اظہار و ابلاغ میں صائب اور بیدل منفرد ہیں ۔ چنانچہ علامہ شبلی کے الفاظ ہیں کہ " ایران میں شاعری رودکی سے شروع ہوئی اور (بہ استثنائے قاآنی) مرزا صائب پر ختم ہوگئی " ــــ اور غالب نے بیدل کے بارے میں لکھا کہ ؎

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا　　　　اسداللہ خاں قیامت ہے

نصرتی بھی صائب کی اہمیت کو سمجھتا ہے اور اسی لئے اس کی غزل پر غزل کہتا ہے ۔

ہم یہاں صائب اور بیدل کی غزلوں کے ساتھ نصرتی کی غزل پیش کرتے ہیں کہ اس کی فارسی شعرگوئی کا بھی اندازہ ہو سکے ۔ اس کے بعد اس کی دو دکنی غزلیں بھی پیش ہیں جنھیں ابھی تک منظرِ عام پر آنے کا موقع نہیں ملا ۔

غزل میرزا صائب اصفہانی

از گریۂ اشکم صفتِ مژگاں گلہ دارد　　　　زیں آبلہ پا خارِ مغیلاں گلہ دارد

بعد یتیمیست صدفِ دامنِ مادر　　　　یوسف عبث از تنگیٔ زنداں گلہ دارد

متراش سرِ سبز بود خندۂ بے وقت　　　　از رخنۂ لبِ بستۂ خنداں گلہ دارد

از اخترِ بدبیں فلک شکوۂ ناداں　　　　مانند بغریبی کہ ز یاراں گلہ دارد

چوں دانۂ بے مغز بود دلوح کلامش　　　　ہر شورہ زمینی کہ تہ دہقاں گلہ دارد

چوں دستِ عروساں بنگارست حنائ　　　　پائے کہ ز بیدادِ مغیلاں گلہ دارد

[illegible] دشنام تو ہیہات　　　　حرفست کہ مور از شکرستاں گلہ دارد

در عالمِ حیرت بود آرام اگر ہست　　　　صائب عبث از دیدۂ حیراں گلہ دارد

غزل میرزا بیدل

از پنبه اگر آتش سوزان گله دارد　　دیوانهٔ ہم از خار بیابان گله دارد
اظهارِ عرق تجلت دیباچۂ شرم است　　مکتوبِ من از شوخیٔ عنوان گله دارد
اے بے خبر از کم خردان شکوه چه لازم　　آدم نبود آنکه ز حیوان گله دارد
رہبار بجود نیز ترحم نه نمائی　　امروز دریں انجمن احسان گله دارد
در نسخۂ کیفیتِ ایں باغ وفا نیست　　مضمونِ گل از بستنِ پیمان گله دارد
مجبورِ فنا را چه خموشی چه تکلم　　چنداں که نفس می زند انسان گله دارد
بیدل ہوسِ داغِ محبت نه فروزی
ایں شب که تو داری ز چراغان گله دارد

غزل نصرتی

از پنجۂ من چاکِ گریباں گله دارد　　وز گریۂ من گوشهٔ داماں گله دارد
داماں نگہ تنگ گلِ حسنِ تو بسیار　　گل چینِ بہارِ تو ز داماں گله دارد
گہ بت شکنم گاہ به مسجد زنم آتش　　از مذہبِ من گبر و مسلماں گله دارد
ز بسکه به زندانِ غمت دیر بماندیم　　زنجیر به تنگ آمد و زنداں گله دارد
گہ گریم و گہ خندم و گہ آه جگر سوز
اے نصرتی از وضع تو جاناں گله دارد

دکھنی غزلیں

(۱)

مزور بے خبر ہے مدہوش[1] مدن[2] کی بالی　　عالم کے جیو کتے سولہ[3] چمن میں رہی لالی
اس خام سن میں دیکھیا کیا پختگی کا فن ہے　　دیتے سو وصل کا وصل لینے کوں جیوا نالی[4]

---

۱ فریب ۲ کام دیو یا عشق، مراد محبوبہ ۳ آنکھ ۴ بے چین، بے کل۔

برہ[۱] کی نس[۲] بیرغم سوں جلتا ہوں شمع تمنے[۳] دکھلا صبح و درس[۴] کا اے تھا در جمالی
مج من کیا[۵] تمو تر ہے تج ہوا میں حیراں .... پلکاں کی مار تالی[۶]
کردے سجن[۷] ہنسی میں یوں کہہ چھپا لجاوے کرتے ہیں تمک[۸] مٹھا جوں دارو[۹] پیالا کسالی[۱۰]
رندی کے فن رہا کے[۱۱] بانا میں کیوں چھپنے گی جسے سو عکس دل کا دستا ہے چک میں خالی
.... پاس رونا جانیا تشہ رندمعاں تے مجہ غم کیرا شنیدی چپ سن ہستی میں ٹالی
سو فن ترے نہ ہوسے[۱۳] مجہ یک ہنر برابر جیو کھیلنا کرا ہے[۱۴] اے بوالہوس خیالی
تج ہات نقد جاں دے لیتا ہوں غم کا کینا یک کر[۱۵] اوپر مگے تو کرتی ہے کیا بحالی

سرمست نصرتی سوں جلسے[۱۶] نہ کچ حریفی
خوباں کی بزم کا ہے وہ رند لاابالی

(۲)

دمن کا لبد ہور گلا دیکھت[۱۷] ساقی مدام مے کی صراحی پھار[۱۸] ہت تے سٹتا ہے جام
عشق کے میدان میں من کا تر[۱۹] نگ سٹیا[۲۰] کیا کرے بدکار ہوا صبر کا ہت بن لغام[۲۱]
جب تے مرے جیو کوں تجہ زلف کی کھینچنی[۲۲] لگی تب تے تراخد دخال ورد ہوا صبح و شام
کی توں مروت کچ آج باٹتی[۲۳] نئیں یک رتی ...... بر آئی ہے ہمت کے اگر خرچہ دام
بوالہوساں کے عبث دل کوں نہیں بخشنگی ... ہنائی کی شعار پل میں دسنگے[۲۴] او خام
سات گگن لگ بند دو دل کے دو سینوں سیڑیاں .... کے چڑنے منے جائے زحل سٹ مقام
پاک نظر باز کا عیب توں ظاہر نہ کر مارینگے عاشق تجے عشق کنے[۲۵] میں غرام

عشق کیرے[۲۶] صدق سوں لاف نہ کر نصرتی
عین یو سرمست کا آپس کوں آئے سلام

---

۱ جدائی ۲ رات ۳ طرح ۴ دیدار ۵ کا ۶ اس کے بعد دو شعر کرم خوردگی کی وجہ سے پڑھے نہ جاسکے ۷ دمدمہ ۸ منہ میٹھا کرتے ہیں ۹ دوا ۱۰ کسیلی ۱۱ ؟ ۱۲ آنکھ ۱۳ نہ ہوں گے ۱۴ سخت ۱۵ ہاتھ ۱۶ جلنے کا ۱۷ دیکھ کر ۱۸ ہاتھ سے پیالہ پھینک دیتا ہے ۱۹ گھوڑا ۲۰ بے ہوش ہوگیا ۲۱ لگام ۲۲ درد ۲۳ وظیفہ ۲۴ تقسیم نہیں کرتی ۲۵ نظر آئیں گے ۲۶ گوشہ ۲۷ کا

جاوید لطیفی

ایک تاثر —

ذرا میسور تک

یہ لفظ اس لئے لکھ دیا ہے کہ میرا یہ سفر حیدرآباد تا میسور واقعی اتنا مختصر تھا کہ سمجھئے یوں گئے اور یوں لوٹے — پہلی بار جنوبی ہند میں بنگلور اور میسور کا سفر کیا تھا، اس سفر میں جا مجھے بہت کچھ دیکھنا تھا، اور دیکھنا چاہیئے تھا لیکن ریل اور اسٹیشنوں ہی پر آدھی میعاد سفر بیت گئی۔

حیدرآباد کے میٹر گیج اسٹیشن کاچی گوڑہ سے چل کر جب بنگلور کے اسٹیشن پہنچا تو شام ہو چکی تھی — میٹر گیج گاڑیوں کے ڈبے چھوٹے ہی ہوتے ہیں اور ان میں تھری ٹائر سلیپنگ کوچ کے برتھوں کی لمبائی چوڑائی عام قد کے انسانوں کے لئے قطعی ناکافی ثابت ہوتی ہے۔ نکلتے قد والوں کے لئے سونا حرام ہو جاتا ہے، پاؤں پھیلاؤ تو (اگر سائڈ میں برتھ ملی ہے) ٹانگیں دوسرے کے منہ پر جا پڑتی ہیں، اور اگر برتھ نیچے اوپر ملی ہے تو ٹانگیں یا تو کھڑکی کے باہر تک چلی جاتی ہیں یا ڈبے کے اندر آنے جانے والوں سے ٹکراتی رہتی ہیں اور اگر ٹانگیں سکیڑ کے سوتے ہیں تو اکڑ جاتی ہیں، برتھ پر سے نیچے اترو تو اکڑی ہوئی ٹانگوں کو راہ راست پر لانے کے لئے یا تو ورزش کرنا پڑتی ہے، یا ویسے ہی چلو تو وجع مفاصل کے مریض معلوم ہوتے ہیں۔ دوسری برتھ یعنے تھری ٹائر میں جو تختہ زنجیروں کی مدد سے لٹکاتے ہیں اُس کے بیچ اور اس کے نیچے اوپر، بامسجز منٹو مرحوم کے ایک لفظ کے مطابق "دُھڑن تختہ" بن جاتا ہے۔ ادھر کبھی بے سر اٹھایا کہ اوپر والے تختے یا چھت سے جا ٹکرایا، نہ ہاتھ بلند کر سکتے ہیں اور نہ ہی پاؤں، تختوں میں سے پھسل کر الگ ہونا پڑتا ہے گویا ایک طرح ٹائر کی مناسبت سے تختوں میں مسافر محبوس بن جاتا ہے — کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے تختے پر کوئی میت غسالوں کے انتظار میں لیٹی ہوئی ہے۔

اپنا سامان لگیج آفس میں رکھوا دیا، اس لئے کہ میسور کے لئے اب رات میں ساڑھے دس بجے گاڑی ملنے والی تھی بنگلور اسٹیشن کے باہر جہاں اسکوٹر اور تانگے کھڑے ہوتے ہیں، تالاب کی مانند گھاٹی میں خوب روشنی ہو رہی تھی معلوم ہوا کہ نمائش ہو رہی ہے۔ ایک صاحب سے پوچھا تو کہنے لگے "جا کے دیکھو نا! بھائی ابھی دس گھنٹے تک چالو ہے!" — ایک حجام کی دوکان تلاش کی، پہلے شیو بنوایا، پھر ایک نئے سے ہوٹل میں آکر چائے پی، ہوٹل اچھا تھا لیکن گاہکوں کے ساتھ ٹیبل کے پاس کتے بھی منہ اٹھائے اور آس لگائے دیکھے، پتہ نہیں اس معاملہ میں مالک کیوں غافل تھا، اور گاہک بھی کیوں نوٹس نہیں لیتے تھے۔ ممکن ہے اس ہوٹل میں کتوں اور انسانوں کی

بے چارگی، بھائی چارگی اور میل ملاپ کا کوئی نیا تجربہ ہو رہا ہو....

کاچی گوڑہ سے بنگلور تک دو باتوں میں جہاں تک خیال ہے، میں نے بڑی مشابہت اور مماثلت دیکھی۔ ایک تو یہ کہ ریلوے اسٹیشن تقریباً ایک ہی نمونے کے تھے، جیسا پچھلا دیکھا ویسا ہی اگلا پایا۔ اور دوسری یہ کہ یہ بات اب اچھی طرح ذہن نشین ہو گئی کہ کتوں اور بندروں کی انفرادی پہچان مشکل ہے۔ جو بندر اور کتے پچھلے اسٹیشنوں پر نظر آئے وہی اگلے اسٹیشنوں پر بھی موجود پائے گئے۔ بچوں کو چھاتی سے لپٹائے بندریاں اور ایک جیسے کتے ہر اسٹیشن پر موجود ملے۔ اگر کوئی لنگڑا لولا کتا پچھلے کسی اسٹیشن پر ملا تھا تو ویسا ہی اگلے اسٹیشن پر، اور نہیں تو اس سے اگلے اسٹیشن پر ملاقات کے لئے بھٹکتا نظر آیا۔ بندر غافل مسافروں کے ہاتھوں سے کھانے کی اشیا جھپٹا مار کر گرا دیتے اور لے بھاگتے ہیں، ڈبوں کے اندر گھس آتے ہیں اور موز، موسمبی یا بسکٹ کا پاکٹ لے بھاگتے ہیں۔ آج کل بڑے شہروں کے ہوٹلوں کے آس پاس بندر نما ایسے بالکل انسان بھی نظر آتے ہیں جو ہوٹل میں بیٹھے گاہکوں کے سامنے سے اچانک بندر کی طرح روٹی سالن چھین کر بھاگ جاتے ہیں، بندر اور انسانوں کی ان حرکات سے خیال آتا ہے کہ شاید ڈارون کی اس تھیوری میں صداقت ہی ہوگی کہ انسان بندر سے انسان بنا ــ اور کیا تعجب کہ ڈیو جانس کلبی کا بھی کتوں کی نسل سے کوئی نہ کوئی واسطہ ضرور رہو۔

ہوٹل سے چائے پی کر جب نکلا تو سڑک کی ایک طرف مجمع تھا، قریب گیا تو دیکھا کہ ایک اندھا منگتا بجا رہا تھا، دو لڑکیاں مختلف ساز اور ایک شخص پیٹ کو اکڑا کر ہاتھوں سے پیٹ پیٹ کر آوازیں پیدا کر رہا تھا۔ سب کے سب ماہرانہ انداز سے لے کی مختلف طریقوں سے تقسیم کر رہے تھے۔ یہ فنکارانہ بات مجھے بہت پسند آئی ــ قریب کھڑے ہوئے تانگے دیکھے تو یوں محسوس ہوا گویا بچوں کے کھلونے ہیں، چھوٹے ٹٹو، تانگے کی گول سی چھوٹی چھت، بیٹھنے کے لئے سیٹ نہیں بلکہ فرش تھا، اور مجھے احمد نگر، پونہ اور ناسک کے تانگے یاد آ گئے جن کے مقابلہ میں یہ تانگے واقعی بچوں کا کھلونا لگ رہے تھے

میسور، بہت سرسبز و شاداب اور خوبصورت شہر نظر آیا۔ کیا شہر اور کیا شہر کا اطراف، بہت ہی بھلے لگے۔ گرمیوں کا موسم تھا، اس لئے گل مہر کے زرد و سُرخ پھولوں کی چوطرف بہار تھی۔ ایک بات طے ہے کہ ہندستان کے کسی بھی حصے میں چلے جائیے، پہاڑیوں پر کوئی نہ کوئی عمارت ضرور نظر آئے گی، یہ عمارت یا تو روحانیت کا مظہر ہوگی یا بادشاہوں کے جاہ و جلال کی غمازی ــ جیسے کوئی دیوی دیوتا، یا پیر فقیر کا دیول، یا درگاہ ہوگی، نہیں تو بادشاہی محل، یا قلعہ ہوگا۔ میسور شہر کے پہاڑ پر ایک عمارت نظر آئی، دریافت پر معلوم ہوا کہ مہاراجہ صاحب کا سمر پیالس ہے۔ اس کے پاس ہی ایک عالیشان مندر بھی ہے جہاں صبح و شام لوگ بسوں میں اور موٹروں میں پہنچتے ہی رہتے ہیں۔ نظارہ قدرت اور میسور سٹی کا ہوائی منظر دیکھنے کے لئے اس سے بہتر مقام اور کون سا ہو سکتا تھا، میں بھی پہاڑ پر جا پہنچا۔

پہلے تو ان لوگوں کے لئے کلمۂ تعریف نکلا جنھوں نے وسیع و عریض پہاڑ کے سینے پر مونگ دل کر رکھ دی تھی، جیسے سڑکیں تعمیر کر ڈالی تھیں اور شاہی محل اور مندر کھڑے کر دیئے تھے ـــــــ پھر نظارۂ قدرت

سب سے جیتا جاگتا
اور حسین منظر پیدا کرتا تھا۔ پہاڑ پر سے میسور شہر ایسا نظر آرہا تھا جیسے بازیچۂ اطفال۔ ساؤتھ ایشیا کا عظیم اور قدیم چرچ
اپنا [illegible] لئے کھڑا تھا۔ بڑے چھوٹے مکانات مثل کسی ٹاؤن پلاننگ آفس میں رکھے ہوئے کسی شہر کا
ماڈل معلوم ہو رہے تھے۔ ہرے بھرے کھیت، قطعے باغات، سڑکیں و پگڈنڈیاں، پانی کے تالاب وغیرہ اپنی اپنی حدود واضح
کرتے صاف نظر آرہے تھے۔ پہاڑی ہی پر ایک مقام پر نندی بیل دیکھا جو ایک ہی چٹان سے بیٹھی ہوئی حالت میں بہت بڑا اور
عظیم تراش کر بنایا گیا تھا۔

آبشار دیکھنے کی خواہش بچپن سے دل میں تھی، ایسی قسمت کہاں کہ امریکہ کے نیاگرا فالس کا بچشم خود نظارہ کر سکیں، یا
کرۂ ارض پر مختلف مقامات کے حسین و دلکش دیگر آبشار دیکھ سکیں۔ میسور میں کاویری فالس شہر سے ترتالیس میل کے فاصلے پر
واقع تھے، اللہ کا نام لے کر چل پڑا، شاید کوئی بس راست جاتی ہو تو جاتی ہو، لیکن مجھے ایسی بس ملی جو سڑک سڑک اور دیہات دیہات
پاسنجروں کو لے کر دوڑتی تھی۔ بس ڈرائیور کا نام مقبول تھا اور وہ واقعی مقبول بھی ثابت ہوا۔ دیہات میں اور بازار میں بچے
مقبول کو خوش ہو کر سلام کرتے تھے مجھے کوئی بس میں موجود ہوتے ہوئے بھی پوچھتا تک نہ تھا کہ بھیا کیا تم فلاں شاعر ہو،
ادیب ہو، نثار نواز ہو؟" یا کسی کو یہ تک دریافت کرنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ "بھائی تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں؟"
حالانکہ ہم نے ابھی عمر کی اتنی مسافت طے نہیں کی ہے کہ اس سوال پر ہمیں شرمندگی ہو، اور اپنے مصنوعی دانتوں کی
بتیسی یا پچیسی (پچیسی اس لئے کہ ایک صاحب نے پچیس دانتوں والا چوکڑا بنوایا ہے) نہ دکھانے کے لئے اپنا منہ چھپالیں۔
جب موٹر روانہ ہونے والی تھی تو میں نے پوچھا تھا کہ "فالس پر کب پہنچے گی؟" جواب ملا تھا کہ "بارہ گھنٹے پہ پہنچ جائے گی!"
حیران ہوا کہ اس طرح تو چوبیس گھنٹے آنے جانے ہی میں لگ جائیں گے — بعد عقدہ کھلا کہ یہ مقامی زبان ہے جس کا مطلب
یہ ہے کہ موٹر بس بارہ بجے تک پہنچے گی، یعنے میسور سے کاویری فالس تک تین گھنٹوں کا راستہ تھا، اور اب بنگلور میں نمائش
دس گھنٹوں تک چلنے کا مطلب بھی سمجھ میں آگیا تھا، یعنے دس بجے تک رہے گی۔ جوگ فالس بھی دیکھنا چاہتا تھا، لیکن
وہ میسور سے دو سو میل کے فاصلے پر تھے، اس لئے خیال ترک کر دیا۔

ہماری بس مختلف دیہات بیچ سے ہوتی شیوا سمدرم چلی جا رہی تھی۔ ایک دیہات میں ہفتہ واری بازار لگا ہوا تھا۔
ایک مقام پر دو زبردست پُل تھوڑے ہی فاصلے پر موجود تھے، مقام کا نام "ٹی نرسی پور" تھا۔ حیرت ہوئی کہ دو ندیاں
اپنے پورے لمبے چوڑے پاٹ کے ساتھ بہہ رہی تھیں اور ان دونوں پر پُل بنے ہوئے تھے۔
معلوم ہوا کہ ایک ندی کاویری ہے اور دوسری کبینی۔ دونوں کا سنگم آگے چل کر ہو گیا تھا۔ شیوا سمدرم پہنچ کر
ایک مایوسی یہ ہوئی کہ عوام کو بجلی پیدا کرنے کی مشینیں و دیگر تنصیبات دیکھنے کی اجازت نہیں تھی، اور یہ کہ آبشار ایک میل کے
فاصلے پر تھا، اور سواری کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ میں اس وقت بیکار بھی تھا، اور بے بس بھی، یعنے پہنچنے کے لئے
کوئی کار نہیں تھی اور بس نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ مقبول صاحب کہہ گئے تھے کہ "دو گھنٹوں" پر بس اسی جگہ واپس آئے گی۔

جب تک فالس دیکھ آؤ ں"۔۔۔۔ اس وقت دو گھنٹے بالکل ٹھیک بیٹھے، یعنے اب بارہ کے بعد دو دو بجے بس لانے والے تھے۔
میں اکیلا تھا، فالس دیکھنے کے لئے بس سے اور کوئی نہیں اترا تھا، اور فالس تک بالکل اکیلے ایک میل پیدل چلنا کھل رہا تھا۔
غیرت، تہرِ درویش بر جانِ درویش۔۔۔ چل پڑا۔۔۔ راستے میں کوئی سنگی وساتھی نہ ملا، البتہ ایک بس لوگوں سے لدی پھندی فالس سے واپس ہوتے ہوئے پاس سے گرد اڑاتی چلی گئی۔۔۔۔ آبشار کی آواز جب آنا شروع ہوئی تو جان میں جان آئی اور اب تو آبشار پر ہی پہنچ گیا۔۔۔۔ دور ایک درگاہ نظر آئی، کافی بڑا گنبد تھا، اور چمکتے ہوئے رنگ سے رنگا گیا تھا پہلے تو میں یہ سمجھا کہ حیدرآباد میں بیگم پیٹھ پر علم فلکیات کی خاطر جو آبزرویٹری بنی ہوئی ہے کہیں ویسی ہی یہاں تو نہیں بنی۔ لیکن درگاہ پر لہراتے ہوئے مذہبی جھنڈے نے بات صاف کردی۔ ایک بات میسور کے دیہاتوں میں خصوصیت سے یہ دیکھنے میں آئی کہ گاؤں میں مسجد اور گاؤں کے باہر عید گاہ ضرور تھی، چاہے مسجد ویران ہی کیوں نہ ہو، اس دل جلے شاعر کی طرح جس نے یہ شعر کہا ہے ؎

جی خوش ہوا ہے مسجدِ ویراں کو دیکھ کر　　　میری طرح خدا کا بھی خانہ خراب ہے

اور چاہے عید گاہ کے ممبر پر چرواہے گپیں ہانکتے ہی کیوں نہ بیٹھے ہوں۔

نیچے آبشار کی پانچ دھاریں بہ رہی تھیں اور میں اوپر بنی ہوئی نظارہ گاہ کے چھجے پر کھڑا انھیں دیکھ رہا تھا۔ آس پاس کوئی آدم نظر آیا اور نہ آدم زاد، البتہ نیچے گھاٹی میں آدم زاد کی پالتو بکریاں چرتی نظر آئیں۔ سوچا کہ کام یوں نہ چلے گا، جب تک نیچے پہنچ کر کاویری کے بہنے والے پانیوں کو ہاتھ سے نہ چھولوں کچھ مزہ نہ آئے گا۔ کافی نیچے اترنا تھا، پیروں میں جوتے تھے اور پتھر چکنے نظر آرہے تھے۔ کبھی آج تک زندگی میں ایسا ایڈونچر عمل میں نہ آیا تھا، پھر بھی ہمت کرکے پہاڑ سے نیچے اترتا گیا۔ ایک دہشت یہ لگی ہوئی تھی کہ پھسل کر گرے تو چٹانوں پہ ہڈیاں چور چور ہو جائیں گی اور پانی میں گر کر غرق ہونا دیکھنے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ اوپر آسمان، نیچے پہاڑ کی چٹانیں اور آبشار۔ چٹانوں اور جھاڑیوں پر پڑتا اور پھسلتا ہر قدم یہ خوف بھی دلاتا تھا کہ اب کہیں سے کوئی سانپ یا بچھو نکلا اور اس نے کاٹا۔ احتیاط سے اٹھتا بیٹھتا آخر کار میں نیچے پہنچ گیا اور کاویری۔۔۔ کے پانی کو چھولیا، دل کو جو مسرت ہوئی ناقابلِ بیان ہے، لیکن میری اس کاوش و کامرانی کو بہتے اور شور مچاتے پانیوں، آسمان پر اڑنے والے لگ ہائے ابر اور سخت چٹانوں کے سوا کسی نے نہیں دیکھا۔ خیال آیا کہ کاش اپنے ساتھی ہوتے تو اس وقت ہم سب آبشار سے بھی زیادہ شور مچاتے، اس کی دھاروں کو پکڑ کر اس کے سر پر چڑھنے کی کوشش کرتے۔۔۔ تھوڑی دیر آبشار کی خوشگوار دھیمی پھواروں اور ماحول کا لطف لیتا رہا، آبشار کے پانی سے کھیلتا رہا، پھر ایک لمحے کے لئے ننگے پاؤں دوسری چٹان پر گیا تو دوپہر کی تپتی ہوئی دھوپ سے جلی بھنی چٹان نے تلوؤں پر فوراً اپنا اثر دکھا دیا، اسی لمحے باپ رے باپ کہہ کر پھر پانی سے ٹھنڈی چٹان پر آگیا اور جلدی جلدی موزے اور جوتے پہن لئے اور اب جو سر اٹھا کر نظارہ گاہ کی بلندی کی طرف دیکھا تو یوں لگا جیسے واپسی ممکن نہیں ہے لیکن آبشار کے پاس چٹانوں پر ہی بسیرا کرنا چونکہ اس سے بھی زیادہ ناممکن تھا اس لئے اوپر چڑھنے لگا۔

بیٹھ دم لئے چلتا اور سنبھلتا آخرکار اوپر پہنچ گیا۔ لیکن میری اس وقت کی حالت دیکھنے کے قابل تھی — ٹانگیں لڑکھڑانے لگی تھیں، آنکھوں میں اندھیری آگئی تھی اور کمر بیٹھنے کے لئے نرم بستر یا آرام دہ کرسی چاہتی تھی .... میں کوئی دس منٹ تک پسینے میں تر بتر کمزوری اور نقاہت کے مارے ایک سنگی بنچ پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا —

زندگی میں تین باتیں ہمیشہ یاد رہیں گی، ایک تو قطب مینار کی چڑھائی اور واپسی، دوسری احمدنگر کے بے تکلف دوستوں نے دوستانہ دھوکہ دے کر اپنے ساتھ سیکل پر کئی میل کا چکر کھلایا تھا، اور تیسری بات یہ کاویری فالس کو چھو کر واپس لوٹنا تھا۔ میرے لئے یہ واقعے بالکل ایسے لگے جیسے کسی مبتدی ورزش کرنے والے سے پہلے ہی دن وقت واحد میں پانچ سو بیٹھکیں کروالی جائیں اور آخری بیٹھک مار کر جب وہ اٹھے یا نہ اٹھے تو یوں لگے جیسے گئے بیٹا قبرستان — لہذا یہ طے ہے کہ اب اپنی مابقی فانی زندگی میں کبھی ایسی غلطی نہ ہونے دوں گا۔ میں اسے اپنی جسمانی کمزوری ہی قرار دوں گا اس لئے کہ ابھی عمر کی وہ منزل نہیں آئی ہے کہ جس میں اپنے پیر کے صحیح ناپ کا فٹ جوتا تک خریدنا بھول جاؤں، اگر اپنے پیر سے جوتا بڑا نکل جائے تو بڑے لڑکے کو دیدوں اور چھوٹا ہو جائے تو چھوٹے بھائی کو عطا کردوں اور پھر بھی جوتے کے لئے فکرمند رہوں —

فالس سے واپسی پر ٹھنڈے پانی اور گرم کھانے کے لئے طبیعت بے چین تھی۔ بجلی گھر کے پاس ایک ویجیٹیرین ہوٹل میں جا گھسا معلوم ہوا کہ صرف سانبر بھات اور دہی کا کھانا ہی ملے گا (کھانا یعنی چاول) میں نے کہا کہ سانبر اور بھات چلے گا لے آؤ! لیکن پانی بالکل ٹھنڈا لانا! تاہم پانی ٹھنڈا نہیں مل سکا اور چائے بھی ناقص ہی ملی — میرے سامنے ایک پولس کانسٹبل نے کھانا کھایا — خوب چاول پتریلی میں ڈال لئے پھر خوب سا دال کا پانی ڈالا اور اس پانی سے چاول ملا کے نگل لئے۔ مابقی چاولوں میں خوب دہی کا پانی ڈالا اور سارے چاول نگل گیا، اوپر سے دو گلاس پانی پی کر ایک لمبی سی ڈکار لے لی، ادھر اس کا پیٹ بھرا ادھر میری طبیعت سیر ہوگئی۔ اپنی غذا اور چائے ویسی ہی چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ ایک کابلی پٹھان کی یہ بات تو ضرور سنی تھی کہ ہندوستانی اناج کو اناج سے کھاتے ہیں، یعنے دال کو روٹی سے چاول کو دال سے وغیرہ۔ لیکن آج یہ بات بھی دیکھ لی کہ پانی کو پانی سے بھی کھایا جا سکتا ہے، چاولوں میں پانی ہی پانی تو ہوتا ہے —

ہوٹل سے باہر نکلا ہی تھا کہ آواز آئی ''میسور میسور میسور'' — دیکھا کہ ایک بس میسور جانے کے لئے تیار کھڑی ہے، بس لپک کر بیٹھ گیا اور مقبول کی بس کا انتظار کرنا مناسب نہ سمجھا۔

ایک بات خاص طور پر یہ دیکھی کہ اس کنڑ زبان والے علاقے میں جہاں بھی میں گیا اور جس کسی سے سیدھی سادھی اور ٹوٹی پھوٹی اردو سنی جی خوش ہوگیا اور یقین ہوا کہ یہی زبان سارے ہند میں عوام میں رابطہ قائم رکھنے کا فرض ادا کرتی ہے۔

ابوالخیر صہبا

سبب حیات کا غم ہو گئے ہیں کیوں آخر
دوائے دردِ الم ہو گئے ہیں کیوں آخر

ستم کے پردے میں ہوتے رہے کرم اب تک
ستم برائے ستم ہو گئے ہیں کیوں آخر

وہاں پہ شیخ، یہاں برہمن کے قبضہ میں
حدودِ دیر و حرم ہو گئے ہیں کیوں آخر

کسی کی یاد کی کرنیں تھیں ان میں جلوہ نما
اندھیرے تیز قدم ہو گئے ہیں کیوں آخر

ابھی تو اور چمکنا ہے میری قسمت کو
خموش لوح و قلم ہو گئے ہیں کیوں آخر

وہی نگاہ کہ جس نے ہمیں بلند کیا
اُسی نگاہ میں کم ہو گئے ہیں کیوں آخر

جنابِ صہبا کہ رندِ خراب تھے کل تک
فدائے شیخِ حرم ہو گئے ہیں کیوں آخر

....

صابر شاہ آبادی

لبِ حیا پہ تبسم جو ہے سلام کے ساتھ
گناہ پاک ہے معصومیٔ تمام کے ساتھ

حیا سے اور عیاں ہو رہا ہے زورِ شباب
جھجھک رہا ہے جو وہ نازشِ خرام کے ساتھ

بہ قدرِ ظرف نہیں مصلحت ہے ساقی کی
جو امتیاز نمایاں ہے جام جام کے ساتھ

جنوں نواز بہاروں کا خیر مقدم ہے
چمن میں جشنِ نگاراں ہے اہتمام کے ساتھ

نگاہِ دوست کی اللہ رے جستجوئے لطیف
کہ دیکھ لیتی ہے مجھ کو مرے پیام کے ساتھ

جو اِزِ بادہ تھا بیتابِ تشنگی کے لئے
وہ اک لطیف تبسم عطائے جام کے ساتھ

مٹا مٹا تھا مگر حاصلِ پیام تھا وہ
جو حرفِ خاص تھا صابر کسی کے نام کے ساتھ

....

احسان علی عرشی

. . . .

بشر جو فطرتاً بد ہے، وہ اچھا ہو نہیں سکتا
چمن میں جس طرح کانٹا شگوفہ ہو نہیں سکتا

اگر جینے کی خواہش ہے تو اپنے کل سے رہ واصل
جدا دریا سے قطرہ رہ کے دریا ہو نہیں سکتا

تماشہ گاہِ عالم میں نہ ہو جب تو تماشائی
مرے دل کے تڑپنے کا تماشہ ہو نہیں سکتا

گرا دے گا زمانہ کی نظر سے یہ عمل تیرا
کسی سے کر نہ وہ وعدہ جو ایفا ہو نہیں سکتا

مری سوئی ہوئی قسمت ابھی بیدار ہو جائے
تری چشم کرم کا کیا اشارہ ہو نہیں سکتا!

نگاہِ یاس! ان کے سامنے میری مدد فرما
زباں سے میری اظہارِ تمنا ہو نہیں سکتا

دیا ہے درد جس نے مجھ کو عرشی کیا نہیں ممکن
وہ میرے دردِ پنہاں کا مسیحا ہو نہیں سکتا

. . . .

مرزا رہبر جدید

. . . .

گو یاس و رنج، درد و الم میں کمی نہیں
پھر بھی حیاتِ عشق میں افسردگی نہیں

اب فیضِ یادِ یار سے کوئی کمی نہیں
تنہائیوں کا اب مجھے افسوس ہی نہیں

مے کش تو ناپ ناپ کے پیتے نہیں کبھی
یہ ظرف کی ہے بات کوئی دل لگی نہیں

اشکوں سے جو کشید ہوا اُس کا نشہ ہے اور
کوثر کے انگبیں میں تو یہ بات ہی نہیں

شعلے سے کیسے اُٹھتے ہیں جامِ شراب سے؟
ساقی! مئے کہن کی کوئی بوند بھی نہیں

اُٹھے صنم کدے سے تو مئے خانے ہم گئے
اور اس سے خوش نصیب کوئی زندگی نہیں

اُس ماہ وش کی یاد سے روشن ہوا ہے دل
میری شبِ فراق میں اب تیرگی نہیں

اس سے خیال و حُسن کا ہوتا ہے امتیاز
جو شئے بُری ہے دہر میں وہ بھی بُری نہیں

رہبر ہوائے نفس لئے پھرتی ہے اسے
شر سے بشر کی ذات کو دل بستگی نہیں

. . . .

مظفر حنفی

ما نجھی دھوئی پاک زباں پر تلخی کی بنیاد کہاں
اس چھانے میں آسکتے ہیں شاگردانِ شاد[1] کہاں

اپنے غم کی لوگ سنانے بیٹھے ہیں روداد کہاں
اس محفل میں مظلوموں کی داد کہاں فریاد کہاں

لاعلمی بھی کار آمد ثابت ہوتی ہے بعض اوقات
میرا طنز نہ سمجھا، اُس میں اتنی استعداد کہاں

بستی سے تو اُکتا کر صحرا کی جانب آتا ہے
صحرا سے بچ کر جائے گا او خانہ برباد کہاں

مصلحتاً تبدیلی کرلی جاتی ہے افسانوں میں
خسرو ہی تیشے سے کھیلا کرتا تھا فرہاد کہاں

ہر چہرے کے پیچھے ہوگا ایک فرشتہ یا شیطاں
ان بارونق چوراہوں پر کوئی آدم زاد کہاں

دھوپ سہی راہوں پر لیکن چلتے رہنا بہتر ہے
سائے ہیں مخدوش، نہ جانے پڑ جائے افتاد کہاں

غالب یہ ہے تیری فطرت بھانپ گئے ہیں جنوں سے
اُٹھ کر تیری محفل سے جاتے ہیں کچھ افراد کہاں

بستی بھر میں ایک تمہارا ہی کاشانہ اونچا ہے
سر اونچا رکھنے والوں کو پھانسی دے جلاد کہاں

آج مظفر اپنے حق کی خاطر لڑنا پڑتا ہے
خالی دامن پھیلانے سے ملتی ہے امداد کہاں

• • • • • • • •

عاصم بریلوی

کسی کی بزم سے ہم یوں شکستہ پا گذرے
کہ جیسے لُٹ کے بہاروں کا قافلہ گذرے

جو دورِ عشق میں اے دوست مبتلا گذرے
وہی حیات کی لذت سے آشنا گذرے

بہ پاسِ شرحِ محبت بہ قیدِ رسمِ وفا
ہم اُن کے سامنے مجبورِ التجا گذرے

گذر گئے وہ تصور میں اس نزاکت سے
گلوں کو چھوتی ہوئی جس طرح صبا گذرے

وفا کے پردے میں یوں اُس نے بے وفائی کی
قضا کا جیسے جوانی میں حادثہ گذرے

کبھی جو گذرے تری رہگذر سے ہم اے دوست!
ترے خیال، ترے غم میں مبتلا گذرے

یہاں تو قید ہیں، اپنی بلا سے گلشن میں
خزاں رہے کہ بہاروں کا قافلہ گذرے

چھلک کے رہ گئے چشمِ حیات میں آنسو
وہ سامنے سے مرے جب خفا خفا گذرے

وہ حسرتوں کو مری روندتے ہوئے عاصم
دل و نگاہ کی راہوں سے بارہا گذرے

• • • • • • • • •

[1] استاد محترم حضرت شاد عارفی (مرحوم)

مخلص بنگلوری، میسور

ہماری [illegible] نہ پوچھو
ستم گر کی ستم رانی نہ پوچھو

کہیں تم بھی نہ ہو جاؤ پریشاں
مرے دل کی پریشانی نہ پوچھو

تمہاری چشمِ بے گوں توبہ توبہ
مرے [illegible] کی حیرانی نہ پوچھو

تجسس میں کہیں تشنہ نگاہیں
کہیں جلووں کی ارزانی نہ پوچھو

نہیں دیکھا ہے اک مدت سے تم کو
مری آنکھوں کی ویرانی نہ پوچھو

تمہاری یاد کی سوغات ہے یہ
مرا ذوقِ غزل خوانی نہ پوچھو

[illegible] دیر و حرم ہے
عروجِ عقلِ انسانی نہ پوچھو

بڑی ہمت سے اب تک جی رہا ہے
مخلص کی گراں جانی نہ پوچھو

. . . .

قمر صدیقی

. . . .

دیکھا نہیں جاتا ہے، مگر دیکھ رہا ہوں
بدلی ہوئی کچھ ان کی نظر دیکھ رہا ہوں

ان کے رُخِ روشن پہ ہیں زلفوں کی گھٹائیں
میں شام کے سائے میں سحر دیکھ رہا ہوں

تاروں پہ نظر رکھنے کی فرصت ہی کسے ہے
اپنے ہی ابھی داغِ جگر دیکھ رہا ہوں

میں نے تو انھیں اشک ہی سمجھا تھا، مگر اب
دامن پہ ترے آبِ گہر دیکھ رہا ہوں

اپنے ہی نشیمن کو جلاتی ہے یہ بجلی
میں آج بھی آہوں کا اثر دیکھ رہا ہوں

جس راہ میں برباد ہوا قافلۂ دل
حسرت سے وہی راہگزر دیکھ رہا ہوں

مقتول نظر میں ہے نہ قاتل کوئی ہمدم
تلوار مگر خون میں تر دیکھ رہا ہوں

دنیا میں قمر دوست کا سایہ ہے گریزاں
دشمن نظر آتے ہیں جدھر دیکھ رہا ہوں

. . . .

واحد [illegible]

فصلِ گل میں ہے خانماں برباد
آہ مظلوم بلبلِ ناشاد

ہائے یہ دورِ انقلابِ چمن
خود نگہبان بن گئے صیاد

ایک بھٹکا ہوا میں راہی ہوں
صرف اتنی سی ہے مری روداد

کھو چکے جب طاقتِ پرواز
ہم ہوئے بھی تو کب ہوئے آزاد

باریابِ جمال ہو نہ سکی
کس قدر بدنصیب ہے فریاد

ہم تو برباد ہو گئے اے دوست
تو جہاں بھی رہے رہے آباد

کتنے دلدوز شعر ہیں واحد
جس پہ دشمن بھی دے رہے ہیں داد

محسن نقوی

مہتاب بجھ [illegible] اداس ہیں
یہ [illegible] اداس ہیں

زنداں میں آج [illegible]
شاید [illegible] اداس ہیں

کیا چاہتے ہو [illegible]
کیوں پھر [illegible] اداس ہیں

ساقی [illegible]
لیکن تم سے بچھڑ [illegible] اداس ہیں

پلکوں سے اشک ہائے ندامت کو پونچھ لو
محسوس ہو رہا ہے ستارے اداس ہیں

کشتی کے ڈوبنے کا نہیں ہی ملال ہے
اے ناخدا وہ دیکھ کنارے اداس ہیں

محروم کر گیا ہے کسی بزمِ ناز سے!
محسن سنا ہے اب وہ اشارے اداس ہیں

نقد و نظر

میر انیس محمد حسین حسان۔ ناشر مکتبۂ جامعہ نئی دہلی۔ صفحات ۸۰۔ قیمت ۲۵ =۱

مکتبۂ جامعہ ہندوستان میں اردو کتابوں کی اشاعت کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ آزادی کے بعد بھی اس نے ترقی کے منازل طے کئے ہیں اور گذشتہ سال اس نے آفسٹ مشین بھی خرید لی اور اس سال سے اس نے کام کرنا شروع کر دیا ہے اور اب اس کی اکثر مطبوعات آفسٹ پر چھپ رہی ہیں۔

مکتبہ نے شعرا کے حالات کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے۔ قبل ازیں میر تقی میر پر تبصرہ شایع ہو چکا ہے۔ یہ دوسری کتاب ہے جس کو محمد حسین صاحب حسان نے نہایت آسان دلچسپ اور دلاویز پیرایہ میں لکھا ہے۔ لطف یہ ہے کہ انیس کی زندگی کا کوئی اہم واقعہ بھی کتاب کے مختصر ہونے کے باوجود چھوٹنے نہ پایا۔ یہ کتابیں نہ صرف بچوں ہی کے لئے کار آمد ہو سکتی ہیں بلکہ ان طلبا کے لئے بھی جو تاریخ ادب اردو کو امتحانی نقطۂ نظر سے پڑھتے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ مکتبۂ جامعہ کی یہ کتاب اردو دانوں میں مقبول ہوگی۔

مثنوی گلزار نسیم مصحح رشید حسن خاں۔ ناشر مکتبۂ جامعہ دہلی۔ صفحات ۱۴۳۔ قیمت ۵۰ =۱۔

اردو میں مسدس حالی کے بعد مثنوی سحر البیان کو اور اس کے بعد مثنوی گلزار نسیم کو جو شہرت حاصل ہوئی اس تک دوسری کتابیں کم ہی پہنچ سکی ہیں۔ ان کتابوں کے جتنے ایڈیشن نکلے شاید ہی کسی اور کے نکلے ہوں۔ مقبولیت کو دیکھ کر ناشروں نے نہ ان کی صحت کا خیال رکھا نہ طباعت میں صفائی کا، اور بہ قول حالی ع جتنا بڑھتا گیا ہوتا گیا پانی گدلا۔ تاج کمپنی کی طرف سے مسدس کے جب صدی ایڈیشن شایع ہوئے تو طباعت میں صحت اور نفاست کا بہت بڑی حد تک خیال رکھا گیا۔ سخت ضرورت تھی کہ ان مثنویوں کو بھی شایع کیا جاتا۔ چنانچہ مکتبۂ جامعہ نے اس کام کو انجام دیا اور مثنوی گلزار نسیم منظر عام پر آگئی۔ یہ اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے! اس سلسلے کی پہلی کتاب میر امن کی باغ و بہار ہے جو رشید صاحب ہی کی مصححہ ہے! اس کی طباعت میں صحت بھی ہے اور نفاست بھی۔ آخر میں فرہنگ بھی دی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ کوئی مقدمہ نہیں، مختصر سا پیش لفظ ہے جس میں اس کے ابتدائی مطبوعہ نسخوں کا ذکر کرکے ایک کو بطور بنیادی نسخہ منتخب کیا ہے۔

اردو مرثیہ سفارش حسین رضوی۔ ناشر مکتبہ جامعہ۔ صفحات ۳۳۶۔ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت ۶/=۔

یہ اردو مرثیہ کی تاریخ ہے۔ اس کو رضوی صاحب نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، ایک دکن کے مرثئے، دوسرے شمالی ہند۔ دکن کی تاریخ مرثیہ نگاری سولھویں صدی کے دوسرے نصف سے شروع ہوکر بیسویں صدی تک پہنچتی ہے اور اسی طرح

شمالی ہند میں مرثیہ نگاری کی تاریخ کا آغاز اٹھارویں صدی کے پہلے نصف سے شروع ہو کر بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی پر ختم ہوتا ہے۔ دکنی مرثیے کی تاریخ کے لئے رضوی صاحب نے ہر صدی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اور شمالی ہند کے لئے اٹھارویں صدی کو دو حصوں میں اور انیسویں اور بیسویں صدی کو چوتھائی حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر صدی کے مراثی اور مرثیہ نگاروں پر تبصرہ کے لئے علحدہ عنوان قایم کیا ہے۔

دکن میں مرثیہ کی تاریخ اشرف کے "نوسرہار" سے شروع کی ہے جو ۹۰۹ھ کی تصنیف ہے اور اب تک اس کے صرف ایک مکمل نسخہ کا پتہ چلا ہے جو ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ کی زینت ہے۔ اس کا ایک ناقص نسخہ علی گڈھ میں ہے۔

رضوی صاحب نے دکنی مرثئے کے متعلق سارا مواد مطبوعہ کتابوں سے اکٹھا کیا ہے، مثلاً اردوئے قدیم، اردو شہ پارے، یورپ میں دکنی مخطوطات، دکن میں اردو، مقالاتِ ہاشمی اور مرقع سخن وغیرہ۔

دکنی شعرا میں جملہ ۱۵۹ مرثیہ نگاروں کا ذکر، ان کے کلام کا نمونہ اور ان پر رائے دی گئی ہے۔ مطبوعہ مواد میں حضرت برہان الدین جانم بھی شریک ہیں اور محمد عادل شاہ کے دربار کا شاعر مقیمی بھی۔ ان کا ذکر رضوی صاحب نے نہیں کیا ہے۔ ابھی ایسے شعرا بھی ہیں جن کے مراثی منظرِ عام پر نہیں آئے لیکن کتب خانوں کی بیاضوں میں موجود ہیں۔ سلاطین بہمنی کے دور میں اردو میں شعرگوئی کا آغاز ہو چکا تھا لیکن مرثیہ نگاری کا کوئی نمونہ ہم تک نہیں پہنچ سکا۔

شمالی ہند کے مرثیہ گو شعرا کی تعداد ۲۱۲ ہے، جن کے متعلق موثق طور پر یہ معلوم ہو سکا ہے کہ وہ مرثیہ بھی کہتے رہے ہیں۔ دکن اور شمال کے یہ سارے شعرا صرف مرثیہ گو نہیں رہے بلکہ مختلف اصناف میں شعر کہتے رہے ہیں، ان میں اکثر و بیشتر ایسے بھی ہیں جنھوں نے دو چار مرثیوں سے زیادہ نہیں کہے۔ دکن میں صرف مرزا ہی ایسا شاعر ہے جس نے مرثئے کے سوا کچھ نہ کہا اور صرف مرثیہ کے لئے ہی قلم اٹھاتا رہا۔ بادشاہ نے اپنی تعریف میں قصیدہ کی خواہش کی تو بادشاہ کے تخلص کا ایک مرثیہ لکھ کر پیش کر دیا۔ اعتقاد کی اس شدت میں انیس اور دبیر بھی مرزا کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اس لئے کہ انھوں نے غزل سے ابتدا کی اور منہ کا مزہ بدلنے کے لئے رباعیات بھی کہیں اور قطعات بھی۔

زیرِ تبصرہ کتاب ایک بہت بڑی کمی کو پورا کرتی ہے اس میں اردو کے تمام مرثیہ گو شعرا کا ذکر ایک جگہ آ گیا ہے جو اب تک منتشر اوراق میں بکھرے ہوئے تھے، اس لئے رضوی صاحب اردو ادب کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ مرثیہ کے بارے میں انھوں نے ایک مستقل اور جامع کتاب اردو ادب کو دی۔

مثنوی قبلہ نما کاوش بدری۔ ناشر مجلس مصنفین مدراس۔ مدینہ پریس ٹریپلیکین مدراس ۵، صفحات ۸۰۔ قیمت ۱=۵۰۔

کاوش بدری، جنوبی ہند کے ان شعرا میں ہیں جنھیں پر گو کہا جا سکتا ہے۔ وہ جب بھی حالات سے متاثر ہوتے ہیں اپنے تاثرات شعر میں ڈھال دیتے ہیں۔ سال ۱۹۴۶ء امنِ عالم کے لئے اچھا ثابت نہ ہوا، اور یہ بات شاعر کے لئے محرکِ شعر بن گئی اور تلاشِ امن میں اس نے گل افشانی شروع کی۔ بات بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی اور اس نظم نے طویل مثنوی کی

حاصل کیا۔ شاعر نے تمام حمد سے شروع کی، پھر دنیا کو امن کا پیغام دینے والے پیغمبر خدا صلعم کی بارگاہ میں نعت کا نذرانۂ عقیدت انتہائی انکسارانہ انداز میں پیش کیا۔ انھوں نے محسن کاکوروی، امیر مینائی اور امجد جیسے نعت گو شعرا کے بعد مدراس کے تقریباً تمام شعرائے متقدمین کا ذکر کیا اور کہا کہ ؎

ان کا ہمسر نعت گوئی میں کہاں ان کی منزل شعر و فن کا آسماں

ان کے آگے ہے سرِ تسلیم خم ان کے فکر و فن کی دنیا یم بہ یم

فکر و فن میرا ابھی ناپختہ ہے دولتِ ایماں سے خود بے بہرہ ہے

بیدِ مجنوں کی طرح لرزاں قلم مجھ سے اور اوصافِ آدابِ حرم

اس کے بعد کاوش نعت کے میدان میں سر سے چلنے داخل ہوتے اور "نعت کہنا یہ ہے یا الانا ہے جوئے شیر کا" کا مصداق بنتے ہیں۔ نعت کہنے میں کاوش نے بڑی جدت طرازی کی ہے۔ چند شعر پیش ہیں۔ وہ سراپائے رسولؐ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

دل حریمِ پاک میں کعبہ نشاں سر بہ سجدہ ہر ارادہ کی زباں

ہر نوا گویا پیامِ جبرئیل خود فصاحت خود بلاغت کی دلیل

عشق اس کا طالعِ فطرت کا نام حسن اس کا حلقہ گیرِ صبح و شام

کاکلِ فکرِ رسا کتنا طویل سرخ اس کی جیسے موجِ سلسبیل

نیند کے عالم میں بیداری کا رنگ رنج و غم میں مسکرانے کی امنگ

کوچہ کوچہ اس پہ استہزا کے سنگ سارا عالم اس کے استغنا سے دنگ

دہر کو چھو لے تو وہ کوثر بنے ذرہ ذرہ عرش کا ہمسر بنے

اس کا ہر پیغام انساں کے لئے
کون کہتا ہے مسلماں کے لئے

دیکھا آپ نے شاعر کس طرح اپنی منزلِ مقصود پر آ رہا ہے۔

اس کے بعد شاعر نے کچھ آپ بیتی بیان کی ہے جو قاری کو بہ اعتبار ترتیب کھٹکتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر ان واقعات کو پیش کرتے ہوئے نعت پر آتا تو شاید تاثر میں اضافہ ہو جاتا۔ آخر میں شاعر امن کی ضرورت اور مدراس کے قیام کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا اور دعا پر اپنی مثنوی کو ختم کرتا ہے۔

نئی روشنی میں کاوش نے ایک طویل مثنوی لکھنے کی جرأت کر کے سہل پسند شاعروں کی روایات کو توڑا ہے لیکن ساتھ ہی اس میں جو جدت طرازی کی ہے اس کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔

کتاب کی ابتدا میں کاوش بدری اور راز امتیاز نے اپنے مشترکہ مضمون میں مدراس میں مثنوی نگاری کی تاریخ دی ہے جو

اردو ادب کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بڑی اہم ثابت ہوگی۔

بہت سی اجلی علی اکبر آمبوری۔ ناشر ادارہ جدید ۳۶/۳۴ الکنس اسٹریٹ وپیری مدراس۔ سائز ورلکار ۱/۱۶ صفحات ۱۱۲۔ قیمت ایک روپیہ۔

آج کل افسانہ نگاروں کی حسرت عشق و عاشقی اور محبت کی پینگوں کی انتہا بن کر رہ گئی ہے۔ ہمارے نوجوان افسانہ نگاروں کے ذہن پر پہلے سے زیادہ عورت سوار ہے اور ان کے افسانے ذہنی تعیش سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ آمبوری صاحب کے افسانے اس موضوع سے ہٹے ہوئے ہونے کے باوجود اپنی دلچسپی میں کوئی کمی نہیں آنے دیتے۔ ان کے پیش نظر سماج کی اصلاح ہے، کوئی افسانہ اس سے خالی نہیں، ان میں کوئی ایسا عنصر بھی موجود نہیں جس سے ہمیں لڑکیوں کو پڑھنے دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس ہو۔ یہ سات افسانوں کا مجموعہ ہے ــــ قومی یک جہتی، معاشرتی قوانین کی پابندی اور اخلاق حسنہ ان کے موضوعات ہیں، اور فاضل افسانہ نگار نے نہایت حسین اور دلکش پیرایہ میں ان خشک موضوعات پر قلم اٹھا کر انھیں باغ و بہار بنا دیا ہے۔

آئینۂ احساس تاج اورنگ آبادی۔ صفحات (۸۰)۔

تاج الدین صاحب تاج اورنگ آباد کے متوطن ہیں اور بمبئی میں قیام پذیر ہیں۔ "آئینۂ احساس" ان کے کلام کا مجموعہ ہے جو ستر نظموں پر مشتمل ہے۔ ہر نظم ایک عنوان کے تحت لکھی ہے۔ حمد کے لئے احترام حق اور نعت کے لئے احترام آدمیت عنوان دیا ہے۔ ہر جگہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ اشعار عنوان کے تحت ہوں۔ اس طرح نظموں میں واعظانہ انداز کی کیفیت نظر آتی ہے، اور جو تاثر قاری پر پیدا ہونا چاہئے نہیں ہوتا۔ قربانی کے ساتھ بیتابی، بربادی اور محو داری وضعداری قافئے بھی باندھے ہیں، ممکن ہے وہ اس کو جائز سمجھتے ہوں۔ (م۔ا۔ص)۔

انشائیہ مرتب، ڈاکٹر آدم شیخ۔ ناشر، وائٹرس امپوریم پرائیویٹ لمیٹڈ۔ سر فیروز شاہ مہتا روڈ بمبئی ملے۔ صفحات ۲۰۴۔ قیمت ۲۔۵۰۔

اردو ادب میں انشائیہ ایک جدید صنف ہے جس کے موجد محمد حسین آزاد ہیں۔ اس کے بارے میں معلومات پہلے پہل ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کی کتاب "اردو ایسیز" سے ہوئیں۔ اس کے بعد وزیر آغا، محمد حسنین، وحید مرزا اور سید صفی مرتضیٰ اصحاب نے اسی موضوع پر کتابیں لکھیں۔ زیر نظر کتاب "انشائیہ" ڈاکٹر آدم شیخ کی تالیف ہے۔ اس میں خط و خال، فکر و فن کے ورثے، نئے اور پرانے چراغ اور تخلیقات کے عنوانات ہیں۔ خط و خال میں انشائیہ کی تعریف، ادبی تعلق و تشکیل بیان کر کے اس کے محاسن و خصوصیات کا جائزہ، اردو ادیبوں اور فنکاروں کے اقتباسات۔ ان کے علاوہ یورپی ادیبوں کے خیالات و تصورات کی روشنی میں لیا گیا ہے۔ ان اقتباسات حوالوں کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ آخر میں مذکورہ بالا ادیبوں کے بیانات کے پیش نظر انشائیہ کی جامع تعریف کا تعین کیا گیا ہے۔ فکر و فن کے ورثے کے تحت عربی، فارسی، فرانسیسی اور انگریزی ادبیات سے متعلق انشائیہ کے ارتقا کا ذکر ہے۔ نئے اور پرانے چراغ کے تحت اٹھارھویں صدی سے لے کر موجودہ دور تک جن اردو ادیبوں اور انشائیہ نگاروں نے ادبی خدمات

انجام دئے ہیں، اُن کے ادبی کاموں پر روشنی ڈالی ہے اور انشائیہ کے نقطۂ نظر سے اُن پر تنقید کی ہے تخلیقات کے تحت اردو ادیبوں میں جن کی تحریریں انشائیہ کے معیار پر پوری اتر سکتی ہیں، اُن کے ادب پاروں کے انتخابات پیش کئے گئے ہیں۔ اس طرح محمد حسین آزاد ۔ شرر ۔ میرزا صر علی ۔ مہدی افادی ۔ سجاد علی انصاری ۔ خلیق دہلوی، خواجہ حسن نظامی ۔ فرحت اللہ بیگ ۔ ابوالکلام ۔ نیاز فتح پوری ۔ پطرس ۔ رشید صدیقی ۔ کنھیالال کپور ۔ مشتاق احمد یوسفی ۔ وزیر آغا اور احمد جمال کی نگارشات آگئی ہیں ۔ مرتب کی یہ ادبی کوشش قابلِ تحسین ہے ۔ (غلام رسول) ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

ابوالنصر محمد خالدی

چند دکھنی مثنویاں

دکھن کی اسلامی، تہذیبی تاریخ کے ماخذ کی حیثیت سے

کمیت اور طرماح دونوں شاعر ہیں۔ ان کو شخصاً جاننے والوں کی تعداد نہایت ہی محدود لیکن اسماً جاننے والوں کی تعداد لا محدود ہے۔ کمیت (م ۱۲۶ھ) متعصب عدنانی، شیعی اور محب اہل کوفہ۔ طرماح (م ۱۲۵ھ) متعصب قحطانی، شاری (= خارجی) اور محب اہل بصرہ۔ اس نمایاں اور گہرے اختلاف کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے جانی وجگری دوست ہیں۔ لوگوں کو ان کی باہمی الفت پر تعجب ہوتا ہے۔ سبب دریافت کرتے ہیں۔ جواب ملتا ہے: ہم دونوں عوام فریبیوں سے بیزار ہیں۔[1]

عبداللہ بن یزید شاری اور ہشام بن حکم شیعی بھی ایک دوسرے کی شادی وغمی میں برابر کے شریک تھے جب تو تو اس اتحاد پر بھی لوگ حیرت کا اظہار کرتے تو دونوں کہتے، اشعار کی دل پذیری اور اخبار کی دلچسپی ہم دونوں میں مشترک ہے۔[2] "ضدین" کا یہ اجتماع تو تقریباً تیرہ صدیوں پہلے کی بات ہے جبکہ دین ہی سب کچھ تھا، اول بھی آخر بھی ظاہر بھی باطن بھی، ہر وقت ہر جگہ۔ جبکیفی وکمی، صوری ومعنوی یا داخلی وخارجی اسباب کی بنا پر نقطۂ نظر بدلا تو باوجود اختلاف مذہب اتفاق کی بے شمار

---

[1] البیان والتبیین: عمرو الجاحظ ۲۵۰: مصر ۱۲۶۷: ج ۱ ص ۳۶۔

[2] مروج الذہب: علی المسعودی م ۳۴۵ یا ۳۴۶ پارس ۱۸۶۱-۱۸۷۷: ج ۵ ص ۴۴۲ ، ۴۴۳ وما بعد۔

صورتیں نکلیں اور صرف افراد ہی نہیں بلکہ مختلف مذہب رکھنے والے فرقوں اور متباین مسلک کے گروہوں میں بھی اتحاد و اتفاق ہونے لگا۔ صرف منفی اتحاد ہی نہیں مثبت بھی۔ بقائے باہم کے لئے اصول کی برقراری کے ساتھ ساتھ فروغ میں زیادہ سے زیادہ اتفاق کی مثالوں سے مسلمانوں کی تاریخ کا کوئی دور کبھی خالی نہیں رہا۔ دکن کی اسلامی تاریخ بھی اس قسم کے بین المذاہب اتفاق کی ایک نمایاں مثال ہے۔

دکھن میں مسلمانوں کی باقاعدہ و مستقل قیام کی ابتدا محمد تغلق سے کی (م ۲۱-۱-۷۵۲ھ) یہاں ان کے قدم اکھڑنے جانے اور اس کی وفات سے قریباً چار سال قبل ہی بہمنیوں کی حکومت قائم ہوگئی (۲۴-۳-۷۴۸ھ) — ہندوستان خاص کا دکھن پر مکمل اقتدار عموماً ایک نسل یعنی قریباً تیس سال سے زیادہ مدت تک باقی نہیں رہتا بہمنی سلطنت کا آزاد و مستقل قیام تاریخ ہند کے اس کلیہ کی ایک نمایاں مثال ہے۔ بہمنیوں کی طبعاً یہ کوشش رہی کہ شمالی ہند سے سیاسی تعلقات کے ساتھ ساتھ معاشری، معاشی و تہذیبی تعلقات بھی منقطع ہو جائیں مگر ہندوستان کے فی الجملہ ایک جغرافیائی اور کسی قدر تہذیبی وحدت ہونے کی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو کم از کم ان رشتوں کی کیفیت کو ضعیف اور کمیت کو کم کیا جائے اور ضعف و کمی کو مغربی ایشیا . . . ایران / عراق اور عرب سے تعلقات بڑھا کر پورا کیا جائے۔ چنانچہ بہمنی سلطنت کے دوسرے ہی حکمران کے زمانہ سے ان ملکوں سے معاشی و تہذیبی تعلقات بڑھنے لگے۔ ہر سال حج کا خصوصی اہتمام ہونے لگا اور عراق و فارس سے بحری تجارت کی غیر معمولی ہمت افزائی شروع ہوئی، فارسی ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی اور حکومت کی اعلیٰ سطح پر فارسی کا چلن بھی ایرانیوں کو یہاں وارد ہونے کی ترغیب دینے لگا۔ دسویں صدی ہجری کے نصف اول میں ایران، خراسان و فارس میں سیاسی اور نتیجتاً معاشی پریشانی پھیلی تو وہاں کے باشندوں کی ایک قابلِ لحاظ تعداد کو دکھن میں پناہ ملی۔ اور جب کبھی شاہی اقتدار برقرار رکھنے کے لئے ایسے نوجوانوں کی ضرورت پڑی جو فوجی زندگی کی صعوبت برداشت کرنے کے سوا ہر حال میں اس کے وفادار رہیں تو ایرانی آفاقی اس کے لئے حاضر ہوگئے، یہاں یہ کہنے کی شاید ہی ضرورت ہے کہ ان کی اکثریت شیعہ مذہب کی پیرو تھی اگو بہمنی حکومت کا مذہب ابتدا سے سنی حنفی رہا اور مسلمان آبادی کی اکثریت بھی اسی مذہب کی متبع تھی مگر ایرانی شیعیت بھی فیروز کے (م ۱۵-۱۰-۸۲۵ھ) زمانے سے دھیرے دھیرے ترقی کرتے ہوئے محمد شاہ لشکری (م ۳۰-۴-۸۸۷ھ) کے بعد بہت نمایاں ہوگئی حتیٰ کہ آخری بہمنی سلطان کے "یا علی مدد یا علی مدد" پکارتے ہوئے وفات پانے سے (۴-۱۲-۹۲۴ھ) بہت پہلے ہی (ذی الحجہ نو سو آٹھ ہجری) بیجاپور کی جامع مسجد کے منبر سے "علی ولی اللہ" کا آوازہ بلند ہوگیا۔[۲]

---

[۱] بہمنی تاریخوں میں مذکور ہے کہ محمود اپنی بے بسی پر روتا اور بار بار کہتا تھا ؎

در بحرِ غم فتادم و امواج بے عدد   تا چند دست و پا زنم یا علی مدد

[۲] دکن میں جمعہ و عیدین کے خطبے "اشہدان علیاً ولی اللہ" سے شروع کرنا امامیہ مذہب کی سب سے زیادہ نمایاں علامت سمجھی جاتی تھی۔

ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں بیجاپور پہلا مقام ہے جہاں سے شیعیت کے سرکاری مذہب ہونے کا اعلان ہوا۔ اس کے دس سال بعد (نوسو اٹھارہ ہجری) گولکنڈہ نے بھی بیجاپور کی پیروی کی۔ احمد نگر قریباً پچیس سال تک پس و پیش کرتا رہا بالآخر وہ بھی اس صف میں شامل ہوگیا (نوسو چھیالیس ہجری) جب تو تینوں مقاموں پر مسلمان آبادی کی اکثریت نے شور و غل مچایا لیکن کشت و خون کی نوبت نہیں آئی اور رفتہ رفتہ سینوں اور شیعوں کا تعصب دور ہوا، جعفریوں، حنفیوں اور شافعیوں نے مثل شیر و شکر آپس میں مل جل کر بحث و تنازع کی بساط لپیٹ دی۔" اگرچہ عادل شاہی سلطنت کے بانی نے سب سے پہلے شیعیت کے سرکاری مذہب ہونے کا اعلان کیا تھا مگر اس کے مرتے کے بعد ہی کمال خاں متولی سلطنت نے شیعیت کے طریق و آئین یک قلم موقوف کر دئے۔ کمال خاں کے مارے جانے پر اسماعیل نے پھر اپنے باپ کے مذہب کو رائج کیا مگر اس کا لڑکا ابراہیم سریر آرا ہوا تو اس نے پھر سنیت کو سلطنت کا سرکاری مذہب قرار دیا، مگر ابراہیم اول کے بیٹے علی نے اپنے باپ کا مذہب ترک کرکے شیعیت اختیار کی اور بارہ اماموں کے نام کا خطبہ پڑھا۔ علی کے بعد ابراہیم ثانی اپنے باپ کے مذہب پر قائم رہا، مگر وہ شیعی رسوم و آئین کی پابندی اتنی کم کرتا تھا کہ کوئی اس کو شیعہ اور کوئی سنی سمجھتا تھا۔ اس کے جانشین محمد کے زمانے میں شیعہ رسوم و آئین بھی یہاں تک ختم ہوگئے تھے کہ علی ثانی کو اپنے باپ کے مذہب سے سوائے ایام عزا کی رسموں اور مرثیوں کے کوئی اور قابلِ لحاظ شیعی خصوصیت نہیں ملی۔ آخری حکمران تو "جز نام سلطانی و لقب عادل شاہی حظے دیگر نداشت۔" شاہی مذہب کی متواتر تبدیلی کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا نکل سکتا تھا کہ دونوں گروہوں کی مذہبی زندگی میں بھی عملاً کوئی نمایاں فرق باقی نہ رہے۔

عادل شاہی حکومت قریباً دوسو سال (۸۹۶ھ تا ۱۰۹۷ھ) اور قطب شاہی حکومت پونے دوسو سال رہی (۹۲۴ھ تا ۱۰۹۸ھ) عادل شاہیوں کی طرح قطب شاہی حکمرانوں کی تعداد بھی آٹھ سے زیادہ نہیں ہوئی۔ قطب شاہی حکمران شیعہ سنی جھگڑے میں نہیں پڑے بلکہ شروع سے آخر تک فی الجملہ شیعہ ہی رہے لیکن اپنے مذہبی رنگ کو کبھی بھی اتنا گہرا نہیں ہونے دیا کہ سنیوں کے رنگ سے بہت زیادہ ممتاز ہوکر رشک و رقابت کا باعث بنے اور شورش و بدامنی کی نوبت آجائے۔ احمد نگر کے جملہ حکمرانوں کی تعداد تیرہ ہے مگر ان کی مدت حکومت ایک سو ترپن یا ایک سو چھپن سال سے زیادہ نہیں ہوئی (۸۹۱ھ یا ۸۹۵ھ تا ۱۰۴۶ھ) اور وہاں بھی قریب قریب وہی صورت حال رہی جو گولکنڈہ میں تھی۔

عادل شاہوں، قطب شاہوں یا نظام شاہوں کے برخلاف برار کے چاروں عمادی حکمرانوں (۸۸۲ھ تا ۹۸۲ھ یا ۸۹۵ھ تا ۹۷۰ھ) اور بیدر کے آٹھوں بریدی امیروں نے (۹۳۴ھ تا ۱۰۲۸ھ) اپنا مذہب نہیں بدلا بلکہ سب کے سب شروع سے آخر تک سنی ہی رہے اور مذہب کو اپنے شیعی ہمسایہ حکومتوں سے مخالفت و منازعت کا سبب نہیں بنایا اور رواداری ہی پر عمل پیرا رہے۔ اسی طرح پورے خطۂ دکن میں مسلمانوں کے یہ دونوں فرقے بحیثیت مجموعی زندگی کے ہر منزل پر اور ہر شعبہ میں ایک دوسرے سے اتنے گھلے ملے رہے کہ ان میں مذہبی فرق و امتیاز صرف برائے نام رہ گیا۔

دکھنی مسلمانوں کی سیاسی اور خاص طور پر تمدنی و سماجی یا تہذیبی تاریخ کا بامعان نظر مطالعہ کرنے والے پر یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ اس معاشرہ کے نمایاں عوامل وہی تھے جن کو علم الاجتماع کی اصطلاحوں میں مصالحت و مخالفت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مصالحت کا مطلب ہے، زیادہ تر بقائے حیات مادی کے لئے کسی مختلف الادیان معاشرہ کے افراد کا ایک دوسرے کے دینی اقدار کا طوعاً و کرہاً اختیار کرنا جو ایک دوسرے سے متباین ہوں۔ مصالحت کے لئے بعض علماء خارجی رواداری کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں۔ (مخالفت کی وضاحت آگے آئے گی)۔

دکھنی معاشرہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا اختلاط بھی ہر حیثیت سے اتنا بڑھا کہ مسلمانوں نے اکثریتی گروہ کی تہذیب کے ایسے اقدار بھی اختیار کرلئے جن کا اسلامی اقدار سے ہم آہنگ ہونا قریباً ناممکن تھا کیوں کہ یہ سب کے سب یا بیشتر غیر اسلامی تھے اور اسلامی معاشرتی ڈھانچہ میں ان کی حیثیت اجنبی جسموں کی سی تھی۔ دکھنی اسلامی معاشرہ میں مصالحت کا اصول کیوں پیدا ہوا؟ اس پر کس طرح عمل ہوا؟ اور اس کا کیا نتیجہ نکلا؟ اور اسی طرح کے دوسرے مسئلوں کا ادب سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے یہاں اس کی توضیح و تشریح بھی ضروری نہیں۔ پیش نظر ادب پاروں کو کماحقہ سمجھنے کے لئے اتنا جاننا کافی ہے کہ دکھنی ادب میں مادی و تاریخی حقیقتوں کی بجائے یا ان کے ساتھ ساتھ وہمی خیال آرائی بلکہ تخیل زدگی اصلاً مصالحت پسندی کی وجہ سے داخل ہوئی جو سراسر ہندی اثرات کا نتیجہ ہے۔ فقہی مثنویوں کے سوا دوسری دکھنی مثنویوں میں آپ کو شاید ہی کوئی ایسی مثنوی ملے جس میں فطری وطبعی قوانین کے بجائے جگہ جگہ خرقِ عادت امور کا اظہار نہ ہوا ہو۔ شاعر کے تخیل پر واہمہ اتنا غالب رہتا ہے کہ اس کے بیان کردہ قصہ میں صرف عجوبگی یا غرابت ہی نہیں رہتی بلکہ وہ ایک معجزہ کی صورت اختیار کرلیتا ہے اور پھر یہ معجزہ محض معجزہ ہی نہیں رہتا بلکہ اسطورہ و خرافہ کی شکل میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ ان مثنویوں کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی پوری زندگی پر خود اس کے ارادہ و عمل سے کہیں زیادہ پریوں، جنوں اور فرشتوں کی حکمرانی ہے یا وہ خود ہی ایسے حیرت ناک کام انجام دیتا ہے جو صرف جنوں، بھوتوں اور پریوں ہی سے سر انجام ہو سکتے ہیں یا پھر وہ اتنا قادر و توانا ہے کہ ساری فوق الطبیعی مخلوق اس کے زیر فرمان ہے! جو گروہ کثیر دینی، مذہبی یا عام اخلاقی اقدار کو اچھا (خیر) مفید و جمیل ثابت یا ظاہر کرنے کے لئے واہمہ کو صنعتی و حرفتی دور میں بھی ناگزیر جانتا اور مانتا ہو، اس کی اعتقادی قوت تین سو سال پہلے جتنی شدید ہوگی اس کا اندازہ کرنے کے لئے ذہن پر زیادہ بار ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ ناممکن تھا کہ گروہ قلیل اس سے متاثر نہ ہو۔ یہ صرف متاثر ہی نہیں ہوا بلکہ کمی (عددی) قلت کے ساتھ ساتھ اپنی کیفی کمزوری (ضعفِ عقیدہ) کی وجہ سے بقائے حیات کے لئے اس کو مصالحت کرنے پر مجبور ہونا پڑا چنانچہ مصالحت ہوئی اور زندگی کے ہر شعبہ میں ہوئی۔ دکھنی ادب اسی زندگی کا آفریدہ تھا، اسی لئے اس ادب میں مقبول عام ہندوانہ وہم پسندی یا تخیل زدگی کا اثر بہت نمایاں ہے۔ اس اثر سے شاعر کی خصوصیت سے زیادہ اس کے معاشرہ کی خصوصیت ظاہر ہوتی ہے۔ شاعر کی خصوصیت وہاں نمایاں ہوتی ہے جہاں اسے انسانی احساسات و جذبات کی ترجمانی کا موقع ملا ہے۔

اس بحث میں اجتماعی نفسیات کا یہ کلیہ بھی نگاہ میں رہنا چاہئے کہ کثیر العناصر معاشرہ میں ہر فرقہ کی اکثریت اصول مصالحت سوچ سمجھ کر نہیں بلکہ غیر شعوری طور پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ البتہ اسی معاشرہ میں ایسے افراد اور گروہ بھی ہوتے ہیں جو بقائے باہم کے لئے تہذیبی ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے اصول مصالحت پر ان کا عمل شعوری طور پر ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس میں ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو اصول مصالحت کے قائل نہیں ہوتے بلکہ اپنے ماحول کو اپنے موافق بنانے یا کم از کم اپنی اجنبیت دور کرنے اور اپنے کو مانوس کرانے کے لئے اپنے مقابل گروہ کے ایسے تہذیبی عناصر بالارادہ اختیار کرتے ہیں جن کی خود ان کی تہذیب میں پہلے ہی سے کچھ نہ کچھ جگہ موجود ہوتی ہے۔ آیندہ صفحوں میں پیش ہونے والی یا اسی طرح کی دوسری مثنویوں کو اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ بعض مثنویوں کی تالیف و تنظیم میں دکنی معاشرہ کے ناخواندہ و نیم شائستہ افراد کو اسلام سے قریب کرنے یا اس سے مانوس کرنے کا خیال بھی رکھا گیا ہوگا۔

ہندوؤں کے پاستانی اسطوروں کی طرح دکنی اسطورہ بھی مقصدی... دینی، مذہبی یا اخلاقی ہوتا ہے اور اس کی غرض کسی عقیدہ کا پرچار اور اس ذریعہ سے عوام میں اچھے، مفید و حسین اخلاق کی پرورش ہوتی ہے: اس میں ایسے اشخاص کا سہارا لیا جاتا ہے جن کی حیثیت افسانوی، روایتی یا نیم تاریخی ہوتی ہے، ان کے متعلق جو کچھ بیان کیا جاتا ہے اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ اشخاص کے اوصاف و اعمال سب کے سب یا اکثر و بیشتر محض خیالی ہیں یا ماورائ الطبیعی۔ بایں ہمہ ان کے احساسات و جذبات بالکل ہم جیسے عام انسانوں ہی کے سے ہیں، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ دکنی شاعر کو جہاں جہاں احساسات و جذبات کی ترجمانی کا موقع ملا ہے وہاں یہ سب اشخاص واقعی و حقیقی انسان معلوم ہوتے ہیں۔ انسانی آرزوؤں، ارمانوں و امیدوں یا ناکامیوں، نامرادیوں و مایوسیوں کی جو فنکارانہ ترجمانی دکنی مثنوی نگاروں نے سیکڑوں سال پہلے کی تھی اس کی مثال زبان کی ترقی کے باوجود بعد کے بڑے بڑے شاعروں کے یہاں بھی بہ مشکل ہی مل سکے گی۔

بیجاپور و گولکنڈہ میں شیعیت کے سرکاری مذہب قرار پانے کا ذکر ہو چکا ہے۔ بیجاپور میں سرکاری مذہب کی متواتر تبدیلی اور گولکنڈہ و احمد نگر کی فرقہ وارانہ رواداری کی وجہ سے صرف حکومتی سطح ہی پر نہیں بلکہ معاشری و تہذیبی سطح پر بھی مسلمانوں کے دونوں فرقوں.. سنیوں اور شیعوں کے تعلقات ممکنہ حد تک خوشگوار رہے اور دونوں طرف سے زیادہ سے زیادہ رواداری کا اظہار ہوا کیونکہ برخلاف دوسرے اسلامی فرقوں کے ان دونوں میں سوائے مسئلہ خلافت یا امامت کے کسی دوسرے مسئلہ میں کوئی نمایاں یا گہرا اختلاف نہیں تھا اس لئے دونوں نسبتاً آسانی سے اتفاق و اتحاد پر راضی ہو گئے! اس اتحاد و اتفاق میں مندرجہ صدر تاریخی عامل کے علاوہ سنیوں اور شیعوں میں اصول مخالفت بھی کارفرما رہا۔ مخالفت کا مطلب یہ ہے کہ زیادہ تر بقائے معنوی (عقیدہ۔ اصول زندگی) کے لئے ایک ہی دین کے کثیر المذاہب معاشرہ کے افراد کا ایک دوسرے کے عناصر تمدن کو اختیار کرنا۔ اسی کو بعض وقت داخلی رواداری کہا جاتا ہے۔ دکنی مسلمانوں کی تاریخ پر گہری و وسیع نظر رکھنے والے بخوبی واقف ہیں کہ ان دونوں فرقوں کی مجموعی تعداد بھی غیر مسلموں کے مقابلہ میں بہت ہی قلیل تھی۔ مسلموں اور غیر مسلموں کا تناسب ایک [illegible]

قریباً ایک دو دس کا تھا۔ غیر معمولی عددی برتری رکھنے والے گروہ کے مقابلہ میں اقلیتی گروہ اپنی انفرادیت صرف کیفی (معنوی) قوت ہی کی بنا پر قائم و برقرار رکھ سکتا تھا اس لئے سنیوں اور شیعوں کے اہلِ فکر زیادہ سے زیادہ اور ممکنہ حد تک گہری مخالفت کی تبلیغ کرتے اور مسلمانوں کی صفت رحماء بینھم پر زور دیتے رہے۔ زندگی کے دوسرے انفرادی و اجتماعی شعبوں سے قطع نظر ادبی زندگی میں مخالفت اس طرح رونما ہوئی کہ مذہبی حکایتوں، قصوں اور داستانوں میں ایسے اشخاص و اقدار کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا گیا جن سے دونوں گروہ یکساں وابستہ تھے۔ چوتھے خلیفہ سیدنا علیؓ دونوں فرقوں کے امام مانے جاتے ہیں۔ آپؓ کی بیوی سیدہ فاطمہؓ کا ایک مقدس ہستی اور خاص طور پر مسلمان عورتوں کے لئے قابل تقلید اسوۂ و نمونہ ہونا کوئی اختلافی مسئلہ نہیں ہے اس لئے اکثر دکنی مثنویوں میں آپؓ کو مدح صحابہؓ رسول اللہ کے ساتھ ساتھ منقبت علیؓ، توصیف آل نبیؐ وغیرہ جیسے مستقل عنوان بھی ملیں گے اور جہاں جہاں کسی قصہ یا حکایت کے مرکزی کردار سیدنا علیؓ یا سیدہ فاطمہؓ ہیں وہاں بھی ابتدا میں خلفاء کی مدح عموماً نظر انداز نہیں کی جاتی اس لئے ایسے قصے مسلمانوں کے اکثریتی فرقہ کے مذہبی احساس پر کوئی ناگوار اثر نہیں ڈالتے۔

یہاں چند ایسی مثنویاں پیش کی جارہی ہیں جو مذکورہ صدر خصوصیت مصالحت و مفاہمت کی پوری پوری ترجمانی کرتی ہیں۔ علاوہ بریں ان سے دکھن کی تمدنی، تہذیبی و معاشری حالت بھی واضح ہوگی جو سیاسی تاریخوں سے بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ باعتبار زمانہ اس سلسلہ کی پہلی مثنوی مجبی کی اور دوسری فاروقی کی ہے ان کے بعد باعتبار موضوع و بہ ترتیب تاریخی امین کا قصیدہ، کمین کی مثنوی اور سیلان کا مخمس آئے گا۔ پھر ان مثنویوں کے موضوع سے قریبی تعلق رکھنے والی طالب کی مثنوی پر یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔

ان مثنویوں کا مطالعہ کرتے ہوئے اس واقعہ کو نہ بھولئے کہ — یہ انفرادی طور پر پڑھنے یا تنہا مطالعہ کرنے کے لئے تصنیف نہیں ہوئی ہیں بلکہ محفلوں میں سنانے اور مجلسوں میں پڑھنے کے لئے لکھی گئی ہیں۔ یہ صنعتی معاشرہ کی پیداوار نہیں ہیں جس کے پاس شاید سب سے بڑی قلت وقت ہی کی ہوتی ہے، یہ اس معاشرے کی پیداوار ہیں جس کے یہاں تفریح کے لئے میدانی کھیل ہیں نہ متحرک تصویریں۔ یہاں برقی روشنی نہیں ہے کہ رات میں بھی کارخانے چلتے رہیں اور برسات میں بھی تیز رو گاڑیاں رواں دواں رہیں۔ شمالی ہندوستان و ہند دکن میں مشاعروں کے رواج عام سے پہلے قریباً تین سو سال تک مثنوی کی سماعت مہذب و شائستہ لوگوں کی تفریح و تربیت کا مرغوب ذریعہ رہی ہے۔ ان مثنویوں پر مذہبی رنگ بھی اتنا زیادہ غالب نہیں ہوتا کہ ان کو سننے کے لئے ہر شخص کو با طہارت حاضر ہونا اور ادب سے بیٹھنا ناگزیر ہو۔ شرکت سماعت کے لئے عزا مذہب اور بعض اوقات تو جنس کی بھی کوئی قید نہیں ہوتی۔ محرم اور ایام عزا کے سوا دوسرے دنوں میں یہ محفلیں عموماً عاشور خانوں میں منعقد ہوتی تھیں جو قریباً ہر اس قصبہ میں موجود تھے جہاں کی خانہ شماری ہزار ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ ہو۔ صاحبِ ثروت لوگوں کے یہاں تو سال کے چند دن اسی غرض کے لئے مخصوص ہوتے تھے جن میں مثنوی خوانی ہوتی اور

اس میں شرکت عام تھی۔ بعض ایسی محفلیں بھی منعقد ہوتی تھیں جن میں ایک ہی مثنوی نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی کئی مثنویاں سنائی جاتی تھیں۔ ان محفلوں کی حیثیت مثنوی نگاروں یا مثنوی خوانوں کے میدان مسابقہ و مقابلہ کی سی ہو جاتی تھی، چنانچہ اسی لئے بعد میں ایسی محفلوں کو دنگل ہی کہا جانے لگا، دکھنی میں اس لفظ کے یہ معنی آج بھی معلوم و معروف ہیں، البتہ اس کا اطلاق زیادہ تر منقبت بازی کی محفل پر کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی بعض مشہور محفلوں میں شرکت کے لئے شوقین سامعین دور دور سے آیا کرتے تھے۔ دکھن کے بعض بعض علاقوں میں آج سے قریباً بیس بائیس سال پہلے تک بھی، زیادہ تر بزرگوں کے عرسوں کے موقع پر ایسی محفلیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ مثنوی سنانے والے عموماً پیشہ ور خاندانی گداگر یا کسی "سید صاحب" کی درگاہ کے مجاور ہوتے تھے۔ دکھنیوں کی ادبی تاریخ کا یہ واقعہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان محفلوں میں اکثر وہی مثنویاں سنائی جاتی تھیں جو اب ڈھونڈ ڈھونڈ کر پرانی بیاضوں سے نقل کی جا رہی ہیں البتہ تحریری اور زبانی سنائی جانے والی مثنویوں کی زبان، بیان، تالیف، و ترتیب میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہو گیا ہے۔ مثنوی سنانے والے کے ضعفِ حافظہ و موزوں بالطبع نہ ہونے کی وجہ سے ایسا ہونا ناگزیر تھا۔

معجزۂ فاطمہؑ۔ از مجبی

مجبی نے اس مثنوی میں جس ترتیب سے جو کچھ بیان کیا ہے اسی ترتیب سے اس کا خاکہ کچھ اس طرح ہوگا۔

حمد: پندرہ ابیات

الٰہی تو صاحب بکت کا دھنی   تجھے ساجتی کبریا دھنی
ترے علم توحید کا ابتدا   نہ کوئی پائے ناپائیں گے انتہا
بھلا ہے کروں عجز سے اختصار   مناجات یاں سے کروں آشکار۔

مناجات: پندرہ

الٰہی نکو کر مرا گھر سقر   ترحم سوں کر مجھ سرگ میں مقر
جو مرحوم میرے ہیں مادر پدر   گنہ بخش ان کو دے جنت میں گھر
انو پرورش مجھ کئے لئی وضا   خدایا تو دے ان کو اس کا جزا
جو ہے بھائی استاد میرے گنجعیر   ہوئے لئی وضا سوں مجھے دستگیر
خدایا تو کر عمر ان کا دراز   ہور اپنے کرم سات کر سرفراز

مناجات کو یاں تے کر اختتام
کر آغاز نعتِ علیہ السلام

. . . . . .

نعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : چودہ ابیات

تیرا نعت ہے بہتوں کناہے کال کیا نعت تیرا مری قدرحال
کروں یاں تے معراج کا میں بیاں جو کچھ تجھ تے مجھ پر ہوا ہے عیاں

ذکر معراج : پندرہ

نبیؐ من سوں حق تے سدر لامکاں پھر آئے مکاں اپنے لے نعمتاں

منقبت : پندرہ

علیؓ ولی شاہ دلدل سوار کیا کفر کو قتل لے ذوالفقار

منقبت سے پہلے یا بعد مدح صحابہؓ کے نہ ہونے سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ مجی مذہب امامیہ کا متبع تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو بندہ نوازؒ کی مدح نہ ہوتی جو یقیناً سنی حنفی تھے۔ مجی کے مرشد کا سنی ہونا بھی کوئی اختلافی واقعہ نہیں ہے اس لئے ہم زیادہ سے زیادہ صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ مجی شاید تفضیلی سنی ہو۔

مدح بندہ نوازؒ : پندرہ

خلف جو ترا شاہ اکبر اہے سو وہ ہادی دین و رہبر اہے
جو ملک عدم تے وہ اہل صفا منگیا نقل کرنے یہ ملک بقا
سو اس حال میں شاہ در حال دیں کیا جانشیں شاہ راجو کے تیں

شاہ راجوؒ متوفی ۱۰۹۲ یا ۱۰۹۶ ہجری سے مراد وہی ہیں جن کا سلسلۂ نسب یہ ہے : شاہ راجو حسینیؒ ثانی (م ۱۰۹۲ یا ۱۰۹۶ھ) بن صفی اللہ بن شاہ راجو حسینی بن اسد اللہ حسینی بن عسکر اللہ بن سفیر اللہ (م ۲۸-۱۱-۸۳۵ھ) بن محمد اکبر حسینی (م ۱۶-۴-۸۱۲ھ) بن بندہ نوازؒ (م ۱۶-۱۱-۸۲۵ھ)۔

"کیا جانشیں شاہ راجو کے تیں" کا مطلب غالباً یہ ہے کہ بندہ نوازؒ نے اپنے لڑکے محمد اکبر حسینیؒ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے (اور اپنے پوتے) سفیر اللہ کو اپنا جانشین و خلیفہ بنایا نہ کہ اپنے دوسرے لڑکے محمد اصغر حسینیؒ کو (م ۸۴۸ھ) مجی نے درمیانی سلسلے حذف کر دیئے ہیں اس کو صرف یہ بتانا تھا کہ راجو ثانی، بندہ نوازؒ کے بڑے بیٹے کی اولاد سے ہیں جن کو غالباً انھیں سے بیعت تھی۔ پھر کہتا ہے، شاہ راجوؒ کی درگاہ سے روزانہ جو لنگر تقسیم ہوتا ہے اس سے مجھے بھی کچھ ملتا ہے :

جو اس کا ہے روضہ بہشت بریں مرغی ہے وہاں روز روتی نفیس
وہ روزی سوں پایا ہوں یوں میں دعا خزاں جا کو جوں باغ پایا بہار

کہاں شاہ کا مدح مجھ سوں سرے
صفت شاہزادوں کی بولوں بہے

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجراء ۱۹۳۸ء — فون نمبر ۳۵۲۰۹

جلد ۲۹ — شمارہ ۲ — فبروری ۱۹۶۶ء

(ماہنامہ)

سب رس

(حیدرآباد دکن)

نگران :-

پروفیسر عبدالمجید صدیقی

مجلس مشاورت :-

۱۔ میر حسن

۲۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

۳۔ رمن راج سکسینہ

معتمد :-

محمد اکبرالدین صدیقی

زر سالانہ ہند و پاک سے .... چھ روپے

" ششماہی .... تین روپے

" غیر ممالک سے .... دس روپے

" فی پرچہ .... پچاس پیسے

مہتمم ادارۂ ادبیات اردو کے اہتمام سے نیشنل پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

ترتیب

....

اپنی بات

ادارۂ ادبیات اردو سال میں دو دفعہ امتحانات اردو دانی۔ زبان دانی۔ اردو عالم اور اردو فاضل منعقد کرتا ہے چنانچہ دسمبر ۱۹۶۵ء میں یہ امتحانات مختلف مراکز پر منعقد ہوئے۔ آندھرا پردیش کے مراکز کے علاوہ ایک مرکز اترپردیش میں جائس بھی تھا جو پدماوت کے مصنف ملک محمد جائسی کا وطن ہے اور جہاں کے مصنفین اور شعرائے کرام نے کافی ناموری حاصل کی ہے۔ مولانا مہر جائسی اب تک بھی اردو کی خدمت کئے جا رہے ہیں اور انھیں کی کوششوں سے یہ مرکز قائم ہوا۔ نتائج تقریباً تیار ہیں۔ مراکز کی روداد اور نتائج آئندہ نمبر میں پیش ہوں گے۔

جنوری سے نیا سال شروع ہوا اور روز اول ہی سے ہمیں بڑے بڑے ادیبوں، شعرا اور سیاست دانوں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہونا پڑا۔ یکم جنوری کو محترمہ جہاں بانو نقوی جو "ج" نقوی کے نام سے شہرت حاصل کر چکی تھیں انتقال کر گئیں۔ مرحومہ نے ادارہ ادبیات اردو کے کاروبار میں ابتدائی دور ہی سے ادارہ کے بانی ڈاکٹر زورؔ کا ہاتھ بٹایا۔ کتابیں لکھیں، لکھوائیں اور زنانہ کالج عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر کی حیثیت سے طالبات میں اردو ادب کا اچھا ذوق پیدا کیا۔ آج جو چند خواتین ادب میں نمایاں مقام کی حامل ہیں یہ انھیں کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ خدا مرحومہ کو غریق رحمت فرمائے۔

۶ جنوری کو جناب تلوک چند محروم کے اٹھ جانے کی اطلاع ملی۔ جناب محروم نے مشاعرۂ یوم محمد قلی میں شرکت فرما کر اہل حیدرآباد کو اپنے کلام سے نوازا تھا آج بھی وہ صدائیں کانوں میں گونج رہی ہیں۔ محروم کی خدمات سے بالواسطہ تو بہتوں نے فایدہ اٹھایا لیکن انکی نظموں نے جو درسی کتابوں میں شامل ہوتی رہی ہیں بلاواسطہ سب ہی اردو خوانوں کو فیض پہنچایا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے کلام کی بدولت ادب میں امر رہیں گے بلکہ اس لئے بھی کہ ان کے صاحبزادے جناب جگن ناتھ آزاد نے بھی اپنے شعر اور اشعار ہر دو سے اردو خوانوں کا دل موہ لیا ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو نے پروفیسر سید محمد کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ کیا جس میں محروم کی شاعری پر جناب ضیاء الدین شکیب اور ڈاکٹر سیدہ جعفر نے روشنی ڈالی۔ جناب صدر نے سیر حاصل تبصرہ کیا اور تعزیتی قرارداد منظور کی۔

مسٹر وی۔ پی مینن یکم جنوری کو رحلت کر گئے جن کا کارنامہ دیسی ریاستوں کے انضمام کی تنظیم تھا، ۵/ جنوری کو بین الاقوامی شخصیت جنرل نمو نے انتقال کیا جو امن کے لئے انتہائی اہم فریضہ انجام دے رہے تھے۔ اسی دن احمد محی الدین صاحب نائب وزیر شہری ہوابازی نے انتقال کیا۔ یہ ۱۹۵۸ء سے نائب وزیر اور ۱۹۶۲ء سے ٹرانسپورٹ کے بھی نائب وزیر تھے۔ حیدرآباد میں احمد محی الدین صاحب کی خدمات کا ریکارڈ بہت شاندار رہا ہے۔ وہ ادارہ ادبیات اردو سے بھی بہت قریب تھے۔ ڈاکٹر زورؔ مرحوم کے بہت عزیز دوستوں میں ان کا شمار تھا۔

۱۱ جنوری انتہائی المناک دن ثابت ہوا۔ ہمارے ہر دلعزیز وزیر اعظم لال بہادر شاستری روس کے وزیر اعظم مسٹر کوسیگن کی دعوت پر ان کی موجودگی میں صدر پاکستان سے امن کے مسائل پر بات چیت کرنے کے لئے تاشقند گئے اور ایک ہفتہ تک قیام کر کے سارے مسائل سے نمٹ کر تاشقند اعلان نامہ پر دستخط کئے اور ابھی اس کی سیاہی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ رات میں ان کی حرکت قلب بند ہو گئی۔ انھوں نے مسٹر چوان وزیر دفاع سے کہا کہ "جس طرح ہم نے مدافعت کرتے ہوئے جنگ جیتی ہے اسی طرح ہم قیام امن میں کامیاب ہوں گے۔" انھیں موت نے مہلت نہ دی لیکن ان کی جانشین مسز اندرا گاندھی نے تاشقند معاہدہ کو عملی جامہ پہنانے کا عہد کیا ہے۔

ڈاکٹر نیر مسعود

حیاتِ مرزا رجب علی بیگ سرور

مرزا رجب علی بیگ سرور نے بڑی رنگا رنگ زندگی گزاری۔ انھوں نے طویل عمر پائی تھی۔ اس طویل عمر میں انھوں نے خوب خوب نشیب و فراز دیکھے۔ ان پر اچھے اور برے سب ہی وقت پڑے۔ انھوں نے خود اپنی زندگی اور اپنے گرد و پیش کے حالات میں نئے نئے انقلابات آتے دیکھے۔ انھیں بادشاہوں سے لے کر عامیوں تک سے صحبت رہتی تھی۔ انھوں نے دور دراز کے سفر کئے اور ان سے تجربے حاصل کئے۔ ان پر قتل کا الزام بھی لگا، اور شاہی الطاف و اکرام کی بارش بھی ہوئی۔ ایسے شخص کی داستانِ حیات کے دلچسپ ہونے میں کیا شبہ، لیکن افسوس کہ سرور کی کتابِ زندگی کے بہت سے اوراق بیچ بیچ سے غائب ہیں جس کی وجہ سے ہم ان کی داستانِ حیات کے بہت سے اجزا سے محض بے خبر ہیں، اور بہت سے اجزا ایسے ہیں جن کے متعلق صرف چند مثالیں ملتی ہیں۔ اس طرح یہ دلچسپ داستان بے ربط ہو کر اپنا بہت کچھ لطف کھو بیٹھی۔

سرور کے بیشتر حالاتِ زندگی ہمیں آپ بیتی کی صورت میں ملتے ہیں۔ ان کے متعلق معلومات کا سب سے بڑا ذریعہ ان کے لکھے ہوئے خطوط ہیں۔ ان خطوط کے علاوہ سرور کی لکھی ہوئی کتابوں کے سببِ تالیف اور خاتمے اور سرور کے بعض اشعار بھی سرور کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کرتے ہیں۔ سرور، شاعر بھی تھے، اس لئے ان کو بہت سے تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکروں میں جگہ دی، لیکن ان تذکروں میں سرور کا ذکر بہت رسمی ہے اور کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں۔

فراہم شدہ معلومات کی بنا پر سرور کی زندگی چار ادوار میں تقسیم کی جا سکتی ہے:—

دورِ اول

پیدائش سے فسانۂ عجائب کی تالیف تک

۱۲۰۰ ہجری تا ۱۲۴۰ ہجری

سالِ پیدائش:— سرور کا سالِ پیدائش معلوم کرنے کا صرف ایک قرینہ "فسانۂ عجائب" کے دیباچے کا یہ فقرہ ہے:—

"چالیس سال جہان کی دیکھ بھال کی، ایسا شہر یہ لوگ نظر سے نہ گزرے۔"

اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیباچے کی تحریر کے وقت سرور کی عمر چالیس سال تھی۔ دیباچہ خود مختلف اوقات میں لکھا گیا ہے مگر

اس کا صحیح بالا مقام پر بظاہر ۱۲۴۰ھ میں لکھا گیا[1]، اس لئے قدرے کمزور آواز میں کہا جا سکتا ہے کہ سرور ۱۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ البتہ ایک بات سے اس قرینے کی کچھ مضبوطی ہوتی ہے، وہ یہ کہ مطبع محمدی کانپور سے شائع ہونے والے "فسانۂ عجائب" کے جس ایڈیشن میں سرور نے [illegible] ہے اس کے دیباچے میں بھی اضافے کرکے اس کے بعض حصوں کو زمانۂ ترمیم کے مطابق کر دیا ہے[2]، اس ترمیم میں دیباچے میں سے سرور نے "چالیس سال . . ." والا فقرہ نکال دیا ہے۔

والد:— سرور کے والد کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا۔ محسن لکھنوی نے آپ کا نام مرزا اصغر علی لکھا ہے[3] لیکن یہ غالباً کتابت کی غلطی ہے۔ محسن کے سوا باقی تذکرہ نگار مرزا اصغر علی بیگ پر متفق ہیں۔[4] سرور کے والد کے نام کے سوا ان کے متعلق اور کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ البتہ بعض تذکروں سے اتنا ثابت ہے کہ وہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ مرزا اصغر علی بیگ سرور کے سن رشد کو پہنچنے تک زندہ تھے۔ سرور ایک خط میں اپنے چھوٹے بھائی کو "اپنی گود کا پلا"[5] لکھتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ سرور سیانے ہو چکے تھے، جب مرزا اصغر علی بیگ کے یہاں ایک اور اولاد پیدا ہوئی۔

وطن:— سرور خود "فسانۂ عجائب" کے دیباچے میں اپنے کو لکھنؤ کا متوطن بتاتے ہیں[6]۔ علاوہ بریں وہ جس طرح لکھنؤ کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں، اس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا وطن لکھنؤ تھا۔ سرور کے معاصر تذکرہ نگار بھی ان کو لکھنوی ہی لکھتے ہیں۔ گارساں دتاسی نے اپنے ایک خطبے میں انھیں کانپوری بتایا ہے[7]۔ سرور کا قیام کانپور میں رہا کرتا تھا

۱؎ دیکھئے باب سوم "فسانۂ عجائب" کے دیباچے کی بحث ۲؎ مثلاً نصیر الدین حیدر اور قدسیہ محل کا ذکر پہلے صیغۂ حال میں تھا۔ اب اسے ماضی کر دیا۔ "تجربہ کاروں کا قول تھا کہ ان کے بعد یہ شہر ویران اور تباہ ہو گیا۔ نہ ہمت کی بیگم ہوگی، نہ اس حوصلے کا بادشاہ ہوگا۔" ۳؎ تذکرہ "سراپا سخن"۔ میر محسن علی محسن لکھنوی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۶۱ء ۴؎ دیکھئے تذکرہ "سخن شعرا"۔ عبد الغفور خاں نساخ۔ مطبع نول کشور ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۲ء صفحہ ۱۱۳ اور تذکرہ "کلیم طور"۔ سید نور الحسن کلیم۔ مطبع مفید عام آگرہ صفحہ ۵

۵؎ "انشائے اردو"۔ سرور کا ساتواں رقعہ ("انشائے اردو" متفرق خطوط کا مجموعہ ہے جو مولوی ضیاء الدین خاں پروفیسر دلی کالج نے وائسرائے ہند کے ایما پر افسران فوج کے امتحان کے لئے مرتب کیا تھا۔ اس میں سرور کے آٹھ اہم خطوط شامل ہیں جن میں سے کوئی سرور کے مجموعۂ خطوط "انشائے سرور" میں موجود نہیں ہے۔ "انشائے اردو" کا پیش نظر ایڈیشن ۱۸۷۲ء میں مطبع سرکاری لاہور میں چھپا۔ اس کی کتابت خط شکستہ میں کی گئی ہے) ۶؎ مطبع نول کشور کے ایڈیشنوں میں اس جگہ پر "متوطن خطۂ بے نظیر" کے بدلے "متوطن حال خطۂ بے نظیر" ملتا ہے۔ حالؔ کے لفظ سے خیال ہوتا ہے کہ سرور کی پیدائش کہیں اور ہوئی تھی لیکن "فسانۂ عجائب" کے اس سے قبل والے ایڈیشن جو ہماری نظر سے گزرے ہیں، ان میں اور افضل المطابع کے ۱۲۷۶ھ والے ایڈیشن میں بھی جس پر سرور نے نظر ثانی کی تھی، حالؔ کا لفظ نہیں ملتا ۷؎ "خطبات گارساں دتاسی" (اردو ترجمہ) ناشر انجمن ترقی اردو حیدرآباد دکن — پانچواں خطبہ ۱۵۹

اور انھوں نے "فسانۂ عجائب" کانپور ہی میں لکھی ممکن ہے کہ ان وجوہ سے دتاسی کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ ان کا وطن کانپور تھا، ورنہ سرور نے جن الفاظ میں کانپور کا ذکر کیا ہے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سرور کا وطن کانپور نہیں تھا۔ سرور کے وطن کے بارے میں مخمور اکبر آبادی لکھتے ہیں :-

"سرور کی تصانیف میں اس قسم کی شہادت موجود ہے کہ وہ لکھنؤ کے باشندے نہیں تھے اس لئے ظاہر ہے کہ ان کا آبائی وطن اکبر آباد تھا۔"[1]

سرور کی تصانیف میں ان کے لکھنؤ کا باشندہ نہ ہونے کی شہادت نہیں ملتی، اور بالفرض یہ طے بھی ہو جائے کہ وہ لکھنؤ کے باشندے نہیں تھے تو یہ بات اس کی دلیل نہیں بن سکتی کہ ان کا آبائی وطن اکبر آباد تھا۔ جب اکبر آباد کے بارے میں کوئی واضح بیان نہ ملے تو کیونکر سرور کا آبائی وطن کہا جا سکتا ہے۔ مخمور اکبر آبادی نے اپنے بیان کی تائید میں کوئی داخلی یا خارجی ثبوت نہیں پیش کیا ہے۔ ان کا یہ بیان نشتر کے اس بیان کی بازگشت ہے :-

"مرزا رجب علی بیگ سرور اکبر آباد میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پایا۔ تاثیر بے ہمتا بننے کے بعد لکھنؤ میں آئے۔"[2]

اس بیان کی بنیاد کا پتہ نہیں چلتا۔ سرور کو "تاثیر بے ہمتا" ان کی پہلی نثری تالیف "فسانۂ عجائب" نے بنایا۔ "فسانۂ عجائب" انھوں نے اکبر آباد میں نہیں بلکہ لکھنؤ سے کانپور جا کر لکھی، اس لئے نشتر کا یہ بیان تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اکبر آباد سے "تاثیر بے ہمتا" بننے کے بعد لکھنؤ آئے۔ "فسانۂ عجائب" کے دیباچے میں سرور کا اعتراف کے بعد اور جس محبت سے وہ لکھنؤ کا ذکر کرتے ہیں اور اس کو تمام شہروں پر فوقیت دیتے ہیں، اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کا وطن لکھنؤ تھا۔

تعلیم و تربیت :- "شگوفۂ محبت" کے دیباچے میں سرور لکھتے ہیں :-

"نامساعدِ بخت اور نیرنگیٔ زمانہ سے نہ عربی میں دخل ہوا، نہ فارسی میں کامل ہوا۔ دونوں سے نا آشنا رہا۔ ایک کا بھی علم نہ حاصل ہوا۔ پست ہمتی سے اردو کے لکھنے میں اوقات بسر کی ... کچھ دن نظم کا اہتمام رہا، شعر کہنے کا خیال خام رہا۔ جب وہ بھی نہ ہو سکا نثر کی طرف خیال آیا ... "الخ[3]

اس بیان میں سرور نے اپنی تعلیمی اور ادبی زندگی کا مختصر خاکہ کھینچا ہے۔ عربی و فارسی کی تعلیم اس عہد میں شرفا کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ سرور کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی سے بخوبی اور کم سے کم کام چلانے بھر عربی سے واقف تھے۔ انھوں نے

---

[1] "فسانۂ عجائب" مرتبہ مخمور اکبر آبادی۔ ناشر رام نرائن لال، الہ آباد ۱۹۲۸ء۔ دیباچہ مرتب ص۳۔
[2] بحوالہ مضمون "اردو کی شستگی اور نفاست میں آگرہ کا حصہ" از لطیف الدین احمد اکبر آبادی۔ رسالہ "ہندوستانی" الہ آباد جنوری ۱۹۳۴ء (مضمون نگار کے بیان کے مطابق یہ نشتر کے کسی مضمون کا اقتباس ہے جو رسالہ "نقاد" مئی ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا ہو)
[3] "شگوفۂ محبت" مطبع محمدی، لکھنؤ ۱۲۷۳ھ۔

فارسی شاعری کا کافی مطالعہ کیا، اساتذۂ فارسی کے ممتاز شاعروں کا کلام ان کی نظر سے گزر چکا تھا۔ فارسی کے جو انشا پرداز ہندوستان میں مقبول تھے ان کو سرور نے غور سے پڑھا تھا، اور وہ ان سے متاثر بھی تھے، اور یہی سبب تھا کہ انھوں نے اپنے لئے اردو نثر کا رنگین اسلوب پسند کیا۔ سرور کے عہد میں اگرچہ بڑی حد تک اردو، فارسی پر حاوی آگئی تھی، تاہم اس وقت پڑھا لکھا کہلانے کے لئے فارسی ادبیات سے واقفیت نہایت ضروری تھی۔ اب سرور نے بھی یہ واقفیت بہم پہنچائی تھی، اگر فارسی لکھنا سرور کو نہ آسکا۔ "انشائے سرور" میں اُن کے جو فارسی خط شامل ہیں وہ عجب بے کسانہ انداز تحریر کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ان کی عبارت کے الفاظ و مصادر گو فارسی ہیں، لیکن حقیقتاً اس کو فارسی میں لکھی ہوئی اردو کہا جا سکتا ہے۔ عربی میں سرور کی لیاقت معمولی تھی، اس زبان میں ان کی تعلیم غالباً کلام پاک کے رسمی مطالعہ اور چند ابتدائی درسی کتابوں تک محدود تھی، اور وہ عربی کی سیدھی عبارت کا مطلب سمجھنے میں بھی غلطی کر سکتے تھے۔ مثلاً ایک جگہ انھوں نے قرآن مجید کی یہ آیت لکھی ہے:—

اذا جاء اجلهم لا يستأخرون ساعة ولا يستقدمون [۱]

اور "اجلهم" کا ترجمہ "ان کی اجل" کے بجائے "تمہاری اجل" کیا ہے۔[۲]

اردو ادب:— اردو زبان اور ادب میں سرور نے قرار واقعی دستگاہ بہم پہنچائی تھی، ان کا مطالعہ وسیع تھا، جس کا اندازہ ان تصنیفوں میں درج شدہ اشعار و منظومات سے ہوتا ہے۔ سرور خود بھی شاعر تھے اس لئے انھوں نے استفادے کی غرض سے بھی اردو شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہوگا۔ شاعری کے علاوہ سرور کو داستانوں اور افسانوی ادب سے خاص دلچسپی تھی، "فسانۂ عجائب" کے لئے انھوں نے جو داستان ترتیب دی وہ خود اس کا ثبوت ہے کہ اس عہد کی تقریباً تمام رائج الوقت داستانیں ان کی نظر سے گزر چکی تھیں۔

دوسرے علوم و فنون:— سرور نے شعر و ادب کے علاوہ کئی اور علوم کی تحصیل بھی کی تھی۔ تذکرہ نویس خوش نویسی اور موسیقی میں بھی سرور کے دخل کا ذکر کرتے ہیں۔[۳]

سرور نے اپنے فرزند متبنیٰ مرزا احمد علی کو جو خطوط لکھے ہیں، ان میں کئی جگہ خطاطی کی مشق کی تاکید کی ہے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ حبیب گنج میں سرور کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ موجود ہے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ اس فن میں انھیں

---

[۱] قرآن مجید کے ساتویں سورہ الاعراف کی چونتیسویں[۳۴] آیت۔ [۲] "انشائے سرور"۔ رقعہ ۷۹۔

[۳] دیکھئے "طبقات شعرائے ہند": ایف فیلن اور کریم الدین۔ مطبع العلوم مدرسۂ دہلی ۱۸۴۸ء ص ۴۳۹۔

اور "گلشن بے خار": مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء۔ ص ۹۷۔

اور "بزم سخن": ابو النصر سید علی حسن خاں بہادر سلیم۔ مطبع مفید عام آگرہ۔ ص ۵۹۔

اور "خمخانۂ جاوید": لالہ سری رام، جلد چہارم۔ ہمدرد پریس۔ دہلی ۱۹۳۶ء۔

حافظ ابراہیم کا شاگرد بتاتے ہیں[۱]۔

سرور کی تصانیف میں علم نجوم کی اصطلاحیں جس انداز سے ملتی ہیں ان سے خیال ہوتا ہے کہ انھیں اس علم میں بھی کچھ دخل تھا۔ سرور نے غالباً فنِ داستان گوئی کو بھی حاصل کیا تھا، اس خیال کو یہ واقعہ تقویت دیتا ہے کہ "فسانۂ عجائب" کی داستان پہلے انھوں نے دوستوں کی محفل میں ایک دوست کی فرمائش پر زبانی سنائی تھی۔ اس کے علاوہ سید فخرالدین حسین سخن دہلوی نے "فسانۂ عجائب" کے جواب میں جو کتاب "سروش سخن" لکھی ہے اس کے دیباچے میں سرور پر تعریض کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے :۔

"یوں تو کہنے کو بہت سے داستان گو دہلی اور لکھنؤ میں مارے مارے پھرتے ہیں، وہ بھی چاہیں تو فسانہ لکھ ڈالیں"[۲]

یہ فقرے بھی سرور کے داستان گو ہونے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

سپہ گری :۔ سرور کے عہد میں فنِ سپہ گری کو بھی عام رواج حاصل تھا۔ ہتھیار لباس کے جز کی حیثیت رکھتے تھے اور گھر سے باہر نکلنے کے لئے ہتھیار باندھنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ بچوں کو ابتدائی تعلیم و تربیت میں درسیات پڑھانے کے ساتھ اسلحہ کا استعمال بھی سکھایا جاتا تھا۔ سرور نے بھی اس فن کو حاصل کیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"ہم بھی کبھی ڈھال تلوار باندھتے تھے اور وہ کام کرتے تھے جس میں صد ہا مرتے تھے، ہاتھ منہ کٹتے تھے، بڑھے ہوؤں کے دل بیٹھتے تھے"[۳]

سرور کے ان فقروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض نمائش کے لئے ہتھیار نہیں باندھتے تھے بلکہ ایک جنگجو انسان کی طرح ان کا استعمال بھی کرتے تھے۔

سرور کے ایامِ شباب :۔ سرور نے آصف الدولہ کے عہد میں آنکھ کھولی۔ اس وقت لکھنؤ اودھ کا تازہ دارالسلطنت تھا، اور تیزی کے ساتھ عروج کی منزلوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سرور کا شعور پیدا ہوتے ہوتے لکھنؤ باکمالوں کی بستی بن چکا تھا۔ سعادت علی خاں کے زمانے میں سرور نے بچپن سے بڑھ کر جوانی میں قدم رکھا، اور غالباً اسی عہد میں انھوں نے شاعری شروع کی[۴]۔ شاعری میں ان کے استاد آغا نوازش حسین خاں عرف مرزا خانی نوازش شاگردِ میر سوز تھے[۵]۔

---

[۱] "تاریخ ادب اردو" ڈاکٹر رام بابو سکسینہ۔ ترجمہ مرزا عسکری، مطبع نول کشور، لکھنؤ، حصۂ نثر صفحہ ۳۱۔ [۲] "سروش سخن" سید فخرالدین حسین سخن دہلوی۔ مطبع نول کشور، کانپور ۱۲۹۱ھ صفحہ ۵۔ [۳] "انشائے سرور" رقعہ ۴۹۔ [۴] خواجہ عشرت کا یہ قول قابلِ اعتنا نہیں ہے کہ سرور کی شاعری کی ابتدا نصیر الدین حیدر کے زمانے سے ہوئی، اس وقت ان کی عمر پندرہ سولہ برس کی تھی۔ (آبِ بقا صفحہ ۹۱) عہد نصیر الدین حیدر سے پہلے غازی الدین حیدر کے زمانے میں تو وہ اپنی شاعری سے غیر مطمئن ہو کر نثر نگاری کی طرف مائل ہو چکے تھے، اسی طرح سرور کی عمر کا بھی خواجہ عشرت کا اندازہ غلط ہے۔ [۵] دالاعظم ... سے

سرور کے شباب کا زمانہ ان کے عیش و آرام اور خوش اقبالی کا زمانہ تھا۔ چنانچہ عمر کی آخری منزلوں میں لکھے جانے والے ایک خط میں سرور اپنی بے کسی، تنہائی اور عوارض کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: —

"جوانی اس طرح گزری، بڑھاپے میں یہ مصیبت دیکھنی پڑی۔"[۱]

شادی: — سعادت علی خاں کے زمانے میں ۱۲۲۶ھ (۱۲–۱۸۱۱ء) میں سرور نے اپنے نام کی مہر بنوائی۔[۲] ۱۲۲۸ھ میں یا اس کے آس پاس سرور کی شادی ہوئی۔[۳] ان کی اہلیہ کسی دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں، وہ سرور کی بہت وفادار اور چاہنے والی بیوی تھیں۔[۴] سرور انھیں "عاشقِ وفادار" اور "دوستِ صادق"[۵] لکھتے ہیں۔ سرور نے بیوی کی دولت کے بل بوتے پر خاصے عیش کئے۔[۶] انھوں نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان کی بیوی نے ان کو لاکھوں روپے نقد دیا، اور سرور نے ان کی بدولت "جہاں کا چین" کیا۔ اور انھیں کی ہستی تھی سرور کو جس کی بدولت کوئی حسرت، کسی طرح کے سازو سامان کا ارمان نہ رہا تھا۔[۷] مگر خود سرور کا رویہ اپنی بیوی کے ساتھ غیر منصفانہ تھا جس کو وہ ساری عمر خاموشی کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷) ۵ مولوی محمد مبین کیفی چریا کوٹی "جواہرِ سخن" میں سرور کو ناسخ کا شاگرد بتا کر لکھتے ہیں: "نساخ نے "سخنِ شعرا" میں اس انداز سے لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نوازش کے شاگرد تھے، حالانکہ یہ صحیح نہیں۔" (صفحہ ۴۹۱) مولوی محمد مبین کا یہ خیال کہ سرور ناسخ کے شاگرد تھے کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ "سخنِ شعرا" سے پہلے کے وہ تذکرے جو سرور کی زندگی میں لکھے گئے، مثلاً "طبقاتِ شعرائے ہند"، "گلشنِ بے خار"، "سراپا سخن"، "دیوانِ غریب"، "خوش معرکۂ زیبا" ان میں اور خود "فسانۂ عجائب" اور سرور کے خطوں میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ وہ نوازش کے شاگرد تھے۔ "فسانۂ عجائب" میں نوازش کے اشعار درج کرنے سے پہلے سرور لفظ "استاد" ضرور لکھتے ہیں۔

۱ "انشائے سرور": رقعہ ۹۷۔ ۲ اس مہر کی نقل "فسانۂ عجائب" کے اس ایڈیشن میں دی گئی ہے جو ۱۲۹۷ھ میں عبدالرحمٰن خاں نے سلطان المطابع کے حسب الحکم کارخانۂ علی بخش خاں لکھنؤ میں چھپوایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ مصنف کی مہر "فسانۂ عجائب" کے اس قلمی نسخے پر ثبت تھی جس کے مطابق مذکورہ ایڈیشن چھاپا گیا۔ ۳ سرور کی شادی کا یہ زمانہ ان خطوط سے متعین ہوتا ہے جن میں انھوں نے اپنی اہلیہ کی وفات (۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) کے ذکر کے ساتھ اس بات پر زور دیا ہے کہ ان کا اور سرور کا پچاس برس کا ساتھ تھا (دیکھئے "انشائے اردو" سرور کا پہلا، پانچواں، چھٹا اور ساتواں خط)۔

۴ "انشائے اردو" سرور کا چھٹا رقعہ۔

۵ 〃 〃 〃 ساتواں 〃

۶ 〃 〃 〃 چھٹا 〃

۷ 〃 〃 〃 〃 〃

۸ 〃 〃 〃 پہلا 〃

برداشت کرتی رہیں۔ سرور لکھتے ہیں کہ انھوں نے :۔

"عورت ہو کے جو منہ سے کہا تھا، پچاس برس وہی کام کیا ہمیشہ مرد کو مورد الزام کیا۔۔۔ جو کام ہم نے کیا اگر سراسر خلاف تھا لیکن گوارا کیا، شکوہ نہ ہمارا کیا۔"[1]

سرور کی اہلیہ نے نہ صرف یہ کہ اپنی دولت سے سرور کو عیش کرائے بلکہ وہ آخر دم تک سرور کے اقارب کی کفیل بھی رہیں اس طرح وہ جب تک زندہ رہیں سرور کے ذمے کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے رہیں۔ غرض ان کی حیثیت سرور کی "نصف بہتر" یا "ارد ھنگی" سے بہت زیادہ تھی۔ سرور کی مشہور ترین کتاب "فسانۂ عجائب" کی ایک ہیروئن ملکہ مہر نگار کی دو خاص خصوصیتیں یہ ہیں کہ وہ ہیرو جان عالم کی وفادار عاشق ہے اور اس کی زبردست معین و مددگار ہے اور یہ دونوں خصوصیتیں ہم مہر نگار اور سرور کی ان اہلیہ میں مشترک پاتے ہیں اس زمانے کو دیکھتے ہوئے کہ مرد کی زندگی میں بیوی کی حیثیت ایک بے جان کھلونے سے زیادہ نہیں ہوتی تھی سرور کی اہلیہ کا کردار اتنا ہی اہم ہے جتنا "فسانۂ عجائب" میں مہر نگار کا کردار۔

سرور کا عقدِ ثانی :۔ اس ضمن میں اس کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سرور کا اپنی اہلیہ کے ساتھ غیر منصفانہ رویہ کیا تھا۔ سرور نے اس کی تصریح نہیں کی ہے کہ ان کا وہ "سراسر خلاف" کام کیا تھا جسے ان کی اہلیہ نے حرفِ شکایت زبان پر لائے بغیر گوارا کیا، اور وہ کون سا وعدہ تھا جسے وہ تمام عمر وفا کرتی رہیں اور جس کی بنا پر سرور ان کو "صادق الاقرار" لکھتے ہیں اس سلسلے کے حقائق ہمارے سامنے نہیں ہیں، لیکن "انشائے سرور" کے پہلے فارسی رقعے میں سرور نے ایک دوست کو اپنی ایک نہایت محبوب عزیزہ کی وفات کی خبر دی ہے، وہ لکھنؤ میں سرور کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ سرور نے خط میں ان کے ساتھ اپنا رشتہ بتانے کے بجائے انھیں "آرام خاطرِ بے قرار" اور "تسکین بخش دلِ پر اضطرار" لکھا ہے۔ سرور نے ان کی موت پر اس لئے بھی بہت افسوس ظاہر کیا ہے "اس زمانے میں موافقِ مزاج کا ہاتھ آنا سخت دشوار ہے۔" خط کو پڑھتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ متوفیہ سرور کی بیوی تھیں، لیکن اس خط میں سرور یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس وفات کے بیس بائیس دن بعد کانپور میں ان کے گھر کے لوگوں" (مردمانِ خانہ) یعنی ان کی اہلیہ کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ متوفیہ لکھنؤ سرور کی دوسری بیوی تھیں۔ عقدِ ثانی ہی بہ ظاہر وہ سراسر خلاف کام تھا جس کی طرف سرور نے اشارہ کیا ہے، اور پہلی بیوی کی صادق الاقراری یہ تھی کہ سرور کے اس فعل کے باوجود وہ پیمانِ وفا کی پابند اور بدستور سرور کی معین و مددگار رہیں۔ سرور کی دوسری بیوی کے بارے میں ان کی موت کے سوا کچھ اور نہیں معلوم ہو سکا۔ البتہ یہ طے ہے کہ پہلی بیوی سرور سے بہت محبت کرتی تھیں، اور ان دوسری بیوی سے خود سرور بہت محبت کرتے تھے۔ بعینہٖ یہی فرق "فسانۂ عجائب" کی

---

[1] "انشائے اردو" سرور کا چھٹا خط۔

دونوں میں وہی مماثلت ہے جو ملکہ مہر نگار اور انجمن آرا میں نظر آتی ہے کہ مہر نگار جانِ عالم پر عاشق ہے اور عود جانِ عالم انجمن آرا پہ۔ مہر نگار اور سرور کی پہلی اہلیہ میں مماثلت کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ دوسری اہلیہ اپنی محبوبیت کی وجہ سے سرور کی داستانِ حیات میں وہی حیثیت رکھتی ہیں جو "فسانۂ عجائب" میں انجمن آرا کی تھی، اور ان کی یہی محبوبیت غالباً ان کے ساتھ سرور کے عقدِ ثانی کا سبب تھی۔

"فسانۂ عجائب" کے دیباچے میں سرور نے لکھنؤ کا جو بیان کیا ہے وہ ان کی زندگی کے پہلے دور پر کچھ روشنی ڈالتا ہے۔ انھوں نے جس انداز سے لکھنؤ کے جزئیات کا تذکرہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اس شہرِ طرب کا پورا لطف اٹھایا تھا۔ بیان لکھنؤ خود بتاتا ہے کہ وہ ایسے شخص کا لکھا ہے جس نے ہر ہر پہلو سے لکھنؤ کی بھرپور سیر کی ہو۔ وہ کھانے پینے کا بہت شوقین ہے اور یہ خوب جانتا ہے کہ کون چیز کہاں اچھی بنتی ہے۔ وہ حلوائیوں اور نان بائیوں میں بہت دلچسپی رکھتا ہے، اور انواع و اقسام کے فواکہات کا مزا چکھے ہوئے ہے، میلا ہو، یا چوک کا بازار، وہ ہر جگہ دخیل ہے۔ سرور "مردِ تماش بیں" کے لئے لکھنؤ کی اہمیت کا خاص طور پر تذکرہ کرتے ہیں۔ سرور کے اس دور کے متعلق ہمارے سامنے براہ راست معلومات تو نہیں ہیں لیکن ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر سرور کی اس دور کی زندگی کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے، اور اس سلسلے میں ہمیں اس پر بھی نظر رکھنا چاہئے کہ ۱۲۲۸ھ میں (یا اس کے آس پاس) شادی کے بعد سرور کے پس پشت بیوی کی کثیر دولت تھی اور ۱۲۴۰ھ سے پہلے ہی ہم ان کو "نیرنگیٔ زمانۂ ناہنجار" کے ہاتھوں "دل گرفتہ" اور "اداس" اور "عدمِ فرصت" یا بہ الفاظِ دیگر فکرِ معاش میں مبتلا پاتے ہیں (سببِ تالیف "فسانۂ عجائب")۔

بیان لکھنؤ میں سرور نے مرزا محمد رضا برق کے مکان پر ہونے والے ماہانہ مشاعروں کی بھی جھلکی دکھائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ سرور نے ادبی زندگی کا آغاز شاعری ہی سے کیا تھا اور یقیناً وہ نوازش کے ایک شاگرد کی حیثیت سے لکھنؤ کے شاعروں میں اپنا کلام بھی سنائے ہوں گے۔

"فسانۂ عجائب" کے خد و خال: — ۱۲۴۰ھ (عہد غازی الدین حیدر) میں کانپور جانے سے پہلے ایک دن سرور اپنے چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے، زمانے کی نیرنگی اور فلک کی کج رفتاری کے باعث محفل پر افسردگی کا عالم طاری تھا۔ سرور کے ایک دوست نے ان سے فرمائش کی کہ کوئی کہانی ایسی سنائیں جس سے کچھ دل بہلے۔ اگرچہ خود سرور بھی اس وقت اداس تھے اور ان کی طبیعت حاضر نہیں تھی، لیکن انھوں نے حسب فرمائش "چند کلمے" دوست کو سنائے جو انھوں نے پسند کئے اور سرور سے کہا کہ اس قصے کو مربوط کر کے لکھ دیں، چنانچہ یہی "چند کلمے" تھے جنھوں نے بعد میں "فسانۂ عجائب" کی شکل اختیار کی۔[1]

---

[1] دیباچہ "فسانۂ عجائب" ("باعث تحریر اجزائے پریشاں ...")

یہ نہیں معلوم کہ اس زمانے میں سرور کا ذریعۂ معاش کیا تھا۔ "فسانۂ عجائب" کے سبب تالیف میں وہ بتاتے ہیں کہ جب ان کے دوست نے ان سے یہ داستان لکھنے کی فرمائش کی تو باوجودیکہ ان کو اسی دن سے ہمیشہ اس کا خیال رہتا تھا مگر عدم فرصت کے باعث وہ جب تک لکھنؤ میں رہے اسے نہ لکھ سکے۔ سرور کے عدیم الفرصت رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانے میں وہ رئیس زادوں کی طرح بیکار نہیں تھے بلکہ ان کے ذمے اتنے کام تھے کہ انھیں لکھنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔

قتل کا ارتکاب اور کانپور جانا:۔۔۔ عرض کیا جا چکا ہے کہ سرور سپہ گری اور شمشیر زنی کے فن سے واقف ہی نہیں تھے بلکہ اس کو برتتے بھی تھے۔ معلوم نہیں اسی کا شاخسانہ تھا یا کوئی اور سبب تھا ان کے ہاتھ سے ایک قتل ہو گیا۔ اس واقعہ کی تفصیلات نہیں معلوم، صرف مرزا احمد علی کے نام سرور کے ایک فارسی رقعے میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"عالم شمارا یاد خواہد بود کہ بہ علتِ خون گرفتار شدم۔ تمام عالم می گرفت کہ ازیں مخمصہ جانبر نہ خواہد شد۔ لیکن بہ فضلِ ایزدی آسیبے بہ من نہ رسید۔ تا حال زندہ و سلامت ہستم۔"[1]

(ترجمہ:۔۔۔ میرا حال تمہیں یاد ہوگا کہ خون (کرنے) کی علت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ساری دنیا کہتی تھی کہ وہ اس مخمصے سے زندہ نہ بچے گا، لیکن بہ فضلِ خدا میرا کچھ بھی نہ بگڑا، اب تک زندہ و سلامت ہوں۔)

سرور کے انداز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قتل اتنا واضح تھا کہ سب کو یقین تھا کہ انھیں سزائے موت ہو جائے گی، اور یہ محض خدا کا فضل تھا کہ وہ زندہ بچ گئے۔ سرور کے بیان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کب کا واقعہ ہے، لیکن ممکن ہے کہ اسی کے نتیجے میں انھیں کانپور جانا پڑا ہو۔

ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ (نومبر یا دسمبر ۱۸۲۴ء) میں سرور کو کانپور جانا پڑا۔[2] منشی نوبت رائے نظر نے اپنے ایک مضمون میں خیال ظاہر کیا ہے کہ سرور کسی عتابِ شاہی کی بنا پر گنگا پار اتار دیے گئے۔[3] "تاریخ ادب اردو" (مترجمہ مرزا محمد عسکری) میں بھی یہی روایت ہے کہ سرور، غازی الدین حیدر کے حکم سے جلا وطن کر کے کانپور بھیجے گئے تھے۔ بعض داخلی شہادتیں بھی اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ سرور کو مشتبہ حالات میں کانپور جانا اور وہاں رہنا پڑا تھا۔ ذیل میں ان شہادتوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

سرور لکھتے ہیں کہ جب ان کے دوست نے ان سے "فسانۂ عجائب" کی داستان کو باقاعدہ مرتب و مکمل کر کے لکھنے کو کہا تو وہ اس پر راضی ہو گئے، مگر یہ بھی کہہ دیا کہ "جلدی نہ کرنا، بہ وقت فرصت لکھوں گا۔"[4] سرور لکھتے ہیں کہ "فقیر کو اس دن سے ہمیشہ اس (داستان کے لکھنے) کا خیال رہتا تھا، عدم فرصت سے کہتا تھا۔"[5] اس کے بعد سرور لکھتے ہیں کہ "فلک تفرقہ پرداز نے

---

[1] "انشائے سرور" رقعۂ سوم فارسی [2] "سبب تالیف فسانۂ عجائب" [3] حوالۂ "تاریخ بنارس" از مظہر حسن جلد دوم۔
[4] و [5] "سبب تالیف فسانۂ عجائب"۔

انھیں دوستوں سے جدا کر دیا، اور ان کو "تلاش معاش کے لیے" بیں مجبوراً کانپور جانا پڑا۔ اس زمانے میں جب دور دور سے لوگ روزی کمانے لکھنؤ آیا کرتے تھے سرور کا لکھنؤ چھوڑ کر کانپور جانا جیسے وہ کور دہ اور پوچ وبچ بستی کہتے ہیں، علت سے خالی نہیں۔ کانپور میں شرفا کی قلت اور رذیلوں کی ریل پیل کی وجہ سے سرور ایسا بولائے کہ قریب تھا کہ پاگل ہو جائیں۔ اس کے باوجود وہ کانپور ہی میں ٹکے رہے۔ کیا وہ قسمت آزمائی کرنے لکھنؤ نہیں آسکتے تھے، اور کیا لکھنؤ میں ملازمتوں کا ایسا کال پڑا ہوا تھا کہ سرور کا سا ہمہ پہلو شخص کہیں نہیں کھپ سکتا تھا؟

کچھ دیر پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ کانپور جانے سے پہلے سرور عدم فرصت کے باعث "فسانۂ عجائب" نہیں لکھ سکتے تھے، حالانکہ اگر لکھنؤ میں وہ بے روزگار تھے تو انھیں فرصت ہی فرصت ہونا چاہیے تھی۔ دوسری طرف کانپور میں ان کا قیام اگر روزگار مل جانے کی وجہ سے تھا تو ان کے پاس فرصت کی کمی ہونا چاہیے تھی، لیکن جب سرور، حکیم اسد علی کے سامنے "فسانۂ عجائب" لکھنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں تو حکیم صاحب جواب دیتے ہیں:- "بے کار مباش کچھ کیا کر"۔ یعنے اس وقت سرور کے پاس کوئی خاص شغل نہیں تھا۔ پھر ان کو لکھنؤ جانے میں کون چیز مانع تھی؟۔ غرض ان شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ سرور کا لکھنؤ چھوڑنا با دل نخواستہ اور کانپور کی سکونت اختیار کرنا کسی مجبوری کا نتیجہ تھا۔ ممکن ہے کہ اسی قتل کے سلسلے میں سرور کو جلا وطن ہونا پڑا ہو۔ اس زمانے میں کانپور کالے پن کی حیثیت رکھتا تھا، اور اکثر شاہی معتوبین اور مجرموں کو جلا وطنی کی سزا دے کر گنگا کے پار اتار دیا جاتا تھا، جس کے کنارے شہر کانپور آباد ہے۔ اس کے علاوہ کانپور چونکہ اودھ کی عمل داری میں شامل نہیں تھا، اس لئے بعض اوقات قانون کی زد پر آئے ہوئے لوگ مواخذے یا عتاب شاہی سے بچنے کے لئے بھی کانپور کا رخ کرتے تھے۔ گو یا اس زمانے میں کانپور مجرموں کا زندان بھی تھا اور ملزموں کی جائے پناہ بھی۔ لوگ وہاں سزا کے طور پر بھی بھیجے جاتے تھے اور سزا سے بچنے کے لئے بھی جاتے تھے۔ دونوں صورتوں میں بادشاہ کی اجازت کے بغیر لکھنؤ آنا خطرے سے خالی نہ ہوتا تھا۔ یقین کے ساتھ نہیں معلوم کہ سرور کا کانپور جانا ان دو میں سے کس قسم کا جانا تھا۔ وہ غازی الدین حیدر کے حکم سے جلاوطن کر کے بھیجے گئے تھے یا لکھنؤ سے فرار ہو کر اور خود جلاوطنی اختیار کر کے وہاں پہنچے تھے۔ البتہ سرور کے ایک بیان سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ وہ خود ہی کانپور چلے گئے تھے۔ سرور کا یہ لکھنا کہ ان کو "تلاش معاش کے لیے" کانپور جانا پڑا، اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یعنی ان کا حیلہ تو یہ تھا کہ وہ روزگار کی تلاش میں کانپور جا رہے ہیں، لیکن اصل مقصد قانونی گرفت یا عتاب سے بچنا تھا، کیوں کہ ظاہر ہے بادشاہ کے حکم سے سزا کے طور پر شہر بدر کر کے کانپور بھیجا جانے والا شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ تلاشِ معاش میں کانپور جا رہا ہے۔ بہر حال سرور کو کانپور جانا پڑا اور لکھنؤ ان کے لئے شہرِ ممنوع ہو گیا۔

۱؎ سبب تالیف "فسانۂ عجائب" ۲؎ سبب تالیف "فسانۂ عجائب"۔

سرور کانپور میں:۔ اس وقت بہارستان لکھنؤ کے مقابلے میں کانپور ایک تاریک وادی تھا۔ سرور جیسے تماش بین اور زندہ دل شخص کو وہاں کے جبری قیام میں جس ذہنی کرب و اذیت سے دو چار ہونا پڑا ہوگا، اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ وہاں کے رہنے والے سرور کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے اور وہ کوفت اٹھا اٹھا کر پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ اس ابتلائے عام میں حکیم اسد علی کی ذات ان کے لئے بڑا سہارا بنی، وہ سرور کی غمخواری کرتے، ان کی تکلیفیں دور کرنے کی تدبیریں بتاتے اور اکثر ان سے ملنے آیا کرتے تھے[1]۔ غرض بہ قول سرور ان کی عنایت و شفقت سے سرور کی "طبع سودا اجزا اور سر جنون انگیز کو آرام و تسکین حاصل ہوئی"[2]۔

"فسانۂ عجائب" کی تالیف:۔ ایک طرف حکیم اسد علی کی غم خواریوں سے سرور کو یہاں تک ذہنی سکون حاصل ہوا کہ ان کی تصنیف و تالیف کی صلاحیت عود کر آئی، دوسری طرف لکھنؤ کی یادیں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتی تھیں اور انھیں یادوں کے ہجوم میں اس داستان کی یاد ابھر کر سرور کے سامنے آئی جو انھوں نے لکھنؤ میں اپنے دوستوں کی صحبت میں سنائی تھی اور جسے لکھنے کا انھوں نے دوستوں سے وعدہ کیا تھا۔ سرور نے حکیم اسد علی سے اس کا ذکر کیا اور انھوں نے یہ داستان لکھنے کی پر زور تائید کی، اس لئے کہ منتشر خیالات کا ایک نقطہ پر مرکوز کر کے تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہو جانا سرور کی ذہنی پراگندگی کا بہت عمدہ علاج بھی تھا، چنانچہ سرور نے قلم اٹھایا، اور ۱۲۴۰ھ کے اندر ہی اندر "فسانۂ عجائب" مکمل کر لی۔ سرور کے استاد نوازش نے اس کا قطعۂ تاریخ کہا۔ سرور کے ایک دوست لالہ درگا پرشاد مدہوش نے بھی ایک تفصیلی قطعۂ تاریخ کہا جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے ع

"کہا فسانہ جو یہ عجائب سرورِ دل خستہ و حزیں نے"

اور تاریخ تصنیف اس طرح نکالی ہے ؎

"ہوئی جو مدہوش کو یہ خواہش کہ سالِ تاریخ اس کا لکھئے
تو کھینچ کر آہِ دل سے نکلا خزاں سے رنگِ بہار دیکھا"

مدہوش کے قطعے کا مصرعۂ اول اور مصرعۂ تاریخ دونوں "فسانۂ عجائب" کی تالیف کے زمانے میں سرور کی جو حالت تھی اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔ پہلے مصرعے میں تو صاف صاف سرور کو "دلِ خستہ و حزیں" بتایا گیا ہے۔ مصرعۂ تاریخ میں "خزاں" کا استعارہ افسردہ و پژمردہ سرور کے لئے اور "رنگِ بہار" کا استعارہ سرور کی شگفتہ اور رنگین نثری تالیف "فسانۂ عجائب" کے لئے۔ خود سرور نے "فسانۂ عجائب" کے آخری باب کے جو تمہیدی اشعار لکھے ہیں، ان سے بھی ان کا کچھ حال معلوم ہوتا ہے،

---

[1] و [2] سبب تالیف "فسانۂ عجائب" مطبع محمدی کانپور ۱۲۶۷ھ (دوسرے ایڈیشنوں میں صراحت نہیں ہے کہ حکیم اسد علی سرور سے ملنے آیا کرتے تھے)۔

بڑی فکر رہتی تھی ہر صبح و شام — ہوئی فضلِ حق سے کہانی تمام
وہ بچھڑے تو سب ہو گئے ایک جا — رہے اپنے مطلوب سے ہم جدا
رہی شرح جورِ فلک ناتمام — سرورِ حزیں تو سنِ خامہ تھام

سرور کی شادی "فسانۂ عجائب" کی تالیف سے قریب بارہ برس پہلے ہو چکی تھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان اشعار کے چوتھے مصرعے میں "مطلوب" سے سرور کی وہی اہلیہ مراد ہیں، یا کوئی اور محبوب ہستی (سرور کے عقدِ ثانی کا زمانہ ہمارے علم میں نہیں ہے)۔

خلاصہ یہ کہ "فسانۂ عجائب" کی تالیف اور کانپور میں قیام کا یہ زمانہ سرور کے لئے حرماں نصیبیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان کی حیاتِ نثری کے آغاز کے ساتھ ان کے بُرے دنوں کا بھی آغاز ہوا۔ ان بُرے دنوں نے چند مختصر وقفوں کے سوا آخر عمر تک سرور کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

نصیر الدین حیدر کی تخت نشینی:۔ ۱۲۴۳ھ[1] میں غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر تخت پر بیٹھے اسی سال سرور نے اپنے نام کی ایک مہر بنوائی۔ انھوں نے "فسانۂ عجائب" کے دیباچے اور متن میں نئے بادشاہ کی رعایت سے کچھ اضافے کئے[2] اور بادشاہ کی مدح میں جو غزل شامل کی اس میں لکھنؤ سے اپنی جدائی پر قلق کا اظہار بھی کیا۔ "انشائے سرور" کی پہلی عرض داشت ایک بادشاہ کے نام ہے جسے سرور نے "فسانۂ عجائب" کا ایک نسخہ پیش کیا تھا۔ عرض داشت میں اپنی پریشانی اور بے سر و سامانی کا ذکر کر کے سرور نے ملازمت کی درخواست کی ہے اور خاتمے پر یہ شعر لکھا ہے ؎

الٰہی در جہاں باشی بہ اقبال — جواں بخت و جواں دولت جواں سال

غالباً یہ بادشاہ نصیر الدین حیدر ہی تھے جو نوجوانی کے عالم میں تخت نشیں ہوئے تھے۔ عرض داشت کے جواب میں سرور کو شاہی ملازمت تو غالباً نہ مل سکی، لیکن یہ نوجوان بادشاہ سرور کے حق میں اس لحاظ سے بہت مہربان ثابت ہوا کہ اس کے زمانے میں لکھنؤ کا قیام سرور کے لئے ممکن ہو گیا اور وہ کانپور کی رہائش سے چھٹکارا پا کر اپنے محبوب شہر میں واپس آ گئے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ایک بار کانپور سے نکلنے کے بعد سرور پھر ادھر کا رُخ نہ کرتے، لیکن ہم ان کو اس کے بعد بھی برابر کانپور جاتا پاتے ہیں۔ اس کے چند اسباب نظر آتے ہیں۔

ایک یہ کہ سرور کے استاد نوازش کانپور میں رہنے لگے تھے، چنانچہ سعادت خاں ناصر لکھنوی نوازش کے حال میں لکھتے ہیں:۔

"چندے روز سے بہ سبب خرید دیہات نیلام کانپور میں تشریف رکھتے ہیں، لکھنؤ میں آمد و رفت بہت کم ہے۔"[3]

دوسرے سرور کے خطوں سے کانپور میں ان کی اہلیہ کی موجودگی کا بھی پتہ چلتا ہے اور وہ غالباً مستقل طور پر کانپور ہی میں رہا کرتی تھیں۔ علاوہ بریں سرور کے سب سے بڑے بیٹے مرزا احمد علی بھی زیادہ تر کانپور میں رہتے تھے۔ سرور کا کانپور جاتے رہنا اور وہاں مختلف زمانوں میں قیام کرنا انھیں سب علاقوں کے باعث تھا، لیکن نصیر الدین حیدر کے عہد میں کانپور میں سرور کا جبری قیام اور اسی کے ساتھ ان کی زندگی کا پہلا دور ختم ہو گیا۔

---

[1] اس مہر کی نقل "شبستانِ سرور" کے ہر نام کی عبارت کے ساتھ دی گئی ہے [2] دیکھئے اگلا باب "فسانۂ عجائب" کی زمانۂ تالیف کی بحث۔
[3] تذکرۂ "خوش معرکۂ زیبا" (قلمی) مخطوطہ لکھنؤ یونیورسٹی ٹیگور لائبریری۔

رزاق فاروقی۔

اودھ پنچ اور حیدرآباد

اودھ پنچ کو محض ایک مزاحیہ اخبار سمجھنا درست نہیں ۔ وہ ہماری جدوجہد آزادی کا نقیب اور ہماری سماجی و تمدنی زندگی کا موثر نقاد تھا اس نے انگریزوں کے سیاسی گٹھ جوڑ ہی کا پردہ چاک نہیں کیا ، بلکہ ساتھ ساتھ اس اخبار نے ہندوستانی لیڈروں ، شاعروں ، ادیبوں اور والیانِ ریاست سب ہی کا مقابلہ کیا جو قومی زندگی پر منفی اثرات ڈال رہے تھے۔

اودھ پنچ کی اشاعت ۱۸۷۷ء سے لکھنؤ میں شروع ہوئی ، اس نے صوبہ اودھ ہی کی سیاست اور سماجی نقوش کو نہیں ابھارا بلکہ اس کے سامنے ایک متحد ہندوستان کا واضح تصور تھا جس کی ترجمانی انڈین نیشنل کانگریس کر رہی تھی یا کانگریس ہی کے اس خیال کی وضاحت اور ترجمانی اودھ پنچ کو مقصود تھی ۔ اس کے نامہ نگار کشمیر سے لے کر دکن تک ہر جگہ تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے سب ہی لکھنے والوں کے سیاسی خیالات ، مذہبی معتقدات اور ادبی نگارشات بڑی حد تک ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے تھے۔ طنز و مزاح اودھ پنچ کا مقصد نہیں ، ذریعہ تھا ۔

ہر جگہ اخبار میں خبریں سنانے کے لئے ۔۔۔ بے خبر کو خواب غفلت سے جگانے کے لئے
پنچ اظاہر میں تو ہے ہنسنے ہنسانے کے لئے ۔۔۔ دل لگی میں ہے گر رستہ بتلانے کے لئے
میٹھی میٹھی چٹکیوں میں ہے جگانے کے لئے ۔۔۔ پردے پردے میں یہ سب کچھ ہے سنانے کے لئے (اودھ پنچ مورخہ ۱۱ر جنوری ۱۹۱۸ء)

اودھ پنچ کے چند اہم لکھنے والوں کے نام پنڈت برج نارائن چکبست اور پنڈت کشن پرشاد کول کے مضامین کی وساطت سے ہمیں مل جاتے ہیں ، لیکن اس کے کئی لکھنے والوں کے نام اور کام ابھی تک شائقین ادب کے سامنے نہیں آسکے ۔ یہ بتلانا مشکل ہے کہ اس اخبار کے نامہ نگاروں کے اصل نام اور مقام کیا تھے ، کیوں کہ اکثر نے اپنی نگارشات کے نیچے بجائے نام کے مزاحیہ جملے یا حروف لکھے ہیں ، مثلاً :۔ کھلے رستم از بدایوں ، ہوشیار عاشق ، م ، ش ، مہر کا کوروی وغیرہ ۔ خود حضرت اکبر الہ آبادی نے جو اس اخبار کے سب سے اہم رتن تھے ا ۔ ح (اکبر حسین کے بجائے) لکھا ہے ۔ دکن کی سیاست اور یہاں کی تمدنی زندگی اور تہذیبی مسائل پر جو مضامین اور نظمیں ملتی ہیں ، ان کے بارے میں بھی تیقن سے یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ یہ کس کس کی لکھی ہوئی ہیں ۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کے ذاتی کتب خانہ (مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد) میں ایک مخطوطہ ہے ۔ یہ دراصل ظہیر الدین ظہیر نامہ نگار اودھ پنچ کی ڈائری ہے ۔ اس کے مطالعہ سے بھی یہ بات وضاحت سے معلوم نہیں ہوتی کہ ظہیر نے

اودھ پنچ کے لئے کیا کیا لکھا تھا۔

اودھ پنچ کی صحافتی اور ادبی معرکہ آرائی کے وقت دکن میں نواب میر محبوب علی خاں کی حکمرانی تھی جو چھٹے نظام تھے۔ ان کے والد نواب افضل الدولہ کا انتقال اس وقت ہوگیا تھا جب نواب محبوب علی خاں سن بلوغ کو بھی نہ پہنچے تھے، اس لئے چند طاقتور امراء اور انگریز ریذیڈنٹ ہی ریاست کی سیاست پر چھائے ہوئے تھے۔ اودھ پنچ کی پھبتیوں اور اس کے طنزیہ جملوں کو سمجھنے کے لئے دکن کی اس دور کی تاریخ کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

حیدرآباد کے مسائل میں ملکی اور غیر ملکی کا مسئلہ بڑا کٹھن بھی تھا، اور قدیم بھی۔ دکنی اور غیر دکنی یا ملکی اور غیر ملکی کی بحث بہمنی دور حکومت ہی سے دکن میں چلی آرہی تھی اور اصل اس کے پیچھے معاشی مسابقت اور مادی مفاد جیسے عوامل کارفرما تھے۔ اسی رقابت اور رسہ کشی کی وجہ بہمنی حکومت کے شہرۂ آفاق وزیر خواجہ محمود گاواں کا قتل ہوا تھا۔ جب دکن میں آصف جاہی سلطنت کی بنیاد مضبوط ہوئی تو یہ مسئلہ پھر نمودار ہوا۔ نواب میر محبوب علی خاں کے دور میں ملکی اور غیر ملکی کا مسئلہ پورے شباب پر تھا۔ شاعر، ادیب، امراء اور حکومت کے چھوٹے بڑے کارندے سب ہی اس کا نشانہ بنتے تھے! انگریز ریذیڈنٹ اس پھوٹ سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا تھا۔ اودھ پنچ کو اس وضع کی تنگ نظری ایک نظر نہیں بھاتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مسئلہ کی اصل میں کوئی حقیقت ہی نہیں، سارے ملک کے شہری ایک ہیں اور اپنی اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ اپنی روٹی پیدا کرتے ہیں، اس طرح اس کا مسلک صلح کل تھا، وہ تمام باشندوں کو ایک ہی لڑی میں پرونا چاہتا تھا۔ اودھ پنچ کے زمانے میں آج کل کی طرح قومی یکجہتی کا مسئلہ نہیں تھا، تاہم اس کے لکھنے والوں کا سوچنے کا انداز کچھ اسی قسم کا تھا جس میں حب وطن اور وسیع النظری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اودھ پنچ کا یہ استدلال تھا کہ جب شمالی ہند سے آئے ہوئے افراد دکن میں غیر ملکی قرار دیئے جاتے ہیں اور ان کے خلاف ایک منظم نفرت کی مہم چلائی جاتی ہے تو کیوں اسی جذبے کے تحت انگریزوں کو غیر ملکی قرار نہیں دیا جاتا، ان کے خلاف بھی کیوں انہیں نفرت و حقارت کی مہم چلائی جاتی، کیونکہ انگریز نہ تو دکنی ہیں اور نہ شمالی ہند سے ان کا تعلق ہے۔ اودھ پنچ شمالی ہند سے دکن جانے والوں کو بھی مشورہ دیتا تھا کہ وہ لوگ اپنی غیرت اور حمیت کی حفاظت کریں اور دکن نہ جائیں۔ ۲۳ رفبروری ۱۸۹۳ء کی اشاعت میں اودھ پنچ لکھتا ہے:۔

"سرحد روس و انگلستان کی نزاعیں، اردو زبان کی بحث میں لکھنؤ اور دہلی کے جھگڑے اور حیدرآباد میں ملکی و غیر ملکی کے بکھیڑے سنتے سنتے کان پک گئے۔ الہٰی توبہ۔ یہ قضیۂ نامرضیہ کس طرح طے ہوں۔ نظر ہی نہیں آتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر ان غیر ملکیوں کو ہو کیا گیا، اور وہ لوگ ان کو لاکھ لاکھ طرح سے نکالتے ہیں اور یہ زمین نہیں چھوڑتے۔ سرکار کی سلامتی ہو انھیں اپنے ملک میں کیا کمی ہے جو ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ اجی غیرت اور حمیت کے یہ معنی ہیں کہ حیدرآباد کو ایک دم سے نقابتائیں"۔

"آفاقیت کا دعبہ بھی کلنک کا ٹیکہ ہے جسے دیکھ کر ایک زمانہ چیخ اٹھتا ہے۔ ایک تعصب ہے کہ جس نے

عقل تک کب بے کار کر رکھا ہے۔ بھلا اس تعصب کی بھی کوئی حد ہے کہ کسی غیر ملکی کے اخراج پر ایڈریس دیا گیا، شکریہ ادا کیا گیا۔ جہنم میں جائے ایسی نوکری، گھر بار چھوڑ دو، جورو بچوں سے منہ موڑ اپنا ہو یا تاک کر دو احسان کے عطرہ خیال میں نہیں آتا۔ ارے یارو، جب ایسی ناقدری کا سامنا ہے تو خواہ مخواہ ضرور ستم کیا ہے وہاں ڈھیٹی دیئے پڑے ہو۔ بھئی مجھ سے کوئی صلاح لے تو میں سرے سے یہی کہوں کہ اب تو ہندوستانیوں کو وہاں دو گھڑی کے لئے نہ رہنا چاہیئے۔"

"آپکے کہنے سے ہوا ہی جاتا ہے۔ ارے بھیا عقل کے ناخن لو، یہ لوگ تو لاکھ چاہیں کہ ہم اپنے گھر بیٹھ رہیں اور پنجے جھاڑ کے اٹھ کھڑے ہوں ۔۔۔ یہ غل غپاڑہ تو محض عارضی تھا اس کا تو خیال بھی نہ کرنا چاہیئے بیندھی کے نشہ میں آدمی اس سے بھی زیادہ چیختا چلاتا اور بس ع "صلاح کار کجا و من خراب کجا" ۔ کا غل مچاتا ہے۔ تم اس ایڈریس کو لئے پھرتے ہو۔ ایسے ایسے زٹل قافیے خدا حیدرآباد کو سلامت رکھے صبح و شام اڑا ہی کرتے ہیں۔"

"بھیا تم بھی نا سمجھ ہو، حیدرآبادیوں کا حال ہم سے سنو، اس میں ایک بڑی تہ کی بات ہے، تم سے کہے دیتے ہیں اور کسی سے نہ کہنا۔ بات یہ ہے کہ وہ بے چارے کیا کریں، یہ سب شگوفے کھلائے ہوئے انھیں آفاقیوں کے ہیں۔ بیٹھے بٹھائے اک یہی مشغلہ اٹھا دیا اور ان کے کان میں پھونک دیا کہ چیندہ چیندہ آدمی رہ جائیں اور نکمے نکال دیئے جائیں۔ بس سمجھے کہ نہیں ۔۔۔ بس سمجھ لو کہ اسی تو تو میں میں، میں سے آخر ایک گورے چٹرے والے صاحب بہادر خزانہ کے سانپ بنا دیئے گئے نا ۔۔۔ پھر کیا وہ غیر ملکی نہ تھے ۔۔۔ اجی وہ تو غیر اقلیمی تھے، آخر ان کے تقرر پر ملکیوں نے نہ کچھ غل مچایا ۔۔۔ جی یہ ہندوستانی ریاست ہے، اپنے بھائی بندوں سے گلے کاٹنے پر چھری تیز کئے رہتے ہیں، انگریزوں کا اقبال زبردست ہے ان کے آگے کیا مجال کوئی چوں کر سکے۔"

راقم (قہقہہ دیوار)

اودھ پنچ کی "نظر عنایت" شاہ دکن پر ہمیشہ رہی، کبھی وہ خود کو ارسطو ظاہر کرتے ہوئے بادشاہ کو نصیحت کرتا ہے، کبھی وہ ادبی نقاد کی حیثیت سے نواب میر محبوب علی خاں کی غزلوں پر اصلاح دیتا ہے۔ نواب صاحب آصف تخلص کرتے تھے۔ جب گلدستہ محبوب الکلام شائع ہوا تو اودھ پنچ نے آصف کے چند اشعار پر اس طرح تنقیدی نظر ڈالی ؎

کوئی دیکھے لالے گلالے کے پھول   ہم اپنے کسونچی کی جڑ دیکھتے ہیں

اس دفعہ تبرکاً ہم تازہ اور نئے گلدستہ محبوب الکلام کے انتخاب کو طرہ دستار مضمون بناتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ اس میں سرزمین دکن کے شعرائے بلند مقام خسروانِ اقلیم سخن کا کلام فصاحت نظام درج ہوتا ہے، اور دکنی کی یہ دولت اردو شاعری کو جشن خلعت تدریج عطا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ نظم ... ہم پس سب پر اس کو ترجیح ... ہے:

حضور بندگانِ عالی ؎

دل لگی یہ جو شبِ وصل رہا کرتی تھی ہم جلا دیتے ہیں وہ شمع بجھا دیتے ہیں ؎

(حاشیہ:۔ بارک اللہ! کیا ظلمت دنور اندھیرا جالا تک دل لگی ہے)

؎ وہ گئے دن جو اسے کوستے تھے آٹھ پہر اب تو آصف کو وہ جینے کی دعا دیتے ہیں :۔

(حاشیہ:۔ میر صاحب اگر اپنے شعر میں ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

معشوق کی طرف اشارہ کر دیتے تو سودا کو بھی مجالِ گستاخی نہ ہوتی۔

ترقئ عشق کے مدارج میں شفقت بھی تو ہے۔)

آوج ؎ خوف فرہاد کو ہر گز نہ ہوا تیشہ کا مرد جو کہتے ہیں، وہ کرکے دکھا دیتے ہیں :۔

(حاشیہ:۔ فرہاد نے شاید آپ سے کہا ہوگا، دنیا کو تو خبر نہیں۔)

ارشاد ؎ جب کبھی تول کے تلوار وہ آجاتے ہیں ہم اُدھر شوق سے گردن کو جھکا دیتے ہیں :۔

(حاشیہ:۔ اُدھر اور جھکا دینے سے تلوار آنے والے کی گردن مراد ہے یا

اُدھر اور جھکا دینے کی گردن ردیف نے ماری ہے۔)

؎ حضرتِ شاد نے ارشاد کو شاگرد کیا مرد جو کہتے ہیں وہ کرکے دکھا دیتے ہیں :۔

(حاشیہ:۔ واقعی مردانگی کی۔)

افضل ؎ خون سے غسل کرائیں گے مہِ کامل کا اپنے ناخونوں پہ وہ رنگِ حنا دیتے ہیں :۔

(حاشیہ:۔ ناخونوں کے ناخن لیجئے۔)

باری ؎ دل لگایا ہے، یہ تقصیر ہے کیسی تقصیر جو سزا دیتے ہیں مجھ کو وہ بجا دیتے ہیں :۔

(حاشیہ:۔ واہ تقصیر۔ دہن کے دل سے اس کا لطف آپ پوچھو۔)

بیدل ؎ وصل کی شب میں غضب ڈھاتے ہیں مرغانِ سحر صبح ہوتی ہی نہیں ہے کہ جگا دیتے ہیں :۔

(حاشیہ:۔ سب ٹھگوں کے مرغے ہیں۔)

بشیر صیغہ دار ؎ بے اثر آہ کو ہر گز نہ تصور کیجئے یہ وہ نالے ہیں کہ جو عرش ہلا دیتے ہیں :۔

(حاشیہ:۔ آہ نالہ بن کر بہ صیغۂ جمع کیا خوب آئی ہے۔)

حافظ ؎ ناز و انداز ترے آگ لگا دیتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ وہ جلبتوں کو جلا دیتے ہیں :۔

(حاشیہ:۔ مرے کو مارے شاہ مدار۔ جلوں کو نہیں جلایا، بلکہ جلبتوں کو جلایا۔)

داد ؎ نقدِ دل اپنا تجھے اہلِ وفا دیتے ہیں پاس جب کچھ نہیں رہتا تو کیا دیتے ہیں :-

(حاشیہ :- اسی طرح جھک مارتے ہیں ریذیڈنٹ ٹیں ٹیں۔)

سرور ؎ نہیں اُمید جواب آنے کی واں سے ہرگز پُرزے کر کر کے مرے خط کو اُڑا دیتے ہیں :-

(حاشیہ :- "محلِ چہل کاٹ" ہے یا شعر؟)

سرفراز ؎ خاک قاصد کو ملے گا مرے نامہ کا جواب خط وہ سو مرتبہ لکھ لکھ کے مٹا دیتے ہیں :-

(حاشیہ :- خط مٹانا بہ معنیٰ رگڑ ڈالنا، یا حرف چاٹ لینا۔ اصل شعر

یوں ہوگا۔

؎ "خاک پتھر قاصد کو ملے گا مرے نامہ کا جواب ....

خط وہ سو مرتبہ سلیٹ پر لکھ لکھ کے مٹا دیتے ہیں ...."۔

(حاشیہ :- مضمون سنگین تھا، وزن کی ترازو کی دونوں ڈوریاں

ٹوٹ گئیں، مگر بڑی بات یہ ہے کہ مضمون تو پورا ہوگیا۔)

نواب بہرام الدولہ ؎ مانوں کیوں کر کہ نہیں غیروں میں پی آپ نے مے ڈورے آنکھوں کے تو کچھ اور پتا دیتے ہیں :-

(حاشیہ :- ڈوروں سے تو مئے نوشی کو پتا چلا، مگر العزۃ للہ [illegible])

وزیر ؎ کیا عجب ہے کہ بنا دیویں تمہیں وہ انساں دم میں حیواں کو جو انسان بنا دیتے ہیں :-

(حاشیہ :- سبحان اللہ! کیا انکسار ہے۔)

ہنر ؎ سر کے بل راہ میں ہم چلتے ہیں جن کی ہے ہے مثلِ نقشِ کفِ پا ہم کو مٹا دیتے ہیں :-

(حاشیہ :- قلا بازیاں نہیں، ہتکڑیاں کہیے ہتکڑیاں۔ کون بزرگوار

جن کی راہ میں چلنے سے یہ سزا ملتی ہے، اور شعر میں کہیں ان کا

نشان تک نہیں۔ غالباً سیاستِ حضرت آصف کے ڈر سے

کہیں فرار ہوگئے۔ جب تک "دہ" کا دار الشفاء نہ جاری ہوگا

یہاں نہ چلے گا۔)

اعلان :- چونکہ ریاستِ دکن میں مدتوں سے تخفیف کا بازار گرم ہے، لہٰذا صیغۂ شاعری میں عموماً لمبی ٹانگ والی یائے مجہول معرضِ تخفیف میں آئی، چنانچہ شعرائے ذیل کے لیے یہ قاعدہ جاری ہوگیا۔ مثلاً :-

حضور [illegible] علی آصف ؎ بے وفا یاد نہیں تجھ کو وفا کا شیوہ یاد رکھ تو کہ یہ ہم تجھ کو سکھا دیتے ہیں :-

(حاشیہ :- سکھائے۔)

رسالہ — تم بھی بدنام ہو، ہم کو بھی رُسوا نہ کرو — دیکھو پچھتاؤ گے ہم تم کو جتا دیتے ہیں :—

(حاشیہ :— جتائے۔)

واعظِ شہر نہیں ہم، ہمیں کس بات کا ڈر — لاؤ پی لیتے ہیں گر آپ پلا دیتے ہیں :—

(حاشیہ :— پلائے — یہ "ہمہ" بھی قابلِ داد ہے۔)

.....

"اسی طرح اکثر حضرات نے قافیہ کا قافیہ تنگ کیا ہے اور بجائے "لیتے ہیں" محض ردیف کی خاطر سے "دیتے ہیں" استعمال کیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان اور فن میں جدید روح پھونکنے کے واسطے یہ گلدستہ شایع نہیں ہوا۔ دکنی دھو تکنی لگائی گئی ہے۔ اب غالباً حضرت بلبلِ ہند نواب مرزا خاں داغ کو بھی بہت کچھ بھلانا اور سکھانا پڑے۔" (اودھ پنچ۔ یکم ڈسمبر ۱۸۹۸ء۔)

دکن کی سیاست اور ملکی امور پر اودھ پنچ کے کھلے خط سربستہ مضامین" مزاحیہ تنقید کی اچھی مثال ہیں خطوط کی مدد سے بے باک تنقید صحافت میں آج بھی استعمال ہوتی ہے۔ اودھ پنچ نے اس وضع کی کالم نگاری میں بھی ابتدائی نقوش ثبت کئے ہیں۔ جس طرح اردو صحافت میں کارٹونوں کا استعمال اودھ پنچ سے ہوا، اسی طرح خطوط کی مدد سے طنز اور تنقید کی روایت بھی اودھ پنچ ہی سے چلی آتی ہے۔ اودھ پنچ کے اکثر خطوط جو اس نے اپنے دور کی مختلف اہم شخصیتوں کے نام لکھے تھے اچھے انشائیے بھی ہیں۔ ان میں صحافتی مقصد اور ضرورتوں کے ساتھ ساتھ ادبی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ سکندرِ اعظم یونان کا مشہور فاتح اور کم عمر حکمران تھا۔ ارسطو اپنے شاگرد کو ملکی و سیاسی معاملات میں رہنمائی کیا کرتا تھا، اسی مناسبت سے اودھ پنچ خود کو لکھتا ہے اور شاہِ دکن کو نصیحت کرتا ہے۔ اودھ پنچ نے نظام کے نام جتنے کھلے خط لکھے ہیں ان کے پیچھے "راقم ارسطو" لکھا ہے۔ ارسطو کی طرح اسی باوقار انداز سے شاہِ دکن کو نصیحت کی ہے سکندر کی طرح نواب میر محبوب علی خاں بھی کم عمری ہی میں والیٔ تخت و تاج بنا دیئے گئے تھے۔

محمد اکبر الدین صدیقی

میٹھے بچن سناؤں

وجہی

وجہی کے متعلق پہلے مولوی عبد الحق مرحوم نے سنہ ۱۹۲۴ء میں لکھا، لیکن اس میں اس کے نام کے بارے میں کوئی صراحت نہ کی۔ اردوئے قدیم میں اس کا کوئی ذکر نہیں اور ڈاکٹر زور اور نصیر الدین ہاشمی نے بھی اپنی تصانیف اور تذکروں میں اس کا ذکر کیا ہے، لیکن نام کے بارے میں کوئی صراحت نہیں کی، قیاساً وجیہہ الدین لکھا ہے۔ ڈاکٹر زور نے تذکرۂ مخطوطات جلد چہارم صفحہ ۲۷۴ میں اس کے مدفن کی اطلاع دی ہے کہ وہ درگاہ حضرت شاہ برہنہ صاحبؒ میں دفن ہے۔

اختر حسن صاحب نے "ہماری زبان" کے ذریعے وجہی کے فارسی دیوان کو متعارف کیا جو سالار جنگ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس سے وجہی کے نام کے متعلق پتہ چلا کہ اسد اللہ تھا اور فن شعر میں اس نے مرزا محمد امین روح الامین وزیر سلطنت سے اصلاح لی۔ وہ گولکنڈے کا باشندہ نہیں تھا، بلکہ اس کے باپ یا دادا خراسان سے آئے تھے اور گولکنڈے میں اس کے باپ کو قیام کا موقع ملا جہاں غالباً وہ محمد ابراہیم قطب شاہ (۹۵۷-۹۸۸ھ) کے عہد میں پیدا ہوا، اور اسی کے عہد میں شعر گوئی شروع کی۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸-۱۰۲۰ھ) کے عہد میں اس نے کافی عروج حاصل کیا۔ سنہ ۱۰۱۸ھ میں قطب مشتری لکھی اور سنہ ۱۰۲۰ھ کے بعد کسی وقت سلطان محمد قطب شاہ (۱۰۲۰-۱۰۳۵ھ) کا معتوب ہو گیا۔ یہ عتاب غالباً اس کی رندانہ طبیعت کی بناء پر ہوگا۔ اس کی شہادتیں اس کے فارسی دیوان میں بے شمار ہیں۔ سلطان محمد قطب شاہ ظل اللہ تخلص کرتا تھا، اور عوام میں بھی وہ ظل اللہ ہی کے لقب سے مشہور تھا۔ اس نے معتوب ہونے کے بعد بادشاہ کی ہجو میں اشعار لکھے اور زیادہ تر لفظ ظل اللہ ہی کو اپنا نشانۂ ملامت بنایا، چنانچہ ذیل کے اشعار اس کی شہادت دیں گے:۔

مرداں ابلہی بودند کہ دیوانہ شدند   آنکہ میرد نتواں گفت کہ او ظل خداست
از گرسنگی مردم وشہ ہیچ نداد   آری بتواں گفت کہ ایں سایۂ تست

......

چشمۂ مظلمم منزل من ظلمات است   خورشیم سنگ سیہ در گذر او قاتست
شاہ را کس چہ بگوید کہ ترا ہیچو نہ کرد   الحق از سایہ گنہ نیست گنہ از ذاتست

......

نام از کشمکش گرسنگی ضایع گشت   سایہ بر تخت نشاندست چرا خود ننشست

......

لطف شہ صورت عتاب خداست   خدمتش خواری عذاب خداست
شاہ را سایۂ خدا خواندند   لیکن از شاہ آفتاب جداست

......

سایہ حق ہمہ گویند بشہ اہل عقول   ایں سخن را بضرورت بتواں کرد قبول
سایۂ از دل کس ہیچ خبر نیست وجہیہ   کاشکے سایہ نمی داشت خدا ہمچو رسولؐ

......

من بندۂ آں رندِ غنی ام کہ مراد   نے از تو طلب کرد و نہ از سایۂ تو

......

بہر حال اس نے اس مضمون کے متعدد اشعار لکھے ہیں جس سے وجہی اور بادشاہ کے درمیان ناگوار تعلقات کا اظہار ہوتا ہے۔

یہ بات تو نہیں کہ اس نے اپنے عفوِ تقصیر کے لئے جد و جہد کی، جیسا اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

بر درِ عالم چنیں بیہودہ می گردی چرا   آنچہ می خواہی وجہی از شہ عالم طلب

لیکن شاید اس کے حاسدوں اور دشمنوں کا پلہ بھاری تھا جیسا کہ اس نے ایک جگہ کہا ہے ؎

عبث از من جدا کرد است دشمن بادشاہم را   گنہ از اوست کو ناحق بشہ گفت ایں گناہم را
بگو غیر شہ رسانیدہ است جرمی را کہ لائق نیست   پناہ خویش می سازد بہ ایں حیلہ پناہم را
عیاں حق می کند پیش شہ حق گوی حق ناحق   امیدِ سُرخ روئی است بختِ روسیاہم را

او راس طرح اس کے دشمنوں نے کم از کم محمد قطب شاہ کے عہد میں اس کو دربار میں جمنے نہ دیا اور اس کو عاجزی و الحاح کے بعد ہجو گوئی پر اُتر آنا پڑا۔ اس کا خمیازہ بھی اس نے بھگتا اور فاقوں پر فاقے کرتا چلا گیا، چنانچہ اپنے فاقے کا ایک جگہ اس طرح ذکر کرتا ہے ؎

می خورد فاقہ مرا لقمۂ نانم گویا   بے خورش جسم روانست روانم گویا
بجز از گرسنگی ہیچ دگر کاری نیست   در دہستاں خراب رمضانم گویا

......

اس سے بھی زیادہ سخت اور خطرناک خیال ملاحظہ ہو ؎

وقتست کہ زایماں و لقیں برگردم — ہم در طلب مذہب دیگر گردم
زیں فاقہ سر روزہ در سنت اگر — در دین کلیم آیم و کافر گردم

کتنے دردناک پیرایہ میں بیان کرتا ہے ؎

بگذشت بغم روز و شب آمد چہ کنم — اندوہ بجائے طرب آمد چہ کنم
کس نیست کہ یک پارچہ نانی بدہد — از گرسنگی جاں بلب آمد چہ کنم

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ وہ بادشاہ کا معتوب تھا اس لئے کسی کی اتنی جراءت نہ تھی کہ اس کی مدد کرتا۔ حتیٰ کہ سوری راؤ نے بھی اس کو سال بھر تک وظیفہ نہ دیا اور ہمیشہ بہ قول وجہی: "کیا ہتا ہے دئینگے جاؤ" جیسے جملوں سے مدارات کرتا ہے۔ — وہ شاعری سے بیزار ہو کر کچھ کام کرنا چاہتا ہے، کہتا ہے ؎

شعر گفتی بلک در سفتی ہمہ لیکن وجہی — کار باید کرد کز دی سیم و زر پیدا شود
سخن ہائے دروغ چند راعزت چہ خواہد بود — وجہی شاعری بگذار و فکر کار دیگر کن

انھیں حالات سے تنگ آکر وہ سفر کا ارادہ کرتا ہے اور کہتا ہے ؎

وجہی با چنیں فضل و ہنر بے سیم و زر مشیں — بہ اقلیم دگر رو خیز تا کے در دکن باشی

لیکن جب ۱۰۳۵ھ میں محمد قطب شاہ کا انتقال ہوتا ہے تو اس کے دن پھرتے ہیں اور عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں جب کہ وہ کافی بوڑھا ہو چکا ہے اس کی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ ۱۰۴۵ھ میں وہ "سب رس" لکھتا ہے اور غالباً اس کے بعد آخری زمانے میں "تاج الحقایق" کی تصنیف عمل میں آتی ہے۔ آخری دور میں وہ مذہب کی طرف رجوع ہو گیا تھا۔ "سب رس" کے ایک مخطوطہ میں وجہی کو چشتیہ سلسلہ میں شاہ علی متقی کا مرید بتایا ہے جو پیر شاہ باز کے خلیفہ تھے۔ غالباً اسی تعلق کی بنا پر اس نے "تاج الحقایق" جیسی کتاب لکھی۔ اگرچہ اس کی زبان قطب مشتری اور سب رس سے سلیس ہے، — بعض داخلی لسانی شہادتیں اس امر کا اشارہ کرتی ہیں کہ یہ وجہی کی تصنیف ہے۔

وجہی کا انتقال ۱۰۶۶ھ اور ۱۰۸۱ھ کے درمیان ہوا اس لئے کہ ابن نشاطی نے اپنی مثنوی (سنہ تصنیف ۱۰۶۶ھ) میں گذرے ہوئے شعرا کے نام دیئے ہیں اور وجہی کا نام اس میں شریک نہیں ہے۔ طبعی نے اپنی مثنوی "بہرام و گل اندام" (سنہ تصنیف ۱۰۸۱ھ) میں وجہی کے انتقال کی خبر سنائی ہے۔ ابھی تک کوئی اور ایسی شہادت نہیں ملی ہے جس سے اس کے سنہ انتقال کو قطعیت دی جاسکے۔

"سب رس" کے ایک اور مخطوطہ سے اس کے مدفن کا پتہ ملتا ہے کہ وہ سید حسن برہنہ شاہ صاحبؒ کی درگاہ میں چمپا پیٹ (قریب چنچلگوڑہ) میں دفن کیا گیا۔ سید حسن برہنہ شاہ بھی عبداللہ قطب شاہ کے عہد کے ایک بزرگ تھے اور مالک پرست خاں ایک قطب شاہی امیر ان کا معتقد تھا جس نے ان کے انتقال پر ان کی درگاہ تعمیر کی اور خود بھی

وہیں دفن ہوا۔ اس کے چند لڑکے بھی وہیں دفن ہیں۔

چند غزلیں جو قطب مشتری میں شامل ہیں طبع ہو چکی ہیں۔ اس کا اردو کلیات ابھی تک بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ اس کی ایک غزل سعادت مرزا صاحب نے "ایک قدیم بیاض" کے عنوان کے تحت رسالۂ اردو میں شایع کی ہے۔ یہ غزل ہماری بیاض میں بھی ہے، اس میں کچھ اشعار زیادہ ہیں اور لفظوں میں بھی بعض جگہ اختلاف ہے، اس لئے یہ پوری غزل پیش کی جارہی ہے۔ اس کے علاوہ دو غزلیں اور ہیں، ان میں دوسری غزل کرم خوردگی کی وجہ سے ناقص رہ گئی ہے۔

گفتارِ وجہی

تجہ پاس[1] سوں[2] ماتے[3] ہمے[4] پھر کیف کھانا کیا سبب
تن من جلا جوگی ہوئے پھر راکھ[5] لانا[6] کیا سبب[7]

ہے کوئی ایس[8] کوں نا منگے جیو اس سوں لانا کیا سبب
اس دل سکیا[8] کوں آپنے پھر دوکہ[9] میں بھانا کیا سبب[10]

ہے بست[11] گئی ہے ہات نے اوپر کے پھرآیا کدھاں
دھندے نے کیا ہوگا نفع اوپچ گنوانا کیا سبب

عاشق ہو لوں[12] سنبھال کر انکھیاں کو پٹی باندھ کر
توں کیوں[13] ایک[14] کوں دیک کر ہوتا دوانا کیا سبب

اک بار آزما دیکھ کر کھائے: دتھا سو بس نہیں
صورت پرائی دیکھ کر ہوتا دوانا کیا سبب

تجہ زلف کے یک تار سوں زنار کر گھالوں[17] گلے
گنگا دھرے[18] توں جیو میں کاشی کوں جانا[19] کیا سبب

تجہ[20] عشق کے کوچے منیں کاندھاں[21] جو پر سر پھوڑتیاں[22]
اس مار کوں راضی ہونا گر نہیں تو آنا کیا سبب

---

۱ خوشبو ۲ سے ۳ متوالے ۴ ہم ۵ لگانا ۶ یہ شعر سعادت مرزا صاحب کے مضمون "ایک قدیم بیاض" مطبوعہ رسالہ اردو ۱۹۳۸ء میں نہیں ہے ۷ اپنے آپ کو ۸ شکستہ دل ۹ رنج و غم میں مبتلا کرنا۔

۱۰ سعادت مرزا صاحب نے "ایس کوں" کو "آپ کوں" "جیو" کی بجائے "دل" اور دوسرے مصرعے میں "دل" کی بجائے "جیو" اور "پھر دوکہ" کی بجائے "چپ دوکہ" لکھا ہے ۱۱ صرف نسخہ سعادت مرزا صاحب میں ہے ۱۲ نسخہ "عاقل" ۱۳ نسخہ "پکا" ۱۴ نسخہ۔ توں یو ۱۵ ایک کو ۱۶ یہ شعر نسخہ سعادت مرزا صاحب میں نہیں ہے ۱۷ ڈالوں۔

۱۸ تیرے دل میں خود گنگا موجود ہے ۱۹ تو کاشی جانے کا کیا سبب ہے۔

۲۰ نسخہ سعادت مرزا صاحب میں سے "اے عشق کا کو بچا ہے کاندا پجہ پر سر پھوڑتیاں" دوسرے مصرعے میں "گر" کی بجائے "یا" ہے ۲۱ کندھے ۲۲ سر پھوڑتے ہیں۔

عشق کیے سو دجھیا کھنیاں ڈونے گڑ گئے پھوٹے
سو بھار اپس سوں نا او چے او بھار اوچانا کیا سبب

—(۲)—

ہے دل میں تیرا عشق لئی کیوں کے ٹھرے گا دیکھنا — کوئی لگ مجھے عالم منے رسوا کرے گا دیکھنا
دیدیاں کے کھارے پانی کے تالیاں بہوت ڈونگیاں ہیں — آسمان یا دل کا کھڑا کیوں کر بھرے گا دیکھنا
اعجاز ہے دھن اس اوپر ہرگز منتر چلتا نہیں — دل ہم تو لئی کڑنا وہے کیوں منترے گا دیکھنا
مجھ سوں زمانہ زور دھند .... — کرتا جو کچھ تھا سو کیا، ابھی کیا کرے گا دیکھنا
نیناں جھرے ہیں لعو بھرے ہرگز ابالے نیں رتی — لعو اس جھریاں میں تے ابھوں کو لگ بھرے گا دیکھنا

—(۳)—

اس غزل کے اکثر اشعار کرم خوردہ ہیں، پڑھے نہ جاسکے —

کالے بنداں پڑے ہیں .... — میں اپس کا لکھنے قلم رکھیا ہوں
.... مکھ میں ہات میں پسار یا — اپس کوں .... اپنی شرم رکھیا ہوں
باطن فقیر ہو کر ظاہر غنی رہا ہوں — لوگاں میں بارے جیوں تیوں گھر کا بھرم رکھیا ہوں
اپنے خدا بغیر بھی کس پاس کچھ منگیا نیں — لوگاں پر اس دنیاں کی امید کم رکھیا ہوں

۱؎ نسخہ سخاوت مرزا صاحب میں ہے —

گڑ گئے بھیٹے کو نیاں ٹوٹیاں پیرت کوں دھو دھو دجھیا — جے بھار اپس سوں تا اوٹھے سو بھار اوچا نا کیا سبب

۲؎ گھٹنے ۳؎ جو بوجھ اپنے سے نہ اٹھایا جاسکے اس کو اٹھانے کا کیا سبب، یا کیا ضرورت ہے ۴؎ بہت ۵؎ ختم ہوگا ۶؎ کب تک ۷؎ میں ۸؎ آنکھیں ۹؎ یہ لفظ بغیر نقطوں کے لکھا ہے اس کو میں نے تالیاں (جمع تال) پڑھا ہے۔ یہ نالیاں بھی پڑھا جاسکتا ہے لیکن تالیاں ہی موزوں نظر آیا ۱۰؎ بہت ۱۱؎ محبوب ۱۲؎ بہت ۱۳؎ منتر پھونکا جاسکے گا ۱۴؎ اور ۱۵؎ آنکھیں ۱۶؎ جھرنے یا چشمے ۱۷؎ رتی بھر بھی نہیں اُٹھے ۱۸؎ ان چشموں میں سے ۱۹؎ ابھی کب تک نکلتا رہے گا ۲۰؎ کے سامنے ۲۱؎ پھیلایا۔

یوسف ہستی

شگفتہ اور شگفتہ

"ہستی ——!"

"ہاں ڈیئرسٹ"

"تو آج پھر جل ہی گئے نا آپ اُس کے نام پر ——؟"

"تو کیا خوش ہولوں اور ——ناچوں تمہاری طرح؟"

"تو گویا میں ناچ رہی ہوں ؟!"

"نہیں تو گویا رو رہی ہیں کسی غم میں ؟"

"کاہے کا غم ——؟"

"غم پرائے غم ——؟"

"یہی تو جلن ہے آپ کو کہ میرے کوئی غم نہیں!"

"جلن! جلن تو صرف ایک عورت کو دوسری عورت کی خوبیاں سن کر ہوا کرتی ہے!"

"بعض دفعہ مرد بھی عورتوں کی طرح جل جاتے ہیں!"

"اس فکر کا دوسرا نام جلن یا خلش بھی تو ہو سکتا ہے؟ میں تو کہوں گی یہ خلش یا جلن ہے بڑے کام کی چیز۔ بشرطیکہ کوئی مغلوب الغضب نہ ہو جائے!"

"وہ کیسے ——؟"

"یہ جلن، کوفت یا خلش انسانی کوتاہیوں یا خامیوں پر نظرثانی کروا سکتی ہے، جذبۂ عمل کو حرارت عطا کر سکتی ہے؟"

"تو کوتاہیوں اور خامیوں کا علاج ممکن ہے؟"

"میری نظر میں ناممکن بھی نہیں!"

"تمہاری نظر میں گہرائی ہے؟"

"گہرائی نہ سہی ——مگر گہرائی تک پہنچنے کی ہمت تو ہے؟!"

"بعض فطری کمزوریوں یا کوتاہیوں کا علاج ہی نہیں ہو سکتا، خصوصاً جن کا تعلق احساسات سے ہوتا ہے۔"

"غلط ——! ہر جذبہ پر غالب آنا انسان کے بس میں ہے ——فطرت اتنی بے رحم نہیں ہوتی ڈیئر ——جتنا کہ آپ خیال کرتے ہیں!"

"اچھا تو یہ ——یہ تمہاری محبت ——؟"

"فی الحال اس کو اسٹڈی ان لو سمجھو!"

"گڈ ——! محبت نہ ہوئی تعمیر مکان ہوئی کہ مسالہ و سامان اکٹھا کیا جا رہا ہے؟"

"عقلمندوں کے دل میں نقشہ اُبھرتا ہے اور دماغ تعمیری کام انجام دیتا ہے ——اب اس کو محبت کہہ لو یا ——مقامِ زندگی؟!"

"زوالِ زندگی ——؟!"

"نظر اپنی اپنی ——فکر اپنی اپنی!"

—— اور میں اپنی کوتاہیوں کو دُور کرنے، فکر و عمل میں گہرائی و بلندی حاصل کرنے کے لئے برسوں مارا مارا پھرتا رہا۔ اِس دوران ایک دن معلوم ہوا کہ شگفتہ نے کسی سے شادی کر لی ہے ——شاید یہ خوش نصیب اس کی کسوٹی پہ پورا اترا ہو!

میرے اُس کے جذباتی معیار پر پورے نہ اترنے پر بے حد غصہ آتا رہا — یہ غم و غصہ عرصہ تک حاوی رہا — اور پھر میری بھی شادی ایک ایسی لڑکی سے ہوگئی جو زندگی کو شاعرانہ محسوسات و نظریات سے زیادہ خالص گھریلو انداز میں پرکھتی ہے — اسی انداز سے اب زندگی بنتی اور سنورتی جا رہی ہے اور — میں نے چُپ سادھ لی ہے جیسے زندگی کا کوئی ہارا ہوا جُواری عالم بدحواسی میں خاموشی اختیار کرلیتا ہے اور دوسرے کی جیتی جانے والی بازیوں کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھتا رہ جاتا ہے۔ شاید اسی کا نام مُقدر ہو۔ اور میں اپنے مقدر پر روز بروز شاکر و صابر بنتا گیا —

حتیٰ کہ زندگی کے اِن پانچ چھ برسوں میں لوگوں نے مجھے صابری کے نام سے مشہور کر ڈالا ہے، حالانکہ یہ میرا اپنا اصلی نام نہیں!

اور — شگفتہ جو کبھی دل و دماغ پر تازگی بن کر چھا جاتی تھی اب اس پھول یا پتہ کی طرح کتابِ دل کے ایک کونے میں سکڑ کر رہ گئی تھی جیسے بچے کسی کھیل یا دلچسپی کی خاطر کسی کتاب میں رکھ چھوڑتے ہیں۔

وقت نے پھر کروٹ بدلی اور زندگی کے سات سال گذر گئے اور آٹھویں سال پھر اُسی شہر میں لوٹ آنا پڑا جہاں میرا ماضی اُفتادہ زمین کی طرح پڑا تھا — اور جس پر حالات و واقعات کی منوں مٹی پڑ چکی تھی، لیکن زمین بنجر نہیں ہونے پائی تھی۔ اپنے چہرے، اپنا ماحول، اپنی بستیاں — پرانی باتیں — پرانی یادیں دل و دماغ کو گرماتی رہیں اور — ایک کھوئے ہوئے پھول کی یاد کا ننھا سا بن کر چبھنے لگیں۔

سہ پہر کا وقت تھا، طبیعت پر آسمان کی طرح ہلکا ہلکا ابر چھایا ہوا تھا، دماغ نے کئی استدلال کی کمندیں پھینکیں مگر دل صاف بچ کر نکل گیا — اور میں نکل پڑا اُس سمت جہاں شگفتہ کا پتہ مل سکتا تھا۔

بس اسٹانڈ کی قطار میں ذات پات، امیر غریب، عورت مرد، کمزور قوی سبھی جیسے ایک ہی رسّی میں بندھے ہوئے کھڑے تھے — بس آکر اسٹیج پر رُکی اور ہلکی سی کھلبلی مچی اور میں بس سے باہر نکل آیا۔

اور میرے منہ سے دفعتاً نکلا: —

"شگفتہ —!"

"سفید ساری اور زردی مائل بلوز میں ملبوس بدن رُک سا گیا"

"کہاں ہو —؟ کیسی ہو؟ میں تمہاری طرف ہی آرہا تھا!"

"تو چلیئے پھر — یہ سڑک پر باتیں کیسی؟!"

— ہم دونوں چلنے لگے — راستہ تمام میں صرف نظروں سے دیوانوں کی طرح گھورتا رہا — شگفتہ کو — اور اُس ماحول کو جس سے ہم گذر رہے تھے —

دل و دماغ میں یکسانیت پیدا ہوتی تب کچھ بات بھی کر پاتا۔ خیالات و جذبات کا ایک تلاطم تھا جو میری آنکھوں میں اُمڈ کر رہ گیا تھا — اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں آنکھوں سے کچھ بول رہا ہوں — سُن رہا ہوں — ہنس رہا ہوں۔ اور رو رہا ہوں —

اور قدم ملا کر چلتا رہا — ایک سایہ کی طرح۔

شگفتہ نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا: —

"آئیے ــــ کرسی پر دہ نہیں!"

"چلئے ــــ!"

"بیٹھئے ناصوفہ پر ــ آپ کا تکلف اب تک چھوٹا نہیں ؟!"

"ٹھیک ہے کرسی بھی بُری نہیں ــ آرام پانے والوں کو کانٹوں پر بھی آرام مل سکتا ہے"۔

"کانٹوں پر ــــ! گویا آپ یہاں آکر کانٹوں سے اُلجھ گئے!"

"ایسا محسوس کیا ہوتا تو آتا کیوں کر؟"

"کون جانے ــ؟ خیر! کیا منگواؤں آپ کے لئے چائے یا کافی؟"

"صرف ٹھنڈا پانی!"

"پھر مہمان نوازی ــ؟"

دل میں یہی رہتی ہے ۔ چائے اور کافی بھی تو پانی سے بنتی ہے نا؟"

"پانی اور چائے میں اتنا ہی فرق ہے جتنا آپ کے اور میرے گوشت و استخواں میں ــــ حالانکہ گوشت و استخواں ایک ہی ہیں، پھر بھی فرق باقی ہے صنعت کا ــ اور لذت کا!"

"ٹھیک ہے چائے ہی منگوا لو ــ اب فلسفیوں سے کون بحث کرے؟"

"ہاں! اب کہو "وہ" کہاں ہیں؟ بچے کہاں ہیں؟ ارــ یہ تم اتنی دبلی ہوگئی ہو؟"

"تمہاری نظریں موٹی ہوگئی ہیں تمہاری طرح ــــ باقی میں ٹھیک ہی تو ہوں!"

"ہوسکتا ہے؟ مگر "وہ" اور بچے کہاں ہیں؟"

"عزیز! وہ آتے ہی ہوں گے ۔ شاید تم بس انہی سے ہی ملنے آئے ہو؟!"

"کیا بچے اپنے باپ کے ہمراہ جاتے ہیں؟"

"وہ آئے تو دیکھ لینا ــ!"

"مگر یہ تم یکدم اتنی اُداس کیوں ہوگئیں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"مجھے کیا ہوا ہے؟ ٹھیک ہی تو ہوں ۔ دراصل تمہارے دیکھنے کا انداز بدل گیا ہے ۔ یوں عینک چڑھا لیں تو اچھا رہے گا!"

"عینک تو چڑھا لوں گا کسی ڈاکٹر سے مشورہ لے کر، مگر اس وقت تو میری نظریں ٹھیک ہی پڑھ رہی ہیں"۔

"اُداسی کوئی کتاب یا کوئی تحریر نہیں ــــ! پھر کیسے یقین کرلوں کہ تم نے کچھ پڑھا ہے"۔

"چلو پڑھا نہیں ــ سمجھو محسوس کیا ہے ــ اب کہو یہ غلط ہے؟"

"بعض وقت ہم پڑھ بھی لیتے ہیں محسوس بھی کرلیتے ہیں ۔ مگر عموماً نتائج نکالنے میں غلطی ہو جاتی ہے!"

"میں سمجھا نہیں ــ؟"

"بد مقو جو ٹھیرے ــ؟!"

"تب ہی تو دور ہوئے ــ؟!"

ــــ غم کی چادر اور پھیل گئی ــــ زرد کتاب پر جیسے روشنائی گر گئی ہو ــــ اور اس فضا کو "آپا" نے یہ کہہ کر توڑا ــ

"چائے حاضر ہے ــ!"

شگفتہ نے ایک پیالی بڑھاتے ہوئے کہا :ــ

"پہلے کچھ پھل، بسکٹ کھائیے تب چائے پی لینا ــــ! میوہ صحت کے لئے بے حد مفید اور بسکٹ چائے کا ذائقہ

بڑھاتے ہیں!"

"سچ ۔۔؟"

"نہیں تو کیا غلط ۔۔؟

"وہ تو تمہاری صورت سے عیاں ہے!"

"صورت سے ہر نقش صحیح طور پہ پڑھا نہیں جاتا!"

"پھر بھی کچھ تو پڑھا جا سکتا ہے نا؟ اور ۔۔۔ تم تو اب مشتاق ہو گئی ہو گی ۔۔؟!"

"ارے ۔۔! سیب تو لو ۔ کتنے خوش رنگ و تازہ ہیں یہ!"

"رنگوں کا کیا بھروسہ؟ تازگی ہونٹوں تک آتے آتے بعض دفعہ لطافت کھو دیتی ہے شگفتہ!"

"تمہارے ڈنک مارنے کی عادت نہیں گئی اب تک ۔۔؟!"

"عادت مٹتی ہے بھلا؟ ۔ مجھے یاد ہے برسوں قبل میں نے اس بارے میں کیا کہا تھا اور تم نے کیا جواب دیا تھا!"

"پھر دیکھا تم نے پیچھے کی طرف ۔۔!"

"نہ دیکھتا تو تم سے ملاقات ہوتی اب ۔۔؟"

"اچھا بھابی کہاں ہے اور لائے کیوں نہیں؟ ہاں! تمہارے بچوں کی بابت تو میں پوچھنا ہی بھول گئی! کتنے بچے ہیں؟

"اتنے نہیں کہ ان کا گننا دشوار ہو جائے!"

"پھر بھی ۔۔؟

"تین لڑکے ہیں!"

"تمہاری طرح ۔۔؟"

"نہیں ۔ تمہاری طرح!"

"کیا ۔۔؟!

"ہاں! مگر یہ عزیز کہاں غائب ہیں بچوں کے ساتھ ۔ میں بھی تو دیکھوں تمہارا انتخاب ۔ اور نتیجہ الفتِ شوہر کس رنگ اور روپ کی تخلیق کی ہے؟"

"ایک بات پوچھوں! بشرطیکہ اجازت دیں تم؟

"یہ اجازت کی بھی خوب رہی! کہو نا کیا کہنا ہے؟!"

"مگر وعدہ کرو کہ میری بات مانو گے!"

"کوئی ایسی بات ہے جو تمہارے لیے کر نہ سکوں؟!"

"وعدہ نا ۔۔؟"

"پکا ۔۔!"

"تمہارے بچے میری طرح ہیں نا؟"

"میں تو ۔۔!؟"

"نہیں نا؟! اور یہ کہ تم ان کو اتنا ہی چاہتے ہو جتنا کبھی مجھ کو؟!

"ہاں! مگر ان کی چاہت سے اس بات کو کیا نسبت؟"

"ہے ایک نسبت ۔۔!"

"اب چھوڑو اس فلسفیانہ انداز کو ۔ کہو صاف صاف جو کچھ کہنا ہے!"

"اچھا ۔۔ چائے تو پیو پہلے!"

"پی لوں گا! پہلے بات تو سنوں پہلی بار تم نے ایسا اظہار کیا ہے!"

"پہلے پی لو ۔۔!"

"پی لوں گا ۔ کبھی تو میری بھی سنو؟!"

"اچھا تو سن کر مانو گے نا؟"

"ہاں! کتنی بار کہوں؟"

"تمہارے تین پھول ہیں نا؟ ۔ ان میں سے ایک پھول جو مجھ سے بے حد مشابہت رکھتا ہے مجھے دیدو! ۔ شاید تمہاری شگفتہ کی زندگی میں یہ پھول پھر سے شگفتگی و تازگی لا دے! دو گے نا؟"

دفعتاً میرے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ گئی اور جیسے فرش پر تیزی سے پھیل گئی اور ایک گلدان جو صوفے کے بازو ایک چھوٹے سے ٹیبل پر رکھا تھا پھولوں کی ٹوکری سے گر پڑا ۔ اس میں سے ایک شگفتہ پھول شگفتہ کی گود میں جا گرا! جیسے کوئی معصوم بچہ کسی کی گود میں سما جاتا ہے۔

ڈاکٹر حمید شاہین

(دیہور)

حریفِ مے کی جسارت اگر معاف نہ ہو
مجھے یقین ہے رندوں میں اختلاف نہ ہو

وہ انجمن جو پسِ پردۂ تنفس ہے
مرے جنوں کا وہی مرکزِ طواف نہ ہو

شریکِ جام اسے کر لیا ہے چپکے سے
مراد یہ ہے کہ زاہد مرے خلاف نہ ہو

انھیں کو خارِ مغیلاں سلام کرتے ہیں
جنھیں فسونِ عزائم سے انحراف نہ ہو

جنوں نے لاج تو رکھ لی مری وفا کی مگر
خدا کرے کہ محبت کا اعتراف نہ ہو

ستم بدستِ کرم کر سکو تو کر ڈالو
مزہ تو جب ہے حقیقت کا انکشاف نہ ہو

جواب وہ ہوں تری ہر غلط خیالی کا
گلہ کروں نہ جو شاہیںؔ تو بات صاف نہ ہو

مظفر حنفی

خلوت ہو، یا اُن کی محفل = اُچٹا اُچٹا رہتا ہے دل
کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں = جن کا دہرانا لاحاصل
سچ کہنا جو سیکھ رہا ہوں = قہر نہ ہوگا کب تک نازل
دیوانے کے افسانے ہیں = صحرا صحرا محمل محمل
ایک مثلث ہے دھوکے کا = راہنما، رہزن اور منزل
تیری خاطر بن بیٹھا ہوں = اپنے ارمانوں کا قاتل
غرقابی کے حیلے ہیں سب = کشتی وشتی، ساحل واحل
مرنا بھی آسان ہوا ہے = مشکل جیسی ہے یہ مشکل
میرے تیور بتلاتے ہیں = کتنا روشن ہے مستقبل!
اندھیارے میں اس کے جگنو = مدھم مدھم جھلمل جھلمل
طنز، مظفرؔ، شادؔ[۱] کا صدقہ
ورنہ ہم تھے ہی کس قابل

[۱] شادؔ عارفیؒ (استاد مرحوم)

عنوان چشتی

جب زلف شبیہ ہو گئی ہے
خود اپنی اسیر ہو گئی ہے

جو بات تری زباں سے نکلی
پتھر کی لکیر ہو گئی ہے

اب خیر نہیں کسی کے دل کی
وہ آنکھ شریر ہو گئی ہے

جنت کے مقابلے میں دنیا
آپ اپنی نظیر ہو گئی ہے

شاید کوئی "بے نظیر" بن جائے
وہ بدر منیر ہو گئی ہے

لہرا کے ہنسی لبوں پہ ان کے
جلووں کی لکیر ہو گئی ہے

اے بادِ صبا! نہ چھو کے گیسو
خوشبو کی سفیر ہو گئی ہے

ساقی کی نگاہ میکدہ میں
مستی کی سفیر ہو گئی ہے

جو آہ مرے لبوں تک آئی
ار حسن کا وہ تیر ہو گئی ہے

دیوانوں سے جا کے کوئی کہہ دے
رانجھا کی وہ ہیر ہو گئی ہے

آوازِ شکستِ دل ہی عنوان
آوازِ ضمیر ہو گئی ہے

ممتاز راشد

صحنِ گلستاں چھوڑ آئے ہم ریت یہ ہے دیوانوں کی
صحرا صحرا معصوم ہوائیں، سیر کریں ویرانوں کی

ہر کھڑکی کی آنکھیں ویراں، ہر دروازہ مہر بہ لب
ہوک اٹھتی ہے دل میں صورت دیکھ کے بند مکانوں کی

روزِ جزا ہے کیسے اس تک فردِ ستم ہم پہنچائیں
سب کو اپنی فکر پڑی ہے کون سنے دیوانوں کی

زخمی خواب، سلگتی یادیں کاسۂ دل میں لے آئے
راشد جب بھی اس کی گلی میں بات چلی نذرانوں کی

باقر منظور

صہبائے زندگی جو بنے بادۂ نشاط
کیوں جھوم کے جھوم لے نہ قدم موجِ انبساط
پہنچے نہ آبگینۂ دل کو تمہارے ٹھیس
لفظوں کے انتخاب میں کرنا ہوں احتیاط

مفہوم ربط و ضبطِ محبت بدل گیا
شاید برائے نام ہے اب حرفِ ارتباط
انسان دوست اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
انسانیت کی کوئی الٹتا چلا بساط

ہر موڑ پر ہے حسن کا نظارۂ لطیف
اے عشق چھٹنے پائے نہ دامانِ احتیاط
مجھ کو فضائے درد میں ملنے لگا سکوں
آغوش اپنی وا نکرے پیکرِ نشاط

غم ہے ازل سے نقطۂ آغازِ زندگی
طبعاً حدودِ فکر کا ہے غم سے ارتباط
باقر وہاں حیات بناتی ہے دائرہ
ملتے ہیں حسن و عشق کے آکر جہاں نقاط

• • • • • • •

گوہر تریکیروی (میسور)

یکساں سلوک ہو ترا ساقی تمام سے
غیرت عزیز ہوتی ہے رندوں کو جام سے
گلشن کا ذرہ ذرہ ہے شاہد اے باغباں
گلشن اجڑ گیا ہے ترے بد نظام سے

منزل کی آن کے واسطے ہے جستجو فضول
جو عمر بھر نہ بڑھ سکے دو چار گام سے
توبہ نبھائی جائے گی اہلِ حرم کہاں!
میخانہ سج رہا ہے بڑے اہتمام سے

کیسے نہ اعتبار کروں اس رقیب پر
آغاز ہو رہا ہے وفا کا سلام سے
لو، میکدہ میں آگیا اک انقلاب نو
ساغر اٹھائے جائیں گے صد احترام سے

ملتے ہی آنکھیں جھک گئیں آنکھیں حریف کی
باز آگیا حریف مرے انتقام سے
گوہر جو خود غرض ہیں انہیں نذر کے کام ہے
شاعر کو داد ملتی ہے شیریں کلام سے

• • • • • • • •

نقد و نظر

کربل کتھا: — تصنیف فضل علی فضلی ۔ مرتبہ جناب مالک رام صاحب و ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو ۔
ناشر:۔ ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ ۔ کتابت طباعت اور کاغذ نفیس اور عمدہ صفحات ۳۴۸ ۔ مجلد قیمت ۶ روپے ۔
ملنے کا پتہ :۔ جامعہ ملیہ ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۔

ملّا حسین واعظ کاشفی اپنے علم و فضل کی بنا پر بہت بلند مقام کے مالک ہیں ۔ علوم معقول و منقول میں ان کی تیس پینتیس تصانیف ہیں، لیکن ادب میں انوار سہیلی اور اخلاق محسنی، اور فن تفسیر میں جواہر التفسیر اور تفسیر حسینی نے ان کے نام اور کام کو حیات جاودانی بخشی ۔ ان کے علاوہ روضۃ الشہدا ان کا ایسا کارنامہ ہے جو ہر دور میں نہ صرف یہ کہ مقبول رہا بلکہ اس کے ترجمے بے شمار زبانوں میں ہوئے ۔ روضۃ الشہدا کا سنہ تصنیف ۹۰۸ھ ہے اور نوسرہار کا ۹۰۹ھ ۔ ”روضۃ الشہدا“ ہرات میں لکھی گئی اور ”نوسرہار“ قصبہ فخرآباد متعلقہ انبڑ ضلع اورنگ آباد میں ۔ اس کے بعد روضۃ الشہدا کے متعدد ترجمے ہوئے اور دکنی میں اس قسم کی متعدد تالیفیں اور تراجم لکھے گئے ۔ پیش نظر کتاب ”کربل کتھا“ کے لکھے جانے سے قبل دکن میں روضۃ الشہدا کے کئی ترجمے ہو چکے تھے، ان میں سب سے زیادہ مقبولیت میر فیاض ولی ویلوری کی روضۃ الشہدا کو نصیب ہوئی جس کے متعدد خطی نسخے ملتے ہیں ۔ حیدرآباد کے سب ہی مشہور کتب خانوں کے علاوہ خانگی کتب خانوں میں بھی اس کے کئی نسخے موجود ہیں جو اس کی مقبولیت پر دال ہے ۔

فضل علی فضلی نے یہ کتاب نثر میں ترجمہ کی ۔ ترجمہ ۱۱۴۵ھ میں ہوا اور ۱۱۴۸ھ میں نظر ثانی اور تکمیل کے بعد اس کے متعلق لوگوں کو علم ہوا ۔ قیاس یہ ہے کہ اس کے دو تین نسخوں سے زیادہ کی نقل نہ ہوئی ۔ یہ خیال اس لئے پیدا ہوا کہ موجودہ کتاب ایسے اہتمام سے لکھی گئی ہے جس کا مسودہ سامنے موجود تھا ۔ کریم الدین نے طبقات الشعرا میں اس کا ذکر کر کے اس کو ضائع ہونے سے بچا لیا ۔ اس طرح شمالی ہند کی نثر کی اولین کتاب آج فاضل مرتبین کی کوششوں سے منظر عام پر آ سکی ! اس کو حاصل کرنے میں جو محنت برداشت کی گئی وہ محققین کے لئے ایک درس سے کم نہیں ۔ ان جنگجو اور وحشیانہ مظالم ڈھانے والے جرمنوں پر صد ہزار آفرین ہے جنھوں نے ہندوستان میں لکھی گئی کتابوں کو حفاظت کی خاطر ان دور دراز دیہات اور قصبات کے کتب خانوں میں قومی گاڑیوں میں بھر بھر کر پہنچا دیا جہاں تک جنگ کے شعلے نہ پہنچ سکتے تھے ۔ ہمارے لئے یہ بھی ایک بہت بڑا درس عبرت ہے ۔

فاضل مرتبین نے ایک سیر حاصل مقدمہ دیا ہے۔ اس میں ایک مقام پر یہ کہا گیا ہے کہ "کربل کتھا" کی تالیف سے پہلے پہلے ۱۱۳۳ھ/۲۲-۱۷۲۱ء میں ولی کا دیوان دلی پہنچ چکا تھا۔ حالانکہ واقعہ جو پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا یہ کہ محمد یار خاں کی صوبہ داری کے زمانے میں ۱۱۱۲ھ میں خود ولی دلی میں تھے سید محمد فراقی بیجاپوری، فقیر اللہ آزاد حیدر آبادی، محمد فقیہ درد مند وغیرہ دلی میں ان سے ملے ہیں۔

کتاب کی لسانی اہمیت کو پیش نظر رکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ دکنیوں کی طرح انھوں نے بھی علامت فاعل "نے" کا استعمال نہیں کیا۔ جمع الجمع بھی وہ استعمال کرتے ہیں مفعول کے ساتھ فعل کو متعلق کرنے کی بجائے فاعل سے متعلق کرتے ہیں۔ دکنیوں کی طرح "دوسرے" کے لئے "دوجا" "سے" کے لئے "سیتی" "زمین" کے لئے "بھیں" اور "وہاں" کے لئے "وہاں" استعمال کیا ہے، اگرچہ کتابت "وہاں" کی گئی ہے فضلی ا، ں لگا کر جمع بناتے ہیں جیسے کتاباں، دشمناں، زلفاں لیکن اس کے ساتھ و، ں سے بنی ہوئی جمع بھی ملتی ہے، جیسے کوفیوں، ہتھیاروں۔

فاضل مرتبین نے حاشیوں میں الفاظ کے معنے دیئے ہیں بعض معنوں سے ہمیں اختلاف ہے مثلاً :۔ کھیل خفیف سا یا تھوڑا سا (صفحہ ۱۰) بمعنی دانہ (ص۱۱۴) دیا گیا ہے۔ کھیل، اصل میں جوار کو چنے کی طرح بھون لیا جاتا ہے اور یہ پھولے چنے کی کیفیت اختیار کرتی ہے۔ غریب لوگ آٹا پیسنے، گوندھنے اور پکانے سے بچنے کے لئے کھیلیاں کھاتے ہیں۔ اس طرح جوار کا بھونا اور پھولا ہوا دانہ کھیل کہلاتا ہے اسی لئے فاقہ کی کیفیت کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ ایک کھیل بھی اڑ کر منہ میں نہ پڑی ۔۔ اسی طرح اوکنا (ص۹۵) اوبکائی لینا نہ کہ قے کرنا۔ مایا (ص۱۰۸) سرمایہ نہ کہ کھیل (دیکھی ہی سرمایہ ہے) ۔۔ بدل، بمعنی لئے یا واسطے نہ کہ عوض ۔ مجھ بدل، یعنے میرے لئے ۔۔ بدھی (ص۱۹۲) صرف ہار نہ کہ پھولوں کا ہار۔

"کربل کتھا" کا خطی نسخہ جس کی تین صفحوں کی تصویریں دی گئی ہیں، بہت صاف ہے، البتہ کاتب کی کم سوادی نے مشکل پیدا کی ہے۔ فاضل مرتبین نے حاشیہ آرائی کے لئے جو زحمت اٹھائی ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہوگا متن میں آنے والے کرداروں کی مستند تاریخوں کے حوالے سے تفصیلات، کلام مجید کی آیات کی تشریح اور ان کی نشان دہی، حدیثوں کے ماخذ اور "روضۃ الشہدا" سے فضلی کی "کربل کتھا" کے اختلافات کی وضاحت نہایت عرق ریزی کا کام ہے جس کو باحسن الوجوہ پورا کر دکھایا ہے۔ کتاب کی پیش کشی کے لئے نہ صرف فاضل مرتبین ہی مبارک باد کے مستحق ہیں، بلکہ جناب قاضی عبدالودود صاحب بھی قابل مبارک باد ہیں۔ ہم ان ہر سہ حضرات کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ اس وقت وہ جرمن لائبریرین بھی اردو کے ایک محسن کی شکل میں ہمارے سامنے ہے جس نے ڈاکٹر آرند صاحب کو نسخہ تک پہنچنے میں مدد دی اور وہ وحشی فوجی بھی جنھوں نے اس کو نذر رکھنے کے لئے سنتاقی گولیوں میں سے گذر کر دیہاتی کے کتب خانے میں پہنچا آئے۔ کاش ہمارے ہم وطن بھی

سب سے حیدرآباد دکن

اس سے سبق حاصل کریں۔ (م۔ ا۔ ص)

کتاب کار پبلی کیشنز رامپور کی مطبوعات

کتاب کار پبلی کیشنز رام پور (یو۔ پی) نے سستی کتابوں کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ نیوز پرنٹ پر اچھے خط میں خوب صورت گٹ اپ کے ساتھ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ پہلے تو اردو عوام طبقہ کتابیں پڑھنے کا شوق نہیں رکھتا۔ دوسرے خرید کر پڑھنا اس کے لئے اور زیادہ مشکل ہے۔ یہی سبب ہے کہ سارے ہند و پاکستان میں کسی کتاب کے بارے میں یہ نہیں سنا گیا کہ دس پندرہ ہزار چھپی ہو۔ (بہ استثنائے درسی کتب) ہزار دو ہزار کتابیں چھپتی اور برسوں گرد و غبار کا لبادہ اوڑھے پڑی رہتی ہیں پڑھنا جب تک تفریح نہ بنے اس وقت تک کتابوں کا نکلنا مشکل ہے۔ جو لوگ تھوڑا بہت کتابوں کی خریدی پر خرچ کرتے ہیں ان میں زاید قیمت دینے کی سکت نہیں، ایسے ہی لوگوں کے لئے کتاب کار پبلی کیشنز نے قیمتی کتابوں کے سستے ایڈیشن شائع کر کے پڑھنے والے طبقے کی بڑی اہم خدمت انجام دی ہے۔ ہمیں اس کی سب ہی کتابیں وصول ہوئی ہیں۔

یہاں صرف پانچ پر تبصرہ پیش ہے:۔

۱۔ پری خانہ :۔ جانِ عالم واجد علی شاہ کی خود نوشت داستانِ معاشقہ۔ صفحات ۱۹۲ قیمت ۲ روپے۔ مترجمہ تحسین سروری۔

آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ ۱۸۴۷ء میں تخت نشین ہوئے، لیکن ان کے معاشقے لڑکپن ہی سے شروع ہو چلے تھے۔ دولت کی فراوانی اور ماحول نے انھیں ہمیشہ راگ رنگ اور عیش و عشرت میں غرق رکھا۔ سیاست کی طرف ان کا میلان قطعاً نہ تھا۔ "پری خانہ" فارسی میں ان کی خانگی زندگی کا ایک مرقع ہے۔ وہ جنسی بھوک مٹانے کے لئے اچھی بری، کم سن، معمر، اپنے سے دوگنی عمر رکھنے والی عورتوں کو گھر میں ڈال لیتے ہیں، جب تک خوش ہیں ان کی ہر طرح خاطر مدارات ہوتی ہے، اور خفا ہوں تو ہر قسم کی سزا بھی دیتے ہیں۔

اس کتاب سے واجد علی شاہ کی زندگی کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں، لیکن سب سے بڑا پہلو جو عیش سے متعلق ہے "پری خانہ" میں آئینہ کی طرح روشن ہے اس میں کسی سیاسی واقعہ کی تلاش اس لئے فضول ہے کہ یہ کتاب اس نقطۂ نظر سے نہیں لکھی گئی۔

۲۔ رسومِ دہلی :۔ سید احمد دہلوی صفحات (۱۸۸) قیمت دو روپے۔

"فرہنگِ آصفیہ" کے مولف سید احمد دہلوی نے بے شمار کتابیں لکھیں، لیکن ان کا نام فرہنگ آصفیہ کی وجہ سے ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ "رسومِ دہلی" کے عنوان کے تحت انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک مسلمانوں میں جتنی رسوم ادا ہوتی تھیں ان کا بیان اس میں بڑی تفصیل سے ملے گا۔ یہ سید احمد کے عہد اور ان سے پہلے کی سماجی زندگی کی ایک گراں قدر تصویر ہے اس میں بیسیوں ایسے مقامات اور الفاظ ملیں گے جن سے آج ہم واقف نہیں۔ ایسے

محاورے ملیں گے جو آج زمانے کی زد میں آکر پامال ہوگئے، روزمرہ سے خارج اور قدیم کتابوں میں باقی رہ گئے۔

کتاب میں سید یوسف بخاری صاحب کا مقدمہ بھی ہے جس میں سید احمد کی زندگی کے حالات، ان کے خاندان اور ان کی تصنیفات کی تفصیلات دی گئی ہیں اور اتنی تفصیلات پہلی دفعہ منظرِ عام پر آئی ہیں۔

۳۔ چچا چھکن :۔ سید امتیاز علی تاج ۔ صفحات (۱۲۸) قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے۔

"ڈرامہ انارکلی" کے خالق جناب امتیاز علی تاج کی اس کتاب نے ایک زمانے میں کافی مقبولیت حاصل کرلی تھی اور یار لوگ اپنی مختصر سی سوسائٹی میں بھی ایک آدھ شخص کو "چچا چھکن" سے موسوم کردیتے تھے، اس سے کتاب کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ عرصے سے یہ کتاب نایاب ہوگئی تھی، اب دوبارہ منظرِ عام پر آئی ہے لیکن اب شاید اس کو اتنی مقبولیت حاصل نہ ہو، اس لئے کہ اب کئی بھتیجے بھی چچا کا روپ دھار چکے ہیں اور مزاح نگاری بہت آگے بڑھ چکی ہے، لیکن چچا چھکن اپنی بزرگی کے باعث ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے، بنیادی پتھر جو ہیں۔

۴۔ "انارکلی پر ایک نظر" :۔ از آنسہ روح افزا رحمان ۔ صفحات (۹۶) قیمت ایک روپیہ۔

تاج کے ڈرامے پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہے۔ ابتدا میں ڈرامے کا آغاز و ارتقا مختصر طور پر بتایا گیا ہے، پھر "انارکلی" پر تفصیلی تبصرہ ہے۔ اکبر اور جہانگیر کے دور کی جو تصویریں ڈرامے میں ملتی ہیں اور جن سماجی اور معاشرتی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے ان پر وضاحت کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے، اتنا تفصیلی کہ یہ مضمون بجائے خود ایک کتاب بن گیا ہے۔

۵۔ شیر کیا سوچتا ہوگا :۔ سید رفیق حسن ۔ صفحات (۱۹۲) قیمت دو روپے۔

کتاب کا نام عجیب ہے لیکن اس کا مطالعہ بتلائے گا کہ فاضل مصنف نے جانوروں کی نفسیات پر کس قدر باریک بینی سے قلم اٹھایا ہے۔ اس میں صرف شیر ہی کی نفسیات کو پیش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی، بلکہ جنگلی گائیں، بارہ سنگھے، بندر اور ہاتھی وغیرہ سب ہی ہیں۔ شکار اور شکاریوں کے بارے میں بہت سی دلچسپ باتیں پیش کی گئی ہیں۔ فاضل مصنف نے دلچسپی کو ابتدا سے آخر تک قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ توقع ہے کہ یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ (ا۔ ص)

کیفِ صہبا :۔ ابو الخیر سید ابراہیم حسینی صہبا۔ حیدرآباد دکن۔

ویسے تو ۱۸۵۷ء ہی سے ہندوستان کا احساسِ بیداری جاگ اٹھا تھا۔ سرسید کی ہمہ جہتی تحریکوں، اقبال کے نغموں اور گاندھی جی کی رہنمائیوں نے اپنے اپنے دور میں اپنے اپنے طور پر اس احساس کو اور متاثر کیا۔ ادیب اور شاعر بھی اپنے فرائض سے بے خبر نہ رہے۔ شاید اسی مقصد کے لئے مواد کے ساتھ ساتھ ہیئت کی تبدیلی کو بھی ضروری سمجھا گیا۔ غزل گوئی کی مخالفت کی گئی اور نظموں کو عروج ملا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب صہبا نے شعر کہنا شروع کیا۔

ان کی شاعری ابھی اپنی عمر کے ۳۵ سال بھی پورے نہیں کر پائی تھی کہ اس مختصر سے عرصے میں رونما ہونے والے سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور ادبی سارے تغیرات سے دوچار ہونا پڑا۔

ان کے کلام کا ایک مجموعہ "جامِ صہبا" ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ یہ غزلوں اور قطعات کا انتخاب ہے۔ دوسری شعری تصنیف "کیفِ صہبا" ابھی ابھی منظرِ عام پر آئی ہے۔ یہ صرف (۲۴۴) قطعات کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ شاعر کی شخصیت کی آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عصر کی عکاس بھی ہے۔

صہبا کی شاعری میں روایت کی پاسداری، وسائلِ اظہار کا تنوع اور ہمہ گیری ہے، اور ان کی فکر آسمانی ہی نہیں بلکہ زمینی بھی ہے، جس میں حسنِ تخیل، خلوص و محبت، سادگی اور بے ساختگی کے بادصف زندگی کے راست اور قریبی مطالعہ کا احساس بھی ملتا ہے اس طرح ان کا کلام کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے قابلِ لحاظ ہے۔

صہبا کا مزاج بنیادی طور پر تغزل کی طرف مائل ہے۔ ان کے کلام میں معاملاتِ محبت اور متعلقاتِ محبت کا سیدھا سادا معصوم اظہار ملتا ہے۔ دو قطعے ملاحظہ ہوں ؎

جب کبھی آپ مجھ سے ملتے ہیں چاک دامن کے بھرے سلتے ہیں
کیا کہوں حالِ گلشنِ ہستی آپ ہنستے ہیں پھول کھلتے ہیں

(۲)

آپ تھوڑا مسکرائے تھے اور بجلی گری ادھر دل پر
حال اپنا ہے اس مسافر کا لٹ گیا ہو جو آکے منزل پر

صہبا نے مئے الست و مئے مجاز دونوں پیے ہیں۔ ان کے یہاں دونوں کا نشہ ملتا ہے اور ان دونوں کا امتزاج روح و قلب دونوں کو یکساں مسرور و محظوظ کرتا ہے۔

میتھو آرنلڈ کا یہ قول غلط نہیں ہے کہ "شاعری انسانی زندگی کی تنقید کا نام ہے۔" اس تنقید کو صہبا نے خوب نبھایا ہے۔ اس موقع پر روزمرہ رمز و اشارہ، تراکیب اور الفاظ کے مناسب استعمال کا بڑا خیال رکھا ہے۔

کلام میں روایات کی پابندی، خیالات کی ہمہ گیری، اسالیب کا تنوع اور زبان و خیال کی سادگی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

"کیفِ صہبا" آمد و آورد کا ایک اچھا امتزاج بھی ہے۔ صہبا کی زود گوئی ان سے شعر تو کہلوا دیتی ہے لیکن عدم مصروفیت نظرِ ثانی کا شاید موقع نہیں دیتی جس کی وجہ سے بعض مقامات پر وہ خیال کی کنہہ تک پہنچتے نظر نہیں آتے اور شعر مبہم ہو جاتا ہے۔ کہیں کہیں الفاظ کی بے موقع نشست کھلتی ہے۔ ویسے اس مجموعے میں زیادہ

قطعات ایسے ہیں جنھیں پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاسکتا ہے۔

ادیب کی ذمہ داریاں یہیں پر ختم نہیں ہو جاتیں کہ وہ ایک اچھی تخلیق پیش کرے، بلکہ اس کی اچھی کتابت اور محتاط پروف ریڈنگ کی ذمہ داری بھی اس پر عائد ہوتی ہے، مثلاً ذیل کے اشعار میں کاتب کے گناہوں کے باعث میں خود صہبا کے ماخوذ ہونے کا اندیشہ ہے ؎

ہر طرف مجھ کو نظر آتی ہے معاشی پستی — کوئی صورت نہ نظر آئی یہاں پر "ہستی"

دوسرے مصرع میں غالباً "ہستی" کی جگہ "ہنستی" ہے۔

اک تری یاد کے سہارے پر — آرزؤں کے محل بناتا ہوں

دوسرے مصرع میں "آرزوؤں" کا لفظ صہبا جیسے پختہ مشق سے متوقع نہیں۔

آج وہ میری بات سنتے ..... — اور بعد التفات سُنتے ہیں

پہلے مصرع میں "ہیں" صاف چھوٹ گیا ہے۔ (ضیاء الدین احمد شکیب)

رزم نامۂ دبیر:- مرتبہ سرفراز حسین رضوی خبیر لکھنوی، صفحات (۳۱۹) قیمت مجلد چار روپے۔
ناشر:- نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنو۔

مولانا شبلی کے "موازنۂ انیس و دبیر" کے بعد یہ ایک ایسی دوسری کتاب ہے جس میں ہم کو جناب انیس اور جناب دبیر کا ایک جگہ تقابلی ذکر ملتا ہے۔ مگر اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ دونوں باکمال شاعروں کے محاسن کچھ اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ ایک دوسرے پر فوقیت کا گمان تک بھی نہیں گزرتا۔

مرثیوں میں بزم کی بجائے رزم ہی کا ذکر زیادہ تر موضوعِ سخن رہا ہے، اور مولف صاحب نے اس اقتباس میں جو دبیر کے مختلف مرثیوں سے کیا گیا ہے، نہایت ہی خوش اسلوبی، نکتہ رسی اور فن اور بیان کے اچھوتے نمونے پیش کئے ہیں اور ان نمونوں میں ہم کو باپ، بیٹے، بہن، بھائی، دوست، غلام سب ہی کی سیرتوں کی ایسی موثر تصویریں ملتی ہیں کہ جن کو پڑھ کر نہ صرف دل میں ایک جوش پیدا ہوتا ہے بلکہ مرثیہ نویس کی اس قدرت کا اندازہ ہو جاتا ہے جو اُن کو کرداروں کے مرقعے پیش کرنے پر حاصل تھی۔ دبیر کی زبان انیس سے یقیناً مختلف اور پُر شکوہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں کسی قسم کا تصنع نہیں پایا جاتا۔ مولف صاحب کا یقیناً یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کو اردو دنیا ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتی رہے گی۔ (میر یسین علی خاں)

مکاتیب امیر مینائی:- مرتبہ مولوی احسن اللہ خاں ثاقب، صفحات (۳۴۰) قیمت مجلد پانچ روپے۔
ناشر:- نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنو۔

حضرت امیر مینائی کا انتقال (۷۳) برس کی عمر میں سنہ ۱۹۰۰ء میں ہوا۔ اس لحاظ سے حضرت امیر کو انیسویں صدی کا

ممتاز اور مشہور شاعر ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ نہ صرف عالم و فاضل گنے جاتے تھے، بلکہ شاعری میں اُس وقت کی صفِ اول میں شامل تھے اس کے علاوہ ان کی نثری تصانیف بھی بلند پایہ اور پُر مغز سمجھی جاتی تھیں۔ مذہبی لگاؤ کے اعتبار سے بھی صاحبِ تقویٰ بزرگ تصور کئے جاتے تھے۔ مکاتیب بھی نثر کی صنف میں شمار ہوتے ہیں مگر ان کا درجہ خلوص، بے ساختگی اور واقعاتی نقطۂ نظر سے دیگر اصناف سے زیادہ حقیقی اور اہم ہوتا ہے۔ یوں تو حضرت امیر کی سب سے پہلی سوانح عمری مسکین نے ۱۹۰۳ء میں شایع کی تھی اور اس کے بعد اُن کے مشہور شاگرد فصاحت جنگ جلیل نے ۱۹۲۹ء میں دوسری سوانح عمری لکھی اور اس کے بعد ۱۹۳۱ء میں حضرت امیر کے عزیز قریب شاگرد رشید ممتاز علی آہ کی سوانح عمری منظرِ عام پر آئی۔ حالانکہ ۱۹۲۸ء ہی میں آہ کی سوانح عمری مکمل ہو چکی تھی لیکن اشاعت کی نوبت تین برس بعد آئی۔ ممتاز علی آہ نے اپنی سوانح عمری میں حضرت امیر کے چند خطوط بھی درج کئے ہیں جو ان کے موسومہ ہیں اگر اس سے بہت پہلے ۱۹۱۰ء میں "خطوطِ منشی امیر احمد" کے نام سے احسن اللہ خاں ثاقب نے پہلی بار خطوط کا مجموعہ شایع کیا تھا۔ بابعد ۱۹۲۲ء میں اضافے کے ساتھ "مکاتیب امیر مینائی" کے نام سے ثاقب صاحب نے اس کی دوبارہ اشاعت کی اور اس وقت پیشِ نظر "مکاتیبِ امیر" کو اسی کی طبع سوم کہنا چاہیے اس میں نہ صرف (۲۶۴) خطوط طبع کئے گئے ہیں بلکہ اس کتاب میں حالاتِ امیر اور تصانیف و تالیفاتِ امیر اور نظم و نثرِ امیر کے نمونے بھی درج ہیں۔ مزید برآں مکاتیب پر رائے اور مولانا حالی، شبلی اور دیگر مشاہیر کے تبصرے بھی شامل ہیں۔ ایک اور خصوصیت جو دلکش بھی ہے اور تقابلی بھی، مثلاً موازنہ کلامِ داغ و امیر وغیرہ خاصے کی چیز ہے۔ اس خصوص میں مولانا شبلی کا بے باک اور غیر جانب دارانہ تبصرہ ہر لحاظ سے قابلِ غور ہے اور جو باتیں انھوں نے بیان کی ہیں وہ حقایق سے دُور نہیں ہیں۔

"مکاتیبِ امیر" میں بچوں، بوڑھوں، عالموں، شاعروں، دوستوں، شاگردوں اور رشتہ داروں سب ہی کے نام خطوط ملتے ہیں، جن میں امیر مرحوم کی رواداری، حقیقت پسندی، تبحر اور شگفتہ نگاری کے انمول نمونے شامل ہیں، جن کے پڑھنے سے نہ صرف باہمی تعلقات، خانگی حالات اور معاصرین سے رواداری، علم دوستی، مسلم پرستی اور فن سے عشق کا پتہ چلتا ہے، بلکہ آج بھی اُن کی روشنی ہمارے لئے چراغِ راہ کا کام دے سکتی ہے۔

یہ کتاب بہ حیثیت مجموعی علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ ثاقب صاحب کے بارِ دوم میں جو خطوط چھپے تھے اس کے علاوہ اگر کچھ اور خطوط اس مجموعے میں شامل کر لئے گئے ہوں جو ۱۹۹۳ء میں چھپا ہے تو ناشر صاحب کو ایسا ایک نوٹ دینا چاہئے تھا، تاکہ بعض ایسے خطوط جن کے حضرت امیر سے متعلق کئے جانے پر بعض ممتاز ہستیوں نے شبہ کا اظہار کیا ہے، آسانی سے معلوم کر لئے جا سکتے۔

(میر حسین علی خاں)

٩

مدح شاہ بڑے: ستائیس ابیات

بڑے صاحب اس شاہ کے جانشیں، جو
کئے یوں کرم سب پو وہ گرند معاں، کہ

گئی مفلسی سب کی کیا رتھا س   ولے ہیچ مفلس ہوں اس شہ کے پاس
عجب کیا جو وہ کیمیا سی نظر   کرے میرے اس فن کے تانبے کو زر
جو ہیں بھائی شہ کے حمیدہ خصال   اچھو دولت ان کا ہمیشہ بحال
شجاعت منے شہ سواراں ہے وہ   سخاوت منے نام داراں ہیں وہ

یعنے شاہ راجو کے دو بیٹے تھے۔ بڑے صاحب زادے تو ہندوستانی رواج کے مطابق اپنے باپ کے خلیفہ ہوئے، انھوں نے ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا اور غالباً اپنی اوقات۔ اوقاف و فتوحات کی آمدنی پر بسر کی۔ چھوٹے بیٹے حسب توقع فوج میں بھرتی ہو گئے اور شائد اونچا عہدہ پایا، مزاج بھی غالباً سپاہیانہ ہی پایا تھا اس لئے جو ملتا بے تکلف خرچ فرماتے اور جو شے کو بخل تصور فرماتے تھے۔ اور "انوں کی جو مادر ہے علیا جناب" "انوں حضرت فاطمہؓ کے" سے "دھریں سب پو یک دعا نین شہ کم" جس کی وجہ سے دسیوں مفلس اور بیسیوں صعلوک، "ہوے ہیں سرفراز انھوں سے سدا" انھیں سے یہ دھرتا ہوں بیں التماس" کہ

"مجھے قرض داروں کے بند سے چھڑاؤ   یہ احسان کا اجر دو جگ میں پاؤ"

معلوم نہیں بڑے صاحبؒ یا چھوٹے صاحبؒ نے بے چارے محبی کی کچھ مدد کی یا نہیں۔ بڑے صاحب زادے نے تو دعائیں ضرور دی ہوں گی، ممکن ہے چھوٹے صاحبؒ نے وعدہ بھی کیا ہو لیکن "علیا جنابؒ" کے متعلق اگر ہم یہ گمان کریں کہ انھوں نے اس کا بار قرض اتار نے ہاتھ بٹایا ہو تو ہماری یہ خوش گمانی غالباً بے جا نہ ہوگی۔ کیا ہم فرض کریں کہ محبی نے یہ مثنوی "علیا جنابؒ" کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے لکھی؟ محبی نے بتایا ہے کہ یہ مثنوی رمضان کے عشرۂ آخر میں ختم ہوئی، ایسی صورت میں کیا یہ ممکن ہے کہ اس نے اپنی مثنوی عید سے کچھ ہی پہلے یا عید کے موقع پر بمصداق "ہم خرما و ہم ثواب" "علیا جنابؒ" کو سنائی ہو؟ ظن غالب تو یہی ہے کہ شیر خرما کے ساتھ اس کو زکات یا فطرہ یا دونوں ملے ہوں۔ بہر حال "خرما" ملا ہو یا نہ ملا ہو "ثواب" تو یقیناً مل گیا ہوگا۔ اللھم اغفرہ وجعل اللہ الجنۃ مثوہ۔

محبی نے اپنے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے وہ صرف اتنا ہی ہے۔ ان معلومات کے سوا مطبوعہ مصدر میں اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملی، حتیٰ کہ اس زمانہ یعنے گیارہویں صدی کے آخر اور بارہویں صدی کے اوائل میں گولکنڈہ کے کسی ایسے شاعر کا نشان وہی نہ ہو سکی جس کے نام کا جز محب یا تخلص محب یا محبی ہو۔

مدح ابو الحسن قطب شاہ: پندرہ ابیات

کہ اے نامور قطب شہ بوالحسن   عطا تجھ کئے پیر تخت دکن

محمد حسینیؒ دیے تجھ کو راج — مبارک رہے تجھ کو یہ تخت و تاج

یہ محمد حسینیؒ وہی ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا، ان کی دعاؤں کی برکت سے ابوالحسن تو تی بلکہ خلاف توقع گولکنڈہ کا بادشاہ ہوا۔ اس واقعہ کی تفصیل گولکنڈہ کی ہر تاریخ میں موجود ہے۔ اجمالی بیان حاشیہ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے[1]۔ ابوالحسن تانا شاہ ۱۰۸۳ھ م ۱۶۷۲ء میں تخت نشین، ۱۰۹۸ھ م ۱۶۸۷ء میں سلطنت سے دست بردار ہوا۔ ۱۱۱۱ھ م ۱۶۹۹ء میں وفات پائی۔

تعریف سخن: سولہ ابیات

سخن سے سخن ور ہوویں سرفراز — سخن سے ہوویں ناثر ہر ایک ساز
سخن مجھ خدا سے ہوا ہے عطا — تو کیوں نہ کروں مدح خیر النساء

قصہ: تقریباً ایک سو ساٹھ ابیات

کہوں مدح میں قصۂ فاطمہؓ — جو ہے مدح عصمت وہاں قائمہ
(کہوں پھر سو میں فاطمہؓ کا بیاں — جو گزرا الوں پر کروں میں بیاں)

کہ ہیں ابوجہل کی بیٹی اور اس کی سہیلیوں نے ایک روز یہ تجویز کی کہ (فاطمہؓ کہتی ہیں کہ ان کے باپ پیغمبر ہیں حالانکہ وہ مفلس ہیں) ان کو شرمندہ کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ ہم جھوٹ موٹ ایک شادی رچائیں اور اس میں فاطمہؓ کو مدعو کریں، ہم تو اہل ثروت ہیں، یہاں

---

[1] عبداللہ قطب شاہ کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی، تین لڑکیاں تھیں۔ ایک عالمگیر کے لڑکے محمد سے منسوب تھی، دوسری لڑکی نظام الدین محمد سے بیاہی گئی تھی۔ تیسری لڑکی کا نکاح سید محمد سلطان سے ہونے والا تھا۔ تیاری مکمل ہو چکی تھی، ایسے میں نظام احمد نے اس رشتہ کی مخالفت کی۔ عبداللہ قطب شاہ کے مشیروں نے بھی نظام الدین کی رائے سے اتفاق کیا۔ چنانچہ بادشاہ نے بعد مشورہ یہ ارادہ کر لیا کہ اپنی بیٹی کا نکاح ابوالحسن سے کر دے گا۔ شادی کی تیاری مکمل ہو چکی تھی فوراً ابوالحسن طلب کیا گیا۔ ابوالحسن اس زمانے میں اپنے مرشد شاہ راجو حسینیؒ کی خانقاہ میں درویشانہ زندگی گزار رہا تھا۔ جس وقت شاہی گوئندے خانقاہ پہنچے ہیں اس وقت شاہ راجو اپنے مرید ابوالحسن کے ہاتھ پر گل مہندی و گل حنا ملتے ہوئے فرما رہے تھے: "آج بادشاہ کی لڑکی کی حنا بندی ہے آؤ ہم تمہاری بھی حنا بندی کریں!" جب ابوالحسن کی طلبی ہوئی تو آپ نے فرمایا: "جاؤ ہم نے تمہاری شادی بادشاہ کی لڑکی سے کر دی!" چنانچہ سید محمد سلطان کی بجائے بادشاہ نے اپنی لڑکی کا نکاح ابوالحسن سے کر دیا۔

کہتے ہیں کہ شاہ راجو حسینیؒ نے ایک روز ابوالحسن کو انار کی ایک پھانک دی اور فرمایا: "اس میں کتنے دانے ہیں گنو؟" ابوالحسن نے گن کر کہا: "چودہ!" آپ نے فرمایا: "تمہاری بادشاہی چودہ سال رہے گی!" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

یہ واقعہ گولکنڈہ کی تاریخوں اور شاہ راجو حسینیؒ کے تذکروں میں باختلاف جزئیات موجود ہے۔ مندرجہ صدر الفاظ عبدالجبار خاں مرحوم کے "تذکرہ اولیائے دکن" سے ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ ہو کتاب مذکور ج ۱ ص ۳۳۰ تا ۳۴۱، حیدرآباد۔ [2] ربط عبارت کے لئے مرتب کا اضافہ۔

کس چیز کی کمی ہے۔ فاطمہؓ بغیر زیور پہنے پرانے کپڑے پہن کر آئیں گی تو ہم ان کو اپنی شان دکھائیں گے اور انھیں شرمندہ کریں گے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت نامہ لکھا۔ آپؐ کو دھوکہ دینے کے لئے ظاہراً آپؐ کی مدح کرتے ہوئے درخواست کی گئی آپؐ اپنی صاحب زادی کو شادی کی محفل میں روانہ کریں۔ آپؐ نے یہ رقعہ فاطمہؓ کو دکھایا تو فاطمہؓ نے کہا: "میری ماں کا انتقال ہو جانے کی وجہ سے ان کافروں نے مجھے شرمندہ کرنے کے لئے اپنے یہاں مدعو کیا ہے، میں تنہا، اور وہ بھی بغیر تحفہ لئے کس طرح جاؤں!" آپ (صلعم) یہ سن کر متفکر تھے کہ اتنے میں جبرئیلؑ نازل ہوئے اور کہا کہ: "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آپ (صلعم) فاطمہؓ کو اس شادی میں ضرور بھیجیں، ما بالآخرہ کافر ہی نادم ہوں گے!" آپ (صلعم) نے فرمان خداوندی فاطمہؓ کو سنایا اور وہ جانے پر راضی ہو گئیں، اور جبرئیلؑ واپس ہوئے۔ ادھر کافروں نے بہت ہی شان و شوکت سے شادی کا اہتمام کیا، شامیانہ تانا، اس کو خوب سنوارا، محفل آراستہ کی اور راگ و رنگ کا بھی بند و بست کیا، قسم قسم کے کھانے پکائے۔

جب فاطمہؓ کے جانے کا وقت آیا تو جبرئیلؑ جنت سے سارا ساز و سامان لے آئے جو شادی میں شرکت کے لئے ایک شہزادی کے شایانِ شان ہو۔ چنانچہ فاطمہؓ بہشتی کپڑے و زیور پہنے دعوت میں تشریف لے گئیں۔ کافروں کی عورتوں نے آپؓ کو اس طرح دیکھا تو خود ہی شرمندہ ہوئیں، مگر با دلِ نخواستہ آپؓ کو دسترخوان پر بلایا۔ فاطمہؓ نے کہا: "میں اپنے درجے کے لوگوں۔ ایمان داروں کے ساتھ ہی بیٹھ سکتی ہوں، اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو میں کھانا کھا لوں گی!"

سن اس بات کو دین کر اختیار ۔۔۔ ہوئے ان میں چالیس تن دین دار
چلے واں سو بی بی پھر اپنے مقام ۔۔۔ تجے سوں کہے واں کا قصہ تمام
جو یہ قصہ تھا فارسی سوں اول ۔۔۔ کیا اس کو دکھنی زباں سوں اول
اتھے یک ہزار و اسی آٹھ سال[1] ۔۔۔ دیا بار اس مثنوی کا اتھال
شب قدر ہو اتھا وہ ماہ صیام[2] ۔۔۔ کیا ختم ترتیب سوں وہ کلام
رہے یار یہ بہرہ در جگ پہ عام ۔۔۔ بحقِ محمد علیہ السلام

مجمی نے یہ نہیں بتایا کہ فارسی میں یہ قصہ منظوم تھا، یا منثور، مگر کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اصل قصہ شاید نثر میں تھا۔ مجمی نے اصل قصہ میں غالباً کسی قسم کا تصرف بھی نہیں کیا، اور یہ تو بالکل واضح ہے کہ مصنف گیارھویں صدی ہجری کی دکھنی، ایرانی تہذیب کا پروردہ ہے۔ شادی کا انتظام و اہتمام اس طرح ہوا ہے گویا یہ کسی آفاقی سلح دار کی ڈیوڑھی پر رچائی گئی ہے۔ زرنگار منڈپ کے ستون چاندی کے، ان کے کلس سونے کے، اور تنا ہوا طنابیں سونے کی میخوں سے (کذا فی الاصل) بندھی ہوئی ہیں، روشنی کے بلوریں جھاڑ اور عود دان ہیں۔ باغ میں دائیں بائیں سرو کی قطاریں ہیں اور چمن میں سیب و انار کے درخت جھوم رہے ہیں۔

---

[1] ۱۰۸۸ھ مطابق ۱۶۷۷ء   [2] رمضان مطابق اکتوبر۔

دیوان یا ایمن کی سوتی دغیرہ کھولوں کی خوشبو سے فضا مہک رہی ہے مغلوں میں حوض ہیں، ناک میں مجمیٹر دف وچنگ دنائے (جیسے خالص ایرانی باجے) بجائے جا رہے ہیں۔ دسترخوان تو بالکل ایرانی ہے، چنانچہ اس پر پلاؤ، بھنا ہوا دست کا گوشت، شیرینی و نان کے ساتھ پیازہ، پودینہ، پنیر، مولی اور تلیہ چنا ہوا ہے۔ سیدہ فاطمہؓ برقعہ اوڑھے پیدل روانہ ہوتی ہیں، ڈولی ہے نہ میانہ، البتہ ہندی رواج کے مطابق آپ کا استقبال آپ کے عدو تول جانب پردے پکڑ کر کیا جانا ہے اور جب مندیر شیقی میں تو جوہروں کے طبق تیار کئے جاتے ہیں اور کافروں کی عورتیں آپ کے قدموں پر سر رکھ دیتی ہیں۔

اظہار محرومی و کمتری کے لئے قدموں پر سر رکھنے کے خالص ہندوانہ طریقہ کی تو شاید کچھ تاویل کی جا سکتی ہے لیکن ان کی دیہی روایتوں کے اس دیومالائی خرافی تصور کے متعلق کیا رائے ہے جو اس مثنوی میں شاید سب سے زیادہ نمایاں ہے؟ مالی مرفہ الحالی کے میدان میں کافر عورتوں کی دعوت مسابقت میں سیدہ فاطمہؓ قوت و مضبوطی کردار کے بل بوتے پر نہیں بلکہ امداد انسانی امداد کے سہارے شرکت کرتی ہیں۔ وحی لانے کے علاوہ جبریلؑ کو رسول اللہ صلعم کی لڑکی کے لئے آسمانی کپڑے اور زیور فراہم کرنے کی خدمت بھی سونپی جاتی ہے صرف یہی نہیں بلکہ جب فرشتوں کی دو دو صفوں کے درمیان سیدہ فاطمہؓ حوروں کے جلو میں روانہ ہوتی ہیں تو سے

آگے جا کے جبریلؑ جوں چوبدار کرے غیر لوگوں کو مسند سے بھار!

اللہ اپنے نبیؐ کی بیٹی کو کافروں کی نظروں میں سرخرو کرنے کے لئے اپنی سنت بدل دیتا اور داخل ہی ہیں، [illegible] برائے العین مشاہدہ کرا دیتا ہے!

مختصر یہ کہ اس مثنوی میں اگر آپ صرف دو تین اسمائے معرفہ کسی مناسب ہندوانہ نام سے بدل دیں تو پوری نظم ہندی دیومالائی کہانی ہو جائے گی۔ یہ نتیجہ یا اظہارت اس معاشرت پسندی کا جو منشر صوبہ صدی [illegible] دکنی اسلامی معاشرہ کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ ہمیں مجمی کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اس نے اپنے معاشرہ کی [illegible] ایک رخ کی مطابق عکاسی کردی ہے! اس طرح اس کی مثنوی ہماری معاشرتی و تہذیبی تاریخ کی ایک تحریری دستاویز سے کم نہیں البتہ فنی حیثیت سے اتنی شکایت ضرور ہے کہ اس نے بعض جدید شاعروں کی طرح جو تعارف، دیباچہ اور مقدمہ وغیرہ کا سہارا لئے بغیر نمایاں نہیں ہو سکتے، تین سو بیالیس ابیات کی مثنوی میں ایک سو ابیات صرف رسمی عنوانوں کی نذر کر دیئے ہیں اور پھر اصل قصہ یکایک اس طرح ختم کر دیا ہے گویا زمانہ حال کی کسی امتحان گاہ میں ایک محنتی امیدوار پرچہ حل کر رہا تھا، وقت ختم ہو گیا، گھنٹی بجی اور نگران کار نے پرچہ چھین لیا۔

مجمی کی مثنوی کا صرف ایک ہی نسخہ مل سکا۔ یہ کتب خانہ مختاریہ (سالار جنگ) میں ہے۔ کوئی اور نسخہ نہ ہونے کی وجہ سے دو تین الفاظ کی تصحیح نہیں ہو سکی۔ ایسے الفاظ کے محاذی مرتب نے اپنی معذوری ظاہر کر دی ہے۔ اس کی دانست میں جو الفاظ نامانوس معلوم ہوئے صرف انھیں کے معنی کی وضاحت کی گئی ہے۔

"تحت" سے خارج از تقطیع "خک" سے خطائے کتابت اور "ضش" سے ضرورت شعری مراد ہے۔ بعض ابیات پڑھنے میں جو دشواری پیش آتی ہے اس کو جس طرح دور کیا جا سکتا ہے اس کی تفصیل کے لئے "برہان" دہلی (ج ۵۰ شمارہ ۶) بابت محرم ۱۳۸۳ھ ملاحظہ ہو، ص ۲۲ تا ۳۶۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

معجزۂ فاطمہؑ

از مجتبیٰ

.....

"ایں قصہ حضرت فاطمہ علیہا السلام۔ چوں منافقان از زیب و زر ایں دنیا عاری دیدہ از روئے نفاق خواستند کہ در خانۂ خود ضیافت ساختہ حضرت فاطمہ علیہا السلام را طلبیدہ و زیب و زر خود نمودہ شرمندہ سازند ایں چنیں مکر ساختہ طلبیدند۔ آخر خدائے تعالیٰ ہموں کافراں را شرمندہ ساخت۔

قولہ تعالیٰ: "و جعل کلمۃ الذین کفروا السفلیٰ و کلمۃ اللہ ھی العلیا ؕ (سورۃ التوبۃ چالیسویں آیت)

......

١۔ الہٰی تو صاحب سکت کا دھنی — تجھے ساجتی کبریا دھنی — ساجنا: بسکونِ جیم عجمہ، موزوں یا مناسب ہونا۔

٢۔ اپس کے تو قدرت سوں جگ کوں سنبھال — دیا رزق ہر یک کو مقدار حال

٣۔ بچھایا کندعیاں تو ہر تھار ا پار — رچیا نعمتاں تس میں رنگیں ہزار — ابار: بالفتح دوسرا حرف بائے فارسی: بے حد بے نہایت۔ رچنا: بفتح رائے مہملہ و سکونِ جیم فارسی۔ زینت دینا، سنوانا۔

٤۔ نہیں بھار کوئی تیرے احسان تے — ہوی سیر سب جگ ترے خوان تے

٥۔ تو رزّاق سب خلق مرزوق ہیں — تو خلّاق سب خلق مخلوق ہیں

٦۔ ترے حکم میں سب ہیں جن و ملک — پھریا امر سوں تیرے ساتوں فلک

٧۔ گگن سا منڈپ بن ستوں استقام — کیا ہور دیا جگ کو تس میں مقام — منڈف: منڈپ۔

٨۔ علیمؑ حکیمؑ ترا نام ہے — ترا علم و حکمت کسے فام ہے — فام: فہم: بمعنی مفہوم۔

٩۔ تو مالک ملکت کا سکت کا دھنی — ہیں سب فقیراں تو صاحب غنی

١٠۔ غنی چن منزلہ ارم ہے تجھے — تو کس بات کا فکر غم ہے تجھے

۱۱۔ سدا حی قیوم تیری ہے ذات — یو دو اسم کا عکس سالم صفات
۱۲۔ بجھا عارفاں تیری قدرت بجھائے — ولے ذات کا کنہ نیں کوئی پائے

بجھانا = بکسرِ نون و فتح جیم مجمہ مع ہائے ہندی، غور سے دیکھنا، مشاہدہ کرنا۔

۱۳۔ کئے عارفاں کی سب ہل قبول — جو بولے اتنے معرفت میں رسولؐ

کئے = کہے = کہا = قول۔

۱۴۔ ترے علم توحید کا ابتدا — نہ کوئی پائے نا پائیں گے انتہا
۱۵۔ بھلا ہے کروں عجز سوں اختصار — مناجات یاں تے کروں آشکار

در مناجات گفتہ شد

۱۶۔ الٰہی نکو کر مرا حشر سقر — ترحم سوں کر منج سرگ میں مقر

سرگ = بر وزنِ مرگ = س = جنت ۔ بتحریک رائے مہملہ ۔ ضش ۔

۱۷۔ گنہ کو نہیں میرے حد و شمار — نکو حشر میں کر مجھے شرمسار
۱۸۔ ترے ذکر کا دل میں دیپک لگا — تہ سکتیوں عباد سو جیو کو جگا
۱۹۔ تری یاد سوں نت مجھے شاد کر — ہوا حرص کے بند سوں آزاد کر

بند = دال خت ۔

۲۰۔ زیادہ منکر حرص کو منج منے — سلک دے نہ اس حرص کو منج کنے

سلک = بفتح سین دندانہ دار و لام ۔ آخری حرف کاف عربی در کشیدن چیزے را در چیزے ۔

۲۱۔ فراغت بخش منج دل کو تجھ ذکر سوں — مجھے دور رکھ غیر کی فکر سوں
۲۲۔ گہر کر مرے شعر کو سر بسر — اگر فی الحقیقت میں ہے وہ کنکر

کنکر = نون خت ۔

۲۳۔ زباں کر مری ابر نیساں کے سار — بچن کھرے کر در شاہ وار
۲۴۔ امولک تن دل تے لیا ہوں میں — سو تیرے خزینے تے پایا ہوں میں

امولک = ہ = بالفتح، تیسرا حرف لام مفتوح = لاقیمت = نادر = نایاب ۔

۲۵۔ معزز اسے کر تو سب جگ منیں — اچھے محترم خلق کی چک منیں

منیں = منے = میں ۔

۲۶۔ جو مرحوم ہیں میرے مادر پدر — گنہ بخش ان کو دے جنت میں گھر
۲۷۔ انو پرورش مج کئے لئی دفعا — خدایا تو دے ان کو اس کا جزا
۲۸۔ جو ہیں بھائی استاد میرے گنبھیر — ہوئے لئی دفعا سو مجھے دست گیر

لئی = بہت = دفعا = دفع کا "اِکفا" ۔

دفعا = دفع = ابدال ۔

۲۹۔ خدایا تو کر عمران کا دراز ہور اپنے کرم سات کر سرفراز
۳۰۔ مناجات کو یاں تے کر اختتام کر آغاز نعتِ علیہ السلام

در مدح حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

۳۱۔ محمد نبی سید المرسلیں ہوا شرعِ اسلام تج تے مبیں
۳۲۔ ترے نور تے خلق کو ایک بار کیا جگ میں اظہار پروردگار
۳۳۔ ترا نعت تِس د کہ کیا کسی کو شرف حق یتا نیں دیا

یتا = اِتنا۔

۳۴۔ کہ پیغمبراں سب اول کے جتے دکھے دراں پر سیں تیرے رتے

اول بروزن بدل۔
سیں = بکسرِ سین مہملہ و سکون یائے معروف = ہ = سر۔

۳۵۔ ہوا ختم تجہ تے نبوت تمام نبیاں مقتدیاں سب تو ان کا امام

نبیاں اور مقتدیاں کی یا = خت۔

۳۶۔ ترے کارنے سب میں و زماں نپایا اہے خالقِ دو جہاں

نپایا = پیدا کیا۔ ملاحظہ ہو فرہنگ "گلشنِ عشق" نصرتی۔

۳۷۔ اگر تو نہ ہوتا تو یہ سب منڈاں نہ کرتا خدا کس کو جگ میں عیاں

منڈاں = بفتح میم و سکون نون و تیسرا حرف دالِ ہندی = خلقت۔ کائنات۔

۳۸۔ توی پایہ پایا ہے تج دھرتے دیں کیا کفر کو تو زبوں اور چھیں

دھرس۔ بکسرِ دالِ مہملہ مع ہائے ہندی۔ اصلاً دھیرج عزم بالجزم مضبوط ارادہ۔ یہاں بحذف یائے معروف ہے۔
چھیں = س۔ بکسرِ جیم فارسی مع ہائے ہندی۔ بے قدر۔ بے مقدار۔ حقیر۔

۳۹۔ بقا کی صفت سوں عیاں تیری ذات ہوی ہور فنا گئے ہے لات و مناۃ
۴۰۔ جے کوئی پنت میں تیری دھایا اہے وہی راست مارگ کو پایا اہے

پنت = ہ۔ بفتح پائے فارسی = پنتھ = رستہ۔ مذہب۔ مسلک۔
دھانا = ہ۔ بفتح دال سعی و کوشش کرنا۔
مارگ = رائے مہملہ متحرک۔ روش۔

۴۱۔ تری باٹ بن کوی دوجی باٹ جائے کدھیں راست مارگ وہ ہرگز نہ پائے

دوجی = دوسری۔

۴۲۔ ترا وصف ہور مدح حق پر عیاں اہے تیوں تکوئی کرسکے کا بیاں

تیوں = جیسا (ہے ویسا)

۴۳۔ ترا نعت یتے یوں کہنا ہے محال کیا نعت تیری مری قدر حال

کیا = کہا۔

۴۴۔ کروں اب سو معراج کا میں بیاں — جے کچھ نبی تے منجے پر ہوا ہے عیاں

وصفت معراج حضرت نبی علیہ السلام

.....

۴۵۔ محمدؐ کو جس رات معراج اتھا — دھرت ہور گگن پر بڑا کاج اتھا

دھرت = ہ بفتح دال مہلہ و ہائے ہندی و فتح رائے مہلہ۔ دھرتی = زمین۔

۴۶۔ تھی رات روشن وہ معراج کی — اَدِک گگن بھری ہور اَتِ کاج کی

اَدِک = بفتح ہمزہ و کسرِ دالِ مہلہ یس۔ ادھک کی تخفیف۔ انتہائی۔ بہت۔ نہایت۔
اَتِ = بفتح ہمزہ و کسر تائے قرشت۔ بے حد و نہایت۔ اصل سنسکرت میں غالباً ما ورا کے معنی میں ہے۔

۴۷۔ سو تس رین جبریل علیہ السلام — لے کر آئے حق تے نبیؐ کن پیام

۴۸۔ تجھے حق بلایا ہے ات شوق دھر — نہ لا بار آمل اُسوں ذوق کر

ات = بسکونِ تائے قرشت عشق۔
بار = گرانی، مراد تکلف۔

۴۹۔ کہ روح الامینؑ جو کہے یو پیام — ہوا مستعد تو وہ خیر الانامؐ

۵۰۔ چڑیا براق سے تیز سیڑی اُپر — اُڑیا لے کے یک پل میں وہ عرش پر

ط = تیز تیزی اُپر۔

۵۱۔ تماشے جتے عرش اُپر لے اتھے — ہوئے کشف سارے نبیؐ پر دِتے

۵۲۔ وہاں جائے تن کو رکھو تخت پر — گئے پردہ نور لگ جب گزر

۵۳۔ تب آواز آیا کہ اے پاک ذات — کھڑے آج جو کرتا ہوں اپنا صلوٰت

اَچ = ہو = آچنا = ہونا۔

۵۴۔ کتے وقت بعد از وہ پردے بھتر — بلا راز ظاہر کیا سر بسر

۵۵۔ اتھے امر ہور نہی ظاہر جتے — کیا حکم، امت کو بولو دِتے

۵۶۔ کتے امر باطن کے کر کشف اُسے — کیا منع اس کوں کہ تو نہ کسے

ط ... نہ کی تیوں کسے۔

۵۷۔ ولے ہے جے کوئی نیک تن نیک من — کہاں اس اپر منع کا ہے سخن

جے = جو۔

۵۸۔ نبیؐ کے علیؐ کو مرا من اسے — تو وہ امر کیوں من پہ مخفی رہے

کے = کہے۔

۵۹۔ نبیؐ من سوں مل حق سوں ملا مکاں — پھر آئے مکاں اپنے لے نعمتاں

......

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء فون نمبر ۳۵۲۰۹

جلد ۲۹ شمارہ ۳ مارچ ۱۹۶۶ء

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد دکن

نگران

پروفیسر سید علی اکبر

مجلس مشاورت

۱۔ میر حسن

۲۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

۳۔ رمن راج سکسینہ

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

زر سالانہ ہندو پاک سے چھ روپے۔ ششماہی تین روپے

بیرونی ممالک سے دس روپے۔ فی پرچہ پچاس پیسے

مہتمم ادارہ ادبیات اردو کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپکر

ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن ۔ ۴ سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات

فروری ادارہ کے لئے بڑی مصروفیت اور ہماہمی کا مہینہ تھا۔ امتحانات کے نتائج کی اشاعت کے علاوہ یوم محمد قلی قطب شاہ کی تیاریاں کافی وقت لیتی رہیں جس کی وجہ سے دوسرے امور متاثر ہوتے رہے۔ ۱۹ر، ۲۰ر اور ۲۱ر فروری کو اس کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس کی مکمل روئیداد اپریل کے یوم قلی نمبر میں پیش کی جا رہی ہے۔ اس میں وہ مضامین بھی شامل ہوں گے جو قطب شاہی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔

اردو امتحانات کے سلسلے میں جائنٹ ڈائرکٹر کی رپورٹ بھی پیش کی جا رہی ہے جس سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ ادارہ کے امتحانات سے لوگ کہاں تک مستفید ہوئے اور ادارہ اردو کی کس طرح ٹھوس خدمات انجام دے رہا ہے۔ مرتب رپورٹ طیب انصاری صاحب نے شمالی ہند میں اردو کی زبوں حالی پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس کا ذمہ دار زیادہ تر اردو والوں کو قرار دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جب تک ہم آپس کے اختلافات کی خلیج پاٹنے کی کوشش نہ کریں اس وقت تک ہمارا ابھرنا ناممکن ہے۔ یہ دور جمہوریت کا ہے اور ہر شخص اپنے حقوق کو حکومت کے آگے رکھ کر اس کو منوانے پر مجبور کر سکتا ہے، لیکن دانشمندی کا تقاضہ تو یہ ہے کہ رواداری اور انصاف سے کام لیا جائے۔ اس کی توقع اس وقت زیادہ قوی ہو سکتی ہے جبکہ اردو والے اپنے مسائل کھلے انداز میں پیش کریں اور سننے والے وسیع القلبی اور وسعت نظر کے ساتھ سنیں اور دیکھیں۔

فروری میں پنڈت ونشی دھر ودیا النکار نے اچانک دہلی میں انتقال کیا۔ یہ خبر ہندی اور اردو بولنے والے دونوں طبقوں میں بڑے افسوس کے ساتھ سنی گئی۔ پنڈت جی گوناگوں خوبیوں کے حامل تھے۔ وہ مولانا حالی کے شیدائی تھے، اسی لئے مولوی عبدالحق سے ان کی دوستی ہوئی اور آخر تک باقی رہی۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں وہ بڑی شاندار نظمیں کہتے۔ مولوی عبدالحق جب تک اورنگ آباد میں رہے وہ ہندی پڑھاتے رہے اور جب علیم مرحوم کے بعد وہ جامعہ عثمانیہ میں شعبہ اردو کی صدارت پر آئے تو پنڈت جی کو بھی بلا لیا اور صدر شعبہ ہندی بنا دیا۔ پنڈت جی کی تقریر اور تحریر دونوں ساحرانہ تھیں، چھوٹے چھوٹے جملوں میں وہ اپنے مطلب کی باتیں بیان کرتے۔ شگفتگی اور بذلہ سنجی مزاج میں بلا کی تھی۔ چنانچہ پنڈت جی کے ساتھ ایک طویل سفر درپیش تھا، ایک صاحب نے جو ان کے ہم سفر بننے والے تھے راستے میں پڑھنے کی خاطر کتاب لینی چاہی۔ دوسرے ہم سفر نے کہا کہ "پنڈت جی ساتھ ہوں تو کتاب بے کار ہو جاتی ہے اس لئے کتاب نہ لو"۔ اور واقعہ یہ ہے کہ آٹھ نو گھنٹے کا طویل سفر ایسا معلوم ہوا کہ باتوں باتوں میں طے ہو گیا۔ پنڈت جی نے یونیورسٹی سے علحدہ ہونے کے بعد نانک رام بھگوان داس کالج کی پرنسپلی قبول کی اور مدت معینہ ختم کرکے ہندو آرٹس کالج قایم کیا اور اس کے پرنسپل ہو گئے۔ ہندی پرچار سبھا میں انھوں نے مختلف خدمات ذمہ داری کے ساتھ انجام دیں کبھی امتحانات کے شعبہ کے نگران رہے کبھی اس کے سکریٹری بھی۔ ڈاکٹر زور مرحوم اور پنڈت جی میں گہری دوستی تھی، وہ ادارہ کی تقریبوں میں اکثر و بیشتر شریک رہتے اور کاروبار میں صائب رائے دیتے۔ خدا ان کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

احمر لاری ایم۔ اے

حسرت کی سیاسی شاعری

حسرت کی عشقیہ شاعری نے لوگوں کو اتنا مسحور کر دیا کہ ان کی شاعری کے دوسرے پہلوؤں کی طرف کسی نے کما حقہٗ توجہ نہیں دی۔ حسرت کی شخصیت بڑی رنگارنگ ہے۔ وہ بہ یک وقت عاشق اور سیاست داں، صوفی اور اشتراکی ہیں۔ ہیئت کے نقطۂ نظر سے ان کی شاعری غزل تک محدود سہی مگر موضوع کے لحاظ سے ان کی شاعری بھی ان کی شخصیت کی طرح رنگارنگ ہے[1]۔ حسرت کی شاعری کے تین خاص موضوعات ہیں: عشق، تصوف اور سیاست۔ حسرت کی عشقیہ شاعری پر تو تقریباً تمام نقادوں نے قلم اٹھایا ہے، مگر ان کی شاعری کے دیگر موضوعات کو یا تو یک قلم نظر انداز کر دیا ہے، یا پھر چند لفظوں سے زیادہ مستحق نہیں سمجھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حسرت بنیادی طور پر عشقیہ شاعر ہیں، ان کی عشقیہ شاعری روایتی نہیں، بلکہ ان کے ذاتی تجربات پر مبنی ہے۔ انھیں اپنے عشق میں کامیابی بھی ہوئی ہے اور کبھی کبھی ناکامیوں کا سامنا بھی ہوا ہے۔ ان تمام تجربات کا عکس ان کی عشقیہ شاعری میں ملتا ہے۔ مثالیں دینے کی ضرورت نہیں، حسرت کے عشقیہ اشعار ہر خاص و عام کی زبان پر ہیں۔ یہی عشق مجازی آگے چل کر قوم و ملک، انسان اور خالق کون و مکان کے عشق کی شکل اختیار کرتا ہے۔ حسرت کی صوفیانہ اور سیاسی شاعری کو اسی آئینے میں دیکھنا چاہئے۔

حسرت کی عشقیہ شاعری کی طرح ان کی سیاسی شاعری بھی ان کے ذاتی تجربات پر مبنی ہے۔ حسرت نے اپنے طالب علمی کے زمانے سے ہی عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ کانگریس میں بھی شریک رہے اور مسلم لیگ میں بھی۔ انھوں نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا، اور قید و بند کی صعوبتوں سے بھی گزرے۔ وہ ہندوستان میں اشتراکی تحریک کے بھی علمبردار تھے۔ مختصر یہ کہ حسرت اپنی عمر کے آخری لمحے تک سیاست میں عملی حصہ لیتے رہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ ان کی سیاسی زندگی کا اثر ان کی شاعری پر نہ پڑتا۔ ان کے یہاں سیاسی اشعار کافی تعداد میں ملتے ہیں۔ پہلے میں حسرت کے چند ایسے اشعار پیش کر رہا ہوں جن میں کھل کر سیاسی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ بعد میں ان اشعار سے بحث کروں گا جن میں "بادہ و ساغر" کے پردے میں "مشاہدۂ حق کی گفتگو" کی گئی ہے ؎

روح آزاد ہے خیال آزاد　　　جسم حسرت کی قید ہے بیکار

---

[1] حسرت کے کلیات میں چند قطعات، رباعیات اور کچھ گیت بھی ملتے ہیں مگر مقدار اور معیار دونوں ہی کے لحاظ سے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ (ا۔ ل)

۱ر۵ ۱۹۲۲

۴

سب سے جیتا جاگتا

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی ...... اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

مخصوص نہ ز خاطرِ حسرت کو ملک تک ...... پیغامِ وفا بادِ سحر لے کے گئی ہے

خوشی سے ختم کرے سختیاں قیدِ فرنگ اپنی ...... کہ ہم آزاد ہیں بیگانۂ رنجِ دل آزاری

یورپ میں جیسے پھیل گئی ہے وبائے حرص ...... چلنے لگے وہ سارے جہاں میں ہوائے حرص

ہے چین دکوریا کو مٹانے پہ مستعد ...... جاپان بھی ہوا ہے مگر آشنائے حرص

اچھا ہے اہلِ جور کئے جائیں سختیاں ...... پھیلے گی یوں ہی شورشِ حبِ وطن تمام

سمجھے ہیں اہلِ شرق کو شاید قریبِ مرگ ...... مغرب کے یوں ہیں جمع یہ زاغ و زغن تمام

کچھ شک نہیں اس میں کہ وطن کی ہے ترقی ...... ہم رشتگیٔ سبحہ و زنار پہ موقوف

نسبت جزو کل کی ہے یہ دنیائے عمل میں ...... اقوام کو محتاجیِ افراد رہے گی

کشورِ ہند کہ مغلوب رہا ہے اس میں ...... نام ہی نام ہے اسلام کا اسلام کہاں

دستور کے اصول مسلم تھے چکے ...... شاہی بھی رام غلبۂ جمہور ہو چکی

سرمایہ دارخوت سے اترا رہے تھے کیوں نہ ہو ...... معلوم سب کو قوتِ مزدور ہو چکی

ہدایت کا زمانہ تشنہ تھا اہلِ سوویت نے ...... دکھائی سب کو راہِ حریت بے خوف و بیم ہو کر

لازم ہیں یہاں غلبۂ آئینِ سوویت ...... دو ایک برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

کچھ ایسی غزلیں بھی سن لیں جو پوری کی پوری سیاسی ہیں، یا جن کے زیادہ تر اشعار سیاسی رنگ میں ہیں ـــــ

رسمِ جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے ...... حبِ وطن مستِ خواب دیکھئے کب تک رہے

دل پہ رہا مدتوں غلبۂ یاس و ہراس ...... قبضۂ حزم و حجاب دیکھئے کب تک رہے

تا بہ کجا ہوں دراز سلسلہ ہائے فریب ...... ضبط کی لوگوں میں تاب دیکھئے کب تک رہے

پردۂ اصلاح میں کوششِ تخریب کا ...... خلقِ خدا پر عذاب دیکھئے کب تک رہے

نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم ...... جبر بہ زیرِ نقاب دیکھئے کب تک رہے

دولتِ ہندوستاں قبضۂ اغیار میں ...... بے عدد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے

حسرتِ آزاد پر جورِ غلامانِ وقت
از رہِ بغض و عتاب دیکھئے کب تک رہے

......

قبضۂ یثرب کا سودا دشمنوں کے سر میں ہے ...... اب تو انصاف اس ستم کا دستِ پیغمبرؐ میں ہے

جو ریفارم پہ ہے بنا بیداری اسلام کی ۔۔۔ خیر ہے در اصل یہ با آنکہ شکل شر میں ہے
خاطرِ افسردہ میں باقی چلا تک یادِ عشق ۔۔۔ گرمیِ آتش ہنوز اس مشتِ خاکستر میں ہے
قلتِ افواجِ ترکی پر نہ ہو اٹلی دلیر! ۔۔۔ ایک ہے سو کے لئے غازی جو اس لشکر میں ہے
اب صدا چاہے تو حسرت جلد ہونا ہے بلند
رایتِ حریتِ حق جو کفِ انور میں ہے

. . . . . .

معیشت میں بہر سو رنگِ فطرت ہے جہاں میں ہوں ۔۔۔ اُخوت ہے جہاں میں ہوں، مُسَویت ہے جہاں میں ہوں
مقامِ فرد بھی محفوظ ہے، خونِ جماعت بھی ۔۔۔ نمایاں ہر طرف وحدت میں کثرت ہے جہاں میں ہوں
اصولِ اشتراک آئینِ بیت المال سے مشتق ۔۔۔ اساسِ کارِ جمع و خرجِ ملت ہے جہاں میں ہوں
فلاحت ہو کہ حرفت، کامیابی سعیِ انساں کی ۔۔۔ نظامِ اجتماعی کی یہ دولت ہے جہاں میں ہوں
بری ہے فکریاں ہر فرد کی لوثِ عقیدت سے ۔۔۔ مسلم اقتدارِ علم و حکمت ہے جہاں میں ہوں
رواجِ بربریت ہے مذاہب کے تعاقب میں ۔۔۔ فضائے امن و صُلحِ آدمیت ہے جہاں میں ہوں
بلا تائیدِ محنت کچھ بھی افزائش جو ہو حسرت
وہ دولت کے لئے اک طوقِ لعنت ہے جہاں میں ہوں

اشعار کا اتنا طویل اقتباس دینے کا ایک مقصد تو یہ رہا ہے کہ اس عام غلط فہمی کا ازالہ ہو سکے کہ حسرت کے یہاں سیاسی اشعار بہت کم ہیں۔ یہ اشعار بھی مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق ہیں۔ دوسرا مقصد یہ رہا ہے کہ حسرت کے سیاسی خیالات و نظریات کا ہر پہلو سامنے آجائے۔ ان اشعار سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اگر ایک طرف حسرت کو ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور دیگر مسائل سے دلچسپی تھی تو دوسری طرف مسلمانوں کے ملکی و بین الملکی مسائل سے بھی تعلقِ خاطر تھا۔ وہ عالمی سیاست پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ اشتراکیت سے ان کا لگاؤ اس بات کا واضح ثبوت ہے۔

اب ایسے اشعار کی طرف آئیے جن میں حسرت نے غزل کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے "بادہ و ساغر" کے پردے میں اور "دشنہ و خنجر" کی زبان میں اپنے سیاسی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان کے الفاظ میں :۔

"غزل کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حد درجے کی دروں بینی پائی جاتی ہے۔ غزل گو جو کچھ کہتا ہے وہ اپنے آپ میں ڈوب کر کہتا ہے۔ اس کا حیات و کائنات کا نقطۂ نظر داخلی

ہوتا ہے۔"[1]

اسی لئے غزل میں خارجی تجربات بھی داخلی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ غزل میں تفصیل و وضاحت نہیں ہوتی، بلکہ رمز و کنایہ کی ایمائی قوت سے کام لیا جاتا ہے:۔

"غزل گو شاعر اپنے کلام میں جو الفاظ برتتا ہے ان سے ظاہری معنوں کے علاوہ بھی اور کچھ مقصود ہوتا ہے۔ لفظوں کو وہ علامتوں کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ بہ ظاہر جتنا وہ کہتا ہے اس سے کہیں زیادہ حقیقت میں وہ کہہ جاتا ہے۔"[2]

اس روشنی میں حسرت کے حسب ذیل اشعار دیکھئے ؎

۱۔ کیا سمجھتا ہے اسیرانِ قفس کو صیاد ...... دل ہلا دیں جو کبھی درد سے فریاد کریں

۲۔ نظر میں پھر گئیں کیفیتیں سب عہدِ ساقی کی ...... بھر آئے اشکِ خوں نظارۂ مینائے خالی سے

۳۔ مایۂ عشرت ہے بے حد ہے غم قیدِ وفا ...... میں شناسا بھی نہیں رنجِ گرفتاری کا

۴۔ سرگرمِ ناز آپ کی شانِ جفا ہے کیا ...... باقی ستم کا اور ابھی حوصلہ ہے کیا

۵۔ اہلِ صفا کی جان ہے اتنی سی یہ امید ...... کچھ اور بھی ہے اس ستمِ برملا کے بعد

۶۔ وہ بار بار سزا جرمِ عشق پر دیتے ...... مگر قصور وہی بار بار ہم کرتے

۷۔ اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم ...... گھبرا گئے ہیں بے دلیٔ ہمرہاں سے ہم

۸۔ کچھ ایسی دور بھی تو نہیں منزلِ مراد ...... لیکن یہ جب کہ چھوٹ چلیں کارواں سے ہم

۹۔ اے کاش قفس میں تو نہ سنتے ...... افسانۂ جورِ باغباں ہم

۱۰۔ کیا شوقِ بہار ہے کہ حسرت ...... کچھ رکھتے نہیں غمِ خزاں ہم

غزل کی مولۂ بالا خصوصیات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر صرف حسرت کی سیاسی زندگی کے پس منظر میں ان اشعار کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ اشعار سیاسی محرکات کے تحت کہے گئے ہیں ـــ پہلے شعر میں "صیاد" سے انگریزی حکومت مراد لیجئے اور "اسیرانِ قفس" سے جنگِ آزادی کے وہ سپاہی جو قید و بند میں گرفتار ہیں۔ اب اس شعر کے مفہوم پر غور کیجئے۔ کیا اب بھی اس کے سیاسی شعر ہونے میں شبہ کیا جا سکتا ہے؟

دوسرے شعر میں "عہدِ ساقی" سے مراد، انگریزی حکومت کا دور ہے، یعنے دورِ غلامی، اور "مینائے خالی" اس دور کی

---

[1] "اردو غزل" از ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ صفحہ ۱۴۔

[2] ایضاً ایضاً صفحہ ۱۵۔

۱۹۲۱ء

سبب نہ جینا آباد کن

معاشی حالات کی ترجمان ہے۔ سیاسی موضوع پر حسرت کے دو شعر اور سنئے

بھر آئے اشک دور افتادگانِ بزمِ ساقی کے ...... مئے رنگیں سے خالی دیکھ کر آغوشِ مینا کو

رندوں پہ یہ کیا ستم ہے ساقی ...... ساغر خالی ہیں پُر سبو ہیں

ان اشعار سے حسرت کی سیاسی بصیرت پر روشنی پڑتی ہے کیوں کہ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان کی معاشی زبوں حالی سیاسی غلامی کے سبب ہے۔

تیسرے شعر کے سیاسی ہونے کے ثبوت میں اسی غزل کا ایک دوسرا شعر پیش کیا جا سکتا ہے، وہ شعر یہ ہے

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرتؔ ...... گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

یہاں "غمِ قیدِ وفا" محبوب کی محبت کا مظہر نہیں، بلکہ وطن کی محبت کا اشاریہ ہے۔

اوپر ایک غزل درج کر چکا ہوں، جس کا مطلع ہے

رسمِ جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے ...... حبِ وطن مستِ خواب دیکھئے کب تک رہے

اس غزل کو متفقہ طور پر تمام نقادوں نے سیاسی غزل تسلیم کیا ہے۔ اگر اس غزل کے مطلع میں "جفا" سے معشوق کی جفا نہیں، بلکہ انگریزی حکومت کا جور و ظلم مراد لیا جاتا ہے تو پھر چوتھے اور پانچویں شعر میں "جفا" اور "ستم" سے یہی معنی کیوں نہ لئے جائیں۔

فیض کی نظم "عشق" کے مندرجہ ذیل اشعار سے چھٹے شعر کا مفہوم پوری طرح واضح ہو جائے گا

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو ...... تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں

ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائشِ منزل ...... رخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری ...... تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار

گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر ...... کڑکے ہیں بہت اہلِ حکم برسرِ دربار

اسی مضمون سے ملتا جلتا مولانا محمد علی جوہر کا بھی ایک شعر سن لیجئے

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں ...... آتا ہے لطفِ جرمِ تمنا سزا کے بعد

شعر نمبر ۹ اور ۸ کسی توضیح و تشریح کے محتاج نہیں۔ یہ اشعار حسرت کے عزم امور کے مظہر ہیں

کر کے ہی رہے گا جو دل میں ٹھان لی ہے ...... روشن ہے ہم پہ حسرتؔ عزم امور تیرا

شعر نمبر ۱۰ اور ۱۱ میں "قفس" "باغباں" "بہار" اور "خزاں" اپنے اصلی معنوں میں نہیں، بلکہ علامتی طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ قفس سے زنداں مراد ہے، تو "باغباں" سے انگریزی حکومت۔ "خزاں" غلامی کی علامت ہے، تو "بہار" آزادی کا استعارہ۔

ان اشعار کے تجزیے کے بعد اب کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ حسرت کی غزلوں میں ان کے سیاسی خیالات کا پتہ ملتا ہے۔

مجروح ہوئے کہا ہے ـــ

اب کھل کے کہیں گے ہم دل مجروح نہیں وہ وقت کہ اب اشکوں میں سنایا کرتے تھے آہوں میں غزل خواں ہوتا تھا

حسرت نے اپنی غزلوں میں سیاسی خیالات کا اظہار کھل کر بھی کیا ہے، اور "اشکوں اور آہوں" کی زبان میں بھی۔ جہاں انھوں نے کھل کر اظہار خیال کیا ہے، وہاں وہ غزلیت کی حدود سے نکل گئے ہیں۔ لیکن جہاں انھوں نے آدابِ غزل کو ملحوظ رکھتے ہوئے رمز و کنایہ اور استعارے کی ایمائی قوت سے کام لیا ہے، وہاں ان کے سیاسی اشعار بھی ان کے عشقیہ اشعار سے لگا کھاتے ہیں ـــ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے الفاظ میں :ـــ

"غزل کے آرٹ میں بھی داخلی اور خارجی عنصر پہلو بہ پہلو موجود رہتے ہیں۔ کبھی یہ پہلو بہ پہلو، اور الگ الگ دکھائی دیتے ہیں، اور کبھی ایک دوسرے میں ایسے گتھ جاتے ہیں کہ ان کی دوئی باقی نہیں رہتی۔ یہ غزل کے آرٹ کا کمال ہے۔"[1]

اور غزل کے آرٹ کا یہ کمال حسرت کے یہاں ملتا ہے۔ نہ صرف ان کے عشقیہ اشعار میں، بلکہ سیاسی اشعار میں بھی۔ ایسے چند اشعار اوپر گزر چکے ہیں ـــ کچھ اور اشعار ملاحظہ فرمایئے ـــ

جان کو محوِ غم بنا، دل کو وفا نہاد کر ... بندۂ عشق ہے تو یوں قطع رہِ مراد کر

بے کار ڈراتے ہیں مجھے قیدِ ستم سے ... حال روحِ وفا اور بھی آزاد رہے گی

انکار اور اک جرعۂ صہبا سے بھی انکار ... ساقی پہ تری کم نگہی یاد رہے گی

اہتزازِ روحِ بلبل ہے بہ فصلِ نو بہار ... جو عیاں ہر سمت شکلِ جنبشِ صرصر میں ہے

جو چاہو سزا دے لو، تم اور بھی کھل کھیلو ... پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی

دشوار ہے رندوں پہ انکارِ کرم یکسر ... اے ساقیِ جاں پرور کچھ لطف و عنایت بھی

چمن میں دورِ فصلِ گل ہے پر اے وائے مجبوری ... قیامِ بلبلِ مجبور، ارمِ باغباں تک ہے

عاشقو، دور نہیں منزلِ مقصودِ وصال ... بادپائے طلبِ یار کو مہمیز کرو

بزمِ ساقی میں عید کا ہے سماں ... خم لبریز و جامِ خالی کا

یہ آخر تا کجا مشقِ جفا، کچھ حد بھی ہے ظالم ... زمانہ ہو گیا پامال تیری ترکتازی کا

رہتی ہے روز اک ستمِ تازہ کی تلاش ... بے چین ہے وہ فتنۂ دوراں مرے لئے

محوِ گل ہیں یہ عندلیب کہ چمن میں گویا ... خوف گلچیں کا نہیں، خطرۂ صیاد نہیں

---

[1] "اردو غزل" از ڈاکٹر یوسف حسین خاں صفحہ ۳۳۶۔

رندوں کے لئے میخانے میں کچھ قحطِ مئے گلفام نہیں   محروم نہ رہتا کوئی مگر ساقی کی نوازش عام نہیں

حسرت کے ان اشعار میں غزل کے آداب کو پورے طور پر ملحوظ رکھتے ہوئے رمز و کنایہ اور استعارے کی زبان میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس لئے حسرت کے اس قسم کے سیاسی اشعار اور ان کے عشقیہ اشعار اس طرح گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ ان میں تفریق دشوار ہو جاتی ہے۔ ان اشعار میں الفاظ اپنے اصلی معنوں میں نہیں، بلکہ علامتی طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ یہاں عشق، ستم، جفا، وفا، ساقی، مئے گلفام، خم لبریز، جام خالی، رند، میخانہ، گل، بلبل، گلچیں، صیاد، قفس، چمن وغیرہ علامتیں ہیں، جن کے پسِ پردہ سیاسی خیالات و تجربات ہیں۔ حسرت نے نئے الفاظ نہیں گھڑے ہیں، بلکہ پرانے الفاظ کو ہی نئے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اگر ان اشعار کو حسرت کی سیاسی زندگی کے پس منظر سے الگ کر کے سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو صحیح مفہوم تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

کلیم الدین احمد نے حسرت کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:۔

> "ان کی (حسرت کی) زندگی میں کافی بوقلمونی تھی۔ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی زندگی کے دو بڑے دھارے تھے: ایک تو ان کی سیاسی جد و جہد تھی، وہ سیاست کے مردِ میدان تھے، لیکن اپنی زندگی کے اس دھارے کو انھوں نے شاعری سے دور رکھا۔ کبھی کبھار ایسا ضرور ہوا کہ کچھ غزلوں میں سیاسی مضامین بندھ گئے اور ترقی پسند قسم کے حضرات ان غزلوں کو کافی اہمیت دیتے ہیں، لیکن حسرت کی شاعری میں ایسی غزلوں کی اہمیت نہیں۔"[1]

یہ رائے حسرت کے ان اشعار کو سامنے رکھ کر قائم کی گئی ہے جن میں انھوں نے اپنے سیاسی خیالات کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ میرے اس قول کی تائید ان اشعار سے ہوتی ہے جو کلیم الدین صاحب نے حسرت کی سیاسی شاعری پر لکھتے ہوئے مثال کے طور پر پیش کئے ہیں[2]۔ یہی غلطی دوسرے نقادوں سے بھی ہوئی ہے۔ انھوں نے حسرت کے ایسے ہی اشعار کو بنیاد بنا کر ان کی سیاسی شاعری کو ناقابلِ اعتنا ٹھہرایا ہے۔ حسرت کی سیاسی شاعری کے مرتبہ کے تعین کے لئے ان اشعار کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا جن میں انھوں نے رمز و کنایہ اور استعارے کی ایمائی قوت سے کام لیا ہے:۔

> "موضوع چاہے کچھ بھی ہو، اگر شاعر نے اپنے حسنِ ادا سے شعریت کو برقرار رکھا ہے تو اس کے کلام کا پایہ بلند رہے گا۔ جس طرح کوئی لفظ حقیر نہیں جسے شعر میں نہ استعمال کیا جا سکے،

---

[1] "عملی تنقید" از کلیم الدین احمد۔ صفحہ ۲۴۴۔

[2] "اردو شاعری پر ایک نظر" از کلیم الدین احمد۔ صفحہ ۲۴۲ تا ۲۴۳۔

اسی طرح کوئی موضوع ایسا نہیں جسے شاعر دبرت سکے"۔[1]

حسرت کے ایسے سیاسی اشعار جن میں انھوں نے "تشکوہ" اور "آہوں" کی زبان میں اظہار خیال کیا ہے، ان کے عشقیہ اشعار سے کسی طرح کم مرتبہ نہیں۔ ایسے اشعار کے متعلق کلیم الدین صاحب کی یہ مندرجہ ذیل رائے لاحظہ فرمائیں :-

"حسرت سیاست کے مرد میدان تھے لیکن چند غزلوں کو چھوڑ کر وہ سیاسی تجربوں کو غزل میں کھینچ نہیں لاتے۔ شاید اگر ہم چاہیں تو اس شعر کو —

بزم ساقی میں دیدنی ہے سماں　　　خم لبریز و جام خالی کا

سیاسی رنگ دے سکتے ہیں، اور اگر دیں تو کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی باتیں کس طرح شعر میں ڈھل سکتی ہیں، لیکن اس شعر کو سیاسی رنگ دینے کی ضرورت نہیں"۔[2]

وہی اشعار جن کی بنیاد پر حسرت کی سیاسی شاعری کے مرتبہ کا تعین کیا جاسکتا ہے، انھیں کو کلیم الدین صاحب سیاسی اشعار ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اس کو ہٹ دھرمی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

اس جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حسرت کی سیاسی زندگی کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا۔ ان کے بیشتر اشعار ان کے سیاسی خیالات کے مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ اس دور کے سیاسی حالات کے بھی آئینہ دار ہیں۔ یہ بات خاص توجہ کی مستحق ہے کہ حسرت نے سیاسی خیالات کے اظہار کے لئے بھی غزل کے سانچے کو استعمال کیا، حالانکہ اس وقت تک نظم ہی ایسے خیالات کے لئے وسیلۂ اظہار تھی۔ شبلی اور اکبر کی غزلوں میں چند اشعار ایسے ضرور ملتے ہیں جو سیاسی محرکات کے تحت کہے گئے ہیں۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ سب سے پہلے کس نے غزل میں سیاسی خیالات کا اظہار کیا، مگر یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ جتنے متنوع اور جتنی تعداد میں سیاسی اشعار حسرت کی غزلوں میں ملتے ہیں، ان سے پہلے کسی اور کے یہاں نہیں ملتے۔ اس لحاظ سے اگر حسرت کو اسی طرز کا پیشرو کہا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ لیکن حسرت کا صرف یہ کارنامہ نہیں کہ انھوں نے غزل کو سیاسی خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا، بلکہ اصل کارنامہ یہ ہے کہ ان کے یہاں ایسے اشعار بھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں جن میں غزل کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے "بادہ و ساغر" اور "دشنہ و خنجر" کی زبان میں سیاست کی گفتگو کی گئی ہے۔ اسی قسم کے اشعار کی بدولت حسرت کی سیاسی شاعری کی اہمیت ہے۔ اس روایت کو بعد میں آنے والے شعراء خصوصاً اقبال، سہیل، فیض، جذبی اور مجروح نے پروان چڑھایا، اور اب تو غزل اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

---

[1] "اردو غزل" از ڈاکٹر یوسف حسین خاں، صفحہ ۳۰۸ [2] "عملی تنقید" صفحہ ۱۲۹۔

میر حسن (ایم۔اے)

ترجمے کا فن

کسی زبان کے ادب اور ذخیرۂ معلومات میں اضافہ کرنے کا بہترین ذریعہ ترجمہ ہے۔ دنیا کی بیشتر زبانوں نے اسی راستے پر چل کر توسیع اور ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کئے ہیں۔ لاطینی نے یونانی تصانیف سے استفادہ کیا، عربی نے لاطینی اور یونانی دونوں زبانوں کے بیش بہا ذخائر کو اپنایا۔ اسی طرح فارسی زبان عربی اور ترکی ادب سے مستفید ہوئی اور جہاں تک اُردو کا تعلق ہے اس نے فارسی، عربی اور ترکی کے علاوہ ہندوستان کی قدیم اور جدید زبانوں کی مدد سے اپنے ادب میں مفید اضافے کئے۔ اور پھر جب مغربی اثرات ہندوستان پہنچے تو اُردو نے انگریزی کا استعمال کیا اور زیادہ تر انگریزی ہی کے توسط سے فرانسیسی، جرمن، روسی اور پرتگالی زبانوں کے ادب سے بھی کھل کر فائدہ اُٹھایا۔

مغربی زبانوں کی تصانیف سے استفادہ کی منظم کوشش انیسویں صدی کے اوائل سے شروع ہوئیں جب کہ فورٹ ولیم کلکتے میں انگریزوں نے ایک دارالترجمہ قائم کیا۔ اس کے بعد شمس الامراء بہادر نے جہاں تھا، حیدرآباد میں دارالترجمہ قائم کر کے کارآمد علوم اور سائنس کی انگریزی کتابوں کا ترجمہ کرایا۔ پھر دہلی میں دہلی کالج اور، ودھیا شاہانِ اودھ کے دارالترجموں میں بھی یہ کام ہوا۔ اس کے بعد سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی نے ترجمے کرائے۔ سررشتۂ علوم و فنون حیدرآباد میں ترجمے کئے گئے۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، دارالمصنفین اعظم گڈھ، ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد۔ اور اردو اکیڈیمی جامعۂ ملیہ کو بھی ترجمے کے کام کے سلسلے میں اہمیت حاصل ہے۔ آزادی کے بعد سے اُردو میں ترجمے کا کام مرکزی ساہتیہ اکیڈیمی نے بھی شروع کیا ہے جس کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

اولین انفرادی ترجمہ ۱۷۴۵ء میں ہوا جب کہ انجیل مقدس کو اُردو میں منتقل کیا گیا تھا۔

ہمارے ملک میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اور ان میں سے بیشتر زبانیں قیمتی ادبی اور تہذیبی سرمایہ کی حامل ہیں۔ اس سے ترجمے کے فن کو فروغ دینے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے تاکہ ملک کی ہر زبان دوسری مقامی زبانوں کے شاہکاروں سے استفادہ کر سکے جس سے کل ہند قومی اور ادبی مزاج کی تشکیل میں مدد مل سکتی ہے۔

جہاں تک اردو شعر و ادب کا تعلق ہے اس کی ابتدا ترجمے ہی سے ہوئی۔ چنانچہ متقدمین نے اپنی شاعری کا آغاز فارسی اشعار کے ترجمے اور تقلید سے کیا۔ اس کلیّہ سے اُردو کا اولین صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ معانی البتہ ایک حد تک مستثنیٰ ہے کیونکہ اس کے کلام میں مقامی موضوعات اور روایتی طرزِ فکر سے مختلف اشعار کی کمی نہیں ہے۔

ابتدائی دور کی اردو نظم کی طرح، اردو کی اولین نثری تصنیف ملا وجہی کی "سب رس" بھی ایک فارسی قصّے کا ترجمہ ہے۔

یوں تو اردو ذخیرۂ ادب، علوم وفنون اور عام معلومات میں اضافے کا اہم ذریعہ شروع سے ترجمہ رہا ہے۔ لیکن پچھلی صدی کے اواخر اور موجودہ صدی کے ربع اول کو خصوصی طور پر ترجمے کا دَور کہا جاسکتا ہے۔ اس زمانے میں ترجمے کا کام زیادہ منظم طور پر اور وسیع پیمانے پر کیا گیا۔ ترجمے کے اصول مرتب کئے گئے اور وضع اصطلاحات کے طریقوں کا تعین کرکے ترجمے کو ایک باضابطہ فن کے درجے تک پہونچا دیا گیا۔ اس کے علاوہ اس دور کے بیشتر انفرادی لکھنے والوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مغرب کے افسانوی ادب، نظموں اور دوسری تصانیف کے ترجمے سے کیا جس کی بدولت نظم ونثر کی نئی نئی صنفیں رائج ہوئیں اور زبان کے ذخیرے میں کافی اضافہ ہوا۔

معلومات کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کے عمل کو بھی ترجمہ کہا جاتا ہے لیکن میں اپنی اس مختصر تقریر میں ترجمے کی زیادہ مشکل اور اہم صنف یعنی غیرزبانوں کے شعروادب کو اردو میں منتقل کرنے کے فن سے متعلقہ مسائل کا ذکر کروں گا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسی اچھے اور کامیاب ترجمے کو سامنے رکھ کر اُس کی خصوصیات کو غور کیا جائے اور ان کی روشنی میں اصول بنائے جائیں۔ مثال کے طور پر اگر ہم نظم طباطبائی کے ترجمے "گورِ غریباں" کا عنایت اللہ کے ترجمے "پریکلز کی تقریر تعزیت" سید علی بلگرامی کے ترجمے "تمدنِ عرب" یا ڈاکٹر عابد حسین کے "فاؤسٹ" پر اس لحاظ سے غور کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اچھا ترجمہ وہ ہے جس میں اصل کے متن کو اُس کی ساری خوبیوں کے ساتھ دوسری زبان میں اس قدر مکمل طور پر منتقل کیا گیا ہو کہ ترجمہ پڑھنے والا اُن خوبیوں کو اُسی قدر نمایاں طور پر اور شدت کے ساتھ محسوس کرے جس قدر اور جس شدت سے اصل عبارت کو وہ لوگ محسوس کرتے ہیں جن کی زبان میں مصنف نے اپنے مطالب کا اظہار کیا ہے۔ جب تک یہ خوبیاں کسی ترجمے میں نہ پائی جائیں اُسے کامیاب نہیں کہا جاسکتا۔ اس حقیقت کو تسلیم کرلینے کے بعد اب ہم اس امر کی کوشش کریں گے کہ اچھے ترجمے کی جو تعریف ہم نے پیش کی ہے اُس کی مدد سے ترجمے کے اصول اخذ کریں۔

پہلا اصول تو صاف ظاہر ہے یہ ہوگا کہ ترجمہ میں اصل کے سارے خیالات، مطالب اور معلومات کو تمام وکمال منتقل کیا جائے۔ یہ اُسی صورت میں ممکن ہوسکتا ہے جبکہ مترجم اصل کی زبان پر قدرت رکھتا ہو، موضوع پوری طرح سے اُس کی گرفت میں رہے اور اپنی زبان پر اُسے نہ صرف اصل کی زبان سے کچھ زیادہ ہی عبور حاصل ہو بلکہ وہ حسب ضرورت اجتہاد سے بھی کام لے سکے۔ اگر مترجم ان تینوں اوصاف میں سے کسی ایک میں بھی پیچھے رہا تو وہ اصل کے مفہوم، متعلقات اور مضمرات کو سمجھ کر اپنی زبان میں نئے نئے خیالات اور محسوسات کو موثر طور پر منتقل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے گا۔

لغات اور زبان دانی کی کتابوں سے زیادہ زبان کی وسعت اور صلاحیت کا اندازہ صرف ایک حد تک ہوسکتا ہے۔ لغات سے مدد ضرور ملتی ہے لیکن صرف لغت کے سہارے کسی کا اچھا مترجم بن جانا ممکن نہیں ہے۔

جیسے صرف رنگوں کی فراہمی کسی کو مصوّر نہیں بنا سکتی جب تک اُس شخص میں تصویر کشی کی استعداد نہ ہو۔ یہی حال مترجم کا ہے۔ اگر اُس کا ذوق صحیح، مطالعہ وسیع اور حافظہ حاضر نہ ہو، وہ الفاظ کا صحیح استعمال نہیں کر سکتا۔ ملتا جلتا مفہوم رکھنے والے الفاظ اپنی زبان میں بہت سے مل جاتے ہیں لیکن اصل الفاظ کے مفہوم میں جو نزاکتیں اور نفاستیں پنہاں ہیں، اُن سب کو اپنی زبان میں برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھنا آسان کام نہیں ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ترجمہ، تخلیق کی سرحدوں کو چھونے لگتا ہے۔

مترجم کی قدر جیسی چاہئے نہیں کی جاتی لیکن حقیقت میں اس کا کام بہت مشکل اور صبر آزما ہوتا ہے۔ اِس سلسلے میں مجھے ایک جرمن مصوّر کی بنائی ہوئی تصویر یاد آرہی ہے۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں لکھنے کی ایک فرسودہ میز رکھی ہے جس پر متعدد موٹی موٹی کتابیں کھلی ہوئی ایک دوسرے پر پڑی ہیں۔ تصویر کا عنوان ہے "مترجم"۔ بیچارے مترجم نے اصل کتاب میز پر اپنے سامنے کھول رکھی ہے جس کے بازو ترجمے کے مسودے کے کاغذات ہیں۔ مترجم کے چہرے اور نشست کے انداز سے سخت لمحۂ غور و فکر کا پتہ چلتا ہے۔ سیدھے ہاتھ میں قلم ہے اور دہنے ہاتھ کی کہنی کو میز پر ٹیک کر وہ آسمان کی طرف اس انداز سے دیکھ رہا ہے جیسے کمرے کی چھت نظروں کے راستے میں حائل نہیں ہے۔ دیکھنے والوں پر تصویر یہ تاثر پیدا کرتی ہے کہ مترجم، ترجمے کے دوران کسی مشکل مقام پر پہونچا ہے۔ اس نے بہت سوچا اور موٹی موٹی فرہنگوں سے جو میز پر کھلی پڑی ہیں، مدد لے کر آگے بڑھنا چاہا، مگر کامیابی نہیں ہوئی تو بالآخر وہ اپنے سارے علم و فضل کو مستحضر اور قلب و دماغ کو مرتکز کر کے ایک آخری کوشش کرتا ہے اور جو لفظ یا ترکیب جستجو اور کاوش کے باوجود نہیں مل سکی تھی، یکایک ایک لمحۂ انکشاف میں اُسے آسمان کی طرف سے مل جاتی ہے۔ تو یہ ہے مترجم کا بلند مقام۔

مترجم کو مشکلات اُس وقت بھی پیش آتی ہیں جبکہ اصل عبارت میں ابہام ہو یا ایک جملے یا فقرے کے ایک سے زیادہ معنی نکالے جا سکتے ہوں۔ ایسے موقع پر معمولی مترجم جو جی میں آئے لکھ کر آگے بڑھ جاتا ہے لیکن کامیاب ترجمہ اُسی وقت ممکن ہے جب مترجم مکمل غور و خوض کے بعد اپنی قوتِ فیصلہ سے کام لے۔ اور سیاق و سباق اور خیالات کے بہاؤ کے مطابق ایسے مفہوم کا انتخاب کرے جو سب سے زیادہ قرینِ قیاس ہو۔ اس سلسلے میں بشرطِ ضرورت مصنف کے عام طرزِ فکر اور اظہار کے اسلوب سے مدد لی جا سکتی ہے۔ اِس صبر آزما تحقیق و تدقیق سے بچنے کی غرض سے مترجم، اصل کے دھندلکے کو برقرار رکھنے پر قناعت کرے یا ایک سے زیادہ مفاہیم کو بیان کرے تو یہ بڑی قباحت ہوگی۔

جو تعریف ترجمے کی ہم نے پیش کی ہے اُس کے مطابق مترجم کے لئے ضروری ہے کہ مصنف کے خیالات کو بے کم و کاست پیش کرے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طویل اور پیچیدہ جملوں کی وجہ سے یا بیان کے تسلسل میں خلل پیدا ہونے کی بنا پر مشکل مقامات آجائیں تو ربطِ عبارت کی خاطر یا وضاحت کی غرض سے یا اپنے بیان میں زور پیدا کرنے کے لئے متن میں کوئی اضافہ کرنا۔ یا بشرطِ ضرورت ایسے زوائد اور مکررات کو خارج کر دینا جن کی وجہ سے

عبارت کو مختصر بنایا جاتا ہے، جائز قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حذف و اضافے کے عمل سے اگر متن کی قوت بڑھ جاتی ہے اور اس کی اثر انگیزی بڑھ جاتی ہے تو یقیناً مترجم کو ایسا کرنا چاہیئے لیکن یہ کام معمولی مترجم کے بس کا نہیں ہے۔ اس پیوند کاری کے استعمال میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے اور یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ جس خیال یا توضیح کا اضافہ کیا گیا ہے اُس کا اصل خیال سے غیر منفک تعلق ہو۔

یہاں تک نثر کے ترجمے کا ذکر تھا۔ نظم کے ترجمے کے بھی یہی اصول ہیں لیکن جہاں تک حذف و اضافے کا تعلق ہے شعر کے ترجمے میں اس کی حدیں بہت وسیع ہو جاتی ہیں۔ شاعری سارے علوم کا نچوڑ ہے لیکن شعر میں زبان صرف معلومات کے اظہار کے لئے استعمال نہیں کی جاتی بلکہ اس کا مقصد تجربے اور مشاہدے کے گداز کی باز آفرینی اور ذہنی پیکر تراشی کے ذریعہ ایک طلسم کھڑا کرنا ہوتا ہے۔ شعر فکر اور جذبے کے حسین اور مترنم امتزاج کا نام ہے۔ موضوع اور مقصد اُس کی بنیادی قدریں فراہم کرتے ہیں جن کے مقابلے میں ہیئت اور اسلوب اضافی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اضافی قدروں کا انحصار شاعر کے قومی اور انفرادی مزاج، ماحول، مخاطبین کے ذوق اور معیارِ حسن و قبح پر ہوتا ہے۔ مترجم کا فرض ہے کہ اساسی قدروں کی شناخت کرکے اُن کو برقرار رکھے لیکن اس بنیاد پر جو بالاخانہ اضافی قدروں کا ہوتا ہے اُس کی وضع قطع، آرائش و زیبائش کو ترجمے کی زبان کے مزاج اور تہذیبی ماحول کے مطابق از سرِ نو تشکیل دے۔ اگر ایسا نہ کرکے غلامانہ وفاداری برتی جائے اور اصل کی سادہ نقل اُتاری جائے تو شعر کا سارا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ غرض شعر کو ہاتھ لگانے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ترجمہ تو رہا ایک طرف کسی نظم کو اُسی زبان کی نثر میں منتقل کیا جائے تو بھی بسا اوقات اس کی روح پرواز کر جاتی ہے۔ چنانچہ ایک مشہور انگریزی نقاد نے کہا ہے کہ شیلی کی نظم SKYLARK کی نثر کی جائے تو وہ ایک پھیکے پھیکے سرد یا اور ناقابلِ برداشت الفاظ کا گورکھ دھندا بن کر رہ جائے گی۔ نظم کا ترجمہ اس قدر مشکل ہے کہ حالی اور آزاد بھی اس میدان میں سرخرو نہیں ہو سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُنھوں نے اصل سے وفاداری برتنے کی کوشش کی۔ وفاداری اور مکمل مطابقت کی فکر ایسی تحریروں کے ترجمے میں ہونی چاہیئے جن کا تعلق معلومات فراہم کرنے یا سیدھے سادھے انداز میں واقعات بیان کرنے سے ہو۔ نظم کے ترجمے میں بہرصورت وفاداری اور مطابقت کے اصول برتنے والا مترجم اپنے آپ کو مصنف کا نادان دوست ثابت کرتا ہے۔

نظم کا کامیاب ترجمہ شاعر ہی کر سکتا ہے۔ ترجمے کے لئے اُسے ایک نظم کہنی پڑتی ہے، اُس پایہ کی نظم جس پایہ کی اصل نظم ہے۔ یا پھر اس بات کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ شاعر کے جس تجربے یا مشاہدے کا ماحصل اصل نظم ہے۔ اگر وہی تجربہ اور مشاہدہ مترجم کا ہوتا تو وہ اس کا اظہار جن الفاظ، اشاروں اور علامتوں کی مدد سے کرتا، وہی الفاظ اور انداز، تشبیہیں اور استعارے ترجمے میں استعمال ہونے چاہئیں۔

جس قدر مترجم شاعر کے تجربے اور محسوسات سے دور ہوتا جائے گا اسی قدر ترجمے میں شعریت کی کمی ہوتی [illegible] مترجم بھی شاعر ہو تو شعر کا ترجمہ مکمل شعریت کے ساتھ اس کے ذہن میں تشکیل پائے گا اور اس طرح ایک طلسم کی جگہ دوسرا طلسم خود بخود کھڑا ہو جائے گا۔ نظم کا کامیاب ترجمہ وفاداری نہیں مانگتا بلکہ متوازی تخلیق چاہتا ہے۔

اس قسم کی متوازی تخلیق کی ایک نمایاں مثال نظم طباطبائی کی "گورِ غریباں" ہے۔ غریب انگریزوں کے گورستان کی اداسی، شامِ زندگی کے جگرخراش لمحات اور جنازے کی مسیحی رسومات کا نقشہ کھینچ کر گرے نے جو تاثر اپنی انگریزی نظم ELEGY میں پیدا کیا ہے، ترجمے میں طباطبائی نے اس کو کامیابی سے منتقل کیا ہے۔ ان کے ترجمے میں مسیحی رسوم کی جگہ تجہیز و تکفین کی اسلامی رسوم نے لے لی ہے۔ گرجا کے گورستان کی جگہ ہندوستان کے قبرستان کا منظر پیش کیا گیا ہے اور تاریخ انگلستان کی شخصیتوں ملٹن اور کرامول کی جگہ فردوسی اور رستم کو دے کر، جن سے اردو والے زیادہ مانوس ہیں، طباطبائی نے اصل نظم کی موثر ترین خصوصیات، اس کے ماحول اور تہذیبی پس منظر کو بھی اپنی زبان میں منتقل کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس طرح ایک متوازی تخلیق عمل میں آئی جو بے تکلف اردو کے ادبِ عالیہ کا ایک جزو بن گئی۔

ترجمے کے فن کے سلسلے میں آخر میں اس حقیقت کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ محض اصولوں سے واقفیت کافی نہیں ہوتی۔ ترجمہ، ترجمہ کرنے سے آتا ہے۔ کافی مشق ہو جائے تو اپنی زبان کے موزوں اور بنے بنائے جملے اور فقرے خود بخود مترجم کے ذہن میں آنے لگتے ہیں۔ لیکن اگر مسلسل کام کر کے مہارت پیدا نہیں کی گئی تو مترجم اصل کے بوجھ سے دبا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کا ترجمہ مطابقِ اصل تو ہو سکتا ہے لیکن اصل کا بدل بنکر اس کی طرح مقبول نہیں ہو سکتا۔ (آل انڈیا ریڈیو کے شکریہ کے ساتھ)۔

اعلان

بحکم پریس رجسٹرار حکومتِ ہند۔ فارم ۴۔ رول ۸

ایڈیٹر کا نام:۔ (پروفیسر) سید علی اکبر۔
قومیت:۔ ہندوستانی۔
پتہ:۔ ادارۂ ادبیات اردو، خیریت آباد حیدرآباد ۴ (اے۔ پی)
پرنٹر کا نام:۔ (پروفیسر) سید علی اکبر۔
قومیت:۔ ہندوستانی۔
پتہ:۔ ادارۂ ادبیات اردو، خیریت آباد حیدرآباد ۴ (اے۔ پی)

پبلشر کا نام:۔ (پروفیسر) سید علی اکبر۔
قومیت:۔ ہندوستانی۔
پتہ:۔ ادارۂ ادبیات اردو، خیریت آباد حیدرآباد ۴ (اے۔ پی)
نام و پتہ مالک:۔ ادارۂ ادبیات اردو، خیریت آباد حیدرآباد ۴ (اے۔ پی)
میں سید علی اکبر تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

(دستخط) سید علی اکبر

شکیل احمد
ایم کام ۔ دہلی

دیہاتی تعلیم اور اقتصادیات

ہندوستان بہ لحاظ نفس ایک تعلیم یافتہ ملک ہوتے ہوئے بھی تعلیمی میدان میں صد درجہ پچھڑا ہوا ہے۔ شہروں میں تو خیر آبادی کا ایک بڑا حصہ تعلیم یافتہ ہے بھی، مگر دیہاتوں میں اس کے برعکس اکثریت غیر تعلیم یافتہ طبقہ کی ہے۔ میرے خیال میں اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جہالت سب ہی مسائل کی جڑ ہے۔ اگر بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے ملک ہندوستان کی کل آبادی کا صرف ۷ء۲۳ فی صد حصہ ہی تعلیم یافتہ ہے جب کہ دیہاتوں میں یہ نسبت ۳ فی صد ہی ہے۔ ہر تین دیہاتوں میں سے صرف ایک دیہات میں پرائمری اسکول اور ہر ۱۶۱ مربع میل کے پیچھے ایک جونیر ہائی اسکول ہے۔ اول تو ہمارے ملک میں تعلیمی اداروں کی شدید کمی ہے، پھر اس پر ستم یہ کہ ان میں پڑھانے والے اساتذہ کی تعداد بھی ضرورت سے کہیں کم ہے۔ بدقسمتی سے زیادہ تر اساتذہ پڑھانے میں خاص دلچسپی نہیں لیتے، چونکہ انھیں ان کے کام کے بدلے میں مناسب معاوضہ نہیں ملتا۔ ہندوستانیوں کے غیر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ :- "ہندوستانی بیسویں صدی میں رہتے ہوئے بھی پندرھویں صدی کی باتیں کرتے ہیں"۔ جہالت ہی کی وجہ ہم لوگ آج بھی ایجاداتِ سائنس کا استعمال نہیں کر پاتے۔ نتیجہ میں ہمارا معیارِ زندگی مغربی ممالک کے مقابلہ میں بہت نیچا ہے۔ حصول آزادی سے پیشتر برٹش سرکار یہ چاہتی تھی کہ ہندوستانیوں کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ پڑھ لکھ کر حکومت کی مشنری چلانے میں ایک اہم پرزہ کا رول ادا کر سکیں اور ان میں قومی بیداری کے عناصر نہ پیدا ہونے پائیں اس لئے انھوں نے تعلیمی ڈھانچہ کو بھی ایسے رنگ میں ڈھالا تھا کہ ان کے اس مقصد کی تکمیل ہو سکے۔ بدقسمتی سے آج بھی ہمارا تعلیمی ڈھانچہ اس برائی سے خالی نہیں۔ آج بھی تعلیم کے بعد لوگ بے روزگار نظر آتے ہیں یہی نہیں بلکہ ان میں کچھ برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ دیہاتی طلبا جب شہروں میں حصول تعلیم کے لئے جاتے ہیں تو وہ شہری ماحول اور تعلیم کے مغربی طریقہ سے اتنا زیادہ متاثر ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے دیہاتی بھائیوں اور عزیز و اقربا کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں اس طرح موجودہ تعلیم شہروں اور دیہاتوں کے درمیان ایک دیوار بن گئی ہے۔ شہری دیہاتی لوگوں کو "اجڈ" اور دیہاتی شہری لوگوں کو "بگڑا ہوا" تصور کرتے ہیں۔ تعلیم کے موجودہ ڈھانچہ میں اگر ضروری رد و بدل نہیں کیا گیا تو یہ قومی مفاد پر ایک کاری ضرب ہوگی۔ اس لئے ہماری تعلیم ایک ایسے ڈھانچہ میں ڈھلی ہونا چاہئے کہ ملک کی قومی آمدنی میں

[illegible] کے بوجھ سے نجات حاصل کر سکیں۔ [illegible] تعلیم کا بنیادی مقصد [illegible] ملک آزاد ہوا تو ہمیں اپنے تعلیمی نظام کو حالات کے مطابق بنانا پڑا [illegible] تعلیم کو عملی بنایا جائے تاکہ قوم میں بیداری اور ترقی کے دبے ہوئے عناصر ابھر سکیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے دیہاتی [illegible] تعلیم [illegible] پیدا ہوتا ہے کہ دیہاتی طلباء کی تعلیم کا معیار کیا ہونا چاہئے؟

دیہاتی تعلیم کا معیار ایسا ہونا چاہئے کہ وہ دیہاتی طلباء کو جسمانی کام میں بھی مدد دے سکے۔ صرف کتابی تعلیم [illegible] بلکہ اس کی بجائے عملی تعلیم پر زیادہ زور دینا چاہئے۔ ڈاکٹر حسین [illegible] نے "وردھا تعلیمی منصوبہ" کی [illegible] جو آج کل بیسک یا بنیادی تعلیم کے نام سے مشہور ہے۔ بنیادی تعلیم سے مطلب اس تعلیم سے ہے جس کا تعلق انسانی زندگی [illegible] تعلیم حاصل کرنے والوں کی جسمانی، دماغی اور روحانی صلاحیتیں اجاگر ہونا چاہئے۔ بنیادی تعلیم کو دیہاتوں میں [illegible] تبلیغ کی گئی۔ مرکزی حکومت نے ۱۹۴۵ء میں ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس کا مقصد پورے ملک میں جلد از جلد بنیادی تعلیم کو [illegible] پہنچانا تھا۔ ۶۲-۱۹۶۱ء میں ملک میں بنیادی اسکولوں کی تعداد ۹۵۱۸۵ تھی جن میں ۶۵۸، ۹۱، ۱۱ طلباء اور [illegible] اساتذہ تھے۔ اس منصوبہ پر ۴۳ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے خرچ کئے گئے تھے۔

اب ہم اس موضوع پر آئیں گے کہ دیہاتی تعلیم کے ڈھانچہ میں کن کن باتوں کو شامل کرنا چاہئے جس سے ملک کے [illegible] سماجی اور سیاسی مسائل حل ہو سکیں۔

ہمارے ملک میں دیہاتی تعلیم کے کیوری کلم (CURRICULUM) میں مندرجہ ذیل باتوں کی شمولیت ہونا چاہئے۔

اول تو دیہاتی تعلیم میں زراعت کو خاص اہمیت حاصل ہونی چاہئے، چونکہ بھارت میں دیہاتی لوگوں کا خاص پیشہ زراعت ہے، اس لئے گاؤں کے طلبا کو ایسی تعلیم دینا چاہئے کہ وہ زراعتی میدان میں مکمل ہو جائیں۔ ان کے کیوری کلم میں کھیتی کے نئے طریقے، سینچائی کے نئے ذرائع، زراعتی فصلوں کو فروخت کرنے اور تباہی سے بچانے کے [illegible] شمولیت ہونا چاہئے جس سے زراعت میں دلچسپی لے سکیں اور ملک کی پیداوار بڑھا کر [illegible] ملک کو [illegible] بنا سکیں۔

دوسرے دیہاتوں کے [illegible] کو [illegible] بھی کافی اہمیت رکھتی ہیں اس لئے دیہاتی طلبا کو ایسی تعلیم دی جانی چاہئے جس سے وہ [illegible] گھریلو صنعتوں سے متعلق معلومات حاصل کر سکیں۔ خصوصاً انہیں کتائی، بنائی [illegible] اور [illegible] وغیرہ سے متعلق مکمل معلومات بہم پہنچانا چاہئے۔ اس طرح کی [illegible] ایک طرف گاؤں کی [illegible] ہوگی، دوسری طرف طلباء میں خود کفیل بننے کی صلاحیتیں بھی اجاگر ہو جائیں گی [illegible] اضافہ ہوگا۔

تیسرے دیہاتی تعلیم میں [illegible]

سے جیسا آباد ہو کر رہ سکیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے دیہاتی تعلیم میں ایسے مضامین شامل ہونا چاہئے جس سے ان میں اتحاد پیدا ہو سکے۔ دوسرے عملی تعلیم میں مقدمہ بازی کی خرابیاں، چک بندی کے فوائد، گاؤں کی صفائی، کوآپریٹیو سوسائٹی بنانے اور چلانے کے متعلق باتوں کی معلومات کرانا چاہئے۔ علاوہ ازیں ان کو بتانا چاہئے کہ شادی، بیاہ، کفن دفن پر زیادہ خرچ کرنا ان کے اور قوم کے مفاد کے لئے مناسب نہیں۔ اس طرح ان میں اگر بچت کا جذبہ پیدا ہو گیا تو ملک کے منصوبوں کے لئے بھاری سرمایہ آسانی سے مل جائے گا جس سے ہمیں بیرونی امداد کا منہ نہیں تکنا پڑے گا۔

چوتھے، طلبا جو ادبی کتابیں پڑھتے ہیں وہ ان کے معیار اور ذوق پر بار ثابت ہوتی ہیں، اس لئے دیہاتی طلبا کے لئے جو کتابیں منتخب کی جائیں ان میں ایسے مضامین اور مقالے شامل کئے جائیں جو ان کے ماحول اور زندگی سے وابستہ ہوں تاکہ ان میں ادب کے لئے دلچسپی پیدا ہو سکے۔ اگر ان میں ادبی شعور پیدا ہو گیا تو ان کی خشک زندگی میں ایک عظیم ترین انقلاب آپ ہی آ جائے گا اور ان کی قوت متخیلہ میں اضافہ ہوگا جس سے وہ اپنے اور اپنے ملک کے مسائل حل کرنے سے متعلق تدابیر سوچ سکتے ہیں۔

مردوں کی طرح عورتوں کو بھی تعلیم یافتہ ہونا چاہئے۔ اگر وہ تعلیم یافتہ ہوں گی تو وہ گھر گرہستی کو منظم طریقہ سے کامیابی کے ساتھ چلا سکیں گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دیہاتی عورتوں کی تعلیم کا معیار کیا ہونا چاہئے؟ اس سلسلہ میں میری ناقص رائے یہ ہے کہ نسوانی تعلیم "امور خانہ داری" (ہوم سائنس) کا مضمون لازمی ہونا چاہئے۔ ہوم سائنس کی تعلیم سے انھیں بچوں کی تربیت کرنا، سلائی، کڑھائی، کھانا پکانا وغیرہ اچھی طرح آ جائے گا جس سے انھیں گھریلو نظام چلانے میں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

مندرجہ بالا باتیں تو وہ تھیں جو دیہاتی تعلیم کے کمزوری کلم سے متعلق تھیں۔ اب ہم دیہاتی تعلیم کی ترقی کی تدابیر پر غور کریں گے۔

دیہاتوں میں تعلیمی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ بالغوں کو تعلیم دینے کے لئے "بالغوں کے مدارس" قائم کئے جائیں جن میں انھیں زراعت سے متعلق تعلیم دی جائے۔ دوسرے ملک کے تمام دیہات میں لازمی تعلیم کی اسکیم کو پوری طور سے عملی جامہ پہنایا جائے، یعنے ۵ سال سے ۱۴ سال تک کے بچوں کو مفت تعلیم کی سہولتیں دی جائیں۔ تیسرے دیہاتی تعلیم کے لئے ٹرینڈ اور تجربہ کار اساتذہ کا انتظام کیا جائے، اس کے لئے ٹیچرس ٹریننگ اسکول قائم کئے جائیں۔

حصول آزادی کے بعد سے اب تک اگرچہ ہماری سرکار نے تعلیمی ترقی کے لئے بہت سے منصوبے بنائے اور وہ منصوبے بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے مگر باوجود اس کے ابھی ہمارا ملک تعلیمی میدان میں بہت پچھڑا ہوا ہے۔ ترقی کی موجودہ رفتار کو اطمینان بخش نہیں کہا جا سکتا اس لئے سرکار کو چاہئے کہ وہ دیہاتوں میں مڈل، پرائمری، اور ہائی اسکول قائم کرے تاکہ دیہات کی ۹۰٪ آبادی کو جہالت کے ظالمانہ پنجے سے نکالا جا سکے۔ جب تک دیہاتوں میں معقول تعلیم کا انتظام نہ کیا جائے گا تب تک ہماری اقتصادی، معاشی، سیاسی اور سماجی ترقی محض ایک خواب رہے گی۔

احمد علی خاں ادیب

خطوطِ غالب

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب کی بے مثل شخصیت دنیائے ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ ہجری مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو غالب، اکبر آباد یعنے آگرے میں پیدا ہوئے۔ جس طرح ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں اپنی سسرال میں مرزا دولھا مشہور تھے اُسی طرح یہ مرزا نوشہ کہلانے لگے۔ مرزا کم عمری ہی میں یتیم ہوگئے، چچا کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا، خوش حال ننھیال میں پرورش پائی، اس لئے ابتدائی تعلیم و تربیت بھی وہیں ہوئی، جو مولوی محمد معظم، درملّا عبدالصمد کے ذمے تھی۔ سچ ہے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، لائق استادوں کے فیضِ صحبت اور علمی ماحول کی یہ دولت یہ جوہر قابل کچھ ایسا چمکا کہ روزمرّہ کی گفتگو سے لے کر شعر و سخن کی لطافتوں اور علمی مسائل کی بال کی کھال نکالنے میں آپ اپنی نظیر ثابت ہوا۔ گفتگو کرنا بھی ایک فن ہے، اور وہی شخص اس فن کا ماہر ہوتا ہے جو ذی علم ہو، اپنی زبان کے استعمال پر پوری پوری قدرت رکھتا ہو، اعلیٰ تخیل کا حامل اور زبردست قوتِ ارادی و مستقل مزاجی کا مالک ہو۔ مرزا غالب میں یہ سب چیزیں کوٹ کوٹ کے بھری تھیں۔ ان سب پر طرّہ ان کی فطری ظرافت اور بذلہ سنجی تھی۔ سنجیدہ سے سنجیدہ موقع پر بھی وہ خط و کتابت یا خانگی گفتگو میں مزاح کا کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ نکالتے تھے، مثلاً مرزا صاحب نے اپنے آخری زمانے میں ہر سال اپنے مرنے کا مادۂ تاریخ نکالنے کا ایک معمول سا بنا لیا تھا۔ ایک سال کوئی دبا پھوٹ پڑی، زمانہ گزر گیا اور مرزا نے نئے سال میں قدم رکھا، کسی نے ان سے پوچھا "قبلہ! پار سال آپ نے اپنے انتقال کی تاریخ نکالی، پھر انتقال کیوں نہ فرمایا؟" کہنے لگے کہ: "بھائی! سب ہی جانتے ہیں کہ اس وقت دبا پھیلی تھی، اور کثرت سے شہر کے لوگ مرے ہیں، بھلا عوام کے ساتھ کیوں مرنے چلا!"

آدمی اسی وقت پورا پورا ادیب یا چوٹی کا شاعر اور انشا پرداز سمجھا جاتا ہے جب کہ وہ کچھ لکھنے سے کہیں زیادہ پڑھنے کا بھی عادی ہو۔ مرزا غالب کے پڑھنے کا یہ حال تھا کہ دس بارہ برس کی ہی عمر میں انھوں نے دیوان ظہوری کا بھرپور مطالعہ کیا تھا۔ اپنی ایک فارسی غزل میں "یعنی چہ" کے موقع پر کہ چند بیت لکھ کر اپنے استاد کو غزل دکھائی مولوی معظم نے اس غزل کی ردیف کو مہمل قرار دیا، مگر چند دن بعد مرزا نے جب "یعنی کہ چہ" کا استعمال ظہوری کے یہاں سے اخذ کر کے سند کے طور پر استاد کی خدمت میں پیش کیا تو مولوی معظم دم بخود ہو کر رہ گئے۔

مرزا مطالعۂ کتب کے ایسے عادی ہو چلے تھے کہ بڑھاپے میں بھی اسے ترک نہ کر سکے۔ خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی نے ایک چشم دید واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :- "جب میں ان کی زندگی کے بالکل آخری ایام میں ان کی ملاقات کو گیا تو مرزا غالب قاآنی کا مطالعہ کر رہے تھے۔ حالانکہ اس زمانے میں انھوں نے چلنا پھرنا ترک کر دیا تھا اور سارا سارا دن بستر پہ لیٹے رہتے تھے، کانوں سے بالکل سنائی نہیں دیتا تھا، بینائی بھی بہت کمزور ہو گئی تھی اور پڑھنے کے لئے عینک لگانے کی ضرورت پڑتی تھی" اس واقعے کے مطابق اور علمی معلومات کی بنا پر ان کا یہ دعویٰ بیجا نہیں معلوم ہوتا کہ "آج ہندوستان بھر میں میرے برابر کا فارسی داں نہیں!" — وہ صاحبِ تصنیف بھی تھے، انھوں نے اردو اور فارسی میں متعدد کتابیں لکھیں جن کے منجملہ ان کا دیوانِ اردو، ڈاکٹر بجنوری کے نزدیک الہامی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ اردو دیوان ہی نہیں، بلکہ مرزا کے اردو خطوط بھی اس قدر مقبول ہوئے کہ ان کے بارے میں حالی جیسا نقاد رطب اللسان نظر آتا ہے۔ حالی صاحب لکھتے ہیں کہ :- "مرزا کی اردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے پوری پوری تقلید ہو سکی"۔

عموماً خطوط میں بیماری کا دکھڑا تو سب ہی روتے ہیں، مگر غالب نے اس دکھڑے کے اظہار میں بھی وہ دلکشی پیدا کر دی جو گلستانِ سعدی کی نصیحتوں میں پائی جاتی ہے، مثلاً سیف الحق سیاح کو اپنا حال لکھتے ہیں کہ :-

"ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے، ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی، گرانی رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے، بڑا سفر دور دراز در پیش ہے، زادِ راہ موجود نہیں، خالی ہاتھ جاتا ہوں، اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر، اگر باز پُرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے، دوزخ جاوید ہے، اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے :-

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے"

قرائن بتاتے ہیں کہ ۱۸۵۰ء تک تو مرزا صاحب فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے، پھر اردو میں لکھنے لگے۔ جب ملک میں ان کے اردو خطوط کی اشاعت کی سخت ضرورت محسوس ہونے لگی تو وہ قلم سنبھال کر لکھنے پر مجبور ہوئے۔ اس طرح ان کے اردو خطوط آگے چل کر ایک خاص کی شئے ثابت ہوئے۔ جب ہم ان خطوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خطوط خوش مذاق ناظرین کے حق میں انھیں کے ایک شعر کے مصداق ثابت ہوتے ہیں۔ وہ شعر یہ ہے :-

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

خطوط نگاری میں ان کو یہ کمال حاصل تھا کہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ اپنے مخاطب میں سما جاتے اور

۱؎ میاں داد خاں سیاح مرحوم کا دیوان ادارے کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ اکبر۔

رنگ برنگ کے موضوعات پر حقیقت پسند ادب باکمالِ اظہارِ خیال کے ساتھ ساتھ اپنی افتادِ طبع کا ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے تھے۔ ان کے چہیتے اور قریبی شاگرد خواجہ الطاف حسین حالی نے مرزا کے رجحانات کا ہمراط ذکر کرکے لکھا ہے کہ:-

"مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوتے ہیں، اور قوتِ متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلّاق ہے اس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوتِ پرواز کو طائر کے ساتھ۔"

مرزا صاحب کے بارے میں حالی مرحوم کی یہ بڑی جچی تلی رائے ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ مرزا کے کلام میں جو شوخی یا قوتِ متخیلہ پائی جاتی ہے اس سے کوئی نہ کوئی نکتہ نکل آتا ہے۔ ان کے اشعار کی طرح ان کے نثر پاروں میں بھی آمد ہی آمد پائی جاتی ہے جس کے حرف حرف سے زورِ قلم ٹپکتا ہے۔ یہ ایک خداداد بات ہے جو انھیں کے حصے میں آئی، اس کا ثبوت ذیل کے خط سے ملے گا جو میر مہدی مجروح کے نام لکھا گیا۔ خط کا مضمون یہ ہے کہ میرن صاحب آئے اور ان سے کچھ بات چیت ہوئی، اسی بات چیت کی تفصیل بہ شکل مکالمہ خط میں پائی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"اے میرن صاحب! السلام علیکم! حضرت آداب، کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ حضور! کیا میں منع کرتا ہوں، اگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں، پھر آپ کیوں تکلیف کریں؟ نہیں میرن صاحب! اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں، وہ خفا ہوا ہوگا، جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت! وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے خفا کیوں ہوں گے؟ بھائی! آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے باز کیوں رکھتے ہو؟ سبحان اللہ، اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے! اچھا، تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں۔ کیا عرض کروں، سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا، اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں، میری روانگی کے تین دن بعد آپ شوق سے لکھیے گا۔ میاں بیٹھو ہوش کی خبر لو! تمہارے جانے نہ جانے سے کیا علاقہ، میں بوڑھا آدمی تمہاری باتوں میں آگیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا، لاحول ولاقوۃ!"

مرزا صاحب نے اس خط میں مکالمے کے جس طرز کو نبایا وہ انگریزی تحریروں میں بھی اس طرح پایا جاتا ہے کہ سوال کرنے والے اور جواب دینے والے کا نام یا کوئی علامت ضرور لاتے ہیں تاکہ سوالات و جوابات میں امتیاز قائم رہے۔ مرزا صاحب یہ نہیں کرتے بلکہ سوال یا جواب کے موقع پر ایک آدھ ایسا لفظ لے آتے ہیں جس سے سوال سوال رہتا ہے اور جواب جواب۔ چنانچہ یہی خط جو بارہ جملوں پر مشتمل ہے اس کے دوسرے جملے میں "حضرت" کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ جواب سلام ہے۔ اسی طرح پانچویں جملے میں حضور، ساتویں میں حضرت، نویں میں سبحان اللہ، اور گیارھویں جملے میں کیا عرض کروں کے فقرے سے

صاف ظاہر ہے کہ یہ سب کے سب جوابات ہیں۔ اس خط کے سوالات و جوابات میں جو سلاست اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے اس نے تحریر کی لطافت کو دوبالا کر دیا، اس طرح معمولی سی شوخی بھی طرز ادا کے لحاظ سے غیر معمولی ہو گئی۔ خود مرزا نے اپنی خطوط نگاری کی سلاست کا ایک خط میں اس طرح اظہار کیا ہے کہ:۔

"پیر و مرشد! یہ خط لکھنا نہیں ہے باتیں کرنی ہیں، اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا۔"

مرزا غالب کے خطوط دیکھنے کے بعد اور لوگوں کے خطوط پھیکے نظر آتے ہیں، البتہ خال خال اہل قلم ایسے پائے جاتے ہیں جن کے خطوط میں کافی جاذبیت اور رنگارنگی موجود ہے، مثلاً علامہ شبلی نعمانی اور دوسرے ادیبوں کے مکتوبات اپنی جامعیت اور اسلوب کے اعتبار سے شاہکار حیثیت کے حامل ہیں، تاہم ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے — کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

مرزا نے اپنے اس مقطع میں محض شاعرانہ تعلّی سے کام نہیں لیا بلکہ ایک کھلی ہوئی حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ اسی مفہوم کو زیادہ صراحت کے ساتھ انہوں نے اپنے ایک عریضے میں ظاہر کیا تھا جو بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں پیش کیا گیا چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"مجھے اپنی خوش بختی پر جتنا ناز ہو بجا ہے کہ آپ سا حکمران میرا خداوندگار و آقا ہے، لیکن میری جان آپ کے قربان، آپ کو بھی تو فخر ہونا چاہئے کہ غالب کا سا شاعر آتش بیاں آپ کا غلام ہے اگر آپ کا التفات میرے رتبے کے مطابق ہو تو میری جگہ آپ کے دیدہ و دل میں ہونا چاہئے۔

کہتے ہیں صاحبقران ثانی شاہ جہاں نے کلیم کو سیم و زر اور لعل و گہر سے تلوایا تھا، میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ زیادہ نہیں آپ سخن سنج حضرات کو یہ حکم دیں کہ وہ ایک بار میرے کلام ہی کو کلیم کے کلام کے ساتھ جانچنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔"

علی اکبر آمبوری

کاوش مثنوی کے آئینہ میں

مرزا غالب کا ایک مشہور شعر ہے ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

ایک اور شاعر منشی جگت موہن لال رواںؔ نے کہا ہے ؎

اللہ اللہ ری یہ وسعتِ دامانِ غزل
بلبل و گل ہی پہ موقوف نہیں شانِ غزل

ختم پہنائے دو عالم پہ ہے پایانِ غزل
پوچھیئے حافظِ شیراز سے امکانِ غزل

اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے خیال میں ۔۔۔ "غزل، ہماری شاعری کی آبرو ہے"۔۔۔

غزل کی نسبت مختلف اربابِ فکر و نظر کے نظریات یہاں موضوعِ بحث نہیں ہیں البتہ شاعری کی اس اہم صنف کی عظمت سے نہ انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس حقیقت سے چشم پوشی کہ قدیم طرزِ غزل کی ابہام پسندی و روایت پسندی سے بعض لوگ متنفر بھی ہیں۔ درحقیقت یہ صرف روایتی غزل کی قدامت پسندی ہے جسے بار بار دہرائے جانے کے باعث اس میں فرسودہ پن آگیا ہے اور غزل کے اسی فرسودہ پن نے بعض جدت پسند ذہنوں میں اس صنف کے خلاف عجیب سے خیالات پیدا کر دیئے ہیں۔ ذرا تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھ لئے جائیں تو پتہ چل جاتا ہے کہ مومنؔ جیسے قدیم غزل گو شعراء نے بادہ و ساغر، گردشِ افلاک اور حرماں نصیب عشاق کی داستانِ حزن و ملال جیسے پامال اور فرسودہ مضامین میں اپنے طرزِ بیان کی ندرت اور اسلوبِ ادا کی جدت سے صنفِ غزل کو اس طرح نکھار دیا ہے کہ ان اساتذہ کا کلام پڑھتے ہوئے ہم محض عالمِ محویت میں ایک گونہ روحانی سیرابی سی محسوس کرنے لگتے ہیں اور کلام پڑھنے کے بعد ہی چونکتے ہیں کہ یہ تو وہی پامال مضامین تھے۔ اس ضمن میں خدائے سخن میر تقی میرؔ کا نام نہ لینا صنفِ غزل سے ناانصافی ہوگی۔ اردو شاعری میں میرؔ کا کلام واقعی "اک متاعِ گراں مایہ" سے کسی قدر کم نہیں۔ یہ وہی شاعر ہے جس کا مزار کوئی نہیں پہچانتا، لیکن اہلِ نظر تو ہزاروں لاکھوں اشعار میں سے میرؔ کے کلام کو الگ کر کے بتا سکتے ہیں۔ میرؔ جیسے اساتذۂ فن کے کلام کی ایک اور خوبی جو ناقدانہ نظر رکھنے والوں نے بتائی وہ یہ ہے کہ ان شعراء نے یہ کوشش کی کہ فارسی غزلوں کے سود خاکی املاء سے بچے رہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض نام نہاد، خود ساختہ شاعروں نے محض تک بندی و قافیہ پیمائی سے غزل کی صنف کو بہت بدنام کر رکھا ہے ورنہ اچھی غزلیں تو تاثیر اور دلکشی کا دوسرا نام ہوتی ہیں۔ وہی حسن و عشق کی داستان اور

سہیلی چھپا یادکی

معشوق کی شان میں غلو اور مبالغہ کی بات — یہ تو اس صنف کے لیے کسی قدر ضروری بھی سمجھی گئی ہے۔ فارسی میں غزل کے معنی "سخن از زنان گفتن" ہی تو ہیں۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ غزل میں تسلسل کا لحاظ زیادہ نہیں رکھا جاسکتا۔ جب نزاکتِ ادا اور ندرتِ الفاظ کے ساتھ تسلسلِ بیان کا لحاظ رکھنا مقصود ہو تو گویا پھر کر شاعر کو نظم کی اس صنف کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے جسے مثنوی کہتے ہیں۔

زبانِ اردو کے ساتھ مثنوی کی تاریخ بھی بہت پرانی ہے اور بہ قولِ پروفیسر طاہر فاروقی۔ — "اردو میں نثر سے پہلے نظم اور اصنافِ نظم میں سب سے پہلے مثنوی پیدا ہوئی" — متقدمین سے لے کر عصرِ حاضر تک کے اردو شعراء میں بیشتر شاعروں نے مختلف اصنافِ سخن کے ساتھ مثنوی میں اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ تاریخ کے مطالعہ اور تذکروں کی روشنی میں یہ راز افشا ہو جاتا ہے کہ مثنوی کو جہاں فروغ حاصل ہوا، وہ صرف دکن کی مردم خیز سرزمین کے سوا کوئی دوسرا مقام نہیں۔

عہدِ بہمنی سے لے کر ولی اورنگ آبادی تک کے دور میں دکن میں جتنے بھی شاعر گزرے ہیں ان میں سے، بہ استثنائے چند، ہر ایک نے مختلف اصنافِ سخن کے ساتھ مثنوی کو بڑے ہی چاؤ سے اپنایا، اسے لکھا، سنوارا اور اسے ایک مستقل صنف بنا دیا۔

قطب شاہی دور کے شعراء میں قلی قطب شاہ کی مثنویوں کو جو اہمیت حاصل ہے، اس کے تذکرے سے کوئی بھی مورخ دامن نہیں بچا سکتا، بلکہ یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ معانی کے تذکرے کے بغیر اردو ادب بالخصوص دکنی ادب کی تاریخ بالکل نامکمل اور تشنہ رہ جاتی۔ یہ وہی شاعر ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ اس نے پچاس ہزار سے زیادہ شعر کہے تھے۔ ہندوستانی ترکاریوں، شکاری چڑیوں اور ہندوستانی پھلوں سے متعلق محمد قلی کی مثنویاں اور مسلمانوں کے رسم و رواج، عید، تہوار اور موسمِ برسات سے متعلق ان کی بعض نظمیں انسانی معاشرت اور فطرت کی غماز کہی گئی ہیں۔ اسی عہد میں ابن نشاطی کی "پھول بن"، غواصی کی مثنوی "قصۂ سیف الملوک"، ملا وجہی کی "قطب مشتری" اور دیگر شعراء کی کئی مثنویاں قابلِ ذکر ہیں۔ عادل شاہی حکومت کے درباری شاعر نصرتی کی مثنوی "گلشنِ عشق" یعنی کنور منوہر اور مدمالتی کے حسن و عشق کی داستان اور ہاشمی کی مثنوی "یوسف زلیخا" بھی بہتر مثنویاں کہلاتی ہیں۔ دکن کی دیگر مثنویوں میں بحری کی "من لگن"، وجدی کی "باغِ جانفزا"، سورت کی تعریف میں ولی دکنی اورنگ آبادی کی مثنوی اور بعض دیگر شعراء کی مثنویاں، مثنوی کی تاریخ میں اہمیت رکھتی ہیں۔

یہاں تامل ناڈو میں گزشتہ تین سو برسوں کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مثنویوں کی تحقیق میں کاوش بدری اور راز امتیاز نے بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے جس کا تفصیلی جائزہ کاوش بدری کی مثنوی کی [illegible] شائع ہوا ہے۔

جب مثنویوں اور مثنوی نویسوں کا ذکر آ جائے تو میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" اور پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گلزار نسیم" کا اجمالاً یا ضمناً تذکرہ کرنا لازمی سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ ان مثنوی نویسوں کے اعجاز فن اور ان مثنویوں میں جو روانی، سلاست اور سحر بیانی پائی جاتی ہے، اس کا اعتراف تمام تذکرہ نویسوں نے بالاتفاق کیا ہے حالانکہ یہ مثنویاں بھی قواعد قدیمہ اور روایتی واقعات کی زنجیروں سے آزاد نہیں معلوم ہوتیں مثلاً "سحر البیان" اس طرح شروع ہوتی ہے ؎

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ — کہ تھا وہ شہنشاہ گیتی پناہ

اور پھر آگے چل کر ؎

جو دیکھی تو ہے اک جوان حسیں — کھڑا ہے وہ آئینہ سا مہ جبیں

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن — جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

اور پھر مثنوی کے اختتام پر حسب معمول مثنوی کے سن تحریر سے پہلے ۔

زبس باپ ماں کو تھی سہرے کی چاہ — دوبارہ انھوں نے کیا ان کا بیاہ

لکھوں گر میں اس بیاہ کی دھوم دھام — تو پھر یہ کہانی نہ ہوئے تمام

ہوا شہر بفضل پروردگار — وہی شاہزادہ وہی شہریار

مثنوی کی مختصر سی تاریخ اور بعض مثنویوں کے تذکرے سے ان کا تنقیدی جائزہ مقصود نہیں بلکہ اس حقیقت کو دہرانا ہے کہ ہر دور میں مثنوی کی صنف، شعراء میں اتنی محبوب رہی کہ بیشتر شعراء نے شعوری یا لاشعوری طور پر اسے اپنایا۔

کاوش بدری کی مثنوی "قبلہ نما" پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے مالک رام نے لکھا ہے ۔

"مثنوی کی روایت بہت قدیم اور شاندار ہے فارسی میں بڑی بلند پایہ مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ ہمارے یہاں اردو میں بالعموم واقعاتی اور عاشقانہ مثنوی لکھنے کا رواج رہا ہے، چونکہ ان میں کوئی پائدار حقیقت بیان نہیں ہوتی تھی ان میں سے بیشتر طاق نسیاں کی نذر ہو گئیں۔ ایک آدھ جو آج بھی پڑھی جاتی ہے وہ اپنی لسانی اہمیت کے باعث۔"

چونکہ کاوش بدری کی مثنوی "قبلہ نما" مثنوی نویسی کی قواعد قدیمہ اور روایتی انداز سے الگ ہٹ کر ایک پائدار حقیقت یعنی سرکار دو عالم کے مقدس کردار کی عکاسی پیش کرتی ہے، یہ مثنوی کی تاریخ میں ایک زرین باب کا اضافہ اور اس صنف میں نئے امکانات کی نشان دہی کرتی ہے۔

کاوش بدری معدودے ان چند شعراء میں سے ہیں جنھوں نے بچپن ہی سے طبع آزمائی کو اپنا شیوہ بنالیا اور اپنی فطری صلاحیتوں کے باعث ارتقاء کی نئی منزلوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ڈاکٹر زور نے یہ کہہ کر حقیقت بیان کی ہے کہ ۔۔۔ "نہ جانے آپ (کاوش) کب سے مشق سخن کر رہے ہیں کیونکہ تیور بتا رہے ہیں کہ

اس دشت کی سیاحی میں آپ نے عمرِ عزیز کا ایک بڑا حصہ گذارا ہے ...“

میں کاوش کو بہت مدت سے اور بہت قریب سے جانتا ہوں۔ اس منحنی اور نیم بسمل سے شاعر نے اسی شاعری کے پیچھے اپنا دولت لٹا دی، اپنی عمرِ عزیز کا ایک بڑا حصہ گذار دیا، اپنی صحت کو پامال کرلیا اور خود اپنے ہی ایک شعر کے مصرعہ ”آدمی میں ایک چلتا پھرتا سا مزار ہے“ کی تفسیر بنے بیٹھے ہیں۔ اس چلتے پھرتے مزار اور اس ہڈیوں کے ڈھانچے میں ابھی اتنی لگن، اتنا جوش اور شاعری سے اتنا شوق بلکہ جنون باقی ہے کہ دیکھنے والے اس کی حالت زار پر رحم کھاتے ہیں۔ بعض ناقدرشناس تو اسے رسوا بھی کرتے ہیں۔ لیکن کاوش کو اپنی صحت سے اپنی شاعری کی صحت کا خیال زیادہ رہتا ہے۔ وہ ان ناقدرشناس اپنوں اور غیروں کی خدمت میں عرض کرتا ہے ؎

الاماں اس دشت کی سیاحیاں ہائے اس دھن میں مری رسوائیاں
خار کھائے بیٹھے ہیں اغیار بھی فتنہ گر کہتے ہیں مجھ کو یار بھی

جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے۔ شاعر پیدا ہوتا ہے، بنتا نہیں۔ کاوش کی شاعرانہ صلاحیتیں بھی قدرت کا عطیہ ہیں۔ عمیق مطالعہ، مشاہدے، زمانے بھر کی ٹھوکروں اور تلخ تجربات کی بھٹی میں تپ کر کاوش کی شاعری کندن بن گئی ہے۔ اگر اس کی شعری صلاحیت موزونیتِ طبع تک محدود رہ جاتی تو وہ قافیہ پیمائی تو ٹھیک ڈھنگ سے کرلیتا، لیکن اس کی شاعری میں وہ بات پیدا نہ ہوتی جو ”مثنوی قبلہ نما“ کی طویل نظم کا خاصہ ہے۔ کہتا ہے ؎

میں نے وہ طرزِ سخن ایجاد کی فطرتِ رنگیں نے اس میں سانس لی

سید احتشام حسین نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے :-

”شاعری میں فطری صلاحیت، ذہانت اور طباعی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، لیکن وہاں بھی اگر مشاہدے اور مطالعہ سے غذا بہم نہ پہنچائی جائے اور مشق جاری نہ رکھی جائے تو خیالوں کے چراغ دھندلے ہو جاتے ہیں اور جذبات کی یکسانیت اظہار کے دائرے کو بالکل محدود کردیتی ہے۔“

کاوش نے مشقِ سخن میں کبھی تساہل نہیں برتا اور مطالعہ سے کبھی روگردانی نہیں کی جس کی وجہ سے اس کی شاعری میں اس کے خیالوں کے چراغ دھندلے نہیں، آنکھوں کو خیرہ کردینے والے ہوتے ہیں۔ خود سید احتشام حسین نے کاوش بدری کے بارے میں لکھا ہے :-

”کاوش بدری جنوبی ہند کے نئے شاعروں میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے یہ اہمیت محنت، ریاضت اور شاعری سے شغف کی بنا پر حاصل کی ہے ...“

مثنوی قبلہ نما میں جو اشعار کاوش کی سرگزشت سے عبارت ہیں، انھیں پڑھتے ہوئے تصورات میں ایک زخم خوردہ تصویر ابھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، نگاہوں کے سامنے ایک نحیف ونزار، ستم رسیدہ شاعر کے لاغر جسم کی ہڈیاں

چیختی ہوئی محسوس ہوتی ہیں جو کہ ایک کرب انگیز زخمی احساس کی تپش انگیزی سے جھلکس کر رہ گئی ہے۔

کیا کہوں میں زندگی کا ماجرا   لٹ چکا ہے آرزو کا قافلہ
آج بھی میرا قدم دھوکے میں ہے   خود مرا نقشِ قدم دھوکے میں ہے
ہر گلِ تر خار سے کچھ کم نہیں   یار بھی اغیار سے کچھ کم نہیں
زندگی میری سراپا یاس و غم   کیا قیامت خیز ہے ہر ایک دم
داغ پائے ہیں مرے دل نے ہزار   زخم کھائے ہیں جگر نے بے شمار
میرے سینے میں ہیں داغِ لالہ زار   میرے چہرے پر ہیں چشمِ اشکبار
میرا ہر احساس شمعِ غم کی لو   میرا جذبہ گرمیٔ ماتم کی لو

یہ آخری شعر پڑھ کر مجھے بے اختیار میر کا وہ شعر یاد آتا ہے۔

حالت تو یہ ہے مجھ کو غموں سے نہیں فراغ   دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ

جوش ملیح آبادی نے نالہ و شیون کو ایک الگ زاویہ نظر سے پیش کیا ہے۔

میرے رونے کا جس میں قصہ ہے   عمر کا بہترین حصہ ہے

اور ایک ایرانی شاعر کہتا ہے۔

دلِ بے غم گلِ بے آب و رنگ است   بہارِ گلشنِ آئینہ زنگ است

لیکن کاوش بدری غمِ دل سے فرار چاہتا ہے اور اس کے لئے بے اختیار ہو کر دست بہ دعا ہوتا ہے۔

ہے مری تشنہ لبی رقصِ شرار   رحم کر اے سایۂ ابرِ بہار
میری جانب اک نگاہِ غمگسار   دامنِ جاں ہے ازل سے تار تار
خاکساروں میں ہوں میں اک خاکسار   صرف اک رحمت کا ہوں امیدوار

اور پھر یہ کہہ کر صبر پہ قناعت کر لیتا ہے۔

ذکر میرے اک فسانے کا نہیں   کتنے افسانے ہیں اور اندوہگیں
درد کی تصویر ہے سارا سماج   فصلِ گل کے سر پہ ہے کانٹوں کا تاج

شاعر اگر صرف اپنی سرگزشتِ دل یا غمِ جاناں کی عکاسی میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی مٹی خوار کر لے، غمِ دوراں اور زمانے کے تغیرات کا احساس اسے نہ ہو تو اسے شاعر نہیں قنوطی کہنا چاہئے اور ایسا شاعر کس کام کا جو اپنی ڈفلی آپ خود بجاتے رہنے میں اپنی عمرِ دو روزہ بھی کھو دے۔ کاوش کی شاعری میں محض اس کے غمِ دل کی داستان نہیں ہوتی بلکہ وہ تو زمانے کے تغیرات پر نظر رکھتا ہے اور جیسے زمانے کی نبض پر اس کی انگلیاں بھی رہتی ہیں۔

جب وہ محسوس کرتا ہے کہ صورتِ حال پژمردہ ہو رہی ہے، افرا تفری کا عالم طاری ہو رہا ہے اور زمانے کا ساز شعبدہ گاہ ہے وہ ایک حساس شاعر کی طرح بے قرار ہو جاتا ہے، بے چین ہو جاتا ہے اور مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور دوسری عظیم المرتبت ہستیوں کے مہان آدرش کی تبلیغ کے لئے شاعری کی زبان کا سہارا لیتا ہے۔

حامیانِ امن پہ نازاں ہے امن — غاصبانِ امن پہ خنداں ہے امن
زیست کے ہر درد کا درماں ہے امن — ہر گھڑی اک عیشِ دوراں ہے امن
پیار کی تاریخ کا عنواں ہے امن — سایۂ دامانِ معشوقاں ہے امن
سارے بھارت کی نگاہوں کی چمک — گویا نہرو کے تصور کی دھنک
امن کا نقارہ ہر دل میں بجے — کوچۂ قاتل میں منزل میں بجے
روس و امریکہ میں ہو اس کا رواج — امن کے پرچم تلے ہو سب کا راج
امن کی منزل ہے بس انسانیت — امن کا حاصل ہے بس انسانیت
ہیلڈ روجن بم کا دم خم ٹوٹ جائے — تیغ دستِ ظلم ہی سے چھوٹ جائے

غرض کاوش بدری کی مثنوی "قبلہ نما" بہ قولِ نیاز حیدر وہ طویل نظم ہے جو:-

"صرف سرکارِ دو عالم کا کردار ہی منعکس نہیں کرتی بلکہ کرشن، کنھیا، مہاتما گوتم بدھ، مرشی والمیکی، رام، پنڈت نہرو، ہندوستان اور آج کے انسان کی زبردست کردار نگاری کا مظہر بھی ہے۔"

ہمارے عظیم ملک کی شان و شوکت، قومی یکجہتی اور حب الوطنی کا جذبہ جس شد و مد کے ساتھ کاوش کے دل میں جاگزیں ہے اس کا اظہار "مثنوی قبلہ نما" میں جگہ جگہ ملتا ہے:-

علم و عرفاں زہد و تقویٰ کا وطن — اولیاؤں کے حسنِ معنیٰ کا وطن
برگزیدہ ہستیوں کی جلوہ گاہ — اسوۂ احسن کی گویا شاہراہ
رام اور سیتا کا مکتب تھا یہی — کرشن، گوتم کو یہیں شکشا ملی
ذرہ ذرہ اتفاق و اتحاد — قطرہ قطرہ دافعِ بغض و عناد
سارے گلشن میں نہیں اس کا جواب — فصلِ گل نے کر لیا ہے انتخاب
کالکوں کو بادلوں کو بھاگ دے — سرد مکھڑوں کو شفق کی آگ دے
شور سے دہقاں رہٹ کے جھوم اٹھے — لہلہاتا کھیت لکشمی جنم دے
جگمگا دے ہند کی تقدیر کو — توڑ دے ہر حلقۂ زنجیر کو

مثنوی قبلہ نما پڑھنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جدید شاعری کے اس نقار خانے میں کاوش کی اپنی آواز اور

اس کا اسلوب واقعی آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ کاوش نے اس مثنوی کے لئے جس بحر کا انتخاب کیا ہے، وہ بہ قول پروفیسر حید علی خاں حمید بالکل مناسب بحر ہے۔ اس بحر میں محض موسیقیت کی تاثیر نہیں بلکہ کرب اور دل گرفتگی کے عناصر بھی شامل ہیں۔ مثنوی معنوی خوبیوں کے علاوہ صوری دل کشی سے بھی مزین ہے جو اس مخصوص، رواں بحر کی مرہون منت ہے۔

مثنوی قبلہ نما پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد اتنا عرض کر دوں کہ یہ مقالہ اس مثنوی کا تنقیدی جائزہ ہرگز نہیں اور نہ ہی دوسری مثنویوں سے اس کا موازنہ مقصود ہے۔ ع "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" — بلکہ اسے کاوش کی شاعری پر اپنے تاثراتِ قلبی یا اظہارِ خیال سے زیادہ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے بعض غیر جانبدارانہ رائے کے حامی نقادوں سے قطع نظر، کچھ تنقید کی رسم ادا کرنے والے نام نہاد نقاد محض داخلی، خارجی اور اسی قسم کے الفاظ کا سہارا لے کر مثنوئی قبلہ نما میں پیچ نکالنا چاہیں۔ مجھے تو ہر ذی علم و ذی استعداد شاعر جو اپنے وارداتِ قلبی کا اظہار مؤثر پیرایہ میں کرتا ہے اچھا لگتا ہے۔ لہٰذا کاوش بدری کی شاعری اور اس کی مثنوئی قبلہ نما کو پسند کرنا، اس کی دعا میں شامل ہونا فطری تقاضہ ہے۔ کاوش کی دعا ہے:—

مثنوی بن جائے اتنی طرح دار — شعر کی تاریخ میں ہو یادگار
فکرِ کاوش اور بھی ہو تابدار — رنگ لائے جذبۂ بے اختیار

محمد اکبر الدین صدیقی

مٹھے بچن سناؤں

فرخ۔ سنائی۔ روپتی۔ نوخیز

فرخ۔ نوخیز۔ سنائی اور روپتی کا کلام ان شعرا کے کلام کے ساتھ بیاض میں لکھا ہے جو بیجاپور کے آخری عادل شاہی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے متعلق تمام تذکرے اور تاریخیں ساکت ہیں۔ ان کا کلام بھی زیادہ مقدار میں نہ مل سکا جس سے ان کے حالات پر کچھ روشنی پڑتی۔ اس امر کا امکان ہے کہ ان کا تعلق بھی امین الدین اعلیٰ سے رہا ہو۔ یہ قیاس اس لئے ہے کہ شعر و شاعری کا زیادہ چرچا پیرانِ طریقت میں زیادہ تر انھیں کے پاس نظر آتا ہے ورنہ قادری سلسلے میں حضرت شاہ ابوالحسن قادریؒ اور حضرت پیر ہاشم قادریؒ کے مریدوں اور معتقدین میں علما کی تعداد تو بہت تھی، ان میں صاحبِ تصنیف بھی تھے، فارسی کے علاوہ دکھنی میں بھی شعر کہے ہیں اور تصوف کے سلسلے میں رسایل بھی تصنیف کئے ہیں، لیکن جیسا کہ قراقی کے حالات میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ قراقی نے اپنے پیشروؤں کو عالم و فاضل تو بتایا ہے لیکن یہ بھی کہہ دیا ہے کہ انھیں شعر و شاعری سے ذوق نہ تھا! اس خاندان میں وہ پہلا شخص ہے جو ادب میں زندہ رہنے کی خاطر شعر گوئی کو اپنی مصروفیت میں داخل کر لیتا ہے۔ ویسے حضرت شاہ ابوالحسن قادریؒ بھی شاعر تھے۔ ان کی کتاب "سکھ انجن" کے دو نسخے ادارے میں موجود ہیں اور کچھ کلام بھی مجھے ملا ہے جو آیندہ کسی موقع پر پیش کیا جائے گا۔

فرخ کی صرف دو غزلیں ملی ہیں اور سنائی۔ روپتی اور نوخیز کی ایک ایک۔ بظاہر قیاس یہ ہے کہ سنائی اور روپتی فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، اس لئے کہ تخلص اسی طرح رکھے گئے ہیں جیسے مقیمی۔ آتشی۔ نصرتی۔ عشقی وغیرہ۔ سنائی نے ممکن ہے کہ حکیم سنائی کی نسبت سے تخلص اختیار کر لیا ہو۔

فرخ

—(۱)—

اے شمع ترا عشق سزا وار پتنگ کوں　　　یوں دیکھ دکھا آگ[1] سپنیر کوں سکے گا

---

[1] دیکھتے بھالتے۔ جان بوجھ کر۔ آگ کو ہاتھ میں لینا۔

تجہ عشق کے داؤد[1] وداں دل کے لوہے[2] کوں
بے ہاتھ میں جیوں موم رگڑ کون سکے گا

کیا گال[3] لکھوں، بالی کہوں، لالی[4] ادھر کوں
کاگل کہاں ہے، مرا جیو پکڑ کون سکے گا

جو بن کے ترے مست ہتی[5] تھان پہ لاکر
چولی کے بجز بند پکڑ کون سکے گا

فرخ کا کھیا مان تو کس پہ ہو عاشق

....

— (۲) —

مجنوں کو دیوانہ کرے لیلیٰ کے لب کی مکتی[7]
فرہاد چین میں پیا شیریں محبت کی گھوٹ[8]

نکلے یکایک چاند سے یوں لگیا[9] اس کا جھلک
یا جھمیٹ اتیر سورج یا لک دن بجلی ٹوٹ

بھیری ہوا دل کوں مرے دیوانگی کا جوں کی آس
گوری رنگیلی گال پر[10] کا کھیالی[11] لٹ[12] جھٹ

تا گل پڑے گھڑی بیک[13] نا بھار[14] سکلوں تو قرار
اس چلپلی کو دیکھنے دل کوں لگی ہے چیلپٹی[16]

اے پنجۂ خورشید اگر ہے چاند تیرے ہات میں
فرخ کو دکھلا معجزہ ٹک کھول جھانکے[17] سو موٹ

سنائی

تج[18] لب کوں میں گل کیوں کہوں، باتاں[19] کہاں گل بولتا
بلکے[20] اسے بلبل کناں[21] جے بات بلبل بولتا

لٹ[22] کی رسن کی پینگ بند[23] بیٹھیا ترک غنچہ نین
پلکاں اشارت سو مگر کچھ رمز جھل جھل[24] بولتا

نت[25] مدح تیرے گال کی جی میں گل لالہ[26] اگے
سوسن ہر یک پینے چمن ڈالیاں پو ڈل ڈل[27] بولتا

تعریف تیرے حسن کی کرتے چمن کے نرگساں
تجہ زلف کا اوصاف سب پوچھے تو سنبل بولتا

---

۱ داؤد علیہ السلام جیسے لوگ ۲ لوہے کو ۳ لبوں کو ۴ کہاں لکھاں ہے ۵ ہاتھی ۶ ؟ ۷ گھلی (اچھوتی)
۸ چمک دمک ۹ صاف پڑھا نہ جا سکا ۱۰ کس قدر ۱۱ گھنگریالی ۱۲ زلف ۱۳ قرار، چین ۱۴ مجھ کو
۱۵ باہر ۱۶ اضطرار، بے قراری ۱۷ ؟
۱۸ تیرے لبوں کو ۱۹ پھول باتیں کہاں کرتا ہے ۲۰ بلکہ ۲۱ کہنا چاہیئے ۲۲ زلف کی رسی ۲۳ سرخ ڈورے والا پھیج ۲۴ جھوم جھوم کر ۲۵ ہمیشہ ۲۶ گل لالہ کے سامنے ۲۷ لہک لہک کر، جھوم جھوم کر، یا وجد میں آکر۔

تمہیں تو غدا اتھا طرح مجھے تز یک اپنے کھینچ لے ‏ ‏ رمعوں گا تہرے لگ پاؤں سوں گھنگرو ہو کھل کھل بولتا

دکھن رات کل کس سوں گی زر کا پھر مڑ پاؤں پڑیا ‏ ‏ کیتا چوچیا[۱] بینگی تو ادی مڑ مڑ یا سو چینگل بولتا

سچ کہہ سنائی تیرا یہ کیسا ہے بھوند[۹] بوجھنا

ہر کوئی دل کا بھید[۱۰] لا پوتی[۱۱] سوں کھل کھل بولتا

رویتی

محبت تجھ یوی کا منج دردنا[۱۲] کاٹتا جاتا ‏ ‏ سو نس پر پھوں کے خنجر سوں کلیجا[۱۳] کاٹتا جاتا

اپس[۱۴] میں آپ لعو رو رو نجھا کر دکھیتا[۱۵] ہوں تو ‏ ‏ امولک خال تج مکھ[۱۶] لہو کوں چاٹتا[۱۷] جاتا

مجا یب سحر کی توں دمعن[۱۸] تیرا کوئی بھید نیں پاتا ‏ ‏ ملایک کوں فلک پر کی[۱۹] تیرا تبہ[۲۰] لاٹتا[۲۱] جاتا

شراب عشق بھر عشاق اپس غم کی صراحی میں ‏ ‏ سدا الکھیاں کی پیالی میں شفق[۲۲] لعو آٹتا جاتا

ارے اے رویتی تج مکہ کی دین داری کو دیک ؟

سمو دا کفر کا پر دا یکا یک پھاٹتا جاتا

نو خیز

سجدہ کریں ہم کس طرح فی کل شئی حق حاضر ند ‏ ‏ حیرت کے بن میں گم اچھوں[۲۳] کیدھر کھو رتج ماہ کا

برو مدرسے[۲۴] بیٹھ کر کرتے ہدایت خلق کوں ‏ ‏ مرداں کے پر ایوان میں کہتے حرف آگاہ کا

عاشق جد معاں سنیں[۲۵] تس من[۲۶] اور کچھ نہ بولدا[۲۷] اسنہ

نو خیز بھی خم[۲۸] ہو کر سر دے[۲۹] حکم درگاہ کا

---

۱ گھونگرو کی آواز ۲ محبوب ۳ کس سے ۴ دل بہلاتی رہی ۵ شکن آلود ہو گیا ۶ کتنا ۷ جو شکن آلود ہو ۸ پنجہ (پنجہ کی وجہ سے شکن آلود ہوا ہو) ۹ سادہ لوحی سمجھنا ۱۰ کتاب (یہاں مراد دل کی کتاب سے ہے) ۱۱ علانیہ کھلم کھلا ۱۲ دل ۱۳ ابرو ۱۴ آپ ہی آپ ۱۵ بہ غور ۱۶ لاقیمت ۱۷ اشک خونیں ۱۸ محبوبہ ۱۹ کیوں ۲۰ عشق ۲۱ ؟ ۲۲ بجرتا جاتا ہے ۲۳ رہوں ۲۴ جدائی کے مکتب میں مراد ترک دنیا کر کے ۲۵ جہاں یا جونہی ۲۶ مل جائے ۲۷ تمہیں ۲۸ سر جھکا کر ۲۹ اطاعت قبول کرو

پروفیسر شیخ فرید

(جبل پور)

یہ کیا ستم چمنِ روزگار ہوتا ہے
کہ تیرے نام پہ خونِ بہار ہوتا ہے

وہ سمٹے کاکلِ مشکیں، وہ حُسنِ رخ چمکا
عجیب جلوۂ لیل و نہار ہوتا ہے

یہ تیرے حُسنِ تبسم کا جلوۂ رنگیں
یہی تو حاصلِ دورِ بہار ہوتا ہے

لطافتِ غمِ ہجراں کی بات کیا کہیئے
ترے خیال کا آنا بھی بار ہوتا ہے

کوئی فریدؔ کی اس بے کسی کو کیا جانے
وطن میں بھی وہ غریب الدیار ہوتا ہے

حبابؔ ہاشمی

رکھ نہ سکتا تھا سلامت کبھی ایماں کوئی
دیکھ لیتا جو جمالِ رخِ جاناں کوئی

گلبدن، غنچہ دہن، زلفِ رسا، جانِ بہار
ساتھ اپنے لئے پھرتا ہے گلستاں کوئی

یوں تری چشمِ محبت کی تری یاد آئی
جیسے دیکھا ہو کبھی خوابِ پریشاں کوئی

اشکِ خوں پلکوں پہ رہ رہ کے چمک اٹھتے ہیں
روز کرتا ہے شبِ غم میں چراغاں کوئی

آشنا برق کو جس طرح کہ تنکوں سے کیا
یونہی زنداں کو بنا لیگا گلستاں کوئی

شدتِ درد ہوئی کم تو خلش ہے افزوں
چھیڑتا رہتا ہے رہ رہ کے رگِ جاں کوئی

خونِ انساں کبھی اس طرح سے بہتا نہ حبابؔ
اتنے انسانوں میں ہوتا اگر انساں کوئی

طیب انصاری

اُردو امتحانات

ادارۂ ادبیاتِ اُردو

دسمبر کے آخری ہفتے میں ادارہ کے امتحانات اردو دانی۔ اردو زبان دانی۔ اردو عالم اور اردو فاضل منعقد ہوئے۔ مقامی مراکز کے علاوہ اترپردیش میں ایک مرکز جالنس بھی تھا جہاں طیب انصاری صاحب کو بہ حیثیت صدر نگران کار بھیجا گیا تھا، انھوں نے مرکز کے بارے میں جو رپورٹ دی ہے اس کا اقتباس درج ذیل ہے:—

۲۰ر دسمبر ۱۹۶۵ء کو ۷ بجے شام گھر سے بہ عزم سفر جالنس، اسٹیشن نامپلی پہنچا۔ جالنس ایسا مقام ہے جس سے حیدرآباد کے اسٹیشن پر صحیح معلومات جلد نہیں مل سکیں، بڑی مشکل سے جالنس کا پتہ چلا، اور ایک ٹکٹ میرے لئے بنا دیا گیا۔ ۷½ بجے حسب وعدہ مولوی عارف الدین حسن صاحب معتمد امتحانات ادارہ تشریف لائے۔ ان کی پرخلوص شخصیت سے میں بے حد متاثر ہوا۔ وہ تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے اور میری درخواست پر وہ گھر تشریف لے گئے۔ کوئی ۱۰ بجے ہماری ٹرین روانہ ہوئی۔ اس طرح میرے سفر کا آغاز ہوا۔

دو دن سفر میں گذرے، سفر انتہائی آرام دہ رہا۔ جھانسی سے بہت پہلے ڈاکٹر متین نیازی سے ملاقات ہوئی۔ متین صاحب سے ملاقات کئی اعتبار سے آسانیوں کا باعث بنی۔ سفر میں ان کا ساتھ رہا، اور چونکہ یہ خود بھی جالنس پر ڈاکٹر کی حیثیت سے چند سال رہ چکے تھے اس لئے جالنس کے ظاہری اور معنوی محل وقوع سے واقفیت حاصل کرنے میں بڑی مدد ملی۔ صاحب موصوف نے ڈاکٹر زیدی (جو ان دنوں جالنس پر برسر کار ہیں) کے نام چٹھی بھی لکھ دی اور مجھے ہدایت فرمائی کہ جالنس جب رات میں اتر دگے تو آبادی میں نہ جانا، کیونکہ چور اچکوں کا ہمیشہ ڈر رہتا ہے، اسٹیشن پر ہی رات بسر کرنا۔ جھانسی میں چونکہ ٹرین بدلنی پڑتی ہے اور وقت بھی کافی ملتا ہے، اس لئے جب ہم وہاں ۲۲ر تاریخ کو صبح ۱۱ بجے پہنچے تو ہم نے اپنا سامان دوسری ٹرین میں منتقل کر لیا اور جھانسی گھومنے کے لئے نکلے۔ شہر انتہائی گندہ ہے مکھیاں بھنبھناتی پھرتی ہیں۔ بلدیہ کو خیال ہے اور نہ عوام کو۔ قلعہ پر ہم اس وقت پہنچے جب کہ دیکھنے کے اوقات ختم ہو چکے تھے۔ البتہ قلعہ کے سامنے مہارانی جھانسی کا مجسمہ دیکھنے کو ملا۔ کالے گھوڑے پر سوار مہارانی جھانسی بہت بہادر اور جواں ہمت نظر آتی ہے!

کوئی ۹ بجے ہماری ٹرین لکھنؤ پہنچی، یہاں متین صاحب کا ساتھ چھوٹ گیا، اور سفر کا اصل احساس یہاں آکر پیدا ہوا جبکہ جائس یہاں سے صرف [illegible] میل تھا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ متین صاحب اور ان کے ساتھیوں نے سفر کی صعوبتوں کو محسوس ہی ہونے نہ دیا۔

۲۲ر اور ۲۳ر کی درمیانی شب میں ½۱ بجے جائس پہنچا۔ چھوٹا سا اسٹیشن ہے۔ سردی کا احساس تو آپ کو ناگپور ہی سے ہو جاتا ہے لیکن لکھنؤ میں یہ احساس شدت اختیار کر لیتا ہے خصوصاً ہم جیسے معتدل آب و ہوا میں زندگی بسر کرنے والوں کے لئے دوزخ کی آگ اور شمال ہند کی سردیاں دونوں یکساں طور پر تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ کپکپاتی رات، آدھی رات اور اجنبی رات، پھر میں تنہا، ہمت کر کے اسٹیشن پر اتر پڑا اور اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا، یہی تو منزل مقصود تھی جس کے لئے وطن سے نکلنا پڑا تھا۔ سب اسٹیشن ماسٹر نے مسافر نوازی کی۔ اپنے کمرے میں ایک لمبا ٹیبل ڈال کر کہا کہ آرام کروں۔ میں جوں توں سو گیا۔ جب اٹھا تو ۲۳ر کا آفتاب نمودار ہو چکا تھا۔ ½۸ بجے کے قریب دواخانے پر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر زیدی اس وقت ناشتہ پر تھے۔ بہت خوش اخلاقی سے پیش آئے اور ناشتہ پر ساتھ ہی بٹھا لیا۔ ناشتہ کے بعد مہر صاحب کے یہاں اطلاع کرا دی گئی۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد نذیر حیدر صاحب (جو مہر جائسی صاحب کے ہم زلف ہوتے ہیں) تشریف لائے۔ میں ان کے ساتھ ہو لیا اور مہر صاحب سے ملاقات کی۔ راستہ ہی میں نذیر حیدر صاحب نے ملک محمد مصنف "پدماوت" کے مکان کی زیارت کرائی۔ مکان کیا ہے کھنڈر ہے۔ ادھر پچھلے چند سالوں میں یہاں ایک ستون بطور یادگار تعمیر کروایا گیا ہے جس پر ملک محمد جائسی کا نام، ہندی شعرا اور مصنف "پدماوت" نمایاں طور پر لکھا ہوا ہے۔ اطراف میں کوڑا کرکٹ جمع ہے۔ بڑی عبرت ہوئی، اور یہاں کے ادبی ذوق رکھنے والے حضرات اور حکومت ہند (جو ہندی زبان کی ترویج کے لئے بے حد کوشاں ہے) کی لاپروائی پر بڑا تعجب ہوا، اور تاسف بھی!۔ ہمارے یہاں دیکھئے کہ ڈاکٹر زور اور ان کے ساتھی ہر ایک نئے شاعر اور ادیب کی قبر ڈھونڈ نکالتے رہے اور اس شاعر کی اس آخری نشانی کو بہر حال محفوظ رکھنے کی کوشش کی تاکہ ان کی قبر کو دیکھ کر، ان کے کارنامے یاد آ جائیں اور یہاں ہندی کے اس مایۂ ناز شاعر سے حکومت اور عوام کی یہ لاپروائی انتہائی افسوسناک ہے۔ راہ میں دیگر بہت ساری مشہور شخصیتوں کے مکانوں کو دیکھنے کا موقع ملا، مثلاً سید احسن، کلب حسین، مآتی جائسی، قدسی جائسی، صدق جائسی اور ابن حسن وغیرہ۔ ان میں سے اکثروں کا تعلق حیدرآباد سے بھی رہا ہے۔

چھوٹی چھوٹی اینٹوں سے تعمیر شدہ یہ پرانی عمارتیں اب خستہ حالت میں نظر آئیں گی۔ یہ تنگ اور تاریک گلیاں گندہ بھی ہیں۔ مختصر الفاظ میں جائس شاعروں کی غیر شاعرانہ بستی ہے۔

مہر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ آپ معمر آدمی ہیں۔ جب بھی میں وہاں پہنچا انھیں کچھ نہ کچھ لکھتے ہوئے پایا۔ انھوں نے بتایا کہ کئی دیوان اردو میں مسودے کی صورت میں پڑے ہیں۔ وہ انتہائی نحیف و ناتواں ہیں لیکن اردو کی خدمت کا جذبہ انھیں نئی قوت دیتا ہے۔ نامساعد حالات میں ان کی خدمات لائق تعریف اور قابل تقلید ہیں۔ ان سے

سب بس جینا باد دکن

ابتدائی احمد میں بات چیت رہی اور واپس ہوا۔

۲۴ر دسمبر کو نماز جمعہ جامع مسجد میں ادا کی۔ مسجد قصبہ کا سماں کرتے ہوئے کافی کشادہ ہے، لوگ بھی کثرت سے نماز کو آتے ہیں، البتہ مسجد کے ساتھ ہی عورتوں کے لئے ایک حصہ تعمیر کیا گیا ہے جس میں عورتیں جماعت سے نماز پڑھتی ہیں۔

۲۵ر دسمبر۔ آج سے امتحان کا آغاز ہوا، اور آج ہی پہلی رمضان بھی تھی۔ عام طور پر یہاں مسلمان روزے اور نماز کے پابند ہیں اور اکثر ستر کار امتحان بھی روزے سے تھے۔ مہر صاحب اپنی ناسازیٔ مزاج کے باوجود امتحان گاہ پر وقت سے پہلے موجود تھے۔ اردو عالم کا ایک اور اردو فاضل کا ایک اس طرح دو امیدوار غیر حاضر رہے۔ امتحان میں خاتون امیدواروں کی کافی تعداد ہے اور اکثر اس میں مشہور شاعرہ بھی ہیں۔ مثلاً خود مہر صاحب کی بیگم صاحبہ اختر جائسی (جو انگلی زخمی ہونے کی وجہ سے امتحان میں شریک نہ ہو سکیں) اور انوری بیگم صدیقی حیا جائسی معتمد بزم خواتین جائس بھی شریکِ امتحان رہیں۔ پردہ میں نگرانی کے لئے میں نے اختر جائسی صاحبہ کو ذمہ دار قرار دیا۔

۲۶ر دسمبر کو میں ڈاکٹر زیدی کے یہاں سے نذیر حیدر صاحب کے یہاں منتقل ہو گیا۔ ایک تو نذیر حیدر صاحب اور مہر صاحب کا مسلسل اصرار بھی تھا، اور دوسری بات یہ کہ ڈاکٹر صاحب رائے بریلی جا رہے تھے۔ ڈاکٹر زیدی کے حسن سلوک اور مہمان نوازی کے لئے میں بے حد شکر گزار ہوں۔ ان کا تعاون عمل بھی میرے ساتھ رہا۔

۲۷ر دسمبر امتحان کا آخری دن تھا۔ مہر صاحب اور امیدواران امتحان کے اصرار پر وداعی جلسہ ہوا جس میں مہر صاحب نے تقریر کرتے ہوئے ادارہ کے امتحانات اور ادارہ کے نمائندے کا خیر مقدم کیا اور وداعی شکریہ بھی ادا کیا۔ بزم خواتین کی طرف سے حیا جائسی نے اور بزم سخن کی جانب سے متین اثرت نے شکریہ ادا کیا۔ میں نے اپنی گفتگو میں وہاں امتحانی مرکز قائم ہونے پر مبارکباد پیش کی۔ اردو زبان کی توسیع میں ادارہ کے کارناموں کو واضح کیا۔ علمی اور تعلیمی و تعمیری خدمات سے واقف کرایا، اور زور اس بات پر دیا کہ آج اردو زبان کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ آخر میں معتمد بزم خواتین، بزم سخن اور خود مہر صاحب اور میزبانوں کا بھی شکریہ ادا کیا۔

۲۸ر ۲۹ر ۳۰ر ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۵ء۔

۲۸ر کی صبح ذریعہ بس براہ رائے بریلی لکھنؤ کے لئے روانہ ہو گیا۔ سڑکیں ناقص اور بسیں انتہائی فرسودہ اور غیر آرام دہ ہوتی ہیں۔ کنڈکٹر بس کو روکنے اور چلانے کے لئے سیٹیاں بجاتا ہے اور ہر ہر اسٹیج پر چائے کے لئے مع ڈرائیور بس سے اتر پڑتا ہے۔ کوئی ½۱۲ بجے دوپہر میں لکھنؤ پہنچا، اور یہاں مولانا قائم مہدی صاحب مجتہد کے یہاں قیام کیا۔ آدمی بہت با اخلاق ہیں، میرے جاتے ہی ملنے کے لئے خود تشریف لائے اور بات چیت کی۔ کپڑے بدلنے کے بعد یہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کی غرض سے دفتر "قومی آواز" پر گیا۔ لکھنؤ میں یہی واحد مقام ہے جہاں سے آپ کو ادیبوں اور شاعروں کے پتے مل سکتے ہیں اور ان سے ملاقات کی کوئی صورت نکل آ سکتی ہے۔ حیات اللہ انصاری صاحب

نیاز حاصل ہوا۔ ابتدا میں وہ ادارہ کے یہاں مرکز قائم کرنے پر معترض ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ اردو جامعہ اور ادارہ میں تریفانہ چپقلشوں کے آغاز ہونے کا امکان پیدا ہوسکتا ہے۔ اس خیال کی میں نے تردید کی اور کہا کہ اردو دنیا ان دنوں ایسے نازک حالات سے گزر رہی ہے کہ ہم آپسی چپقلش کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وقت ہے کام کرنے کا، اور ہر طرف سے ہر ادارہ کی طرف سے جس قدر بھی کام ہوسکتا ہے ہونا چاہئے۔ اردو زبان کی توسیع و اشاعت ہمارا بنیادی مقصد ہے اور جس قدر ادارے اس سلسلے میں اپنے فرائض انجام دے سکتے ہیں وہ ایسا کریں۔ آپس میں ٹکرانے کے بجائے مشترکہ مفادات میں تعاون عمل ہونا چاہئے تب کہیں چل کر اردو زبان پنپ سکتی ہے۔ پھر میں نے انھیں بتایا کہ کس طرح حیدرآباد میں مختلف چھوٹے بڑے ادارے اپنے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، اور خود جامعہ اردو کے امتحانات شہر حیدرآباد میں منعقد ہوتے ہیں ہم نے کبھی ان خطوط پر نہیں سوچا بلکہ ممکنہ تعاون سے کام لیا ہے۔

میری ان باتوں سے حیات صاحب بہت متاثر ہوئے اور اپنے اخبار میں رپورٹ بھی شائع کر دی، اور ساتھ ہی شاکر صاحب اور عثمان صاحب سے ملاقات کرائی اور ان سے کہا کہ میرے لئے کوئی ادبی اجتماع یہاں رکھیں۔

۲۹؍ کو "قومی آواز" میں رپورٹ اور میرے یہاں پہنچنے اور قیام کی خبر شائع ہوئی۔ دن کا بڑا حصہ تاریخی عمارتوں اور امام باڑوں کے دیکھنے میں گزرا۔ صبح اور شام دو مرتبہ مولوی ولی الحق انصاری صاحب سے ملاقات ہوئی۔ شام میں کوئی ۸ ½ ، ۹ بجے میں نے دائم مہدی (فرزند مولانا قائم مہدی) اور شاکر صاحب کے ساتھ امین سلونوی صاحب کے دولت کدہ پر حاضری دی، یہیں پروفیسر شجاعت علی سندیلوی اور نور اللہ صاحب سے بھی ملاقات رہی۔ شجاعت صاحب سلجھے ہوئے خیالات کے آدمی ہیں، اردو کی زبون حالی کا غم انھیں بھی ہے اور کچھ کام کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ہمارے امتحانات کے قواعد کی کاپی ان کے لئے روانہ کریں۔ وہ میری باتوں سے اس قدر متاثر رہے کہ انھوں نے مزید ایک دن یہاں قیام کرنے پر مجبور کیا تاکہ ۳۱؍ کو انجمن ترقی اردو لکھنؤ کی طرف سے ایک اجتماع ہو جائے۔ وہ ریاستی انجمن کے معتمد عمومی بھی ہیں۔

دوسرا دن تاریخی مقامات کی سیر اور مختلف ادیبوں سے ملنے میں گزرا۔ مولوی سید مسعود حسن رضوی ادیب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ انھیں اگر وارفتۂ انیس کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ انیس اکیڈیمی کے خازن بھی ہیں۔ انیس کے مکان کو انھوں نے خرید لیا ہے اور اس میں تعمیر و ترمیم کا کام بھی جاری ہے۔ بہر حال وہ انیس کے شیدائی ہیں۔ لکھنؤ میں میر کے بعد انیس کی قدر و عزت ہے۔ میر تو وہ خوش قسمت شاعر ہے جس کے نام پر یہاں ایک روڈ، ایک چوک، جہاں پر دوات قلم رکھی گئی ہے اور شعر بھی کندہ ہے اور ایک سٹی اسٹیشن کا نام بھی "میر اسٹیشن" رکھنے کی تجویز زیر غور ہے۔

لکھنؤ میں ادیبوں اور شاعروں سے ملنے کے لئے کوئی مقام نہیں۔ مجھے یہاں آکر حیدرآباد کا "اورینٹ ہوٹل" اور پرانے شہر کا "مدینہ ہوٹل" بار بار یاد آتے رہے۔ جو سہولتیں ہمیں شہر حیدرآباد میں حاصل ہیں وہ لکھنؤ میں کہاں۔

حیدرآباد دکن کئی اعتبارات سے لکھنؤ سے غیر معمولی طور پر ترقی یافتہ ہے۔ علم و زبان اور لب و لہجہ کے معاملہ میں بھی۔ اب یہاں سرشار و شرر کی زبان کہاں؟ ناسخ و آتش مصحفی اور انشا کے معرکے سرد ہو گئے۔ "امراؤ" پر تو سرکار نے پابندی عائد کر دی! اس لیے اس کا کوٹھا جو زبان کی درس گاہ سمجھا جاتا تھا اس پر تالا پڑ چکا ہے۔ لب و لہجہ پر بھی ہندی اور پوربی بولیوں کا اثر عام ہو چلا ہے۔ اردو رسم الخط لکھنؤ سے منقا ہو چکا ہے۔ عام بول چال میں ہندی کے الفاظ کی کثرت نے اردو زبان کو مار ڈالا! اس لیے میں نے اپنے اس نقطۂ نظر کو شدت کے ساتھ پیش کیا کہ شمالی ہند میں اردو میں "فارسیت" اور "عربیت" کو رواج دیا جائے۔ آپ اردو زبان کو سننے کے لیے ترس جائیے۔ شاید ہی آپ سُن پائیں گے۔ لکھنؤ میں اردو زبان کی اس زبون حالی پر دل تو چاہتا ہے کہ خون کے آنسو روئیے۔ یہاں کے اہلِ ادب انجمنیں اپنی فوقیت کا دعویٰ ہے، ذہنی پستی کے شکار ہیں۔ ایسا نہیں ہے، اس کیفیت کا انھیں اندازہ نہیں ہے وہ جانتے ہیں لیکن کچھ کر نہیں پاتے اور سارا الزام آسانی سے حکومت کے سر ڈال دیتے ہیں، حالانکہ انھوں نے کبھی بھی منظم طریقہ پر حکومت کے پاس نمایندگی نہیں کی۔ جمہوریت کے دور میں نمایندگی اور موثر نمایندگی کے بغیر کامیابی کی توقع بے جا ہے۔ میں نے وہاں کی بھی ملاقاتوں میں حیدرآباد میں ہونے والے کاموں سے واقف کرایا، وہ لوگ ہمارے کاموں سے بے حد متاثر ہیں اور ثنا خواں بھی۔

۳۱ر دسمبر سال کا آخری دن ہے۔ "قومی آواز" کی ڈائری "آج لکھنؤ میں" میں اطلاع شائع ہوئی کہ میری آمد کے موقع پر ریاستی انجمن ترقی اردو ہند لکھنؤ میں ۲ بجے دن ادبی نشست ہوگی۔ صبح میں دائم صاحب کے ساتھ یونیورسٹی دیکھنے چلا گیا۔ دوپہر میں شاکر صاحب سے ملاقات ہوئی اور دوپہر کے کھانے کے بعد تنہا دفتر ریاستی انجمن پہنچا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جو بیرسٹر حیدر صاحب نے از راہ کرم انجمن کو دیا ہے۔ شجاعت صاحب کے والد بزرگوار آج کل بیمار ہیں، تنگیٔ وقت کی وجہ سے میں ان کی مزاج پرسی کے لئے نہ جا سکا! اس کا ملال رہا۔ وہ باوجود اس کے جلسہ میں تشریف لائے اور میرے وہاں پہنچنے سے قبل ہی واپس بھی ہو گئے۔

جلسہ میں نوجوانوں کی تعداد زیادہ رہی۔ ان میں سے اکثر نوجوان کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ "طاقی" کے مدیرین بھی تھے اور انھوں نے دو پرچے تحفۃً دیئے۔ انجمن کی طرف سے امین صاحب نے "شمشیر و سناں" نئی کتاب تحفتاً عنایت فرمائی۔ اس کے لئے میں ان حضرات کا شکر گذار ہوں۔ میری مختصر سی گفتگو کے بعد نوجوانوں میں کام کا جذبہ پیدا ہوا، اور وعدہ کیا کہ وہ لکھنؤ میں زبان کے کام کو آگے بڑھائیں گے۔ اس موقع پر احمد جمال پاشا صاحب سے ملاقات رہی۔ بہت ہی مخلص اور ملنسار ہیں، — حیدرآباد کی مختلف شخصیتوں کا ذکر بھی رہا۔

رات میں ۸½ بجے کی ٹرین سے میں آگرہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ اسٹیشن پر دائم مہدی صاحب چھوڑنے کے لئے تشریف لائے تھے۔

یکم، ۲ر ۳ر جنوری۔ نئے سال کی نئی صبح شہرِ آرزو آگرہ میں جلوہ گر ہوئی۔ حُسن و محبت کی لافانی یادگار "تاج" یہاں قلب پر عجیب تاثر چھوڑتی ہے۔ میں نے آگرہ کے آثارِ قدیمہ دیکھے اور رات ۱۰ بجے ان تمام یادوں کو سینہ میں چھپائے حیدرآباد کے لئے چل پڑا۔

نقد و نظر

ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں :- مصنفہ ڈاکٹر سید عابد حسین - ناشر مکتبۂ جامعہ نئی دہلی - ڈیمائی سائز صفحات (۳۶۶) مجلد - مع گرد پوش قیمت آٹھ روپے۔

فاضل مصنف کا نام اردو ادب کے پرستاروں کے لئے نیا نہیں۔ وہ عرصہ دراز سے اس نام سے آشنا ہیں۔ صاحب موصوف نے اس کتاب میں یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستانی مسلمان کیا تھے، کیا ہیں اور کیا ہو سکتے ہیں۔ اس کے لئے کتاب کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ "کل کی پرچھائیاں" ہے جو سات ابواب پر اس طرح منقسم ہے :-

(۱) نئے زمانے کا چیلنج اور اس کے مختلف جواب (۲) سیکولر فرقہ پروری (۳) مذہبی قوم پروری (۴) سیکولر قوم پروری (۵) قوم پروری سے فرقہ پروری کی طرف (۶) مذہبی قوم پروری سے سیکولر قوم پروری کی طرف (۷) تصادم اور تقسیم۔

دوسرا حصہ "آج کا ہندوستان" کے زیر عنوان دو باب ہیں حالات و مشکلات اور خیالات و رجحانات

تیسرا حصہ :- "کل کیا ؟ روشنی یا اندھیرا" کے تحت دس باب ہیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

(۱) بنیادی فیصلہ (۲) سیکولرزم اور علمی انداز نظر (۳) جمہوریت اور اشتراکیت (۴) قومیت اور وطنیت (۵) مذہبی زندگی اور مذہبی تعلیم (۶) تہذیب و معاشرت، زبان و ادب (۷) معاشی زندگی اور دنیوی تعلیم (۸) برادران وطن سے تعلقات (۹) برادرانِ اسلام سے تعلقات (۱۰) ایک آرزو۔ ایک خواب۔ مسلم تصورات کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی آزادی کی بھی تاریخ ہے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے آغاز اور اس کے کارناموں کا تفصیلی بیان ہے۔ قوم کے قائدین کی تقریروں اور خیالات کا اظہار ہے۔ ان میں ایسے قائدین بھی شامل ہیں جو رجعت پسند تھے اور فرقہ پرستی کو اپنائے ہوئے تھے، ایسے بھی ہیں جن کو ترقی پسند یا اعتدال پسند سمجھا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے بارے میں ان قائدین نے جو کوششیں کیں اس کی وضاحت ہر جگہ ملتی ہے۔ آخری حصے میں ایسے مقامات بھی ملیں گے جن کے بارے میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔ مذہبی اور دینی تعلیم، دنیوی تعلیم، ضبط تولید اور صنعتی نظام وغیرہ پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ طفیل احمد نے "مسلمانوں کا روشن مستقبل" لکھ کر صرف مسلمانوں کے تعلق سے اپنے خیالات پیش کئے تھے، ڈاکٹر عابد حسین نے "مسلمان آئینۂ ایام میں" لکھ کر مسلم تاریخ کی

تحلیل کی ہے۔ ان خیالات میں جذباتی رنگ نہیں، بلکہ انتہائی غور و فکر کے بعد ان کو پیش کیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ مسلم طبقہ ہی نہیں بلکہ ہر طبقہ اس کا مطالعہ کر کے صحیح قدم اٹھانے کے لئے اپنی راہ متعین کرے گا۔

بانو سالنامہ سنہ ۶۶ء:۔ شمع میگزین دہلی بسالانہ چندہ آٹھ روپے۔ فی پرچہ ۷۵ پ سالنامہ ۵۰ء۲ صفحات (۲۰۰)

"بانو" خواتین کا نہایت ممتاز اور معیاری رسالہ ہے جو شمع جیسے منظم ادارے سے شایع ہوتا ہے پیش نظر سالنامہ کی فہرست پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کو کیسے کیسے ادیبوں اور شعرا کا تعاون حاصل ہے۔ کرشن چندر۔ اپندر ناتھ اشک۔ بلونت سنگھ۔ امرتا پریتم۔ کنھیالال کپور۔ دیوندر ستیارتھی۔ واجدہ تبسم۔ رام لال۔ سلمیٰ۔ نکر تونسوی۔ صدیقہ بیگم۔ صالحہ عابد حسین۔ عادل رشید۔ جیلانی بانو وغیرہ کے ساتھ ساتھ شعرا میں راجہ مہدی علی خاں، شکیل۔ ساحر۔ سلام مچھلی شہری۔ حسرت۔ شاد۔ شفیع الدین نیر۔ شمس کنول، اور مخمور سعیدی شامل ہیں۔۔ یہ فہرست ہی اس امر کی ضمانت ہے کہ سالنامہ اپنی پوری خوبیوں کو لئے ہوئے ہے۔ اس کے ساتھ دلچسپ کارٹونوں نے اس کی اہمیت میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ کارکنانِ ادارہ اس شاندار سالنامہ کی اشاعت پر قابلِ مبارک باد ہیں۔

ماہنامہ "ثانی" عید نمبر:۔ یہ ایک ننھا منا سا رسالہ بچوں کے مطالعے کے لئے لکھنو سے ہر ماہ پابندی سے شایع ہوتا ہے۔ پیشِ نظر نمبر عید نمبر ہے جس میں مزیدار کہانیاں۔ لطیفے اور نظمیں ہیں جو بچوں کے لئے نہایت موزوں اور دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ نظموں میں ناصحانہ بھی ہیں اور ظریفانہ بھی۔ اس میں کم از کم آٹھ صفحے ایسے ہونا چاہئے جو قدرے جلی قلم سے لکھے ہوں۔ پیشِ نظر شمارے کی تحریر چھٹی، ساتویں جماعت کے بچے تو پڑھ لے سکتے ہیں لیکن تیسری، چوتھی جماعت کے بچے اس کے پڑھنے میں دشواری محسوس کریں گے۔ اس کا سالانہ چندہ نہایت قلیل صرف دو روپے ہے اور پتہ ہے ۔ ۱۔ گوتم بدھ مارگ لکھنو۔۱۔

سالنامہ عکس (یوراج کالج اردو انجمن) ایڈیٹر۔ ایم۔ این سعید دواجد ماہر۔ ادارۂ اردو یوراج کالج میسور۔

میسور آج بھی اردو کا ایک مرکز ہے اور کرناٹک کے علاقہ میں اردو کی بقا کے لئے جد و جہد جاری ہے۔ کئی کالج ہیں جہاں اردو کی تعلیم ہوتی ہے اور یونیورسٹی میں بھی طلبا اردو پڑھتے ہیں پیش نظر سالنامہ کالج کے اساتذہ اور طلبا کی مشترک کوششوں کا نتیجہ ہے! محمد شریف صاحب نے اردو رسائل کے ارتقا پر نظر ڈالی ہے اور سعید صاحب نے کریم الدین صاحب سے ایک انٹرویو میں کنڑی زبان پر مختلف سوالات کر کے ان کے جوابات پیش کئے جو کنڑی ادب پر کافی روشنی ڈالتے ہیں جناب رفعت صاحب نے حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کا تعارف کرایا ہے اور محمد ابراہیم صاحب نے میسور کی ایک اہم شخصیت شاہ ابوالحسن ادیب کا۔ فہمیدہ ممتاز نے اوائل تیرھویں صدی کے ایک شاعر عارف شاہ قادری اور ان کی مثنوی نگاری پر اظہار خیال کیا ہے ان کے علاوہ رسالے میں افسانے بھی ہیں اور دیگر مضامین بھی جو قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ہم مرتبین کو ان کی اس کامیاب کوشش پر مبارکباد دیتے ہیں۔ (ا۔ ص)

در منقبت حضرت علی علیہ السلام

۶۰۔ علیؑ دلی شاہِ دلدل سوار — کیا کفر کو قتل لے ذوالفقار

۶۱۔ ہوا تجھ تے بنیاد دیں کا قوی — زبوں تجھ تے ہوئی کفر کی پے رہی

۶۲۔ لیا خیبر کا جو تو شمشیر ہات — کیا جگ تے معدوم کافر کی ذات

۶۳۔ خدا تے ہوا کشف جوں تجھ پو راز — نبیوں فیض کا در ہوا کس پو باز

۶۴۔ نبیؐ نے تجھے جان کر راز دار — کریں کام ہر نیک تج سوں بچار

۶۵۔ نبیؐ نت تجھ اُپرال خوش حال ہے — خدا کے عدو کا تو قتال ہے

اُپرال = بضم ہمزہ و سکون بائے فارسی ۔ حامی ، مددگار
لیکن یہاں اور آگے کئی جگہ ۔ اوپر ۔ بالا ، فوق کے
معنی میں استعمال کیا گیا ہے ۔ ملاحظہ ہو بیت
نشان (۹۱) اور (۲۵۳) ۔

۶۶۔ ولایت کا تاج تجھ سر پو دھر — دیا بھیج حق جگ میں تجھ راج کر

۶۷۔ دلیاں سارے سردار تو بادشاہ — خدا نے عطا تجھ پہ یو عز و جاہ

۶۸۔ خدا نے عطا تجھ اپر یو عطا — جو آیا تری شان میں لا فتیٰ

۶۹۔ تجھے علم باطن کے ظاہر ہے سب — تو علم لدنی تے ماہر ہے سب

۷۰۔ وصی نبیؐ جانشینِ رسولؐ — کیا حق تجھے ہور زوج بتولؑ

۷۱۔ تو گھر علم کا در ہے اعجاز [illegible] — [illegible]

۷۲۔ محبت ترا مج کو ایمان ہے — ترا یاد و غم مج کو جیو دان ہے

جیو دان = جی دان ۔ یہاں جان بخشی مراد ہے ، یا جیسے =
جس طرح دان = عطیہ ۔

۷۳۔ مجھے حشر کو جام دے یا علیؑ — محب ہوں ترا میں خفی او جلی

خفی اور جلی = باطن اور ظاہر

۷۴۔ کیا منقبت صدق و اخلاص دھر — محباں میں تیرے مجھے جمع کر

در مدح حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نوازؒ

۷۵۔ محمد حسینیؔ شہِ جگ نواز — کیا مفلساں کو اِیک سرفراز

۷۶۔ کتیاں کو دیا پیار سوں تخت و بخت — کتیاں کے لیا چھین کر بخت و تخت — کتیاں = بکسر کاف = کتنوں ہی کو، بہت سوں کو۔

۷۷۔ خدا کی خدائی کے جو کچھ ہے کام — سو آغاز و انجام سوں تج سے قام — قام = قیام۔

۷۸۔ سدا فعلِ احسن ترا کام ہے — خدا کے نبیؐ کا تو ہمنام ہے

۷۹۔ بزرگی دو جگ کی ترے آل کوں — ازل تے ابد لگ دیا ہے جگوں

۸۰۔ خلف جو ترا شاہ اکبر اہے — سو وہ ہادیٔ دین و رہبر اہے

۸۱۔ جو ملکِ عدم تے دو اہلِ صفا — منگیا نقل کرنیں بہ ملکِ بقا — منگیا = مانگا = چاہا۔ کرنیں = کرنے۔

۸۲۔ سو اس حال میں شاہ درحال دیں — کیا جانشیں شاہ راجو کے تئیں

۸۳۔ کہ وہ جانشیں لائقِ صدر تھا — جھمکتا مکھ اس کا سو جوں بدر تھا — جَھمکتا = بفتحین = چمکتا، دمکتا۔

۸۴۔ کیا خُلق کے دام میں جگ کو قید — ہوئے عقل کے طائراں اس کے صید

۸۵۔ کہ وہ خُلق کا عین سمدر تھا — سخاوت کے موجاں سو بھرپور تھا

۸۶۔ منوّر اچھو قبر اُس کا سدا — سرافراز واں ہوئیں شاہ و گدا

۸۷۔ جو اس کا ہے روضہ بہشتِ بریں — مرگ ہے دہاں روزروزی تئیں — نئیں = نئیں کی تخفیف بمعنی منتین۔

۸۸۔ وہ روضے سوں پایا یہیں یو ادھار — خزاں جا کو جوں باغ پایا بہار — ادھار = بالفتح = سہارا۔

۸۹۔ کہاں خستہ کا مدح مجتبیٰ سرے — صفت شاہ زادوں کی بولوں برے — سرنا = بفتح سین = پورا کرنا۔ مدح میں کا حلقہ بالاشباع۔ برے = بفتح بائے موحدہ = تکیہ کلام ہے۔ یہ آج کل بصورت بارے رائج ہے۔

در مدح حضرت شاہ بڑے صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

۹۰۔ بڑے صاحب سوں شاہ کے جانشیں — خلافت کے وارث شہ داد و دیں

۹۱. دسے شہ کی جاگے گیا پال یوں — گھڑی جاگے پہ پیند ہے جوں

۹۲. سو اپنی غلاف منے دہ گنبھیر — پس افتادگاں کے ہوئے دستگیر

گنبھیر = بفتح کاف فارسی و نونِ غنہ تیسرا حرف بائے بسم اللہ مع بائے ہندی مکسور۔ پانچواں حرف یائے معروف ساکن = گہرا۔ مجازاً سنجیدہ مضبوط۔ قوی۔

۹۳. کیئے یوں کرم سب پو وہ کرندعاں — نہ کوئی کر سکے تس کرم کا بیاں

ندعاں = بس۔ بکسر نون و فتح دال مہملہ مع ہائے ہندی آخر میں نون با علان۔ مگر یہاں غنہ۔ خشش۔ بمعنی = مسکن۔ مقام۔ مراد جانشین ہوکر۔

۹۴. گئی مفلسی سب کی یکبارگی تعاس — دسے مینج مفلس ہوا اس شہ کے پاس

مینج = میں ہی۔

۹۵. عجب کیا جو دہ کیمیا سی نظر — کہے بیجز اس تن کے تانبے کو زر

۹۶. نظر شاہ کی بخت میری یہاں — کروں یوچ کر مجھ سکت ہے کہاں

یوچ = یوں ہی = اسی طرح۔

۹۷. تمنا ہور شہ کی دعا کو مدام — کیا ورد دیں آپنا صبح و شام

۹۸. جو ہیں بھائی شہ کے حمیدہ خصال — اچھو دولت ان کا ہمیشہ بحال

۹۹. شجاعت منے شہ سواراں ہے وہ — سخاوت منے نامداراں ہے وہ

۱۰۰. انو کی جو مادر ہے علیا جناب — ہے عصمت میں مشہور جوں آفتاب

۱۰۱. خدا کا ہے رحمت انو کے اُپر — ہو اختم عصمت انو کے اُپر

۱۰۲. انو کا ہے دل صاف جوں آرسا — عبادت میں ہے مریم پارسا

آرسا = آئینہ۔

۱۰۳. ہماری یو ما صاحب عدل و داد — تجمل میں بلقیس تے ہے زیاد

۱۰۴. دھریں حضرتِ عائشہؓ کا خصال — کہ ان کو تو بیبیاں میں ہے مثال

بیبیاں = دوسری بات۔

۱۰۵. انو کا اگر فضل ہے کوئی کئے — تو فرزند دل بند انو کیچ ہے

کئے = کہے = اگر تم کہہ سکو۔

۱۰۶. سو وہ کون جو بنتِ یوسف لقا — انو سوں ہے عصمت جہاں میں بقا

۱۰۷. جو صاحب ہیں صاحب نکو خصال — جگر گوشہ بنتِ شاہ جمال

۱۰۸. انو حضرتِ فاطمہؓ کا کرم — دھریں سب یک دو نعاتیں بیش و کم

۱۰۹. کتیک مفلساں ہو کتے یک گدا — ہوئے ہیں سرافراز انو تے سدا

کتیک = کتنے ہی = بہت سے۔

۱۱۰. دلے ٹیک عرض تا ہوں میں التماس — جو اپنے کرم ساتھ بر لائے آس

۱۱۱. مجھے فرزند ارتک بند سوں چھڑاؤ — یو احسان کا اجر دو جگ میں پاؤ

۱۱۲۔ الٰہی تمھارے جگر گوشگاں ‏ جہاں میں اچھو تا اچھے لگ جہاں
۱۱۳۔ الٰہی تمھارا دَمیں ہور دل ‏ اچھو جلنے سوں پھول کے ناد کھل
۱۱۴۔ الٰہی تمھارا دیوا تو فلک ‏ اچھو جگ میں روشن ہے مہ جب تلک

ناد = مشابہ۔
دیوا = بکسر دال مہلہ و یائے معروف = دیپ = ہندی
اور اردو میں واؤ معروف یائے فارسی سے بدلا گیا ہے =
چراغ۔ اس کی دوسری صورت دِیا بحذف واؤ بھی ہے۔

۱۱۵۔ الٰہی جو درحق ہے علیا جناب ‏ دعا میں منگیا ہوں سو کر مستجاب
۱۱۶۔ خوشی پر اچھو اس کداں ہب تماما ‏ بحقِ محمد علیہ السلام

در مدح بادشاہ جم جاہ ابوالحسن قطب شاہ گفتہ شد

۱۱۷۔ کہ اے نامور قطب شہ بوالحسن ‏ عطا تجکو تھے پیر تختِ دکھن
۱۱۸۔ تو پینے ستی یادِ حق کا شراب ‏ دندکا ہے دل جل کے اگ پر کباب

دندے = بفتح دالِ مہلہ و سکون نون۔ یہاں ضرورۃً
فقۃ تیسرا حرف دالِ مہلہ مکسور۔ آخر میں یائے مجہول =
دشمن۔ اگ = آگ۔ ضرورۃً بالقصر۔

۱۱۹۔ تجے جیو بیا حق نے سایہ اہے ‏ تو ہر کام میں فتح پایا اہے
۱۲۰۔ تو ہے عدل میں آج نوشیرواں ‏ بکلیں عدل تجھ نے سگل خسرواں

بکلیں سیکھیں۔ سگل = بفتح سین دندانہ دار۔
دوسرا حرف کافِ فارسی مفتوح = سب۔

۱۲۱۔ سخاوت میں دیکھوں تو اے صف تجھے ‏ تو حاتم نے افضل ہو دستا مجھے
۱۲۲۔ تجمل میں ہور شان میں جم ہے تو ‏ شجاعت میں اے شاہ رستم ہے تو
۱۲۳۔ زبردست اے شاہ تو شیر ہے ‏ دندیاں تیو پنج بکریاں تمن زیر ہے
۱۲۴۔ عدو گر پڑے تجھ نظر کی تلار ‏ تو لے اس کے تئیں وہ ہے تیرا شکار
۱۲۵۔ جو کوئی دند تج سوں کرے اختیار ‏ تو وہ جوں ہے اقرا سباب اس کو مار
۱۲۶۔ [illegible] ‏ سو وہ مرغ نم لعڑگ تال ضرب آئیں

تلار = بفتح تائے قرشت = تلے = نیچے۔
دند = بفتح دال مہلہ۔ دشمنی۔
جنیں = جو۔
لعڑگ۔ بفتح کاف عربی مع ہائے ہندی و رائے ہندی ساکن
آخر میں کافِ فارسی = تلوار۔

۱۲۷۔ لیوے سر پو جن تیرے فرمان کوں	نوازے اسے تو بی بھومان سوں	بی = بھی۔
۱۲۸۔ سپاہی پیادے ترے نام دار	کریں رن سوں ہر ایک کاڑے ہتیار	کاڑنا = تلوار نکالنا = باہر نکالنا، مراد جان لینا، روح نکالنا۔
۱۲۹۔ انو کو نوازش سوں اکرام کر	کریں جاں فشانی ترے کام پر	
۱۳۰۔ تو کیوں نا ہوئے زیر تیرا غنیم	جو اس وقت اچھے تیرے لشکر تے ہیم	
۱۳۱۔ محمد حسینی دئے تجھ کو راج	مبارک اچھو تج کو یو تخت و تاج	

در تعریف سخن گوید

۱۳۲۔ سخن تے سخن ور ہوئے سرفراز	سخن تے ہوویں فاش ہر ایک راز	
۱۳۳۔ سخن تے ہوا خلق کو عزّ و جاہ	سخن تیچ ملنے گدا ہور شاہ	تیچ = تے (سے) ہی۔
۱۳۴۔ سخن تیچ حاصل ہے دانا کو مال	سخن تیچ ناداں کو ہے گوشمال	
۱۳۵۔ سخن پائے سو ویچ دانا اہے	سخن داں سخن کا یو دانہ اہے	
۱۳۶۔ سخن جگ کے محفل میں جوں ہے چراغ	سخن مست لوگاں کو جوں ہے ایاغ	
۱۳۷۔ سخن کا بڑا سب میں ہے مرتبا	سخن تیچ پاتی ہے جگ مرحبا	
۱۳۸۔ سخن لعل ہے جیو کے کان کا	سخن خسرواں کے ہے دُرکان کا	جیو = دل، قلب۔
۱۳۹۔ سخن کا ہے کرسی تے عالی مقام	سخن عرش کے سر پہ دھرتا ہے گام	
۱۴۰۔ سخن تیچ ہوتا ہے حق کا وصال	سخن تیچ آتا ہے صوفیاں میں حال	
۱۴۱۔ سخن تیچ سمجھیں حلال و حرام	سخن تیچ حل ہوویں مشکل کے کام	
۱۴۲۔ سخن تیچ حاصل ہے دنیا و دیں	سخن تیچ پیدا ہوئے مہر و کیں	
۱۴۳۔ سخن عقل کے سمد کی موج ہیں	سخن جیو کی روح کی فوج ہیں	سمد = سمندر، بسکون میم غش۔
۱۴۴۔ سخن ویچ جو نیک مرداں کہیں	جواں کے سخن جیو دھرتے رہیں	
۱۴۵۔ سخن تیچ ظاہر ہے سو پیغمبری	سخن تے ہدایت ہے اور رہبری	
۱۴۶۔ سخن تے امیراں امیری کریں	سخن تے فقیراں فقیری کریں	
۱۴۷۔ سخن سچ خدا تے ہوا ہے عطا	تو کیوں نا کروں مدح خیر النساءؑ	

درابتدائے قصہ گوید

۱۴۸۔ کہوں مدح میں قصۂ فاطمہؓ — جو ہے مدح عصمت دہاں خاتمہ

۱۴۹۔ سو وہ پاک داماں بنتِ رسولؐ — اہے حق کی درگاہ میں نت قبول

۱۵۰۔ خدا کی سدا یاد سوں شاد ہیں — دنیا کے علائق سوں آزاد ہیں

۱۵۱۔ وہ خاتون جنت میں خاتون ہیں — یو دنیا سو ہے بندۂ کمتریں

۱۵۲۔ وہ دنیا کی باندی کو آزاد کر — جو خاتون بن گھر سوں کیتے بدر

کیتے = کرتے۔

۱۵۳۔ کریں کافراں کے گھراں میں وطن — تب او داسی ہوان کی بی بی نمن

۱۵۴۔ اوک مال سوں گھرانو سا بھرے — سگل کافراں کو غلاماں کرے

۱۵۵۔ جتے عورتاں کافراں کی اتھے — لئی مول یک دُھرتی سالم دتے

دُھر بروزن گھر۔ ابتدا۔ انتہا۔ یک دُھر سب۔ سگٹ۔

۱۵۶۔ مرصع کے پیرائے اِن کو پنائے — ہو احرص کے زر سوں زیور دلائے

۱۵۷۔ منم کا انو کو پلا کر شراب — کھلائے اہے کافرا کا کباب

۱۵۸۔ دنیا دیکھ گھر کی باندی اہے — سدا بے وفائی تی باندی کا ہے

۱۵۹۔ جو ہے کام اس کا سدا لوڑنا — لگا نیہہ پھر جیو کو توڑنا

لوڑنا = س۔ لوڑھنا = پلٹانا۔ ور غلانا۔
نیہہ = س۔ بکسر اول و سکون ثانی و ثالث = محبت۔

۱۶۰۔ کہ وہ آشتق سب تی معرفی اہے — دلے نیں وفا کس سوں کرتی اہے

۱۶۱۔ وفا کا نہیں بوئے کچھ اس کنیں — نہیں عہد ہور شرم کچھ اس منیں

۱۶۲۔ ہر یک کس سوں رہتی ہے ان جار دل — کہ دلبر پانچ بن پہچانک کرتی دو سحل

۱۶۳۔ دلے کافراں اس کو جانے نہیں — دنیا کر اس کا پچھانے نہیں

۱۶۴۔ وہ سمجھے اچھوں گی اپنیچ پاس — لگے مست ہو پھیریں تس آس پاس

اپنیچ = نون مشدد خصّش۔
نیں = یاء اور نون ثانی خفت۔ یہ بھی ممکن ہے کہ "نیں" نہیں ہو اور "تس" کاتب کا سہواً اضافہ ہو۔

۱۶۵۔ یو دنیا سو آخر کو ہے بے وفا — پچھانے نہیں کوئی اس کا جفا

۱۶۶۔ ہو مغرور اس مال دنیا اُپر — جہنم میں جائیں گے تن کو سنوز

۱۶۷۔ وہ باندی کے باندیاں جو کسوت کیے ۔ دکھانے کو جنت کی بی بی لیے

کسوت۔ ع۔ کپڑا۔ لباس۔ مجازاً طریقہ ظاہری تدبیر۔
باندیاں ۔ یا بخت ۔
بھاں = بہن ۔

۱۶۸۔ سو وہ کون جو بہناں ابوجہل کی ۔ کتے عورتاں تھے لعیناں کی بھی
۱۶۹۔ وہ کفار کی عورتاں نابکار ۔ گئے وہ اپس میں اپے یوں بچار
۱۷۰۔ ہمیں نیں ہے کس بات محتاج آج ۔ تو کیوں نا گنائیں بڑا کاج آج
۱۷۱۔ جو اس میں بی بی فاطمہؑ کو بلائیں ۔ ہماری بزرگی انو کو دکھائیں
۱۷۲۔ انو آئے تو اٹھ نہ تعظیم دیں ۔ انوتے ہمیں بلکہ تعظیم لیں
۱۷۳۔ ہمیں اپنی مسند پو بیٹھے رہیں ۔ نہ تعظیم دیں ان کو بیٹھو کہیں
۱۷۴۔ مجمل ہو کے بعد از جو مجلس میں آئیں ۔ ہماری زرینے تے حسرت لیجائیں
۱۷۵۔ اگر ہو ویں خجل دیکھ ہمارا یو شان ۔ بڑا ہے ہمارا بڑیاں بیچ مان

زرینہ۔ ف۔ سنہری سامان، کپڑے وغیرہ۔
دیکھ کی یا بخت ۔
بڑیاں = بڑے۔ ممتاز۔ بزرگ۔ مان = عزت۔

۱۷۶۔ خجل ہو انو سم ہماری بڑائی ۔ بڑیاں کا ہمیں ناؤں کرنا کھڑی

ط: . . . . انو سم ہماری بڑی۔ سم = ہی سے (سامی)
نیز دیکھئے بیت نشان ۲۴۷۔

۱۷۷۔ نہیں شرمندی کوئی انو کو کرے ۔ ہمیں مکر سوں پیش آئیں بہے
۱۷۸۔ اوک مکر کی دوستی سوں بھلائیں ۔ ہمیں ان کو بھر کیوں یہاں لک بلائیں

شرمندی = شرمندہ ۔
بھلائی = بہلائیں ۔
بھُرکی بضم اول مصدرہ وسکون ثانی وثالث = بھولا میں ڈالنا۔ بھلا دینا (سامی)

۱۷۹۔ بلانے کے تیں فاطمہؑ کو یہاں ۔ ہمیں بھیج دینا ہے نامہ وہاں
۱۸۰۔ جو اس بات پر ہو انو سب قبول ۔ کئے دین سوں قدم تیا پو پھول
۱۸۱۔ ولے دین آخر زبردست ہے ۔ یو عقبا سو اس کے انگے پست ہے
۱۸۲۔ بہرحال نامے کو لکھنے لگے ۔ ہو باطن میں دشمن تو منہ پر سگے
۱۸۳۔ لکھے تھے کتی عاجزی سوں سلام ۔ کئے تھے کتی دل فریبی کلام
۱۸۴۔ جو نامہ لکھے تھے سو وہ بدگہر ۔ لکھوں اس کے مضمون منظوم کر
۱۸۵۔ کہوں بیاں تے نامے کے مضمون کوں ۔ وہ نامہ جو مکتوب تھا مکر سوں

نامہ نوشتن کافراں بر آنحضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

۱۸۶۔ ایا ناصر دیں خدا کے رسولؐ	ایا بانیٔ شرع و علم اصول	ایا ۔ ع ۔ بالفتح ۔ حرفِ ندا ۔
۱۸۷۔ ایا سامع وحی صاحب کتاب	ایا قاضیٔ صدر روزِ حساب	ط : .... وصول ۔
۱۸۸۔ ایا ماہِ دیں رہبرِ رہبراں	ایا شاہِ دیں سرورِ سروراں	
۱۸۹۔ ایا ربِ عالم کے مخزن کے گنج	ایا خلق کے دافعِ درد و رنج	
۱۹۰۔ ایا ناطقِ نطق خیر الانام		
۱۹۱۔ رسولِ امیں اے نجات پناہ	شفیعِ خلائق طبیبِ گناہ	
۱۹۲۔ رسولِؐ خدادال و شاہِ عرب	پناہِ عجم اے پناہِ عرب	خداداں = خدا شناس ۔
۱۹۳۔ احد دوست اے احمدِ حمد گو	علیمِ عمل واقفِ سِرّ ہو	
۱۹۴۔ ثنا ہور صفت بعد ازاں سربسر	اچھو عرض اظہار حضرت اپر	
۱۹۵۔ ایا اے محمدؐ رسولِ خدا	نہیں ہے خدا تجہ تے یک تل جدا	
۱۹۶۔ خدا کی رضا سوں تجھے کام ہے	قضا ہور قدر سب تجھے فام ہے	
۱۹۷۔ تو برحق پیمبر خدا کا ہے جان	ہمیں لائے ایمان پانے اماں	
۱۹۸۔ نکو جان ہمنا بگانے ہے کر	ہمیں ہیں فدا جیو سوں تجھ اپر	بگانے = بیگانے ۔ جیو سوں = دل سے ۔
۱۹۹۔ ہماری برایاں پر نظر نا کرو	کرم کی نظر ٹک ہمن پر دھرو	برایاں ۔ یا الف ۔ بمعنی ۔
۲۰۰۔ جو ہے کم خدا ای کرا کاج یاں	نہ اس شعار کوئی ہے بڑا آج یاں	کرا = برائے ۔ کے لئے ۔
۲۰۱۔ نہیں یاں ہمن کوئی تمن سوں بڑا	جو اس شعار پر آکرے کھڑ کھڑا	کھڑ کھڑا ۔ بفتح کاف عربی مع ہائے ہندی ۔ تیسرا حرف رائے ہندی ۔ لغوی معنی شور و پکار ۔ مجازاً زینت یا شہرت دینا ۔
۲۰۲۔ ہمن کو سرافراز کر آج کو	رضا دیو بی بی کو یاں کاج کو	
۲۰۳۔ جو ایسے کے ہمن گھر کو وہ پاک ذات	تو ہوگا ہمن کو دو جگ میں نجات	

بیاد گار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

سنہ اجرا ۱۹۳۵ء
فون نمبر ۳۵۲۰۹
جلد ۲۹
شمارہ ۴

اپریل ۱۹۶۶ء

ماہنامہ سب رس حیدرآباد دکن

نگران :- پروفیسر سید علی اکبر

مجلس مشاورت

۱- میر حسن ۲- ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ۳- رمن راج سکینہ

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

زر سالانہ ہند و پاک سے چھ روپے
زر ششماہی تین روپے
غیر ممالک سے دس روپے
فی پرچہ آٹھ آنے

مہتمم ادارہ ادبیات اردو کے اہتمام سے نیشنل پرنٹنگ پریس میں چھپ کر
ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات

سنہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کو آزادی ملنے کے بعد سنہ ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد کو انڈین یونین میں شامل کیا گیا۔ ریاست آندھرا میں وشال آندھرا کی تحریک زور پکڑتی گئی اور لسانی بنیادوں پر ریاست حیدرآباد کی تقسیم کے لئے سیاسی تحریکیں چلائی جانے لگیں۔ بالآخر کانگریس نے لسانی بنیادوں پر اسٹیٹس کے اصول کو تسلیم کرلیا، اور سنہ ۱۹۵۶ء میں ریاست حیدرآباد کی تقسیم عمل میں آئی۔ کچھ اضلاع مہاراشٹر میں ضم ہوئے کچھ کرناٹک کو ملے اور آٹھ اضلاع ریاست آندھرا کو ملے اور اس طرح وشال آندھرا کا خواب پورا ہوا لیکن شاید اس بات سے کم لوگ واقف ہیں کہ کم و بیش یہی حدود قطب شاہی سلطنت کے تھے جس کے حکمرانوں نے انتہائی عدل و انصاف اور رواداری کے ساتھ تقریباً دو سو سال تک حکومت کی اور محمد قلی قطب شاہ نے حیدرآباد کی تعمیر کرکے ایک ایسے شہر کی تخلیق کی جو دن بدن ہر اعتبار سے ترقی کرتا گیا، اور آج وہ جن وسعتوں کو سمیٹے ہوئے ہے وہ ہمارے سامنے ہیں۔ اس وسیع سلطنت کو استحکام محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں نصیب ہوا اسی لئے ادارۂ ادبیات اردو کے بانی ڈاکٹر زور مرحوم نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا، اور یوم محمد قلی منانے کی تجویز کی۔ سنہ ۱۹۵۸ء سے یہ یوم نہایت تزک و احتشام کے ساتھ محمد قلی قطب شاہ کے مقبرے پر پہلے اجلاس سے منایا جانے لگا۔ چنانچہ اس سال بھی یہ یوم ۱۹ر۔۲۰ر اور ۲۱ر فروری کو منایا گیا۔ پہلا اجلاس حسب سابق مقبرہ کے وسیع چبوترہ پر منعقد ہوا۔ گولکنڈہ کے عوام کی کثیر تعداد کے علاوہ حیدرآباد کے عوام کی بھی ایک بہت بڑی تعداد نے شرکت کی اور اس کے رنگا رنگ پروگرام نے شرکت کرنے والوں کو محظوظ کیا۔ پروگرام کا مختصر خاکہ حسب ذیل ہے:۔

افتتاحی اجلاس کی صدارت آندھرا پردیش کے وزیر داخلہ جناب میر احمد علی خاں صاحب نے کی۔ ابتدا میں میر عابد علی خاں صاحب نے محمد قلی کی مناجات سنائی۔ معتمد صاحب عمومی نے خیر مقدمی تقریر کی۔ اس کے بعد جناب صدر جلسہ نے افتتاحی تقریر فرمائی۔ جناب صدر ادارہ نے پیامات سنائے اور رحمت علی صاحب نائب میر بلدیہ نے عہد قطب شاہ پر روشنی ڈالی۔ جناب سید شاہ عباس منصوری خراسانی نے فارسی میں تقریر کی۔ محمد قلی قطب شاہ کے مزار پر چادر گل چڑھائی گئی۔ تلاوت کلام پاک کے بعد جناب عباس عابدی نے مرثیہ سنایا۔ جناب اظہر افسر صاحب کا مرتبہ خاکہ محترمہ عایشہ دلشاد نے پیش کیا۔ جناب عزیز احمد خاں صاحب کی قوالی کے بعد جناب رمن راج صاحب سکینہ معتمد یوم محمد قلی کے شکریہ پر یہ تقریب اختتام کو پہنچی۔

دوسرے دن ۲۰ر فروری کو دس بجے عالی جناب نواب مہدی نواز جنگ سابق گورنر گجرات نے نمائش کا افتتاح فرمایا اور ساڑھے دس بجے سے جناب پروفیسر سید علی اکبر صدر ادارہ کی صدارت میں ادبی اجلاس کا آغاز ہوا۔

جس میں قطب شاہی مقبروں کے طرز تعمیر پہ غلام ربانی صاحب، شاہان قطب شاہیہ کے رفاہی کام پر محی الدین احمد صاحب،
قطب شاہی سلاطین کی رواداری پر، میر سراج الدین علی خاں صاحب، معانی/ جدید رجحانات کی روشنی میں پر
ملک زادہ طیب انصاری صاحب اور محمد قلی کی شاعری پر زاہدہ ابوالحسن صاحبہ نے اپنے مقالے سنائے اور
پرنس نقی علی خاں ثاقب، آغائی فرخ شیرازی اور وقار خلیل صاحبان نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ ان مقالوں پر
جناب صدر جلسہ نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔

شام میں پروفیسر مسعود حسین خاں کی صدارت میں ایک سمپوزیم "حیدرآباد میں اردو ادب کا ماضی، حال
اور مستقبل" کے عنوان پر منعقد ہوا، جس میں پروفیسر سید محمد، پروفیسر عالم خوندمیری اور جناب مصطفٰی کمال نے
اپنے خیالات کا اظہار فرمایا، اور پھر صدر جلسہ نے عہد قطب شاہ کی زبان پر لسانیاتی نقطۂ نظر سے
روشنی ڈالی۔ جناب میر حسن صاحب کے شکریہ پر یہ جلسہ برخواست ہوا۔

اسی دن رات کے نو بجے علامہ حیرت بدایونی کی صدارت میں طرحی مشاعرہ منعقد ہوا۔ طرح تھی

"ساقیا آ، شراب ناب کہاں"

تقریباً تیس ۳۰ شعرا نے سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ فرمایا۔

۱۲ر فروری کو چار بجے شام میں جناب ڈی، راما نج راؤ صدر آندھرا سرسوتی پریشد کے زیر صدارت
تلگو اجلاس منعقد ہوا، جس میں پروفیسر وینکٹ اودھانی، جناب کے، للکشمن شاستری، ڈاکٹر سی، نارائن ریڈی
اور ڈاکٹر بی، رام راؤ کی تقاریر ہوئیں اور جناب ڈی، پانچا جنیم کے شکریہ کے بعد جلسہ ختم ہوا۔

پیش نظر شمارے میں پہلے وہ مضامین ہیں جو ادبی اجلاس میں پڑھے گئے اور دوسرے حصے میں فاضل محققین
اور ناقدین کے مقالوں کو جگہ دی گئی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ یہ سب مضامین اور مقالے قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔
اور انھیں قطب شاہی عہد اور ادب کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

محمد اکبر الدین صدیقی

ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ
معتمد عمومی ادارہ

خطبۂ استقبالیہ

جناب صدر، معزز خواتین و حضرات!

آج ہم ایک ایسے قابل احترام تاجدار گولکنڈہ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں جو بلا تخصیص مذہب و ملت رعایا کا سچا خدمت گزار تھا، اور جس کی مذہبی روا داری، علم پروری، اور عوامی خدمات تاریخ دکن کا اہم سرمایہ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ نہ صرف شہر حیدرآباد کا بانی، اردو اور تلگو زبان کا شاعر تھا بلکہ وہ ایک ایسا عوامی بادشاہ بھی تھا جس نے اپنی ساری زندگی رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ کی یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس کی بدولت محسن زبان اردو اور ملک کے مایۂ ناز سپوت ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے ۱۹۵۸ء میں اس قومی بادشاہ کا یوم منانے کی بناء ڈالی اور ہر سال ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام یہ یادگار تقریب اعلیٰ پیمانے پر منائی جاتی ہے۔ اس سالانہ تقریب کے انعقاد کا منشا یہ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے زرین کارناموں کو منظر عام پر لایا جائے اور عوام کے دلوں میں روا داری، اتحاد و اتفاق اور قومی یکجہتی کے جذبات پیدا کئے جائیں، جن کی آج ہمارے ملک کو شدید ضرورت ہے۔

بے محل نہ ہوگا اگر میں اس موقع پر ادارۂ ادبیات اردو کے علمی و ادبی کاموں کا سرسری ذکر کروں:۔

ادارۂ ادبیات اردو لسانی تحقیقات کا ایک اہم مرکز ہے ــــ اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں سرگرم عمل اور بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے۔

اِس سال ادارے کے تمام شعبوں کی کارکردگی میں قابل لحاظ اضافہ ہوا۔ شعبۂ امتحانات کی جانب سے اردو دانی۔ زبان دانی ۔ اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات کا انعقاد عمل میں آیا۔ چنانچہ جونیر سرٹیفائیڈ اسکول چیپا پیٹ۔ سنٹرل جیل محبوب نگر۔ شہر حیدرآباد اور جائس (ضلع رائے بریلی، اتر پردیش) کو امتحانات کے مراکز قائم ہوئے، جس میں (۲۲۱) طلبا و طالبات نے امتحان اردو زبان دانی ۔ اردو دانی۔ اردو عالم اور اردو فاضل میں کامیابی حاصل کی۔

یہ امر باعث طمانیت ہے کہ اردو امتحانات کی مقبولیت میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور

ادارے کے امتحانات اردو فاضل کو ڈپ، اد، یل کے مساوی قرار دینے کا مسئلہ ارباب جامعہ سے رجوع کیا گیا ہے۔

ادارے کے کتب خانے میں اس سال (۶۰) نادر مخطوطات اور (۸۶۷) مطبوعات کا اضافہ ہوا، اور محققین کی ایک بڑی تعداد نے اپنے تحقیقاتی کاموں کے سلسلے میں کتب خانے کے ذخیرے سے استفادہ کیا۔ مطبوعات اور مخطوطات کے عطیہ دہندوں میں پرنسپل صاحب انوار العلوم کالج نواب احمد نواز جنگ۔ حکیم یوسف حسین خاں صاحب۔ ہادی بلگرامی۔ ڈاکٹر ہاشم امیر علی خاں۔ مالک رام اور نواب نذیر نواز جنگ قابل ذکر ہیں۔ دارالمطالعہ میں اخبارات و رسائل سے بھی بے شمار افراد نے استفادہ کیا۔

ادارے کا ترجمان ماہنامہ "سب رس" پابندی سے شایع ہو رہا ہے اور اس کا بلند معیار اس کی روز افزوں مقبولیت کا آئینہ دار ہے۔

"ایوان اردو" کے میوزیم کے نوادر کا اضافہ میوزیم کے سرپرست نواب عنایت جنگ بہادر کی توجہات خاص کا رہین منت ہے۔ نواب صاحب نے کئی نادر قطعات۔ قدیم رقعے۔ عہد قطب شاہی کے بیش بہا نوادر عنایت فرمائے ہیں۔

مجلس اشاعت تاریخ و تمدن دکن (شعبۂ ادارہ) کے زیر اہتمام "وزرائے سلطنت آصفیہ" کے نام سے ایک مبسوط کتاب شایع کی جا رہی ہے، جو مستند دستاویزی مواد پر مشتمل ہوگی اور جس کی تالیف کا کام مولوی سید محی الدین صاحب ایم اے نے آغاز کر دیا ہے۔

اس کے علاوہ ادارے کے پروگرام میں کئی اہم مخطوطات کی اشاعت داخل ہے۔ توقع ہے کہ آیندہ چند ماہ میں ان کی اشاعت کے لئے مناسب مواقع فراہم ہو جائیں گے۔

آپ حضرات اس سے بہ خوبی واقف ہیں کہ آندھرا پردیش میں تلگو کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی قانونی درجہ دینے کا مسئلہ حکومت کے زیر غور ہے اور حکومت نے اس کا تیقن دیا ہے کہ اردو کے ساتھ جو ملک کی عوامی زبان ہے انصاف سے کام لیا جائے گا، اور اس کو مناسب مقام دیا جائے گا۔ ایسی صورت میں ہمیں توقع ہے کہ حکومت آندھرا پردیش اپنی مثالی رواداری سے کام لے کر اردو بولنے والوں کے جائز حقوق کی حفاظت کرے گی اور اردو کو وہ قانونی درجہ دے گی جس کی وہ بجا طور پر مستحق ہے۔

آخر میں میں آپ تمام خواتین و حضرات کا استقبال کرتا ہوں اور تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اپنی شرکت سے اس تاریخی تقریب کو کامیاب بنایا۔

جے ہند

پیامات یوم محمد قلی قطب شاہ

"یوم محمد قلی قطب شاہ" کے سلسلے میں آئے ہوئے پیامات 'صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے افتتاحی اجلاس منعقدہ گولکنڈہ میں سنائے :-

۱۔ ڈاکٹر بی گوپال ریڈی (دہلی) :-

"مجھے ۲۰ر فبروری کو یونیورسٹی کا نوکیشن کا خطبہ خیر گڈھ میں دینا ہے اس لئے یوم محمد قلی کی تقاریب میں حیدرآباد نہ پہنچنے کا افسوس ہے۔ مجھے بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ آپ حضرات ڈاکٹر زور کے بعد ان کے کام کو نہایت خوش اسلوبی سے آگے بڑھا رہے ہیں۔ یوم محمد قلی کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔"

۲۔ جناب بھیم سین سچر (ہندوستانی ہائی کمشنر متعینہ سیلون) :-

"یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب میرے لئے بے حد باعث مسرت ہیں اور اس سلسلے میں گزشتہ تقاریب کی یادیں میرے دل میں ابھی تک تازہ اور پایندہ ہیں۔ یہ تقاریب قومی یکجہتی اور تہذیبی اتحاد کی آئینہ دار ہیں اور ان سے دیرپا تاثرات دلوں پر مترتب ہوتے ہیں اس سال کی تقاریب کے لئے میری نیک تمنائیں قبول فرمائیے۔"

۳۔ جناب اے۔ بلرامی ریڈی (وزیر تعلیم حکومت آندھرا پردیش) :-

"ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے یادگاری یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر میری پرخلوص تمنائیں اور کامیابی کی دعائیں قبول فرمائیے۔"

۴۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی (ایڈیٹر "صدق جدید" لکھنؤ) :-

"محمد قلی قطب شاہ کا شمار اردو شعر و ادب کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ ان کی یاد آپ حضرات اس اخلاص قلب سے منائیں وہ حق ان کا بھی ہے اور آپ کے ادبی ادارے کا بھی۔"

۵۔ جناب فضل الرحمان (پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) :-

قطب شاہی روایات اور تہذیبی ورثے کو زندہ رکھنے کے لئے ادارۂ ادبیات اردو کی ہمہ جہتی کوششیں نئی نسل کے لئے جو اپنے اسلاف کے اعمل کارناموں سے پوری طرح واقف نہیں

بطور خاص اہم اور مفید ہے۔ میری بہترین تمنائیں ان مبارک مساعی میں شریک ہیں۔"

۶۔ جناب جلال عبدہ (سفیر ایران مقیم دہلی):-

"تقاریب یوم محمد قلی میں ناگزیر وجوہات کی بناء پر شریک نہ ہونے کا مجھے افسوس ہے۔ سال آئندہ ضرور حاضر ہوں گا۔ بہرحال میری طرف سے اس کی کامیابی کی، دعائیں قبول فرمائیے۔"

۷۔ جناب کے۔ آر۔ کرپلانی (جنرل سکریٹری مرکزی ساہتیہ اکاڈیمی، دہلی):-

"یوم محمد قلی قطب شاہ اور ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شاندار مستقبل کے لئے میری نیک تمنائیں اور دعائیں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گی۔"

۸۔ جناب جی۔ یم صادق (وزیر اعلیٰ ریاست جموں وکشمیر):-

"یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب میں دعوت کا بے حد شکریہ۔ بہ وجہ سرکاری مصروفیات عدم شرکت کا افسوس ہے۔"

۹۔ جناب فخر الدین علی احمد (مرکزی وزیر آب پاشی وترقیات۔ دہلی):-

"جب کہ مغل اعظم اکبر شمال میں اور محمد قلی قطب شاہ گولکنڈے میں تخت پر جلوہ افروز تھے تو حیرت ناک طور پر ایک قسم کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ خاص طور پر دونوں رعایا کی فلاح وبہبود اور قومی اتحاد ویک جہتی کے جذبے سے سرشار تھے۔ تاریخوں میں اکبر اعظم سے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے البتہ محمد قلی کی سرگرمیوں کا جائزہ لے کر اس کو منظر عام پر لانا ضروری ہے۔ اس کے دربار میں مذہب کی بناء پر کوئی امتیاز نہیں تھا۔ آسیر راؤ۔ جگپت راؤ اور دھرم راؤ اس کے اتنے ہی معتمد الیہ سپہ سالار اور مشیران کار تھے جتنے محمد امین میر جملہ امجد الملک وغیرہ تھے۔ محمد قلی قطب شاہ ہندوستانی تہذیب وتمدن کا دلدادہ تھا، حتیٰ کہ اس نے ایرانی لباس ترک کرکے دکھنی لباس اختیار کیا، اور اس کے درباری بھی یہی لباس پہنتے تھے۔ موسیقی تلنگی زبان اور اردو سے بھی اس کو عشق تھا۔ وہ دکن کے رسم ورواج سے اتنی محبت رکھتا تھا کہ اپنی اکلوتی شہزادی کی شادی میں تمام دیسی رسومات کی پابندی کی۔ بسنت کا تہوار بڑے اہتمام سے مناتا تھا۔ اس کے کلیات میں متعدد نظمیں ایسی عیدوں کی تعریف میں ملتی ہیں۔ کلیات محمد قلی ایک ایسا دلکش مرقع ہے جو ہر طرح کی دلاویز تصویروں سے مزین ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اہل دکن ایسے عظیم الشان اور محب وطن بادشاہ کی سالگرہ مناتے ہیں لیکن یہ چند دن کی مختصر تقاریب کافی نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی زندگی میں ان اصولوں پر عمل کریں جو محمد قلی قطب شاہ نے اپنائے تھے۔"

۱۰۔ جناب امتیاز علی عرشی (ناظم رضا لائبریری۔ رام پور):- "محمد قلی قطب شاہ دکن کے ان نامور فرزندوں میں سے ہے جنھیں بادشاہت کے ساتھ ادب کی سلطانی بھی عطا ہوئی تھی۔ وہ اردو کے سب سے نمایاں شاعر تھے اور ان کا کلام دکنی اردو کے ماہرین کے نزدیک ناقابل فراموش سرمایہ ہے۔ وہ اردو کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں اور اپنی شاعری کے ہمہ گیر انداز اور متنوع موضوعات کی وجہ سے بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ میں اس سود تقاریب کے انعقاد میں اپنے آپ کو برابر کا شریک تصور کرتا ہوں۔ اس قومی اہمیت کے شاعر کی یاد سال بہ سال تازہ کرنے پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔"

تقریر صدارت

نواب میر احمد علی خاں وزیر داخلہ حکومت حیدرآباد

محمد قلی نے ایران نژاد ہونے کے باوجود اپنے آپ کو ہندوستانی تہذیب اور روایات سے ہم آہنگ کر لیا تھا۔ لسانی اور مذہبی رواداری اور یک جہتی کے ایک زریں دور کا اس نے آغاز کیا جس کا تسلسل آج آندھرا پردیش کی شکل میں موجود ہے۔

محمد قلی نے اردو کے ساتھ ساتھ تلگو کی سرپرستی کی۔ محمد قلی کے بعد سے آندھرائی روایات محو ہونے لگی تھیں لیکن آندھرا پردیش کے قیام کے ساتھ ساری روایات تازہ ہونے لگیں۔ قطب شاہی دور میں سری کاکلم تک ریاست کی عملداری تھی۔ ہندوستان میں اگر کوئی علاقہ دو مختلف زبانوں کے درمیان بہترین تعلقات کا دعویٰ کر سکتا ہے تو وہ بلا شبہ آندھرا پردیش ہی ہے۔ ہمارے اضلاع میں اردو کے جلسوں اور اردو کے مقابلوں میں تلگو زبان رکھنے والے اصحاب زیادہ تعداد میں شریک رہتے ہیں۔ اس طرح آندھرا پردیش سارے ہندوستان کے لئے ایک نمونہ ہے اور اس کا سہرا محمد قلی کے سر ہے۔

حکومت آندھرا پردیش ایسے عوام کی نمائندہ حکومت ہے جو ہر طرح کی یک جہتی اور ہم آہنگی کے دل دادہ ہیں چنانچہ حکومت نے تلگو کے ساتھ ہی ساتھ اردو کی ترقی اور اشاعت کے لئے فراغ دلانہ پالیسی اختیار کی ہے۔

غلام ربانی

قطب شاہی مقبرے

عمارتیں رہنے سہنے کے لئے بنتی ہیں لیکن مقبرہ ایسی عمارت ہے جو صرف دیکھنے کے لئے بنتی ہے۔ اس کا مقصد بنانے والے کی یادگار قائم کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے سارا زور اس کی مضبوطی اور استحکام پر دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقبرے زیادہ مستحکم ہوتے ہیں۔ گولکنڈے کے شاہی محل، محل سرائیں، ایوانات اور دروازے کھنڈر ہو کر رہ گئے ہیں، لیکن ان ہی بادشاہوں کے مقبرے اچھی حالت میں ہیں۔ ان عالی شان عمارتوں نے کہیں سے جنبش نہیں کھائی ہے۔

دکن میں سب سے پہلا مقبرہ سلطان علاء الدین حسن بہمنی کا ہے جو تغلق طرز پر تعمیر ہوا تھا۔ تغلقی گنبد چپٹے ہوتے تھے، دیکھنے میں اچھے نہیں معلوم ہوتے تھے، ان کے نیچے گردن بھی نظر نہیں آتی تھی۔ گلبرگہ کے معماروں نے گنبد کو بلند کرنے کے لئے اس کا پایہ اونچا کیا، اور گنبد کی وضع کو انار نما بنا دیا۔ رفتہ رفتہ ان میں گولائی آتی گئی، چنانچہ بعد کے سب گنبد گردی ہیں اور بہمنی طرز ایک مستقل عنوان بن گیا۔ یہی بہمنی طرز گولکنڈہ پہنچا۔ چنانچہ قطب شاہی مقبروں کا نقشہ وہی ہے جو بہمنی مقبروں کا ہے۔ لیکن یہاں ان میں بہت کچھ ترمیم و اصلاح ہوئی اور بعض جدتیں ایسی ہوئیں جن سے عمارتوں میں رعنائی پیدا ہوگئی۔

تلنگانہ خوب صورت مندروں سے مالا مال ہے۔ اس سرزمین کے معماروں نے قطب شاہی مقبروں میں کام کیا، انھوں نے مقبروں کی تعمیر میں وہ چیزیں داخل کر دیں جن کو وہ صدیوں سے مندروں میں بناتے چلے آئے تھے۔ اس وقت تک مقبروں میں نقش و نگار کا رواج نہیں تھا۔ تلنگانے کے کاریگروں نے ان کو بیل بوٹوں اور پھول پتوں سے سجایا۔ یہ نقش و نگار چونے میں اس خوبی سے منبت کئے گئے کہ آخر کار یہی منبت کاری گولکنڈہ طرز تعمیر کی خصوصیت بن گئی۔

قطب شاہی مقبرے بادی النظر میں ایک سے معلوم ہوتے ہیں، لیکن اگر ان کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مقبروں کا یہ خوب صورت جھرمٹ گولکنڈہ اسٹائل کی ایک کتاب ہے جس سے اس طرز کے ارتقائی مدارج آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔

یہاں سب سے پرانا مقبرہ سلطان قلی قطب شاہ کا ہے جو اس خاندان کا بانی تھا۔ اس مقبرہ کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تغلق آباد (دلی) سے غیاث الدین تغلق کا مقبرہ لا کر یہاں رکھ دیا گیا ہے۔ دونوں کی دیواریں گاؤدُم ہیں۔ مخروطی ہونے کی وجہ سے ان کے کونے کمر کی شکل کے ہوگئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دروازے اندر کو دھنسے ہوئے ہیں۔ پوری عمارت میں نقش و نگار کا نام نہیں ہے، حجم میں بھی برابر ہیں، وضع میں اس قدر مشابہ ہیں کہ دونوں

ایک سانچے میں ڈھلے معلوم ہوتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ اس کی کرسی نیچی ہے اور تغلق کے مقبرے کی کرسی بہت بلند ہے۔

یہ مقبرہ یہاں کے شاہی مقبروں میں سب سے چھوٹا ہے اور قلی قطب شاہ جیسے اولوالعزم سلطان کی آخری آرام گاہ کے لئے شایانِ شان نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ تمام عمر سلطنت کے استحکام میں لگا رہا، اسے مقبرہ بنانے کی فرصت نہیں ملی۔ یہ مقبرہ اس کے مرنے کے بعد تعمیر ہوا۔ اس کے بعد کے دوسرے فرماں رواؤں نے اپنے اپنے مقبرے اپنی زندگی ہی میں بنوا لئے تھے۔

اس کے برابر جمشید قلی کا مقبرہ ہے جو قلی قطب شاہ کا بیٹا تھا۔ یہ عمارت دو منزلہ ہے، اس پر نیچے سے اوپر تک مہین چونے کی استرکاری کی گئی ہے۔ وضع میں ہشت پہل ہے۔ اس شکل کا مقبرہ ہندوستان میں کہیں نہیں ہے، البتہ بیجاپور میں حضرت خواجہ امین الدین اعلیٰ شیر خدا کا مقبرہ اس سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔

جمشید کے بعد اس کے کم سن بیٹے سبحان قلی کو تخت پر بٹھایا گیا لیکن چند مہینے بعد وہ تاریخ سے اس طرح غائب ہوا کہ اس کی قبر تک کا پتہ نہیں ہے۔ البتہ سلطان قلی قطب کے مقبرے کے برابر ایک چھوٹا سا مقبرہ ہے جو "چھوٹے ملک کا مقبرہ" کہلاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مقبرہ سبحان قلی کا ہو، اگرچہ اس پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔

سبحان قلی کی جگہ اس کا چچا ابراہیم قطب شاہ تخت پر بیٹھا۔ اس کا مقبرہ پہلے دونوں مقبروں سے بڑا ہے اور بیدر کے بہمنی مقبروں کے نمونے پر بنا ہے۔ اس کی دیواروں پر چینی کا کام تھا جو خستہ ہو کر جا بجا سے گر گیا ہے لیکن کچھ نقش و نگار اب بھی باقی ہیں۔

اس مقبرے سے گزر کر جب محمد قلی کے مقبرے پر پہنچتے ہیں تو نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ یہ عمارت زیادہ خوبصورت اور شاندار ہے۔ اس کی تعمیر میں چالوکی طرز کی خصوصیات موجود ہیں۔ دروازوں کے سامنے جو برآمدے ہیں ان کے ستون ایک ڈال کے پتھر کے ہیں۔ کاکتیائی مندروں میں اسی قسم کے تراشیدہ ستون جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ ستونوں کے سروں پر چار چار توڑے ہیں جن پر سلیں پاٹ کر چھت بنا دی گئی ہے۔ یہ چھتیں چالوکی طرز کی ہیں، ورنہ اسلامی عمارتوں میں ہر جگہ لداؤ کی چھتیں ہوتی ہیں۔ دیواروں پر سطح سے ابھری ہوئی پٹیاں ہیں جو ایک دوسری کے متوازی چاروں طرف چلی گئی ہیں۔ اس طرح کی پٹیاں مندروں میں عام ہیں، کہیں یہ پٹیاں افقی ہوتی ہیں، کہیں عمودی، اس مقبرے میں افقی ہیں۔ غرض کہ تراشیدہ ستون، سردل، پٹیاں، توڑے اور چھجے سب چالوکی طرز کے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان برآمدوں میں کھڑا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھے تو معلوم ہوگا کہ وہ کسی مندر میں کھڑا ہے۔

عمارت کے ردکار پر چونے میں نقش و نگار بنائے ہیں جن میں کنول کے پھول پتے، کنول کی کلیاں اور کنول کی پتیاں بنائی گئی ہیں۔ کنول کو ہندو دیومالا میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس مقبرے پر ہندو مسلم طرزِ تعمیر کا امتزاج بہت نمایاں ہے۔ محراب اور مینار جو خاص اسلامی چیزیں ہیں، اس عمارت میں نمایاں نہیں۔

محمد قلی کے کوئی بیٹا نہ تھا، اس کے بعد اس کا بھتیجا محمد قطب شاہ جانشین ہوا۔ ان دنوں دکن میں بڑے مقبرے بنانے کا رواج تھا، چنانچہ جتنے بڑے مقبرے دکن میں ہیں، شمالی ہند میں نہیں ہیں۔ محمد قطب شاہ کا مقبرہ بھی بہت بڑا ہے۔ یہ عمارت اندر سے ہشت پہلو، اور باہر سے چوکور ہے، جس کے گرد سات سات در کی گیلری چاروں طرف بنی ہوئی ہے۔ اصل عمارت ایک مکعب کی شکل ہے، یعنی اس کا طول، عرض، اور بلندی سب برابر ہیں۔ چبوترہ پر جو عمارت ہے اس کی بلندی گنبد کی بلندی کے برابر ہے۔ اس زمانے میں جتنے بڑے مقبرے پائے جاتے تھے ان میں عموماً یہی تناسب رکھا جاتا تھا۔ عمارت میں شان پیدا کرنے کے لئے گنبد دوہرے بنائے جاتے تھے، یعنی ایک گنبد کے اوپر دوسرا گنبد بناتے تھے اور دونوں کے بیچ میں خلا ہوتا تھا۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ زائر کسی زاویئے سے دیکھے، اس کو ایک وقت میں صرف ایک ہی گنبد دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح کا دوہرا گنبد سب سے پہلے دلّی میں سکندر لودھی کے مقبرے میں بنایا گیا تھا۔ یہ جدت اتنی مقبول ہوئی کہ ملک میں عام طور پر دوہرے گنبد بننے لگے۔ چنانچہ محمد قطب شاہ کے مقبرے کا گنبد بھی دوہرا ہے۔

اس مقبرے کی تعمیر میں بہت بڑے پتھر استعمال ہوئے ہیں۔ یہ پتھر بیس پچیس فٹ لمبے ہیں۔ گیلری کے دروں کی پوری محرابیں صرف دو دو پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی ہیں۔ قطب شاہی عمارتوں میں بڑے پتھروں کا استعمال عام ہے۔ یہ ہمارے مقامی طرز تعمیر کا اثر ہے۔ اس عمارت پر شروع میں مینا کاری کی گئی تھی، جس کے نشان اب بھی کہیں کہیں باقی ہیں۔

اس کے پاس ہی حیات بخشی بیگم کا مقبرہ ہے۔ اس خاتون نے بادشاہت تو نہیں کی، مگر ایک بادشاہ کی بیٹی، بادشاہ کی بیوی اور بادشاہ کی ماں تھی، اور ہر حیثیت سے ملکی معاملات میں دخیل تھی، اسی لئے اس کا مقبرہ بھی شاہی مقبروں کے برابر بنایا گیا ہے۔ اس کا نقشہ بالکل وہی ہے جو اس کے شوہر سلطان محمد قطب شاہ کے مقبرہ کا ہے۔ اس کا گنبد بھی دوہرا ہے، یہ مقبرہ شاہانہ عظمت و شان رکھتا ہے۔

اس شاہی قبرستان میں پچیس مسجدیں ہیں۔ بعض ایک دوسرے سے چند گز کے فاصلے پر ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں اتنی مسجدیں بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یہ سب غیر آباد ہیں۔ ان میں سب سے بڑی اور خوبصورت مسجد حیات بخشی بیگم کی مسجد کلاں ہے جو اس کے مقبرے سے متصل ہے۔ اس عمارت سے اس کے تعمیری ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ پوری عمارت پر اعلیٰ قسم کی استرکاری ہے۔ اس میں پانچ در کا دالان در دالان ہے۔ منڈیر پر خوبصورت کنگورے ہیں جن میں پانچ گلدستے ہیں۔ دونوں پہلوؤں پر دو بلند مینار ہیں جن کی برجیوں کے نیچے کنول کی پتیاں اور اننا سس بنے ہوئے ہیں۔ روکار پر ہندسی اشکال اور جالیاں ہیں۔ بیرونی محرابوں پر خوبصورت بیل بوٹے اور زنجیرے بنے ہوئے ہیں۔ روکار کی آرائش، میناروں کی گولائی اور محرابوں کے بانکپن سے رعنائی پیدا ہوگئی ہے۔ یہ عمارت اس قدر پاکیزہ ہے کہ اس میں زنانہ حُسن پیدا ہوگیا ہے۔ چاندنی رات کی خاموشی میں اگر اس کو

دیکھتے ہیں تو قلب پر خاص کیفیت طاری ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ حیات بخشی بیگم نورانی پوشاک پہنے کھڑی ہے۔

ساتواں بادشاہ عبداللہ قطب شاہ تھا۔ اس کا مقبرہ بہت بڑا ہے، دو منزلہ عمارت ہے اگنبد بھی دوہرا ہے، مگر نشیب میں واقع ہے جس سے اس کی عظمت میں فرق آگیا ہے۔ اس عظیم الشان عمارت میں تناسب اور موزونی کی کمی ہے کرسی نیچی ہے، چبوترہ بھی وسیع نہیں۔ اس بلند عمارت کے لئے بہت وسیع اور بلند چبوترے کی ضرورت تھی۔ برجیاں اتنی چھوٹی ہیں کہ کھلونا معلوم ہوتی ہیں۔ اگر اس کی جگہ بلند مینار ہوتے تو عمارت میں بڑی شان پیدا ہو جاتی۔

ابوالحسن تاناشاہ اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا۔ اس نے بھی اپنے پیش روؤں کی طرح مقبرہ بنوانا شروع کیا تھا مگر ابھی گنبد نہیں بنا تھا کہ اس کی حکومت ختم ہوگئی۔ اس بدنصیب کے آخری ایام قلعۂ دولت آباد کے چینی محل میں بسر ہوئے اور وہیں انتقال ہوا۔ اس کی قبر خلد آباد (ضلع اورنگ آباد) میں موجود ہے۔

یہ قطب شاہی قبرستان آج کل ویران ہے، مگر اس نے ایسے اچھے دن دیکھے ہیں کہ ہندوستان کے کسی شاہی قبرستان کو نصیب نہیں ہوئے۔ قبر کوئی اچھی چیز نہیں ہوتی اور جہاں بہت سی قبریں ہوں وہاں ایک قسم کی اداسی اور افسردگی چھائی ہوتی ہے، لیکن اس قبرستان کی خاموش فضا میں دہشت پیدا نہیں ہوتی۔ یہاں اب بھی عظمت اور شان باقی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں ایک قسم کی پاکیزگی اور روحانیت پیدا ہوتی ہے اور زائر جب یہاں داخل ہوتا ہے تو یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ کسی مقدس جگہ آگیا ہے اور یہی ان مقبروں کا مقصد تھا۔

محی الدین احمد

قطب شاہی بادشاہوں کے رفاہی کام

پچھلے زمانے کے بادشاہوں کے حالات معلوم کرنے کے بہت سے ذریعے ہیں۔ تاریخوں میں ان کے حالات ملتے ہیں۔ بعض روایات قصے کہانیوں سے بھی ان کے حالات پر روشنی پڑتی ہے لیکن تاریخوں میں بعض باتیں ایسی بھی آجاتی ہیں کہ کوئی صحیح رائے قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ابھی کچھ ہی دنوں کی بات ہے کہ محمدؐ قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے معاشقہ کے افسانے کو کسی نے صحیح قرار دیا تو کسی نے غلط۔ لیکن ان کتب تواریخ اور افسانوں کے سوا ایک اور ذریعہ بھی ہے جس سے ان بادشاہوں پر روشنی پڑتی ہے اور ان سے صحیح حالات کا اندازہ ہو سکتا ہے، اور وہ ہے ان کے زمانے کی تعمیرات اور خصوصاً وہ کام جو رفاہ عامہ سے متعلق ہیں ؎

ہر کسے افتادہ ہیچ خشت در ویرانہ	ہست فردِ دفترِ احوالِ صاحب خانہ

اور یہی چیزیں ان کو یاد دلانے اور انھیں زندہ جاوید رکھنے میں بہت زیادہ کام آتی ہے۔ جب تک ہمارا شہر حیدرآباد اور اس میں چارمینار کی سربہ فلک عمارت کھڑی ہے ہم سلطان محمدؐ قلی قطب شاہ کو بھول نہیں سکتے۔ جب تک ہم پرانے پُل پر سے گذرتے رہیں گے، یا حسین ساگر کے تالاب کی تفریح کرتے رہیں گے، ابراہیم قلی قطب شاہ کو ضرور یاد کریں گے، اور جب تک مکہ مسجد میں نماز ادا کرتے رہیں گے سلطان محمدؐ قطب شاہ کی یاد بھی تازہ رہے گی۔

شاہانِ ایران میں سے شاہ طہماسپ صفوی کہا کرتا تھا کہ "شاہانِ ہندوستان شاہی نہیں بلکہ خدائی کرتے ہیں" اگر وہ اس کے اسباب و وجوہ پر غور کرتا ہوتا تو اس کو معلوم ہوتا کہ شاہانِ ہند اپنی رعایا پر اس قدر شفقت کرتے تھے کہ ان کی آسایش پر اپنی آسایش قربان کر دیتے تھے۔ اس کے فائدہ کا ہر وہ کام کرتے جو اس کے لئے ضروری ہوتا۔ انھوں نے خود اپنے رہنے کے مکانات و محلات اس قدر پائدار نہیں بنائے جس قدر رعایا کے فائدہ کی تعمیرات مستحکم و مضبوط بنیادوں پر تعمیر کرائیں، ورنہ آج ابراہیم قلی قطب شاہ کا بنوایا ہوا اگلن محل باقی رہتا نہ سجن محل، لیکن اسی ابراہیم قلی قطب شاہ کا تعمیر کردہ پُرانا پُل آج بھی جوں کا توں کھڑا ہوا ہے۔ اسی طرح سلطان محمدؐ قلی قطب شاہ کے دولت خانۂ عالی کے محلات اور ابوالحسن تاناشاہ کا چار محل تو باقی نہیں لیکن اسی سلطان محمدؐ قلی قطب شاہ کا بنوایا ہوا دار الشفاء گو بوسیدہ حالت ہی میں سہی ابھی تک موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رعایا بھی بادشاہ پر جان فدا کرتی تھی۔

اس تمہید کے بعد قطب شاہی بادشاہوں کے چند ایسے کارنامے پیش کئے جاتے ہیں جن کا تعلق رفاہ عامہ سے ہے۔

شہنشاہ اورنگ زیب نے دکن اور خصوصاً سلطنتِ گولکنڈہ کے حالات پر مشتمل جو رپورٹ اپنے باپ شاہ جہاں کو لکھی تھی اس میں وہ لکھتا ہے کہ: "سرزمینِ دکن کی ایک چپہ بھر زمین بھی بے کار نہیں ہے اور یہاں کی زمینیں بے حد زرخیز ہیں"۔ زمین کی زرخیزی کی اصل وجہ یہ تھی کہ یہاں کا نظام آب پاشی نہایت مکمل اور منظم تھا۔ جب تک کاکتیا خاندان یہاں برسرِ حکومت رہا انھوں نے اس جانب خاص توجہ کی۔ چنانچہ ورنگل کے بڑے بڑے تالاب مثلاً پاکھال۔ رامپا، اور لکھناورم کے تالاب انھی کی یادگار ہیں۔ ان کے بعد قطب شاہوں نے اس پروگرام کو بہت توسیع دی اور اس کثرت سے تالاب بنوائے کہ یہاں کی زیادہ تر زمینوں میں تری کی کاشت ہونے لگی۔ چنانچہ سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ کے زمانے میں جو بڑے بڑے تالاب بنے وہ یہ ہیں:۔ (۱) حسین ساگر (۲) تالاب ابراہیم پٹن (۳) درک کا تالاب (۴) قصبۂ کویل کنڈہ ضلع محبوب نگر کا تالاب۔ ان میں درک کے تالاب سے زراعتی اغراض کے سوا آب نوشی کا بھی کام لیا جاتا تھا۔ اس تالاب سے ایک نہر نکالی گئی تھی جو قلعہ کے بالا حصار تک جاتی تھی، پھر وہاں سے اس کی شاخیں شاہی محلات اور شہر کے عوام کے لئے مختلف حصوں تک پہنچائی گئی تھیں۔ ان تالابوں کی تیاری کے سلسلے میں یہ بتلانا بھی مناسب ہوگا کہ تالاب حسین ساگر اور ابراہیم ساگر کس طرح بنے۔ تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت خواجہ حسین شاہ صاحب ولیؒ، جو حضرت خواجہ گیسو درازؒ حسینی کی اولاد سے تھے وہ اسی بادشاہ کے عہدِ حکومت میں گولکنڈہ آئے تھے، بادشاہ ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا، اور ان کو دس ہزاری منصب اور محکمۂ تعمیرات کی وزارت سرفراز کی اور اپنی دختر خیرت النساء بیگم کی شادی ان سے کردی۔ شہزادی کے جہیز میں جو گاؤں جاگیر میں دیئے گئے تھے ان میں خیرت آباد بھی تھا۔ اس جگہ شہزادی کے حکم سے ایک مسجد تعمیر کی گئی، جب مسجد بن چکی تو ایک دن بادشاہ اس کے معائنہ کو تشریف لائے۔ مسجد سے کچھ ہی فاصلہ پر ایک چھوٹا سا کنٹہ نظر آیا، بادشاہ نے چاہا کہ اس کو ایک بڑا تالاب بنادیا جائے۔ چنانچہ بادشاہ کے داماد خواجہ حسین شاہ صاحب ولیؒ نے اس کام کا ذمہ لیا، اور ۱۵۴۸ء میں تالاب مکمل ہوگیا۔ چونکہ تالاب بہت بڑا بنایا گیا تھا، اور اس میں آبپاری کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، بارش کا پانی اس کو بھرنے کے لئے کافی نہیں ہوتا تھا، اس لئے بادشاہ کی خواہش پر نیک نام خاں نامی ایک امیر نے گنڈی پیٹ سے چار میل آگے قصبۂ معین آباد کے قریب سے موسیٰ ندی کو روک کر ایک نہر نکالی اور اس کا پانی تالاب میں پہنچایا۔ جب تالاب مکمل ہوچکا تو بادشاہ اس کے ملاحظہ کے لئے آئے۔ چونکہ یہ تالاب خواجہ حسین شاہ صاحب ولیؒ کے زیرِ اہتمام تیار ہوا تھا اس لئے عوام میں اس کا نام حسین ساگر یا حسین شاہ چرو ہوگیا، پھر جب بادشاہ کو معلوم ہوا کہ یہ تالاب اس کے نام سے موسوم نہ ہوسکا تو اس نے ایک دوسرا تالاب اپنے آباد کئے ہوئے قصبہ ابراہیم پٹن میں کسی دوسرے امیر کے ذریعہ بنوایا۔ یہ تالاب ابراہیم ساگر بالکل حسین ساگر کے نمونہ پر تعمیر ہوا ہے اور اتنا ہی بڑا ہے۔ قصبۂ کویل کنڈہ ضلع محبوب نگر میں بھی ایک

تالاب اسی بادشاہ کا بنوایا ہوا ہے۔

جس زمانے میں گولکنڈے پر جمشید قلی قطب شاہ حکمران تھا اس وقت سلطان ابراہیم قطب شاہ اس کے خوف سے بیجانگر کے راجہ کے پاس پناہ گزیں تھا۔ جمشید کے مرنے کے بعد یہاں تخت نشینی میں بہت سے جھگڑے پیدا ہوگئے۔ اس وقت قصبۂ کویل کنڈہ کے نایک داڑیوں نے سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ کے پاس عرائض بھیجے کہ وہ فوری گولکنڈہ آجائے تو اس کو مسند نشین کرنے میں وہ اس کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ وہ بیجانگر سے روانہ ہوکر قلعۂ کویل کنڈہ پہنچا اور یہاں مستقر رکھ کر فوجی استحکام کی تدبیر کرتا رہا۔ اسی دوران میں اس نے قصبۂ کویل کنڈہ سے بہ جانب مغرب ایک قصبہ ابراہیم پور آباد کرکے اس میں ایک مسجد بنوائی، اور قصبۂ کویل کنڈہ میں ایک جامع مسجد تعمیر کی جانب شمال قلعہ سے ایک میل کے فاصلے پر ایک ستون پر تلنگی زبان میں ایک کتبہ لگا ہوا ہے اس میں یہ سب امور درج ہیں۔ قصبۂ نرساپور تعلقۂ میدک میں بھی اسی بادشاہ کا بنوایا ہوا ایک تالاب موجود ہے۔

بعض لوگوں کا بیان ہے کہ پٹن چیرو کا بڑا تالاب بھی اسی بادشاہ کا بنوایا ہوا ہے، لیکن اس کی کوئی تاریخی شہادت مجھے نہ مل سکی۔ قرائینی شہادت میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قصبہ میں اسی بادشاہ کے عہد کا ایک کتبہ ایک درگاہ پر لگا ہوا ہے جس سے پایا جاتا ہے کہ ابراہیم قطب شاہ کے دربار کے ایک امیر عبدالقادر امین خاں جو دبیرِ مملکت تھے اسی قصبہ کے باشندے تھے، ان کے مرشد شاہ محی الدین ابو محمد سید عبدالقادر حسینی کا گنبد اسی بادشاہ کے عہد میں تعمیر ہوا تھا۔ ان ہی عبدالقادر کی مدح میں ایک قصیدہ ایک تلنگی شاعر نے لکھا ہے جس میں ذکر ہے کہ ان کے اہتمام سے ایک بہت بڑا تالاب بنایا گیا تھا۔ اس اعتبار سے ممکن ہے کہ یہ تالاب بھی ابراہیم قطب شاہ کے حکم ہی سے بنایا گیا ہو۔ بہرحال یہ قیاس ہے، یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

ابراہیم قلی قطب شاہ کے بعد سلطان محمد قلی قطب شاہ نے موضع جل پلی میں ایک بڑا تالاب بنوایا تھا، اس سے شہرِ حیدرآباد کی آب رسانی کا کام لیا جاتا تھا۔ چارمینار پر ایک خزانۂ آب تیار کیا جاکر اس میں جل پلی کے تالاب سے نہر کے ذریعہ پانی لایا جاتا تھا، یہاں سے چھوٹی چھوٹی نہروں کے ذریعہ سے شاہی محلات اور شہر کے دیگر محلوں میں پانی دیا جاتا تھا۔ اسی سلطان محمد قلی قطب شاہ کی بیٹی حیات بخشی بیگم کا بنوایا ہوا تالاب موضع نرسا پا محال تعلقۂ شرقی میں واقع ہے جو ماں صاحب کے تالاب کے نام سے موسوم ہے۔ قطب شاہی خاندان میں خانم آغا محل مرزا محمد امین جو سلطان محمد قطب شاہ کی والدہ اور حیات بخشی بیگم کی ساس تھیں، انھوں نے بھی ایک تالاب بنوایا تھا جو شہرِ حیدرآباد میں رسالۂ حبوش کے پاس واقع ہے اور یہ بھی ماں صاحب کا تالاب کہلاتا ہے، اس لئے اس میں ابہام ہوتا ہے اور لوگ اس کو بھی حیات بخشی بیگم کا بنایا ہوا سمجھتے ہیں، لیکن اس تالاب پر جو کتبہ لگا ہوا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تالاب خانم آغا نے بنوایا تھا۔

بادشاہوں کے ایسے رفاہی کاموں کو دیکھ کر یہاں کے اکثر امرائے بھی تالاب بنوائے ہیں، چنانچہ قطب شاہی دربار کے

ایک امیر میر صاحب نے ایک تالاب بنوایا ہے جو سلطان شاہی میں واقع ہے اور اب خشک ہو گیا ہے اور میر محمد مومن استرآبادی پیشوائے سلطنت کا تعمیر کردہ تالاب قصبہ راؤ ریال قریب پہاڑی بابا شرف الدین صاحبؒ میں موجود ہے۔ یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اس موقع پر میں نے صرف ان ہی تالابوں کا ذکر کیا ہے جو بڑے بڑے اور قابلِ ذکر تھے۔ ان کے سوا چھوٹے چھوٹے تالاب اور کنٹے جو دیہاتوں کی آب پاشی کے اغراض سے قطب شاہی دور میں تعمیر ہوئے ہیں ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے۔ ان تالابوں کی وجہ ملک کی ہزار ہا ایکڑ اراضی زیرِ کاشت آگئی تھی اور سلطنت سے قحط کا نام و نشان تک مٹ گیا تھا۔ اگر احیاناً امساکِ باراں کی وجہ قحط کی صورت پیدا ہو جاتی تو دوسری طرف کا فاضل غلّہ وہاں بھیج کر اس کا انسداد کر دیا جاتا تھا۔

تالابوں کے بعد دیگر رفاہِ عامہ کے کاموں میں پلوں، سڑکوں اور سرائے وغیرہ کی تعمیر ہے۔ قطب شاہی دور میں ان چیزوں پر بھی خاص توجہ دی گئی ہے۔ چنانچہ پرانا پل، ابراہیم قطب شاہ کے حکم سے تعمیر ہوا ہے اس کی تعمیر ۹۸۱ھ میں شروع ہوئی تھی۔ بنائے پل کی تاریخ ہے (صراط المستقیم) ۹۸۱ھ اور تکمیل ۹۸۶ھ میں ہوئی جس کی تاریخ ہے ؎

ازین سبب شدہ تاریخ او۔ گذر گہ با
۹۸۶ھ

اس شاعر کو جس نے یہ تاریخ لکھی، بادشاہ نے پانچ سو اشرفی انعام سرفراز فرمایا تھا۔ اس پل کی بناء کی نسبت بعض کتب تواریخ میں جو واقعہ درج ہے وہ ایک افسانوی رنگ لئے ہوئے ہے اور بہت مشہور ہو گیا ہے جو یہ ہے کہ ایک بار شہزادہ سلطان محمد قلی قطب شاہ بھاگ متی سے ملنے ندی پار کرنا چاہتا تھا لیکن طغیانی کی وجہ ندی چڑھاؤ پر تھی اور ہاتھی ندی میں نہ جا سکا، اس لئے شہزادہ بھر پور ندی میں گھوڑا ڈالا اور پار ہو گیا۔ جب بادشاہ کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے ندی پر پل بنا دینے کا حکم دیا اور پل تعمیر ہو گیا۔ لیکن ایک چھوٹے سے واقعہ کو وجہ پل کی تعمیر ہونا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس واقعہ کے سوا کچھ اور بھی اسباب ہوں، کیونکہ اسی بادشاہ کے عہدِ حکومت میں مواضعات گمن اتکور اور پیٹیاں میں ہیرے کی کانیں برآمد ہوئی تھیں جو ضلع نلگنڈہ میں وادیٔ کرشنا میں واقع ہیں۔ ان کانوں سے دفعتاً اس قدر ہیرے برآمد ہوئے کہ گولکنڈہ دنیا بھر میں ہیروں کی سب سے بڑی منڈی بن گیا، جن کی خرید و فروخت کے لئے دیگر ممالک کے تجار گولکنڈہ آنے لگے۔ ان میں سے جو قافلے جنوب کی طرف سے ساحلِ مالابار۔ مچھلی بندر وغیرہ کی طرف سے آتے ان کو گولکنڈہ آنے کے لئے موسیٰ ندی کو عبور کرنا پڑتا۔ یہ ندی موسمِ سرما و گرما میں تو پایاب رہتی لیکن بارش کے موسم میں اس میں سے گزرنا دشوار ہو جاتا، اور ندی اترنے کے انتظار میں قافلوں کو کئی کئی دنوں تک ٹھیرے رہنا پڑتا۔ دوسری طرف ان کانوں کی دیکھ بھال اور دیگر سرکاری کاموں کے لئے سرکاری افسران و عملۂ شاہی کا بھی آنا جانا ہوتا، اس لئے ان ہی سہولتوں کے مدِ نظر یہ پل بنوایا گیا ہے۔ اس پل کی تعمیر کے ساتھ ہی کاروان سرائے بھی تعمیر ہوئی ہے جو قلعۂ گولکنڈہ اور پرانے پل کے درمیان واقع ہے۔ یہ بہت

عظیم الشان سرائے تھی اور سڑک کے دونوں جانب بنائی گئی تھی جس میں (۲۵۰) کمرے تھے اور جس میں جملہ آسائش ہوتی تھیں موجود تھیں۔ اس سرائے کے ساتھ ایک بہت بڑی مسجد بھی تعمیر کی گئی جو ابھی تک اچھی حالت میں ہے۔ اس کے صحن میں ایک مدرسہ بھی بنایا گیا تھا اس کے آثار ابھی تک نظر آتے ہیں۔ شاہانِ قطبیہ کے زمانے میں مساجد بھی بہت بنائے گئے۔ یہاں اتنی زیادہ مسجدیں ہیں کہ اگر حیدرآباد کو مدینۃ المساجد یعنے مسجدوں کا شہر کہا جائے تو بجا ہوگا۔ صرف قطب شاہی گنبدوں کے اطراف کم و بیش ایک مربع میل کے رقبہ میں (۲۶) مساجد ہیں جو سب کی سب قطب شاہی دور کی ہیں۔ ان میں سے بعض مساجد ایک دوسرے سے صرف چند گز کے فاصلہ پر بنی ہوئی ہیں لیکن بڑی بڑی اور قابلِ ذکر مسجدوں میں مسجدِ صفا ہے جو قلعۂ گولکنڈہ میں واقع ہے جس کو بانئ خاندان قطب شاہی سلطان قلی قطب شاہ نے تعمیر کیا تھا۔ ابراہیم قلی قطب شاہ کی تعمیر کردہ مسجد کاروان کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے تعمیر شہر حیدرآباد کے وقت جامع مسجد کی تعمیر کی جو قطب شاہی طرزِ تعمیر کا ایک نہایت ہی عمدہ نمونہ ہے۔ اس مسجد کے ساتھ ایک حمام بھی تھا جو مسجد سے متعلق تھا لیکن افسوس ہے کہ یہ حمام مرزا اسمٰعیل کے ذوقِ انہدام کی نذر ہو گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس مسجد و حمام پر جو کتبہ لگا ہوا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ وقت سلطان محمد قلی قطب شاہ نے ملک امین الملک نامی ایک وزیر کے زیر اہتمام اس مسجد و حمام کی تعمیر کروائی تھی اور اس کو منہدم کرنے والے وزیر حکومت آصفیہ کا خطاب بھی اتفاق سے امین الملک ہی تھا۔

سلطان محمد قطب شاہ کی تعمیر کردہ مکہ مسجد اس قدر مشہور ہے کہ اس پر کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ کے زمانے میں بھی مساجد تعمیر ہوئی ہیں لیکن وہ چنداں لائقِ ذکر نہیں البتہ عبداللہ قطب شاہ کے میر عمارات موسیٰ خاں کی بنوائی ہوئی ٹولی مسجد اپنی حُسن کاری اور خوب صورتی میں لاثانی ہے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے چارمینار کی تعمیر کے وقت اس کی چھت پر ایک بہت چھوٹی سی مسجد تعمیر کروائی تھی۔ قطب شاہی دور کی مساجد پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس میں ان کی طرزِ تعمیر اور آرائشی کام پر کافی روشنی پڑتی ہے اس لئے ان کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔

قطب شاہی دور میں مساجد کے ساتھ ساتھ منادر کی بھی تعمیر ہوئی ہے چنانچہ قلعۂ گولکنڈہ کے بالا حصار پر رام داس کا مندر قطب شاہی دور کی ہی تعمیر ہے۔ اس کے علاوہ شہر حیدرآباد ایک جدید آباد شدہ شہر ہے اس میں جس قدر پرانے منادر ہیں وہ اکثر اسی قطب شاہی زمانے کے تعمیر کردہ ہیں۔ قطب شاہوں نے منادر کو معاش بھی دی ہے چنانچہ بعد راچلم کی مشہور دیول کو جاگیر دی تھی جو آصفیہ عہد میں بھی باقی تھی۔

قطب شاہی دور کی تعمیرات میں شاہی عاشور خانہ کی تعمیر کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔ یہ زمانۂ سلطان محمد قلی قطب شاہ سنہ ۱۰۰۰ھ میں ایک بار شہر حیدرآباد میں ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی تھی اس پر بادشاہ نے نذر مانی کہ یہ وبا دفع ہو جائے تو وہ عاشور خانہ تعمیر کرے گا۔ چنانچہ وبا ختم ہو جانے کے بعد ہی بادشاہ نے یہ عاشور خانہ تعمیر کروایا اور اس میں

چودہ علم چودہ معصومینؑ کے نام کے استادہ کئے، اس کے بعد سلطان عبد اللہ قطب شاہ نے سنہ [illegible]ھ میں اس میں کچھ آرائش کا کام اور چینی کی نقاشی وغیرہ کروائی اور چند علم بھی اس میں اضافہ کئے۔ قطب شاہی دور میں چند اور بھی عاشور خانے تعمیر ہوئے ہیں لیکن وہ چنداں قابل ذکر نہیں۔

قطب شاہی دور کے رفاہِ عامہ کے کاموں میں سب سے زیادہ اہم اور لائق ذکر علوم و فنون کی سرپرستی اور اشاعتِ علم کا کام ہے اس مقصد میں شاہانِ گولکنڈہ نے خاص دلچسپی لی ہے۔ قطب شاہی دور میں نظامِ تعلیم وہی تھا جو دیگر بلادِ مشرقی میں رائج تھا، وہ یہ کہ علماء و مدرسین کو کچھ زمین بطور مدد معاش دے دی جاتی، یا نقد رقم بطور تنخواہ ماہانہ، یا سالانہ دی جاتی اور وہ اپنے اپنے گھروں میں، یا محلہ کی مسجد، یا مندر جیسی صورت ہو، بیٹھ کر طلبہ کو پڑھایا کرتے۔ اگرچہ قطب شاہی دور میں کوئی عمارت مدرسہ کے نام سے تعمیر نہیں ہوئی جیسے بیدر کا محمود گاواں کا مدرسہ یا بغداد کا مدرسہ نظامیہ تھا لیکن اکثر مساجد میں حدودِ مسجد کے اندر ہی ایک حصہ مدرسہ کے نام سے تعبیر کر دیا کرتے تھے، چنانچہ قلعہ کی ہیرا مسجد اور کاروان سرائے کی مسجد میں ایسے مدرسے موجود تھے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی تعمیر کردہ جامع مسجد میں ایک بہت بڑا مدرسہ تعمیر کیا گیا تھا جو اب خانقاہ شجاعیہ کے نام سے موسوم ہے، اور چار مینار کی چھت پر جو چھوٹی سی مسجد ہے اس کے ساتھ بھی مدرسہ قایم کیا گیا تھا۔

سلطان محمدؐ قلی قطب شاہ کی دختر ملکہ حیات بخشی بیگم کو بھی علمی سرپرستی اور تعلیم و تعلم کا خاص شوق تھا، چنانچہ اس ملکہ نے جو قصبہ حیات نگر اپنے نام پر آباد کیا ہے اس میں ایک بہت بڑی جامع مسجد تعمیر کی، اس کے صحن میں ایک بہت بڑا مدرسہ بنوایا تھا، جو اب تک بھی بہت اچھی حالت میں ہے۔ اس مدرسہ میں (۱۲۵) کمرے ہیں جن میں طلبہ رہتے تھے گویا یہ ایک اقامتی درسگاہ تھی، اس مدرسہ میں جو طلبہ زیر تعلیم تھے ان کے اخراجات تعلیم و خوراک پر ماہانہ دو سو ہون صرف ہوتے تھے جو ملکہ کی جیب خاص سے ادا کئے جاتے تھے اور اس مدرسہ کی نگرانی اور انتظام پیشوائے سلطنت میر محمدؐ مومن استرآبادی کے سپرد تھا جو خود بھی بڑے جید عالم تھے! اس ملکہ کو تعلیم و تعلم کا یہاں تک شوق تھا کہ اس نے اپنی پروردہ کنیزوں اور غلاموں کو تک جاہل نہیں رہنے دیا چنانچہ ملکہ کے غلام ملک خوشنود۔ ملک الماس اور ملک یوسف بڑے نامور گزرے ہیں، ان میں ملک خوشنود، ملکہ کی بیٹی خدیجہ سلطانہ کے جہیز میں دیا گیا تھا جس نے بیجاپور جا کر بڑا نام پیدا کیا۔ یہ نہ صرف ایک نازک خیال شاعر تھا بلکہ بڑا مدبّر اور سیاست داں بھی اور بارہا سلطنتِ بیجاپور کی طرف سے گولکنڈہ اور احمد نگر کے بادشاہوں کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا اور وہاں نہایت خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیئے تھے اسی طرح ملک الماس اور ملک یوسف بھی بڑے فاضل گزرے ہیں۔ ان غلاموں کو اس قابل بنانے کا سہرا ملکہ کے سر ہے۔

قصبہ جات اور دیہاتوں میں اکثر قاضیوں۔ آئمہ مساجد۔ علماء اور پنڈتوں کو جو زمین مدد معاش کے طور پر

دی گئی تھی ان میں اکثروں میں یہ شرط خدمت بھی تھی کہ وہ رعایا کے بچوں کو تعلیم دیں۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ قطب شاہی دور میں علم و ہنر کا چرچا عام ہوگیا تھا۔ چنانچہ اسی دور میں صدہا شاعر دکھنی تلنگی اور فارسی کے پیدا ہوئے، صدہا کتب تصنیف ہوئیں جن میں برہان قاطع فارسی زبان کی پہلی لغت ہندوستان میں لکھی گئی ہے بہت مشہور ہے۔ اس کے بعد جو عمارت قابلِ ذکر ہے وہ دارالشفاء ہے۔ یہ عمارت سنہ ۱۰۰۴ھ میں تعمیر ہوئی ہے۔ اوپر لکھا جاچکا ہے کہ سنہ ۱۰۰۰ھ میں شہر میں وبائے ہیضہ پھوٹ پڑی تھی، اس میں بادشاہ کو اطلاع ملی کہ اطباء حاذق کی کمی اور غیر مستند اطباء و معالجین کی وجہ بیشتر انسانی جانیں تلف ہوئی ہیں تو اس نے ستر ہزار روپے کی لاگت سے ایک بڑا شفاخانہ تعمیر کروایا جس میں دو شعبے تھے، مقیم مریض اور غیر مقیم مریض (ان پیشنٹ اور آؤٹ پیشنٹ) غیر مقیم مریضوں کو دوا مفت دی جاتی تھی اور مقیم مریضوں کو دوا اور غذا ملتی تھی۔ اس کے سوا بیماروں کی سہولت کا ہر قسم کا انتظام تھا۔ یہ شفاخانہ موسیٰ ندی کے کنارے جہاں کی آب و ہوا نہایت معتدل و خوشگوار تھی بنایا گیا تھا۔ اس میں ایران، مصر وغیرہ سے حاذق اطباء بلائے جاکر متعین کئے گئے تھے جن میں بعض امراض کے ماہر خصوصی اطباء بھی شامل تھے اور حکومت کی طرف سے ان کو جاگیر اور مناصب سرفراز ہوئے تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ شفاخانہ قطب شاہی حکومت کے خاتمہ تک اسی طرح قائم تھا بسقوط سلطنت قطب شاہی کے بعد صوبہ داران سلطنتِ مغلیہ نے اس کو بند کردیا تھا۔ اس کے بعد آصف جاہوں نے اس کو دوبارہ جاری کیا لیکن اس میں مقیم مریضوں کا انتظام نہیں تھا، صرف بیماروں کو دوا مفت دی جاتی تھی۔ عبداللہ قطب شاہ کے دور میں آغا محسن نامی ایک ایرانی حضرت امام زین العابدینؑ کے طوق کا ایک ٹکڑا لایا جس کو ایک علم میں پیوست کرکے اس دارالشفاء کے ایک علیحدہ حصے میں رکھا گیا تاکہ علم کی برکت سے مریضوں کو شفاء عاجلانہ نصیب ہو۔ اس علم کے عود و گل کے لئے یومیہ دو ہون مقرر کئے گئے تھے، چنانچہ عبداللہ قطب شاہ کی عطا کردہ سند ابھی تک عاشور خانہ سرطوق میں موجود ہے۔ قطب شاہی بادشاہوں کے رفاہِ عامہ کے کاموں کا یہ ایک اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ ان بادشاہوں کے مفادِ عامہ کے کام اس کثرت سے ہیں کہ اگر ان کی تفصیل لکھی جائے تو ایک کتاب بن جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ اپنے آپ کو ایرانی النسل نہیں بلکہ آندھرائی سمجھتے تھے اور اپنی رعایا کو رعایا نہیں بلکہ اپنی اولاد یا افرادِ خاندان تصور کرتے تھے۔ اس کے جواب میں رعایا بھی ان کو بادشاہ نہیں بلکہ دیوتا تصور کرتی تھی، ورنہ اسی ہندوستان میں بہت سے مسلمان خاندان برسرِ حکومت رہے ان میں آج تک کسی کی بھی یاد نہیں منائی گئی۔ اس کے برخلاف قطب شاہیوں کی یاد ابھی تک باقی ہے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کہے ہوئے تلنگی زبان کے گیت ابھی تک یہاں کے دیہاتوں میں گائے جاتے ہیں جن کو میں نے خود سنا ہے۔ شادی بیاہ کی تقاریب میں اسی سلطان کے لکھے ہوئے دکھنی زبان کے گیت جلوہ کی رسم کے وقت میراثنیں گاتی ہیں جو عام طور پر اب بھی سنے جاسکتے ہیں۔ غرض کہ اب نہ قطب شاہ باقی رہے اور نہ قطب شاہی اور نہ اُن کا سکہ بازاروں میں چلتا ہے لیکن اپنی محبت، خلوص، شفقت اور رعایا پروری کا جو سکہ انھوں نے اپنی رعایا کے دلوں پر نقش کیا تھا وہ ابھی تک چل رہا ہے۔

میر سراج الدین علی خاں

قطب شاہی سلاطین کی رواداری

حقیقت یہ ہے کہ اکبر اعظم کی طرح قطب شاہی سلاطین نے بھی علم پروری، مذہبی رواداری اور انصاف پروری کی ایسی مثالیں پیش کی ہیں جو تاریخ ہند کے زرین باب تصور کئے جاتے ہیں۔ قطب شاہی سلاطین کی نیک نامی، شہرت اور کامیابی کا راز اُن کی وہ طرزِ حکمرانی تھی جس کی بہ دولت اُن کی رعایا کا ہر طبقہ مطمئن تھا، اور آرام و آسایش میں زندگی بسر کر رہا تھا۔

قطب شاہی سلاطین کا اہم کارنامہ اکثریتی فرقے کی زبان تلگو کی سرپرستی ہے۔ چونکہ ان سلاطین نے تلنگانے کو اپنا وطن بنا لیا تھا، اس لئے تلگو زبان کو وہ اپنی زبان تصور کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ قطب شاہی عہد کو اگر تلگو زبان کا دورِ زرین کہا جائے تو نا واجبی نہیں۔ چنانچہ ابراہیم قطب شاہ تلگو زبان کا ماہر اور سرپرست تھا۔ گولکنڈہ اس کے عہد میں تلگو ادب کا مرکز بن گیا تھا۔ اس کے دربار میں تلگو زبان کے شعرا اور ادیب ہمیشہ جمع رہتے تھے۔ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں دو اہم تلگو کتابیں تصنیف ہوئی ہیں، ایک "تپانی سمہ ورانم" مصنفہ "اڈانکی گنگا دھرا" اور دوسری "یایاتی چرترم" مصنفہ "پونی کنٹی تلاگنا ریا"۔ پہلی کتاب ابراہیم قطب شاہ کے نام سے معنون ہوئی اور دوسری کتاب امین خاں کے نام سے جو اس کے درباری امیر تھے۔ یہ دونوں کتابیں تلگو زبان کی شاہکار تصور کی جاتی ہیں۔

ابراہیم قطب شاہ کا جانشین محمد قلی قطب شاہ بھی تلگو زبان کا سرپرست تھا۔ وہ تلگو زبان کا شاعر تھا، اور اس کے دربار میں تلگو شعرا جمع رہتے تھے۔ چنانچہ تلگو کے مشہور شاعر "سارنگو تمایا" اپنی مشہور نظم "دیجایانتی وِلاسم" میں بیان کرتا ہے کہ "اسے محمد قلی قطب شاہ کی ہم نشینی کا شرف حاصل تھا۔ وہ وقت بے وقت اُسے گفتگو کے لئے بلایا کرتا تھا"۔ محمد قلی قطب شاہ نے "تپا منیا سوما یاجی" کو مملکت تلنگ کا ملک الشعرا نامزد کیا تھا، اور "گنیش پنڈیتولو" کو قطب شاہی سلطنت کا "سمستھان پنڈیتولو" یا قطب شاہی سلطنت کا صدر پنڈت مقرر کیا تھا۔ تلگو ادب کا ایک دوسرا سرپرست "کامی ریڈی" بادشاہ کی طرف سے پالکی، چتر، مورچل اور دیگر جواہر سے سرفراز ہوا تھا۔ کامی ریڈی کے خاندان کے ایک فرد "ملا ریڈی" نے دو کتابیں "شیو دھرموترمو" اور "پدما پرانمو" لکھی ہیں، جو

تلگو ادب کی اہم تصانیف تصور کی جاتی ہیں۔

عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں بھی تلگو زبان کی سرپرستی ہوئی۔ اس کے دربار میں تلگو شاعری کا چرچا تھا، اور بادشاہ اُس سے دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کے دربار میں تلگو شعراء میں مسابقت اور فنِ موسیقی کے مقابلے ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ تلگو زبان کے مشہور موسیقار "پاگایا کاراشی نمرایا" نے فنِ موسیقی کے مقابلے میں بادشاہ سے کثیر رقم بطور انعام حاصل کی۔ اس فنکار نے جو شاعر بھی تھا اپنی ایک نظم میں عبداللہ قطب شاہ کی علمی سرپرستی کی بڑی تعریف و توصیف کی۔

ابوالحسن تانا شاہ بھی تلگو زبان کا سرپرست تھا۔ اس کے عہد میں مسلمان تلگو اور سنسکرت کی تعلیم حاصل کرتے تھے، چنانچہ ابوالحسن کے مرشد شاہ راجو کے فرزند شاہ اکبر نے تلگو کتاب "النکار اسا سنگرا" موسوم بہ "سرنگارا منجری" مصنفہ شاعر "رنگا سائی" کا سنسکرت میں ترجمہ کیا تھا۔

قطب شاہی سلاطین نے تلگو زبان و ادب کی نہ صرف سرپرستی کی بلکہ سرکاری زبان فارسی کے ساتھ تلگو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت دے دی تھی، چنانچہ دیہی نظم و نسق تلگو زبان پر قائم تھا، اور حتیٰ اس کہ فرامین و احکام تلگو میں بھی جاری ہوتے تھے، چنانچہ ایسے فرامین موجود ہیں جن میں فرمان کی عبارت فارسی اور تلگو دونوں میں درج ہے۔ ابوالحسن تانا شاہ کے عہد کا اکنا اور مادنا کا مجریہ حکم نامہ تلگو زبان میں ہے، اس حکم نامہ کے ذریعہ "کاجرلہ" میں پاپا ریڈی کی جو زمینات تھیں وہ دیساجی بھاناجی پنتلو کے نام عطا کی گئیں اور زمینات مذکور کے معاوضہ میں پاپاریڈی کو دوسری زمینات جو "سنگا سمدرم" میں واقع ہیں دی گئیں۔

تلگو کو جو دوسری سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، اُس کا ثبوت اس سے بھی بخوبی مل سکتا ہے کہ قلعہ گولکنڈہ کے موسیٰ برج پر عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں سنہ ۱۰۶۶ھ میں جو کتبہ سرکاری طور پر نصب کیا گیا تھا اس کی عبارت فارسی اور تلگو دونوں زبانوں میں ہے۔

قطب شاہی سلاطین نے اپنی ہندو رعایا کو ملکی اور انتظامی معاملات، فوجی نظم و نسق میں مساوی حقوق دیئے تھے۔ ملک کے حکومتی نظم و نسق میں نایک واڑیوں اور موروثی ہندو زمینداروں کو اہم درجہ حاصل تھا۔ دیہی نظام انہیں کے ہاتھوں میں تھا۔ ہندو نہ صرف اضلاع کے گورنر تھے بلکہ تمام مستاجر جو اضلاع ٹھیکے پر لیتے تھے اور مال گزاری ادا کرتے تھے وہ سب کے سب ہندو ہوا کرتے تھے۔

محمد قلی قطب شاہ کے عمائدینِ سلطنت اور مقربانِ خاص میں اکثر ہندو تھے اور فہم و فراست کی بدولت بلند مرتبے حاصل کئے تھے۔ بادشاہ کو ان پر بڑا اعتماد تھا، چنانچہ اکثر ہندو راجاؤں اور باغیوں کے مقابلے میں وہ اپنے ہندو سرداروں ہی کو روانہ کیا کرتا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں جہاں ایک طرف میر مومن، مصطفیٰ خاں استرآبادی اور امین الملک نظر آتے ہیں وہاں دوسری طرف آسیراؤ، جگت راؤ، ماسری راؤ، سایا جی، دھرما راؤ اور بھانے راؤ

دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۰۰۳ھ میں آمیر راؤ نے محمد قلی قطب شاہ کے ہمراہ مسلور گ۔ نندیال۔ کلکور۔ کندی کوٹ اور پینکنڈہ کے معرکوں میں بڑی جواں مردی کا مظاہرہ کیا۔ آمیر راؤ ۱۰۰۳ھ سے ۱۰۲۰ھ تک مسلسل ۱۷ سال محمد قلی کی فوجوں کا سردار رہا اور ۱۰۱۹ھ میں سپہ سالار بنایا گیا۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا، چنانچہ مسلمان امرا مثلاً امجد الملک اور سید حیدر وغیرہ اس کے ماتحت تھے۔

اکنّا اور مادنّا پنگلی بھانوجہ پنتلو عامل ہنمکنڈہ کے فرزند تھے، عبد اللہ قطب شاہ کے عہد میں حیدرآباد آئے اور مرزا احمد سعید نے مادنّا کو صیغۂ حساب میں ملازم رکھ لیا۔ اس نے اپنی ذاتی قابلیت سے ترقی کر کے اعلیٰ خدمات حاصل کیے۔ ابو الحسن تانا شاہ کو مادنّا پر بڑا اعتماد تھا، چنانچہ ۱۶۷۳ء میں سید مظفر کی جگہ وزارت عظمیٰ کا قلمدان اس کے حوالہ کیا گیا اور دربار سے سوریا پر کاش راؤ کا خطاب اور خلعت سرفراز ہوا۔

اکنّا پہلے اپنے بھائی مادنّا کا پیش کار بنا اور اس کے بعد بیجاپور میں حاجب مقرر کیا گیا تھا۔ پنڈت ام۔ نرسمہا چاری سابق وزیر و اصلاحات حکومت آندھرا پردیش کے مورث اعلیٰ "اکاراجو" ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں مہتمم کی خدمت سے سرفراز تھے۔ اس خدمت کے علاوہ "اکاراجو" کو پرگنہ چری کنڈہ کی مجموعہ داری بھی عطا کی گئی تھی۔ "اکاراجو" کے بعد پدّا دینکیا ولد رنگا سائی کو عبد اللہ قطب شاہ نے ذریعہ فرمان پرگنہ چری کنڈہ سرکار دیورکنڈہ کی دیسکھی عطا کی تھی، اور مہتمم کی اہم خدمت بھی آپ سے متعلق رہی۔

قطب شاہی سلاطین کا یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ وہ اپنی رعایا کو ایک نظر سے دیکھتے تھے۔ انھوں عطایا اور مراعات کے معاملے میں مذہب کا کوئی خیال نہیں رکھا، چنانچہ یہاں بطور مثال ایسے چند قطب شاہی فرامین کا ذکر کیا جاتا ہے جو ہندو رعایا کے نام جاری ہوئے تھے۔

فرمان ابو الحسن تانا شاہ مورخہ ۱۸ فروری ۱۶۸۴ء کے ذریعہ مندر "بھمرا ملیشور۔ سامی" واقع دریائے کرشنا، روزانہ طعام۔ تیل روشنائی اور روترانہ، پندرہ روزہ، ماہانہ اور سالانہ جشن کے لئے (۵۰) کچا ر منظور کئے گئے تھے، اور یہ بھی حکم ہوا کہ اس مندر کے قرب و جوار میں "ملیشورا سامی پورم" کے نام سے ایک گاؤں بسایا جائے جس کی آمدنی سے مندر کے اخراجات کی پابجائی ہو۔

فرمان ابو الحسن تانا شاہ مورخہ یکم اپریل ۱۶۸۶ء کے ذریعہ رام چندر راؤ۔ نرسا راؤ۔ رگھو نایک راؤ اور سیناپت راؤ فرزندان ینکنا کے نام پرگنہ چری کنڈہ سرکار دیورکنڈہ کے (۹۲) دیہات کی خدمت دیسکھی، مجموعہ داری و نارگوڈی نسلاً بعد نسلٍ عطا کی گئی۔

فرمان ابو الحسن تانا شاہ یکم اپریل ۱۶۸۶ء کے ذریعہ وینکٹ پتی چکرس کو دیورکنڈہ، وچری کنڈہ اور ابراہیم پٹن وغیرہ کے بارہ محالات کی سر دیسکھی نسلاً بعد نسلٍ عطا کی گئی۔

اِن فرامین کے علاوہ بعض ایسے روزنامچے بھی موجود ہیں جن سے قطب شاہی سلاطین کی رواداری کا یقینی ثبوت مل سکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ وقائع نویس مغلیہ نظم و نسق کے اہم جزو تھے جو ہندوستان کے تمام صوبوں میں متعین کئے جاتے تھے اُن کے فرائض میں داخل تھا کہ اُن علاقوں کے صحیح واقعات کے روزنامچے شہنشاہ کے پاس ارسال کریں چنانچہ گولکنڈہ میں بھی اورنگ زیب نے وقائع نویس متعین کئے تھے جو دربار گولکنڈہ کے صحیح واقعات سے اورنگ زیب کو مطلع کرتے تھے۔ یہاں صرف دو روزنامچے مثالاً پیش کئے جاتے ہیں :— (۱) "روزنامچہ وقائع بلدہ حیدرآباد مورخہ ۱۲/اپریل ۱۶۶۲ء کے ذریعہ وقائع نویس نے اس واقعہ کی اطلاع اورنگ زیب کو دی کہ بھن ریڈی بنیسولو ملازم سلطان عبداللہ قطب شاہ نے رپورٹ کی کہ میراحمد کے نوکر نارائن نے اُس سے ۲۴ ہزار ہون بطور رشوت لئے ہیں جس پر بادشاہ نے اُس سے رقم واپس حاصل کرنے اور اس کو خدمت سے برطرف کرنے کے لئے احکام صادر کئے۔ نرائن کے مالک میراحمد نے اُس سے ۲۰ ہزار ہون حاصل کرکے بادشاہ کی خدمت میں پیش کئے جس پر بادشاہ نے نرائن کے قصور معاف کر دیئے، سابقہ خدمت پر بحال کر دیا اور اس کو سراپا سے سرفراز کیا۔" (۲) "روزنامچہ وقائع بلدہ حیدرآباد مورخہ ۲۴/مئی ۱۶۶۲ء سے واضح ہے کہ راچرلہ کے دیسکھ ویر ریڈی جو عبدالجبار کے ملازمین کے ہاتھوں قتل ہوا اُس کے ایک فرزند نے قطب الملک سے ملاقات کی اور ۵ ہزار ہون بطور نذر پیش کئے۔ قطب الملک نے اس کو سراپا، طرہ مرصع کاری، دو گھوڑے، تلوار اور جواہرات عطا کئے"— ان روزنامچوں سے ظاہر ہے کہ عبداللہ قطب شاہ اپنی ہندو رعایا کے ساتھ کس قدر لطف و کرم سے پیش آتا تھا۔

قطب شاہی سلاطین ہندو رعایا کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے تھے، انھیں مذہبی آزادی حاصل تھی، ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کا بہتر انتظام تھا، چنانچہ مندر بھیرمار اسوامی واقع دریائے کرشنا۔ مندر بھدرا چلم واقع وادی گوداوری اور دیول بالا حصار قلعہ گولکنڈہ قطب شاہی سلاطین کی مذہبی رواداری کی زندہ مثالیں ہیں۔

قطب شاہی سلاطین نے مذہبی رواداری کے ساتھ ساتھ سماجی رواداری کو بھی روا رکھا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ہندو رعایا کے رسوم و رواج اختیار کئے اور اُن کی روایات کو جاری رکھا۔ محمد قلی قطب شاہ نے ترکی و ایرانی لباس کے بجائے تلنگانے کا لباس زیب تن کیا۔ محمد قلی نے اپنی متعدد دکھنی نظموں میں تلنگانے کی معاشرت اور روایات بیان کئے ہیں۔ وہ اپنی ہندو رعایا کی خاطر بسنت کا تہوار شان دار طریقہ سے مناتا تھا بسنت دراصل ہندوؤں کی عید ہے جو موسم بہار کی آمد آمد پر منائی جاتی ہے اس زمانے میں چونکہ پھولوں کی کثرت رہتی ہے اس لئے ہندو پھول جمع کرکے دیوتاؤں کے مندروں یا تالابوں کو لے جاتے ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ نے بسنت پر نو نظمیں کہی ہیں۔

قطب شاہی سلاطین کی انتہائی رواداری ایک معمولی ہندو لڑکی کے نام پر شہر آباد کرنا ہے جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ واقعہ اب افسانہ نہیں بلکہ مسلمہ حقیقت بن چکا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ نے اپنی محبوبہ بھاگ متی کے نام پر شہر آباد کیا اور اُس کے نام کی مناسبت سے بھاگ نگر نام رکھا، اور بھاگ متی کو جب حیدر محل کا خطاب دیا گیا تو اس خطاب کے لحاظ سے شہر کا نام بھاگ نگر سے حیدرآباد رکھا گیا۔ بہرحال ان حقائق کی روشنی میں یہ خوب واضح ہے کہ قطب شاہی سلاطین انتہا درجہ انصاف پسند اور روادار تھے اُن کا مذہب مذہبِ انسانیت تھا، اور اُن کی عبادت خلقِ خدا کی خدمت تھی۔

ملک زادہ طیب انصاری

"معانی" — جدید رجحانات کی روشنی میں!

کیٹس کے خیال کے مطابق "حُسن حقیقت ہے، حقیقت حُسن۔ بس اتنی سی بات ہے اور ہم کو اسی قدر جاننے کی ضرورت ہے"۔ والٹر پیٹر حُسن کاری کا قائل ہے۔ اس کا اصرار ہے کہ ادب کی غائت سوائے لذت و انبساط کے اور کچھ نہیں۔ اٹلی کا مشہور فلسفی کروچے اسی ماورائی نظریہ کا علمبردار ہے۔ اس کے خیال میں حُسن کاری یعنے آرٹ، ایک وجدانی تجربہ ہے جو آپ اپنی غائت ہے اور جس کو منطق و فلسفہ، یا مذہب و اخلاق کے اصول سے نہیں جانچا جاسکتا۔ جمالیات کے ماہرین نے جو کچھ ادب اور حُسن کے تعلق سے کہا ہے ان ہی خیالوں کی روشنی میں کلام معانی کا مطالعہ کریں تو معانی کی غزلوں اور نظموں میں حُسن جلوہ گر نظر آئے گا۔ معانی نے اپنی رنگین طبع اور روح پرور ماحول کی مدد سے ایک ایسی حقیقت کو ابدی شکل دے دی جو اس کے مزاج اور اس کے وقت اور زمانے ہی تک محدود اور عارضی تھی۔ معانی جس زمانے میں پیدا ہوا اور جن حالات میں اس نے شعر کہے ہیں وہ حسین ترین لمحات سے عبارت تھا اور حُسن ہی اس زمانے کی زندہ حقیقت تھی۔ ایسی صورت میں کلام معانی لذت و انبساط کا علمبردار نہ ہوتا تو پھر کیا ہوتا؟! پرسیٹلی کا خیال کہ حُسن کاری یعنے آرٹ کو زندہ رکھنے کے لئے تھوڑی سی افیون کی ضرورت ہمیشہ پڑے گی۔ اس سے اس کی مراد یہ تھی کہ نشہ کے بغیر آرٹ میں حُسن و خوب صورتی کو پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ معانی کی نظموں اور غزلوں میں جو حُسن کاری نظر آتی ہے یقیناً وہ نشہ ہی کا نتیجہ ہے لیکن یہ نشہ افیون کا نہیں جوانی کا ہے۔ جوانی، جو ماحول میں رچ بس گئی تھی۔ جوانی، جو سکھیوں کی صورت میں اس کے اطراف و اکناف رقصاں و شاداں تھی اور جوانی، جو اس کے رگ و پے میں رواں دواں تھی! اس لئے اگر اس کے ایک ایک لفظ میں حُسن سمایا ہوا ہے، اس کے ایک ایک مصرعے میں رنگینی پنہاں ہے اور اس کا ایک ایک شعر حُسن کاری کا اعلیٰ نمونہ بن گیا تو اس میں تعجب کیا ہے:

پلا ساقی مئے ہور خوشی سیتی ناچ　　　ہوا سبزہ خرم ہوا جیسا پاچ

درحقیقت معانی نے اپنے وقت کی رنگینی کو لفظوں میں سمو کر لافانی کلام میں محفوظ کرلیا ہے۔ واقعی آپ جدید رجحانات و افکار کی روشنی میں، جدید اصول تنقید کے پیش نظر کلام معانی کا جائزہ لینا چاہتے ہوں اور کسی جدید اصطلاح کا کلام معانی پر اطلاق چاہتے ہوں تو آپ بلاشبہ معانی کو رومانویت پسند شاعر کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ کیٹس کے خیال کے مطابق معانی کے کلام میں آپ حقیقت کو پائیں گے اور یہ حقیقت حُسن کے سوا کچھ اور نہیں! یا پھر بدلے ہوئے الفاظ میں معانی کے شعروں میں جو حُسن ہے وہ اس کے زمانے کی زندہ حقیقت ہے۔

۱۵۸۰ء میں جب ابراہیم قطب شاہ کا انتقال ہوا تو چاروں طرف امن و امان تھا، خوش حالی اور مرفہ حالی کا دور دورہ تھا۔ ایک مستحکم حکومت ابراہیم نے چھوڑی تھی۔ ایسے پرامن زمانے میں قلی قطب شاہ معانی کو حکومت کا موقع ملا۔ اور اس موقع سے اس نے پورا پورا فائدہ بھی اٹھایا۔ ویسے اردو زبان و ادب کو فروغ تو قطب شاہیہ دور کے ابتدائی زمانے سے ہی شروع ہو چکا تھا لیکن اس کو انتہائی عروج کو پہنچانے والا معانی ہی ہے۔ معانی بہ یک وقت دو سلطنتوں کا بادشاہ تھا۔ ایک ارضی سلطنت کا جو گولکنڈہ کے نام سے موسوم تھی اور دوسری طرف وہ اقلیم سخن کا پہلا تاج دار بھی کہلایا۔ کمال تو یہ ہے کہ دور قدیم کا شاعر ہوتے ہوئے بھی اس نے اپنے زمانے کی روایتی شاعری کی پابندی نہیں کی۔ جس زمانے میں معانی پیدا ہوا اور پروان چڑھا اردو شاعری میں خالص مذہبی رنگ نمایاں تھا۔ بلاشبہ معانی سے پیشتر شعراء مثلاً نظامی بیدری۔ اشرف، مشتاق اور فیروز وغیرہ نے مثنویاں لکھی ہیں، لیکن ان مثنویوں کا موضوع بھی مذہبی رہا ہے۔ اور یہ صنف سخن تخلیقی قوتوں سے عاری صرف ترجموں کے بل بوتے پر زندہ تھی۔ معانی کے کلام میں کہیں کہیں مثنوی کا رنگ غالب نظر آتا ہے لیکن اس نے پیش رو یا بعد کے شعرا کی طرح باقاعدہ مثنوی نہیں لکھی۔ جدید مفکرین کے نزدیک رومانویت محض فرار نہیں ہے بلکہ بدلے ہوئے حالات میں کائنات کی نئی تلاش ہے، نئی قدروں کی بازیافت ہے، اس میں صرف پرانے اصولوں سے سرتابی نہیں بلکہ ان معیاروں اور ترتیب کو رد کرنے کی کوشش ہے جس سے جامد اصول تراشے اور مسلط کئے جاتے ہیں اس لئے اس تحریک کو رومانویت سے وابستہ کر دیا گیا۔[1] معانی کے کلیات کو دیکھنے کے بعد یہ کہنا کہ معانی نے بت شکنی کی ہے اور یہ پہلا بت شکن ہے جس نے روایتی شاعری سے بڑی حد تک انحراف کر کے نئے نئے اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، اس نے اردو شاعری میں نئی قدروں کی بازیافت کی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ وہ جدید معیارات اور نئی قدریں ہیں جس کے لئے آج دور حاضر بے چین ہے۔ اور معانی نے باغوں، پھلوں، محلوں، تہواروں اور معشوقوں پر جو متعدد نظمیں لکھی ہیں ان کے پیش نظر اعجاز حسین[2] نے کہا کہ معانی نے ادب کو زندگی سے قریب کرنے کی قابل قدر کوشش کی تھی۔

جن اصناف سخن پر معانی نے طبع آزمائی کی ہے ان میں قصیدہ، مرثیہ، رباعیات، نظم اور غزل ہیں۔ اس بات پر ہمیں تعجب نہ کرنا چاہئے کہ معانی نے قصیدے کس طرح اور کس کی شان میں لکھے؟ کیونکہ ہمارے نزدیک قصیدہ سے مراد صرف بادشاہ وقت کی مدح سرائی ہے۔ اس محدود مفہوم کے پیش نظر بھی اگر ہم معانی کے قصیدوں کو پرکھنے اور پڑھنے کی کوشش کریں تو ہمیں معانی یہاں بھی تیشہ زنی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ معانی کا دل اسلام کی محبت سے معمور تھا۔ اسے رسول اللہ سے بے پناہ عقیدت تھی، چنانچہ اس کے ثبوت میں متعدد اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اس نے ان اشعار میں رسول اللہ کو اپنا

---

[1] اردو ادب میں رومانوی تحریک از محمد حسن [2] نئے ادبی رجحانات۔

آقا تسلیم کیا ہے اور خود اپنی غلامی پر نازاں ہے۔ اسی آقائے نامدار رسولِ خدا کی شان میں معانی نے شعر کہے ہیں:

سُرج افشان گر ہو کر، نبیؐ منبعِ دوادا پر　　　زر افشانی کیا ہے کر سو جگ میں جھلکارے ہیں

چندر غواص ہو آیا، اگن سمدر بعتر دھایا　　　نبیؐ پر وارنے لیایا، دُھلک موتیاں ستارے ہیں

ان اشعار میں معانی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے اسلام کی بے پناہ وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ قصیدہ گوئی میں معانی بلاشبہ باکمال شاعر نہیں ہے۔ وہ سودا ہی تھا جو قصیدہ گوئی کے لئے پیدا ہوا تھا یا پھر ذوق! معانی نے اردو شاعری میں قصیدہ گوئی کی ابتدا کی۔ معانی قصیدہ گوئی میں اپنے آپ کو خاقانی اور نظامی کا شاگرد بتاتا ہے شعر ملاحظہ ہو:

خاقانی و نظامی کا تعلیاتہ ہے شاگرد　　　شہنامے کی کہانیاں سر تھے سنانی مجکوں

البتہ وہ اپنے آپ کو انوری کا ہم پلہ ضرور بتلاتا ہے۔ لیکن یہ بھی معانی کی صرف تعلی ہے ورنہ انوری کا مرتبہ قصیدہ گو شاعر کی حیثیت سے بے حد بلند ہے۔ جبکہ خود اردو شاعری میں معانی کو بہ حیثیت قصیدہ گو شاعر سے بڑھ کر اہمیت حاصل نہیں ہے۔

مرثیہ کی تاریخ اور اس کے ارتقاء کی داستان اردو زبان و ادب کی تاریخ ہی سے شروع ہوتی ہے۔ اردو ادب کے ابتدائی دور میں مرثیہ نگاری کا آغاز ہو چکا تھا۔ سب ہی اس حقیقت سے بہ خوبی واقف ہیں کہ دکن وہ پہلا گہوارہ ہے جہاں زبان کی پرورش ہوئی اور ادب بھی پیدا ہوا۔ ایرانی ادبیات کے اثرات نے جہاں ہمارے قدیم ادب میں مثنوی کو شہرتِ دوام بخشا ہے وہیں مرثیہ نگاری کے لئے بھی راہ ہموار کی ہے۔ دکن کے بادشاہ ایرانی النسل تھے اور یہی اردو زبان و ادب کے سرپرست بھی۔ علاوہ ازیں ہمارا ادب بھی ایرانی روش پر ہی چل رہا تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں مرثیہ کا آغاز حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ گر بیم بیلی[1] اور دکنی محققین کے بیان کے مطابق معانی وہ پہلا شاعر ہے جس نے سب سے پہلے مرثیہ لکھا۔ مرثیہ کی موجودہ شکل و صورت ترقی یافتہ ہے۔ اور معانی کے زمانے کا مرثیہ اپنی ابتدائی شکل میں نمو پاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اشرف نے ۹۰۹ھ میں نوسر ہار لکھ کر مرثیہ گوئی کا آغاز کر دیا تھا لیکن اسے مرثیہ مان بھی لیا جائے تو یہ کوئی تحلیقی کارنامہ نہیں تھا۔ تخلیقی مرثیہ کا بانی تو معانی ہی ہے جس نے غزل کی زمین میں مرثیہ کہا ہے۔ مرثیہ اپنے اختصار کے باوجود بنیادی مقصد "ثنائیت" سے خالی نہیں ہے:

آہ ہمارے درد تھے دریاکوں سب جوش آدتا

ماتمیاں کے لعو بنداں تھے آگ سب بج جادتا

سب دُکھاں کو انت ہے اس دکھ کے تائیں انت نئیں

فاطمہؑ کے پوت ہیں اس جگ منیں نئیں لوز کئیں

---

[1] اردو لٹریچر ص ۳۵-۳۴

ظاہر ہے جیسے مرثیہ کی کوئی تکمیل نہیں، تکمیل تو اس کی میر انیس کے ہاتھوں ہونے والی تھی لیکن معانی نے اردو شاعری میں قصیدہ کی طرح مرثیہ کی صنف کا آغاز کر دیا تھا۔

معانی رومان پسند شہزادہ ہے۔ بھلا ایسے رومان پسند شاعر کو رباعی، قصیدہ یا مرثیہ سے کیا کام ہو سکتا ہے؟ اسے تو صرف غزل یا نظم ہی کہنا چاہئے تھا اور حقیقتاً وہ غزل گو شاعر ہی تھا۔ اس نے نظمیں بھی کہی ہیں، لیکن ان نظموں میں بھی غزل ہی کا مزہ آتا ہے۔ درحقیقت وہ رومانوی شاعر تھا اور رومانوی شاعر چاہے غزل کہے یا نظم، اس کا موضوع اور مزاج تو بہرحال رومانی ہی رہے گا۔

مولوی عبدالحق نے "سب رس" کو ترتیب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ وجہی کی زبان تقریباً دو ڈھائی سو برس پرانی ہے۔ ظاہر ہے اس قدیم اور ابتدائی زبان میں وہ لوچ اور لچک اور شیرینی و سادگی کہاں جو آج کی جدید زبان میں موجود ہے۔ معانی کی زبان تو وجہی کی زبان سے چند سالوں پرانی ہی ہے اس کے سمجھنے میں وہی دشواری درپیش ہے جو وجہی کے کلام اور زبان کو سمجھنے میں محسوس ہوتی ہے۔ اردو کی یہی قدامت ہے جس نے کلام معانی کی شیرینی و لطافت کو بے مزہ بنا دیا ہے۔ ورنہ اس کی غزلوں میں بلا کا رس ہے اور اس کے کلام میں حافظؒ کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ ویسے بھی حافظؒ معانی کا پسندیدہ شاعر ہے۔ اس نے کلامِ حافظؒ کا صرف مطالعہ کر کے اثر ہی قبول نہیں کیا بلکہ حافظؒ کی غزل در غزل شعر گوئی کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر زورؔ مرحوم نے کلیات کی ترتیب کے موقع پر ان غزلوں کو بھی حافظؒ کی غزلیات کے ساتھ پیش کیا ہے جن کی تقلید میں معانی نے غزلیں کہی ہیں،

گل بے رُخِ یار خوش نباشد بے بادہ بہار خوش نباشد (حافظؒ)

پھل بن رُخِ یار خوش نہ دِسے بن مد پھلی بہار خوش نہ دِسے (معانی)

معانی کی غزل کا رنگ نکھرا ستھرا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ دیگر بعد کے شعرا میں غزل کا شعور موجود نہیں تھا بلکہ وہ ماحول جو معانی کو ملا تھا انھیں نہ مل سکا۔ جل پریوں میں گھرا رہنے والا رومان پسند شہزادہ جس کیف و سرور میں ڈوبا رہتا وہ کیفیت دوسروں کو کس طرح نصیب ہو سکتی تھی؟ یہی وجہ ہے کہ اس کی غزلوں میں حسن و جادو بھرا ہوا ہے۔ حافظؒ کی تقلید نے تو اور بھی آگ لگا دی۔ اس کی غزلوں میں رعنائی ہے اور رنگینی بھی، سحر انگیزی اور سحر آفرینی بھی اور سرور و مستی بھی! زبان سے ہٹ کر اس کی غزلیں جدید رومانوی شاعروں کے کلام سے کسی طرح کم نہیں بلکہ کہیں کہیں وہ آگے ہی سرداری کرتا نظر آتا ہے،

مدن مست، بدلا مست، گگن مست، پری مست ہوئی مست، پون مست، الگن مست، پری مست

پیا باج پیالہ پیا جائے نا پیا باج یک تل جیا جائے نا

جدید رومانوی شاعروں کی دنیا خواب ہے یا پھر تصور! ان میں سے بہتوں نے تو صرف تصوری اور خیالی محبوبہ سے

باتیں کی ہیں اس وجہ سے ان کے کلام میں اثر نہیں۔ برخلاف اس کے معانی سکھیوں میں گھرا ہوا حالتِ مستی میں شعر کہتا۔ اس کا نشہ حقیقی نشہ تھا اسی وجہ سے اس کے کلام میں بھی سچائی اور حقیقت ہے۔ فنی اعتبار سے بھی معانی کی غزلیں مکمل کہی جا سکتی ہیں۔ معانی نے جہاں منظر کشی کی ہے، جذبات کے والہانہ پن کو ظاہر کیا ہے وہیں معشوق کا سراپا بھی کھینچا ہے:

سرو خوش قد دیکھیا سب سرو کے بن میں عجب — اس کے سر کوئی نہیں سب باغ و گلشن میں عجب

یا رب اس سرو رواں کوں ناد کھا باد سموم — کیونکہ اس کا نور دستا دل کے درپن میں عجب

محبوبہ کے چہرۂ پرنور کو چاند سے تشبیہہ دیتے ہوئے کہتا ہے ؎

سجن مکھ کا اوجالا چند تھے آلا — ادھر تھے چودے جسم امرت پیالا

معانی کی وہ نظمیں جن میں اس نے اپنی معشوقوں کا سراپا بیان کیا ہے اپنی نظیر آپ ہیں اور اپنی نوعیت کی پہلی نظمیں ہیں۔ جدید شعراء میں مجاز۔ سردار جعفری اور جوش وغیرہ نے بھی اپنی محبوباؤں کا سراپا الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے، در اصل اس مرقع نگاری کی ابتداء معانی ہی کی جدت طرازی کا نتیجہ ہے۔

ورلینن نے اس بات کو پوری طرح تسلیم کیا ہے کہ سماجی فلسفی کی حیثیت سے ٹالسٹائی رجعت پرست تھا لیکن ایک ادبی فن کار کی حیثیت سے اس نے اپنے دور کی سماجی قوتوں کی تصویر کشی جس خوبی اور ایمان داری سے کی ہے اس کی داد نہ دینا سخت ظلم ہے"۔ یہی بات قلی قطب شاہ معانی پر بھی صادق آتی ہے۔ یقیناً وہ بادشاہِ وقت تھا۔ سیاسی اور سماجی حیثیت سے اس کا مقام معاشرہ کے اعلیٰ طبقہ سے تھا، لیکن فن کار کی حیثیت سے اس نے اپنے وقت کی کیفیات کو اپنی نظموں میں پیش کیا ہے، وہ اپنے وقت کا سچا اور ایمان دار فن کار تھا۔ اس نے کھیل۔ برسات اور سرما۔ مہندی۔ چوگان۔ پھول کڑی پھول۔ پریم کہانی اور دنیائے فانی لکھ کر اپنے سماجی تصورات اور معاشرتی قدروں کی ترجمانی کی ہے۔ جہاں اس نے، ناز، نیاز اور افسانۂ محبت لکھ کر اپنے رومانوی افکار کا اظہار کیا ہے وہیں اس نے جلوہ اور دیگر رسوم کو منظوم کر کے سماجی روایتوں کو اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ رومانوی شاعر کی خوبی یہی ہے کہ وہ ماضی کی اعلیٰ اور ابدی قدروں سے گریز نہیں کرتا، سچائی اور نیکی سے بغاوت اس کے نزدیک جائز نہیں ہے، لیکن وہ پتھر کی لکیر بن کر پرانی اور فرسودہ روایتوں کو روا بھی نہیں رکھتا۔ اپنی گہری فکر اور ندرتِ خیال کی مدد سے ادب میں نئے رجحانات اور نئے اقدار کو جنم دیتا ہے۔ اس کا ادب تقلیدی ہونے ہوئے بھی تخلیقی ہوتا ہے۔ معانی ابدی اور آفاقی افکار و رجحانات کی پابندی کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ فکر و خیال کی کھلی فضا میں پرواز بھی کرتا نظر آتا ہے۔ یہی خصوصیت ہے جو اُسے رومانوی شاعروں کی صف میں اولین مقام دلاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن نے مارکسی نظریۂ تنقید پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ "ادب ایک حادثہ نہیں ہے اور اس کی تخلیق نہ کسی حلول کرنے والی

روح کے تابع ہے اور نہ ذاتی توہم کے سبب ــ اور خیال و شعور کا ہر شعبہ ــ مادی حقیقتوں کا تابع ہے۔ مادہ اور اس کے مظاہر بنیادی حقیقت ہیں اور خیالی و شعور ثانوی[1]" لیکن معانی جس زمانے سے تعلق رکھتا ہے اس پورے دور میں مادہ اور خیال میں نہ تو شعوری طور پر کوئی فرق موجود تھا اور نہ حقیقی صورت میں عملاً ایسا کوئی امتیاز ! مادہ اور خیال کا گمراہ کن فرق تو بعد کی پیداوار ہے۔ جہاں تک معانی کا تعلق ہے اس کی حیثیت خصوصی نوعیت کی ہے۔ معانی جس بات کا بھی تصور کرتا وہ مادہ کی شکل میں ہمیشہ موجود رہتا تھا اس کا ہر خواب اپنی تعبیر کے ساتھ سامنے جلوہ گر ہوتا ! ایسی صورت میں اس نے جو کچھ بھی اپنے کلام میں پیش کیا ہے وہی اس کا تصور بھی ہے اور مادی حقیقت بھی۔ خواب اپنی ساری حقیقتوں کے ساتھ شعری قالب میں ڈھل گیا۔ فرانس کا مشہور فلسفی نقاد ریمی دی گورماں کہتا ہے" ہم فن کاروں کو اپنے طبقے اور اپنے دور کا حقیقی نمائندہ ہونا چاہیے۔" اگر آپ معانی کی نظموں ہندی، پرم کہانی، دنیائے فانی کو ملاحظہ فرمائیں تو ریمی دی گورماں کی ہمنوائی کرتے ہوئے معانی کو فن کار ماں لینے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے کہ اس نے اپنی نظموں میں اپنے زمانہ کی رسموں اور سماجی اصولوں کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

معانی کے دور میں مذہب کا چلن عام تھا جس طرح آج مذہب بیزاری عام ہے اور مذہب بیزاری کے خیالات کو پیش کرنا ترقی پسندی سمجھا جاتا ہے اس طرح کے خیالات اس دور میں موجود نہیں تھے ان بزرگوں کا دین و ایمان تو صرف مذہب ہی تھا۔ وہ مذہب ہی کے حقیقی اور آفاقی اصولوں پر اپنی زندگی گزارنے کے آرزومند تھے جس معاشرہ میں تقویٰ اور عمل صالح کی بنیاد پر اونچ نیچ کا فرق کیا جاتا ہو وہاں مادہ کی بنا پر سماج میں طبقاتی تصور کہاں ہو سکتا ہے! انسانی کردار لافانی ہے حالانکہ انسان کو خود فنا ہے۔ ظاہر ہے انسان کے ساتھ ساتھ اس کی ساری مادی طاقتیں بھی فنا ہو جائیں گی۔ اسی وجہ سے ان کی بات چیت، اٹھنے بیٹھنے کے طور طریقے اور رسم و رواج سب ہی کچھ مذہب ہی سے ماخوذ تھے اور ان ہی مذہبی تعلیمات کے زیر اثر وہ دنیا کو فانی اور آنی جانی مانتے تھے۔ چنانچہ ان ہی افکار و خیالات کی معانی نے بھی ترجمانی کی ہے ؎

سنو عاقلاں سب کہ دنیا ہے فانی جو کوئی بوجھیا اس ہے صاحب قرانی

ایک طرف اس مذہب سے اٹوٹ وابستگی کا اظہار کرتا ہے اور دوسری طرف ایک سچے رومانوی شاعر کی طرح حیاتِ انسانی کے جدید رجحانات اور افکار کی عکاسی بھی کرتا نظر آتا ہے۔ یار باش اور آزاد خیال لوگوں کے یہاں عشق و عاشقی من پسند شغلہ ہے۔ مئے نوشی عام تھی معاشی خوش حالی نے سامانِ عیش بھی خوب فراہم کر دیئے تھے ایسے ہی افراد کی معانی ترجمانی کرتے ہوئے اپنی پرم کہانی سناتا ہے ؎

سنو لوگو میری پرم کی کہانی کہ پیلا ہے رنگ عاشقی کی نشانی

اور پھر کبھی بچوں کے کھیل، بھوکڑی بھوں سے اپنی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کرتا ہے ؎

سکی تال دے منج ٹھنکی کوڑی کہ ڈوماں ڈھلکی کھل کر ہلکی کوڑی

ان نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ معانی کس حد تک اپنے معاشرہ سے قریب تھا! اس کی نظر بھوکڑی جیسے (باقی صفحہ ۶۰ پر)

[1] ادبی تنقید صفحہ ۳۴۔

زاہدؔ ابوالحسن

محمد قلی کی شاعری —
ایک ادبی جائزہ :—

محمد قلی کا شمار اردو زبان کے اُن خدمت گزاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے سیاہ تاریکیوں میں اپنے خونِ جگر سے چراغِ فکر جلایا، اور تاریخِ ادب سے یوں وابستہ ہوگئے جیسے جسم سے روح۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ محض ایک عیش پرست بادشاہ ہی نہیں تھا بلکہ جمال دوست اور ادب نواز انسان بھی تھا۔ حسینائیں اس کے محل سرا کی زینت تھیں اور شعرا اس کے دربار کی رونق۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے ذوق کی تکمیل کے لئے شاعری کا سہارا لیا، اور ہر روز شعر کہتا رہا۔ اس کی شاعری میں دریا کی سی وسعت اور موجوں کی سی روانی ہے، جس کا خود اسے بھی احساس تھا۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتا ہے ؎

صدقے نبیؐ قطب شہ بول شعر بولے ہر دن دریا کور وز جوں ہے موجاں کا تماشہ

فن کی تخلیق کھیل نہیں ہے۔ فن کار اپنی ہر تخلیق کی تکمیل کے دوران مر مر کے جیتا ہے، اس لئے اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ محمد قلی بادشاہ ہونے اور عیش و عشرت کا دلدادہ ہونے کے باوجود بڑی ہی تیز رفتاری کے ساتھ مشقِ سخن کرتا رہا اور اس کرب سے دوچار ہوتا رہا جسے "کربِ تخلیق" کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک بادشاہ کی حیثیت سے خود شعر و شاعری کی اُلجھنوں میں پھنسنے کی بجائے دوسروں کے تخلیق کردہ اشعار سے اپنے ذوق کو آسودہ کر سکتا تھا، لیکن محمد قلی کی عظمت اور انفرادیت یہی ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا، اور خود اپنے خونِ جگر سے اپنے گلستاں کی تعمیر کی۔

محمد قلی کوئی عالم۔ فاضل اور صوفی صافی انسان نہیں تھا۔ حُسن و عشق سے فطری لگاؤ نے اس میں شعر و شاعری کی اُمنگ پیدا کردی تھی، اس لئے اس نے اردو اور فارسی کے پیش رو شعرا کے کلام کا مطالعہ کیا، اور سب سے زیادہ حافظؔ سے متاثر ہوا۔ اس کے کلیات میں غزلیاتِ حافظؔ کے ترجموں کے علاوہ کئی شعر حافظؔ ہی کی طرز میں موجود ہیں۔

دکھنی زبان میں ادب پیش کرنے کی سب سے پہلی باقاعدہ کوشش ہمیں محمد قلی کے دیوان میں ملتی ہے۔ اس کا دیوان دکھنی زبان کے ادب اور ارتقا کی تحقیق میں ایک اہم بنیادی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔

محمد قلی نے اردو زبان کی اُس وقت دست گیری کی جب کہ وہ اس کی بہت محتاج تھی۔ فطری ذوقِ شعر گوئی، موزونئ طبع۔ مئے و معشوق کا ساتھ، اور پھر ساز گار، رنگین ماحول۔ یہی وہ عناصر ہیں جنھوں نے محمد قلی سے پچاس ہزار سے

کچھ دنوں میں شعر کہنے لگے اور ایک ایسی زبان کو جو ابھی نوخیز تھی، فارسی کی رقیب بنا دیا، بقول مولوی عبدالحق مرحوم:

"یہ محمد قلی کا کچھ کم کمال نہیں ہے کہ اس نے ایک ایسی زبان میں جس کے منہ سے اس وقت دودھ کی بو نہیں گئی تھی، ان خیالات کا اظہار کیا ہے جس کی صلاحیت فارسی میں صدہا سال منجھنے کے بعد پیدا ہوئی ہے۔"

محمد قلی کی زبان سے ہم مانوس نہیں ہیں لیکن وہ لوگ جو قدیم اردو سے واقف ہیں اور پونے چار سو برس پہلے کی زبان کا اندازہ لگانے کی اہلیت رکھتے ہیں انھیں اس کا احساس ہوگا کہ محمد قلی کی شاعری قدیم اردو میں بھی جادو جگاتی ہے۔ اب چونکہ زبان و ادب کے پیمانے بدل گئے ہیں، اس لئے قدامتِ زبان اور طرزِ ادا کی کہنگی نے محمد قلی کے کلام کی خوبیوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔

محمد قلی کی شاعری میں ایک شاعر کے جذبات اور محسوسات کی جھلک ہی نظر نہیں آتی بلکہ زندگی کی ہر ہر ادا اور حُسن کے بانکپن پر سو سو طرح سے نثار ہونے والے فنکار کا دل بھی دھڑکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ شاعرانہ دماغ اور عاشقانہ مزاج کا آدمی تھا، حُسن پرستی اس کا شعار تھی، محبت سے اس کا خمیر اُٹھا تھا، اس لئے اس کی شاعری خالص حُسن و عشق کی شاعری ہے جس میں جذبہ کی فراوانی اور وارداتِ قلب کی ترجمانی ہے۔

محمد قلی کثیر المحبوب شاعر تھا، اس کا دیوان اس کی ان گنت محبوباؤں کے نام اور ان کی تعریف و توصیف سے بھرا پڑا ہے، اس ہرجائی پن سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد قلی نے محبت کو کبھی ایمان اور عبادت کا درجہ نہیں دیا بلکہ محض عیش و عشرت اور تفریح کا وسیلہ سمجھتا رہا۔

غزل، سخن سنجوں اور سخن فہموں، دونوں کی محبوب صنف ہے۔ غزل کے لئے جس داخلی کیفیت و رخارجی ماحول کی ضرورت ہے وہ محمد قلی کو میسر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غزل اس کی پسندیدہ صنفِ سخن بن گئی، یہاں تک کہ اس کی جن تخلیقات کو نظمیں سمجھتے ہیں، وہ بھی اس کی مسلسل اور مربوط غزلیں ہی ہیں۔

محمد قلی کی غزل کا خاص موضوع حُسنِ نسوانی ہے، اس کی غزلیں وصل کی آسودگی سے مُزیّن اور تغزلیت سے بھرپور ہیں۔ صنفِ غزل میں محمد قلی کا اجتہاد یہ ہے کہ اس نے فارسی شاعری کا تتبع کرنے کے باوجود غزل کو ہندوستانی لب و لہجہ دیا، اور نسوانی جذبات خالص ہندی رنگ میں پیش کئے۔ فارسی طرز کے برخلاف ہندی رنگ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اظہارِ محبت عورت کی طرف سے ہوتا ہے، وہ عاشق کے روپ میں ہجر کی راتیں گزارتی ہے، آہیں بھرتی ہے، سوت سے جلتی ہے، اپنے محبوب کو بے وفائی کے طعنے دیتی ہے اور اکثر اس سے بدگمان رہتی ہے۔ اس بدگمانی کو محمد قلی نے یوں پیش کیا ہے ؎

پیا کس سے گنوائی رات ساری   تمن انکھیاں میں پانی میں خماری

ہندی کا دوسرا رنگ محمد قلی کے کلام میں یہ ہے کہ اس نے بیشتر ہندی ترکیبیں اور الفاظ استعمال کئے ہیں، مثلاً رقیب کے لئے دوتی، دوتن، اور ہمدم و مونس کے لئے سہیلی، سکھی اور ساجن وغیرہ ؎

تو پلی پرت لاگی ہے تھیر تیں منج سکی ملنے تیں پیو کوں جاتی ہرن اب

محمد قلی کا کلام پڑھ کر یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ وہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے! اس پس و پیش کی وجہ خود اس کا فن ہے۔ مضامین کا تنوع۔ اسلوب بیان۔ تیور زبان لہجہ اور لفظیات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس سے پہلے بھی ایسے شعری تجربے کئے جا چکے ہیں، لیکن کسی مستند نقش کے ملنے تک ہم دیوانِ محمد قلی کو اردو کا پہلا دیوان سمجھتے رہنے پر مجبور ہیں۔

اصناف کے تنوع اور موضوعات کی رنگارنگی کے اعتبار سے محمد قلی کا کلام ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے عوام کے معتقدات اور عیدوں اور تہواروں جیسے بسنت۔ نوروز۔ سالگرہ۔ شادی بیاہ۔ محرم۔ شبِ معراج۔ شب برات عید میلاد النبیؐ اور عید رمضان وغیرہ پر بے شمار مسلسل غزلیں لکھیں، جنھیں موضوع اور متن کے اعتبار سے نظم کہنا بجا ہو گا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اردو کے اس اولین صاحبِ دیوان شاعر کا کلام جدید شاعری کے معیاروں پر پورا اُترتا ہے اور یگانگت و یک جہتی کے خیالات سے بھی معمور ہے۔ ترقی پسندی اگر یہی ہے کہ اپنے محسوسات کو من و عن بیان کر دیا جائے، عصری زندگی اور اس کے اقتضاد کا ادب میں لحاظ رکھا جائے، اور اس میں طبقات کی نہیں، انسانوں کی ترجمانی کی جائے تو محمد قلی کا کلام اس کسوٹی پر پورا اُترتا ہے! اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترقی پسند موضوعات پر جس نے سب سے پہلے قلم اُٹھایا، وہ محمد قلی ہے۔

مظاہر قدرت سے بھی محمد قلی بیگانہ نہیں رہا۔ پھلوں، میوؤں اور ترکاریوں کے بیان میں اس کی کئی مثنویاں ہیں۔ قصیدوں میں اس نے جا بجا چرخیات کا ذکر کیا ہے اور اس فن میں اس کی حیثیت موجد اور امام کی سی ہے۔

تشبیہوں اور استعاروں میں بھی محمد قلی نے اپنی اختراع پسند طبیعت کے جوہر دکھائے ہیں۔ معشوق کے سراپا میں اس نے جو تشبیہیں تراشی ہیں وہ اس کی جودت و ذکاوت اور بالغ نظری کی ضامن ہیں۔ مثلاً کجلائی ہوئی آنکھوں کو حسین، نازک گہرے نیلے رنگ کے بادام سے تشبیہہ دیتا ہے۔ ٹھوڈی کو سیب سے اور دانتوں کو چارہ کی چروبجی سے مشابہ بتاتا ہے۔ یہ مقامی رنگ کی مثالیں ہیں نظیر اکبرآبادی کے سوا اور کسی بھی شاعر کے پاس نہیں ملتیں۔

محمد قلی نے دشمنوں سے خطرے کا اظہار اپنے اشعار میں اکثر کیا ہے۔ مثلاً جب وہ آسمان پر نیا چاند دیکھتا ہے تو اسے خنجر کی تشبیہہ سجھائی دیتی ہے اور اس کے دل کا خطرہ فوراً اس شعر میں ظاہر ہوتا ہے ؎

نبیؐ صدقے قطب کے دشمنوں کو کاٹنے گھس جو تو اچند کا بلی خنجر پکڑ کر ہت میں آیا عید

یعنے محمد قلی کے دشمنوں کو گھاس کی طرح کاٹنے کے لئے اپنے ہاتھ میں کابلی خنجر لے کر آیا ہے۔

بہ حیثیت مجموعی محمد قلی کا کلام اس کی جدتِ طبع، قوتِ مشاہدہ، مشقِ سخن اور وسعتِ قلب و نظر کا آئینہ دار ہے۔
محمد قلی کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ وہ بڑا حقیقت پسند شاعر تھا۔ قدیم شعراء عموماً فرضی معشوق کی ستائش کرنے کے مجرم رہے ہیں، لیکن محمد قلی نے اپنی کلیات میں بہ کمال دیانت اپنی عیش پسندی کا اظہار کیا ہے اور اپنے تمام تجرباتِ عشق بے کم و کاست بیان کئے ہیں۔ یہی نہیں اس نے اپنے عہد کی صحیح اور کامل ترجمانی بھی کی ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ محمد قلی کی شاعری نہ صرف اس کی منظوم سوانح حیات ہے بلکہ اس کے عہد کی ایک مستند تاریخ بھی ہے، جس میں ہمیں تقریباً چار سو برس پہلے کی زندگی کی تصویریں ملتی ہیں۔

اردو شعراء میں یہ بات صرف محمد قلی کے ساتھ ہی مخصوص ہے کہ اس کی غزلوں میں "نبیؐ صدقے" سے شروع ہونے والے بے شمار مقطعے موجود ہیں، جن سے محمد قلی کے تصورِ مذہب پرستی پر روشنی پڑتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ محمد قلی مذہب پر بھرپور عقیدہ رکھتا ہے، اور وہ مذہبی ریت و رسوم پر بھی چلتا ہے، لیکن مذہب کی حقیقی روح کے امر و نواہی سے وہ بے نیاز نظر آتا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ اپنی عیش کوشی کو بھی نبیؐ اور علیؑ کا صدقہ سمجھتا ہے۔

محمد قلی کے کلام میں فکر کی گہرائی نہیں ہے، سوز نہیں ہے، شعریت نہیں ہے، اور وہ کیفیت بھی نہیں ہے جو دل کو درد آشنا بناتی ہے۔ خیال گزرتا ہے کہ جوش ملیح آبادی کی طرح اگر محمد قلی سے بھی یہ سوال کیا جاتا کہ ان کی شاعری میں سوز و گداز کا فقدان کیوں ہے، تو یقیناً یہی جواب ملتا کہ اس کے ذمہ دار وہ متعدد تجرباتِ عشق ہیں جنھوں نے کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کی زندگی اول تا آخر سرشاری اور سرمستی سے عبارت ہو وہ کہاں سے درد کا عنصر لائے اور اپنے فن میں وہ سوز پیدا کرے جو ابدی فن پاروں میں ناگزیر ہے۔

محمد قلی کا کلام محرومی اور شکوہ و شکایات سے بھی پاک ہے۔ اس نے اپنی زندگی کی بہاریں نغمہ و نشاط اور راگ و رنگ میں بسر کیں، اس لئے اس کی شاعری میں رعنائیاں اور رنگینیاں ہیں، سیرابی اور سرمستی ہے اور مدھ بھرے گیت ہیں۔ غرض آسودگی کے تمام روپ محمد قلی کی شاعری میں اپنی ساری خوب صورتیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۲۸) زنانی کھیلوں پر بھی پڑتی ہے تو وہ اسی چابک دستی سے اپنے جذبات کو شعری صورت میں ظاہر کرتا جاتا ہے۔ بلاشبہ معانی سرمایہ داروں کا ممدوح تھا، لیکن وہ عوامی جذبات اور عوامی خیالات کا ترجمان بھی تھا! اس کی شاعری میں معاشرہ کو جیتا جاگتا دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ وہ پہلا شاعر ہے جس نے رومانوی تحریک کی بنا ڈالی، اور وہ رومانیت پسند شاعر ہی کہلائے گا کہ جس کے یہاں رومانوی رجحانات و خیالات کے ساتھ ساتھ اس سماج کے عام رسوم اور روایتیں بھی موجود ہیں جس سے معانی کا تعلق تھا۔

بانو طاہرہ سعید

نوائے محمد قُلی قطب شاہ

دکن کے گوشے گوشے میں ہے میری داستاں باقی
دلوں میں ہوں بہ شکلِ شاعرِ رنگیں بیاں باقی

بڑے ہی شوق سے میں نے سجایا تھا نشیمن کو
میں خود بانی ہوں جس میں ہے یہ میرا گلستاں باقی

وہی ہے نقشِ لافانی، دلوں پر جس کا سکّہ ہو
نہ کوئی جنگ جو باقی، نہ کوئی حکمراں باقی!

محبت، مذہب و ملت سے بالا تر ہے سرمایہ
وہی جنت کا خطہ ہے محبت ہے جہاں باقی

مروّت، پیار لوگوں کا ہے اب تک درمیاں باقی
خدا کا شکر ہے میری روایت ہے یہاں باقی

مسلماں اور ہندو میرے ہی دل کے رہیں دو ٹکڑے
رہیں شیر و شکر بن کر ہمیشہ شادماں باقی

یہ شہر حیدرآبادِ حسیں ہے مرکزِ عرفاں
اسی کے نام سے ہے عزتِ ہندوستاں باقی

وقار خلیل

قطبِ اُردُو

نذرِ محمد قلی قطب شاہ

آسمانِ شعر کے اے اولین ماہِ تمام
تیرے فکر و فن میں ہے کیفیتِ رنگِ دوام

کوہِ نورِ شہرِ دل، اردو کے پہلے تاجدار
حیدرآباد دکن، تیری محبت کا دیار

"سجدہ گاہِ نازنینانِ دکن" "بالا حصار"
"چار مینار" ترے عہدِ وفا کی یادگار

آج بھی جیسے بہ اندازِ وفائے مستقل!
ذرہ ذرہ میں دھڑک جاتا ہے اک تیرا ہی دل

اب بھی جلتے ہیں دبستانوں میں حکمت کے چراغ
تیرے نغموں سے مہک اٹھتے ہیں کتنے ہی دماغ

جیسے ساون رت میں نکلے آسمانوں پہ دھنک
یا سمٹ جائے کسی مرکز پہ تاروں کی چمک

نام سے اُردو کے جب تک یہ زمیں ہے آسماں
فن کے مہر و ماہ کا ہے قافلہ جب تک رواں

روح پر چھاتا رہے گا تیرے گیتوں کا شباب
یاد تیری دل میں ٹھہرے گی مثالِ آفتاب

تیرا دورِ سلطنت تھا وہ اُجالوں کی کتاب
جس سے روشن ہو گئے تاریخِ انسانی کے خواب

قطبِ اُردو کا وطن گہوارۂ علم و ہنر
حیدرآباد دکن ہے مرکزِ شمس و قمر

اے معانیِ سخن اے دیدہ ور اے راز داں
ناز کرتی ہے ترے اخلاص پہ اُردو زبان

تیرے فیضانِ سخن کی مشعلیں جلتی رہیں!
باغِ اُردو میں سدا کلیاں نئی کھلتی رہیں!

صلاح الدین نمبر

قطب شہ کی زبانی

(۱)

خود مجھ سے آج سن لو مری اپنی داستاں
بکھری ہوئی فلک پہ ہے مانند کہکشاں

ہر ذرہ میرے شہر کا ہے دل کش و حسیں   ہر خطہ میرے شہر کا ہے خلد بر زمیں
یہ میرا شہر حسن نگاراں کا شہر ہے   یہ میرا شہر چشم غزالاں کا شہر ہے
اس شہر کا ہے آج بھی مخصوص بانکپن   اس کی گلی گلی میں وفاؤں کا ہے چلن
پھیلی ہوئی ہے حسن مروت کی داستاں   مہکا ہوا ہے اب بھی وفاؤں کا گلستاں
ہر شاخ گل میں خون وفا ہے رواں دواں   تہذیب زندگی کے ہیں ہر موڑ پر نشاں
یہ سرزمیں ہے اب بھی بہاروں کی سرزمیں   یہ سرزمیں ہے چاند ستاروں کی سرزمیں
انصاف کا یہ دادرسی کا دیار ہے   بستی وفا کی بھاگ متی کا دیار ہے
اقوام ہند جتنی ہیں میرے دکن میں ہیں   گل ہائے رنگ رنگ اسی رنگیں چمن میں ہیں
ہے شہر شہر میری بہاروں کا تذکرہ   میرے دکن کی سانولی شاموں کا تذکرہ
میرے چمن کے خار بھی پھولوں سے کم نہیں   شبنم کی آنکھ مصلحتاً آج نم نہیں
ہے ہر روش پہ مہر و محبت کی داستاں   ہر گام پر ہیں میرے ہی قدموں کے کچھ نشاں
جو اہل دل تھا میرا خریدار بن گیا   یہ شہر میرا مصر کا بازار بن گیا

(۲)

سنولا گیا تھا میں بھی حوادث کی دھوپ میں — فرق آگیا تھا میرے بھی کچھ رنگ روپ میں
کہنے نہ پایا تھا میں ابھی دل کی واردات — آئی قضا بکھر گیا شیرازۂ حیات
یوں تو کئی چراغ سرِ شام بجھ گئے — اوراقِ زندگی پہ فقط نام ہی رہے

(۳)

مانا کہ تم کو مجھ سے محبت ہے دوستو! — اس پر بھی تم سے مجھ کو شکایت ہے دوستو!
پر تو نہ مجھ سے دوستو! اتنی بھی بے رخی — بجھ جائے کچھ نہ کچھ تو مرے دل کی تشنگی
آئے ہو اتنی دور تو دل کے قریب آؤ — اپنا سمجھ کے جو بھی ہے دل میں مجھے سناؤ
کوئی چراغ ہے نہ مری قبر پر دیا — روشن ہے میرا دل تمھیں مل جائے گی ضیا
مرہم رکھو کچھ ایسا دلِ بے قرار پر — پھولوں کے بدلے اشک چڑھاؤ مزار پر

(۴)

یہ مانتا ہوں آج بھی کچھ غم پسند ہیں — اس انجمن میں آج بھی کچھ دردمند ہیں
پلکوں پہ ہے شفق کے سرِ شام ہی نمی — اس انجمن میں آج ہے اک مستقل کمی
ویسے خلوص، پیار سبھی ساتھ لائے ہو — محسوس ایسا ہوتا ہے کچھ بھول آئے ہو
میری نگاہیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں چار سو — اُس مردِ باوفا کی ابھی تک ہے جستجو
جس نے حیات دی وہ مسیحا نہیں ہے آج — وہ زور میرا چاہنے والا نہیں ہے آج

اک آفتاب ڈھلنے سے پہلے ہی سو گیا
کشمیر کی فضاؤں میں خاموش ہو گیا

پروفیسر جاوید وششٹ
صدر شعبۂ اردو دلی کالج دہلی

محمد قلی قطب شاہ کا رنگِ تغزل

اردو کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ، معانی قطب شاہی خاندان کا پانچواں بادشاہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) تھا۔ وہ مغل اعظم جلال الدین محمد اکبر کا ہمعصر اور شہر حیدرآباد کا بانی تھا۔ وہ بھاگمتی کی مہ جبیں رقاصہ بھاگ متی کا عاشق زار تھا۔ بقول صاحب "ماہ نامۂ محمد قلی" تلنگن بھاگ رتی کا بیٹا تھا۔ محمد قلی اور اس کے معاصرین شمالی ہند میں اکبر اعظم اور جنوب میں عادل شاہی خاندان کا بادشاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ) ہندی مسلمانی اور ایرانی تہذیب کے سنگم اور بقول ڈاکٹر زور مرحوم ایک ہندلمانی (ہندو + مسلمان) ثقافت کے بانی تھے۔ سلطان محمد قلی ایک عادل صلح کل اور امن پسند بادشاہ تھا۔ اُس نے اپنے عہد حکومت میں کبھی کسی کو سزائے موت نہیں دی۔ اس کے انصاف کا یہ عالم تھا کہ اس نے ایک "داد محل" تعمیر کرایا جس کے دروازے بازار کی طرف کھلتے تھے اور جن پر کوئی دربان نہیں ہوتا تھا۔ فریادی براہ راست بادشاہ سے ملتے تھے اور وہ ان کی داد رسی کرتا تھا۔ گویا محمد قلی دکن کا جہانگیر تھا۔ اُسے تعمیر کا بھی بڑا شوق تھا۔ اس نے باغات کے علاوہ بہت سے محل تعمیر کرائے جن میں مشہور یہ ہیں :-

داد محل، خدا داد محل، دولت خانۂ عالی، چندن محل، گگن محل، سجن محل، ندی محل، محل کوہ طور، الٰہی محل، قطب مندر، حنا محل، حیدر محل، لعل محل، اور بادشاہی عاشور خانہ۔

اس طرح وہ دکن کا شاہجہاں بھی تھا۔

وہ بڑا رنگیلا اور عیش پسند بادشاہ تھا چونکہ وہ شیعہ تھا اس لئے اس نے بارہ اماموں کی رعایت سے "محل کوہ طور" کے بارہ برج تعمیر کرائے اور اُن میں اپنی بارہ پیاریوں کو رکھا۔ اُن کے نام یہ ہیں :- ننھی۔ سانولی، کونلی، پیاری، گوری، چھبیلی، لالا، لالن، موہن، حیدر محل، محبوب اور مشتری۔ اور ان کے علاوہ بلقیس زمانی، حاتم، بہمنی، مندر، سندری، چھوری، پدمنی، سندر، سجنا اور رنگیلی۔ دوسری پیاریاں بھی تھیں لیکن رقاصہ بھاگ متی اس کی خاص محبوبہ تھی۔ اسے اپنے حرم میں داخل کرنے کے بعد اس کے نام پر شہر "بھاگ نگر" بسایا اور جب اُسے حیدر محل کا خطاب دے دیا تو بھاگ نگر کا نام بھی حیدرآباد ہو گیا۔

محمد قلی کٹر شیعہ تھا۔ اس کی عیاشی کے ساتھ ساتھ مذہبی غلو بھی اپنی انتہا پر تھا۔ رمضان اور محرم کے مہینے میں وہ

بالکل صوفی صافی کی طرح رہتا تھا۔ شراب اور رقص و سرود کی محفلیں موقوف کر دی جاتی تھیں۔ بلکہ باقاعدہ شاہی فرمان کے ذریعہ پوری سلطنت میں شراب خانے، گوشت کی دوکانیں، حجاموں کی دوکانیں اور رقص و سرود کے ہنگامے بند کر دیئے جاتے تھے۔ وہ شاہی عاشور خانے میں ننگے پاؤں جا کر خود چراغاں کرتا تھا۔ اس کا شاندار تاریخی علم آج تک موجود ہے جو "حسینی علم" کے نام سے مشہور ہے اور ہر سال محرم میں گولکنڈہ کے قدیم عاشور خانہ میں استادہ کیا جاتا ہے۔ ان دو مہینوں کو چھوڑ کر سال میں دس مہینے وہ خوب داد عیش دیتا تھا۔ کثرت شراب نوشی و عیاشی سے اس کی صحت خراب رہنے لگی اور آخر وہ ۴۸ برس کی عمر میں ہی اس جہان فانی سے چل بسا۔ ملا وجہی اس کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔ اس نے محمد قلی اور بھاگ متی کے معاشقہ کو مثنوی "قطب مشتری" میں نظم کیا۔ وجہی کے علاوہ اس کے اور کئی درباری شاعر تھے۔ محمد قلی کا ضخیم کلیات پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے جسے ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم نے اڈٹ کیا ہے۔ اس میں حمد، نعت، منقبت، مدح حضرت بی بی فاطمہ، شاعر کا مذہب، عید میلاد النبی، عید بعثت نبی، شب معراج، عید سوری، عید مولود نبی، عید غدیر، شب برات، ہلال عید، عید رمضان، بقر عید، نوروز، بسنت، دوسری عیدیں، سالگرہ، جلوہ اور دیگر رسوم، لوازمات شاہی، کھیل، برسات اور سرما، محلات شاہی، بارہ پیاریاں، دوسری پیاریاں، ناز و نیاز، افسانۂ محبت وغیرہ، موضوعات پر (۲۲۰) نظمیں، (۳۰۰) غزلیں، (۱۲) قصیدے، (۴۱) رباعیاں، (۳) مرثیے (۴) ریختی اور ایک ناتمام مثنوی کے چھ شعر شامل ہیں (۴۱) رباعیوں اور مثنوی کے چھ شعروں کے علاوہ معانی کا تمام کلام غزل کے فارم میں ہے۔

محمد قلی نے غزل کو اس کے لغوی معنوں میں پیش کیا ہے۔ اس لئے اس کی بیشتر غزلیں "گفتگو با زنان" کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ اس کی غزلوں میں بھی اس کی "پیاریاں" براجمان ہیں۔ وہ پیاریوں کے نام کے علاوہ سکی، دھن، سودھن، نار وغیرہ محبوب کے لئے استعمال کرتا ہے۔ مثلاً ؎

کیس کھولے کرنے کنگھی رات ہے ہمناں کوں اُو — مانگ کاڑے جب سکی وہ دیس ہمناں کوں دِیا

پیا سوں رات جاگی ہے سو دیتی ہے سودھن سرخوش — ملن سرخوش نین سرخوش انجن سرخوش نین سرخوش

نین تج میں ہے تج راز ہے عکس سوں نہ کہئے نازاں — اے راز ایسا نیں جو کیں کوئی جا کرے ہر ٹھار فاش

مجے اس رہات سوں کہتی ادھنجل جھند بھری بے ہوش — کسے یوں آج لگ جگ میں نہ کیتی کوئی پری بے ہوش

عجب کچھ سحر دھرتے ہیں سکی تج نین ساحر وہ — کر تج نیناں کے سحراں دیکھ ہوئے ساری بے ہوش

نہ تج مد کی پیالی اس جنس بے ہوش کیتے ہیں — دکھا جھلکار آپ مکھ کا کیتی وہ مسندی بے ہوش

محمد قلی کے اس رنگ کی تقلید کم و بیش ولی دکنی کے زمانے تک ہوتی رہی۔ ولی کہتا ہے ؎

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا — ٹک مہر کے پانی سوں توں آگ بجھاتی جا

تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دایم !! مشتاق درس کا ہے ٹک درس دکھاتی جا

مگر بعد کو غزل میں محبوب کے لئے صیغۂ مذکر استعمال کرنا غزل کی تہذیب میں داخل ہو گیا۔

معانی کی غزل کا دوسرا رنگ وہ ہے جس میں اظہار عشق عورت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اسے ریختی کا رنگ بھی کہہ سکتے ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی مرحوم نے سیّد میراں ہاشمی کو جو مادرزاد اندھا تھا اور علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۹ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے عہد میں موجود تھا، ریختی کا موجد قرار دیا ہے*۔ ہاشمی نے ایک مثنوی (یوسف زلیخا) بھی ۱۰۹۹ھ میں لکھی تھی، محمد قلی ۹۸۸ھ میں پندرہ برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا تھا۔ ان دونوں کی عمر کے تفاوت سے گمان غالب یہ ہے کہ معانی، ہاشمی سے پہلے ریختی کہہ چکا ہوگا۔ کیونکہ اس کی کلیات میں چار ریختیوں کے علاوہ اس کی بیشتر نظموں اور غزلوں میں بھی یہ رنگ غالب ہے۔ "بارہ پیاریاں" نظموں کے بعض مقامات پر محمد قلی خود "پیاری" بن جاتا ہے اور "پیاری" کو "پیارا" بنا لیتا ہے۔ میرے خیال میں اس نے اکتساب لذت کے لئے یہ حربہ استعمال کیا ہے۔ اب اس کی غزلوں میں اس رنگ کے نمونے ملاحظہ کیجئے ؎

تری نیہہ کا منج کوں بچھو لڑیا ۔۔۔ مرے سب ہی تن میں بس اس کا چڑیا
میں آئی ہوں تج پاس اُتارا کرن ۔۔۔ تھیں کرنے ہارا اتارا پیا
جو دیکھی میں اُس روپ ونتا سجن ۔۔۔ نین اس سلونی تھے پھر بس چڑیا

کھا بچھڑ کے آ دیں گے من ہرنا ۔۔۔ نگروں کی آج پیا کے چرنا!
سکی آپی توں سائیں سمجاؤ نا ۔۔۔ مندر میرے سمجھاؤ کر لیاؤ نا
پیاری کا کرنا ہے من بھاؤنا ۔۔۔ پیا منجہ بچن سے منگل گاؤنا
پیا ہات میں ہے مرا اختیار ۔۔۔ منج اپنا کیا ہے مومن بھاونا
منجے نینچے کوں دیکھ یاد آوتا ۔۔۔ النکار سوں سائیں مسکاونا

پیا بچھڑا ہے منج کوں دکھ گھنیرا ۔۔۔ نہ جانوں کب ملے گا پیو میرا

غرض پوری پوری غزلیں اسی رنگ میں موجود ہیں پیا، پیو، سجی، سائیں، گسائیں وغیرہ محبوب کے لئے آیا ہے۔ سعادت یار خاں رنگین اور جان صاحب کی ریختی کے مقابلے میں محمد قلی کی ریختی میں زیادہ نزاکت، لطافت اور نفاست ہے اگرچہ محمد قلی کے بیشتر کلام کو بھی "بھوگ بلاس" کی شاعری کہا جا سکتا ہے۔

اگرچہ معانی کا تقریباً تمام کلام غزل کے فارم میں ہے لیکن غزل میں جب بھی وہ فارسی غزل کا تتبع کرتا ہے۔ اس کی غزل بے کیف، بے رنگ اور روایتی ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ فارسی انداز فکر کے ساتھ فارسی تشبیہات، تلمیحات و

---

* دکن میں اُردو صـ ۱۴۳

استعارات بھی اپنی غزل میں سموتا ہے اور فارسی تقلید میں وہ امرد پرستی کو بھی غزل میں جگہ دیتا ہے۔ حالاں کہ ہم جانتے ہیں کہ امرد کا اس کی زندگی میں دُور دُور تک نام و نشان نہیں۔ اسی لئے اس کی وہ غزلیں جو خالص فارسی تقلید میں ہیں بے جان اور پھُسپھُسی ہیں۔ فارسی شعرا میں وہ حافظؔ شیرازی سے بے حد متاثر ہے۔ اس لئے اس نے حافظؔ کی بہت سی غزلوں کا اُردو غزل میں ترجمہ کیا ہے اور بقول ڈاکٹر زورؔ مرحوم، محمد قلی، حافظؔ کا پہلا مترجم ہے۔

"سب رس" میں ملا وجہی نے بھی حافظؔ کے ایک شعر کا ترجمہ شعر میں کیا ہے۔ حافظؔ کا شعر ہے ؎

سکندر را نمی بخشند آبی　　　بزور و زر میسر نیست ایں کار

وجہیؔ نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ ؎

بُو سکندر کوں نیں ملیا یک جام　　　زور ہور زر سوں نیں یُو ہوتا کام

وجہیؔ کا اُردو دیوان ابھی تک دستیاب نہیں ہوا ہے۔ عین ممکن ہے وجہیؔ نے بھی حافظؔ کی غزلوں کے ترجمے کئے ہوں۔ لیکن جب تک وجہیؔ کا دیوان نہیں مل جاتا محمد قلی کو ہی اوّلیت کا شرف حاصل رہے گا۔

حافظؔ کے بعد کلیات محمد قلی میں انوریؔ، خاقانیؔ، نظامیؔ، عنصریؔ اور ظہیرؔ کے نام ملتے ہیں۔ ایک قصیدہ بسنت میں اس نے اپنے شعر کو خاقانیؔ کا شعر قرار دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید وہ قصیدہ میں خاقانیؔ کے رنگ کو پسند کرتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ ؎

نزاکت شعر کے فن میں خدا بخشا ہے تو تج کوں　　　معانیؔ شعر تیرا ہے کہ یا ہے شعر خاقانیؔ

محمد قلی نے حافظؔ کی غزلوں کے جو ترجمے کئے ہیں ان کے کچھ نمونے ملاحظہ کیجئے ؎

حافظؔ	محمد قلی
سخن درست بگویم نمی توانم دید	درست بات کتا ہوں نہ جاسے منجہ تے دیکھیا
کہ مے خورند حریفاں و من نظارہ کنم	شراب پیویں حریفاں دہیں نظارہ کروں
گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں	شراب خانہ کا مسکیں ہوں، دیکھ مستی میں
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم	کہ لاڈ انبر پہ کروں حکم تل سو تارہ کروں
گل بے رُخ یار خوش نباشد	پھُل، بن رُخ یار خوش نہ دیسے
بے بادہ بہار خوش نباشد	بن مد پھُلی جھاڑ خوش نہ دیسے
با یارِ شکر لب و گل اندام	مو یار شکر لب و چنپا رنگ
بے بوس و کنار خوش نباشد	بن چمن یار خوش نہ دیسے

آنکس کہ بدست جام دارد
سلطانیٔ جم مدام دارد
ذکر رخ و زلف تو دلم را
وردیست کہ صبح و شام دارد

جے کوئی کہ ہتیلی جام لئیا
سلطانیٔ جم مدام لئیا
ذکر مکھ و زلف تج ہمن دِل
پوجن سو صبح و شام لئیا

یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور
کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور
حافظا در کنج فقر و خلوت شبہائے تار
تا بود وردت دعا و درس قرآں غم مخور

یوسف گم سو پھر آگا اب بہ کنعاں غم نہ کھا
گھر ترا اُمید کا ہوگا گلستاں غم نہ کھا
قطب شہ اس کنج فقر و خلوت دینی منے
تا اچھے وردت دعا و درس قرآں غم نہ کھا

غزلیات حافظ کے ترجموں کے علاوہ محمد قلی کی غزلوں میں بے شمار ایسے شعر ملتے ہیں جن میں حافظ کے اشعار کا چربہ پیش کیا گیا ہے۔ پھر بھی وہ اس رنگ میں ابھرنے کی بجائے کچھ دب سا جاتا ہے اور اس کی یہ غزلیں تقلیدی اور روایتی شاعری کی حد سے آگے نہیں بڑھ پاتیں۔ ڈاکٹر زور مرحوم رقمطراز ہیں کہ:۔

"عشق و عاشقی کے سلسلہ میں سلطان محمد قلی نے جہاں شاعری میں کمال حاصل کیا۔ ساتھ ہی تصوف کا چسکہ پیدا کر لیا۔ اُس کی فطری آزادہ روی اور ظاہر پرستی کے تنفر نے اُس کو واقعی ایک پختہ کار صوفی مشرب بنا دیا تھا۔"

(مقدمہ کلیات محمد قلی قطب شاہ ص۲۴۔)

اور اپنے بیان کے ثبوت میں اشعار بھی پیش کئے ہیں مثلاً:—

معانی کوں تمن غمزیاں تھے نیں ہوش
نچھل صوفی بندا ہے نار کھو رنج

دیا استاد منج تعلیم کچھ ہور
نہیں کچھ دیکھا ر باندے ہیں زنار

دیکھے نہیں کوئی نین تج، توں سب نین تھے ہے چھپا
تیرے سونیکے حُسن کا رستا رہے سنسار نقش

دنیا کا حکمت نا بوجھیں ہرگز حکیماں علم سوں
گاؤ ترانہ عیش کا ہر دم پیا کے نام پر

دنیا کو ہیچ کر یچ کوئی خدا کی بات پکڑے ہیں
او تو افضل ہیں ساریاں میں اُن کا ہے بدل طالع

جہاں توں واں ہوں میں پیارے مجے کیا کام یکسوں
نہ بت خانہ کا منج پروا، نہ مسجد کا خبر منج کوں

نبی صدقے فنا تا جانے تعلیا   محبت میں لقا پیالہ پیا ہوں

نہ لکھ سکے گا کئے شرح بج کتا بال کی   ہمارا علم ہے سب عالماں میں جیوں اعجاز

گر میرے نزدیک ڈاکٹر زور کا یہ قول صحیح نہیں۔ کیونکہ محمد قلی کے اس قسم کے اشعار کی حیثیت حافظ کے اشعار کی صدائے بازگشت سے زیادہ نہیں۔ اسے تصوف سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا وہ ایک رند شاہد باز تھا۔ اور سال میں دس مہینے بھوگ بلاس اور عیاشی میں غرق رہتا تھا اور پھر محض مسائل تصوف بیان کر دینے سے کوئی ولی نہیں ہو جاتا۔ غالب نے محمد قلی سے کہیں زیادہ اور یکجل انداز میں مسائل تصوف کو پیش کیا ہے۔ پھر تو غالب کو بھی ولی سمجھنا چاہیئے۔

محمد قلی کی غزلوں میں فارسی تلمیحات مثلاً لیلیٰ مجنون، شیریں فرہاد، یوسف زلیخا، آئینہ سکندر، جام جمشید، خضر، عیسیٰ، موسیٰ، آذر، سامری، منصور، دارا، کیخسرو، پرویز وغیرہ کے ساتھ ساتھ ہندی دیو مالا اور ہندی فضا مثلاً راجا اندر کے اکھاڑے کی اپسرائیں مینکا، اُروشی، رنبھا وغیرہ — اندر دھنک، بسنت، مور، چکور، پپیہا، کوئل، ہنس، بھونرا، کنول وغیرہ کا ہر رنگ موجود ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ محمد قلی خالص ہندی رنگ اور ہندی فضا میں اُبھرتا ہے اور یا پھر ایرانی اور ہندی رنگوں کے حسین امتزاج میں بھی خوب چمکتا ہے مگر خالص فارسی رنگ کے اشعار میں وہ بالکل روایتی اور تقلیدی ہو کر رہ جاتا ہے اور غالباً اسے اس بات کا احساس بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کی روایتی غزلوں میں بے کیفی اور بے لطفی بڑھ جاتی ہے تو عمداً کوئی ایسا شعر کہتا ہے جس میں اس کی کسی پیاری کا ذکر ہوتا ہے گویا اپنے رنگ خاص کا سہارا لیتا ہے اور اس طرح غزل کی بے رنگ اور بے کیف فضا میں رنگ و نور کی بارش کر دیتا ہے۔

محمد قلی کی نظمیں (بارہ پیاریاں اور دوسری پیاریاں) اردو شاعری میں جنسیاتی شاعری کی نمائندہ نظمیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "کوک شاستر" کا قدردان تھا اور سنسکرت لٹریچر کی کلاسیکل فضا اور دیو مالا سے بھی واقف تھا۔ اس نے ان نظموں میں "نایکہ بھید" اور "شرنگار رس" کے کم و بیش تمام لطیف پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ یہی محمد قلی کا "رنگ خاص" ہے۔ اس رنگ میں وہ اپنے پورے عروج پر ہوتا ہے۔ غزلوں میں بھی یہ رنگ خوب نکھرتا ہے اور فارسی رنگ کو بالکل ماند کر دیتا ہے۔ اس رنگ کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے

جوبن کی شاخ کوں لاگے ہیں پھل جوبن سے مست
صبا کا باکا لجا عرض میری دست بدست

ابھری ہے نین رنگ تماری کی گلابی
مدپیک تگے لاگ جوبن کھولک بولت

مدن مست، بدل مست، کچن مست، پری مست   ہوئی مست، پون مست، لگن مست، پری مست
چرتی مست، بھی مست، دُلی مست، رہی مست   کہا مست، سدا مست، سُہن مست، پہری مست
چولی مست، کھلی مست، کمل مست، بھنور مست   شکر مست، اچھن مست، ہنس مست، پری مست

بہت دن تھے لگیا ہے پیاس تیرا آس کا منج کوں !
پلادو نیر اب ہونٹاں کا ہے اُو نیر منج جنت !

موگرا چنپا جنا خوشبو اسچھے   کیس کے ہیماں منے پیچے ہے رات
سکی آج پیالا انند کا پلا منج   دیا قوت اَدھراں کی مستی دلا منج
محل دستے ہیں نور کے ات صفا سوں   سکی لیا سجن کوں منا کر بلا منج
محبت پیالہ پریاں نے کھڑیاں   دسے یوں اُن ہت میں جوں سُورچند
پیا نکھ کے قلم سوں خوش نویسی کرنے منگتے ہیں   ضرورت ہے سکی پیو ہت ایں دیناب جوبن تعویذ
پرت کے قول دیتی ہے وے منج کوں پتیاراتیں   پتیارا تو ہووے منج کوں جو دیوے منج چمن تعویذ
ین سبز تن ساری کلیاں سوک رہی ہیں   ٹک آ کے کرو گشت چمن جی اُٹھے سارا
تج مکھ کمل پہ بھونرا ہے بھونرا ہو کر اکاس   دیوے پہ جوں پتنگ پھرے بے خبر اکاس
تو میری باس ہے سکی اور تیری باس میں   بھرتا ہے ڈاواں ڈول کدھر کا کدھر اکاس
تج درس دیکھ دُور تھے بے تاب ہوئے کر   سر تج چرن سوں لانے کوں اُوے اترا اکاس

غرض محمد قلی جمال پرست بھی تھا اور عاشق پیشہ بھی۔ اس لئے اس کی شرنگار رس کی غزلوں میں بھوگ بلاس کی فضا ہے۔ اَدھر کا امرت ہے۔ نینہ مد کے پیالے ہیں۔ پیاریوں کے چمن ہیں۔ گلے میں باہوں کے ہار ہیں۔ مکھ کے کنول پہ چھند کے بھونرے ہیں۔ عشق کا برہمن ہے۔ زلف کی زنار ہے۔ جوبن کا سنگار ہے۔ چند رکھی سکھی ہے۔ ہونٹوں اور رخساروں پر دانتوں کے نشان ہیں۔ جوبن پہ ناخن کی خراش کے ہلال ہیں ایسا حسن ہے کہ جس کے خرام ناز سے مُردے جی اٹھیں۔ ایسا رُوپ ہے کہ جس کی ایک نظر سے سوکھے ہوئے پھول بھی تر و تازہ ہو جائیں اور یہ عیش و نشاط کی بزم بھی سجتی ہے تو "نبی کے صدقے" میں۔

محمد قلی کی شاعری میں "شرنگار رس" کے بعد "بھگتی رس" بھی بڑی شدت سے اُبھرتا ہے۔ یہاں بھگتی سے مراد تصوف نہیں ہے بلکہ مذہبی رنگ ہے۔ معانی نے اس رنگ میں شیعہ عقائد کی تبلیغ و اشاعت بڑی شد و مد سے کی ہے۔ اس کے کلام میں ایک طرف بھوگ بلاس اور عیاشی اپنے عروج پر ہے تو دوسری طرف مذہب پرستی بلکہ مذہبی غلو بھی اپنے منتہا پر ہے۔ اور یہ زبردست تضاد محمد قلی کے کردار کو ایک ذہنی الجھن ایک ذہنی گتھی (COMPLEX)

بھی تبدیل کر دیتا ہے اور اس طرح اس کا کردار دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ ایک "بھوگی" اور دوسرا "جوگی" لیکن اس تضاد کے باوجود اس کے ہاں وحدت تضاد بھی ہے یعنی "بھوگ" اور "جوگ" کا سنگم بھی ہے۔ وہ عیش بھی نبی و علی کو نہیں بھولتا بلکہ عیاشی بھی نبی کے صدقے میں کرتا ہے مثلاً "خداداد محل" سے متعلق ایک نظم میں کہتا ہے کہ اے پیارے! نبی کے صدقے اور بارہ اماموں کے کرم سے ہمیشہ بارہ پیاریوں سے عیش کرو؎

نبی صدقے بارا اماماں کرم تھے — کرو عیش جم بارا پیاریاں سوں پیارے

غرض "شہر نگار دس" کی شاعری کا ہر قطع "نبی صدقے" پر ختم ہوتا ہے۔ غزلوں میں بھی (علاوہ مذہبی نظموں کے) مذہبی رجحان شدت سے ابھرتا ہے۔ مثلاً؎

پایا ہوں اماماں کی دعا تاج شہانی — مج تاج میں ہے نور الٰہی جھلک آرا
نبی صدقے سدا آہتا ترکمان — کہ منج سر تاج ہے حضرت امیرا
ہیں ہیں شیعہ کر کرتے خوارج دشمنی سب سوں — علی ابن ابی طالب اُن کوں مار و ہت ضربت
محمد غلامی تھے قطب زماں — سکیاں گل میں نا یا ہے اپ نیہہ کا پھند
نبی کی غلامی میں ہے قطب شاہ — صفت اس کے ہے نانوں کی چاروں کھنڈ
ہے معانی گناہ گار بندا — رکھ محبت نظر سوں تج دربار
عشق کے منارے اوپر چیو و دل ہوں — معانی کہے بانگ اللہ اکبر
صدقے نبی کے قطب سدا عشق بازی ہے — اس کام پہ منجے دیتے ہیں پنجتن آس
نبی صدقے قطب سوں راستی ہے — اگرچہ ہے اوک اُدنا را و باش!
نبی صدقے قطب کو ندیا بچن ا چھی ثریا تھے — فلک پر تو غزل سن سن کے ہووے مشتری بیہوش

غرض اس قسم کے بے شمار مقطعے اور اشعار غزلوں میں موجود ہیں۔ اس کی مذہبی نظموں میں بھی بڑا جوش و خروش اور شدت جذبات ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا محمد قلی مذہبی آدمی تھا؟ اس کی مذہبی شاعری کے

---

* ڈاکٹر زور نے محمد قلی کے (۱۷) تخلص گنائے ہیں:۔

۱۔ محمد ۲۔ محمد شاہ۔ ۳۔ محمد قلی۔ ۴۔ محمد قطب ۵۔ قطب ۶۔ قطب زماں ۷۔ قطب شہ
۸۔ محمد قطب شہ ۹۔ محمد قطب شہ غازی ۱۰۔ محمد قطب شہ راجہ ۱۱۔ محمد قطب شہ سلطان ۱۲۔ قطب شہ نوابا
۱۳۔ معانی ۱۴۔ قطب معنی ۱۵۔ قطب العنا ۱۶۔ قطب معانی ۱۷۔ ترکمان۔
(مقدمہ کلیات محمد قلی قطب شاہ ص ۳۲)

مطالعہ کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وہ سخت مذہبی آدمی تھا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو نتیجہ برعکس نکلتا ہے۔ مذہبی غلو کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً سیاسی یعنی رعایا میں ہردلعزیزی! لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے دورِ حکومت میں دو بار بغاوتیں ہوئیں جو خود اس کے بھائیوں نے کیں جن میں سُنّی علماء کا ہاتھ تھا۔ وہ سخت سُنّی دشمن تھا اور وہ اِن کو خارجی کہتا تھا۔ اس سے کوئی سیاسی مصلحت ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کے مقابلے میں اس کا والد ابراہیم قطب شاہ زیادہ مذہبی رواداراور ہر فرقے میں ہردلعزیز تھا۔

ڈاکٹر زورؔ نے یہ شبہ بھی ظاہر کیا ہے کہ پہلے وہ شیعہ نہیں تھا بعد کو شیعہ عقائد کو اپنایا تھا۔ اس سے بھی کچھ غلو پیدا ہو سکتا ہے۔ سُنّی بغاوتوں نے اُسے اور کٹر شیعہ بنا دیا تھا۔ لیکن اس کے مذہبی غلو کی وجہ سیاسی یا مذہبی نہیں بلکہ نفسیاتی ہے۔ اُس نے اپنی عیاشی اور بھوگ بلاس کا جواز "نبی کے صدقے" میں تلاش کیا محرم اور رمضان کے مہینے میں مذہب کے رنگ میں رنگ جاتا' اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ کچھ دیر دم لینا چاہتا ہے اور تازہ دم ہو کر پھر اپنے رنگ محل کی رنگ رلیوں میں کھو جاتا ہے۔ نبی کا صدقہ اس کا تکیہ کلام بن جاتا ہے اور یہ ایک حد تک عیاشی سے فرار بھی ہے۔ اس کی پیاریاں مع بھاگ متی کے اُسے آسودہ نہ کر سکیں۔ یہی ناآسودگی اور تشنگی اسے شاعر بنا دیتی ہے اور یہی ناآسودگی فراریت کا روپ دھار کر مذہب کی طرف نہ صرف کھینچ لاتی ہے بلکہ شدّت کے ساتھ جذباتی بنا دیتی ہے۔

محمد قلی کی غزلوں میں جہاں فارسی غزل کی پیروی میں روایتی اور تقلیدی رنگ ملتا ہے وہاں خالص ہندی طرز اور ہندی فارسی رنگوں کا حسین امتزاج بھی موجود ہے جو فارسی تقلید سے زیادہ جاندار ہے' بلکہ معانی کا خاص رنگ ہے جس میں بھوگ بلاس کے ساتھ ساتھ بھگتی کا پُٹ بھی ہے۔ خواہ وہ بھگتی کسی نفسیاتی اُلجھن کا نتیجہ کیوں نہ ہو۔ بہرحال اس کی شدت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مجموعی طور پر محمد قلی کی شاعری بھوگ بلاس کی ہی شاعری ہے' وہ خود کہتا ہے ؎

ہوا سر تجھے غزل کہنے ہوس اُس پو تلی خاطر
رتن ہے شعر بوجھ جوہریاں ہم عید و ہم نو روز

ڈاکٹر مسیح الزماں
(الہ آباد)

محمد قلی کی مرثیہ گوئی کا تہذیبی پس منظر

بہمنی سلطنت کے اثر و اقتدار کے زوال نے جن حکومتوں کو خود مختار ہونے کا موقع دیا ان میں بیجا پور، احمد نگر اور گول کنڈہ کی تینوں ایرانی حکومتیں رقبہ اور دائرہ اثر کے اعتبار سے بڑی بڑی تھیں۔ یوں تو بہمنی سلطنت میں با اقتدار ہونے کی وجہ سے ایرانیوں کو اپنے طور پر زندگی گزارنے کی آزادی تھی۔ ایک نئی ابھرتی ہوئی قوت کی حیثیت سے سماجی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر ان کی چھاپ نمایاں ہوگئی تھی لیکن اپنی خود مختار حکومت ہونے کا احساس ہی دوسرا ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنے کو باقاعدہ سلطان یا شاہ کا لقب دینے کے پہلے ہی سے ان صوبہ داروں نے بہمنی سلطان کا نام خطبے سے نکال دیا اور بیجاپور کے عادل خاں نے شیعی خطبہ اس کے بجائے پڑھنے کا حکم دے دیا[1] قطب شاہی علاقے میں بھی یہ رواج بعد کو ہوگیا۔ ان ریاستوں نے حسنِ تدبیر اور جرأت و دلیری سے اپنے ملک کو الیا خوشحال اور پسندیدہ بنایا کہ قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتوں کا زمانہ تاریخ دکن کا درخشاں ترین دور سمجھا جاتا ہے۔ بقول نصیر الدین ہاشمی :—

"عادل شاہی اور قطب شاہی دور میں علم و فن کی جو ترقی ہوئی اور تعلیم کی اشاعت کیلئے جو کوششیں کی گئیں، ان کا اظہار اس وقت کے اور حال کے تمام مورخوں نے کیا ہے۔ ان کی قلمرو میں مدرسے تعمیر ہونے مسجدوں میں مکتب قائم ہونے کا تاریخوں میں کثرت سے مواد ملتا ہے۔ عادل شاہی حکمرانوں میں ابراہیم اول اور ثانی، علی اول اور ثانی کے زمانے میں خصوصیت سے علم و فن کی جانب بہت زیادہ توجہ ہوئی تھی۔ اسی طرح ابراہیم قلی اور محمد قلی اور اس کے داماد سلطان محمد اور نواسہ سلطان عبد اللہ کی حکومت میں جو علم و فن کی ترقی ہوئی وہ تابناک ہے اور یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان بادشاہوں نے علم کی ترقی اور تعلیم کی وسعت کے لئے جو کوشش کی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں"[2]

---

[1] ہارون خاں شیروانی :- دکن کے بہمنی (انگریزی) ص ۲۹۲۔ [2] نصیر الدین ہاشمی :- دکنی ادب کا تہذیبی پس منظر مجلہ عثمانیہ۔ دکنی ادب نمبر ص۴۵

ان بادشاہوں کی سرکاریں اردو شعر و ادب کی سرپرستی اور فروغ کے لئے ممتاز ہیں۔ ان کا ذوق اور ان کی علم دوستی نے علماء فضلا اور فنکاروں کی حوصلہ افزائی ہی نہیں کی بلکہ ان کی تخلیقی قوتوں کو ایسا ابھارا کہ انھوں نے علم و ادب کے نادر نمونے پیدا کئے ان کی جنگ آزمائیاں سیاسی ریشہ دوانیاں اور عیش کوشیاں اس عہد کے فنکاروں کے لئے بیڑیاں نہیں بنیں بلکہ انھیں ایسا حوصلہ ملا کہ وہ اپنے شعور سے ادب میں نئی راہیں نکالنے میں منہمک ہو گئے۔

اسی سلسلے میں ایک قابل غور بات اور بھی ہے۔ ایرانیوں کا یہ برسر اقتدار طبقہ دکن میں سیاسی اقتدار حاصل کرکے حکومت کرنے لگا۔ اپنی زیادہ جاندار تہذیبی قدروں کی وجہ اس نے ایک طرح سے معاشرتی تسلط بھی حاصل کر لیا رہن سہن، لباس، طرز تعلیم، نظم حکومت، تصورات و عقائد، فن تعمیر، رسم و رواج ہر چیز میں ان کی چھاپ نظر آنے لگی۔ فارسی زبان پورے ہندوستان کی علمی اور سرکاری زبان پہلے ہی سے بنی ہوئی تھی۔ ان ایرانیوں کو غیر ملکی نہیں کہا جا سکتا۔ ایران و ترکستان کے بادشاہوں سے سفیروں اور تحائف کے تبادلے کی بات دوسری ہے۔ دکن کے ان ایرانیوں میں سے کسی کو ایران واپس جانے کی خواہش تھی نہ ارادہ۔ یہاں انھوں نے شادیاں بھی کر لی تھیں اور سرزمین کو اپنا وطن سمجھ کر زندگی گزارنے لگے ان کی رسموں میں بعض ہندو رسمیں بھی شامل ہو گئی تھیں جن کو انھوں نے اپنی معاشرت کا جز بنا لیا تھا۔ انھیں اپنے ایرانی النسل ہونے پر ناز ضرور تھا۔ لیکن اس احساس نے انھیں تنگ نظر نہیں بنایا تھا۔ جس طرح ایک نئے ملک میں آکر ان کے آبا و اجداد نے اپنی عادتوں کو یہاں کی مقامی چیزوں اور خصوصیات کی طرف سے عصبیت نہیں پیدا ہوئی اس لئے جب اردو (دکنی) میں لوگوں نے شعر کہنا شروع کیا تو ان کی "ایرانیت" نے اس پر خشمگیں نگاہیں نہیں ڈالیں بلکہ فراخ حوصلگی سے انھوں نے اس کی بھی سرپرستی کی خود بھی شعر کہے اور شاعروں کی حوصلہ افزائی میں انعام و اکرام اس انداز سے نہیں بخشے جس میں امراء اور اہل دول کی نخوت شامل رہتی ہے بلکہ شعراء سے ان کا برتاؤ اس طرح ہوتا تھا کہ ایک تخلیقی فن کار کی خودداری برقرار رہے۔ ابراہیم قطب شاہ کے ایک امیر امین خاں امین الملک کے متعلق تلنگی زبان کے ایک شاعر پونی کنتی تلیکنا نے اپنی طویل نظم "نیتی چر تر" میں امین الملک کے پاس باریابی کا بیان اس طرح کیا ہے:۔

"مجسم اخلاق امین خاں نے مجھے اپنے قریب بیٹھنے کی عزت دی۔ میرے جسم پر خوشبو لگائی۔ ایک نہایت قیمتی کیسری رنگ کا شال میرے کندھوں پر ڈالا گیا اور جواہر کا ایک ڈبہ جس میں کئی یاقوت تھے مجھے دیا گیا اور اس کے بعد نظم سنانے کی فرمائش کی گئی"[1]

---

[1] ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور:۔ داستان حیدر آباد ص۔

بسنت کے اس طریقے میں ایک ایسے سماج کی جھلک موجود ہے جو ادیب کو اپنا ایک اہم رکن سمجھتا ہے۔ یہ سماج ایرانی اور ہندوستانی اثرات سے مل جل کر اس منزل پر پہونچا تھا جس میں مذہب و ملت، فرقہ و گروہ، نسل و رنگ کے امتیاز بنیادی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ بادشاہ اپنی رعایا کے لئے قابل احترام ہونے کے ساتھ ان کے درمیان کی ایک محبوب اور عزیز ہستی تھا جس کی ہر ادا ان کو دل پسند ہوتی تھی۔ بسنت کے پر بہار موسم میں جب قلی قطب شاہ اپنی نوبلیوں کے ساتھ پھولوں کے انبار میں مسکراتا پھرتا تو قلعہ گولکنڈہ سے متصل پُر فضا تالاب وسیع مرغزار میں اس کی رعایا بھی میلہ لگا کر جشن میں حصہ لیتی تھی اس وقت مسلمان یہ نہیں سوچتے تھے کہ بسنت ان کا تیوہار نہیں اور جب یہی بادشاہ محرم کا چاند نکلتے ہی شیشہ و جام کو سلام کر کے سیاہ ماتمی لباس زیب بدن کر لیتا اور پا پیادہ عاشور خانے کا رُخ کرتا تو اس کی رعایا جس میں بقول ڈاکٹر زورؔ مرحوم اکثریت ہندوؤں کی تھی اسی عقیدت سے اس کے ساتھ ہوتی اور کوئی یہ نہیں سوچتا تھا کہ واقعۂ کربلا کی یادگار منانے کا یہ طریقہ اصلاً ایران کے شیعوں کی رسم ہے۔ یہ رسمیں اب اس نئے سماج کی رسمیں بن چکی تھیں جن سے سب کی جذباتی وابستگی تھی۔

"محرم کے مراسم کو محمد قلی نے اس خوبی سے رائج کیا کہ شیعوں کے علاوہ سنیوں اور ہندوؤں نے بھی ان ایام کو خاص اہتمام سے منانا شروع کیا اور خاص کر محرم کے ابتدائی دس بارہ روز تک تو ایسی معروفیتیں رائج ہو گئیں جن میں سلطنت قطب شاہیہ کا ہر متنفس (خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو) حصہ لیتا تھا"[2]

ان مراسم عزا کے لئے شاہی محل کے عاشور خانے کے علاوہ اس نے ایک عاشور خانہ ۱۰۰۳ھ میں تعمیر کرایا تھا۔ جس پر ساٹھ ہزار روپے خرچ ہوئے تھے[3]

"یہ عمارت بارہ گز لمبی یعنی ۳۶ فیٹ بلند رکھی گئی اور اب تک موجود ہے۔ اس میں چودہ معصوموں کے نام کے چودہ علم استادہ کئے گئے۔ ان علموں کو استادان نادر اور ہنرمندان ماہر نے اپنے اپنے کارناموں کے طور پر بنایا ہے۔ اور چودہ گز کے زر بفتی تھان جن میں شاہی شعر بافوں نے قرآنی آیتیں اور ادعیۂ عاشور نہایت کمال کے ساتھ بُن دی ہیں ان علموں کو پہنائے جاتے ہیں"[4]

محرم میں مراسم عزاداری کی تفصیل حدیقۃ السلاطین میں ملتی ہے جو عبداللہ قطب شاہ کے عہد کی تصنیف ہے۔

---

[1] ڈاکٹر سید محی الدین زورؔ۔ مقدمہ کلیات محمد قلی قطب شاہ ص۲۰۔ [2] ڈاکٹر سید محی الدین زور۔ مقدمہ کلیات محمد قلی قطب شاہ ص۱۲۳
[3] گلزار آصفی [4] ڈاکٹر سید محی الدین زورؔ۔ مقدمہ کلیات محمد قلی قطب شاہ ص۱۲۵

اس کا اُردو ترجمہ یہ ہے :۔

"قطب شاہی سلطنت کا قدیم طریقہ ہے اور خاص کر محمد قلی قطب شاہ کے زمانے سے یہ رواج ہے کہ محرم کا چاند دیکھتے ہی خود بادشاہ بھی اور رنگ زرنگار دستے اتر جاتے اور لباس شاہی کو جامۂ عزا سے تبدیل کر لیتے اور تمام قلمرو قطب شاہی میں کہیں کوس، نقارہ، طبل یا دمامے نہیں بجتے اور گانے بجانے والے بھی اپنے تمام آلات موسیقی کو غلافوں میں رکھ دیتے۔ شاہی اور عام باورچی خانے میں گوشت کی آمد بند ہو جاتی۔ مسکرات تاڑی، سیندھی، بھنگ اور دیگر نشہ آور چیزوں کی دوکانیں بند کر دی جاتیں، نہ قصاب گوشت فروخت کرتے اور نہ تمولی پان۔ اسی طرح شہر کے حماموں میں حجام بھی اپنا کام بند کر دیتے۔ بادشاہی عاشور خانے کے صحن میں طاقچوں کی دس صفیں ایک دوسرے کے متوازی بنائی گئی ہیں۔ اور ہر صف میں تقریباً ایک ہزار طاقچے ہیں تاکہ اتنے ہی چراغ روشن ہوں اور قاعدہ یہ ہے کہ پہلی شب میں پہلی صف روشن کی جاتی ہے اور دوسری میں دوسری۔ اسی طرح دسویں کی رات پوری دس صفیں روشن ہو جاتی ہیں۔ دس ہزار چراغوں کی روشنی سے عاشور خانہ بقعۂ نور بن جاتا ہے۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے چراغدان بھی بصورت اشجار ہر شاخ پر بنائے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک میں ایک سو بیس شمعوں اور چراغوں کی روشنی کا انتظام کیا گیا ہے۔ ایوان اور حوض کے اطراف قد آدم سے بھی بلند کافوری شمعیں ہر رات روشن کی جاتی ہیں۔ عاشور خانہ میں سیاہ پوش عزاداری کا صبح و شام اژدحام رہتا۔ خوش آواز ذاکر اور خوش خواں نغمہ پرداز دل سوز مرثیے اور غم اندوز اشعار درد و اثر سے پڑھتے رہتے سننے والوں پر ان سے بے اختیار رقت طاری ہو جاتی۔ عصر کے وقت بادشاہ (عبداللہ قطب شاہ) بنفشئی رنگ کا لباس پہن کر آہستہ رفتار سواری میں یا سیاہ محل کے سنگاسن پر بیٹھ کر سیاہ پوش مقربوں، مجلسیوں، امیروں اور وزیروں کے ساتھ الاوہ میں آتا۔ دو خوش آواز ذاکر شاہی سنگاسن کے دونوں طرف خود بادشاہ کے مصنفہ مرثیے پڑھتے ہوئے چلتے۔ جب بادشاہ عاشور خانے کے دروازے میں داخل ہوتا تو سواری سے اتر کر برہنہ پا آتا اور اپنے ہاتھ سے علموں پر پھول چڑھاتا اور شام کے وقت کافوری شمعوں اور ایوانوں کے برابر کے چراغوں کو بھی اپنے ہاتھ ہی سے روشن کرتا اس وقت مرثیہ خوانی ہوتی رہتی اور ائمہ معصومین کی مدحیں پڑھی جاتیں۔ چراغ

روشن کرنے کے بعد ایک فصیح و بلیغ خطیب کھڑا ہو کر شہدائے کربلا کی ارواح کیلئے باواز بلند فاتحہ پڑھتا۔ اس کے بعد بادشاہ دولت خانۂ عالی کو واپس ہوتا اور وہاں کے عاشور خانے میں امرا و وزرا کے ساتھ آدھی رات تک ماتم و مرثیہ خوانی میں بسر کرتا۔ یہاں بغیر گوشت کے قسم قسم کے کھانے تیار رہتے اور شربت وغیرہ کی تقسیم عمل میں آتی۔[1] (حدیقۃ السلاطین ص ۲۱ تا ۱۹)

ان مراسم کی حیثیت ایک عوامی تقریب کی سی ہوگئی تھی جس کی تیاریاں لوگ سال بھر کرتے رہتے تھے۔ بادشاہی عاشور خانے کے علاوہ شاہی محل اور دوسرے امرا کے یہاں بھی عزاداری ہوتی تھی جس میں کچھ لوگ بیان شہادت کرتے، کچھ مرثیے پڑھتے۔ مرثیہ خوانی میں کچھ لوگ اپنے کہے ہوئے مرثیے پڑھتے اور کچھ دوسروں کے۔ اس طرح داد و تحسین حاصل کرنے اور شاعرانہ انداز بیان کی مہارت کے اظہار سے اپنے کو نمایاں کرنے کیلئے لوگ مرثیہ کہنے لگے۔ اس میں داد و تحسین کے علاوہ عاقبت درست کرنے کا بھی پہلو تھا۔

یہاں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اردو کا پہلا مرثیہ گو کسے قرار دیا جائے۔ نصیر الدین ہاشمی نے مثنوی نوسرہار کے مصنف اشرف کو پہلا مرثیہ گو قرار دیا ہے جس نے اسے ۹۰۹ھ میں تصنیف کیا لیکن مثنوی نوسرہار کو مرثیہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔[2]

---

[1] نصیر الدین ہاشمی:۔ دکھنی کے چند تحقیقی مضامین ص ۱۲۹ — ۱۲۸

[2] اس سلسلے میں ڈاکٹر رشید موسوی کا یہ اقتباس قابل غور ہے:۔

ہاشمی صاحب لکھتے ہیں کہ نوسرہار ایک شہادت نامہ ہے اور پھر اسے وہ مرثیہ بھی بتاتے ہیں اور اسی بناء پر اردو مرثیہ نگاری کی ابتدا کا شرف شیخ اشرف کو بخشنا چاہتے ہیں۔ ہاشمی صاحب کے اس بیان سے یہ امر بحث طلب ہو جاتا ہے کہ کیا شہادت نامہ اور مرثیہ دونوں کو ہم ایک ہی صف میں رکھ سکتے ہیں؟ جہاں تک ہم جانتے ہیں مرثیہ اور شہادت نامہ دو الگ الگ اصناف ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ دونوں میں موضوع کے کچھ پہلو متحد ہو جاتے ہیں۔ شہادت نامے ایک وسیع تجویز کے تحت مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مثنوی ان کیلئے مخصوص ہو گئی ہے۔ اس کے مقابلے میں خاص طور پر ابتدائی دور کے مرثیے مختصر اور قصیدے کے روپ میں لکھے جاتے تھے۔ بعد میں مثلث، مربع اور مخمس اور حال میں مسدس کی شکل میں لکھے جانے لگے۔ اس لئے ہاشمی صاحب کی رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

دکن میں مرثیے کے اولین نمونے ہم کو وجہی اور محمد قلی قطب شاہ کے یہاں ملتے ہیں۔ وجہی اور محمد قلی دونوں معاصر تھے اور دونوں نے مرثیے بھی لکھے تھے۔ ان دونوں میں سے مرثیہ پہلے کس نے لکھا اسے طے کرنے کیلئے ہمارے یہاں کوئی تاریخی بنیاد ایسی نہیں کہ جس کی بناء پر ہم کسی ایک کو اولیت کا شرف بخش سکیں ...... جن علما نے نوری کو دکن کا پہلا مرثیہ نگار قرار دیا ہے۔ ان کا بیان اس لئے درست نہیں کہ نوری ابراہیم عادل شاہ کے دربار کا شاعر تھا۔ اس کا ... اس کا زمانہ ... وجہی کے بعد کا زمانہ ہے۔

(دکن میں مراسم عزاداری اور مرثیہ نگاری ـــــ مجلہ عثمانیہ دکنی ادب نمبر ص ۳۵۵)

وجہی اور قطب شاہ (۱۰۲۰ — ۹۷۳ھ / ۱۶۱۲ — ۱۵۶۵ء) دونوں معاصر ہیں۔ انھیں کے مرثیے قدیم ترین موجود مرثیے ہیں۔

محمد قلی کی رسول اکرمؐ اور بارہ اماموں سے عقیدت و محبت اس کے مرثیوں ہی سے نہیں اس کی نظموں، غزلوں اور قصیدوں سے بھی ظاہر ہے وہ ان کی محبت میں سرشار ہے اور صرف عاقبت کے لئے اسے اپنا سرمایہ نہیں سمجھتا بلکہ اس پر یقین رکھتا ہے کہ اس دنیا میں بھی اُسے جو کچھ حاصل ہوا ہے، وہ حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کی غلامی کا فیض ہے اس طرح دین و دنیا میں اسے وہ اپنا مربی اور سرپرست سمجھتا ہے اس پر برابر عقیدت کے پھول نچھاور کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنے باپ کا تیسرا بیٹا تھا اس لئے اُسے جب تخت سلطنت ملا تو اسے اس نے پنجتن اور اماموں کا طفیل سمجھا۔ اس کی آزاد، خودسرا ور حوصلہ مند شخصیت نے اپنی کامیابی کے شکرانہ کے طور پر جو اقدامات کئے ان سے رعایا کے ایک حصہ میں اس کے خلاف آواز اٹھی جو بغاوت کی حد تک پہونچ گئی۔ ان حالات پر جب محمد قلی نے قابو پا لیا تو اس کی انانیت اور خود رائی نے اپنی کامیابی سے اور غذا پائی۔ اس کامیابی کو بھی اس نے پنجتن کا طفیل سمجھا اور اس کے دل میں حب اہل بیت رسولؐ کا وفور ہو گیا۔ اس کی سلطنت میں کئی بار ایسے موقعے آئے اور ہر بار اس نے اپنے خلاف سازش کرنے والوں کا قلع قمع کر کے اپنے عقائد کو تقویت پہنچائی۔

محمد قلی کے مزاج کی دو خصوصیتیں جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتی ہیں ایک ہی نفسیاتی رجحان کے دو پہلو ہیں سال کے دس مہینے وہ مہکتی زلفوں اور دمکتی باہوں میں گزارتا تھا، رنگ و نور کے سیلاب، شیشہ و ساغر کی کھنک اور بادۂ ارغوانی کی کیف باریوں سے رنگین تر بنا تا لیکن رمضان اور محرم میں ان چیزوں سے یکسر کنارہ کر لیتا تھا، سال کے دس مہینے جتنا دل کھول کر وہ دادِ عیش دیتا تھا اتنا ہی محرم کی عزاداری میں وہ منہمک نظر آتا تھا۔ حدیقۃ السلاطین[1] میں ان رسوم اور تقریبات کا بیان ہے جو چھٹی محرم سے دسویں محرم تک شاہی سرپرستی میں کی جاتی تھیں اور جن میں بادشاہ خود شریک رہتا تھا۔ ان تمام باتوں سے اس کے جوش و ہمت، حسن عقیدت اور رنگ طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ واقعہ کربلا کی اس طرح یادگار منانے اور مقصد شہادت کو عام کرنے کے اس طریقے سے لوگوں کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن امام حسینؑ سے محمد قلی کے خلوص کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سامنتی نظام میں ایک عظیم واقعے کی یادگار منانے کا جو تصور ہوتا ہے وہی محمد قلی کا بھی تھا اور ان جلوسوں میں اسی کا جلوہ نظر آتا ہے۔

محرم کے سلسلے میں ہر سال محمد قلی متعدد مرثیے لکھتا تھا جو مختلف موقعوں پر پڑھے جاتے تھے۔ افسوس ہے کہ اس کے صرف دو مکمل اور تین نا مکمل اردو مرثیے ہم تک پہونچے ہیں[2]۔ ان چند مرثیوں سے بھی اس کی بے پناہ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے لیکن عقیدت کے علاوہ اس میں شاعرانہ مضمون آفرینی اور نزاکت بیان بھی موجود ہے۔ اگر محمد قلی کے مرثیے اُردو کے اولین مرثیے ہیں تو اس کے سامنے آذری اور روضۃ الشہدا کے فارسی مرثیے ہی ہو سکتے تھے جو نمونے کا کام دے سکیں۔ اس لئے ان پر بھی ایک نظر ڈال لینا چاہیئے۔

---

[1] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۴۱ — [2] کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ

آذری (متوفی ۸۶۶ھ) کے ایک فارسی مرثیے کے چند اشعار یہ ہیں :۔

آں دم چرا زمین و زماں سرنگوں نہ شد   خاکِ سیاہ بر سرِ گردونِ دوں نہ شد
ترجمہ:۔ اس وقت زمین و زماں نے سر کیوں نہ جھکا لیا   کمینے آسماں کے سر پر سیاہ خاک کیوں نہیں پڑی
خونیں چو گشت فرقِ جگر گوشۂ رسولؐ   روئے زمیں چرا ہمہ دریائے خوں نہ شد
ترجمہ:۔ جب رسولؐ کے پارہ جگر کا سر خون آلود ہوا   تو ساری دنیا خون کا دریا کیوں نہ بن گئی

آہ از دمے کہ زد بہ جفا شمر نابکار
ترجمہ:۔ افسوس اس وقت پر کہ شمر نابکار نے
بر بوسہ گاہ سید ما تیغ آب دار
ترجمہ:۔ ہمارے رسولؐ کی بوسہ گاہ پر تیز تلوار ماری

روضۃ الشہدا (۹۰۸ھ) میں مرثیوں کا نمونہ یہ ہے :۔

اے دریغا دیدۂ انصاف گر بینا بدے   سبطِ پیغمبر چرا در کربلا تنہا بدے
ترجمہ:۔ ہائے افسوس اگر انصاف کی آنکھ کھلی ہوتی   تو رسولؐ کا نواسہ کربلا میں اکیلا کیوں رہتا
بر غریبی حسینؑ و درد او بگریستے   حضرتِ ختم النبیینؐ گر دراں صحرا بدے
ترجمہ:۔ حسینؑ کی مسافرت اور مصائب پر روتے   اگر حضرت خاتم النبیینؐ اس صحرا میں ہوتے

ان نمونوں کو سامنے رکھ کر محمد قلی کے مرثیوں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو جیسی کم عمر زبان میں اس وقت محمد قلی نے اپنے خیالات ایسے دلکش پیرائے میں بیان کئے ہیں جو ان نمونوں سے کسی طرح کم درجہ نہیں کہے جا سکتے۔ قطب شاہ کے عہد میں مرثیہ گوئی اظہار رنج و ملال کے لئے وقف تھی۔ کربلا کے واقعے کی طرف اشارہ کر دینا اس سانحۂ عظیم سے رسولؐ، جناب فاطمہؑ، حضرت علیؑ وغیرہ کو متاثر دکھانا اور اس قیامت خیز حادثہ کو سوچ کر دل میں جو احساسات موجزن ہوتے ہیں انھیں پیش کر دینا مرثیہ کا موضوع تھا۔ انھیں حدود میں محمد قلی نے اپنا زورِ طبیعت دکھایا ہے۔

کالا کیا کسوت سکا دیکھو اماں دوک تھے   ظلمات بی کالا ہوا اس دکھ تھے بھاری وائے وائے
ترجمہ:۔ خانہ کعبہ امام کے غم میں سیاہ پوش ہو گیا   افسوس اس غم سے ظلمات بھی تاریک ہے۔
آسماں پنچ جالا ہوا سورج اگن دا لا ہوا   چندر سو جل کالا ہوا ہے دکھ اپاری وائے وائے
ترجمہ:۔ اس غم سے آسمان کا پنجا جل گیا اور سورج اس قدر آگ والا ہو گیا   چاند بھی جل کر اس غم سے کالا دھبا آ گیا
پنکھی سٹے ہیں سب پراں رو رو دھائے سندراں   چھپر ٹٹ میں سب اپنے گھراں دیکھو زاری وائے وائے
ترجمہ:۔ پرندوں نے اپنے پر جھاڑ دیئے اور سمندر روتے روتے لبالب ہیں   سب اپنے گھر چھوڑ کر فریاد و زاری میں لگے ہیں

شاعر کا عقیدہ ہے کہ امام حسینؓ خدا کے عزیز ترین اور مقبول ترین بندوں میں تھے۔ جن کی راہ میں جان دینے کی وجہ سے پوری کائنات اسے اس غم سے متاثر نظر آتی ہے۔ چاند سورج سمندر پرندے سب اسے نوحہ کناں معلوم ہوتے ہیں۔

مصطفےٰ کے باغ کا پھولاں کوں بن پانی سکائے — مصطفےٰ ہور مرتضےٰؓ ہور فاطمہؓ کا دل دکھائے
نیل کپڑے پہنتے ہیں پیغمبراں اس غم سیتی — دشمنی پکڑے یزیدیاں مال ہور خاتم سیتی
جیوں نبیاں میں مصطفےٰ ہیں تیوں اماماں میں حسینؓ — کفر کے تئیں بھان کر اسلام یو کہتے ہیں حسینؓ

اردو مرثیہ کے اس ابتدائی زمینہ پر واقعات کربلا میں کسی ایک واقعہ کے تفصیلی بیان کی توقع نہیں کرنا چاہیئے۔ ذہین اور طباع شاعر پرانی بنیادوں پر نئی دیواریں کھڑی کرتے ہیں اور خیالات کے اظہار کے لیئے نئے راستے بھی تلاش کرتے ہیں لیکن یہ ذوق تعمیر و جستجو ادبی میراث اور ماحولی تقاضوں کا پابند ہوتا ہے۔ مرثیہ میں محمد قلی کی ادبی میراث وہ فارسی مرثیے ہو سکتے تھے جن کا ذکر کیا گیا اور ماحول کی طرف بھی اشارہ کیا گیا۔ ان حالات کے پیش نظر محمد قلی کے مرثیے اردو میں ایک نئے راستے کا آغاز ہیں۔ وجہی بھی ان کے معاصر ہیں لیکن وجہی کے مرثیوں میں وہ زور بیان نہیں۔ جو محمد قلی کے مرثیوں میں نظر آتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ محمد قلی کے مزاج کا والہانہ پن موضوع سے اس کے خلوص کو زیادہ گہرا کر دیتا ہے جو اس کے فن کو بلندی عطا کرتا ہے۔

بقیہ صفحہ ۷۶

میر یٰسین علی خاں:—

وہ لگن وہ خیال و خواب کہاں — دوستو زورِ کا جواب کہاں
پھول گلشن میں اب بھی کھلتے ہیں — پر چنبیلی کہاں گلاب کہاں
بے وضو پی نہیں شراب کبھی — سچ ہے واعظ تجھے عذاب کہاں
ہم بدلتے ہیں بدلے جاتے ہیں — خود زمانے کو انقلاب کہاں
چھوڑ جنت کی آرزو یٰسینؔ — دیکھ آدم ہوا خراب کہاں

علامہ حیرت بدایونی:—

چاند بھی ہے حسین گل بھی حسین — آدمی کا مگر جواب کہاں
سالہا سال سے ہے رات ہی رات — کھو گیا جا کے آفتاب کہاں
غنچۂ معصوم ہے نسیم نہ چھیڑ — ابھی چھونے کی اس میں تاب کہاں
کیا کہوں مجھ سے پوچھتے ہیں لوگ — لٹ گئی دولتِ شباب کہاں

اب بھی ملتے ہیں مجھ سے وہ حیرتؔ
وہ ملاقات کامیاب کہاں

جمال کٹرپوی

قطب شاہی دور میں تلگو کی سرپرستی

ہندوستان کی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے اپنے دورِ حکومت میں اس ملک کے غیر مسلم باشندوں کی کس طرح دلداری کی ہے اور کس طرح آپس کے میل ملاپ سے ایک مشترکہ تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈالی ہے انھوں نے کبھی بھی اس ملک کے باشندوں کو نفرت، و حقارت کی نظروں سے نہیں دیکھا بلکہ ہمیشہ ان کو برابری کا درجہ دیا اور آگے بڑھایا مسلمان بادشاہوں کی یہ پالیسی صرف رواداری ہی پر محمول نہیں ہے بلکہ اس میں بہت بڑی سیاسی مصلحت بھی پوشیدہ ہے۔ اسی مصلحت اور یگانگت کا نتیجہ ہے کہ اس ملک میں ہم آج زبان، آرٹ، تعمیرات، رہن سہن طور طریقوں اور رسم و رواج غرضکہ ہر چیز میں قومی اتحاد اور یک رنگی کے نقوش نمایاں طور پر دیکھتے ہیں اس معاشرتی اتحاد میں مسلمان بادشاہوں کے علاوہ ہندو مسلم نقرا اور رہنمکردوں کا بھی دخل رہا ہے۔ ان مسلمان بادشاہوں میں جنھوں نے ہندوستان میں حکومت کی ہے قطب شاہی (۱۵۱۲ء تا ۱۶۸۷ء) دور نہ صرف دکن کیلئے بلکہ سارے بھارت کیلئے قومی یکجہتی، جذباتی ہم آہنگی اور مشترکہ قومیت کا ایک اعلیٰ اور آن مٹ نمونہ پیش کرتا ہے۔ زمانۂ حال کے ایک ممتاز مورخ ڈاکٹر وینکٹ رامیا نے قطب شاہی بادشاہوں کو ان الفاظ میں سراہا ہے:۔

ان تمام مسلمان خاندانوں میں جنھوں نے ہندوستان میں راج کیا ہے، قطب شاہی بادشاہ سب سے زیادہ روشن خیال گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنی سلطنت میں ہندوؤں کو جو آزادی دے رکھی تھی اسکی مثال دوسری مسلمان سلطنتوں میں مشکل سے ملتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ قطب شاہی حکمرانوں نے ہندوؤں کو ملک کی اہم خدمات پر فائز کرنے میں کبھی مذہبی بنیاد پر تفریق روا نہیں رکھی۔ ہندو بھی سلطنت کی بڑی سے بڑی خدمت پر اسی طرح فائز تھے جس طرح کہ مسلمان تھے۔ قطب شاہی راج کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ راعی اور رعایا میں بڑی یگانگت تھی۔ قطب شاہوں نے کبھی اپنی رعایا پر اپنی برتری نہیں جتائی جس سے ان کا فاتح ہونا ظاہر ہو۔ یوں تو وہ مسلمان تھے مگر اپنے طور طریق میں اپنی رعایا کی طرح آندھرائی ہو گئے تھے۔

قطب شاہی سلاطین شیعہ مسلک رکھتے تھے۔ انھیں اسلامی "صوفیانہ" فلسفۂ حیات سے خاص دلچسپی تھی۔ اسلامی صوفیانہ خیالات اور ہندو ادویتہ نظریہ ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ لازمی طور پر اس کا اثر ہندو مسلم مشترکہ روایات، طور طریقوں اور تہذیب و تمدن پر بہت گہرا پڑا۔ حکومت قطب شاہی غیر مذہبی روایات یعنے سکولرزم پر قائم کی گئی۔ اس خاندان کے تمام فرماں روا تنگ نظری اور تعصب سے بالکل پاک تھے۔ تمام مذہب کے لوگوں میں مذہبی رواداری قائم تھی، بلند حوصلہ اور روشن خیال ہونے کی وجہ وہ مقامی رنگ میں اسطرح رنگے گئے کہ ہندوؤں کے ذہن میں کبھی بھی اس بات کا تصور تک نہ آیا کہ ان کے حاکم بدیسی یا غیر مذہبی تھے۔

اس عہد کے حکمران، فارسی اور اردو ادب کے علاوہ تلنگی زبان کے بھی محسن تھے۔ درباری زبان فارسی ہونے کے باوجود تلگو میں بہت سے اہم دستاویز، فرمان، اسناد اور نشان وغیرہ ترجمے کئے گئے۔ تلگو علاقوں میں تلگو زبان کے ذریعے ہی حکومتی کاروبار جاری تھا۔ خود حکمران تلگو سے واقف تھے۔ ابراہیم قطب شاہ کو اپنے بھائی جمشید قطب شاہ کے عہد حکومت میں سات سال کیلئے وجے نگر میں گزارنا پڑا وہاں کا راجا اس کیساتھ خلوص سے پیش آیا۔ یہاں اس نے ہندو ریاست کی تہذیب و تمدن کے علاوہ تلگو زبان کا بھرپور مطالعہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں جب وہ حاکم بنا تو تلگو شعراء کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ اس کے علاوہ اس نے تلگو زبان میں بھی شاعری کی ہے لیکن بدقسمتی کی بات ہے کہ اس کا کلام ابھی تک دستیاب نہ ہو سکا۔

بجا طور پر قطب شاہی دور کو دکنی زبان کا سنہری زمانہ کہا جا سکتا ہے لیکن اس عہد میں فارسی، اردو، اور تلگو زبان کو جو ترقی ہوئی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اردو اور فارسی میں جہاں وجہی، احمد خیالی، غواصی، ابن نشاطی، طبعی، امین، جنیدی، غلام علی، سیوک، اور لطیف وغیرہ، اس عہد کے باکمال شاعر گزرے ہیں، وہاں تلگو زبان میں حسب ذیل شعراء گزرے ہیں:۔

نیناپی راما کرشنوڈو، شنکرا کوی، ویلا گا پوڈی وین گنا، انگا دا یسا دیا، واسی راجو راپیا، چن داوری پی کیا، کانوکولا ترانتا راجو، بیجا راجو وینکاٹا نادھوڈو، مولاّ، ایالا راجو راما بھدروڈو، ادنکی گنگا دھروڈو، پوناکنتی تلاگنا، چندلو واڈا ملانا، سارنگو تمایا، کندکوری رودرا کوی، پنگلی سورنا، راما راجو بھوشناڈو، مری گنٹی سنگا اچاریلو وغیرہ۔

ان میں ادنکی گنگا دھروڈو نے اپنی تصنیف "تپتی سمور نو پاکھانم" کو ابراہیم قطب شاہ کے نام سے موسوم کیا ہے اس وقت کے بہت سے ہندو شعراء نے اپنی نظموں میں اپنے دیوتاؤں سے ابراہیم بادشاہ کی سلامتی کی دعائیں مانگی ہیں گنگا دھرا اپنی ایک نظم میں اس طرح دعا گو ہے:۔

" اے وشنو ـــ شہنشاہوں کے شہنشاہ ملک ابرام کو اپنی حفاظت میں لے لے "

" وہ (ابراہیم) جو امن کا بھاری ہے۔ وہ جو دیگر بادشاہوں کیلئے بھگوان ہے "

اے کرشنا ـــــ تو جو برستے بادل کی طرح ہے ۔

اے لکچھمی ـــــ تو جو دنیا کو روشنی عطا کرتی ہے

اے تلسی ـــــ تو جو دشمنوں کے سینہ پر ہیرے کی چمک پیدا کرتی ہے ۔

اے اندرا ـــــ تو جو رنگ و بو پیدا کرتی ہے ۔

اے مالک ـــــ بادل کی گرج میں بنسری کی آواز پیدا کرنے والے بادل کے پانی سے

دھرتی کی پیاس بجھانے والے میری دعا سن لے ۔

ابراہم کو اپنی رحمت سے مالامال کر دے ۔"

ہندوؤں کا یہ مذہبی عقیدہ ہے کہ دنیا میں صرف چھ عظیم شہنشاہ گزرے ہیں جنھوں نے دنیا پر حکومت کی ہے ۔ ایک نظم میں ملک ابراہیم بادشاہ کی ہردل عزیزی کی اس طرح تعریف کی گئی ہے :۔

" ملک ابراہیم ساتواں شہنشاہ ہے جس کی شہرت سات بلند پہاڑوں سے بھی بلندی حاصل کر چکی ہے جس کا نام سات سمندر پار کر چکا ہے جس کے نام کی مالا جپنے والے سات جزیروں میں گشت کر رہے ہیں ۔ جس کی نیک نامی کی خوشبو چودہ دنیاؤں میں پھیل چکی ہے ۔"

(جاٹو پدیامنی منجری صفحہ ۴۵)

تلگو ادب میں کئی جگہ ابراہیم قطب شاہ کو " ملکی بھرامو " و " اور " بھرام شاہ " کے نام سے یاد کیا گیا ہے ۔ پرانوں کے مطابق " رام " نام کے کئی مذہبی رہنما گزرے ہیں ۔ ایک جگہ ہندو شاعر ابراہیم (نام کے آخر میں رامو و بطور لاحقہ استعمال ہوا ہے) کا موازنہ ان راموں سے اس طرح کرتا ہے :۔

" پرانوں میں کئی راموں کا ذکر آیا ہے ، لیکن کیا اس رام بھرامو ڈو (یعنے ابراہیم) کے مقابلے میں کسی دوسرے رام کی وقعت و اہمیت زیادہ ثابت ہو سکتی ہے " ؟

ابراہیم قطب شاہ کے زمانے میں تلگو زبان میں مشاعرے (کوی سمیا سلن) بھی منعقد کئے جاتے تھے ۔ اس نے ادبا اور شعرا کی حوصلہ افزائی کس طرح کی اور ان کو انعام و اکرام سے کس طرح مالامال کیا اس کا ذکر تلگو زبان کا ایک شاعر اس طرح کرتا ہے :۔

" اس کی (ابراہیم) ، ایک مسکراہٹ ۔

ایک ہزار کے انعام کا فرمان تصور کی جاتی تھی ۔

اس کا کہنا " آؤ " دس ہزار کے انعام کا حکم سمجھی جاتی تھی ۔

اُس کا حکم "آؤ بیٹھو"
ایک لاکھ کی بخشش کے برابر ہوتا تھا۔
اسکا خراج تحسین "شاباش"۔
شاعر کیلئے جاگیر کے اجراء کا حکم نامہ تھا"۔

(چاٹو پدیا منی منجری صفحہ ۴۲)

کہا جاتا ہے کہ ابراہیم قطب شاہ کا وزیر آہو بالم بن نرا سمہا سوامی مندر کا ئیت چھین لایا جس کی وجہ ابراہیم بادشاہ اُس کی اس نازیبا حرکت پر بہت غمگین ہوا یہی غم اس کی بیماری اور موت (۱۵۸۰) کا سبب بنا۔ اس وقت تلگو بھاشا کے شاعر نے برہما (موت کے خدا) کو اس طرح بُرا بھلا کہا ہے:۔

"کیا تجھکو اور کوئی بادشاہ نہیں ملا۔
دنیا میں بہت سے حاکم ہیں جو شر پھیلاتے ہیں۔
لوگوں پر ظلم وستم کرتے ہیں۔
کاش اُن میں سے کسی کی جان لے لیتا۔
لیکن تو نے ایسے شہنشاہ کی جان لی ہے۔ جو امن کا پُجاری تھا۔
انسانیت کا متوالا لوگوں سے پیار کرتا تھا۔
کیا تو پھر اس قسم کے عظیم انسان کی تخلیق کر سکتا ہے؟
کیا یہ بات تیرے دستِ قدرت میں ہے؟"

(چاٹو پدیا منی منجری صفحہ ۴۶)

اسی عہد کا ایک اور درباری شاعر کندکوری رودراگزرا ہے جس نے "نیرنکو شویا کھیا نم" "سوگریوا وجیا"۔ "سوامادہ پیکا" (سنسکرت میں کام شاستر) "سادا سا جنا مانور نجنامو" "بالا وادری شا تا کمو" "گوداآ جنیا" جانا رتھا سنو ترا شتکمو" اور شرو نگارا جنار دھا شتکمو" جیسی نادر کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اس کو چنتلا پالم نامی گاؤں بطور جاگیر عطا کیا گیا۔

اسی طرح ابراہیم قطب شاہ سے خلعت و انعام حاصل کیا ہوا ایک اور تلگو شاعر یا سوری مارسنگنی سنگاا چاریلو ہے۔ اُس نے "دشارا دھا راجہ نندا نا چارتبرا" نامی مشہور و مقبول کتاب میں راماین کی کہانی کا منظوم ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

اس خاندان کے بادشاہوں کے سوا دیگر امرائے سلطنت بھی ہندو شعراء و ادیبوں کی سرپرستی میں اپنے بادشاہوں کی پیروی کر رہے تھے، تیلا گنّا امین خاں کی رعایا پروری سے خوش ہو کر اپنی تصنیف "یایاتی چاترامو" کو اس کے نام موسوم کیا ہے۔ تلگو زبان کا یہ وہ پہلا شاعر ہے جس نے خالص تلگو زبان میں شاعری کی ہے۔ خالص تلگو زبان کی داغ بیل ابراہیم قطب شاہ کے زمانے میں پڑی۔ تیلا گنّا کو اس کا موجد قرار دیا گیا ہے" وہ (ابراہیم قطب شاہ) خالص تلگو پر زیادہ اہمیت دیتا رہا۔ بہ نسبت ایسی تلگو زبان کے جس میں سنسکرت کے دقیق الفاظ استعمال کئے گئے ہوں ملاحظہ کیجئے صفحہ ۱۸۱ "جدید ہندوستان کی زبانیں اور ادبیات" (انگریزی کتاب) از سونیتی کمار چیٹرجی۔

اسی دور کے شعراء میں لاّ ریڈی ایک اہم شاعر ہے۔ اس نے "شا تا چکرا ورتی" "شوادھرمو تارامو" "پدما پرانمو" نامی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اس کی شاعری سادگی دیدہ کاری اور منظر کشی کیلئے مشہور ہے۔

محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء) کے زمانے میں تلگو کے جو شعراء گزرے ہیں ان میں سے ایک سارنگو تما یا ہے۔ وہ گولکنڈہ کا کرنم تھا (زمینات کا لگان وصول کرنے والا) اس کو بادشاہ وقت بہت چاہتا تھا اس نے "ویجنتی ویلاسا" نامی کتاب لکھکر تلگو ادب میں ناموری حاصل کی ہے۔

اس خاندان کے آخری بادشاہ ابوالحسن قطب شاہ (۱۶۸۷ء) کا ایک عہدیدار کنچرلہ گوپنّا مشہور شاعر گزرا ہے۔ اس کو رام سے نہ صرف یہ کہ عقیدت تھی بلکہ حد درجہ عشق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو "راما داسو" کے نام سے آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس نے "داسا رادھی شاتا کامو" نامی کتاب تصنیف کی ہے جو آج بھی تلگو دنیا میں بہت مقبول ہے۔ اسی طرح "راما داسو کیرتانالو" بھی اس کی ایک مشہور تصنیف ہے۔ یہ دونوں کتابیں ہندو مذہبی روایات اور عقائد سے تعلق رکھتی ہیں۔ آج بھی ہندو لوگ بڑی دلچسپی اور بھگتی سے پڑھتے ہیں۔

۱۶۱۱ء میں کگان تادھا نامی شاعر گزرا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو ایک درباری شاعر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اسکے علاوہ چِترآیا نامی شاعر نے عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۶ء) کے درباری شاعر تلاسی سورتی سے بازی لگائی اور چالیس دن میں (۱۵۰۰) اشعار لکھکر حاکم وقت سے انعام و اکرام حاصل کیا۔

اس عہد میں نہ صرف ہندو شعرا و ادبا کی سرپرستی کی گئی بلکہ بہت سے ہندوؤں کو حکومت کی جانب سے بڑی بڑی جائیدادیں بھی دی گئیں۔ امفاراؤ نامی ایک ہندو قلی قطب شاہ کا ملازم رہا ہے اس کی وفاشعاری سے خوش ہو کر بادشاہ نے اس کو ملی مڈگو نامی مقام کا حاکم بنا دیا۔ اسی طرح جگ پتی راؤ کو تدیال کا حاکم مقرر کیا۔ سرراؤ کو قاسم کوٹا نامی تعلقہ کا افسر بنایا۔ ساباجی راؤ کو سرنوبت کا عہدہ عطا کیا۔ راماچندر کو پٹیا پودم کی جاگیر عطا ہوئی۔

ابوالحسن قطب شاہ کے پاس اکنّا اور مادنّا نامی دو ہندو وزراء تھے۔ یہ دونوں وزرا بہت سی خدمت گزار تھے۔ انھوں نے مال گزاری زمینات کے محصولات کی وصولیابی اور زمینوں کی پیمائش وغیرہ کے بہت سے اہم کام سرانجام

بیٹے ہیں۔ کنچرلہ گوپنا بھدراوتی کا تحصیلدار تھا۔ سانگوتما یا محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں ارضی کا افسر تھا۔

ان سلاطین نے مسلمان ہونے کے باوجود ہندوؤں کے مندروں کی دیکھ بھال کے لئے جاگیریں عطا کیں۔ اس کی زندہ مثال آج بھی دیکھنے میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ بھدراچلم نامی مندر کو سال میں ایک دفعہ شری راما نومی کے دن حیدرآباد کے نواب کی جانب سے تحفے انعام وغیرہ روانہ کئے جاتے ہیں۔

ابراہیم قطب شاہ کے دور میں مقامی رسم و رواج کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ لباس میں بھی کافی تبدیلی آگئی۔ آب و ہوا اور مقامی لوگوں کے طور طریقوں کا خیال کرتے ہوئے باریک ململ کے جھبے زیب تن کئے جانے لگے۔ ایرانی لباس کو ترک کر دیا گیا۔

محمد قلی قطب شاہ نے اپنے بہت سے اشعار میں "دکن" کی سرزمین کی تعریف کی ہے "دکن" اور "تلنگانہ" کی سرزمین کو اپنا وطن قرار دیا ہے۔ تلگو تنقید نگاروں کا کہنا ہے کہ طوطی نامہ "شوکا سپتاتی" نامی سنسکرت کتاب کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ کا کام بھی قطب شاہی دور کی یاد دلاتا ہے۔

اسی کے عہد میں ہر سال چودہ قومی عیدیں اور تہوار منائے جاتے تھے۔ ان میں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی عیدیں بھی شامل ہیں۔ ہندوؤں کی عیدوں اور تہواروں میں بادشاہ وقت خود دلچسپی لیتا تھا۔ نوروز ہوئی بے ڈو واکا (بہار کے موسم کا ایک تہوار) پر قلی قطب شاہ نے کئی نظمیں اور گیت لکھے ہیں۔ جس طرح مسلمان ہندوؤں کے تہواروں اور میلوں میں دلچسپی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ اسی طرح ہندو بھی مسلمانوں کی عیدوں میں خلوص سے حصہ لیتے تھے۔ آج "محرم" سے متعلق جو بہت ساری رسمیں ہم میں پائی جاتی ہیں وہ ہندوؤں سے حاصل کی گئی ہیں۔ اس قسم کی رسمیں اسلامی دنیا میں اس سے پہلے کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آئیں۔ جنوبی ہند میں "محرم" کے تہوار کا رواج سب سے پہلے قلی قطب شاہ کے زمانے سے شروع ہوا۔

ڈاکٹر بی راما راجو ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "ابراہیم بادشاہ کی ہندو بیوی سے قلی قطب شاہ پیدا ہوا۔ یہی سبب ہے کہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی بہت سی رسوم و رواجوں کو ایک دوسرے میں خلط ملط کرنے کی سعی کی ہے" اس کے علاوہ اس نے بھاگیا متی سے محبت کر کے اسی کے نام پہ بھاگیا نگر قایم کیا۔ یہی بھاگیا نگر آج شہر حیدرآباد کے حسین روپ میں ریاستِ آندھرا پردیش کا دارالخلافہ بنایا گیا جو قطب شاہی دور کی شاندار قومی یکجہتی کی روایات کی یاد دلاتا ہے۔

یہ وہی روایات ہیں جن کی بنا پر آج بھی بہت سے ہندو "محرم" کے دنوں میں تابوتوں کو اپنے سروں پر لئے پھرتے ہیں۔ عاشور خانوں کے سامنے الاؤ کھدواتے ہیں۔ آگ بھڑکتی ہیں اور اس پر ننگے پیر دوڑ کر آگ سرد کر دیتے ہیں۔ جانوروں کی نقل کرتے ہیں۔ یہ ایک عام رواج ہے کہ ہندو "دیپاولی" کے دن پٹاخے جلاتے ہیں۔ اس رواج کو شب برات کے موقع پر جاری کیا گیا۔ اسی طرح شادی بیاہ کے موقع پر آج مسلمان گھرانوں میں جو بہت ساری رسمیں دیکھی جاتی ہیں یہ اس عہد کی یاد دلاتی ہیں۔ نکاح سے پہلے جب دلہا دلہن کے گھر

جاتا ہے تو دلہن کے سامنے اور سالیاں گھر کے اندر داخل ہونے سے روکتے ہیں اور خوب چھیڑ چھاڑ ہوتی ہے۔ شادی کے بعد "جلوہ" کی رسم کے موقع پر دولہا دلہن کو آئینہ میں دیکھتا ہے۔ دونوں کے سروں پر چاول چھڑکے جاتے ہیں غرض کہ اسی طرح کی بہت سی ہندو رسمیں مسلمانوں کی شادی بیاہ میں داخل ہو کر سماجی روایات بن گئی ہیں۔

قطب شاہی دور میں عموماً ہندوؤں کی اور خصوصاً برہمن عالموں کی بڑی قدر ہوئی۔ "کوچی پوڑی" نغام ان لوگوں کے حوالے کر دیا گیا جو آرٹ اور ادب میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اس طرح کوچی پوڑی ناٹک اور سنگیت وجود میں آئے جنکو شاہی سرپرستی حاصل تھی۔

تلگنا نے اپنی کتاب "یایاتی چرترا" میں سردار امین خاں اور ان کی بیوی بڑی بی کی بڑی تعریف کی ہے۔ دونوں نے غریبوں اور بیواؤں کی بڑی مدد کی ہے۔ کئی برہمن لڑکیوں کی شادی کروائی ہے۔ یہ دونوں غریب بچوں کی دیکھ بھال خود کرتے تھے۔ اپنے نام پر امین پور نامی گاؤں آباد کیا جس میں ایک بڑا تالاب کھدوایا گیا اور پھولوں کے باغات بھی لگوائے گئے۔

رعایا اپنے ان حاکموں سے بہت خوش تھی۔ یہی سبب ہے کہ عوام انھیں بڑا مالک، بڑے حاکم، تاناشاہ (اچھے حاکم) کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہبی کدورت نہ تھی۔ یہ دونوں اقوام حکومت کی نظروں میں اسی طرح تھے جس طرح ایک گاڑی کیلئے دو پہیئے ہوتے ہیں۔ اسی میل ملاپ کا نتیجہ ہے کہ مذہبی اور سماجی رسومات کے ساتھ ساتھ آج بھی تلگو زبان میں اُردو کے کئی الفاظ رس بس گئے ہیں۔ دکھنی اور اُردو میں تلگو، مراہٹی اور کنڑ کے کئی الفاظ موجود ہیں۔

صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو آج آندھرا پردیش میں جس مشترکہ تہذیب و تمدن کا نقشہ نظر آتا ہے اسکو قطب شاہی ورثہ سمجھنا چاہیئے۔ قطب شاہیوں کی علم دوستی، شعر و سخن کی قدردانی، عالموں کی سرپرستی، رعایا پروری، دکن کی سرزمین سے فطری لگاؤ، وسعتِ نظری، ہندوؤں کی دلداری، تہذیبی رسموں میں دلچسپی، ہندو مسلم غیر جانبداری اور انصاف پسندی اور اس قسم کے دیگر صفات آج بھی ہمارے لئے "قومی یکجہتی" کی تحریک میں ایک مشعل راہ کا کام دیتی ہیں۔

نوٹ: ۔ مضمون کی تیاری میں حسبِ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے: —

(۱) "سامراجیہ آندھرا ساہتیم" (تلگو) آٹھویں جلد (نوابوں کا دور) از آرودرا۔

(۲) "نانا سنسکرتی چرترا" (تلگو) مرتب از جی پانڈو رنگیا۔

(۳) "قطب نامہ" (تلگو منظوم) از شیخ بڈن صاحب۔

(۴) "سب رس" اردو رسالہ (حیدرآباد) اپریل ۱۹۶۵ء

مرتبہ
وقار خلیل

اِنتخاب طرحی مشاعرہ یوم محمد قلی قطب شاہ

۱۹۶۶ء

ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے منعقدہ سہ روزہ یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب کا ایک اہم جزو طرحی مشاعرہ بھی تھا۔ اتوار فروری ۱۹۶۶ء کو ۹ بجے شب ایوان اردو کے دلکش اور بقعۂ نور آڈیٹوریم میں یہ یادگار طرحی مشاعرہ علامہ حیرت بدایونی کی صدارت میں شروع ہوا۔ باذوق سامعین سے نہ صرف آڈیٹوریم بلکہ میوزیم گیلری اور ریڈنگ روم کے تمام گوشے کھچا کھچ بھر گئے تھے۔ محترمہ عائشہ رشاد نے معتمد مشاعرہ کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔ شمع کے روشن کئے جانے کے ساتھ ہی مشاعرہ کا آغاز محمد قلی قطب شاہ کی غزل سے ہوا جسے جناب ارمان فاروقی نے اثر آفریں ترنم میں سنایا۔ شہ نشین پر محمد قلی کی خوبصورت اور رنگین تصویر سب کی توجہ اپنی طرف مرکوز کئے ہوئے تھی۔

علامہ حیرت بدایونی نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے یوم محمد قلی کی ادبی اور تہذیبی اہمیت کا ذکر کیا اور تقریب کے بانی ڈاکٹر زورؔ مرحوم کا تذکرہ کرتے ہوئے کارکنان ادارہ کو اسی لگن اور اسی جذبۂ رفاقت سے علم و ادب کے کاموں کو آگے بڑھانے کے سلسلے میں مبارکباد دی۔ آقائی فرخ شیرازی نے فارسی میں اپنی غزل سنا کر مشاعرہ کے طرحی دور کا آغاز کیا۔ اس طرحی مشاعرہ میں تیس شعراء صاحبان نے حصہ لیا اور خوب خوب شعر سنا کر اہل ذوق حضرات سے داد حاصل کی۔ ذیل میں شعراء کی غزلوں سے منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان غزلوں کا انتخاب اس میں شریک نہ کیا جا سکا جو ہمیں مشاعرہ میں پڑھنے کیلئے وصول ہوئی تھیں یا مشاعرہ کے بعد کسی وقت وصول ہوئی ہیں۔ بعض ایسے شعرائے کرام کی غزلیں بھی ممکن ہے کہ انتخاب سے رہ گئی ہوں جنھوں نے غزل پڑھنے کے بعد اس کو معتمد مشاعرہ کے حوالے نہ کیا یا نظرثانی کے بعد دینے کا وعدہ فرمایا اور نہ دے سکے۔

طرح :— ساقیا آ شراب ناب کہاں
(ق) (ن)

سلطان محمد قلی قطب شاہ معانی :—

ساقیا آ شراب ناب کہاں! چندکے پیالے میں آفتاب کہاں
عاشقاں منگتے ہیں سماع کرن چنگاں نے کہاں رباب کہاں

سو کر دیکھو کتے ہیں ساجن کون — وطے میرے نین کوں خواب کہاں
نیند کی ہے خماری نیناں ہیں — او کنول مکھ دھو دیں گلاب کہاں
سکی مجلس شہاں سنوارے ہیں — مجلس قطب کامیاب کہاں

فتح شیرازی:- ساقیا آن شراب ناب کجاست — تاکہ مستم کند شراب کجاست
من و منصور ہم سفر بودیم — چہ شد آں دار و آں طناب کجاست
دل ز دستم برفت و صبر نماند — در غم یار صبر و تاب کجاست
وصل او از خدا ہمی طلبیم — آن دعاہائے مستجاب کجاست
زرخا تشنگی بدست آورد — تا عیاں نشود کہ آب کجاست

سید محمود احمد محمود:- گل چمن میں سنور سنور کے کھلے — پر ترے حسن کا جواب کہاں
غیر ہیں بامراد محفل میں — اپنی قسمت ہے محو خواب کہاں
تو گرفتار عشق ہو محمود!!! — تم نے دیکھے ہیں انقلاب کہاں

احمد اللہ حسینی احمد:- حسن ڈھلتا ہوا، ہوا رخصت — پیری آئی، گیا شباب کہاں
ہیں کٹھن انتظار کی گھڑیاں — ساقیا آ، شراب ناب کہاں

مظفر الدین صاحب:- اس قیامت خرام کو دیکھے — دوڑے جاتا ہے انقلاب کہاں
میرے عصیاں کا اب شمار نہیں — رحمتوں کا تری حساب کہاں

اسحاق ملک:-
اے کتاب فسانۂ ہستی — ختم ہونا ہے غم کا باب کہاں
کس کو دکھلائیں اپنا داغ جگر — جگمگائے یہ آفتاب کہاں

سجاد رحمت:-
گیسوؤں کو کسی نے جب کھولا — چھپ گیا جانے آفتاب کہاں
دینے والوں کو مانگتے دیکھا — کھینچ لایا ہے انقلاب کہاں
اپنے عصیاں کا ہے حساب کتاب — اس کی رحمت کا ہے حساب کہاں

احمد اللہ قادری:-
تم نہیں ہو تو حسن منظر کیا — اب وہ کیفیت شراب کہاں
رد ہوئی میری ہر دلیل وفا — آپ ہوتے ہیں لاجواب کہاں

دیکھیں کہاں کس پہ برق گرتی ہے
رخ یہ اٹھتا ہے یہ حجاب کہاں
گننے والے ہے گناہوں کے
تیری رحمت کا ہے حساب کہاں

داؤد نصیب:۔

میں کہاں حسنِ لاجواب کہاں
شب کی قسمت میں آفتاب کہاں
جو شعورِ نظر نہیں رکھتے
اُن کو احساسِ انقلاب کہاں
اپنی تقدیر کی ہے بات نصیب
ہر کوئی غم سے فیضیاب کہاں

درگا راج راز:۔ یوں تو کہنے کو ایک دفتر ہے
پھر بھی گنجائش جواب کہاں
یہ محبت کی رہگزر ہے راج
بچ کے جائیں گے ایجناب کہاں

ثریا جبیں قہر:۔ زندگی خود عذابِ کامل ہے
اس سے بڑھکر کوئی عذاب کہاں
تھک کے آخر کو نیند آہی گئی
کتنے تارے گنے حساب کہاں

غازی جلیلی:۔ اس کا کوچہ ہے اور رسوائی
میری مٹی ہوئی خراب کہاں
جان و ایمان کی خیر ہو غازی
پڑ گئی چشمِ انتخاب کہاں

خالد کشمیری:۔ میں وہی، میری تشنگی بھی وہی
میں کہاں اور شراب ناب کہاں
فرصتِ آہ بھی غنیمت ہے
عرضِ مطلب کہاں جواب کہاں

ابوالفضل محمود فیضی:۔

حسن کو حاجتِ نقاب کہاں
پر یہاں دیکھنے کی تاب کہاں
درد نے لاکھ لی نئی کروٹ
دل کی دنیا میں انقلاب کہاں

منوہر لال بہار:۔ کتنا ساکت ہے زندگی کا نظام
دل میں پہلا سا اضطراب کہاں
دور کیوں ہو، قریب آجاؤ
ہم میں تم میں رہا حجاب کہاں
محروم ہیں بہار شرمندہ
ان میں وہ حسنِ لاجواب کہاں

سراج حیدرآبادی:۔

ہر نظر آپ ہی کا پردہ ہے
آپ ہوتے ہیں بے حجاب کہاں
جبرِ فطرت سہی حیات مگر
راستوں پر ہے احتساب کہاں
شمع بھی ہے، دلِ سراج بھی ہے
ہوگا احساسِ التہاب کہاں

رمن جامی:۔ ہائے وہ چہرہ جس میں سب کچھ ہے
آج ملتی ہے وہ کتاب کہاں

دل بھی اب ہے مشین کی صورت — وہ تڑپ اب وہ اضطراب کہاں
آپ رحمٰن جامی شاعر ہیں — آپ انساں ہیں کامیاب کہاں

رئیس اختر:- زندگی کے شعور سے بڑھکر — زندگی میں کوئی عذاب کہاں
کیا پتہ وقت کے اندھیروں میں — چھپ گئے میرے ماہتاب کہاں

صلاح الدین نیر:-

جس کے پینے سے زہر بنتا ہے — وہ لہو ہو تو ہو شراب کہاں
بدگمانی نہیں مگر نیر — زندگی سے بڑا عذاب کہاں

تاثیر صدیقی:- کوچۂ یار دو قدم پر ہے — بڑھ گیا دل کا اضطراب کہاں
نقش محفوظ ہیں زمانے کے — دل سے بڑھکر کوئی کتاب کہاں

معین بزمی:- چشم ساقی کا ہے کرم ورنہ — میں کہاں ساغر شراب کہاں
دل کی وحشت کو پوچھئے کیا ہو — میرے دامن کا ہے جواب کہاں

مظہر کامل:- جب ملے جام ان کے ہاتھوں سے — مے سے اس وقت اجتناب کہاں
ساتھ ہوں اس کے جس کا مظہر ہوں — وہ نہیں تو مرا حساب کہاں

ریورنڈ ہنسن ریکانی:-

رہزنی کر رہے ہیں جو رہبر — ان کے اعمال کا حساب کہاں
تاجداروں کا حال ہم سے پوچھ — تونے دیکھا ہے انقلاب کہاں
جنگ کی بات اب کرے نہ کوئی — فرق مفتوح و فتح یاب کہاں

برق یوسفی:- بڑھ گیا اور درد محرومی — رہ گیا دل کا اضطراب کہاں
شب کی وادی میں بھٹکتا ہوں — کھو گیا دل کا اضطرب کہاں

حامد بن شبیر:-

اک نشہ دائمی تو اک وقتی — چشم ساقی کہاں شراب کہاں
مجھکو رحمت پہ ہے یقیں زاہد — تیرے حصے میں یہ ثواب کہاں
سنگ در اس کا مل گیا ورنہ — خانۂ خانماں خراب کہاں

بانو طاہرہ سعید:- داغ عصیاں بہت ہیں دھو ڈالیں — ساقیا آ شراب ناب کہاں
زور صاحب کی ہے جگہ خالی — اب وہ ایواں میں آب وتاب کہاں

باقی برصفحہ ۷۵

MAY 1966

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجراء ۱۹۳۸ء

فون { ادارہ- ۵۲۰۹ ۳ / معتمد- ۳۲۴۶۳ }

جلد ۲۹ شمارہ ۵ مئی ۱۹۶۶ء

ترتیب

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد دکن

نگران

پروفیسر سید علی اکبر

مجلس مشاورت

میر حسن   ڈاکٹر گوپی چند نارنگ   رمن راج سکسینہ

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

زرسالانہ ہندوپاک سے   چھ روپے

غیر ممالک سے   دس روپے

ششماہی   تین روپیہ   فی پرچہ پچاس پیسے

مہتمم ادارۂ ادبیات اردو کے اہتمام میں نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو- خیریت آباد حیدرآباد ۴ سے شائع ہوا

اپنی بات

آندھرا پردیش ہندوستان کی ایک ایسی خوش قسمت ریاست ہے جس کا کوئی جواب نہیں۔ وہ غذائی اعتبار سے نہ صرف خود مکتفی ہے بلکہ ہمسایہ ریاستوں کو غلہ فراہم کرتی ہے اس کے وسائل آبپاشی اوروں کے مقابلے میں بہتر ہیں اور بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔ قیام آندھرا کے بعد ریاست کو ین سنجیوا ریڈی، سنجیویا اور کاسو برہمانند ریڈی جیسے وسیع الخیال فراخ دل اور وسیع النظر چیف منسٹر ملتے گئے جن کی رہنمائی میں ریاست کے ہر شعبہ میں عوام کا قدم آگے بڑھتا رہا۔ عوام کے مطالبہ پر جب سرکاری زبان بل اسمبلی میں پیش ہوا تو وہ منظور کر لیا گیا اور اب قانون ساز کونسل میں بھی تمام گوشوں سے بھرپور تائید کے ساتھ منظور ہو گیا۔ آندھرا کے عوام نے ہندوستان میں سب سے پہلے لسانی بنیاد پر ریاست کی تخلیق کی اور اقلیتی زبانوں کی متعلقہ علاقوں میں عوام کے مفادات کو ملحوظ رکھتے ہوئے استعمال کرنے کی گنجائش فراہم کی۔ قانون ساز کونسل کے صدر نشین جناب آنندم نے بل کی تائید کرتے ہوئے اردو کے بارے میں یہ واضح کیا کہ یہ کسی مخصوص طبقہ کی زبان نہیں بلکہ ۵۵ تا ۶۰ فیصد عوام اس زبان میں بات چیت کرتے ہیں اس کی کوئی علیحدہ ریاست نہیں لیکن ہر ریاست میں یہ اکثریت کی بول چال کی زبان ہے۔ قانون ساز کونسل کے ارکین میں کنکا راجو، اے سیتا رام ریڈی، بی راگھو اچاری اور وزیر قانون جناب پی نرسمہا راؤ کے علاوہ جناب ابو یوسف اور جناب مخدوم محی الدین صاحبان نے بھی تقاریر کیں اور بتلایا کہ یہ بل اقلیتی زبانوں کے تحفظ کے لئے ہماری حکومت کا عملی اقدام ہے۔ اور خواہش کی کہ جلد از جلد اس کو روبہ عمل لایا جائے۔

۲۴ اپریل ۱۹۶۶ء کو ادارہ ادبیات اردو کے حسینی جبلی آڈیٹوریم میں ایک خوشگوار تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت آندھرا پردیش کے گورنر شری پورم تھانو پلے نے کی۔ ڈاکٹر غلام یزدانی سابق ناظم آثار قدیمہ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اکیڈیمک بورڈ کے پہلے صدر تھے ان کے انتقال پر بورڈ نے ان کی یادگار میں ایک کتاب شائع کرنے کی تجویز کی یہ کتاب پروفیسر ہارون خاں شروانی کی ادارت میں مرتب ہو کر شائع ہوئی جس کی اجرائی کیلئے یہ تقریب منعقد کی گئی تھی۔ پروفیسر سید علی اکبر صدر ادارہ ادبیات اردو نے اپنی تقریر میں ادارہ کے قیام سے آج تک کے کاموں کا نہایت جامع اور مختصر خاکہ پیش کیا اور اس طرح ہز اکسلنسی گورنر کو ادارہ کے کاموں سے پہلی دفعہ واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا۔

"میٹھے بچن" کے عنوان کے تحت ماہ محرم کا لحاظ کرتے چند ایسے مرثیہ گو شعرا کے مرثیے پیش کئے جا رہے ہیں جن کے ذکر سے ہماری تاریخیں اور تذکرے خالی ہیں۔ مرزا اوج قائم کے بارے میں خصوصی طور پر وضاحت کر دی گئی ہے۔ آئندہ شمارے میں بھی دو تین مرثیہ گو شعرا کے مرثیے پیش ہوں گے۔

پروفیسر سید مبارز الدین رفعت

تبصرة الخوارق

حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے متعلق ایک اہم ماخذ

ہندوستان میں عظیم المرتبت چشتیوں کا سلسلہ خواجۂ بزرگ حضرت بندگیِ مخدوم معین الدین چشتی اجمیریؒ سے شروع ہوتا ہے۔ آپ سے لے کر حضرت بندگی مخدوم خواجہ گیسو دراز تک جتنے چشتی بزرگوں نے مسندِ رشد و ہدایت کو زینت بخشی، وہ سب، اللہ اکبر، کس پائے، کس مرتبے اور کس جلالتِ شان کے بزرگ ہوئے ہیں، اور ان سب کے آخر میں اس سلسلے کی آخری کڑی، ویسی ہی جلالت شان والی، مرتبہ و درجہ میں ان ہی کی ہمسر، ویسی ہی فیضان رساں، اور ویسی ہی انسانیت پرور خواجۂ دکن، بندگی مخدوم حضرت سید محمد گیسو دراز بندہ نوازؒ کی ہے۔

خواجۂ دکن بندگیِ مخدوم سیدنا حضرت ابو الفتح صدر الدین سید محمد محمد حسینی گیسو دراز بندہ نوازؒ ۷۲۱ھ بمقام دہلی تولد ہوئے۔ پندرہ سال کی عمر میں بندگی مخدوم حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کے خلیفہ اور جانشین بندگی مخدوم حضرت خواجہ نصیر الدین چراغؒ دہلی کے مرید ہوئے۔ چھتیس برس کی عمر میں اپنے پیر کے جانشین مقرر ہوئے اور سجادۂ خلافت کو زینت بخشی۔ تقریباً پچاس سال تک دہلی میں رشد و ہدایت کی شمع روشن رکھنے کے بعد (۸۲) سال کی عمر میں تیمور کے حملۂ دہلی سے کچھ پہلے ۸۰۱ھ میں دہلی کی اقامت ترک فرمائی، اور گجرات سے ہوتے ہوئے ۸۰۳ھ میں گلبرگہ پہنچے۔ بہمنی سلطنت کے آٹھویں فرماں روا سلطان فیروز شاہ بہمنی نے اپنے دار السلطنت میں آپؒ کا شاندار استقبال کیا۔ گلبرگہ پہنچنے کے بعد آپؒ نے اپنی حیاتِ طیبہ کے باقی بائیس یا تیئیس سال یہیں بسر فرمائے اور دکن کے سیاسی، سماجی اور دینی حالات پر غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوئے۔ ایک سو چار سال اور کچھ مہینوں کی عمرِ دراز پاکر آپؒ نے ۱۶ ذیقعدہ ۸۲۵ھ کو وصال فرمایا۔ آپؒ کی حیاتِ طیبہ آٹھویں اور نویں صدی ہجری کے ہندوستان کی دینی، علمی، ثقافتی، سیاسی، سماجی اور لسانی تاریخ کا ایک نہایت اہم باب ہے۔ آپؒ نے ہی سلسلۂ عالیہ چشتیہ میں سب سے پہلے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ فرمائی۔ اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں تصوف اور عرفان کے موضوع پر کتابیں لکھیں۔ آپؒ ہی اردو کے

اولین نثر نگار قرار پائے۔ آپؒ ہی نے دکن کی سیاست پر اتنا اثر ڈالا کہ فیروز شاہ بہمنی کے بھائی سلطان احمد کو بہمنی تخت نصیب ہوا۔ آپؒ ہی کی بلند و بالا، اور قد آور شخصیت کی وجہ سے پورے دکن میں سلسلۂ عالیہ چشتیہ کو غیر معمولی حسن قبول حاصل ہوا۔

افسوس ہے کہ سلسلۂ عالیہ چشتیہ کے اس چشتیِ اعظمؒ کے سوانح طیبہ کے پورے گوشے عوام و خواص کی آپؒ سے صدیوں کی بے پایاں عقیدت کے باوجود ابھی تک پوری طرح منظرِ عام پر نہیں آئے ہیں۔ اور تو اور۔ آپؒ کی لکھی ہوئی ایک سو پچیس کتابیں بھی سب کی سب شائع نہیں ہوئی ہیں۔ اسی طرح آپؒ کے سوانح طیبہ اور آپؒ کی تعلیماتِ مبارکہ کے بعض نہایت اہم ماخذ بھی ہنوز طبع نہیں ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ سے ایسی باتیں بھی منسوب کردی گئی ہیں جو بالکل بے سروپا اور بے اصل ہیں۔ یہ سب کتابیں طبع ہو کر عام ہو جائیں تو اسی وقت حضرت بندگی مخدومؒ کے فیضانِ جاریہ اور آپ کے مقامِ بلند کا پورا پورا اندازہ ہو سکے گا۔

حضرت بندگی مخدومؒ کے سوانح طیبہ کے سلسلہ میں جو کتابیں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں، ان میں حضرت بندگی مخدومؒ کے ملفوظات کے مجموعوں کو اولیت حاصل ہے۔ آپ کے ارشادات اور آپ کی مبارک محفلوں کے حالات یا مختلف حضرات نے مختلف زمانوں میں بطور ملفوظات مرتب فرمائے تھے۔ ایسے چھ ملفوظ مرتب ہوئے تھے پہلا ملفوظ مخدوم زادہ سید ابن رسول معروف بہ میاں منجھلے نے مرتب کیا تھا۔ اس کا کچھ حصہ دہلی میں مرتب ہوا تھا اور باقی حصے گلبرگہ میں۔ دوسرا ملفوظ قاضی علم الدین ابن شرف الدین اجودھنی نے جمع کیا تھا۔ تیسرا ملفوظ چتر کے رہنے والے حضرت شیخ الاسلام کا جمع کردہ تھا۔ چوتھا ملفوظ منظوم تھا اور اسے ملک زادہ عثمان جعفر نے ترتیب دیا تھا۔ پانچواں ملفوظ بندگی مخدوم کے بڑے فرزند بندگی میاں سید اکبر حسینیؒ نے قیام دہلی کے زمانے میں مرتب فرمایا تھا۔ یہ سب ملفوظ اب ناپید ہیں۔ ان کے کسی نسخے کا کسی بھی کتب خانہ میں اب تک پتہ نہ مل سکا۔ ان مذکورہ ناپید ماخذوں کے بعد جو کتابیں ملتی ہیں اور ہماری دسترس میں ہیں، وہ ترتیبِ زمانی کے لحاظ سے حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جوامع الکلم (۲) سیر محمدی (۳) تاریخ حبیبی (۴) محبت نامہ (۵) شمائل الاتقیاء (۶) تبصرۃ الخوارقات۔

تبصرۃ الخوارقات اس سلسلے کی آخری اور نہایت اہم کڑی ہے۔

تبصرۃ الخوارقات کے مصنف حضرت سید حسن اللہ حسینی ایک طرف تو بندگی مخدوم حضرت سیدنا گیسو دراز بندہ نوازؒ کے ہم جد ہیں تو دوسری طرف حضرت بندگی مخدومؒ کی دوسری صاحبزادی حضرت بی بی بتولؒ زوجۂ حضرت سید سالار اللہ حسینی کی اولاد میں ہیں۔ اس طرح خاندان حضرت بندگی مخدومؒ سے ان کا دہرا بلکہ تہرا رشتہ ہے۔ والد کی طرف سے ان کا سلسلۂ نسب آٹھویں پشت پر حضرت مخدوم خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ سے جا ملتا ہے۔ شجرہ حسب ذیل ہے:۔

سید حسن اللہ بن سید علی اللہ بن سید محمد بن سید شاہ علی اللہ بن سید محمد عرف سید محمود حسینی بن سید شاہ فضل اللہ حسینی

بن سید علی برہنہ العشاقؒ بن سید جلال الدین برج الاولیاؒ بن حضرت سید علیؒ۔
حضرت سید علی حضرت بندگی مخدوم سید نا گیسو دراز بندہ نوازؒ کے حقیقی جد ہیں۔

حضرت سید جلال الدین برج الاولیاء حضرت سید یوسف حسینی شاہ راجو قتال کے چھوٹے بھائی اور حضرت بندگی مخدومؒ کے سگے چچا ہوتے ہیں۔ حضرت برج الاولیاء کے اکلوتے صاحب زادے سید علی برہنہ العشاق ہیں۔ ان کے فرزند سید شاہ فضل اللہ حسینی سے حضرت بندگی مخدوم کی حقیقی نواسی یعنی حضرت بندگی مخدوم کی بڑی صاحب زادی حضرت بی بی ستی فاطمہ کی صاحبزادی منسوب تھیں۔ ان ہی کے بطن سے سید محمد معروف بہ سید محمود حسینی تولد ہوئے۔

سید محمد بن فضل اللہ سے حضرت بندگی مخدومؒ کے پوتے میاں بندگی حضرت سید ید اللہ حسینی صاحب (دفنہ محمود) کی صاحب زادی، جو بی بی عزیزہ حجت اللہ، دختر بی بی بتول بنت بندگی مخدومؒ کے بطن سے تھیں، منسوب ہیں۔ وہ اپنے خسر اور حضرت بندگی مخدوم کے پوتے اور آپ کے اولین جانشین ہیں۔ میاں بندگی حضرت شاہ ید اللہ حسینیؒ نے بڑی توجہ سے اپنے اس داماد اور مرید کی تربیت فرمائی۔ داماد اور مرید کو بھی اپنے خسر اور پیر سے والہانہ عقیدت تھی، چنانچہ انھوں نے آپ کے ملفوظا کو "محبت نامہ الٰہی و اسرار نامہ خدائی" کے نام سے مرتب کیا۔ اس ملفوظ میں ۳ رجب ۸۴۳ھ سے ۲۵ محرم تک کے ملفوظ جمع فرمائے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میاں بندگی حضرت سید شاہ ید اللہ حسینیؒ کے وصال کے بعد سید محمد عرف سید محمود حسینی اپنے محل محترم حضرت بی بی منت اللہ کے ساتھ بیدر منتقل ہو گئے۔ کیوں کہ حضرت بندگی مخدومؒ کے خاندانِ مبارک کے بیشتر اراکین پایہ تخت کی تبدیلی کے بعد گلبرگہ سے بیدر منتقل ہو گئے تھے۔ میاں بندگی حضرت شاہ ید اللہ حسینی کی صاحبزادی حضرت بی بی منت اللہ اپنے وقت کی بڑی بابرکت خاتون گزری ہیں۔ بیدر میں آپ نے ایک خانقاہ کی بنیاد رکھی اور جب ۱۸ ذی الحجہ ۸۸۸ھ میں آپ کا وصال ہوا تو آپ کا روضہ بھی بیدر ہی میں بنا۔ آپ کے وصال کے بعد آپ کے دوسرے صاحبزادے سید شاہ علیؒ آپ کی درگاہ اور آپ کی خانقاہ کے سجادہ نشین مقرر ہوئے۔ یہ خانقاہ ایک عرصہ دراز تک بیدر میں فیضانِ چشتیہ نوازیہ کا مرکز بنی رہی۔ سید شاہ علیؒ نے کچھ کم چوبیس سال سجادہ نشین رہنے کے بعد ۸ ربیع الاول ۹۱۲ھ کو وفات پائی۔

کسی نے ان کے وصال کی تاریخ کہی ہے

سیدِ اعظم پناہ و پشتِ دیں — شل او دیگر نباشد مہ جبیں
جانشین سیدِ اعلیٰ علی — عالم ربانی و اہلِ یقیں
از وفاتش رخنہ در دین فتاد — فہم کن تاریخ شان از حرم دیں
۹۱۲ھ

آپ کے جانشین حضرت سید محمد ہوئے۔ آپ کے وجود سے حضرت بی بی منت اللہ کی خانقاہ کو بڑی رونق رہی

اور آپ کی ذات سے فیضانِ چشتیہ کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت سید محمد نے (۷۳) سال کی عمر پاکر ۲۳ ذی الحجہ سنہ ۹۳۶ھ کو وصال فرمایا۔ آپ کے بعد آپ کے بڑے صاحبزادے سید محمود ثانی نے خانقاہ نشین ہوکر سجادہ کو زینت بخشی۔ آپ کے اور تین بھائی تھے، سید حسین۔ سید علی اللہ عرف سید بابو، اور سید احمد حسینی۔ خواجہ محب اللہ ابوالحسن سید علی اللہ عرف سید بابو صوفی منش اور ذی علم بزرگ تھے سنہ ۹۱۲ھ میں ولادت ہوئی۔ ان کے انتقال کی تاریخ معلوم نہیں۔ یہی بزرگ تبصرۃ الخوارقات کے مصنف کے والدِ محترم ہیں۔ سید علی اللہ عرف سید بابو کے چار فرزند تھے۔ سب سے چھوٹے فرزند سید من اللہ حسینی تھے، اور تبصرۃ الخوارقات کے مصنف ہیں۔

صاحب تبصرۃ الخوارقات کے حالاتِ زندگی تفصیل سے معلوم نہیں۔ خود ان کی تصنیف کردہ کتاب سے بھی ان کے حالاتِ زندگی پر کچھ زیادہ روشنی نہیں پڑتی۔ جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ بس اتنا ہی ہے کہ وہ اپنے والد سید علی اللہ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ غالباً انھیں رواج زمانہ کے مطابق عربی اور فارسی کی مروجہ تعلیم ملی تھی۔ ان کی شادی بیدر کے مشہور قادری بزرگ حضرت مخدوم سید محمد ملتانی قادریؒ کے پوتے حضرت رفیع الدین ابن حضرت مخدوم جی کی صاحبزادی خوانزا ام ہانی سے ہوئی تھی۔ سنہ ۹۸۱ھ میں جبکہ انھوں نے تبصرۃ الخوارقات مرتب کی ہے، ان کے دو اولادیں ہوچکی تھیں۔ ایک لڑکا سید محمد اور ایک لڑکی بی بی منت اللہ۔ اس وقت ان کی عمر غالباً تیس بتیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ ان کی گزر بسر کی کیا صورت تھی، اس کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ غالباً حضرت بندگی مخدومؒ کی اولاد و احفاد کو جو جاگیریں اور معاشیں مختلف سلاطین سے ملی تھیں، ان میں سے ان کو بھی حصہ رسدی ملتا ہوگا۔ توکل اور قناعت پر گزر بسر ہوتی ہوگی اور مشغلۂ حیات رشد و ہدایت ہوگا۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی بیدر ہی میں بسر کی اور انتقال بھی وہیں کیا، اور غالباً بی بی منت اللہ کی درگاہ کے احاطہ میں دفن ہوئے۔

صاحب تبصرۃ الخوارقات کو اپنے جدِ اعلیٰ اور اپنے سلسلے کے پیر بندگی مخدوم حضرت سیدنا گیسو دراز بندہ نوازؒ سے دلی عقیدت تھی۔ انھوں نے حضرت بندگی مخدومؒ کے وصال کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد سنہ ۹۸۱ھ میں اپنے والد کے ارشاد کی تعمیل میں حضرت بندگی مخدومؒ کے حالات۔ خوارقات، آپؒ کے مریدوں اور خلفاء اور آپ کی اولاد و احفاد کی تفصیل پر تبصرۃ الخوارقات کے نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں حضرت بندگی مخدوم سے متعلق آپؒ کے سنِ مبارک اعداد جمنے (۱۰۵) کی رعایت سے ایک سو پانچ روایتیں جمع کی ہیں۔ دوسرا حصہ جو پہلے حصہ کا ضمیمہ ہے اس میں حضرت بندگی مخدومؒ کی حیاتِ طیبہ سے متعلق ضروری معلومات فراہم کرنے کے بعد آپؒ کے مریدوں اور خلفاء کی فہرست دی ہے۔ اس کے بعد آپ کی اولاد و احفاد کی اپنے زمانے تک تفصیل درج کی ہے۔ ماشاء اللہ حضرت بندگی مخدومؒ کی اولاد خوب پھلی پھولی اور آپؒ کے وصال کے ڈیڑھ سو سال کے اندر اس خاندان مبارک کی اتنی شاخیں ہوگئیں کہ تبصرۃ الخوارقات کے مصنف کو بھی بعض شاخوں کی تفصیلات معلوم نہ ہوسکیں۔

صاحب تبصرۃ الخوارقات نے اپنی کتاب کے پہلے حصے میں جو روایتیں حضرت بندگی مخدومؒ سے متعلق جمع کی ہیں وہ تین طرح کی ہیں۔ پہلی قسم کی روایتیں وہ ہیں جو انھوں نے اپنے خاندان کے بزرگوں یا حضرت بندگی مخدومؒ کے سلسلے میں بیعت کردہ حضرات سے سنیں۔ دوسری قسم کی روایتیں وہ ہیں جو انھوں نے خود حضرت بندگی مخدومؒ کی تصانیف سے نقل کی ہیں۔ آخری قسم کی روایتیں وہ ہیں جو حضرت بندگی مخدومؒ کے سوانح طیبہ پر لکھی ہوئی کتابوں یا حضرت بندگی مخدومؒ کے بزرگوں کے ملفوظات سے نقل کی ہیں۔ انھوں نے ہر روایت کی ابتدا ہی میں اپنا ماخذ بتا دیا ہے۔ اس کے لئے انھوں نے مخففات استعمال کئے ہیں اور کتاب کے آخر میں ان مخففات کی تفصیل بھی درج کر دی ہے۔

صاحب تبصرۃ الخوارقات نے جو مخففات استعمال کئے ہیں وہ یہ ہیں:—

س : مسموع — سنی ہوئی روایت	مح : محبت نامہ
سمر : اسمار الاسرار	مہ : ملفوظات شاہ من اللہ حسینیؒ
خا : خاتمہ	سی : سیر محمدیؒ
دی : دیوان	مو : مولود منظوم
جوا : جوامع الکلم	

اس طرح صاحب تبصرۃ الخوارقات کے کُل نو ماخذ ہیں۔ ایک مسموع یعنی سُنی سُنائی روایتیں۔ تینؔ ماخذ حضرت بندگی مخدومؒ کی تصانیف مبارکہ ہیں۔ باقی چارؔ ماخذوں میں آپ کی سیرت مبارک۔ حضرت بندگی مخدومؒ کے ملفوظات کے دو مجموعے اور حضرت بندگی مخدومؒ کے دو پوتوں کے ملفوظات۔ اب ان ماخذوں کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ اسمار الاسرار:— اسمار الاسرار حضرت بندگی مخدومؒ کی نہایت بلند پایہ تصنیف ہے اور قیام گلبرگہ کے زمانے میں املا کرائی گئی ہے۔ اس میں بہ قول حضرت شیخ عبدالحقؒ محدث دہلوی "حقائق و معارف رمز و ایما اور اشارات کی زبان میں بیان کئے ہیں"۔ حضرت بندگی مخدومؒ نے اس کتاب کے (۴۷) سِرّ سبقاً سبقاً صرف ملک زادہ شہاب الدینؒ مخدوم زادہ میاں ید اللہ میاں عبداللہ اور حضرت قاضی بہاؤالدین کو مخصوص مجلسِ درس میں پڑھائے بھی ہیں۔ البتہ چند مقاموں پر حروف مقطعات کی شرح کو پوشیدہ رکھا۔ اس مخصوص مجلس درس میں بس یہی اصحاب ہوتے تھے، ان کے سوا کوئی اور شریک درس نہ کیا جاتا تھا۔ صاحب تاریخ حبیبی نے لکھا ہے کہ "حضرت قطبی فرماتے تھے کہ حضرت شیخ نصیر الدین محمودؒ کے سر مبارک کی قسم اگر کوئی میرا یارِ سنگی بھی ہوتا اور کہتا کہ اس کتاب کو آپ نے جس طرح لکھا ہے مجھے اس کا سبق دیجئے تو کبھی نہ دیتا اور اس کے اسرار ظاہر نہ کرتا"۔ حضرت بندگی مخدومؒ فرماتے ہیں کہ:— "یہ کتاب الہام ہے، اس لئے تنزیل کے ڈھنگ پر مرتب کی گئی ہے"۔ مقصد معارف قرآنی کی تفسیر و تاویل ہے، اسی وجہ سے اسمار کی تعداد بھی حضرت بندگی مخدومؒ نے

قرآنی سورتوں کے برابر رکھی ہے۔
اس کتاب کو مولانا سید عطا حسین مرحوم نے اپنے مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے حیدرآباد سے شائع کیا ہے۔

۲۔ خاتمہ:— شیخ طریقت ضیاء الدین ابو النجیب عبد القاہر سہروردی کی تصانیف میں ایک کتاب عربی زبان میں "آداب المریدین" ہے جس پایہ کے مصنف تھے یہ کتاب بھی اسی پایہ کی ہے۔
"آداب المریدین" ایک جامع کتاب ہے لیکن مختصر ہے۔ بہ قول مولانا عطا حسین: "حضرت بندگی مخدومؒ حکیم الامت تھے اور اپنے زمانے کے حالات اور رجحانات اور کمزوریوں سے خوب واقف تھے۔ آپؒ نے محسوس کیا کہ "آداب المریدین" کے موضوع پر ایک مبسوط اور مکمل کتاب کی ضرورت ہے۔ آپؒ نے اس کتاب کی آخری شرح لکھنے کے بعد ۸۰۶ھ میں "خاتمہ" کے نام سے ایک اور کتاب تصنیف فرمائی جو بہ طور اس کے تکملہ یا ضمیمہ کے لکھی گئی ہے"۔ مولانا عطا حسین مرحوم نے اس کتاب کو بھی ۱۳۵۶ھ میں اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔

۳۔ دیوان:— حضرت بندگی مخدومؒ فارسی کے بلند پایہ شاعر بھی تھے کبھی محمد اور کبھی شہباز تخلص فرماتے تھے۔ آپؒ کے فارسی کلام کو آپؒ کے خلیفہ مولانا عماد فتح پوری نے "انیس العشاق" کے نام سے دیوان کی صورت میں مرتب کیا تھا۔ یہ دیوان بھی مولانا عطا حسین مرحوم کے مقدمہ کے ساتھ چھپ چکا ہے۔

۴۔ جوامع الکلم:— حضرت بندگی مخدومؒ کے بڑے صاحبزادے میاں بندگی حضرت سید اکبر حسینیؒ نے آپؒ کے قیام دہلی کے زمانے میں ایک ملفوظ مرتب فرمایا تھا۔ یہ ملفوظ اب ناپید ہے۔ اس کے بعد آپ نے حضرت بندگی مخدومؒ کے قیام گجرات کے دنوں میں "جوامع الکلم" کے نام سے ایک اور ملفوظ مرتب فرمایا۔ یہ ملفوظ بروز شنبہ ۱۸ رجب ۸۰۲ھ سے شروع ہوتا ہے اور ربیع الثانی ۸۰۳ھ پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس ملفوظ کی نہایت درجہ اہم خصوصیت یہ ہے کہ حضرت بندگی مخدومؒ نے اسے ملاحظہ فرمایا ہے اور اس کے تعلق سے ارشاد ہوا ہے کہ:—
"اگر میں لکھتا تو ایسا ہی لکھتا"— حضرت بندگی مخدومؒ کی تعلیمات اور آپؒ کے سوانح طیبہ کے تعلق سے اس کتاب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ جناب حامد صدیقی کے مقدمہ کے ساتھ یہ کتاب ۱۳۵۶ھ میں درگاہ شریف سے شائع ہو گئی ہے۔

۵۔ ملفوظ منظوم:— حضرت بندگی مخدومؒ کا ایک اور ملفوظ جو منظوم تھا، ملک زادہ، مقبول خانوادہ، برگزیدہ، ملک عثمان جعفر نے مرتب کیا تھا۔ یہ ملک زادہ حضرت بندگی مخدومؒ کے مرید اور آپؒ کے اجازت یافتہ تھے۔ یہ ملفوظ اب ناپید ہے اور اس کا کوئی نسخہ ابھی تک کسی کتب خانہ میں دریافت نہیں ہوا ہے۔

تبصرۃ الخوارقات ہی اب تک وہ تنہا کتاب ہے جس میں اس ناپید کتاب کے کچھ اقتباسات محفوظ رہ گئے ہیں۔

۶۔ سیرِ محمدی: — اس کتاب کے مصنف حضرت مولانا محمد علی سامانی ہیں۔ مولانا محمد علی سامانی حضرت بندگی مخدومؒ کے مرید اور خادم بارگاہ ہیں۔ انھوں نے ۸۳۱ھ میں حضرت بندگی مخدومؒ کی ایک سیرت طیبہ لکھی۔ چونکہ یہ کتاب حضرت بندگی مخدومؒ کے خادم خاص کے قلم سے نکلی ہے اور وہ بہت سے واقعات کے چشم دید راوی ہیں، اس لئے اسے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اس کتاب کا اصل فارسی متن اور اس کا اردو ترجمہ "سیرِ محمدی مع ترجمہ المعروف بہ تحفۂ محمدی" کے نام سے کلیم سید شاہ نذیر احمد قادری نے ۱۳۲۷ھ میں الٰہ آباد کے یونانی دواخانہ پریس سے شائع کر دیا ہے۔

۷۔ محبت نامہ: — "محبت نامہ" حضرت بندگی مخدومؒ کے پوتے، بندگی میاں سید محمد اصغرؒ کے صاحبزادے اور حضرت بندگی مخدومؒ کے اولین جانشین بندگی میاں سید شاہ یداللہ حسینیؒ (صاحب روضۂ خورد) کے ملفوظات ہیں۔ کتاب کا پورا نام "محبت نامہ الٰہی و اسرار نامۂ خدائی" ہے۔ اس کے جامع میاں بندگی حضرت یداللہ حسینیؒ کے مرید، خلیفہ اور داماد حضرت سید محمد بن فضل اللہ حسینیؒ عرف سید محمودؒ ہیں۔ ملفوظات ۳ رجب ۸۴۲ھ سے شروع ہوتا ہے اور ۲۰ محرم ۸۴۳ھ کی ایک مجلس کے بیان پر ختم ہو جاتا ہے۔ بندگی میاںؒ، حضرت سید شاہ یداللہ حسینیؒ عرف قبول اللہ حسینیؒ حضرت بندگی مخدومؒ کے بڑے چہیتے پوتے ہیں اور آپؒ کے وصال کے بعد ہی آپؒ کے سجادہ نشین ہوئے ہیں۔ اکثر مجلسوں میں حضرت بندگی مخدومؒ کے ایسے حالات بیان فرماتے ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتے۔

یہ کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ جناب رحیم الدین صاحب نے اس کے فارسی متن کی تصحیح کی ہے اور اس کا اردو میں ترجمہ بھی کر دیا ہے لیکن اصل متن کی طرح یہ ترجمہ بھی ابھی تک طبع نہیں ہوا ہے۔

۸۔ شوائل الجمل در شمائل الکمل: — یہ کتاب حضرت مخدومؒ کے دوسرے پوتے اور بندگی میاں حضرت محمد اصغرؒ کے دوسرے صاحبزادے اور حضرت بندگی میاں سید یداللہ حسینیؒ کے چھوٹے بھائی، میاں بندگی سید شاہ صفی اللہ حسینیؒ مشہور بہ ابوالفیضؒ کے ملفوظات ہیں۔ آپؒ کا مزار مبارک آج بھی بیدر میں مرجع خاص و عام ہے۔ اس کے جامع آپؒ کے صاحبزادے بندگی میاں ابوالحسن ناصر الدین سید کلیم اللہ حسینیؒ ہیں۔ ملفوظات کا آغاز ۳ ذی الحجہ ۸۷۲ھ سے ہوتا ہے اور آخری مجلس جس کا حال اس میں بیان ہوا ہے وہ ۱۴ جمادی الاول ۸۷۴ھ کی ہے۔ بندگی میاں صفی اللہ حسینیؒ اپنے جدِ امجد حضرت مخدومؒ کے عشق میں اس درجہ ڈوبے ہوئے ہیں کہ آپؒ کی کوئی مجلس حضرت بندگی مخدومؒ کے ذکر سے خالی نہیں۔ اس کتاب میں حضرت بندگی مخدومؒ کی حیاتِ طیبہ اور آپؒ کی تعلیمات سے متعلق بیش قرار معلومات درج ہیں۔ یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ دنیا میں اس کا ایک ہی قلمی نسخہ حضرت مولانا شیخ محمود الدین جنیدی سجادہ نشین بارگاہ حضرت مخدوم سیدنا سراج الدین جنیدیؒ (گلبرگہ) کے

کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

صاحب تبصرۃ الخوارقات نے اپنی تالیف کے سلسلے میں حضرت بندگی مخدومؒ کے سوانح طیبہ سے متعلق تقریباً تمام اہم کتابوں کو اپنے پیش نظر رکھا ہے لیکن حیرت ہے کہ اس سلسلے کی ایک اہم ترین کتاب ان کی نظر سے کیسے رہ گئی۔ یہ کتاب ہے تاریخ حبیبی۔ جوامع الکلم اور سیرِ محمدیؒ کے بعد اسی کتاب کو عمدہ درجہ اہمیت حاصل ہے۔ اس کے مصنف مولانا عبدالعزیز ابن شیر ملک بن محمد واعظی ہیں۔ مولانا عبدالعزیز حضرت بندگی مخدومؒ کے چھوٹے صاحبزادے بندگی میاں حضرت محمد اصغر عرف میاں لہرہؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ انھوں نے یہ کتاب ۸۴۹ھ میں لکھی ہے اور یہ زمانہ بندگی مخدومؒ کے سجادے اور پوتے میاں بندگی حضرت سید محمد اصغرؒ کے صاحبزادے بندگی میاں سید شاہ ید اللہ حسینیؒ کی سجادگی اور علاء الدین ابن احمد شاہ ولی بہمنی کی حکومت کا ہے۔ یہ کتاب حضرت بندگی مخدومؒ کے وصال کے صرف (۳۴) سال بعد لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کا اصل فارسی متن ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے البتہ اس کا اردو ترجمہ جو نواب معشوق یار جنگ کا کیا ہوا ہے ۱۳۶۸ھ میں درگاہ شریف کی طرف سے شائع کر دیا گیا ہے۔

کتاب تبصرۃ الخوارقات ابتدائی عادل شاہی دور کی فارسی کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ قدیم اردو بولنے والے جب فارسی لکھتے تھے تو ان کی فارسی کیسی ہوتی، اس کتاب سے اس کا تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے۔ گویا یہ دکنی فارسی کا ہے۔ اس کتاب سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اب فارسی لکھنے والے گھروں میں فارسی بولتے نہ تھے بلکہ قدیم اردو یا دکھنی بولتے تھے۔ اس قدیم اردو کے اثرات ان کی فارسی پر بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔

صاحب تبصرۃ الخوارقات اوسط علمی استعداد کے بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔ غالباً انھوں نے بس یہی ایک کتاب تالیف کی تھی کیونکہ ان کی کوئی تصنیف دستیاب ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا کہیں ذکر ملتا ہے۔ انھیں تصنیف و تالیف کا بھی کوئی خاص سلیقہ نہیں۔ مولف کا اصل مقصد حضرت بندگی مخدومؒ سے متعلق بعض خوارقات کو بیان کرنا اور اس کے بعد آپؒ کی اولاد و احفاد کے وسیع سلسلے کے ناموں کو ضبطِ تحریر میں لانا معلوم ہوتا ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس میں بعض ایسی روایتیں درج ہیں جو اس سے پہلے کی لکھی ہوئی کتابوں میں نہیں ملتیں۔ مثلاً عام طور پر حضرت بندگی مخدومؒ کے متعلق مشہور ہے کہ آپؒ نے اپنے سنِ مبارک کے اعداد کے برابر یعنی (۱۰۵) کتابیں تصنیف فرمائیں۔ اس روایت کی کوئی سند نہیں ملتی لیکن صاحب تبصرۃ الخوارقات واضح طور پر بیان کرتے ہیں کہ آپؒ نے (۱۲۵) کتابیں تصنیف فرمائی تھیں اور تصنیف کا طریقہ یہ تھا کہ انھیں املا کراتے تھے۔ کتاب کے تمام ہو جانے کے بعد آپ نے اس پر کبھی نظرِ ثانی نہیں فرمائی۔ اسی طرح حضرت بندگی مخدومؒ کے خلفاء کی جو فہرست سیرِ محمدیؒ یا تاریخ حبیبی میں درج ہے ۔۔۔۔ اس سے زیادہ مکمل فہرست ہمیں تبصرۃ الخوارقات میں ملتی ہے۔ اس فہرست میں کچھ نام ایسے بھی ہیں جو اس سے پہلے لکھی ہوئی مذکورہ صدر کتابوں میں نہیں ملتے (بقیہ صفحہ ۱۶)

محمد اکبرالدین صدیقی

میٹھے بچن سناؤں

چند مرثیہ گو شعراء

مرزا بیجاپوری ۔ قایم ۔ عبدی ۔ احمدی ۔ بسّری

قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کے بانی اگرچہ سُنّی حنفی تھے لیکن ایرانی نو وارد اُمراء، سفراء اور علما کی آمد کے اثر نے ان کے اخلاف کے عقاید تبدیل کئے اور انھوں نے مذہب امامیہ اختیار کیا۔ سلطان قلی قطب الملک اور یوسف عادل خاں نے سلطنت کے استحکام میں اپنی ساری توفیق صرف کردیں، لیکن شاندار مسجدوں کی بھی تعمیر کی۔ ابراہیم عادل شاہ اول سُنّی تھا لیکن اس کا بیٹا علی عادل شاہ اول امامیہ عقاید رکھتا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی راگ رنگ کا شیدائی تھا، اس کے دور میں ہر چیز، حتیٰ کہ شعرا کے خطاب اور تخلص تک نورس تھے اور مذہب سے اس کو یک گونہ لگاؤ نہ تھا، لیکن عقاید کا اعتبار سے وہ سُنّی تھا، اور اس کا جانشین محمد عادل شاہ سُنّی اور حضرت پیر ہاشم کا مرید تھا، جس کا مقبرہ آج گول گنبد اور بولتی گنبد کے نام سے موسوم ہے اور عجائبات عالم میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسی گنبد سے قریب حضرت پیر ہاشم بھی ایک گنبد میں آسودہ ہیں۔

دسویں صدی ہجری کے آغاز ہی سے ہمیں بیجاپور میں مرثیوں کے نمونے ملتے ہیں، چنانچہ اس صدی کی ابتدا میں حضرت برہان الدین جانمؔ کا ایک مرثیہ دستیاب ہوا ہے، آپ کے بعد کے شعرا بھی دیگر اصناف سخن کے ساتھ ساتھ ایک ایک دو دو مرثیے کہتے رہے ہیں، لیکن محمد عادل شاہ کے دور میں جبکہ شعر و شاعری کا چرچا بہت زیادہ تھا، فارسی اور دکنی کہنے والے شعرا کی تعداد بہت زیادہ تھی جن میں سے بعضوں کا ذکر ڈاکٹر زورؔ مرحوم اور نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے اپنی کتابوں میں کردیا ہے۔ اس دور کا سب سے زیادہ مشہور شاعر مرزا ہے۔ تذکرہ نگار اس کے نام کے بارے میں ساکت ہیں، لیکن صاحب بساتین السلاطین نے اس کے متعلق کچھ معلومات دی ہیں[1]۔ وہ کہتا ہے کہ مرزا اپنے دور کا بہت بڑا مرثیہ گو تھا، محفلوں میں جب مرثیہ پڑھتا تو آہ و زاری سے حد

---

[1] بساتین السلاطین صفحہ ۳۳۲ تا ۳۳۴۔

عوام الاموات کے غم میں شدت سے ماتم کرتے۔ مرزا شام سے صبح تک مرثیے پڑھتا، اور اکثر فی البدیہہ لکھتا، بلکہ پڑھتا۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ مرزا فی البدیہہ مرثیہ پڑھ رہا تھا۔ ذیل کا مصرع اولیٰ پڑھ دیا

ع دلاں پھانکاں اناراں کر رکھو سینے طبق میانے

لیکن دوسرا مصرع بہ درست نہ ہو سکا۔ اس کے رنج و غم اور کوفت کی انتہا نہ رہی۔ اسی غور و فکر کے عالم میں اس پر غفلت طاری ہوئی اور حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حکم دیا پڑھو ــــــ

نبی آئیں گے محشر کوں یو تحفا کر لیجانا ہے[1][2]

یہ مرثیہ کسی تذکرہ یا بیاض میں نظر سے نہیں گذرا، صاحب بساتین ہی اس کا ذکر کرتا ہے۔ خوش قسمتی سے یہ مرثیہ جو بقول بالا مقبول بارگاہ رسالتؐ ہے دستیاب ہوا ہے اور اس کو محرم ہی کے مہینے میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے۔

مرزا کی موت کے بارے میں بھی صاحب بساتین لکھتا ہے کہ ایک شب عاشورہ کو وہ رات بھر مرثیہ خوانی کرتا رہا اور صبح طہارت کے لئے باہر نکلا تو کسی ظالم نے خنجر بھونک دیا اور وہ شہید ہو گیا۔ علی عادل شاہ ثانی کو اس کی شہادت کی اطلاع ملی تو اس نے دسویں محرم کو اٹھنے والے تمام تعزیوں اور علموں کو ابراہیم پور دروازہ جو بعد کو فتح دروازہ کے نام سے موسوم ہوا، لے جانے کا حکم دیا۔ تعزیوں اور علموں کے بعد مرزا کا جنازہ تھا جس کے ساتھ مرثیہ خوانوں کی ایک کثیر تعداد تھی جو اس کے شاگرد یا معتقد تھے۔ مرزا کو حضرت سید شاہ مرتضیٰ قادری کی درگاہ کے پائین میں دفن کیا گیا۔ علی عادل شاہ کی وفات یکشنبہ ۳ ارشعبان ۱۰۸۳ھ کو ہوئی۔ مرزا اس سے پہلے کسی وقت شہید کر دیا گیا۔

مرزا کے مرثیوں میں مطلع سے پہلے ایک شعر مختلف القافیہ ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت بعض اور شعرائے بھی برتی ہے مخطوطات میں تخلص کہیں مرزا ہے اور کہیں اعلان نون کیساتھ مرزاں۔ میرا نظر سے نہ گذرا اس سے یہ یقین ہوتا ہے کہ یہ دکنی شاعر ہے۔

دوسرا شاعر جس کا مرثیہ یہاں پیش کیا جارہا ہے قایم ہے۔ قایم برہان پوری کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے۔ ممکن ہے یہ وہی قایم ہو جس کا تعلق برہان پور سے تھا، یا اس کا بھی امکان ہے کہ یہ کوئی اور بیجاپوری قایم ہو۔ قایم برہان پوری کی بیاض میں اگر پیش کردہ مرثیہ مل جائے تو قطعیت ہو سکے گی، ورنہ شبہ باقی رہے گا۔

عبدی۔ احمدی اور سری ایسے شعرا ہیں جن کے حالات کسی تذکرہ میں نہیں مل سکے۔ کسی تاریخ میں بھی ان کا حال

---

[1] مجھے جو مخطوطہ ملا ہے اس میں "دھد" ہے، اور یہی صحیح ہونا چاہئے۔ (ذاکر)

[2] میرے مخطوطے میں مصرع یوں لکھا ہے۔ ــــ کہ محشر کوں نبیؐ انگے یو تحفا کر لیجانا ہے۔

نہیں ملتا۔ یہ بیجاپور کے ہیں یا گولکنڈہ کے اس کا بھی تعین نہیں کیا جا سکتا، تاوقتیکہ کوئی شہادت فراہم نہ ہو۔

مرزا بیجاپوری

حسینؑ ابن علیؑ کا غم محباں دل سوں کرتا ہے
اپس جیو کے گریباں میں جنم یو داغ دھرتا ہے

عزیزاں شہ کے ماتم سوں جگر لعو کر گلاتا ہے — لہوں کو گال پانی کر نین سوں نت بہاتا ہے
سدا دو نین چشمے کر جینے سینے چمن میانے — اٹھانت آہ کیرو پاں گلاں داغاں کھلاتا ہے
رکت آمیز انجو نت ڈھلے جیوں لعل گوہر سیں — مگر سالم ورونا یو اسی غم کا خسزاتا ہے
درو تا کربلا ثمنیں جگر یے لعو سوں پُر خوں کر — بکس جا جیوں کنول ڈوبے علا آپن یو ڈوباتا ہے
دلاں پھانکاں اناراں کر دھرو سینے طبق میانے — کہ محشر کوں نبیؐ انگے یو تحفا کر لیجاتا ہے
جتا بازار عشرت کا اسی ماتم سوں برہم کر — اپس کے جیو نگر میانے یو غم پورا لیساتا ہے
سدا اس غم کے اوپر دل اپنا یو گلا بے کل — گلا سینے بھٹی میانے گلا انجو چوانا ہے
محباں اس دکھوں نس دن سیہ پوشی بدل یو دل — جلانت اس دھونی میں سب لباس اپنا رنگاتا ہے
اپس غم سوں جلاؤ دل کہ فردا آب رحمت لے — مبارک ہات سوں آکر امامؑ آپی بجھاتا ہے

غلام کمتریں تیرا ہے مرزا حسینؑ سرور
شفاعت کی نظر سوں مج قیامت میں چھڑاتا ہے

---

۱ دل ۲ ہمیشہ ۳ لہو ۴ گلاکر ۵ میں ۶ ہمیشہ ۷ زندہ چشمے بناکر ۸ شکلیں ۹ پھول (داغوں کی) ۱۰ خون ۱۱ آنسو ۱۲ سیں ۱۳ دل ۱۴ یہ ۱۵ کربلا کی طرح ۱۶ منتشر ہونا۔ بکھر جاتا (موجودہ معنی سیوں میں سے نکلتا) ۱۷ اپنا دل ۱۸ انار کی قاشیں ۱۹ سینے کے طبق میں ۲۰ نبیؐ کے حضور میں ۲۱ یہ شکل تحفہ ۲۲ جتنا ۲۳ شہر دل میں ۲۴ غم پورا (غم کا ایک محلہ) ۲۵ پہلا مصرع تقطیع سے گر رہا ہے اور کوئی لفظ کاتب سے سہواً چھوٹ گیا ہے ۲۶ سینے کی بھٹی ۲۷ آنسو ٹپکانا ۲۸ رات دن ۲۹ بدل بھی کے لئے ۳۰ دھواں بلکہ تمام چیز کو جلاکر پیدا کیا جائے ۳۱ آپ ہی۔

مرثیہ قایم

اس رات کوں توں ٹھیل[1] کر کیا بیگ[2] آئی ری صبا
شہ کوں شہید کرنے کے تئیں فرمان لیائی[3] ری صبا

جب لیائی صبا غم کی ہلال[4] رونے لگے سب بلبلاں
نعرہ جو ماریں کویلاں کیا غل اوچائی[5] ری صبا

جب اتی[6] صبا چمنے چمن غمگیں ہوئے سب پھول بن
شہ کیرے[7] ٹکڑے آپ تن کیا رن بچھائی ری صبا

نکلا سورج تن جال[8] کر کفنی گلے میں گھالکر[9]
شہ کے اوپر یوں چال[10] کر کیا سد[11] اوچائی ری صبا

شاہی ملی جیوں شبیر ہو کس تھے نہ تھا شہ زیر ہو
کیا اجل کا تیرا دکاری لگائی ری صبا

رو دیں جو اسماں و حور زمیں رونے لگے سب آدمیں[12]
جھاں[13] میں بسائے تم یو تھیں[14] دھند کار اوچائی ری صبا

بھوت[15] دین سوں میں پال کر تہلا دھلا کفن کر
ایک سات میں دفن کر کیا بیگ چھپائی ری صبا

تو سن جو قایم آئے کر غمگیں تھیالاں سر بسر
شہ کے گلے میں ہار کر کیا لیا کہ بھائی ری صبا

مرثیہ عبیدی

ماتم کی ہانک[16] جب تھے گئی[17] سب فلک منیں[18]
طاقت رہی نہ تب تے[19] دیکھو کس ملک منیں

ماتم کی سن خبر یو جہاں تل اوپر[21] ہو سب
غم خوار ہو کہ دکھ سوں پڑیا ہے تلک منیں

جھلکا[22] نت بدن پہ اتھا[23] اس چندر کے سب
چھائی پڑی ہے دکھ سوں دیکھو اس جھلک منیں

---

[1] ہٹاکر [2] جلد [3] لائی [4] لہریں، موجیں [5] اٹھائی، شور مچائی [6] آئی (ضرورت شعری کی بناپر اِی) [7] کے [8] جلاکر [9] ڈال کر [10] دھوکہ دے کر [11] سدّ مفتوح پڑھا جائے تو دیوار کھڑی کردی اور مضموم پڑھیں تو عقل گم کردی۔ موخر الذکر قریب الفہم [12] آدمی (ضرورت شعری کی بناء پر "آدمیں") [13] جہاں کی بجائے جھاں بربنائے ضرورت شعری [14] تاریکی [15] کاتب شعر لکھنے میں غلطی کر گیا ہے۔ دونوں مصرعے وزن میں نہیں ہیں [16] لاکر [17] ڈال دی [18] شور وغل [19] سے [20] میں [21] زیر و زبر ہو کر [22] چمک دمک [23] تھا۔

شہ کے فراق سوں یو حوریاں پریاں شکل　　بیتاب ہو کے تھاک لبتیاں بیٹھا الک منیں
دو نے کی ہر گھڑی پہ بھتا باؤ دکھ ستی　　لٹ دو دک تھے غم ہو سب یہ دھیا ڈھلک منیں
سن کر قصہ یو شاہ کے ماتم کا سر بسر　　رتن دو دکہ تھے سب رھیا ہے یوں پھرتے ملک منیں
یو دو دکہ حسین شاہ کا ہر یک پہ ہے سدا
گرچہ او دو دکہ یو عبدی کے سکتا پلک منیں

مرثیہ احمدی

کاٹیا نبیؐ کے دل کے چمن کے نہال کوں　　کیا دیوے گا جواب صبا ذوالجلال کوں
کیوں حشر میں کریں گے (شفاعت) تجھے رسولؐ　　ستمی تو ہٹ پکڑ کے دکھایا ہے آل کوں
کیوں سرخ رو نوں حشر کوں ہووے گا حق کے پاس　　پھوڑیا علیؑ کے گل کی پدک کے نوں لال کوں
خاتونِ دو جہاں کے جگر پر دیا نوں داغ　　اس دکہ سوں تنہ ہلایا گگن ہور پتال کوں
ایمان کے گلاں کے سورج کوں چھپیا مدام　　اس غم سوں خم کیا ہے گگن پر ہلال کوں
تادیکہ سک گگن یے زمین یو دکہ سیتی　　پردہ کیا ہے منہ پراپس کے ابھال کوں
کیوں احمدی یو غم سیتی خوش حال ہوا پچھے
یو دکہ ہوا ہے تن پہ جتے بال بال کوں

مرثیہ بیری

غم کی اگن سوں جل کر رھیا ہے　　سینہ کلیجا تن میں ماتم میں
افسوس ہر دم شہ پر کھڑیا غم　　حیف سدا ہے من میں ماتم میں

---

۱ تمام ۲ ڈالتی ہیں ۳ زلفوں میں ۴ خوشبو دار گھاس کا پودا ۵ کیاری ۶ بہتا ۷ ہوا ۸ چبھتا ہے ۹ گلا ۱۰ ٹیکہ (زیور) ۱۱ پاتال ۱۲ آسمان زمین پر یہ غم نہ دیکھ سکا ۱۳ پاگل ۱۴ سے ۱۵ آگ ۔

شفق کے لہو میں ڈوبیا ہے — شاہاں جیو چرخ کیرت میں ماتم میں
چاند دکھن سوں خاک لگاموں — غم ہور ہیبا ہے گگن میں ماتم میں
دکھ ملایک سات گگن میں — روتے ہے عرش کے صحن میں ماتم میں
امر سول حق کے پاکر شہادت — پُر خوں ستی ہیں کفن میں ماتم میں
غم سوں پریاں سب لوچے لیاں ہیں — بالاں سراں کے عدن میں ماتم میں
بوند ہیا ایک لہو کے جھڑے سو — لعل ہوئے ہیں کھن ہیں ماتم میں
حوراں شہیداں کو شربت پلاتے — کھڑیاں ہیں کربل اگن میں ماتم میں
دکھ سوں شہیداں کے لہو سوں لگے ہیں — پھولاں ہو لالہ چمن میں ماتم میں

غم کے بچن میں مرثیہ شہ کا
باندھیا ہے ہری دکھن میں ماتم میں

۱؎ سورج ۲؎ کمزور ہوئے ہیں ۳؎ آسمان ۴؎ دکھ سے ۵؎ سے ۶؎ نوچ لئے ہیں ۷؎ سر کے بال ۸؎ کربلا کے آتش زار میں ۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۰) ۱۹۶۶ء

ڈیڑھ سو سال کی مدت کے اندر اندر دکن میں حضرت بندگی مخدومؒ کا خاندانِ مبارک کافی وسیع ہوگیا تھا. آپؒ کے صاحبزادوںؒ اور صاحبزادیوںؒ کی اولاد کا سلسلہ بہت پھیل گیا تھا۔ اب وقت آچکا تھا کہ اس خاندانِ مبارک سے تعلق رکھنے والوں کا تذکرہ ایک جگہ مرتب ہوجائے ۔ مولف تبصرۃ الخوارقات نے اپنے زمانے تک کے ایسے تمام افراد کے نام اور اُن کا نسب نامہ تبصرۃ الخوارقات کے ضمیمہ میں محفوظ کر دیا ہے جو کسی نہ کسی طرح حضرت بندگی مخدومؒ سے نسبی تعلق رکھتے تھے ۔ یہ ایک بہت بڑی خدمت تھی جو صاحبِ تبصرۃ الخوارقات نے انجام دے دی ۔ بعد کے مصنفوں اور خاص طور پر تاریخ خاندانِ محمدؐ یا تاریخ محمدیؒ کے مصنف نے اس سے کافی استفادہ کیا ہے ۔

محمد اسحاق ایوبی

انشائیہ

قرض، فلسفہ، معاشیات اور آرٹ

"گدھا، چوپایوں کا مفکرِ اعظم ہے۔ بارِ امانت اٹھانے، گھاس چرنے اور ڈنڈے کھانے کے بعد وہ سارا وقت بحرِ تفکر کی غوطہ زنی میں گذار دیتا ہے۔"

"گدھا، باربردار جانور ہے، جو گھوڑے اور خچر کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔"

"گدھے پر سلیقے کے ساتھ زرد اور سیاہ دھاریاں پینٹ کر دیجئے "زیبرا" بن جائے گا۔"

اوپر کا موضوعِ بحث گدھے کی ہستی ہے۔ مگر غور و فکر کا انداز فلسفے کا جزو، ٹھوس حقیقت کا سادہ اظہار سائنس کا حصہ اور انوکھی طرز اور آرٹ کا پارٹ بن گیا۔ ہمارے انشائیے میں قرض کی ضرورت۔ رواج اور طریقِ کار زیرِ بحث آئے ہیں۔ اب یہ تمام باتیں بھی اپنے طور پر فلسفہ۔ علمِ معاشیات، یا فن کی کسی نہ کسی شاخ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر ان کا الگ الگ تجزیہ کرنے میں دقت ہو تو کسی فلسفی، عالم، یا فنکار سے مدد لیجئے، کیونکہ مذکورہ چیزیں آپس میں اسی طرح گھل مل گئی ہیں جیسے حلیم میں مختلف قسم کا اناج۔ دالیں، گوشت اور مصالحے۔

اگرچہ قرض، انسانی معاشرے کا جزو لاینفک بن چکا ہے، مگر اس کا مقام وہی ہے جو ادب میں ترجمے کا۔ فرنیچر میں اسٹول کا، اور یونیفارم میں بوٹ کا ہے۔ قرض کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسانی لذت کام و دہن۔ اس کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں افراد اور تنظیمیں۔ رعایا اور حکومتیں۔ غلام اور آزاد مملکتیں سبھی شامل ہیں۔ سیاست، شاعری اور جیب تراشی کی طرح قرض کا آرٹ بھی اسکول، کالج، یا یونیورسٹی کی تعلیم کا دست نگر نہیں ہے۔ بڑے کہہ گئے ہیں "قدرت کی ودیعت ہے"۔ ہر آرٹ وہبی ضرور ہوتا ہے، اور وہبی آرٹ وہ زمین ہے جو مفت ملنے کے باوجود سخت محنت، بھرپور کھاد اور لگاتار سینچائی کی متقاضی ہے، تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ اپجاؤ بنایا جا سکے۔ چونکہ قناعت اور قرض، خودداری اور خوشامد۔ حیا اور حرص۔ راست بازی اور مصلحت بینی، حق گوئی اور شیریں کلامی میں مکان اور مقبرے کا فرق، بلکہ جمہوریت اور فاشسزم کا بیر ہے، اس لئے قرض کے فن میں ہر کس و ناکس کمال حاصل نہیں کر سکتا۔

آرٹ میں نکھار، سجیلا پن اور پختگی لانے کی خاطر برسوں پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ ہر فن کے لئے طبعی رجحان، شخصی ذوق اور ذاتی ریاضت ویسے ہی ناگزیر ہے جیسے کھیر کے پکوان میں دودھ۔ چاول اور چینی۔

پہلے لوگ عام طور پر تیج تہوار۔ شادی بیاہ اور دیگر سماجی رسوم کے لئے قرض لیا کرتے تھے بعض مرتبہ باپ کی شادی کا قرضہ بیٹا اُتارتا تھا، اور بیٹوں کی شادی کے ادھار پیسے پوتے پڑپوتے مہاجنوں کو واپس کرتے تھے۔ یہ سلسلہ اسی طرح باقاعدگی سے چلتا رہتا تھا جیسے شجرۂ نسب۔ یہی نہیں، باپ مرتے مرتے بھی اولاد پر مالی ذمہ داریوں کا بوجھ لاد جاتا تھا۔ یعنی چہلم اور برسی وغیرہ کی شاندار ضیافتیں رہی سہی کسر پوری کر دیتی تھیں اس کے علاوہ بھی کئی معاشرتی تقریبیں پہلے ناک کو اونچا اور سر کو نیچا رکھنے کے لئے ضروری تھیں۔ یہ جشن و نمائش، یہ چہل پہل، یہ دھوم دھام تو ایک دن میں ختم ہو جاتی تھی، لیکن رسم و رواج کی اہمیت کے اعتبار سے اس کے اثرات مابعد، نسلٌ بعد نسلٍ نہ سہی، مہینوں اور برسوں ضرور قائم رہتے تھے، جس کی گونج ساہوکاروں کی بار بار آمد و رفت، میاں بیوی کی آئے دن کی تو تو میں میں اور بچوں کی بے تحاشہ مار کٹائی کی صورت میں سنائی دیتی تھی۔

قرض قرض میں فرق ہوتا ہے۔ سرحدی پٹھانوں۔ سکھوں اور مہاجنوں سے مستعار لی ہوئی رقم موٹی سلاخوں کا جال ہے، جس سے شیر بھی رہائی حاصل نہیں کر سکتا۔ بنکوں اور سوسائٹیوں کا قرضہ لوہے کا پنجرا ہے، جس میں بند پنچھی کو آرام کے ساتھ روٹیوں۔ پھلوں اور مٹھائیوں کے ٹکڑے کھانے کو ملتے ہیں۔ یہی نہیں۔ گھر بھر کے لوگوں کا بھرپور پیار بھی اسے حاصل ہوتا ہے۔ رشتہ داروں اور دوستوں سے ملنے والی رقم شاہی نظر بندی ہے، جس میں اچھے سے اچھا کھانا، بڑھیا سے بڑھیا کپڑا، اور عمدہ سے عمدہ کوٹھی ملتی ہے۔ پھر سیر و تفریح، خرید و فروخت اور بات چیت کی بھی آزادی رہتی ہے۔ راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔

سود خوار پٹھان اور سکھ تو قرض داروں کی جائداد۔ زیور۔ آمدنی۔ دستاویز اور ضمانت سے کہیں زیادہ اپنے زور بازو پر بھروسہ کرتے ہیں۔ مہاجن کو سب سے زیادہ اعتماد ملکیتوں۔ زیورات اور وثیقوں پر ہوتا ہے کیوں کہ ہزاروں سال کے تجربات نے اس کے آباو اجداد پر یہ حقیقت روشن کر دی تھی کہ اگر دنیا میں کسی چیز پر سب سے کم یقین کرنا چاہیئے تو وہ ہے انسان کی "زبان"۔ جہاں تک سوسائٹیوں کا تعلق ہے وہ جائداد۔ آمدنی۔ دستاویز اور شخصی ضمانت۔ چاروں پر بھروسہ کرتی ہیں۔ یہ "ابتدائے عشق" کی ناتجربہ کاری ہے۔ اعزاو احباب کی حالت بے حد قابلِ رحم ہے، کیوں کہ کسی یتیم خانہ۔ عبادت گاہ، یا مدرسے میں چار آنے کا بھی چندہ دیجئے تو باضابطہ رسید ملتی ہے، مگر یہاں ہزاروں کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں، تب بھی "حساب دوستاں در دل" ہی رہتا ہے۔ قرضے کی پیش کش سے ساہوکاروں کا مقصد ادلین ذاتی منافع و سود اور ادھار دینے والے عزیزوں اور ساتھیوں کی آخری منزل وسیع و عمیق رود ہے۔

قرضے کے ضامن کی حالت بعض مرتبہ وہی ہو جاتی ہے جو بڑے بڑے شہروں میں از راہِ ہمدردی لاوارث جنازے کو کاندھا دینے والے آدمی کی ہوا کرتی ہے۔ یہ غریب کمبل کو چھوڑنا چاہتا ہے مگر کمبل اسے نہیں چھوڑتا، آخرکار جنازہ کاندھے پر لادے لادے اسے قبرستان تک پہنچانا پڑتا ہے۔ ضمانت دینے والے کئی لوگ اس چاہ کن کی طرح پیوندِ زمین بھی ہو جاتے ہیں جس پر شرم دان کے دوران میں مٹی کا تودہ اچانک آن گرتا ہے۔

امانت کی کوئی ضمانت نہیں۔ عموماً اس کا حشر قرض سے برا ہوتا ہے۔ قرض اگر محبت کی مقراض ہے تو امانت خودکشی کرنے کا استرا۔ امانت کی رقم جتنی بڑی ہوگی ایمان کو اتنا ہی متزلزل کرے گی۔ منزلِ امانت سے منزلِ خیانت تک کا فاصلہ سانس کی پھانس سے بھی باریک ہے۔

ہم نے پرانے قصوں میں پڑھا تھا کہ فلاں فلاں دیو کی جان طوطے میں ہوا کرتی تھی اور جب یہ طوطا اوروں کے قبضے میں چلا جاتا تھا تو میاں دیو بالکل بے بس ہو جاتے تھے، اس لئے وہ منت۔ سماجت۔ ترکیبوں اور تدبیروں سے اس کو دشمنوں کے پنجے سے نجات دلانے کی کوشش کرتا تھا۔ یہی حال اس شخص کا ہوتا ہے جو نادہند دوستوں اور رشتہ داروں کو ادھار پیسے دیتا ہے۔ قرض مانگنے میں اتنا شدھیا نہیں کرنا پڑتا جتنا واپس لینے میں۔ آپ اپنی ادھار رقم واپس نہیں مانگتے بلکہ بھیک کے لئے جھولی پھیلاتے ہیں۔ مگر پھر بھی ظالم کا دل نہیں پسیجتا۔ آپ طرح طرح سے اپنی مجبوریاں ظاہر کرتے ہیں، مگر اس اللہ کے بندے کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ڈرانا، دھمکانا، کوسنا کاٹنا اور غیظ و غضب کا اظہار کرنا اپنے پاؤں پہ آپ کلہاڑی مارنا ہے۔ ایسی صورت میں قرضہ درضہ تو خیر کیا واپس ملے گا الٹا دوستی دشمنی میں اور یگانگی بیگانگی میں بدل جائے گی۔ شائلاک یہودی نے تو اپنے مقروض سے قرض کی واپسی کے بجائے انتقاماً ایک پونڈ گوشت جسم سے کاٹ لینے کا معاہدہ کیا تھا۔ مگر یہ بالکل حقیقت ہے کہ ہم جب اپنے بھائی بندوں کو قرضِ حسنہ واپس کرتے رہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ہم خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے ہی جسم کا گوشت کاٹ کر ان کے حوالے کر رہے ہیں۔

جب کوئی ماتحت، ساتھی یا عزیز یکایک آپ کی خوش اخلاقی، آپ کے بال بچوں کی ذہانت اور آپ کی بیوی کے سگھڑپن کی تعریف کرنے لگے، آپ کے غریب خانے پر غیر معمولی طور پر کمربستہ نظر آئے تو فوراً کان کھڑے کر لیجئے۔ "آگے خطرہ ہے۔ دشمن کی فوجیں کمین گاہ میں چھپی بیٹھی ہیں اور اب یلغار ہوا ہی چاہتی ہے"۔ لہذا آپ کو ضروری پیش بندی کر لینی چاہئے تاکہ بعد میں دفاعی اقدامات اور جوابی کارروائیوں کی نوبت ہی نہ آئے۔

کئی لوگ رشتہ داروں، دوستوں اور دوسرے جان پہچان والوں کے ہتھکنڈے جاننے کے بعد محتاط رہنے لگتے ہیں۔ چنانچہ وہ آسانی سے ان کے مکر و فریب کے جال میں نہیں آتے۔ مگر جس طرح جنگ لڑنے والا دشمن بہ یک وقت تمام حربے استعمال نہیں کرتا بلکہ کچھ اسلحہ خفیہ بھی رکھ چھوڑتا ہے تاکہ وہ انہیں آخر میں بروئے کار لائے۔ اسی طرح دانا و بینا افراد کبھی اپنی شکست تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ موقع و مصلحت کے لحاظ سے آخر میں آزمودہ اور جدید

دونوں داؤں چلتے ہیں۔ دیہاتی کہاوت ہے: "لالچی کے گاؤں میں لباڑ بھوکا نہیں مرتا۔ لالچ بتانے اور سبز باغ دکھانے کا ہتھیار لاکھ برا سہی، لیکن اسے ہمیشہ فنکارانہ طور پر کام میں لایا جا سکتا ہے۔ تاہم کامیابی کا انحصار سو فی صدی متعلقہ شخص کی ذاتی صلاحیت پر ہے۔

اگر کوئی شریک کار، افسر یا ماتحت آپ پر کسی قسم کا احسان کرتا ہے تو یہ مت خیال فرمائیے کہ وہ اسے یکسر بھول گیا ہے۔ نہیں ـــ مناسب موقع پر پورے کمیشن کے ساتھ یک مشت یا چھوٹی چھوٹی قسطوں میں وہ قیمت وصول کرے گا۔ ساتھ ہی ساتھ آپ کے سر پر اس کے احسان کا بار بھی برابر قائم رہے گا۔ کہتے ہیں ایک سادہ لوح دیہاتی لڑکا آموں کا ٹوکرا سر پر اٹھائے منڈی کو جا رہا تھا، شہر کا کوئی شہدا بھی اس کے پیچھے پیچھے دبے پاؤں چلا۔ یہ لفنگا چوری چوری ایک ایک آم نکال کر کھاتا اور چھلکے اور گٹھلیاں مٹی میں لپیٹ کر دوبارہ ٹوکرے میں ڈالتا جاتا۔ اب بتائیے ٹوکرے کا بوجھ ہلکا ہوا، یا بھاری، یا جوں کا توں قائم رہا۔

لوگ کہتے ہیں عورتوں کی دنیا باورچی خانے تک محدود ہے۔ یہ سراسر غلط بیانی، بہتان تراشی بلکہ فتنہ انگیزی ہے۔ ان کی دنیا اتنی وسیع ہے کہ اس میں چولھے چکی کے ساتھ ساتھ اولاد اور شوہر کی سمائی بھی ممکن ہے۔ کبھی کبھی مہمان نوازی، خاطر تواضع اور احسان و نوازش کی خاطر ان کے دل کی کٹیاں ان کے اپنے رشتہ داروں کے لئے راج محل کا روپ دھار لیتی ہے۔ تاہم جہاں تک قرضے کا تعلق ہے عورتیں سو فی صدی سوشلزم کی قائل ہیں۔ اپنے اور پرائے دونوں ان کی نگاہ میں یکساں طور پر ناقابلِ اعتماد ہیں۔ اس معاملے میں بیویوں سے زیادہ دور اندیش، نکتہ چیں اور زود فہم مخلوق پیدا کرنے سے آج تک دنیا قاصر رہی ہے۔ اگر بیویاں مانع نہ ہوں تو خویش و اقارب شوہروں کو اتنی ہی آسانی سے لوٹ لیں جتنے آرام سے ہیرو یا ولین فلموں میں بوگس تلواروں سے کشتوں کے پشتے لگا دیتے ہیں۔ لہٰذا ان حقائق کی روشنی میں عزیزوں، دوستوں اور ساتھیوں کے پے در پے حملوں کے خلاف "زن مریدی" سب سے بڑی ڈھال ہے۔

ہار جیت کے ساتھ چائے کی پیالیاں منگائی جائیں تو تاش کا کھیل جوا نہیں دل بہلاوا سمجھا جاتا ہے، البتہ اگر پانچ دس، چالیس پچاس، سو دو سو، ہزار دو ہزار روپے داؤ پر لگائیں تو اس کا شمار قمار بازی میں ہوتا ہے۔ پڑوسنیں آپس میں ایک آدھ کٹورا آٹا۔ دال۔ چاول چینی اور روپیہ، دو روپیہ بطور قرضِ حسنہ لیتی دیتی ہیں۔ اگر اس سے بڑھ کر کوئی نقد یا جنس کی شکل میں طلب کرے تو ان کے نزدیک تفریح کی بجائے قمار بازی ہوگی۔ ادھار کا سلسلہ اسی وقت تک چلتا ہے جب تک ساکھ برقرار رہے۔ یعنے ٹھیک ناپ تول کے مطابق اجناس کی واپسی۔ وعدوں کی کڑی پابندی اور فریقِ ثانی کی طرف سے بوقتِ ضرورت جوابی امداد، ورنہ آپ اپنے گھر خوش، ہم اپنے گھر خوش۔

دور و نزدیک کے ایک بھائی آپ کے ہمدرد بن کر آپ کے یہاں آتے ہیں اور باتوں باتوں میں بتاتے رہیں کہ فلاں مکان پندرہ ہزار روپے میں ۔ فلاں زمین پانچ ہزار روپے میں اور فلاں کھیت آٹھ ہزار روپے میں بکاؤ ہے ۔ آپ ان میں سے کسی چیز سے دلچسپی ظاہر کرتے ہیں ۔ معاملہ آگے بڑھتا ہے، مگر سودا طے نہیں ہو پاتا اور آخر کار بات چیت ٹوٹ جاتی ہے ۔ کچھ دنوں بعد یہی ہمدرد آپ سے اپنی لڑکی کی شادی کے لئے ہزار دو ہزار روپے قرض مانگتے ہیں ۔ انھیں پتہ چل چکا ہے کہ اس سے کہیں زیادہ رقم آپ کے بنک اکاؤنٹ میں ہے ۔ لہٰذا جہاں رقم کا سُراغ لگانا فن ہے وہیں رقم کو خفیہ رکھنا بھی آرٹ سے کم نہیں ۔

کئی افسر ہم رتبہ افراد ۔ کلرکوں اور چپراسیوں کو اس لئے رقمیں ادھار دیا کرتے ہیں تاکہ دفتر کی باتیں برابر ان کے گوش گزار ہوتی رہیں ۔ بعض لوگ چند ہمسایوں کی تھوڑی بہت مالی اعانت بھی اسی غرض سے کرتے ہیں تاکہ وہ دشمن کے مقابلے میں اپنی علیحدہ ٹولی بنا سکیں ۔ جن رشتہ داروں میں گاڑھی چھنتی ہے، اُن کے گہرے تعلقات کی اوپری سطح کو بھی کھرچ کر دیکھئے ۔ کچھ اسی طرح کے انکشافات ہوں گے ۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ سرکس کا جوکر ایک ایک درجن قمیص اور پاجامے بیک وقت ڈانٹ کر سرکس میں گھوڑے سواری کرتا ہے اور پھر کئی کرتبوں کی نقالی کرنے کے بعد ایک ایک کپڑا اتار کر پھینکتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جانگیا اور بنیان کے سوا اس کے جسم پر اور کچھ باقی نہیں رہتا ۔ اب گویا یہ اپنے اصلی روپ اور اصلی سائز میں ظاہر ہو گیا ۔

بالغ بننے کے بعد لڑکے کی نفسیات میں انقلابی تبدیلی آتی ہے ۔ وہ اپنی جوانی خوبصورتی اور ذہانت پر نازکرتا ہے ۔ اسی طرح گریجویشن کرنے، ملازم ہونے، دولھا بننے اور باپ کا درجہ پانے تک اس کی اپنی شخصیت کی قدر و قیمت اس پر مزید واضح ہوتی جاتی ہے ۔ یہ تو ہوا ہلال سے بدرِ کامل تک کا مرحلہ ۔ اب پونم سے اماوس کی طرف آئیے ۔ پہلے تو اولاد کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ہی آمدنی اور خرچ میں آنکھ مچولی شروع ہوتی ہے ۔ یہ آنکھ مچولی بچپن کے اس کھیل سے بالکل الگ ہے جس میں دھاندلی ۔ ہاتھا پائی اور مار پیٹ بھی لطف دیتی تھی ۔ سچ پوچھئے تو تعلیم کے اخراجات بعد میں آتے ہیں ۔ بچے پر خرچ کی مد کا آغاز "ولادت باسعادت" سے بہت پہلے ہی ہو جاتا ہے ۔ ہر بچے کی پیدائش سے تعلیم کے اختتام تک معاشرتی رسوم کی بھاری بھرکم زنجیر ایسی جھنکار پیدا کرتی ہے جس کے سامنے شہنائی ماتمی باجا معلوم ہوتی ہے ۔ حقیقت میں زندگی کے اسٹیج پر مسٹر قرض کے پارٹ کی بسم اللہ یہیں سے ہوتی ہے ۔ یہ حضرت ایسے یارِ وفادار ثابت ہوتے ہیں کہ نہ صرف زندگی بھر نباہ کرتے ہیں، بلکہ مرنے کے بعد بھی دوستوں کی "میعادی تقریبوں" میں برابر پلاؤ پر ہاتھ مارتے ہیں ۔

آدمی جب پہلے پہل ایک عدد "چاند سے بچے" کا "والد ماجد" بنتا ہے تو اس کی مونچھیں اونچی ہو جاتی ہیں ۔ مگر جب ادھار کا سلسلہ شروع ہونے لگتا ہے تو اس کی نفسیات میں بہت بڑی تبدیلی نمایاں ہوتی ہے (باقی صفحہ ۸۲ پر)

میر حسن (ایم۔اے)

پنڈت ونشی دھر ودیالنکار

حیدرآباد کے جن بزرگوں نے پچھلے تیس پینتیس سال میں یہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور خصوصاً جامعاتی حلقوں کے کردار اور طرزِ فکر کی تشکیل میں راست یا بالواسطہ قابلِ قدر حصہ لیا ہے، اُن میں پنڈت ونشی دھر ودیالنکار ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ پنڈت جی کے ملنے والوں اور دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ وہ سب سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے اور یہاں کی علمی اور ادبی محفلوں میں اُن کی شرکت بحث و مباحثے میں میانہ روی، اعتدال پسندی اور ہم آہنگی کا باعث ہوتی تھی۔

ونشی دھر جی، پنڈت جی کہلاتے تھے۔ وہ حیدرآباد کے علمی اور ادبی حلقوں کے پنڈت جی تھے اور پنڈت جی ہونے کی رعایت سے انھوں نے سارے ہندستان کے پنڈت جی یعنے پنڈت جواہر لعل نہرو کی طرح اپنے نواسوں کے نام راجیو اور سنجیو رکھے۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں اور مجھ سے پہلے فاضل مقرر صاحبان بیان کر چکے ہیں، پنڈت جی ہندی، اُردو اور سنسکرت کے عالم، اور فاضل ادیب، نقّاد اور صحافی تھے۔ ہمارا ملک بہت بڑا ہے اور اس میں عالموں اور ادیبوں کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن ونشی دھر جی عالم اور ادیب ہونے کے علاوہ کچھ اور بھی تھے۔ پنڈت جی کی امتیازی خصوصیت زندگی کے بارے میں ان کا ایک خاص صحت مند نقطۂ نظر تھا جو ان کی نجی زندگی میں بھی کارفرما نظر آتا تھا۔ ونشی دھر جی زندگی کے اہم مسایل کے بارے میں ایک کل ہند انداز فکر رکھتے تھے۔ وہ ایک سچے دیش بھگت تھے اور زبان، مذہب، طبقاتی اونچ نیچ یا شمال جنوب کے اختلافات کو کسی صورت، کسی رنگ میں گوارا نہیں کرتے تھے۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں جب میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا اور اُردو کے ساتھ فارسی اور عربی کے علاوہ ہندی بھی پڑھتا تھا، پنڈت ونشی دھر جی سے پہلی بار اورنگ آباد میں ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ سرِ شام میں اورنگ آباد کی پن چکی دیکھنے گیا تھا۔ وہاں ایک اورنگ آبادی دوست نے پنڈت جی سے میرا تعارف کرایا۔ میں نے اپنا نام بتایا تو پنڈت جی نے پوچھا کتنے روز کے لئے آئے ہو اور کہاں ٹھیرے ہو۔ میں نے جواب دیا، کل آیا تھا اور کل واپس جاؤں گا۔ پنڈت جی نے کہا، یہ کل کل ٹھیک نہیں۔ دو تین روز ٹھیر کر اورنگ آباد کی سیر کرو۔ میں نے اپنی ہندی کا ذکر کیا تو پنڈت جی نے کہا یہی موقع ہے۔ جی لگا کر پڑھو۔ ہندی بڑی میٹھی اور اچھی زبان ہے اگر

اس زمانے میں تم نے محنت نہیں کی تو آئندہ ہندی زبان اور ادب کی طرف توجہ کرنے کا ممکن ہے موقع نہ ملے۔ اور پھر تمہاری اردو بھی تشنہ رہ جائے گی۔ باتوں باتوں میں یہ بھی کہا، یہی اپنی پن چکی کی ترکیب پر غور کرو، کتنی سندر ترکیب ہے۔ اردو اور ہندی کے ملاپ سے گنگا جمنی، میٹھے اور خوش آواز الفاظ بنتے ہیں اور آئندہ بھی بنیں گے۔ پھر پنڈت جی نے کہا، کالی داس کی ناٹک شکنتلا کا کچھ حصہ بی۔ اے کے ہندی کورس میں شامل ہے، اسے محنت سے توجہ کرکے پڑھو، اور ہو سکے تو پورا ناٹک پڑھ ڈالو اور اس کی لفظی اور معنوی خوبیوں سے واقف ہونے کی کوشش کرو، ہندی سے تم کو محبت ہو جائے گی، اور ذرا سی توجہ سے بصیرت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ زبان اور ادب کے بارے میں اس طرح کی باتیں ہو رہی تھیں اور ہم پن چکی سے نکل کر مراقبہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے پوچھا، پنڈت جی معلوم ہوتا ہے آپ کو اورنگ آباد بہت پسند آگیا ہے، آپ حیدرآباد کیوں نہیں تشریف لاتے؟ پنڈت جی نے کہا، تمہارا حیدرآباد مجھے اورنگ آباد سے کم پسند نہیں ہے، اور امید ہے کہ چند سال بعد میں وہاں جا سکوں گا۔

اس کے چند سال بعد ۳۸ء میں پنڈت جی سے حیدرآباد میں ایک مشاعرے میں ملاقات ہوئی۔ میرے ایک دوست نے اپنے گھر میں محفل شعر منعقد کی تھی، پنڈت جی بھی مدعو تھے اور انھوں نے اپنی کویتائیں سنا کر نوجوانوں سے خوب داد حاصل کی تھی۔ مشاعرے کے بعد پنڈت جی سے گفتگو کا موقع ملا تو انھوں نے کہا، اچھا اب آپ ادیب بن گئے ہیں، میں نے آپ کی کتابیں پڑھی ہیں، مولوی صاحب (یعنی مولوی عبدالحق صاحب) کہتے ہیں کہ لکھنا لکھنے سے آتا ہے۔ خوب پڑھو اور لکھو۔ ملازمت ختم ہو جانے کے بعد جب کوئی کام نہیں رہے گا تو لکھنے پڑھنے کی عادت بہت کام آئے گی۔

جب دکن ریڈیو حیدرآباد میں میرا تبادلہ ہوا تو پنڈت جی ریڈیو پر زبان اور ادب کے بارے میں تقریریں نشر کرتے تھے۔ ۴۲ء کے لگ بھگ ہم نے ایک موضوعی مشاعرہ یادر منزل کے صداخانے میں منعقد کیا تھا جس کی صدارت بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو نے کی تھی۔ اس موقع پر بھی اپنی ایک ہندی کویتا پنڈت جی نے سنائی تھی۔

پنڈت ونشی دھر ودیالنکار کو جن لوگوں نے قریب سے دیکھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ موصوف مشرقی اخلاق کا ایک مستحسن نمونہ تھے۔ فرقہ واریت انھیں چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ زبان کے بارے میں وہ تنگ نظر تھے اور نہ زندگی کے دوسرے مسائل کے بارے میں، چنانچہ انھوں نے اپنی ایک صاحبزادی کے بیاہ کے معاملے میں بھی مذہب کو رکاوٹ نہیں بننے دیا، اور شادی کی رسم اس طرح انجام پائی کہ گویا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

چند سال پہلے جب میں مدراس میں تھا تو پنڈت جی وہاں آئے تھے۔ اُن کے کالج کے لئے چندہ اکٹھا کرنے کی مہم میں میں بھی اُن کے ساتھ ہو گیا، اور مدراس کے ایک مقامی ہندی ادیب رشی چودھری جی کو بھی جو میرے دوست ہیں، میں نے پنڈت جی کی اعانت کے لئے ہموار کر لیا تھا۔ پنڈت جی کی شخصیت ایسی پُر اثر تھی کہ اس مہم میں

خاص کامیابی ہوئی۔ پہلی بار مدراس میں اُن کا صرف دو دن ہی قیام رہا، دن بھر لوگوں سے ملنے ملانے میں صرف ہوتا، لیکن شام میں ہندی، اُردو وادب کے بارے میں گفتگو ہوتی تھی۔ اکثر شام میں پنڈت جی بہت تھک جاتے تھے، لیکن اس کے باوجود جب تک گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ علم وادب کی باتیں نہ ہو جاتیں اُن کو نیند نہیں آتی تھی۔

دوسری بار پنڈت جی کا مدراس کو یکایک آنا ہوا۔ تار کے ذریعہ اطلاع ملی تو میں نے اسٹیشن پر اُن کا استقبال کیا۔ ہندی کتابوں کے ناشر بھی پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ اِس بار پنڈت جی کا زیادہ تر وقت جامعہ مدراس کی کمیٹیوں، ہندی پرچار کے کاموں اور ہندی ناشروں سے بات چیت میں صرف ہو گیا۔ روانگی کے روز میری درخواست پر دلشتی وصدرجی نے دو کویتائیں سنائیں اور دوستوں نے پسندیدگی کا اظہار کیا تو زبان وادب کی باتیں چھڑ گئیں۔ پنڈت جی نے کہا، مدراس کی بول چال کی اردو گولکنڈے کی دکنی زبان سے ملتی جلتی ہے، اس زبان کا ہندی سے قریبی رشتہ ہے، میں آج کل وجہی کی سب رس پر کام کر رہا ہوں، ویسے کئی سال پہلے مولوی صاحب سب رس کے مقدمے میں سب کچھ لکھ چکے ہیں، مگر میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ سب رس، نثری تصنیف نہیں ہے بلکہ ایک طرح کی نظم ہے — پھر انھوں نے حافظے سے سب رس کے دو تین پارے سُنائے اور جملوں کو اس طرح ادا کیا کہ وہ واقعی نظم کے اجزا معلوم ہوتے تھے۔

پنڈت جی نہ صرف لکھنے میں زبان کی خوبیوں کا خیال رکھتے تھے بلکہ بول چال میں بھی سُتھری اور بامحاورہ زبان استعمال کرتے تھے۔ وہ بڑے زندہ دل اور مجلسی آدمی تھے اور اُن کی باتیں گھنٹوں سُنتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ پنڈت جی کہتے تھے کہ محض فرہنگ کی مدد سے زبان پر عبور حاصل نہیں کیا جا سکتا، اس کے لئے ادبِ عالیہ کا گہرا مطالعہ، زبان دانوں سے میل جول اور محاوروں سے واقفیت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر ایک لطیفہ جو وہ اکثر سُنایا کرتے تھے یہ ہے کہ ایک صاحب جو خاص حلقوں میں اچھے ادیب سمجھے جاتے ہیں، اُن کا اور پنڈت جی کا میسور کے سفر میں ساتھ ہو گیا۔ دونوں جامعہ میسور کی ایک کمیٹی میں شریک ہونے جا رہے تھے۔ شہر کے ایک شاندار ہوٹل کے قریب سواری رُکی تو اُن صاحب نے کہا، یہ بہت قیمتی ہوٹل ہے۔۔ پنڈت جی مطلب تو سمجھ گئے مگر مصلحتاً جواب میں کچھ نہ کہا۔ ساتھی نے اپنا جملہ دہرایا کہ یہ قیمتی ہوٹل ہے تو پنڈت جی نے کہا۔ جی ہاں، نہایت قیمتی اور بہت اچھا ہوٹل ہے، یہاں ہر طرح کا آرام رہے گا اور کھانا بھی اچھا ملے گا۔ پنڈت جی کی وجہ سے اُن کے ساتھی کو بھی اُسی مہنگے ہوٹل میں ٹھیرنا پڑا۔ پنڈت جی ہنس ہنس کر کہتے تھے کہ اُس اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں رہنے اور کھانے کے دام ادا کرنے کا وقت آیا تو بل دیکھ کر ساتھی نے کہا۔ دیکھئے پنڈت جی، میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ قیمتی ہوٹل ہے۔ پنڈت جی نے جواب دیا، آپ نے ٹھیک کہا تھا، ہوٹل کی عمارت شاندار ہے، فرنیچر وغیرہ بھی بڑھیا قسم کا، مگر آپ نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ ہوٹل مہنگا ہے، یہاں ہر چیز مہنگی ملے گی۔۔ یہ سارا قصہ سُنا کر پنڈت جی کہتے تھے، اچھا سبق ملا اُسے۔ اب قیمتی اور مہنگا کا فرق کم از کم اس واقعہ کے تعلق سے اُسے ضرور یاد رہے گا۔

پنڈت جی نہ صرف زبان وادب کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے بلکہ بہت سی دوسری باتوں میں بھی خوش ذوق تھے۔

وہ حسن کے پرستار تھے اور کہتے تھے کہ حسن کا جلوہ کسی صورت میں بھی نظر آئے اس کی داد دینی چاہئے۔ ان کو شکایت تھی کہ ہم ہندوستانیوں میں ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ کوئی چیز پسند نہ آئے تو اس کا اظہار کرتے ہیں لیکن پسند آئے تو کچھ نہیں کہتے جبکہ ہونا یہ چاہئے کہ جہاں کوئی چیز پسند آئی فوراً پسندیدگی کا اظہار کر دیا جیسا کہ مشاعروں میں ہوتا ہے۔ فرض کیجئے آپ کسی دعوت میں گئے، مقام کی آرائش، صفائی، دسترخوان کی ترتیب، سلیقہ اور کھانے پسند آئے تو آپ کا فرض ہے کہ اولین موقع پر میزبان کی ان کی داد دیں۔ میں نے چھیڑنے کو کہا۔ پنڈت جی، اگر کوئی صورت پسند آئے تو؟ - پنڈت جی نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر کہا صورت پسند آجائے تو اسے دل میں رکھنا، ورنہ آفت آجائے گی۔ ایک خاتون اناؤنسر کی آواز ان کو بہت پسند آگئی تھی، انھوں نے اس کو دیکھا نہیں تھا مگر اکثر اس کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے، میں نے اس اناؤنسر کو دیکھا نہیں ہے لیکن اس کے قد، قامت، ناک نقشے اور چال ڈھال کے بارے میں صحیح اندازہ لگا سکتا ہوں۔ پھر اپنے تصور کے مطابق اس کا حلیہ دلکش انداز میں بیان کیا۔ میں نے کہا، پنڈت جی واقعی آپ نے کمال کر دیا، جو لفظی تصویر آپ نے بنائی ہے اس کی بیشتر تفصیلات درست ہیں۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور آواز اور اشکال کے باہمی تعلق کے بارے میں اپنا نظریہ بیان کیا۔

روزانہ استعمال کی چیزوں میں بھی پنڈت جی کا یہ ذوق کارفرما نظر آتا تھا۔ دیوان خانے کا فرنیچر ہو، یا در و دیوار کا رنگ روغن، گھر کی آرائش کی چیزیں ہوں، یا کھانے کے برتن۔ لباس ہو، یا کتابوں کی جلد۔ بستر بند ہو، یا بلانکٹ ان سب چیزوں کے انتخاب سے پنڈت جی کی خوش ذوقی کا پتہ چلتا تھا۔ مدراس میں ایک خاص قسم کے نمک دان کی تلاش میں انھوں نے چینا بازار کی کوئی پندرہ دوکانیں دیکھ ڈالیں، تب کہیں ان کو اپنی پسند کا نمک دان ملا۔

ہندی آج ہماری قومی زبان ہے۔ پنڈت ونشی دھر ودیالنکار ہندی کے ممتاز ادیب تھے، اور ہم میں سے بیشتر حضرات کو وہ زمانہ یاد ہوگا جب سابق ریاست حیدرآباد کے جامعاتی اور علمی و ادبی حلقوں میں ہندی کے سلسلے میں صرف ایک آواز سنائی دیتی تھی، اور وہ آواز تھی مرحوم پنڈت ونشی دھر ودیالنکار کی۔ وہ آواز اب خاموش ہوگئی ہے لیکن اس نے فضا کو خاموش نہیں چھوڑا ہے۔ آج بے شمار آوازیں پنڈت جی کے پیام کو ملک کے طول و عرض میں پھیلا رہی ہیں۔

پچھلے چند سال میں جو مشکل حالات پیش آئے، پنڈت جی نے ان کو دیکھا، اور ان میں سے گزرے لیکن سخت سے سخت آزمائش کے زمانے میں بھی انھوں نے اپنے مشرقی اخلاق و عادات، صلح کل کی حکمت عملی، دیش بھگتی اور ہندی اور اردو کی پُرخلوص خدمت کے جذبے کی لَے کو مدھم نہیں ہونے دیا۔

یہ تھے اوصاف پنڈت ونشی دھر ودیالنکار کے، جن کا سوگ آج ہم منا رہے ہیں۔ پنڈت جی کو خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ ہم انھیں کی طرح بے غرض اور پُرخلوص کام ملک و قوم کے لئے کرنے کا تہیہ کر لیں۔

معین شاکر

سر سیّد احمد خاں سیاسی مفکر کی حیثیت سے

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی سیاست میں سر سید احمد خاں کے انقلابی رول کی افادیت ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے لیکن ان کی سیاسی فکر کی اہمیت بھی اس سے کسی قدر کم نہیں یہ صحیح ہے کہ ان کی شخصیت کے اس پہلو پر بہت کم لکھا جاتا رہا ہے۔ سر سید صرف علی گڑھ تحریک کے ہی بانی نہیں تھے جس کا مقصد مسلمانوں کی تعلیمی ترقی تھا بلکہ وہ سیاسی فلسفہ کے لبرل اسکول کے بھی بہت بڑے نمائندے تھے۔ اس فلسفہ کے خدوخال ان کی مذہبی تحریروں میں زیادہ اچھی طرح ابھرتے ہیں لیکن ان کا سیاسی نظریہ اسی کے زیر اثر پروان چڑھا۔ ہندوستان میں اس فلسفہ کی مقبولیت کے اسباب مغربی نظام تعلیم، سماجی اور سیاسی اصلاحات اور برطانوی جمہوری تصورات تھے۔

یہاں غیر مناسب نہ ہوگا اگر سر سید کے عہد کے بارے میں کچھ کہا جائے۔ سر سید اپنے ماحول کی پیداوار تھے انگریزوں نے پہلی بار ہندوستان میں ایک مستحکم حکومت قائم کی تھی، اور یہی حکومت ہندوستانی معاشرہ میں بنیادی تبدیلیوں کا باعث تھی۔ یہ تبدیلیاں صرف طرز حکومت کی ہی نہیں بلکہ پرانی تہذیب اور پرانے معاشی نظام کی بھی تھیں۔ سر سید ان تبدیلیوں کے دور رس اثرات سے بخوبی واقف تھے؛ اور یہ چاہتے تھے کہ تمام ہندوستانی ان کو محسوس کریں۔ مسلمانوں کو ان تبدیلیوں کی اہمیت کا احساس خاص طور پر ضروری تھا۔ سیاسی اقتدار کے ختم ہو جانے کے سبب مسلمانوں میں مایوسی عام ہو چکی تھی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت برائے نام رہ گئی تھی۔ فرائضی اور وہابی تحریکیں کسی نہ کسی طرح سے اسلامی حکومت کے احیا کی کوششیں کرتی رہی تھیں لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ میں ہندوستانیوں کی ناکامی ان کی بھی موت کا اعلان تھی ان مایوس کن حالات میں تباہ حال مسلمانوں کے لئے سر سید کی تحریک امید کی آخری کرن تھی۔

مغربی تعلیم اور انگریزوں کے سیاسی اور سماجی اصلاحات کے علاوہ سر سید کی فکر کا ماخذ غالباً وہابی تحریک بھی تھی۔ یہ تحریک شاہ ولی اللہ کی تعلیمات سے متاثر تھی۔ ابتدا میں اس کا رجحان انگریزوں کے خلاف تھا لیکن بعد میں شاہ اسمٰعیل اور سید احمد بریلوی کی قیادت میں وہابیوں نے سکھوں کے خلاف بھی جہاد کیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سر سید سمجھتے تھے کہ اب نہ انگریزوں سے پرخاش مفید ہو سکتی ہے اور نہ سکھوں سے جہاد کارآمد۔ اس لئے انھوں نے اس تحریک کے مقصد کی ایک نئی تفسیر کی۔ انھوں نے بتایا کہ وہابیوں کا مقصد صرف مذہبی آزادی کا حصول تھا۔ چونکہ انگریز مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرتے اس لئے وہابیوں کو انگریزوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ یہ تاویل شاید غلط ہو لیکن سر سید کے خیال میں یہ ضروری تھی۔ وہابیوں کا

دراصل مقصد ایک ایسے سماجی اور سیاسی نظام کا قیام تھا جس میں اسلامی اصولوں کو عملی جامہ پہنایا جاسکے گا۔

وہابی تحریک کے علاوہ سرسید نے لبرل انگریزوں کی تحریروں سے بھی گہرا اثر قبول کیا تھا۔ وہ بینتھم۔ برک۔ مِل، اور میکالے سے متاثر تھے۔ جمہوریت، حکومت کی نوعیت اور سماجی ترقی کے بارے میں سرسید کے خیالات پر اسی حریت پسندانہ اثر کی چھاپ تھی۔

سرسید کی فکرمندیوں میں سماجی نشاۃ ثانیہ کی تحریکوں کا بھی ردعمل تھی۔ ان کی وجہ سے ہندو معاشرہ میں جو تعلیمی اور سیاسی بیداری پیدا ہورہی تھی سرسید اس سے بھی بہت مرعوب تھے اس لئے راجہ رام موہن رائے اور سرسید کی تحریکوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں جیسے مغربی تعلیم اور تہذیب کا خیرمقدم، پارلیمانی طرزِ حکومت اور عورتوں کی تعلیم کی حمایت وغیرہ۔

سرسید پکے مسلمان تھے لیکن ان کو کٹر علما کی رہنمائی پر بھروسہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اسلامی فلسفہ کی روایت اور مذہبی عقاید کو اندھی عقیدت کے تحت قبول نہیں کیا تھا، بلکہ ان کو تشکیک اور تنقید کی عقلی کسوٹی پر پرکھا تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ وہ ریڈیکل ہیں اور یہ جدید سائنس کی نہیں بلکہ اسلام کی تعلیم کا نتیجہ ہے اسلام شخصی حکومت اور شاہی کے خلاف ہے۔ وہ ایسے صدر کی حکومت کو تسلیم کرتا ہے جس کو سب لوگوں کی تائید واصل ہو۔ سرسید جمہوریت کے مداح تھے، کیونکہ اس میں آزادیٔ رائے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ بغیر آزادیٔ رائے کے کسی چیز کی سچائی دریافت نہیں ہوسکتی۔ ویسے سرسید نے اس اصطلاح کو وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس سے ان کی مراد نہ صرف تقلید اور کٹھ ملائیت سے چھٹکارا پانا تھا، بلکہ مذہبی عقاید کی درستگی، سماجی اصلاح اور تعلیمی ترقی کے لئے بھی جد وجہد کرنا تھا۔ سرسید کے نزدیک جمہوریت کی تائید کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس میں سیاسی آزادی ممکن ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں کو اپنے ملک کی سیاست میں حصہ لینے کا موقع ملتا ہے جو کسی اور طرزِ حکومت کے تحت ممکن نہیں۔ سیاسی آزادی کا یہ تصور عوام اور حکومت دونوں کے لئے سودمند ہے۔ اگر حکومت لوگوں کی خواہشات اور جذبات سے ناواقف رہے تو اس کے نتائج خطرناک ہوسکتے ہیں۔ حکومت کی یہ لاعلمی بغاوت کے اسباب کا سدباب نہیں کرسکتی۔ سرسید شاید پہلے آدمی تھے جنھوں نے انگریزوں کو یہ بتایا کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی اہم وجہ یہ تھی کہ قانون ساز مجلس میں ہندوستانیوں کو نمایندگی نہیں دی گئی تھی۔

یہاں یہ بتادینا ضروری ہے کہ صرف مغربی طرز کی نقالی سے کام نہیں چل سکتا، اور اس لئے مغربی جمہوریت کے تصور اور ہندوستانی ماحول میں مطابقت پیدا کرنا ضروری ہے۔ جہاں تک طریقۂ انتخاب اور نمایندگی کا تعلق ہے سرسید سمجھتے تھے کہ جان اسٹوارٹ مل کے بتائے ہوئے اصولوں کو بغیر تبدیلی کے ہندوستان میں رائج نہیں کیا جاسکتا۔ ۱۸۸۳ء میں انھوں نے کہا تھا کہ ہندوستان میں "جہاں ذات پات کے اختلافات اب تک موجود ہیں، جہاں قومیں

غلط ملط نہیں ہوئی ہیں، جہاں مذہبی اختلافات اب تک زود نقد پر ہیں، جہاں تعلیم نے اپنے جدید معنی کے لحاظ سے باشندوں کے تمام فرقوں میں ایک مساوی مناسبت کے ساتھ ترقی نہیں کی۔ مجھ کو کامل یقین ہے کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں مختلف مطالب کی حمایت کی غرض سے الکشن کے خالص اور سادہ اصول کے جاری کرنے سے بہ نسبت محض تمدنی خیالات کے زیادہ تر بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوں گی . . ." اس تقریر میں سرسید نے بہت واضح طور پر یہ بتایا کہ ہندوستانی ماحول کے حقائق کے پیش نظر مغربی جمہوریت کے تصور میں کس حد تک تبدیلیاں ضروری ہیں۔ وہ جمہوریت کی راہ کی مشکلوں اور رکاوٹوں سے واقف تھے، لیکن وہ جمہوریت سے مایوس نہیں تھے کیونکہ اس عقیدہ کی بنیاد انسانی فطرت کا وہ تصور تھا جو انسان کو صرف سماجی جانور بلکہ عقلیت پسند مخلوق بھی سمجھتا ہے۔

سرسید کا نظریہ حکومت بھی ان کی سیاسی فکر کا اہم پہلو ہے۔ سرسید کے نزدیک حکومت کی دو قسمیں ہیں:۔ مہذب اور غیر مہذب۔ آخر الذکر حکومت ناقابلِ قبول ہوتی ہے، کیونکہ اس میں کوئی فوجداری اور سیول قانون نہیں۔ اس میں نہ انصاف کا الگ شعبہ ہوتا ہے اور نہ عدلیہ آزادانہ طور پر کام کر سکتی ہے، اور ایسی حکومت کا نظم و نسق بھی انصاف پسندانہ نہیں ہو سکتا۔ یہ حکومت عوامی مطالبات اور خواہشات کا احترام نہیں کرتی اور نہ عقیدے کی آزادی کو برداشت کر سکتی ہے۔ اس کے برخلاف مہذب حکومت عوامی مرضی کے مطابق کام کرتی ہے۔ یہ مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرتی۔ یہاں سرسید دین اور سیاست کے باہمی تعلق سے بھی بحث کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ دین اور سیاست ایک نہیں ہیں۔ ایک سچے مذہب کا دنیوی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بلاشبہ مذہب کچھ بنیادی اصولوں کی تائید کرتا ہے، لیکن ان کی نوعیت اخلاقی زیادہ اور مذہبی کم ہوتی ہے۔ مذہب کا سب سے اہم کام روحانی اصلاح ہے۔ اس لئے سرسید نے ہمیشہ دین کو سیاست سے الگ رکھنے کے اصول کی حمایت کی ہے۔ اپنے ایک مضمون (ملاحظہ ہو "مقالاتِ سرسید" حصۂ پنجم، مجلس ترقی ادب۔ لاہور ۱۹۶۲ء صفحہ ۴۳) میں انھوں نے لکھا ہے کہ:۔

"علماء نے حضرت محمدؐ کی بعض باتوں کو مذہب کا جزو لاینفک سمجھ لیا حالانکہ مذہب سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا"——

لیکن سرسید اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ:۔ "عوام کی حکومت سے وفاداری ایک مذہبی فریضہ ہے۔ عوام کو یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ حاکم کا مذہب کیا ہے، کیونکہ حاکم "نائب اللہ" اور "ظلِ الٰہی" ہوتا ہے۔ اگر اس سے کوئی غلطی سرزد ہو تو وہ خدا کے روبرو جواب دہ ہے، اور یہ حدیث ہے۔" (ملاحظہ ہو "مقالاتِ سرسید" حصۂ اول، مجلس ترقی ادب۔ لاہور ۱۹۶۲ء، صفحہ ۱۷۵)۔ مگر اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مہذب حکومت، غیر مہذب حکومت کی شکل اختیار کرلے تو عوام کا فرض کیا ہے؟۔ کیا اس وقت بھی حکومت سے وفاداری، مذہبی فریضہ ہے؟۔ یا ایسی حکومت کو بدلنے کے لئے کونسے ذرائع اختیار کئے جا سکتے ہیں؟— یہ صحیح ہے کہ سرسید نے ان سوالات کا کوئی واضح جواب نہیں دیا، لیکن اس سے نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ سرسید غیر مہذب حکومت کے لئے بھی غیر مشروط عوامی وفاداری کے خواہاں ہیں۔ یہاں

مہذب حکومت کی نوعیت کی بحث اٹھتی ہے۔ سر سید چاہتے تھے کہ مہذب حکومت، مذہب کی آزادی کو تسلیم کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سر سید مہذب حکومت کا "سیکولر" ہونا بھی ضروری سمجھتے تھے۔ ایک غیر مہذب حکومت اس شرط کو پورا نہیں کر سکتی۔ دوسرے یہ کہ مہذب حکومت کو محدود ہونا چاہیئے۔ ایسی حکومت ہی جمہوری ہو سکتی ہے۔ سر سید کے ذہن میں دراصل برطانیہ کی حکومت تھی جس کی بنیاد رائے عامہ اور انصاف کا اصول ہے، اور ایسی حکومت صرف انگریزوں کے عہد ہی میں قائم ہو سکتی ہے۔ انگریزوں کی آمد سے قبل ہندوستانی ایسی حکومت کے تصور سے قطعی ناآشنا تھے۔ (ملاحظہ ہو "مقالاتِ سر سید" جلد نہم مجلس ترقی ادب لاہور صفحہ ۲۴)۔ تیسرے یہ کہ سر سید ضروری سمجھتے تھے کہ حکومت کے ادارے آزادانہ اور موثر طور پر کام کرتے رہیں۔ خاص طور سے ادارۂ قانون سازی عوام کا نمایندہ ہو کیونکہ یہ عوامی رائے کا بیرومیٹر ہوتا ہے۔ اگر حکومت اس ادارہ کی اہمیت کو نظر انداز کرتی ہے تو اس کا خطرہ رہتا ہے کہ لوگ حکومت کی پالیسی کو پوری طور پر نہ سمجھ سکیں، یا حکومت ایسے قوانین نافذ کرے جو عوام کے مزاج اور توقعات کے خلاف ہوں اور اس کا نتیجہ خراب نظم و نسق اور فوجی طاقت کی غلط تنظیم کی شکل میں نکلے۔

چونکہ سر سید کا عقیدہ تھا کہ برطانوی حکومت .. مہذب ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ ایسی حکومت سے بغاوت کا خیال چھوڑ دیں اس لئے انھوں نے حکومت کی وفاداری کو ایک مذہبی فریضہ بنادیا تھا۔

سر سید کی فکر کا ایک اور اہم پہلو قوم اور قومیت کا تصور ہے۔ سر سید نے لفظِ قوم کو بہت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے اس سے ان کی مراد عام لوگوں سے تھی۔ وہ سب ہندوستانیوں کو ایک قوم سمجھتے تھے۔ سر سید کے نزدیک لفظ "ہندو" بھی وسیع معنوں کا حامل ہے۔ ہر وہ شخص جو ہندوستان میں رہتا ہے "ہندو" ہے اس لحاظ سے سر سید ایک قوم اور مشترکہ تہذیب کے علمبردار ہیں۔ ان کی رائے میں ہندو اور مسلمان دو مذہبی اصطلاحیں ہیں اور مذہب کو اتحاد کے راستے میں رخنہ انداز نہیں ہونا چاہیئے۔ ہندوستان، ہندو اور مسلمان دونوں کا وطن ہے۔ دونوں گنگا کا مقدس پانی پیتے ہیں، دونوں کا رنگ ایک ہے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سینکڑوں رسوم اختیار کیں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی کئی عادتیں اپنالیں، اور اس سماجی اور تہذیبی خلا ملط نے اردو کو جنم دیا ان کے نزدیک ہندو اور مسلمان دلہن کی دو خوب صورت آنکھوں کی طرح ہیں۔

بعض ادیبوں، جیسے اشتیاق حسین قریشی کا خیال ہے کہ سر سید دو قومی نظریہ کے حامی تھے لیکن اس میں کسی قسم کی سچائی نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سر سید اردو، ہندی تنازعہ اور یوپی اور مہاراشٹر کے ہندوؤں کی احیائی تحریکوں کی وجہ سے مایوس ضرور ہو گئے تھے کیونکہ مسلمان ان کو اپنی تمدنی روایات کے تحفظ کے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔ پھر کانگریس قائم ہوئی اس کے بنیادی کردار کے بارے میں سر سید کی نہیں بلکہ پٹابھی سیتا رامیا کی رائے (ملاحظہ ہو، انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ، جلد اول، صفحہ ۲۲) یہ تھی کہ صرف اسلامی بلکہ احیائی تحریکیں بھی

ہندوستانی قومیت کی زنجیر کی مختلف کڑیاں" ہیں اور اب "قوم کا فریضہ تھا کہ ایک جامع چیز پیدا کی جائے اور قدیم دین یعنے ویدانتی تصوریت کا احیا کرکے اور نکھار کر کے اسے عہدِ جدید کی قومیت سے مطابقت دے کر چلایا جا سکے ۔ انڈین نیشنل کانگریس کے ذریعہ اس مشن کا پورا ہونا مقدر تھا۔" لازمی بات ہے کہ ایسی تحریکوں میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں تھا بلکہ وہ ان کو اپنے وجود کے لئے خطرناک سمجھتے تھے ۔ دوسرے یہ کہ کانگریس (سرسید کے دور میں) کوئی عوامی تحریک نہیں تھی ۔ اس کے مطالبات بھی متوسط طبقہ کے مفادات سے متعلق تھے۔ اور سرسید کی کانگریس سے مخالفت کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں میں تعلیمی اور صنعتی پستی کی وجہ سے کوئی متوسط طبقہ اس وقت تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ کانگریس کی تائید اور قوم پرستی ہم معنی الفاظ نہیں تھے ۔ سرسید پورے خلوص سے یہ سمجھتے تھے کہ کانگریس ہندوؤں کے لئے بھی خطرناک ہے کیوں کہ اس میں ان کو بنگالیوں کا غلبہ نظر آتا تھا۔ اس لئے سرسید پر فرقہ وارانہ علیحدگی پسندی کے رجحان کا الزام غلط ہے ۔ وہ دو قومی نظریئے کے نہ بانی تھے، نہ طرفدار ۔ اس نظریئے کے بانی دراصل احیاء پسند اور مذہبی قوم پرستی کی تحریکوں کے رہنما رہے ہیں ۔

یہاں یہ بتا دینا بھی مناسب ہوگا کہ سرسید نے جمال الدین افغانی کی پان اسلامی تحریک کی کبھی تائید نہیں کی ۔ وہ خلافت کے ادارہ کی افادیت کے بھی قائل نہیں تھے ۔ خلافت کو وہ محض دنیوی سلطنت کی ایک صورت جانتے تھے، اور اسی بناء پر جو کچھ خلفا نے اپنے اپنے عہد میں کیا اس کا ذمہ دار اسلام کو نہیں ٹھہراتے تھے بلکہ انھیں کو اس کا جواب دہ اور ذمہ دار سمجھتے تھے ۔ اس کے علاوہ سرسید یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس قسم کی تحریک کی مقبولیت کی وجہ سے مسلمانوں کی رہنمائی کٹھ ملاؤں کے ہاتھوں میں آجائے گی جس کو سرسید عام مسلمانوں کے مفادات کے خلاف سمجھتے تھے۔

جہاں تک سرسید کی فکر کے دوسرے پہلوؤں کا تعلق ہے وہ اتنے زیادہ اہم نہیں ہیں، جیسے کہ انھوں نے غلامی کے ادارہ کی مخالفت کی اور اس کو غیر اسلامی قرار دیا ۔ وہ عورتوں کی تعلیم کے موئید تھے، لیکن مردوں کی تعلیم کو زیادہ ضروری سمجھتے تھے ۔ انھوں نے رسم پردہ کی بھی تائید کی ہے (ملاحظہ ہو مقالات سرسید ۔ مرتبہ عبداللہ خاں خویشگی ص ۲۰۵) ۔

سرسید کے سیاسی خیالات سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ شاہ ولی اللہ کے بعد انیسویں صدی کے سب سے بڑے مفکر ہیں ۔ انھوں نے مسلمانوں میں لبرل تحریک کی بنیاد ڈالی ۔ ان کا سیاسی فلسفہ نہ صرف پوری ہندوستانی سیاست کو بہت اہم دین ہے بلکہ ہندوستان میں اسلامی فلسفہ میں بھی ایک اہم اضافہ کرتا ہے ۔

اندرجیت وت

دِل اور تیر

"تم چاہے کچھ بھی کہو شامو! میری نظروں میں اب دلدار سنگھ کی وقعت تاش کے بادشاہ سے کچھ زیادہ نہیں"۔
وادیٔ کلو کی سر بہ فلک پہاڑیوں سے گھرے چھوٹے سے پڑاؤ پر گدیوں کے ایک قافلے کے سردار کے یہ جملے شام کے دھندلکے میں الاؤ کے دھوئیں کے ساتھ فضا میں اونچے اٹھ کر شہ سوار کے دل میں زہر میں بجھے تیر کی مانند پیوست ہو گئے اور وہ موڑ پر گھوڑے کو روک کر ہمہ تن گوش' الاؤ کے اردگرد جمع گدیوں کی بات چیت سننے لگا۔

"تم بھول رہے ہو سردار! کہ دلدار سنگھ دل و جان سے سونیا کو چاہتا ہے اور چاہت میں چھوٹے بڑے کا امتیاز نہیں ہوتا"۔
"لیکن خودداری بھی آخر کوئی شئے ہے! ایسی محبت بھی کس کام کی جو ایک مرد کو جورو کی چوکھٹ کا کتا بنا کر رکھ دے"۔

"دلدار سنگھ میرا بہت پرانا ساتھی ہے اس کی عادات و خصلتوں سے میں بخوبی واقف ہوں۔ میں اب بھی یہ ماننے کیلئے تیار نہیں کہ اس نے مردانگی کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے۔ بلکہ سینہ ٹھوک کر کہہ سکتا ہوں کہ سونیا کے دل میں دلدار کے لئے اب بھی وہی قدر و منزلت ہے جو شادی سے پہلے پائی جاتی تھی"۔

"لیکن حالات گواہ ہیں کہ فی الحقیقت سونیا ہی چندن پور کی کار مختار ہے۔ کاروبار کا حقیر ترین مسئلہ بھی اُس کی مرضی کے خلاف طے نہیں ہو سکتا۔ البتہ ریوڑوں کا پالن پولن دلدار سنگھ کی زیر نگرانی ہوتا ہے اور یہ کام ایک ادنیٰ چرواہا بھی بخوبی کر سکتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کن معنوں میں اُسے راجہ کہہ کر پکارتے ہو!"

"یہ صرف اس لئے ہو رہا ہے کیونکہ سونیا شہر سے پڑھ لکھ کر آنے کے بعد شروع سے ہی اپنے باپ کی دست راست رہی ہے۔ حالانکہ دلدار سنگھ بھی پڑھا لکھا ہے پھر بھی کاروباری معاملات کی جتنی سوجھ بوجھ سونیا رکھتی ہے' اُسے حاصل نہیں۔ دلدار بھیڑ بکریوں اور چرواہوں کی نس نس پہچانتا ہے اور ہمالیہ کی گود میں دور تک پھیلے ہوئے چندن پور کے ریوڑوں کی دیکھ بھال اپنے ذمے لیکر برابر کا فرض نبھا رہا ہے۔ کسی کو اُس کی حیثیت سونیا سے کم نظر آئے تو اس میں اس کی عقل کا ہی قصور ہے نہ کہ دلدار سنگھ اور سونیا کا!"

"ہو سکتا ہے تم کسی حد تک درست کہہ رہے ہو لیکن دلدار سنگھ کی اس جورو پرستی کا اثر اُس کے ماتحتوں پر بہت برا پڑ رہا ہے۔ وہ دن رات ایک عورت کے سامنے سر جھکاتے ہوئے اپنے آپ سے بیزار ہوتے جا رہے ہیں!"

"میں اس حقیقت سے بھی روشناس ہوں کہ اِن خیالات کو ہوا دینے والوں میں تم پیش پیش رہے ہو۔ جس کی ایک اہم وجہ تمہارے دل میں دلدار سنگھ اور سونیا کیلئے نفرت کے وہ جذبات ہیں جو تمہیں کبھی چین نہیں لینے دیتے! سردار! میں جانتا ہوں کہ کسی وقت تم بھی سونیا کے خریداروں میں سے ایک تھے"۔۔۔ شامو کا منہ توڑ جواب سُن کر سردار کا سر ندامت سے جھک گیا۔

آس پاس بیٹھے چرواہوں کے فلک شگاف قہقہوں کی صدا رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی دور دور تک سنائی دینے لگی۔

(٭)

دلدار سنگھ نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ الاؤ کے اردگرد متحرک اور ساکن انسانی سایوں پہ ڈالی اور آہستہ سے گھوڑے کو ایڑ لگادی اس کے دل میں خودداری اور مردانگی کا ایک سمندر موجزن تھا۔ اُس نے خواب میں بھی یہ نہ سوچا تھا کہ لوگ اُس کی محبت کو اس قدر غلط نظریئے سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ سونیا کا حسین اور پرجلال چہرہ بار بار اس کی نظروں کے سامنے رقص کرتا ہوا اُن سنہری دنوں کی یاد دلا رہا تھا۔ جب اُن کی محبت ایک راز نہ رہ کر ہر ایک کی زبان بن گئی تھی۔

جب سونیا شہر سے چندن پور لوٹی تو اُس کے جوان اور حسین جسم کی دلکشی سے متاثر ہو کر ہر چھوٹے بڑے چرواہے کی للچائی نظر اُس کے قدموں کا طواف کرتی ہوئی اُس کے دل کے نہاں خانے تک رسائی حاصل کرنے کی سعی ناکام کرنے لگی۔ سونیا کی خوبصورتی اور فرعونیت کی کئی داستانیں دوسرے چرواہوں کی زبانی دلدار سنگھ کے گوش گذار ہو چکی تھیں وہ اکثر چندن پور سے باہر رہتا تھا اسلیئے کچھ عرصہ تک اس کی ملاقات سونیا سے نہ ہو سکی۔ آخر سردیوں کی ایک دوپہر میں حویلی کے عقبی باڑے میں دونوں کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ دلدار سنگھ اپنے ماتحت چرواہوں کو ضروری ہدایات دے رہا تھا اور سونیا نے باڑے میں داخل ہو کر تحکمانہ انداز میں اس کا کام اور نام پوچھا۔ اپنا سوال دوبارہ دہرائے جانے کے باوجود جب دلدار سنگھ اُس کی طرف متوجہ نہ ہوا تو اُس نے انگریزی میں ایک بھدی گالی دیکر اپنا ہنٹر ہوا میں اچھالا۔ دلدار سنگھ نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیکر اُس کا نازک ہاتھ اپنی آہنی گرفت میں لیتے ہوئے ہنٹر دور پھینک دیا تھا۔ سونیا حیرت واستعجاب کا مُبت بنی اُسے تاکتی رہ گئی۔ وہ نہ جانتی تھی کہ اُس کے باپ کے ماتحتوں میں کوئی انگریزی سمجھنے والا بھی ہے اور آتما بلد بھی ہے۔ اُسے دلدار سنگھ کی یہ حرکت کچھ اس طرح بھا گئی کہ وہ اُس پر ہزار دل وجان سے نثار ہو اٹھی تھی۔

اُن کی محبت کا چرچا سونیا کے باپ تک پہنچا تو اُس نے دلدار سنگھ کو دور دراز ایک ریوڑ کا نگران مقرر کرتے ہوئے اُسے چندن پور کی چار دیواری سے کوسوں دور رہنے کی ہدایت دی اور اگر دلدار سنگھ کبھی اُس کے حکم کی خلاف ورزی کرتا ہوا پکڑا گیا تو اُس کا سر تن سے جدا کر دینے کی دھمکی بھی دی گئی تھی۔ اس پابندی کے باوجود دونوں کی محبت میں بال بھر بھی کمی نہ ہوئی جب سونیا جدائی میں ماہی بے آب کی مانند تڑپ اٹھتی تو چندن پور سے دلدار سنگھ کے ریوڑ کو پہنچائی جانے والی رسد کی بوریوں، چرواہوں کی پوشاکوں اور خچروں کی پیٹھوں پر چاک، کوئلے اور مٹی سے بنے "دل اور تیر" کے نشان نمودار ہو اٹھتے۔ ان خفیہ پیغاموں کا راز اُن دونوں کے سوا بہت کم لوگ جانتے تھے۔ دل اور تیر کا نشان جب دلدار سنگھ کی نظروں سے گزرتا تو وہ راتوں رات دنوں کا فاصلہ گھنٹوں میں طے کرکے حویلی کے عقبی باڑے میں سونیا سے آملتا اور دو بے قرار دل محبت کی پُرسکون وادیوں میں پہروں مدہوش رہتے۔

آخر سونیا کے باپ کو بھی عشق کے دیوتا کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اُن کی شادی کے بعد وہ جلد ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اب سونیا اور دلدار سنگھ اتنی بڑی جائیداد ان گنت ریوڑوں کے مشترکہ مالک تھے۔ سونیا رانی تھی اور دلدار راجہ!

(٭)

دوسرے دن صبح دلدار سنگھ گیلری میں کھڑا پہاڑیوں کے عقب سے ابھرتے سورج کے دلفریب منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا

گھوڑے پر سوار ایک ریوڑ کا نگران گیلری کے نیچے آکر رُکا اور داس سے سر جھکا کر پوچھا۔

"سرکار! میرا ریوڑ نچلے میدان میں پہنچ گیا ہے۔ اُسے آج ان اتر مانے کیلئے شہر کے کس سوداگر کے ہاں لیجانا ہوگا؟"

"شمبھو! ریوڑ بدری داس کے گھر لے جاؤ۔" دلدار سنگھ نے مسکراتے ہوئے نگران کے سوال کا جواب دیا۔ احاطے میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنکر سونیا اپنے کمرے سے نکلی اور دلدار سنگھ کی بغل میں آکر کھڑی ہوگئی تھی لیکن دلدار سنگھ کو اس کی موجودگی کا احساس اُس کی آواز سُن کر ہوا۔

"دلدار سنگھ! تم یہ کیا غضب کر رہے ہو! ایک عرصے سے ہمارا کام گھنشام داس کے ہاں ہو رہا ہے اور آج تک کسی قسم کی شکایت موصول نہیں ہوئی بلا وجہ نئے سوداگر سے کاروبار کرنا ٹھیک نہیں! ریوڑ گھنشام داس کے باڑے میں ہی جائیگا۔"

"ریوڑ بدری داس کے ہاں ہی جائیگا۔ میں اُس سے وعدہ کرچکا ہوں" خلاف توقع آج دلدار سنگھ کو یوں حکم جاری کرتے دیکھا۔ سونیا بوکھلا اٹھی وہ پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی دلدار سنگھ اور کبھی شمبھو کو دیکھتی رہ گئی غصے سے اُس کے حسین گالوں کی لالی خون آشام حد تک لال ہوگئی اور اُس نے ہانپتی ہوئی آواز میں چیخ کر کہا۔

تم نے سُنا نہیں شمبھو! ریوڑ حسب دستور گھنشام داس کے ہاں جائیگا! پھر کیوں اب تک یہاں کھڑے بہرا پن ڈھٹائی کا ثبوت دے رہے ہو! شمبھو نے سر جھکا کر دونوں کو سلام کیا اور گھوڑے کو ایڑھ لگا کر تیزی سے حویلی کے صدر پھاٹک سے باہر نکل گیا دلدار سنگھ نے خون آشام نظروں سے سونیا کو ایک لمحہ کیلئے دیکھا اور پاؤں پٹکتا ہوا اپنے کمرے میں جا گھسا۔ سونیا کے ہونٹ کچھ کہنے کے انداز میں کھلتے ہوئے دکھائی دیئے لیکن کوئی آواز سنائی نہ دی اور وہ وہیں کھڑی رہی۔ تھوڑی دیر بعد جب دلدار سنگھ کمرے کے باہر آیا تو چرواہوں والی وردی اور کندھے پر جھومتی ہوئی اسکی لمبی بندوق پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ وہ اپنے دل میں کوئی مضبوط ارادہ کرچکا ہے وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے کھڑے اپنے گھوڑے کی زین کسنے لگا تو سونیا سست قدموں سے نیچے اتر کر گھوڑے کی دوسری طرف آکر کھڑی ہوگئی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا

"تم آج ناشتہ کئے بغیر اتنے تڑکے کہاں جا رہے ہو؟"

"جہاں پر میرا شمار پھر سے مردوں میں ہو سکے" دلدار سنگھ نے اس کی نظروں سے نظریں ملائے بغیر ترشی سے جواب دیا۔

"یعنی تم مجھے تنہا چھوڑ کر جا رہے ہو؟"

"میں نے کہدیا ہے نا! کہ میں مرد ہوں اور مرد بن کر جینا چاہتا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ سونیا معاملے کی تہہ تک پہنچکر دلدار سنگھ کو روکنے کے بارے میں کچھ سوچ پاتی دلدار سنگھ ایک جست میں گھوڑے پر سوار ہو کر آن واحد میں سونیا کی نظروں سے اوجھل ہوگیا سونیا اب بھی یہ سوچنے سے قاصر تھی کہ دلدار سنگھ اتنی جلدی کوئی انتہائی قدم اٹھا سکتا ہے۔ وہ دن بھر یہی سوچتی رہی کہ شام تک دلدار سنگھ کا غصہ ٹھنڈا ہو جائیگا اور وہ سورج غروب ہونے تک حویلی میں لوٹ آئیگا لیکن جب اندھیرا ہونے کے بعد بھی وہ واپس نہ آیا تو سونیا کے دل میں طرح طرح کے برے خیالات اور اندیشے گھر کرنے لگے جب وہ دوسرے دن بھی حویلی میں نہ آیا تو اُسے یقین ہوگیا کہ دلدار سنگھ کا غصہ عارضی نہ تھا اس کا دلدار سنگھ اس کی جلد بازی

پر عمل رہا تھا لیکن بمشکل پر قابو پالینا اُسے ورثے میں ملا تھا وہ اپنی حالت دوسروں پر ظاہر کئے بغیر حسب معمول سب کام کرنے لگی۔ سونیا نے دلدار سنگھ کی جگہ پرشا مو کو تمام ریوڑوں کا نگران اعلیٰ مقرر کر دیا اور سب کام اسی طرح ہونے لگا۔ چند دنوں تک چرواہوں میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں اور کچھ عرصے بعد لوگ اس واقعہ کو یوں بھول گئے جیسے دلدار سنگھ نامی کوئی شخص وہاں رہتا ہی نہ تھا۔

چند ماہ بعد ایک چرواہا سفر اور بھوک سے نڈھال چندن پور آکر سونیا کی حویلی میں داخل ہوا اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سونیا ہر پردیسی اور خاص کر چرواہوں کی خود دیکھ بھال کرتی تھی۔ دن بھر آرام کرنے اور بڑھیا خوراک میسر ہونے کے بعد شام کو چرواہے نے اپنی آپ بیتی دلچسپ پیرائے میں سنائی اور سب لوگ اسکے سفر کے کارنامے سن کر محفوظ ہوتے رہے اسی دوران میں چرواہے نے منالی کے سرداروں کی ملازمت میں آئے نئے منیجر دلدار سنگھ کا ذکر کیا تو سونیا کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ سونیا کی یہ حالت دیکھکر جب چرواہے نے اُس سے پوچھا کہ دلدار سنگھ سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے تو سونیا نے ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے جواب دیا "وہ مجھ بدنصیب کا خاوند ہے"

دوسرے دن چرواہا اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ لیکن اب سونیا کو دلدار سنگھ کا پتہ معلوم ہو چکا تھا۔ اُسے تسلی ہوئی کہ دلدار سنگھ اچھی حالت میں ہے اور لوگ اب بھی اس کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ چرواہوں کا خیال تھا کہ دلدار سنگھ کا پتہ معلوم ہو جانے پر سونیا کی طرف سے اُسے واپس بلانے کیلئے کوئی نہ کوئی قدم ضرور اٹھایا جائیگا لیکن دوسرے دن جب سونیا نے دلدار سنگھ کا ذکر نہ کیا تو انہیں مایوسی ہوئی دن گذرتے گئے اور لوگ ایک بار پھر دلدار سنگھ کو بھول گئے۔

ایک سال بعد منالی کی گدی سردار بھیراج کا یہ خط سونیا کو ملا۔

"محترمہ سونیا دیوی جی نمستے۔۔ آپ کے ہاں نئی نسل کی بھیڑیں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ اس نسل کی مزید ترقی کیلئے منالی میں اور تجربے کئے جائیں اسلئے اُن میں سے کم از کم سو عدد بھیڑیں آپ ہمیں بھیج دیں تو کرپا ہوگی۔ بھیڑیں منالی پہنچتے ہی پوری رقم ادا کر دی جائے گی۔ آپ کا شبھ چنتک۔ بھیراج"

دلدار سنگھ نے چندن پور چھوڑنے سے پہلے ولایتی اور دیسی نسل کی بھیڑوں کے امتزاج سے ایک نئی نسل کا تجربہ شروع کیا تھا اور اب اس نسل کی بھیڑوں کا ایک پورا ریوڑ تیار ہو چکا تھا۔ یہ بھیڑیں عام بھیڑوں سے ہر لحاظ سے عمدہ تھیں اور جس گدی نے انھیں ایک بار دیکھا دیکھتا ہی رہ گیا کئی سرداروں نے سونیا سے وہ بھیڑیں چوگنے داموں پر خرید کر ریوڑوں میں شامل کر لی تھیں۔ ان بھیڑوں کیلئے آمدہ یہ خط نیا نہ تھا لیکن اس خط کی اہمیت سونیا کیلئے دنیا کے تمام خزانوں سے بڑھکر تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس خط کے پیچھے بھیڑوں کیلئے دلدار سنگھ کی محبت اس امر کی گواہ ہے کہ وہ اُسے اب تک نہیں بھول سکا۔

دوسرے دن شام کو سو بھیڑیں حویلی کے باڑے میں پہنچ چکی تھیں۔ صبح انھیں چار دن کے سفر پر منالی کیلئے بھیجا جاتا تھا سونیا نے شام خود باڑے میں جا کر انکا معائنہ کرایا تھا بھیڑوں کا رنگ بھورا تھا لیکن اتفاق سے صرف ایک بھیڑ بالکل سفید رنگ کی تھی۔ رات کو اپنے پلنگ پر دراز سونیا کبھی پہلو بدل رہی تھی دلدار سنگھ کے اُس کا خط جسے دفتر کی کسی فائل میں ہونا چاہیئے تھا اُس کے ہاتھوں

میں تھا اور وہ بار بار اُسے پڑھ کر بے قرار ہو رہی تھی۔ بے قراری جب حد سے تجاوز کر گئی تو وہ چپ چاپ نیچے آئی اور باڑے میں داخل ہو گئی۔ چاندنی رات میں بھیڑیں سر جھکائے زمین پر سمٹ کر لیٹی یوں لگ رہی تھیں جیسے کسی دہقان نے جا بجا بھوسے کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں لگا دی ہوں۔ ایک کونے میں نئی بھٹی میں اب بھی کوئلے دہک رہے تھے اور اردگرد مختلف اقسام کی مہریں بکھری پڑی تھیں اُس نے بھٹی کے قریب جا کر ایک مہر آگ میں رکھ دی اور چرواہوں والی رسی لئے دبے پاؤں سفید بھیڑ کی طرف بڑھنے لگی۔ کمال چابک دستی سے پھندہ پھینک کر اس نے بھیڑ کو باندھ لیا اُسے بھٹی کے قریب لے جا کر لال آہنی مہر اس کی پیٹھ پر داغ کر ہانپتی ہوئی باڑے سے باہر نکل آئی۔ اپنے پلنگ پر اپنے آپ کو گراتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

———(٭)———

پانچویں دن پو پھٹتے ہی ایک شہسوار چندن پور کی حویلی میں داخل ہو کر گیلری کے نیچے رکا اور سفید گھوڑا ایک چرواہے کے سپرد کر کے اُس کی ہر ممکن تواضع کرنے کا حکم دیتے ہوئے تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر سونیا کے کمرے کے دروازے پر جا پہنچا۔ سونیا دلدار سنگھ کو سامنے پا کر فرط مسرت سے پاگل ہو اٹھی وہ بازو پھیلائے اس سے بغلگیر ہونے کے لئے آگے بڑھی لیکن دلدار سنگھ نے ہاتھ کے اشارے سے وہیں روک دیا اور نہایت سنجیدہ لہجے میں پوچھا "خادم کیلئے کیا حکم ہے رانی صاحبہ؟"

سونیا کے بڑھتے ہوئے قدم لمحہ بھر کیلئے وہیں رک گئے پھر اچانک وہ نئے عزم کے ساتھ آگے آئی اور دلدار سنگھ کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی اسے بغل کے کمرے میں لے گئی وہاں پالنے میں ایک حسین بچہ ایک کھلونے سے کھیلتا ہوا اُسے اپنے منہ میں ڈالنے کی انتہائی کوشش کر رہا تھا۔

اب یہاں کوئی رانی نہیں ہے! میرے دیوتا۔ اس حویلی میں اب اس ننھے راجہ کا راج ہے اور میں ہوں اُس کی ایک خادمہ! تم معاف کر سکو تو اس نوکرانی کو اپنے قدموں میں تھوڑی جگہ دیکر راجکمار کی سیوا کا موقع دو۔

دلدار سنگھ کا رواں رواں خوشی سے جھوم اٹھا وہ بچے کو اٹھائے گیلری پر لے آیا اور اُسے پیار بھری نظروں سے ٹکٹکی لگائے دیکھنے لگا تبھی ایک گھوڑ سوار گیلری کے نیچے آ کر رکا اور آج سے ایک سال پہلے کی طرح اس نے ریوڑ کے بارے میں حکم کی درخواست کی۔ دلدار سنگھ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ بچے نے بابا با کی آواز نکال کر اُس کے منہ کی بات چھین لی وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ سونیا اور گھوڑ سوار تجسس آمیز نظروں سے اُسے گھور رہے تھے۔ اُس نے اچانک سنجیدہ ہو کر شمبھو سے کہا۔

"ریوڑ بدری داس کے ہاں ہی جائے گا! تم نے سنا نہیں اپنے ننھے راجہ کا حکم؟"

اس پر دونوں قہقہہ لگا کر خوشی سے جھوم اُٹھے اور سونیا نے اضطراب پر قابو پانے کی غرض سے لپک کر بچہ دلدار سنگھ کی بانہوں سے لے کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔

مست فتحپوری

نرگس کہاں کبھی کبھی پیمانہ کہدیا
مستوں نے چشم یار کو کیا کیا نہ کہہ دیا

افشائے رازِ عشق کروں تو سُنے گا کون
اچھا ہوا کہ آپ نے دیوانہ کہدیا

بخشش سے ناامید ہو کیونکر گناہگار
رحمت کو تیری شانِ کریمانہ کہدیا

ظاہر پرست خاک نہ سمجھے تو کیا کرے
سجدہ تھا جس کو لغزشِ مستانہ کہدیا

اس طرزِ لب کشائی کے صدقے دل و جگر
دیوانہ ہوگیا جسے دیوانہ کہدیا

دراصل تھی وہ شعلۂ دل کی مرے لپک
مستی میں جس کو جلوۂ جانانہ کہدیا

پوچھا جو حال دل مرے آنسو نکل پڑے
اُن سے کس احتیاط سے افسانہ کہدیا

بجلی سی چمکی مستؔ نظر خیرہ ہوگئی۔
کیا پھر کسی نے رازِ حکیمانہ کہدیا

❊ ❊ ❊

مرزا رہبر جدید (نشید)

وہی اہلِ جہاں کو صدق کا پیغام دیتے ہیں
جو اہلِ دل محبت کو خدا کا نام دیتے ہیں

شبِ غم کے بھی لمحے کیا قیامت ہیں معاذ اللہ
کہ اک اک سانس میں یہ موت کا پیغام دیتے ہیں

جنہیں ہم سے محبت تھی جو بھرتے تھے وفا کا دم
غضب ہے وہ بھی اب دشنام پہ دشنام دیتے ہیں

ہمیں انساں کی عظمت کے پجاری ہیں زمانے میں
ہمیں انسان کو دنیا میں خدا کا نام دیتے ہیں

بجز عشق اور کوئی کام دنیا میں نہیں ان کو
جو اہلِ دہر ہیں ہم کو یہی الزام دیتے ہیں

سمجھتے ہیں نہیں توبہ کہ دل پہ کیا گذرتی ہے
جب اپنے ہاتھ سے وہ مسکرا کر جام دیتے ہیں

رہِ الفت میں تو نے گم رہوں کو ہمت تو دی
دعائیں ہم تجھے اے گردشِ ایام دیتے ہیں

وفا کی راہ میں آتے ہیں کچھ ایسے مراحل بھی
کبھی آلام دیتے ہیں کبھی آرام دیتے ہیں

وفا کی کیا شکایت ہے جفا کا کیا گلہ میرا
جہاں والے وفاؤں کا یہی انعام دیتے ہیں

نصیر پرواز

تعارف

مری دنیا ہے اک گوشہ، مری ہمراز تنہائی
گلِ بزمِ گلستاں ہوں نہیں میں نخلِ صحرائی

مجل ہے مشتری مجھ سے تو زہرہ مجھ سے شرمندہ
بنا ہے رہگذارِ شوق سے ہٹ کر مرا جادہ

خدائے لم یزل سے اپنی اک پہچان رکھتا ہوں
فقیری میں بھی گویا کشوری کی شان رکھتا ہوں

مری پستی کو چھوتا ہے سرِ افلاک پہنائی
نگارِ عالمِ فطرت مرے شعروں کی انگڑائی

مرے آگے جبینِ شوق سجدہ ریز ہوتی ہے
تنفس سے مرے، رفتارِ عالم تیز ہوتی ہے

میں دستِ دل سے خود کرتا ہوں لالے کی حنابندی
کھڑی ہے دست بستہ روبرو میرے ہنرمندی

کسی کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا
میں جب تک اپنے احساسات پہ شیدا نہیں ہوتا

نگاہِ گل رخاں دل پر مجھے اس کی نہیں حاجت
مدد عرشِ بریں کو گدگداتی ہے مری رفعت

متاعِ علم و دانش زندگی کو سونپ دیتا ہوں
میں اکثر سازِ عرفاں نغمگی کو سونپ دیتا ہوں

مرا فیضانِ الفت ہے کہ چشمِ دلبری نم ہے
مسرت کا لباسِ فاخرہ پہنے ہوئے غم ہے

زیارت گاہ اہلِ شوق ہیں تنہائیاں میری
اجالوں کی طرح پرنور ہیں پرچھائیاں میری

نگاہِ التفات آمیز کو صاحب نظر کر دوں
میں اپنے نغمۂ بیباک سے روشن سحر کر دوں

میں مشتِ خاک سے پیدا جہانِ گلفشاں کر لوں
سرودِ بے خودی میں ہر زمیں کہ آسماں کر لوں

مگر میں اپنی دنیا میں مگن دن رات رہتا ہوں
یونہی محوِ اسیرِ فکر و احساسات رہتا ہوں

آزر بیابانی (مدراس)

ستارہ اور انسان

نیم شب کے پراسرار سناٹے میں ایک لرزتا ہوا ستارا
نیلگوں ابر کے سہارے زمین کی طرف اترا نیم کی چھاؤں تلے
بیٹھے ہوئے ایک نیم خوابیدہ گریبان چاک اور غبار آلود
انسان کے پاس پہنچا پھر آہستہ ستارے نے کہا! -

میں ہوں نجم ضوفشاں، فطرت ہے میری تابناک
دے رہا ہوں میں ازل سے ایک درس زندگی
میں اگرچہ تیری دنیا کی فضا سے دور ہوں
تو کلیم آرزو ہے، میں چراغ طور ہوں
تیری دنیا میں طلسم روز و شب کے مرحلے
تیری دنیا سانس لیتی ہے ستاروں کے تلے
تو اگر نا آشنا مجھ سے ہے کیا افسوس ہے
تیرا دل نا آگہی کے جال میں محبوس ہے
تجھ کو کیا معلوم تو کیا جانتا ہے غم نصیب
کس لئے رہتی ہے تیری زندگی غم آشنا
مانتا ہوں تو معزز ہے سر روئے زمیں
کیا مگر آرام پائی ہے تری ہستی کہیں
میں یہ کہتا ہوں کہ تیری ذات ہے اک مشت خاک
آہ بر لب، دل گرفتہ کم سواد و سینہ چاک
کیا کہا تو نے کہ تو کونین کا غماز ہے
اور ترے سینے میں سربستہ فلک کا راز ہے
تیرا نغمہ گونجتا ہے حلقۂ آفاق میں!
تیری مشعل ہے فروزاں زندگی کے طاق میں
تیری ہستی ہے جہاں میں تیرہ بختی کی شکار
میں ہوں نجم ضوفشاں میرا رُشی سے ہمکنار

انسان ....!

بند کر اپنی زباں اتنی تعلّی کس لئے
میں نہیں ہوتا اگر پھر تیری ہستی کس لئے
لالہ و گل، انجم و مہتاب ہیں میرے لئے
گلستاں کے گلستاں شاداب ہیں میرے لئے
تو یہ کہتا ہے کہ میری زندگی ہے مشت خاک
میرے نالے سے ہمیشہ سینۂ فطرت ہے چاک
رات بھر تیری تنک تابی کی عظمت کچھ نہیں
تو زوال آمادہ ہے، تیری حقیقت کچھ نہیں
ذکر کیا تیرا کہ میں نے چاند پر پھینکی کمند
راز ہائے گنج پنہاں ہیں مری مٹھی میں بند
نو بہار ناز کو رنگیں بنا دیتا ہوں میں
وقت سے پہلے بہاروں کو صدا دیتا ہوں میں
یہ شفق میرے لہو کے رنگ سے ہے لالہ رنگ
مجھ سے ہر ذرّے کے دل میں خود نمائی کی امنگ
تو فقط پرتو کسی کا میں سراپا نور ہوں
خود کلیم نکتہ رس ہوں خود چراغ طور ہوں

نقد و نظر

سالنامہ پیام تعلیم" جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

جناب محمد حسین حسّان ندوی کی ادارت میں بچوں کے مشہور زمانہ رسالہ "پیام تعلیم" کا سالنامہ جنوری سنہ ۱۹۶۶ء ۱۶۸ صفحات پر شائع ہوا ہے جس میں بچوں کے لئے مشہور اہل قلم اصحاب نے مضامین تعلیمی مسائل سادہ اور شگفتہ زبان میں خاصی محنت کے بعد قلمبند کئے ہیں اس سالنامہ میں معلوماتی مضامین، اہم سوانح، خوبصورت نظمیں، چٹخارے دار لطیفے، سائنسی تحریریں اور دلچسپ کہانیوں کے ساتھ ساتھ جامعہ ملیہ کے تعلیمی میلے اور طلبائے جامعہ کی علمی و تفریحی مصروفیات کی داستان بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ گلیڈون سیسی کے موقلم نے جگہ جگہ تصویروں اور کارٹونوں کے ذریعہ مضامین کی قدر و قیمت کو دوبالا کیا ہے غرض اس خصوصی شمارے کی ہر تحریر بچوں کیلئے سرمایۂ علم و نشاط ہے جس کیلئے جامعہ کے اصحاب علم و فضل اور خصوصاً حسّان ندوی صاحب لائق صد مبارک ہیں۔ بچوں اور ان کے سرپرستوں کو چاہیئے کہ وہ ایسے علمی اخلاقی اور تہذیبی رسالوں کی سرپرستی کریں تاکہ نئی نسل میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے امکانات پیدا ہوں

زر سالانہ ۵ روپے اور ہر شمارہ پچاس پیسے۔ سالنامہ کی قیمت ایک روپیہ ہے۔

اسی سالنامہ میں ایک دلچسپ چار گوشہ کیلنڈر بھی شامل ہے۔

شب تاب

طلبائے ایوننگ کالج جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے شعبۂ اردو کا مجلہ "شب تاب" اپنی معیاری اشاعتوں کے سبب جامعاتی رسائل میں خاص مقام رکھتا ہے۔ پیش نظر شمارہ ۱۳ سنہ ۱۹۶۶ء جناب محمد اکبرالدین صدیقی لکچرار اردو کی مشاورت عزیز صدیقی، واجد صدیقی، اور وحید اللہ حسینی صاحبان کی ادارت میں شایع ہوا ہے اور ۱۳۶ صفحات کا احاطہ کرتا ہے جس میں طلباء کے مضامین نظم و نثر کے دوش بدوش اساتذہ اور مزاح نگار اصحاب کی تحریریں بھی شامل ہیں طلباء کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ طلباء میں لکھنے پڑھنے کا ذوق بڑی حد تک آگے بڑھ رہا ہے اور یہ طلباء شعر و ادب کے ساتھ ساتھ سائنس فلسفہ اور دیگر علوم و فنون پر بھی معلوماتی اور مفید مضامین لکھ رہے ہیں۔ شاعری کا جہاں تک تعلق ہے یہ بات خوش آیند ہی ہے کہ یہاں کے طلباء میں شعراء کی کثرت نہیں ہے اور طلباء کی شعری کاوشیں اس قابل بھی نہیں کہ حوصلہ افزائی کی جائے۔ عبدالرئیس خان، یوسف علی، صبغۃ اللہ، صادق، عزیز صدیقی، واجد، وحید اللہ، عمر سعید، بہادر ہاشم، عارف انصاری کے مضامین کے ساتھ کچھ افسانے بھی ایسے رہے جن سے اچھی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ "شام تبسم" میں پڑھا گیا۔ مجتبیٰ حسین کا مضمون اور نہ پڑھا گیا بھارت چند کھنہ کا مضمون (جو رسالے میں شامل ہے) طنز و مزاح کی ارتقائی ہیئت کے واضح امکانات ہیں۔

سالنامہ کوثر سوشیل کالج حیدرآباد حیدرآباد کے ایک خانگی تدریسی ادارہ "سوشیل کالج" کی طالبات کا ترجمان کوثر کا سالنامہ پرنسپل کالج عظیم عسکری کی سرپرستی اور لکچرار اُردو النساء منیر کی نگرانی میں شائع ہوا ہے جسے کالج کی طالبات دلاور شکیل اور عاصمہ سلطانہ نے ترتیب دیا ہے۔ اس رسالے کے بیشتر مضامین طالبات کے تحریر کردہ ہیں جن سے تہذیبی' اخلاقی' اور علمی روایات کے ساتھ ساتھ تخلیقی صلاحیتوں کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے۔ اشتراکی طرز کا سماج' معاشی مسائل کا حل' جہیز اور سماج' اردو کا مستقبل' اردو اور برج بھاشا' اردو اور مرثیہ اور سروجنی دیوی جیسے مضامین محنت سے لکھے گئے ہیں۔

ماہنامہ "ہمایون" دہلی جناب تاجور سامری نے سات سال تک ایک معیاری ماہنامہ "جوار بھاٹا" کی ادارت کی اور اب لاہور کے مشہور زمانہ "ہمایوں" کی دہلی میں بازیافت کی ہے اور اس کی زمام ادارت خود سنبھال لی ہے" ہمایوں" کے بالکل نئے دور کا پہلا شمارہ پیش نظر ہے جس میں اردو کے ممتاز معیاری لکھنے والوں کی لکھی ہوئی تحریریں شامل ہیں جن میں ڈاکٹر محمد حسین' شاہد احمد دہلوی' نگر لکھنوی' عرش ملسیانی' جگناتھ آزاد اور جاوید وششٹ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ہمیں یقین ہے ــــ جناب تاجور صاحب اپنے دیرینہ صحافت کے تجربے سے فائدہ اٹھاکر "ہمایوں" کو قدر اول کا رسالہ بنائیں۔ رسالہ کے پہلے شمارہ کو ہم خوش آمدید کہتے ہیں۔

سالانہ	ملنے کا پتہ	
دس روپے	۳۴ " E " کمال نگر دہلی	(وقار خلیل)

رسالہ نہ ملنے کی شکایت "سب رس" ہر ماہ باقاعدگی سے ڈاک کے حوالے کیا جاتا ہے اس کے باوجود شکایتی خطوط وصول ہونے پر دوبارہ بھجوا دیا جاتا ہے۔ ۱۵ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور رہتے ہیں۔
رسالہ نہ ملنے کی شکایت براہ کرم محکمۂ ڈاک سے بھی کیجیے۔ (منیجر "سب رس" حیدرآباد دکن)

(بقیہ صفحہ ۲۱) وہ اپنے آپ کو ہارا ہوا جواری سمجھتا ہے لہذا جب کبھی وہ دفتر' کارخانہ' یا بازار کا رُخ کرتا ہے تو حسینوں سے آنکھیں چار کرنے کی بجائے قرض خواہوں سے نگاہیں چرانے کی سعی جمیل فرماتا ہے۔ اب آہستہ آہستہ اسے لین داروں کو جھانسا دینا' بہانے تراشنا اور جھوٹے وعدوں پر ٹرخانا بھی آگیا ہے۔ قرض کے آرٹ کا ڈانڈا اسی مرحلے سے ملتا ہے۔ آگے کی ارتقائی منزلیں اس کے اپنے وجدان صلاحیت اور محنت پر منحصر ہیں وہ چاہے تو کھمبے کی طرح زمین میں گڑا رہ جائے' چاہے تو الگنی کے کپڑے کے جیسے ہواؤں میں لہراتا رہے' یا چاہے تو پاؤں میں بانس باندھ کر اشتہاری لونڈوں کی مانند بلند و بالا قد کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتا جائے۔

۲۰۴۔ ہمارا ہے تمنا سوں یہ التماس	جو بی بی مے تئیں بھیج برما دو آس
۲۰۵۔ حقیقت جو تھا سو کہیں ہوئی تمام	زیادہ لکھیں اس تے کیا والسلام

نامہ فرستادن پیشِ حضرت رسول اللہ علیہ وسلم

۲۰۶۔ بلا بھیج قاصد کو وہ بدگُہر	دیا کر نامے کے تئیں بھیج کر
۲۰۷۔ سو در حال قاصد وہاں تے گیا	ادب ساتھ حضرت کو نامہ دیا
۲۰۸۔ وہ نامہ نبی سر نے پک لگ تجھائے	لکھے تھے سو مضمون مکر اس میں پائے — تجھانا بکسر نون = غور سے دیکھنا۔
۲۰۹۔ وہ نامہ کو حضرت تراں گھر متے	لے کر آئے در حال بی بی کنے — تراں = بعد ازاں۔
۲۱۰۔ کہے اے مری جان و دل اے بتول	کہے ان نبوت کے بستاں کے پھول
۲۱۱۔ تمن کو عروسی کو وہ گم رہاں	بلانے کو بھیجے ہے نامہ یہاں
۲۱۲۔ یو نامے کو خاطر لگا کر جواب	تمیں بول بھیجو انو کن شتاب
۲۱۳۔ تراں دیکھ نامے کو خیر النساءؓ	دئے جاب حضرتؐ کو وہ خوش لقا — جاب = جواب۔
۲۱۴۔ ایا واقفِ راز حق کے رسولؐ!!	نہ کرنا تمے بات ان کی قبول — تمے = تمہیں، تمھیں۔
۲۱۵۔ سکل جمع وال ہو کے اہلِ قریش	لیا آئے ہیں مکر ہمنا سوں پیش
۲۱۶۔ بچارے ہیں وہ مل کے اس بات کوں	مجل کرنے ہمنا کو ہر دھات سوں — دھات = بالفتح = طرح، طریقہ۔
۲۱۷۔ لکھے ہیں یو نامہ انو مکر سات	نہیں سچ کچھ اس میں بجز جھوٹ بات
۲۱۸۔ ہماری سگی مائی جیتی براں	انو کے انگے زیر یہ گم رہاں — براں = بفتح اول = اس وقت۔
۲۱۹۔ انو اس دنیا سو ہوئے گر وفات	پیو کر مانڈے ہار سے سگات — پیو = انھوں۔ مانڈنا = ارادہ کرنا۔ تدبیر کرنا، مراد سازش۔ سنگات = بفتح سین، دندانہ دار، نونِ غنہ اخیر احرف کاف فارسی کے ساتھ۔

۲۲۰۔ نہیں تو پیو کو کہاں منہ اتھا	انو کے انگے فخر کرنے بیتا
۲۲۱۔ مجھے دیکھ تنہا انو خوش ہو کر	بلائے ہیں اس فکر سوں مکر کر
۲۲۲۔ کہو جاؤں کیوں میں بیگانیاں کے گھر	جو وہ مجھ بلائے ہیں یوں مکر کر
۲۲۳۔ یو ناہو کے تئیں کوئی دوجا یہاں	جو آوے مرے ساتھ ہمراہ واں — ناہو کے = نہ ہو کے بقطعِ نظر۔ یو ناہو کے = علاوہ بریں۔

۲۲۴۔ کھیلی یوں کوئی تھی بچیریں سنگات — یگانہ ہو کر نہیں بگانیاں بات

۲۲۵۔ جو اس دھات صدقہ فاطمہ سر بسر — انو کا کہے کر سب کھول کر

۲۲۶۔ کہے جب وہ سب نقل خاتون میں — جو حضرت سے سو ہو سنگر میں۔ — نیں = نے

۲۲۷۔ بتراں حال میں آئے روح الامیںؑ — کیے وحیٔ حق کا نبیؐ پر سبیں

۲۲۸۔ خدا بول تحنا درود و سلام — دیا بھیج کر بعد ازاں یوں پیام

۲۲۹۔ کیا عذر کو دل سے سار کر — دیو دبیج بی بی کو اس ٹھار پر

۲۳۰۔ نکو کچھ اندیشہ کرو ہور بچار — کہ آخر کو دے ہو دیں گے شرمسار — اندیشہ کا نون غنہ = ضش ۔

۲۳۱۔ کہ بھیلے وہ نا جائے تیوں پاک ذات — نگہباں ہوا اس کا ہوں میں اس کے سات

۲۳۲۔ پیمبرؐ ہوئے شاد سن یو خبر — خداوند کو سجدۂ شکر کر

۲۳۳۔ کہے یا نبی جا کے کہتا ہوں میں — جے کچھ حق کیا ہے سو بی بی کنیں — کیا = کہا کنیں = کے پاس ۔ نون کی زیادتی = ضش ۔

۲۳۴۔ بتراں جا کے بی بی ستے یوں کہے — جے کچھ وحی جبریلؑ آ جیوں کہے

۲۳۵۔ تب او پاک دامن ادک خوش ہو کر — کہے امر حق کا ہے مجھ سر اُپر

۲۳۶۔ آیا جاؤں کئی میں انو کے مقام — جو آیا ہے حق ستے یوں پیام

۲۳۷۔ کہے پھر کے جبریلؑ سوں یوں رسولؐ — کئے فاطمہؓ امر حق کا قبول

۲۳۸۔ کہا پھر کے جبریلؑ حضرتؐ کنے — کہ جاتا ہوں زیور لکانے کوں میں — لکانے = لیکر آنے کی تخفیف ۔

۲۳۹۔ جو میں آئے لگ یاں توقف کرو — نظر میرے آنے کی پنت پر دھرو — پنت = بفتح بائے فارسی و نون غنہ و رستہ = سڑک ۔

۲۴۰۔ کیا ہور گیا جبریلؑ امیںؑ — [illegible] کے اُپر چھوڑ دے کر زمیں

۲۴۱۔ بتراں بول بھیجے نبیؐ واں خبر — [illegible] ے ہیں بی بیؓ عروسی کے گھر

۲۴۲۔ خبر کے قاصد وہاں تے شتاب — گیا ہور دیا ان کو اس کا جواب

۲۴۳۔ ہوئے خوش دنو سن کے اس بات پر — سنوارے سنے سات سارا وہ گھر — دنو = انھوں = دو ۔ سنے = سونے (ذھب ۔ زر)

۲۴۴۔ کہے خوش دغا دسے ہیں تو بلائے — ادک مکر و حیلے ستے پیش آئے

۲۴۵۔ دغا کو ہماری نہیں وہ پچھان — جو آتے ہیں اس ٹھار ہو میہمان

۲۴۶۔ وے نیں پچھانے تھے وہ بد گہر — کہ آخر خجل ہو گئیں آپ کر

۲۴۷۔ بدی نیک لوگاں سو جن کوئی بدائے — انو سب ہی ہو ندمی پیش آئے — بدانا = بندھانا = بندھنا ۔ ندمی = ندامت ۔ یاخت ۔

۲۴۸۔ جے کوئی حق کے نزدیک مقبول ہے — ہمیشہ رخا اس کا سو جو لا پھول ہے — جے = یائے مجہول خت ۔ کوئی = واؤ خت ۔

۲۴۹۔ کہیں کس طرز سوں اے محمد فر کہ جس پر خدا کا سدا ہے نظر

بناکردنِ میزبانی مکاراں

۲۵۰۔ بلبداں جو وہ میزبانی گنگنائے	عرب کے قبیلیاں کو سالم بلائے	گنانا = بضم کاف فارسی۔ با قاعدہ کرنا سلیقہ سے کیا مہارت دکھانا۔ سالم = سب، جملہ = بلا استثنا۔
۲۵۱۔ بڑے دبدبے سوں گنائے تھے کاج	نہیں کوئی کیا کاج اس دھات راج	
۲۵۲۔ بنائے تھے ایسا مندٔف زرنگار	دُئے تھے اسے زیب زر سوں سنگار	
۲۵۳۔ وہ مندٔف کے تھیں تھام کنچن کے تھے	کلس تس کے اپرال کندن کے تھے	تھام = تھم = ستون۔ کنچن = سونا۔
۲۵۴۔ طنابان اتھے اس کو زر تار کے	سُنے کے اسے میخ ہر ٹھار تھے	
۲۵۵۔ وہ میخاں کے تیں ٹھونک ہر ایک ٹھا	زمیں پر مندٔف کو کئے استوار	
۲۵۶۔ بچھانے بچھا اس میں گوں دھات دھات	سٹے مسنداں تس پو ترتیب سات	سات = ساتھ۔
۲۵۷۔ اتھے فرش اس میں بڑے مول کے	ہر اک پادشاہی کے تھے تول کے	
۲۵۸۔ لگا شمع کے جھاڑ ہر ٹھار پر	دکھائے تھے مجلس میں گل زار کر	
۲۵۹۔ سنے کی وہاں مجمراں کئی ہزار	رکھے لا کے مجلس میں ہر ایک ٹھار	مجمر = عود دان۔
۲۶۰۔ کئے تھے وہاں باغ آراستہ	اتھے سرو اس میں چپ دراستہ	راست میں بائے ہوز کی زیادتی = غلط۔
۲۶۱۔ ہر یک جنس کے جھاڑ کئی رست تھے	اپس میں اپے مل کے ہم دست تھے	رست = ف۔ رُستن۔ اُگا یا بڑھا ہوا۔
۲۶۲۔ ڈلیں چار سو دیکھ بارے ستے	نظر مست تھی تس نظارے ستے	بارا = ہوا۔
۲۶۳۔ ادک جھاڑ چینی کے تھے دل فریب	سو چمپا کے اُتّن کو بخشے تھے زیب	اسّن = ستون۔ جنہ۔
۲۶۴۔ وہاں تھے کتیک جھاڑ گل زار کے	کتیک تختے تھے سیب انار کے	انار = بہ تشدید غلط۔
۲۶۵۔ کہ ریحان ہور یاسمن اسیوتی	مدن بان مُگرا اتھے دیوتی	مُگرا = موگرا۔ دیوتی = دیوٹی۔
۲۶۶۔ اتھے گوہ چمن صاف وال دل ربا	جو اس بن کی تس میں ۔۔ ہو صبا	۔۔۔۔ جگہ کرم خوردہ۔
۲۶۷۔ مرصّع سوں ہر ایک کنگر سنوار	چمن کے دو رستہ دیے تھے قرار	کنگر۔ ہ۔ کٹھگر = کٹھگھر = لکڑی کی باڑ۔
۲۶۸۔ کتیک حوض خانے اتھے آب دار	جو پانی اتھا تس میں موتی کے سار	
۲۶۹۔ اتھیں فوارے اچھلتے سو یوں	و سرآتے تھے موتیاں کے جھبلے جوں	فوارے = بتخفیف واؤ غلط۔ جھبلا = بکسر جیم مجمع

ح ہائے ہندی وسکون ہائے مجہول چوتھا حرف لام = گچھا۔

۲۷۰۔ کتے دعات کے واں کلاونت بلائے — بجانے لگے وہ دف وچنگ ونائے

۲۷۱۔ کتیک نقش پور گیت گانے لگے — مجالس کو سارا رجھانے لگے

۲۷۲۔ کیئے تھے الو بوں زرینے تیزیب — جو ابلیس دیکھے تو پا دے فریب

۲۷۳۔ لگے ناچنے وہ ادک ناز سوں — ہر یک گیت گادیں خوش آواز سوں

۲۷۴۔ جو اس ڈھنچ کی میزبانی کنائے — لیکر میہماناں کو مسند پو آئے

۲۷۵۔ کہ ہر ایک واں کے زناں نابکار — زرینے سے تن کو کیئے تھے انگار

۲۷۶۔ وہ سب آئے مجلس میں مسند اُپر — جو بیٹھے سو تھے گزدمانِ سقر

۲۷۷۔ کیتیک ان کے انگے کنیزاں کھڑیاں — انو ہو کے بیٹھے تھے بی بیاں بڑیاں

۲۷۸۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فرمائے مطبخ کے تیں — لگے واں پکانے کوئی الحال وہیں — .... جگہ کرم خوردہ۔

در تعریف سفرۂ آں لعیناں

۲۷۹۔ کتیک رنگ کے واں پلاواں پکائے — ہزاراں سو بریان دندے کرائے — دندہ ۔ ف بفتح دال و نون غنہ تیسرا حرف بھی دالِ مہملہ یعنی مراد پہلو۔ بکرے یا مینڈھے کی اگلی ران۔

۲۸۰۔ کتیک دعات کی شیرنی ہور ناں — پکا کر دھرے کئی ہزاراں سو خواں

۲۸۱۔ کہ پیاز ہور مولی و نانا پنیر — کتیک جنس قلیے کے تھے دل پذیر — نانا = نعناع ۔ ع ۔ پودینہ ۔

۲۸۲۔ کہ اس دعات کی کر کند وری اپار — وہ بیٹھے تھے کھینچتے انتظار — اپار ۔ س ۔ بکثرت ۔ بے حد ۔ وافر۔

زیور بہشتی و حلّہ ہائے نورانی آوردن جبریل علیہ السلام برائے حضرت فاطمہ علیہا السلام

۲۸۳۔ کتیک وقت کو پھر کے جبریل آئے — بہشتی وہاں حور و غلمان لائے

۲۸۴۔ بہشتی زرینے کتیک دعات کے — لیکر آئے حلّے کتیک بھات کے

۲۸۵۔ اگر اس زرینے کو جن کوئی بجھائے	ندا تاب بے تاب ہو سُدھ گنوائے	
۲۸۶۔ اتھا قدرتی وہ زرینہ تمام	جو بھیجا ہے خالقِ صبح و شام	قدرتی = یعنے جس کو دیکھ کر خدا کی قدرت نظر آئے = مراد حیران کن۔
۲۸۷۔ سو جبریلؑ ویسے زرینے کو لائے	وہ خاتونِ جنّت کو سالم پنہائے	
۲۸۸۔ سگل حور مل نور کے تیل سوں	لگے کرنے کنگوئی خاتونؑ کوں	
۲۸۹۔ خدا کے کرم کا لگا کر عبیر	مُبارک بدن پر سٹے (گل کا نیر)	"گل کا نیر" مرتب کا مجوزہ ہے۔ مخطوطے میں یہ جگہ کرم خوردہ ہے۔
۲۹۰۔ ہوئے مستعد جانے اس ٹھار پر	نورانی سگل تن کو سنگار کر	نورانی = واؤ۔ حت۔
۲۹۱۔ پیمبرؐ کنے جا کے رخصت لیے	بزاں برقع نور بی بیؓ کیے	
۲۹۲۔ فرشتے کتیک صف بہ صف باندیا	چلے تھے رفیقاں ہو جبریلؑ تا	
۲۹۳۔ انگے جا کے جبریلؑ جوں چوب دار	کیے غیر لوگاں کو مند تے بعار	
۲۹۴۔ وہ باندیاں کو مند تے اول اٹھائے	بزاں بی بیؓ دین و دُنیا کو لائے	
۲۹۵۔ پکڑ نور کے پر دے اس ٹھار پر	بلا بھیجے بی بیؓ کو واں آنو کر	
۲۹۶۔ وہ خاتونؓ دیں نونکل گھر تے جا	چلے واں سو دُنیا کے لوگاں کے ٹھا	
۲۹۷۔ بہشتی جتے حور ہمراہ تھے	لگے کرنے خدمت کو ڈگ ڈگ تے	ڈگ = قدم۔
۲۹۸۔ رکھے نور کا تخت اس ٹھار پر	کھڑی حور واں خدمت اختیار کر	اختیار = یا۔ حت۔
۲۹۹۔ بزاں بی بیؓ اس دعوات کی شان سوں	چڑے تخت پر واں تے بھگوان سوں	
۳۰۰۔ طبق جوہراں کے بھرے کئی ہزار	کھڑے لا کے بی بیؓ پو حوراں نثار	
۳۰۱۔ جواہر جو بی بیؓ پو صدقہ دئے	وہاں کے سگل عورتاں چن لیے	
۳۰۲۔ گئیں وہ کنیزاں خجل ہو سگل	کنارے گیاں واں تے سارے نکل	
۳۰۳۔ دیکھت ٹیں چلیا مکر ہو کر مجل	لگے دیکھنے ٹیں سب یک ٹھار مل	یک۔ یا۔ حت۔
۳۰۴۔ لگے آپ میں آپ کرنے بچار	ہمیں تو ہوے یاں اوک شرم سار	
۳۰۵۔ ایتو اس دغا سا تھ آتے نگر	نہ تھا کام ہمنا کو اس ٹھار پر	
۳۰۶۔ عبث مکر سینے ہمیں ہنشیا آئے	ہمارا ہمیں ہو کے عزت گنوائے	
۳۰۷۔ خدا کی خدائی پو بلہار ہوں	اپن دستاں کو رکھے شرم سوں	یہاں سے التفات۔

۳۰۸. جنوکا خدا عزّ و حرمت رکھے — انو ساتھ کوئی مکر کیوں کرسکے — کوئی = واؤ خت .

۳۰۹. جو کوئی اس کے خاصاں سو دشمن ہوا — خجالات کے دریا میں وہ ڈُب موا

۳۱۰. جو کوئی دیں کے لوکاں سوں یو پیش آئے — دیکھیوں نا سزا اس خدا ساتھ پائے

۳۱۱. وہ نادان ہے کچھ کئے تھے بچار — آگے اُن کے آیا ہوئے شرم سار

۳۱۲. جسے محب دہرتے انو کو مدام — محبت سوں خاصاں کے دیتا ہے جام — دہر = بفتح ہائے ہوز = خش.

۳۱۳. کہ وہ کون ! سو جانو آلِ رسول — خدا کی رضا سوں انو ہے قبول

۳۱۴. انو حشر کے دیس کے راج ہے — انو کو ہر یک رات معراج ہے

۳۱۵. انو کو کرم سوں کتنیک گُم رہاں — دیکھے دین کی باٹ جگ سوں .. دعیاں — .. جگہ کرم خورده ممکن ہے کہ "عیاں" ہو .

۳۱۶. انو میں تے کتنیک زناں پیش آ — لیکر آئے بی بی کی خدمت بجا — .. یہاں سے عَود الی المقصود .

۳۱۷. کھڑے ہو ادب ساتھ تسلیم کر — لگے بولنے یوں زباں کھول کر

۳۱۸. قدم پر تمہارے ہمیں رکھنے سر — بہت وقت سوں سب اتھے منتظر

۳۱۹. اگر حکم ہوئے تو سفرہ بچھائیں — بجالا کے خدمت ہمیں فیض پائیں

۳۲۰. دئے جاب بی بی نزاں یوں شتاب — نہ ہوئے سوں کنے پھر انو کو جواب — ط : نہوئے تیوں الخ . نہوے سوں = نہو سکا . یعنے وہ جواب نہ دسکے .

۳۲۱. کہے یوں انو کو کتے سچ تمیں — دلے کس وزا کھاں کھانا ہمیں — وزا = وضع .

۳۲۲. تمیں دشمنِ دیں ہمیں دین دار — کریں کیوں تنا دل یہاں اختیار

۳۲۳. ہمارا تمیں دیں کریں گے قبول — تو رفیع اچھیں گے تمن سوں رسولؐ

۳۲۴. ہمارے تی دین پر آئیں گے — نزاں آکے کھانا ہمیں کھائیں گے

۳۲۵. سن اس بات کو دین کر اختیار — ہوئے اُن میں چالیس تن دین دار

۳۲۶. چلے واں سوں بی بی پھر اپنے مقام — نبیؐ سوں کہے قصہ واں کا تمام

۳۲۷. جو یو قصہ تھا فارسی سوں اول — کیا اس کو دکھنی زباں سوں بدل

۳۲۸. جو ہمت نبیؐ سوں مدد منگ لیا — سو اس مثنوی کو مرتب کیا

۳۲۹. کہ اُے اوستاداں صاحب ہنر — دکھو اس کو اصلاح کی رکھ نظر

۳۳۰. بہر یو زہ آیا ہوں میں سب کے پیش — کرو خیر تُس سوں نکو مار دریش

۳۳۱. مرے حق پہ احسان سوں پیش آؤ — اس احسان کے نخل کا بار پاؤ

۳۳۲۔ دیا ہے خدا جیوں تمن کو ہنر عطا تیوں کرد جگ کو ہوا ہر

۳۳۳۔ جو فردا رہے یو تمارے سنگات کرو سی اس کو ادک جہد سات

۳۳۴۔ ہنر مند جوں جھاڑ ہے باردار لگے ہیں اسے میوے کئی لک ہزار

۳۳۵۔ اگر کوئی اس جھاڑ کا بور نہ پائے تو وہ بار ہور جھاڑ کیا کام آئے

۳۳۶۔ پیمبر کی ہجرت کی ... مداد کوں لکھا مثنوی ہیں ادک یاد سوں — مداد ؟ کرم خوردہ۔

۳۳۷۔ اتھے یک ہزار و اسی آٹھ سال دیا بار اس مثنوی کا نہال — رمضان = ۱۰۸۸ء م اکتوبر ۱۶۷۷ء۔

۳۳۸۔ شب قدر ہور تعادہ ماہ صیام کیا ختم ترتیب سوں وہ کلام

۳۳۹۔ نشاں جگ منے ہے مرا یو نہال کدھیں کس خزاں تے اسے ئیں زوال

۳۴۰۔ اسے ئیں زمانے سنے درد و غم سدا بار بہوں رہے جھاڑ جم — سدا بار = اسم فاعل ترکیبی۔ ہمیشہ میوہ دار رہنے والا۔

۳۴۱۔ خدا میرے رُکھ کو کیا باردر توکیوں نا دیوے اس دعا کا ثمر — رُکھ = رد کھ = پودا۔

۳۴۲۔ اچھو باریو بھر در جگ پو عام بحقِ محمد علیہ السلام

(تمت تمام شد)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

معجزۂ فاطمہؑ

از

فاروقی

متعلقہ مصادر میں فاروقی سے متعلق کوئی بالواسطہ اطلاع بھی نہیں ملی ۔ اس مثنوی سے بھی کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کون تھا ، کہاں کا تھا ۔ اس نے مثنوی میں اپنی زندگی کے متعلق کسی طرح کا کوئی ذکر اشارۃً بھی نہیں کیا حتی کہ تاریخ تصنیف بھی نہیں بتائی لیکن مثنوی کی زبان اور اس کے اسلوب و مضمون سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ گیارویں صدی ہجری کے نصف آخر میں لکھی گئی ہے ۔

اس مثنوی کا موضوع و مضمون وہی ہے جو محبؔی کی مثنوی کا ہے ۔ فاؔروقی نے لکھا ہے کہ اصل روایت عربی میں تھی عربی نہ جاننے والے اس سے استفادہ نہیں کر سکتے تھے اس لئے (دکھن یا ایران ؟) میں یہ فارسی میں منتقل کی گئی اور چوں کہ فارسی دکھنی عوام کی زبان نہیں تھی اس لئے ؎

لکھا فارسی کا میں دکھنی کلام   یہ معلوم ہونا لکر خاص و عام

آگے چند ایسی باتیں لکھی گئی ہیں جو قدرے قابل توجہ ہیں جیسے مثلاً ، ”روایت ہے یہ حضرت عباسؓ سوں“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سے زیادہ اصحابؓ کے نام عباسؓ ہیں (۱) معلوم نہیں یہاں کون بزرگ مراد ہیں ۔ پھر یہ لکھا ہے کہ سیدہ فاطمہؓ کو دعوت دینے والا

”عرب میں تھا عبد اللہ نام دار   اتھا بہوت تجار اور مال دار
یہ دنیا کی نسبت نبیؐ کا چچا   تھا دشمن نبیؐ کا وہ مشرک بچا
ابوجہل کا وہ سگا بھائی تھا   تونگر تکبّر میں ہرجائی تھا“

لیکن واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کے دس چچاؤں میں سے کسی ایک کا نام بھی عبد اللہ نہیں تھا (۲) دوسرے یہ کہ ابوجہل سے رسول اللہ صلعم کا براہ راست یا کوئی قریبی خونی رشتہ بھی نہیں تھا ۔ ابوجہل تو بنو ہاشم سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا وہ تو مخزومی تھا ۔ ابوجہل کے باپ ہشام کے بارہ بیٹے تھے جن میں سے ایک کا نام عبد اللہ تھا ۔

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا — فون ادارہ ۳۵۲۰۹

۱۹۳۸ء — معتمد ۳۷۴۶۳

جلد ۲۹ — شمارہ ۶ — جون ۱۹۶۶ء

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد دکن

نگران

پروفیسر سید علی اکبر

مجلسِ مشاورت

میر حسن۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ مسز راج سکینہ

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

زرِ سالانہ ہندو پاک سے — چھ روپے

غیر ممالک سے — دس روپے

ششماہی — تین روپے

فی پرچہ — پچاس پیسے

مہتمم ادارہ ادبیات اردو کے اہتمام سے شمع فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوانِ اردو خیریت آباد حیدرآباد ۴ سے شائع ہوا

ترتیب

اداریہ

اپنی بات

مئی حیدرآباد کے عوام کیلئے انتہائی ادبی معروفیتوں اور دلچسپیوں کا مہینہ تھا۔ ادارہ روزنامہ سیاست کے زیر اہتمام ایک ادبی ٹرسٹ قائم کرنے کی اسکیم بنائی گئی تاکہ اس سے ہمارے ادیبوں کی تخلیقات کو منظر عام پر لایا جاسکے۔ آندھرا پردیش ادبی اعتبار سے بھی ہندوستان میں بلند مقام کا حامل ہے لیکن افسوس اس کا ہے کہ اس کے ادیب اور شاعر بھی محرومی اور کم نصیبی کا گلہ کرتے آئے ہیں۔ وجہی عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا شاعر ہے لیکن اس کے دربار میں داخل ہونے سے پہلے اپنی فاقہ کشی اور غربت کا گلہ اپنے دیوان میں کرتا ہے جس کی تفصیل قبل ازیں "سب رس" کے صفحات پر پیش کی جاچکی ہے۔ یہی حال ابن نشاطی کا ہے جو ابوالحسن قطب شاہ کے دور میں اپنی شاعری سے زیادہ انشاء پردازی پر فخر کرتا ہے لیکن آج اس کا ایک جملہ بھی ہم تک نہ پہنچ سکا۔ ہم صرف اس کی "پھول بن" سے واقف ہیں۔

ہزاروں پھول دشت و در میں ایسے بھی کھلے ہوں گے —— کہ جن کے مسکرانے میں تھی خوشبو مشک اذفر کی

لیکن جنگل میں مور ناچا والی بات ہوئی کتنے ہی ادیب اور شاعر ہمارے دیس میں پیدا ہوئے اپنی شاعری اور ادب کو اپنے خون جگر سے سینچا۔ اپنے نتائج افکار کو پھیلا نہ سکے اور ختم ہوگئے۔ ہندوستان میں پہلی دفعہ ادبی ٹرسٹ قائم کرنے کیلئے حصول آمدنی کا ایک ذریعہ مشاعرہ بھی تھا۔ یہ ۲ مئی کو منعقد ہوا اور —— ملک کے مشہور شعرائے کرام۔ علی سردار جعفری۔ کیفی اعظمی، جگن ناتھ آزاد، جیکل آسامی، کیلاش ماہر، مینا قاضی، تبسم اور سلیمان خطیب اس مشاعرے کو کامیاب بنانے کیلئے حیدرآباد آئے اور مشاعرہ کے بعد مختلف چھوٹی موٹی محفلوں میں بھی عوام کو اپنا کلام سننے کا موقع دیا اور فضا کو شعریت سے معمور کردیا۔ یہ مشاعرہ بالکل مقصدی تھا جن اغراض کے تحت اس کا انعقاد عمل میں آیا اگر ان کی بجاآوری احسن طریقہ پر ہو تو یہ ادارہ کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

اس کے ایک ہفتہ بعد ہی ۱۳ اور ۱۴ مئی سنہ ۱۹۶۶ء کو مزاح نگاروں کی ایک کل ہند کانفرنس زندہ دلان حیدرآباد کی جانب سے منعقد ہوئی اور ملک کے مشہور اور نامور طنز نگاروں اور مزاح نگاروں کو حیدرآباد آنے اور اردو کے ماحول میں سانس لینے کا موقع ملا۔ اس کانفرنس کے ساتھ ایک مزاحیہ مشاعرہ کا بھی انعقاد عمل میں آیا مشاعرہ میں داخلہ ٹکٹ کے ذریعہ تھا اور ٹکٹ کی فروخت سے اندازہ ہوا کہ اس نے سارے سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے۔ ادیبوں میں کرشن چندر کا نام سرفہرست ہے۔ پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی، سلمیٰ صدیقی، احمد جمال پاشا، سرور جمال، عبدالاحد خاں تخلص اور یوسف ناظم صاحبان نے کانفرنس میں شرکت کی اور اپنے مضامین اور مقالات سنائے۔ کرشن چندر کی کہانیاں سننے کیلئے مختلف انجمنوں نے انہیں مدعو کیا اور ہر جگہ لوگوں نے اپنے ہر دلعزیز ادیب کو سنا۔ کانفرنس میں کرشن چندر نے "لوکی" یوسف ناظم نے "نام رکھنا" اور مجتبیٰ حسین معتمد عمومی کانفرنس نے "تکیہ کلام" سنا کر محفل کو زعفران زار بنادیا۔ مشاعرہ میں شرکت کرنے والوں میں مندرجہ بالا مہمانوں کے علاوہ دلاور فگار (صدر مشاعرہ) انجم روحانی، مائل لکھنوی، ساغر نلگنڈوی، نکلی نلگنڈوی اور سلیمان خطیب بھی تھے۔

اس کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر ملک کے مشہور مزاح نگار جناب بھارت چند کھنہ آئی اے ایس تھے اور معتمد عمومی جواں سال مزاح نگار مجتبیٰ حسین کانفرنس کی شاندار کامیابی انہیں حضرات اور ان کے رفقائے کار کی رہین منت ہے۔ حیدرآباد آنے والے مہمانوں نے ایوان اردو کی بھی زیارت کی اور اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کیا۔ "جناب کرشن چندر نے کہا کہ ایوان اردو رواروی میں دیکھنے کی چیز نہیں مجھے اس کیلئے دوبارہ حیدرآباد آنا ہوگا ڈاکٹر زور کی کاوشوں کا یہ نادر ذخیرہ بہت زیادہ وقت اور فرصت چاہتا ہے۔ پروفیسر فرقت کاکوروی نے کہا کہ "کاش میں جوانی میں آیا ہوتا تاکہ عمر کا بقیہ حصہ یہیں گذار دیتا۔ احمد جمال پاشاہ نے ایوان اردو کو "اردو کا تاج محل" اور تخلص بھوپالی نے اردو کی آبرو سے تعبیر کیا۔ دلاور فگار نے کہا کہ ایوان اردو کا جواب یا تو میں نہیں دیکھ سکا یا اس ملک میں کہیں نہیں اور سرور جمال نے کہا ادارہ کو دیکھ کر یقین ہوگیا کہ اردو زبان کو مٹایا نہیں جاسکتا۔ یوسف ناظم نے کہا ایسا محسوس ہوا کہ "ڈاکٹر زور اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ مجسم نظروں کے سامنے موجود ہیں۔"

سکندرالنساء ایم۔اے (عثمانیہ)
ڈی ایس ایس (کرور یڈو)

رتن ناتھ سرشار

سرشار لکھنو میں پیدا ہوئے۔ سنہ پیدائش غالباً ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء ہے۔ آپ کے والد کا نام پنڈت بیج ناتھ در تھا۔ آپ ایک باعزت کشمیری پنڈت تھے۔ چونکہ باپ کا سایہ چار سال کی عمر ہی میں اٹھ گیا تھا اس لئے سرشار کا بچپن ماں کے زیر سایہ گزرا۔ ابتدائی تعلیم حسب رواج مدرسہ سے شروع کی۔ اردو، فارسی اور عربی پڑھی۔ لکھنو کا ماحول ادبی تھا۔ چونکہ سرشار ذہین اور طباع تھے اس لئے آسانی سے ادبی ذوق کا اکتساب کرلیا۔

لکھنو میں جب شاہی کا دور ختم ہوا تو انگریزی زبان نے پاؤں جمانا شروع کیا۔ چونکہ سرشار بے حد لاابالی اور لاپرواہ تھے۔ اس لئے بغیر ڈگری لئے کالج چھوڑ دیا۔ سن بلوغ کو پہنچکر فکر معاش دامن گیر ہوئی۔ اور ضلع کھیری میں کسی اسکول میں مدرس ہوگئے اسی زمانے سے آپ کی ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہی زمانہ "اودھ پنچ کی تاسیس اور ترقی کا ہے۔ آپنے اپنے مضامین اس میں بھی بھیجے۔ آپ کے مضامین "مراۃ الہند" اور "ریاض الاخبار" میں بھی چھپتے اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے رہے۔ صوبہ یوپی کے سررشتۂ تعلیم کی طرف سے ایک رسالہ نکلتا تھا۔ آپ اس میں انگریزی سے ترجمہ کرکے مضامین بھیجا کرتے تھے جو زیادہ صحیح اور بامحاورہ ترجمہ کی وجہ سے بہت پسند کئے جاتے تھے۔ تھوڑے عرصہ مدرسی کرنے کے بعد آپ لکھنو چلے گئے اور ۱۸۷۸ء میں آپ "اودھ اخبار" کے ایڈیٹر ہوئے، چنانچہ اسی اخبار سے "فسانۂ آزاد" کا سلسلہ شروع ہوا۔ مسلسل ایک سال تک جاری رہا۔ پھر بہ شکل کتاب مارکٹ میں آیا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ ۱۸۹۳ء تک اسی اخبار سے وابستہ رہے اور "جام سرشار" اور "سیر کہسار" ناول لکھے جو اخبار مذکور کے کالموں کی زینت بنتے رہے۔

۱۸۹۵ء میں وہ حیدرآباد آئے اور اپنے ہی الفاظ میں اس دوران قیام کو بہت فراغت اور عزت کی زندگی بتایا ہے۔ یہاں اعلیٰ حضرت نے ان کا نام معزز درباریوں کی فہرست میں کر دیا۔ لیکن بعض عادتوں کی وجہ وہ جلد اس دنیا سے سدھار گئے۔ انھیں مئے نوشی کا چسکہ تھا۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے "ہسٹری آف اردو لٹریچر" میں لکھا ہے جب کبھی ان سے کوئی مضمون لکھوانا ہوتا تو مالک مطبع شراب کی ایک بوتل پیش کرتے اور وہ اس مضمون کو لکھ ڈالتے۔ کثرت مئے نوشی نے ان کی صحت پر برے اثرات مرتسم کئے۔ ۲۱ جنوری ۱۹۰۲ء کو حیدرآباد میں ہی انتقال ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر ۵۵ یا ۵۲ سال کی تھی۔

اخلاق اور عادات کے لحاظ سے سرشار بے حد لاپرواہ تھے۔ اسی لئے ملازمت کیلئے ان کی طبیعت قرار د

ضوابط کی متحمل نہیں ہو سکی۔ ۱۹۰۳ء میں انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں، ان میں خلوص کی کمی نہیں تھی۔ منشی سجاد حسین سے معاصرانہ چشمکیں چلتی رہتی تھیں، لیکن دل صاف تھے۔ مل بیٹھنے کے موقع جب بھی ملتے شکر رنجیاں دور ہو جاتیں طبیعت ہنسنے ہنسانے کی طرف زیادہ راغب تھی۔ جہاں بیٹھتے محفل زعفران زار ہو جاتی۔ سرشار جو کچھ لکھتے بہت تیزی کے ساتھ، پروف تک دوبارہ نہ پڑھتے۔ مسودہ پر نظر ثانی تو دور کی بات ہے۔ شراب نوشی نے احساسات کو تو جگا دیا۔ لیکن تخلیقی قوت رفتہ رفتہ سلب کر لی۔ ان کی وارفتہ مزاجی ان کی ہر تصنیف میں ملتی ہے۔ وہ بے حد خوددار تھے۔ سرشار کی اس خودداری اور قناعت پسندی کا ثبوت انکی کتابوں سے بھی ملتا ہے۔ ان کے مردانہ کردار بگڑے ہوئے نواب ہونے کے باوجود وضع دار ہیں۔ وہ شراب پیتے ہیں، چوک کے بالاخانوں پر گھومتے ہیں اور دیگر لہو و لعب میں غرق رہتے ہیں لیکن اپنی شرافت اور نجابت کے بہت بڑے امین بھی ہیں۔

سرشار کا مذہب انسانیت تھا ان کا موضوع گفتگو انسان ہے۔ وہ کسی مخصوص سیاسی نظریہ پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آ چکی تھی۔ اس کے سالانہ اجلاس پابندی کے ساتھ ہو رہے تھے۔ اس کا مقصد سماجی اصلاح اور رفتہ رفتہ وطن کی آزادی تھا حکومت کی طرف اس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ زیادہ معزز لوگ اسکے ممبر تھے۔ وہ تعلیم نسواں، ہندو مسلم اتحاد، پرانی رسوم، مغربی خیالات وغیرہ پر ہمیشہ لکھتے رہتے تھے۔ مے نوشی کے خود عادی تھے لیکن ہمیشہ اسکی مذمت کرتے رہے۔

جہاں تک سرشار کے مذہبی عقائد کا تعلق ہے وہ مورتی پوجا کے قائل تھے۔ انھوں نے "فسانہ آزاد" میں ہندو مذہب کے دیومالائی عنصر کے متعلق جگہ جگہ تاویلات پیش کی ہیں لیکن ان کا طرز فکر سائنٹفک تھا۔ وہ عام رسومات، تکلفات اور خرافات سے پرہیز کرنے اور کڑی تنقید کر کے مذہب کو تقاضائے حیات کے مطابق پیش کرتے تھے۔ ان میں مذہبی تعصب نام کو نہیں تھا وہ حقیقت اور سچائی کے پرستار تھے۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں مسیحیت، اسلام اور ہندو مت کی ہر اچھی بات کو سراہا ہے وہ تنگ نظر نہ تھے بلکہ ایک وسیع المشرب اور سمجھدار ادیب کی طرح اظہار خیال کیا ہے۔ سرشار اس حد تک سچے اور پرخلوص ہیں کہ ہمیں بڑی مشکل سے یہ یقین آتا ہے کہ "فسانہ آزاد" سیر کہسار اور جام سرشار کا مصنف ایک غیر مسلم ہے۔

سرشار کا عہد نثری تخلیقات کی وجہ سے بہت اہم ہے۔ ان کی حسب ذیل کتابیں مشہور ہیں:۔

فسانہ آزاد، سیر کہسار، جام سرشار، کامنی، خدائی فوجدار، کرم دھم، بچھڑی دلہن، ہشو، طوفان بے تمیزی، پی کہاں، شمس الضحیٰ غالباً ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس میں سائنس کی اصطلاحات کو اردو کا جامہ بڑی خوبی سے پہنایا ہے۔

سرشار کو خدا نے فراست، عالی ظرفی اور برجستگی کے ساتھ ساتھ خوش طبعی اور بذلہ سنجی کے بہترین

جوہر عطا کئے تھے۔ وہ زہرناک نہیں تھے اس لئے بات ہنسنے ہنسانے سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ ان کی تصانیف تمام کی تمام زندہ دلی سے بھرپور ہیں۔ ادیب کیلئے پُرخلوص ہونا بھی بہت ضروری ہے اور یہ چیز سرشار میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ لکھنؤ کی معاشرت نے بھی سرشار کی سیرت سازی پر بہت اثر ڈالا۔ سرشار لکھنؤ میں پلے اور بڑھے ان کی لاابالی طبیعت نے انہیں لکھنؤ کے چوک سے لیکر لکھنؤ کے دربار تک گھوم گھوم کر زندگی کی حقیقتوں سے واقف ہونے کا موقع دیا۔ یہاں عورتوں کی صحبت میں بیٹھ کر لکھنؤ کی ٹکسالی زبان سیکھی۔ رسوم اور رواج جانے۔ شہر کی سیر و تفریح سے محرم، عید، چہلم، نوچندی، پتنگ بازی اور میلے ٹھیلوں کی جزدیاتی معلومات حاصل کیں اس لئے ان کی کتابوں میں لکھنؤ کی خالص زبان ہے۔

۱۸۵۷ء کی قومی تحریک نے ہندوستانی سماج کے ہر ہر پہلو پر اثر ڈالا۔ اس زمانے کے بڑے بڑے مصلح اور لیڈر جیسے سرسید، راجہ رام موہن رائے وغیرہ نے جن حالات کو پیش نظر رکھکر ملک و قوم کے لئے ایک نئی اور روشن راہ کھولنے کی کوشش کی اسی طرح سرشار نے بھی ان لوگوں کی اصلاحی تحریکوں کو افسانوی رنگ میں بیان کر دیا۔

سرشار نے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کی گزشتہ عظمت کے نقشے بڑی تفصیل سے کھینچے ہیں۔ سرشار کا میدان مزاح کا تھا۔ قابل گرفت چیزوں کی تضحیک کرنا، لوگوں کو خوش کرنے کے لئے کارٹون بنانا اور ذکاوت و برجستگی کا سہارا لیکر سنجیدہ چیزوں کو ہنسنے ہنسانے کی اشیاء بنا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ چنانچہ سیرت نگاری کے وقت یہ امر ناگزیر تھا کہ سرشار کے قلم سے مضحکہ خیز زندہ دل اور مزاح پسند کرداروں کی تخلیق نہ ہو۔ "فسانہ آزاد" میں خوجی، سلارو، اور وکیل صاحب اور سیر کہسار میں منشی مہاراج بلی مزاحیہ سیرتیں اور نمونے ہیں۔ اس قسم کے کردار تقریباً ہر طبقے اور حلقے میں ملتے ہیں۔

مزاحیہ سیرت کی ایک اور خصوصیت خود پسندی اور تمسخر ہے۔ سیر کہسار میں مسترہ تمسخر سے لبریز ایک نمونہ ہے۔ اس کی گفتگو ظریفانہ ہے۔ اور اس کی حماقت کی باتیں خود ساختہ ہیں۔ ظرافت ایک تندرست دماغ کی اپج اور تازگی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جو پڑھنے والوں کے دماغوں کو دیرپا شگفتگی اور ٹھنڈک بخشتی ہے۔

سرشار تعلیم نسواں کے زبردست حامی ہیں لیکن ان کے نزدیک تعلیم سے مراد یونیورسٹی ایجوکیشن نہیں ہے ان کے عہد میں گنی چنی یونیورسٹیاں اور کالج تھے۔ خود مرد تعلیم کی دوڑ میں کافی پیچھے تھے۔ ایسی صورت میں تعلیم نسواں کا تصور یونیورسٹی ایجوکیشن ممکن ہی نہ تھا۔ سرشار عورتوں کے لئے اتنی ہی تعلیم چاہتے ہیں کہ وہ ضروری لکھ پڑھ سکیں اور عملی طور پر بہترین بیوی اور ماں بن سکیں۔ ان کے زمانے میں لڑکیوں کو پڑھانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ عورتیں مردوں سے ذہانت و ذکاوت میں کسی طرح کم نہیں ہیں۔ عورت اگر تربیت یافتہ ہوگی تو اپنے بچوں کو ابتداء ہی سے عمدہ تعلیم دے سکے گی۔ تندرستی سکھائے گی۔ اچھی اچھی باتیں بتائے گی لوازم گھر میں جس قدر عمدہ تعلیم

لڑکے اس سے پاسکتے ہیں۔ اس قدر وہ اور کسی طرز پر ممکن نہیں ان کے نزدیک ناخواندہ عورت جاہل ہوتی ہے
تعلیمی فروگذاشتوں کے علاوہ سرشار نے اپنے عہد کی بہت سی قابل تنقید باتوں پر نظر ڈالی ہے۔ غدر کے بعد انگریزی معاشرت حیات کو پرکھنے کے لیے نئی نئی کسوٹیاں بنا کر لائی تھی۔ ایک سیلاب تھا جس نے مٹی کی نئی تہہ بچھا دی تھی۔ سرشار نے اس زرخیزی سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن سرسید اور حالی کی طرح وہ ہر روایت کے دشمن نہیں تھے۔ وہ ماضی پر آنسو بہانے کے عادی نہ تھے۔ بلکہ پوری سنجیدگی کے ساتھ حال پر تنقید کرتے اور ساتھ ہی تخلیق سے لبریز مستقبل کی افزائش کے لئے حال کی تمام برائیاں بیان کرتے ہیں جس میں پوری پوری سچائی اور خلوص ہے۔ نہ وہ خود ابن الوقت تھے اور نہ دوسروں کو ابن الوقت بن جانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ البتہ ان کے ترقی یافتہ خیالات کو اپنانے کا وہ ضرور مشورہ دیتے ہیں۔ سرسید کی طرح سرشار نے بھی سلامتی اور راہ نجات مغربی تعلیم اور مغربی طرز معاشرت کی جاندار خصوصیات کو اپنانے میں ہی پائی تھی۔

سرشار کی مطبوعات کے بارے میں مختصراً ذکر کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ ان کی تصانیف دو قسم کی ہیں ایک طبعزاد اور دوسرا تراجم۔ ان کی کتابیں آج نایاب ہیں۔ سرشار کو ترجمہ کرنے میں خاص مہارت حاصل تھی ان کی سب سے پہلی باقاعدہ کتاب "شمس الضحیٰ" ۱۸۷۷ء میں لکھنو پریس سے شائع ہوئی یہ کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں ابر، ہوا، اور برف و بخارات کی ماہیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا دوسرا اڈیشن شائع نہیں ہوا جس کی وجہ آج یہ ناپید ہے۔

سرشار کی دوسری کتاب "فسانۂ آزاد" ہے جس پر ان کی شہرت کا دارومدار ہے۔ یہ ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی حضرت شوکر لکھنوی نے اس کتاب کے متعلق ایک قطعۂ تاریخ لکھا تھا۔ کیونکہ ان کے خیال میں سرشار نے فسانۂ آزاد لکھ کر اردو کے حق میں مسیحائی کی تھی۔ قطعہ تاریخ ملاحظہ ہو:—

تم نے نئی نکالی فسانے کی راہ واہ — کن کن محاوروں کا کیا ہے نباہ واہ
دیکھیں جو خوبیاں ترے خامہ کی غور سے — بولے شفیق واہ، عدو بولے آہ واہ
کرتا شکر ہے مصرع تاریخ پیش کش — کیا بول چال لکھی رتن ناتھ واہ واہ

اس ضخیم ناول نے ہندوستان کے ہر گوشہ میں جو مقبولیت حاصل کی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اس کے پڑھنے سے مصنف ممدوح کی معلومات نفاست خیالات اور اعلیٰ شوخی طبع کا پتہ چلتا ہے۔ اس رتن "فسانۂ آزاد" کی حیثیت ادب العالیہ (classical literature) کی ہے۔
"جام سرشار" مختصر اور مربوط ہے۔ اس ناول میں پلاٹ کا شعور ملتا ہے۔ قصہ بھی بذات خود دلچسپ اور

نتیجہ خیز ہے۔ کرداروں میں نواب امین الدین حیدر اور ظہورن کامیاب سیرتیں ہیں۔ سرشار نے یہ ناول شراب کی مذمت میں تحریر کیا تھا۔ سرشار کی تصانیف میں یہ واحد ناول ہے جس کو ٹکنیک کے اعتبار سے ناول کہا جا سکتا ہے اس میں نہ بے جا طوالت ہے اور نہ بے ضرورت باتوں کا بے تکلفانہ ذکر۔ اس کتاب کی زبان صاف اور منجھی ہوئی ہے لیکن اس میں وہ شوخی اور ظرافت نہیں جو "فسانۂ آزاد" اور "سیر کہسار" کی جان ہے۔

"سیر کہسار" ان کا ایک اور نمایاں کارنامہ ہے کیونکہ کردار نویسی "فسانۂ آزاد" کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ہے فسانۂ آزاد کی طرح یہ لکھنؤ کی سماجی زندگی کی آئینہ دار ہے۔ "سیر کہسار" کے قصہ میں دلچسپی اور طرز تکلم میں بذلہ سنجی ہے۔

"کامنی" ڈاکٹر سی سی گھوش کے زیر اہتمام جوبلی پرنٹنگ ورکس لکھنؤ میں طبع ہوئی اس میں راجپوتوں کی معاشرت پیش کی گئی ہے۔ چونکہ یہ لکھنؤ کے باشندے ہیں اس لئے ان کی معاشرت میں بھی لکھنوی رنگ شوخ اور تیز ہے۔ کامنی ایک باعصمت عورت کی کہانی ہے جو اپنے شوہر سے ہزاروں میل دور رہتی اور سرن نامی ایک اوباش کے ڈورے ڈالنے کے باوجود متزلزل نہیں ہوتی۔ پڑھنے والے کو کامنی کی یہ شوہر پرستی اور محبت بہت متاثر کرتی ہے اور یہی اس ناول کی کامیابی کی دلیل ہے۔

ان کے علاوہ "کرام دھم" "بچھڑی دلہن" "پی کہاں" "ہشو" "طوفان بے تمیزی" "چنچل نار" "گور غریباں" "الف لیلیٰ" "خدائی فوجدار" اور "رنگیلے ربیا" وغیرہ بھی کافی دلچسپ ہیں جن کے پڑھنے سے مصنف کی وسیع النظری اور ذاتی مشاہدہ اور اس زمانہ کے سماجی اور معاشی حالات کا بڑی حد تک اندازہ لگتا ہے۔

سرشار کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کے طرز نگارش کے سلسلہ میں تین خصوصیات واضح ہوتی ہیں۔ اول وہ اثر جو انھوں نے رجب علی بیگ سرور کی نثر سے قبول کیا۔ دوم سرسید اور تہذیب الاخلاق کی نثر جو ان کی صحافتی زندگی پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ سوم وہ نثر جس میں وہ کسی سے متاثر نہیں ہیں اور اس میں ان کے اپنے فطری میلان کا اثر نمایاں ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور نے تنقیدی اشارے میں تحریر کیا ہے کہ سرشار کا طرز نثر اردو کے ارتقاء کے لحاظ سے نذیر احمد سے زیادہ قدیم ہے۔ یہ فسانۂ عجائب کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ علاوہ بریں سرشار کا اسلوب بیان رجب علی بیگ سرور سے متاثر ہونے کے باوجود زیادہ عام فہم اور دلکش ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہ فارسی اور عربی کے مشکل الفاظ کی تلاش میں سرگرداں نہیں رہتے تھے۔

جس طرح لکھنؤ میں رجب علی بیگ سرور کی نثر کے اثرات گھر گھر پھیلے ہوئے تھے اسی طرح دہلی اور بحیثیت مجموعی تمام شمالی ہند میں سرسید کی نگارشات مقبول و معروف ہو رہی تھیں۔ موضوع کے اعتبار سے ان کا ہر مضمون علیحدہ طرز بیان کا حامل ہے۔ جہاں تک سرشار کا تعلق ہے وہ ایک صحافی ہی نہیں ناول نگار بھی تھے۔ ان کی کتابوں میں مصلحانہ رنگ میں طویل تقریریں ہیں جن پر سرسید کا اثر غالب ہے مگر فرق نمایاں ہے۔ اگر سرشار ناول نگار نہ ہوتے تو ان کی یہ طویل مصلحانہ

تقریریں ذہن پر اس قدر بار نہ ہوتیں۔

در اصل سرشار کی ایک منفرد شخصیت تھی ان کی تحریروں پر دوسرے مصنفین کا جو اثر ہے وہ دیرپا نہیں رہا سرشار فطرتاً مزاح پسند تھے۔ چونکہ مزاح خود ایک طریقۂ بیان ہوتا ہے اور ہماری نقائص سے بھری زندگی پر ہنس ہنس کر روشنی ڈالنا اس کا مقصد ہوتا ہے۔ اسلئے سرشار جیسے جدت طراز مصنف کی کتابوں میں اس کی بہتات اور فراوانی بے محل نہیں ہے سرشار کا تعلق "اودھ پنچ" سے ہے اس لئے ان کے مزاح میں بھی عمومیت پائی جاتی ہے۔ پست سے پست اور بلند سے بلند لیکن مجموعی طور پر ان کے مزاح کا اثر شگفتگی میں پنہاں ہے۔ غدر کے بعد زندگی تضاد اور بے آہنگی سے لبریز تھی۔ سماج اور افراد میں بے ربطی ظاہر تھی۔ سرشار کے مزاج میں لکھنو کا کارٹون بنا یا گیا چنانچہ خوجی، منشی ہمراج لال اور اللہ رکھی ایک تضاد سے لبریز سماج کے نمایندے ہیں۔ سرشار کی عمیق نظروں نے اس تضاد اور بے آہنگی کو پالیا تھا۔

سرشار کی عبارت کی خوبی ان کے مکالموں میں پوشیدہ ہے۔ ان کی کتابوں کا بیشتر حصہ مکالموں کی شکل میں ہے اور ان کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر طبقے اور ہر ماحول کی گفتگو پیش کرنے پر قادر ہیں۔ اس سے ان کی حیرت انگیز قوت مشاہدہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کے معاصرین میں ڈاکٹر نذیر احمد، نواب سید محمد آزاد، نظم طبا طبائی، عبدالحلیم شرر، منشی سجاد حسین اور ڈاکٹر ہادی رسوا قابل ذکر ہیں۔ یہ سب ناول نگار ہیں اور ان کا طرز نگارش ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ علی عباس حسینی نے سرشار کے طرز نگارش پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے "جہاں تک انشا پردازی اور اسلوب بیان کا تعلق ہے بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے ناول نویسوں میں سرشار کے برابر کوئی کامیاب نہیں ہوا ہے۔ اگر ان کے طرز نگارش میں اس قدر دلچسپی نہ ہوتی تو اس قدر ضخیم کتابیں اس طرح دلچسپی سے نہ پڑھی جاتیں اور نہ طبع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک جاتیں"۔ یہ سرشار کے طرز نگارش پر نہایت موزوں تبصرہ ہے۔

سرشار نے زندگی اور معاشرت کے ہر پہلو پر علیحدہ علیحدہ اظہار خیال کیا ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے سرشار کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد تبصرہ کیا ہے کہ سرشار کی سب سے بہتر اور ان کے کمالات کی نمائندہ تصنیف "فسانۂ آزاد" ہے۔

علی عباس حسینی نے تبصرہ کیا ہے کہ "سرشار کی تمام تصنیفات اس بات کی شاہد ہیں کہ ان میں تعصب مطلقاً نہ تھا اور انھیں مسلمانوں سے خاص طور پر محبت تھی۔ سرشار علم النفس کے بہت بڑے ماہر تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے نتائج اخذ کرنا خوب جانتے تھے۔ سرشار حقیقت نگار تھے۔ اس لئے وہ ایک زوال پذیر سوسائٹی کا نقشہ کھینچ رہے تھے وہ ہر طبقے، ہر قوم، ہر ملت و مذہب، ہر پیشے اور حرفے کے آدمیوں سے کما حقہٗ واقف دکھائی دیتے ہیں، غنڈے، شہدے، بدمعاش، نیک معاش، فقیر، جوگی، بنیا، نائی، حلوائی، سیٹھ، بزاز غرض ہر پیشے اور ہر طبیعت کے لوگ آپکو ان کی کتابوں میں مل جائیں گے۔ جن کی صحیح نقشہ کشی سرشار کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

چکبست نے مضامین چکبست میں یوں تحریر کیا ہے: "اہل کشمیر میں دو صاحب ایسے گزرے ہیں جن کی شہرت کا دامن قیامت کے دامن کے ساتھ وابستہ رہے گا۔ ایک پنڈت دیاشنکر نسیم جن کے فیض سے چمنستان نظم کو شادابی حاصل ہوئی دوسر حضرت سرشار جنھوں نے حدیقۂ نثر اردو میں نئی روشیں نکالیں اور جن کی جادو بیانی کا شہرہ آج ہندوستان بھر میں ہے۔ اودھ پنچ کی اردو میں ایک خاص سادگی بے تکلفی، تازگی اور دل بستگی کا رنگ تھا جو کہ قدما کے طرز عبارت کے برعکس تھا۔

سر عبدالقادر نے جو تبصرہ سرشار کی تصانیف پر کیا ہے وہ خود ان کے بہترین انشاپرداز ہونے کی دلیل ہے" میں نے خود لکھنو کی حقیقی زندگی کا سرشار کے مرقعوں سے مقابلہ کر کے دیکھا ہے اور بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ لکھنو کا کوئی باشندہ خواہ وہ کاہل و آرام پسند، وثیقہ دار ہو یا معمولی بدمعاش، خواہ وہ ڈینگ مارنے والا نشہ باز ہو یا خیالی پلاؤ پکانے والا افیونی ہر ایک کا نمایندہ اور مرقع پنڈت رتن ناتھ سرشار کی کتابوں میں مل جائیگا۔

آل احمد سرور نے بھی ان کے ادب پر بڑی اچھی تنقید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی ادیب کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ اس کے کارناموں میں دیوزادوں کی سی وسعتِ خیالی اور جوہریوں کی سی میناکاری دونوں کی جھلک نظر آئے۔ سرشار کے ناولوں میں دیوزادوں کی سی وسعت خیالی پائی جاتی ہے میناکاری ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے کہا ہے کہ سرشار کیرکٹر نگاری کے استاد ہیں وہ اپنے کیرکٹروں میں جو خاص ممیز باتیں ہوتی ہیں ان کو چن لیتے ہیں اور ایسے شگوفے پیدا کرتے ہیں کہ آدمی پڑھ کر ہنستے ہنستے لوٹ جاتا ہے۔ ایک خاص صفت ان کی تصانیف کی یہ ہے کہ انہوں نے غیر فطری جزو کو اپنے ناولوں سے خارج کر کے انسانی زندگی کے معمولی معمولی واقعات میں ایک غیر معمولی دلچسپی پیدا کر دی۔ سرشار کا بحیثیت ایک ماہر زبان اور ایک صاحب طرز کے بہت بڑا مرتبہ ہے۔ صاف سلیس بامحاورہ اور زوردار عبارت لکھنے میں ان کو اپنے ہمعصروں پر فوقیت حاصل ہے۔ اور بحیثیت ایک صاحب طرز کے گو وہ آزاد سے دوسرے نمبر پر ہوں مگر اور سب سے وہ ضرور بڑھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ایک ایسا طرز اختیار کیا تھا جو افسانہ نویسی کے واسطے نہایت موزوں تھا اور ان کی تصانیف میں لوگ نفس قصہ سے زیادہ عبارت سے دلچسپی لیتے ہیں۔ مکالمے لکھنے میں وہ کمال رکھتے تھے، ان کا مذاق کامل، مہذب اور آزادانہ تھا۔

مختصر یہ کہ رتن ناتھ سرشار کے اردو ادبیات پر بہت سے احسان ہیں اور ان کی ذاتی قابلیت اور منفرد شخصیت ہی ان کو تمام انشاپردازوں میں ایک نمایاں اور اعلیٰ مقام عطا کرتی ہے۔

سید خواجہ حسین
ایم۔اے

دکن کا پہلا منظوم لغت

ہندوستان میں لغت نویسی کا رواج عہد قدیم سے چلا آتا ہے۔ سنسکرت میں منظوم لغت کے ابتدائی خاکے نگھنٹو (Nighantu) کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد کوش کا رواج شروع ہوا۔ سنسکرت میں قدیم ترین کوش امرسمہا کا امرکوش ہے۔ پھر بانا، مراری اور شری ہرشا وغیرہ نے کوش لکھے۔ یہ سلسلہ کئی صدیوں تک جاری رہا۔ منظوم لغت لکھنے کا یہ رواج اردو زبان میں بھی چل پڑا۔ موجودہ معلومات کی بنا پر حکیم یوسفی کا "قصیدہ در لغات ہندی" اردو کا قدیم ترین منظوم لغت ہے۔ جو دسویں صدی ہجری کی تالیف ہے۔ اس کے بعد بھی اردو میں کئی منظوم لغت لکھے گئے۔ گیارھویں صدی ہجری میں منظوم لغت لکھنے کا یہ سلسلہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی دور میں ضیاء الدین خسرو نے خالق باری تالیف کی جسے غلطی سے اکثر امیر خسرو سے منسوب کیا جاتا رہا۔ خالق باری ۱۰۳۹ھ کی تالیف ہے۔ خسرو کا یہ کارنامہ ہندوستان گیر مقبولیت کا حامل رہا۔ کئی ایک مولفوں نے خسرو کی "خالق باری" میں ترمیم کر کے اپنی تالیفیں پیش کیں اور کئی مولفوں نے اپنی تالیف کا نام ہی "خالق باری" رکھا۔ غرض اس طرح منظوم لغت لکھنے کا یہ سلسلہ اردو دنیا میں کافی مقبول رہا۔

شمالی ہندوستان میں منظوم لغت لکھنے کی یہ تحریک دکن پر بھی اثر انداز ہوئی۔ گیارھویں صدی کے اواخر میں دکن میں یہ سلسلہ شروع ہوا اور بارھویں صدی میں دکن میں کئی منظوم لغت لکھے گئے۔ دکن کا قدیم ترین منظوم لغت "خوان یغما" ہے جو کرنول میں تالیف ہوا۔ "خوان یغما" شاہ طاہر کی تالیف ہے۔ شاہ طاہر عبداللطیف حموی کے فرزند تھے۔ حموی شمالی ہند کے باشندے تھے جو دکن آ گئے اور کرنول میں مقیم ہو گئے۔ شاہ طاہر ۱۰۳۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۱۵ھ میں کرنول ہی میں انتقال فرمایا۔ شاہ صاحب عالم بھی تھے اور صوفی بھی۔ خوان یغما کے علاوہ ان سے ایک اور تصنیف "کنز النفائس" بھی منسوب ہے۔ کنز النفائس کا کوئی مخطوطہ مجھے دیکھنے کا موقع نہ ملا مگر "خوان یغما" کا ایک قلمی نسخہ کتب خانۂ سالار جنگ حیدرآباد میں موجود ہے اور یہی دکنی کا قدیم ترین لغت سمجھا جا سکتا ہے۔

شاہ صاحب نے اپنے لغت کی تالیف اور "خوان یغما" سے موسوم کرنے کی وجہ یہ بیان کی ہے۔—

تا یادگار باشد واز من کہ بعد من ÷ گوئی طبع خوش نمک این خوان کن فلاں

یغما سو لوٹ غارت و تاراج نام شہر ÷ خواں مائدہ کندوری خوں دم وجمع خواں

"خوان یغما" کا جو قلمی نسخہ کتب خانۂ سالار جنگ میں دستیاب ہے۔ اس کے مطالعے سے تاریخ تالیف کے تعلق سے

کوئی صراحت نہیں ملتی۔ لغت کے آخر میں تاریخ کتاب کے عنوان سے جو چند شعر ملتے ہیں، یہ ہیں:۔

ہزار شکر کہ ایں نسخۂ طرب افزا ✣ زفضل ایزد بیچوں با ختتام رسید
دو صد جواہر معنی حضرت طاہر ✣ درون رشتۂ تقریر خود بنظم کشید
بدست اضعف دوراں شیخ برہان الدین ✣ بہ سلک گوہر تحریر منسلک گردید
سنہ ز ہجرت سردار سید الکونین ✣ دو ئی و دو نون و دو لام و دو جیم گشت پدید
اگرچہ سہو و خطاہا دریں کتاب آید ✣ بذیل عفو بپوشند دارم ایں امید ۱۱۶۶ھ

ظاہر ہے یہ سنہ کتابت ہے سنہ تالیف نہیں۔ سنہ تالیف لغت کے سلسلے میں "خوان لغما" میں کوئی صراحت نہیں ملتی نصیر الدین ہاشمی نے اس لغت کو ماقبل ۱۱۱۵ھ کی تالیف بتایا ہے۔ کیونکہ شاہ صاحب کا انتقال اسی سنہ میں ہوا۔ اس لغت کے مطالعہ سے سنہ تالیف کے متعلق یہ اشارہ ملتا ہے۔

ہر یک شہی خطابی زاجداد داشتہ ✣ چوں نامہ خسرواں خراساں ہماں رواں
امائی شہان بیجاپور عادل است ✣ در معدلت سر آمدہ اسکندری زماں
شاہان گولکنڈہ چرا قطب گشتہ اند ✣ شاہ ابوالحسن شدہ قطب فلک نشاں

مندرجۂ بالا اشعار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لغت ابوالحسن تانا شاہ کے دور میں لکھا گیا۔ تانا شاہ ۱۰۸۳ھ میں تخت نشین ہوے اور ۱۰۹۸ھ میں قطب شاہی خاندان کے اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔ اور ان اشعار میں شاہان بیجاپور کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ جن کا خاتمہ ۱۰۹۷ھ میں ہوا۔ اس طرح بغیر کسی شک و شبہ کے بیقین کے ساتھ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ "خوان لغما" ۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۸ھ کے درمیان کی تالیف ہے اس سلسلے میں یہ مصرع بھی قابل غور ہے کہ "شاہ ابوالحسن شدہ قطب فلک نشاں" اور خاص کر "شاہ ابوالحسن شدہ" سے یہ بھی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ یہ لغت تانا شاہ کی تخت نشینی کے سال ہی لکھا گیا یا کم سے کم اس دور میں لکھا گیا جبکہ تانا شاہ کی تخت نشینی کی یاد دلوں میں ابھی تازہ تھی۔ بہر کیف "خوان لغما" گیارھویں صدی ہجری کے نویں دہے میں لکھا گیا۔

سبب تالیف کے تعلق سے شاہ طاہر کے لغت میں یہ اشعار ملتے ہیں:۔

ایں جامۂ شکستہ دسر داد ریختہ ✣ ہندی و فارسی پئے اطفال و کودکاں

مزید وضاحت ملاحظہ ہو:۔

وایں خوان ما لغا نہادہ ام! ✣ نی بہر منعماں نے تاراج مفلساں
نی نی برائے خویش خلف خاں اعظم است ✣ درویش شہ نشاں وگدا لیش تونگراں
تا زد ادبہ بند بنوک زبان خویش! ✣ خرد و بزرگ پیر و جواں کوچک و کلاں

شاید دراں چیوہ یک از اہل حق بود ÷ بکند دعا در حق ایں طاہر سکاں
ترتیل حرف حرف ادا مخرج درست ÷ خواندں برغم یاد مصحف سوناظراں

....

اللہ خدا رؤف رحیم است مہرباں ÷ چوں بنگری دگر کرد کن فارسی زباں

مندرجہ اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لغت کرنول کے خان اعظم کے لڑکے کے لیۓ لکھا گیا۔ مگر شاہ طاہر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ انھوں نے "خوان یغما" اطفال وکودکاں' کے لیۓ تالیف کیا۔ اس مقصد کے پیش نظر کر خرد و بزرگ پیر و جواں بھی اس سے مستفیض ہو سکیں اور فیض اٹھانے والے "طاہر سکاں" کے لیۓ دعا کریں۔

ایک اور جگہ یہ وضاحت ملتی ہے :- ہندی و فارسی پئی اطفال وکودکاں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب دکنی اور ہندی کو دو مختلف زبانیں نہیں سمجھتے۔ غرض یہ منظوم لغت دکنی فارسی لغت ہے۔ جس میں دکنی الفاظ کے معنی فارسی زبان میں دیۓ گۓ ہیں۔ مگر اس لغت میں ایسے ترکی الفاظ بھی شامل ہیں جو اردو میں دخیل رہے ہیں۔

سنسکرت میں منظوم لغت یعنی کوش میں شاعروں کو یاد رکھنے کے لیۓ الفاظ مہیا کیۓ جاتے ہیں۔ اردو میں یہ سلسلہ اس لیۓ شروع ہوا کہ بچوں کو حفظ کروانے کے لیۓ چند الفاظ اور اُن کے معنی نظم کیۓ جائیں۔

"خوان یغما" کی تالیف میں بھی یہی مقصد کارفرما نظر آتا ہے۔

تازلہ اوبرند بوک زبانِ خویش ÷ خرد و بزرگ پیر و جواں کو چک وکلاں

غرض یہ لغت بچوں اور مبتدیوں کے لیۓ لکھا گیا اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ بچوں اور مبتدیوں کے لیۓ ضروری الفاظ اُن کے معنی اور وضاحت اور دوسری معلومات مہیا کی جائیں۔

بحیثیت منظوم لغت "خوان یغما" کا تنقیدی جائزہ لینے سے پہلے بہتر ہوگا کہ اردو منظوم لغت نویسی کی عام خصوصیات ذہن نشین کرلی جائیں۔ اردو میں منظوم لغت بچوں اور مبتدیوں کے لیۓ لکھے گۓ۔ اس قسم کے اکثر لغت دو زبانی لغت ہیں۔ جن میں الفاظ اور اُن کے معانی نظم کر دیۓ جاتے تاکہ بچے انھیں آسانی سے یاد رکھ سکیں۔ ان لغتوں کی زبان کھچڑی زبان ہوتی ہے۔ اور اس پر علاقائی اثرات کار فرما نظر آتے ہیں۔ الفاظ کے معنی لکھتے وقت بھی تحقیق و جستجو سے کام نہیں لیا جاتا۔ اس کے علاوہ لفظ کے مختلف معنی بھی نہیں ملتے۔ الفاظ کی ترتیب کے تعلق سے بھی یہ لغت نویس کچھ بیگانہ معلوم ہوتے ہیں۔ اکثر لغتوں میں الفاظ کی ترتیب بھی نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ لفظ کی گرام اور ماخذ وغیرہ کے متعلق معلومات کی تو ان لغت نویسوں سے توقع بھی نہیں رکھی جا سکتی۔

عام رواج کے مطابق یہ لغت بھی حمد و نعت سے شروع ہوتا ہے۔

اس کے بعد چند مذہبی ایقانات، مہاجرین، انصار، خلفائے راشدین، تابعین، تبع تابعین اور چند ایک فرشتوں کے متعلق تصریح ملتی ہے ــ

روح القدس بتازی از فارسی بگو ؛ این نام جبرئیل علیہ السلام داں
دیگر سروش اکبرش از فارسی بگو ؛ پس ہاتف وسروش دو نام فرشتگاں

اس قسم کے بنیادی مذہبی معلومات نظم کرنے کے بعد آگے چل کر الفاظ اور اُن کے معنی ملتے ہیں۔ کسی بھی لغت کی تالیف کے سلسلے میں سب سے پہلا مرحلہ الفاظ کا انتخاب ہوتا ہے کہ آیا زبان کے سارے لفظی سرمایہ کو لغت میں جگہ دی جائے یا مخصوص الفاظ ہی لغت میں شامل کیے جائیں۔ مبتدیوں کے لیے لکھے گئے اس قسم کے لغت میں الفاظ کا دائرۂ انتخاب بہت محدود ہوتا ہے اور "خوان یغما" بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ مگر شاہ طاہر کے لغت میں الفاظ کا انتخاب کئی دوسرے منظوم لغتوں سے بہتر ہے انھوں نے صرف ایسے الفاظ ہی اپنے لغت میں شامل کئے ہیں جن کے معنی سمجھنا مبتدیوں اور بچوں کے لیے ضروری ہو۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس بات کا بھی لحاظ رکھا ہے کہ پہلے آسان الفاظ لیے جائیں اور جوں جوں مبتدی آگے بڑھے مشکل الفاظ کا سامنا کرے۔ پہلے کچھ مذہبی معلومات ملتی ہیں جیسے :ــ

تازی نبی پیرو و صاحب رسول ؛ دخشور نام پاک محمد نوی قرآں
اصحابِ کرام و خلفائے راشدیں ؛ ایں چہار یار نبی شاد مرسلاں
یک لک دو دہ ہزار دو العیں انبیاء ؛ پیغام بر بد بوده برائے پیمبراں

کچھ پھلوں کے نام :ــ

تر میوہ کچھ نے کند وری یہ خوب ہے ؛ از باغ دل طلب کس افرش بگستراں
انگور رز سوداک بتازی عنب بود ؛ تفاح وسیب موز بود کیلا پس پراں

اس طرح مختلف موضوعات پر کچھ کچھ الفاظ ملتے ہیں جیسے جانوروں کے نام وغیرہ ان کے علاوہ بھی مختلف قسم کے الفاظ ملتے ہیں۔ جیسے :ــ

آسیا چکی خرہ میانی بداں پھیرا تول ؛ چھینکا معلاق از وانی او نک دید موانتظار
سرشکستہ سر پھٹیا ہو دل گسستہ جیو تنیا ؛ لغتہ لغتہ ذرہ ذرہ پارہ پارہ تار تار

"خوان یغما" میں اس قسم کے کافی الفاظ ملتے ہیں۔ مگر اس لغت میں الفاظ کے انتخاب کے تعلق سے ایک خرابی جو اردو منظوم لغت میں عام ہے یہ ہے کہ اس میں صرف اسماء کا ذکر ہے افعال اور صفات وغیرہ برائے نام ہیں جیسے "سرشکستہ سر پھٹیا اور دل گستہ جیو تنیا" وغیرہ ورنہ عام طور پر اکثر الفاظ اسم ہیں۔

لغت نویسی میں دوسرا مرحلہ الفاظ کی ترتیب کا ہے۔ اردو کے منظوم لغتوں میں اکثر من مانے چند الفاظ

منتخب کر لیتے اور اُن کے معنی نظم کر دیتے ہیں۔ مگر بعض نے الفاظ بلحاظ موضوع بھی نظم کئے ہیں الفاظ کی ترتیب کے سلسلے میں شاہ طاہر کا ایک مخصوص نظریہ ہے کیوں کہ انھوں نے "خوان یغما" بچوں اور مبتدیوں کے لئے تالیف کیا تھا اس لیے الفاظ کی ترتیب کے وقت بھی وہ یہی چیز ذہن میں رکھتے ہیں۔ پہلے پہل وہ آسان الفاظ لیتے ہیں اور پھر جوں جوں ہم آگے بڑھینگے ہمیں مشکل الفاظ ملیں گے۔ اسی طرح پہلے انھوں نے ایسے الفاظ نظم کئے ہیں جو ایک ہی قسم کے معنوں میں مستعمل ہوں۔ اس کے بعد ایسے الفاظ ملتے ہیں جو دو مختلف قسم کے معنی رکھتے ہوں۔ پھر تین قسم کے معنی۔ چار قسم کے معنی اور آخر میں ایسے الفاظ ملتے ہیں جنکے آٹھ آٹھ معنے ہوں۔ ان اصولوں پر عمل پیرا رہتے ہوئے انھوں نے جا بجا ایک ہی موضوع سے متعلق الفاظ نظم کئے ہیں جیسے۔ کہیں ہمیں صرف پھلوں کے نام ملتے ہیں تو کہیں کسی اور موضوع کے متعلق الفاظ یکجا ملتے ہیں اور کہیں۔ مختلف موضوعات سے تعلق رکھنے والے الفاظ بھی یکجا ملتے ہیں۔ غرض "خوان یغما" میں الفاظ کی ترتیب میں یہی اصول کارفرما ہیں۔ بچوں اور مبتدیوں کے پیش نظر اس قسم کی ترتیب بہت ہی مناسب معلوم ہوتی ہے مگر فنی نقطہ نظر سے یہ اصول زیادہ اہم نہیں ہیں۔ بلکہ "خوان یغما" میں الفاظ کی ترتیب میں ایک قسم کی بے اصولی نظر آتی ہے۔

موجودہ فن لغت نویسی کے اصولوں کی روشنی میں الفاظ کے ماخذ اور گرامر کے لحاظ سے نوع لکھنا بھی ضروری ہے۔ الفاظ کے ماخذ کا کھوج آج تک بھی عام نہیں ہے۔ چاہے لغت منظوم ہو چاہے منثور دونوں قسم کے لغت نویسوں نے الفاظ کے ماخذ لکھنے سے گریز کیا ہے۔ البتہ فرہنگ آصفیہ میں اس قسم کی شعوری کوشش ملتی ہے۔ اس لحاظ سے ہم منظوم لغت نویسوں سے اس قسم کی توقع نہیں رکھ سکتے اور نہ ہی اس فن میں اتنی گنجائش ہے۔ مگر شاہ طاہر نے اس سلسلے میں ایک اہم خدمت یہ انجام دی ہے کہ لفظ کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ لفظ کس زبان کا ہے۔

جاموں لفظ ہندی و عناب تازی است　　٭　　آب است و خاک باد نہ آتش بود دراں

اور جب کبھی لفظ کی زبان کے تعلق سے صراحت کی شعر میں گنجائش نہ ہو تو لفظ کے نیچے لکھ دیا ہے۔

ترک تمر نیز کَپ سو کلام حق !　　٭　　دای کراسۃ مصحف واتیر بود بجزاں

غرض انھوں نے لفظ کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ لفظ کس زبان کا ہے۔ مگر ہر لفظ کی زبان کے متعلق صراحت ضروری نہ سمجھی۔ شاید انھوں نے ایسے الفاظ کے متعلق یہ تصریح ضروری خیال نہ کی ہو جو بہت ہی عام ہوں اور ہر شخص جانتا ہو کہ لفظ فلاں فلاں زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ بہرکیف اس معاملہ میں شاہ طاہر نے جو روش اختیار کی ہے قابل ستائش ہے۔

"خوان یغما" میں کہیں کہیں الفاظ کی گرامر کے لحاظ سے نوع بھی لکھ دی گئی ہے۔

تاریخ گو مورخ و جمعش مورخاں

اس میں تاریخ گو کا مترادف مورخ اور مورخ کی جمع مورخاں بتلائی ہے۔

محراب طاق اور محاریب جمع ہوئے

یہاں بھی محراب کی جمع محاریب ملتی ہے۔ ایک اور مثال ملاحظہ ہو ــــ

تازی جمل نرینہ شتر ناقہ او شتی ÷ محمل کجاوہ بار و جمازہ سو سانڈنیاں

اس طرح خوان یغما میں الفاظ کی گرام کے تعلق سے نوع وغیرہ کے بارے میں ایسے مفید اشارے ملتے ہیں جو مبتدیوں کے لیئے ضروری ہوں۔ مگر شاہ طاہر کے لغت میں ہر لفظ کی صرفی و نحوی تبدیلیوں اور گرام کے لحاظ سے نوع وغیرہ کے متعلق وضاحت نہیں ملتی اور نہ ہی ایک منظوم لغت اس تشریح کا متحمل ہو سکتا ہے۔ کہیں کہیں صرف اس قسم کے اشارے ملتے ہیں جو تشفی بخش تو نہیں مگر یہی کیا کم ہے کہ انھوں نے اس طرف توجہ کی اور لغت نویسی کے فن میں ایک اہم قدم اٹھایا۔ دوسرے منظوم لغتوں میں بھی اس تعلق سے اتنے واضح اشارے کم ملتے ہیں اور یہاں تک کہ وہ اردو لغت جو نثر میں لکھے گئے ان میں بھی صرف لفظ کی جنس لکھ دینا اہم سمجھا جاتا رہا۔

لغت نویس کے لئے سب سے اہم مرحلہ الفاظ کے معنی لکھنا ہوتا ہے۔ یہ فن مشکل بھی ہے اور اہم بھی۔ کیونکہ لغت کا اہم ترین مقصد لفظ کے معنی لکھنا ہوتا ہے۔ شاہ صاحب اس معاملے میں دوسرے منظوم لغت نویسوں سے بہت آگے ہیں ایک منظوم لغت میں لفظ کے مختلف معنی اور وضاحت کی جتنی توقع ہم رکھ سکتے ہیں۔ شاہ صاحب نے اس سے کہیں زیادہ بہتر سلیقے سے یہ کام انجام دیا ہے۔ لفظ کے معنی لکھتے وقت وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ لفظ کے معنی مبتدی کے ذہن نشین ہو جائیں اس لیئے وہ کبھی لفظ کے ایک سے زیادہ مترادفات لکھتے ہیں۔

لخت لخت ذرہ ذرہ پارہ پارہ تار تار

بعض اوقات لفظ کی تعریف نظم کرتے ہیں :ــــ

انصار سو مدینے کے لوگاں جنوں دیئے ÷ محنت ایس یہ لیکن مہاجراں کے تئیں گھراں

تابع سو مصطفےٰ کے زمانے کے یار سب ÷ تابع کے جو زمانے کے سو تبع تابعاں

کبھی لفظ کے معنی لکھنے کے علاوہ مزید وضاحت بھی کرتے ہیں۔

سیویاں کا ناؤں تازی قطایف نوشتہ اند ÷ با شیر و غنش خورد شکر نگن دراں

ایک اور مثال ملاحظہ ہو :ــــ

نام کھجور ہست غذائے مسافراں

اس طرح وہ اپنے لغت میں اگر لفظ کا مترادف لکھ دینا کافی نہیں سمجھتے تو طرح طرح سے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ تاکہ لفظ کے معنی بچوں کے ذہن نشین ہو جائیں۔

اکثر منظوم لغتوں میں صرف الفاظ اور ان کے مترادفات نظم کئے جاتے ہیں۔ زبان میں بعض الفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے ایک سے زیادہ معنی ہو سکتے ہیں مگر ان منظوم لغتوں میں لفظ کے مختلف معنی نہیں ملتے۔ شاہ طاہر نے اس بات کا

خاص خیال رکھا ہے کہ لفظ کے مختلف معنی نظم کئے جائیں۔ پہلے انھوں نے ایسے الفاظ تعلیم کئے ہیں جو ایک ہی قسم کے معنی رکھتے ہیں۔

سخن فلک نشتر کلک مژگاں پلک لمہ جھلک ؛ بس خلق ہندی تنک کندر ملک بے عیب ناب
قرطاس نام کاغذ و کاغذ سو عزت است ؛ نار صحیفہ خامہ قلم شناک وشن گماں

دو مختلف معنی رکھنے والے الفاظ کی مثال ملاحظہ ہو:—

داعی دعا کنندہ و خوانندہ سوئے حق۔

تین مختلف معنوں میں مستعمل الفاظ کو نظم کرنے کی مثال درج ذیل ہے۔

لا بہ سہ معنی سخن اول ذکر یاری بود ؛ پس نطق سو زبان چرب وشیریں و امثال
کاخ سہ معنی بود باران تحسین دوم قصر ؛ سیومیں قصبہ زبوں آمد اورک وسکہ جمال

اس کے بعد ایسے الفاظ ملتے ہیں جو چار مختلف معنوں میں مستعمل ہوں۔

سکہ دری چار معنی یک ازاں معروف دوم ؛ سیر نست وسیومیں ہرز روش ٹھکرا سفال
خستہ دارد چار معنی اول تش کھٹلے دوم ؛ زخمی و پرخاش داں سرکریا مرغ زال

یہاں تک کہ اس لغت میں ایک ہی لفظ کے چھ بلکہ آٹھ آٹھ معنی تک ملتے ہیں۔

شش بود معنی شکر را مکر وحیلہ بکد گر ؛ خوردن وخاییدن و سرہنگ نام کوتوال
سیمیں باشد ہزیجہ و چادو میں ؟ ؛ داں اصول وپس موجد کشش بتازی انفعال
پنجمیں اعراض داں وتند کشش ششمیں ؛ چین دانجوخ آمد سر طاق بود برج ہلال

. . . .

سان دارد ہشت معنی رسم وعادہ اولیں ؛ شبہ و مانند دوم دھاۃ سیم ہمت ہمال
زاغ پاکھر چار دد پا زہر شش پنجمیں ! ؛ نقش مناں وصفتمیں ساماں و میا ہم اتال
ہشتم اسم قصبہ ہند دری از شہر بلخ ! ؛ بہ شدن از زخم و بیماری بتازی رندسال

اردو کے دوسرے کسی بھی منظوم لغت میں لفظ کے اس طرح مختلف معانی کو نظم کرنے کی شعوری کوشش نہیں ملتی۔ اس لحاظ سے "خوان یغما" اردو منظوم لغت نویسی میں بہت بلند مقام رکھتا ہے آج اردو فن لغت نویسی اتنا ترقی یافتہ حالت میں ہے کہ کوئی بھی منظوم لغت موجودہ تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ یہ منظوم لغت فنی یا افادی نقطہ نظر سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ مگر اردو لغت نویسی کی تاریخ کی تدوین کے سلسلے میں یہ تحریک بھلائی نہیں جاسکتی اور "خوان یغما" کو ایک اچھا مقام دیا جا سکتا ہے اور خاص کر یہ لغت الفاظ کے انتخاب کی حد تک تشفی بخش اور لفظ کے مختلف معنی مہیا کرنے میں منفرد حیثیت کا حامل ہے۔

سید احتشام احمد ندوی

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

شہر دلّی آئینۂ شاعری میں

اُردو کی جائے پیدائش دِلّی شہر ہے اس تعلق سے اردو شعراء نے اس سے ایک خاص قسم کی انسیت محسوس کی ہے اور اس کی جانب عظمت و عقیدت کی نگاہ سے دیکھا ہے ان کی نگاہوں میں وہ قبلہ کی طرح محترم رہا ہے جس کا اظہار ان اشعار سے ہوتا ہے جو اس شہر کے بارے میں اردو شاعری کے ذخیرہ میں ہم کو ملتے ہیں۔

دلّی کے بارے میں جن لوگوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے ان کی دو قسمیں آسانی سے کی جاسکتی ہیں ۔

۱ - وہ شعراء جو دلّی میں پیدا ہوئے ہیں تعلیم و تربیت پائی اور شعور کی آنکھیں کھولیں مگر معاشی اور سماجی مجبوریوں سے ان کو اس "عالم میں انتخاب" شہر کو چھوڑنا پڑا۔ ایسے شعراء جہاں بھی گئے دلّی کی یاد سے بے قرار رہے اور وقتاً فوقتاً اپنی شاعری میں دلی سے اپنے والہانہ جذبات کا اظہار کرتے رہے ۔ ان مہاجر شعراء میں مندرجہ ذیل اصحاب قابل ذکر ہیں: -

(۱) سراج الدین علی خاں آرزو (۲) میر حسن دہلوی (۳) میر مستحسن خلیق (۴) میر قمرالدین منت
(۵) مرزا جعفر علی حسرت (۶) سید محمد سوز (۷) میر حیدر علی حیراں (۸) میر محمد تقی میر
(۹) مرزا رفیع سودا (۱۰) قلندر بخش جرات (۱۱) میر انشاء اللہ خاں انشاء (۱۲) غلام ہمدانی مصحفی
(۱۳) سعادت یار خاں رنگین (۱۴) نسیم دہلوی (۱۵) شاہ نصیرالدین دہلوی (۱۶) داغ دہلوی۔

ان شعراء کے علاوہ اور بھی بہت سے مہاجر شعراء ہیں جن کا ذکر سکسینہ نے اپنی کتاب تاریخ ادب اردو میں کیا ہے ۔

۲ - دوسرا طبقہ ان شعراء کا ہے جن کا وطن دلّی نہ تھا مگر انھیں دلّی سے کسی حیثیت سے تعلق تھا یا یہاں کے اہل علم سے تعلق و عقیدت تھی ۔ اس طرح کے شعراء کا نام بتانا تو دشوار ہے مگر پھر بھی کئی شعراء دلّی کے شیدائی ہیں جن میں حالی کا نام سر فہرست ہے۔ اقبال نے بھی دلی کی عظمت کا کئی جگہ ذکر کیا ہے۔

یہ بات تو ظاہر ہے کہ اس شہر پر مستقل نظمیں تو کم ہی ہیں مگر متفرق اشعار میں اس کا ذکر مختلف حیثیتوں سے اردو شعرا کے یہاں ہر ایک کو ملتا ہے ۔ اس سلسلہ میں ۔ حالی ۔ میر اور مصحفی خاص طور سے قابل ذکر ہیں ۔

میر کے اشعار دلّی کی تڑپ وانسیت میں ملاحظہ ہوں :-

لکھنؤ دلّی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اداس   میرؔ کو سرگشتگی نے بے دل و حیراں کیا
خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا   وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں
مرثیئے دل کے کہہ کے دیئے لوگوں کو   شہر دلّی میں ہے سب پاس نشانی اس کی
خاک دلّی سے جدا ہم کو کیا یکبارگی   آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار
جس راہ سے وہ دل زدہ دلّی میں نکلتا   ساتھ اس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
متاع ہنر پھیر کر لے چلو   بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو
دلّی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے   جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

جب میرؔ صاحب لکھنؤ پہنچے تو مشاعرہ میں بعض لوگوں نے پوچھا کہ حضور کا وطن؟ میر صاحب نے فی البدیہہ فرمایا:-

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو   ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب   رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا   ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے
ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں   دلّی سے بھی دیار ہوتے ہیں
ہر روز اک نیا تماشہ دیکھا   ہر کوچہ میں سو جوان رعنا دیکھا
دلّی تھی طلسمات کہ ہر جا گہ میرؔ   ان آنکھوں سے آہ ہم نے کیا کیا دیکھا

میرؔ کے بعد جس شاعر نے دلّی کا ذکر مختلف انداز سے کیا ہے وہ مصحفیؔ ہیں۔ مذکورہ دونوں شعراء کے اشعار میں کہیں والہانہ تعلق کا اظہار ہے اور کہیں اس پر فخر کیا گیا ہے۔ کہیں اس کی ٹکسالی زبان کا ذکر ہے۔ مصحفیؔ نے ایک طویل نظم دلّی پر لکھی ہے جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

دلّی ہوئی ہے ویراں سونے کھنڈر پڑے ہیں   ویران ہیں محلے سنسان نگر پڑے ہیں
بعضوں کو گماں یہ ہے کہ ہم اہل زباں ہیں   دلّی نہیں دیکھی ہے زباں داں یہ کہاں ہیں

اپنے بارے میں کہتے ہیں:-

دلّی کے سب شاعر دیکھے   اور ہم طرح میرؔ کا میں رہا
لکھنؤ والوں کو کیا دوس کہ دلّی کے بھی   عمر عیار تھے ایسے ہی مرے شاگرداں
سن کے آبادی کا شہرا طرف مشرق کے   چھوڑ کر دلّی کو یکبار جو آیا میں یہاں
میرے اشعار زبانوں پہ لگے جب پھرنے   چونک اٹھے سن کے انھیں تھے جو یہاں کو دگراں

لکھنؤ کے بارے میں کہتے ہیں:-

مصحفیؔ کب لکھنؤ میں میری قدر　　　اس خرابہ میں آ بھرا یا یہی کا گل
یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے　　　ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے

دلی کے بارے میں خود اپنی ہجرت کے ذکر کے ساتھ ان الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں۔

یہ دلی کا نقشہ سنوارا زمیں پر　　　کہ لا عرش کو یاں اتارا زمیں پر
قسم ہے سلیماں کی پیش زماں میں　　　یہیں پریوں کا تھا گذارا زمیں پر
اے مصحفیؔ شاعر نہیں پورب میں ہوا میں　　　دلی ہی میں چوری مرا دیوان گیا تھا
کل پوربیوں نے یوں غارت کیا اس کشور دل کو　　　کہ جیسے فوج شاہ آ کر جہاں آباد کو لوٹے

میرؔ:- میر حسن کی مثنوی گلزار ارم میں پورب میں آنے کا ذکر کرتے ہیں۔ پورب سے عام شعراء لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ مراد لیتے ہیں۔

ہوا آوارۂ ہندوستان جب سے　　　قضا پورب میں لائی مجھ کو تب سے

غالبؔ:- ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسدؔ　　　ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

ذوقؔ:- آج کل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن　　　کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

آزادؔ آب حیات میں رقمطراز ہیں کہ دیوان چندو لال نے ذوقؔ کا کلام سن کر خلعت اور ۵۰۰ روپے بھیجے اور دکن آنے کی دعوت دی مگر یہ نہ گئے آزاد نے نہ جانے کا سبب دریافت کیا تو ایک دلچسپ کہانی ان کو اس سلسلہ میں سنائی[1]۔

مومنؔ:- حکیم مومن خاں مومنؔ. پانچ بار دلی سے باہر نکلے مگر دل دلی ہی میں اٹکا رہا۔ رام پور اور سہسوان کے سفر پر یہ اشعار کہے:-

دلی سے رام پور میں لایا جنوں کا شوق　　　ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم
چھوڑ دلی کو سہسوان آیا　　　ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں[2]

فلقؔ:- دلی بگڑ کے بن گئیں اکثر ولایتیں!　　　جس گھر میں دیکھو لوٹ اسی اجڑے گھر کی ہے

رنگینؔ:- سعادت یار خاں رنگینؔ نے گلدستۂ رنگینؔ میں ایک خط میں دلی چھوڑنے پر اظہار افسوس کیا ہے۔ اس میں دہلی کی صحبتوں کو یاد کیا اور ان کے فراق میں جو صدمہ گذرتا ہے وہ بیان کیا ہے۔ ایک دوسرے خط میں اسی کیفیت کو اس طرح لکھا ہے[3]:-

شہر بیگانہ میں میں مسافر ہوں　　　جھوٹ کہتا جو ہوں تو کافر ہوں

---

[1] آب حیات مصنفہ مولانا محمد حسین آزاد مکتبہ اشاعت اردو دہلی صفحہ ۶۰۹، ۶۱۰ [2] آب حیات صفحہ ۵۲۹
[3] لکھنؤ کا دبستان شاعری از ابو اللیث صدیقی اردو مرکز لاہور صفحہ ۲۳۰، ۲۳۹۔

ہے غرض اضطرادیاں جو مجھے		کس طرح سے لکھوں وہ جان تجھے
صحبتیں جب وہ یاد آتی ہیں		اور رونا مجھے ستاتی ہیں

مجموعہ شش جہت رنگین میں ایک خط اپنے بھائی خدایار خاں کے نام لکھا ہے۔ وہ اس خط میں دلّی اور دلّی والوں کی صحبتوں کو یاد کرتے ہیں اور لکھنؤ میں اپنی تنہائی پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں ؎۱

شفیق اپنا نہ کوئی یار ہے یاں		نہ ہمدم نہ کوئی غم خوار ہے یاں
گزرتی ہے عجب صورت سے اوقات		تڑپتے ہی کٹے ہے مجھ کو دن رات
نہ کھانا کچھ خوش آتا ہے نہ پینا		نہ موت آتی ہے نہ بھاتا ہے جینا

اقبالؔ:۔ اقبال داغ کے انتقال پر ان کے مرثیہ میں فرماتے ہیں:۔

بلبل دلی نے باندھا اس چمن میں آشیاں		ہم نوا ہیں سب عنادل باغ ہستی کے جہاں

مرزا غالب کے اوپر جو نظم کہی ہے اس میں کہتے ہیں:۔

شاہد مضمون تصدق ہے ترے انداز پر		خندہ زن ہے غنچۂ دلی گل شیراز پر

دلی اردو شاعری میں ایک مدرسۂ فکر کی حیثیت سے بڑی عظمت کا حامل ہے۔ یہاں کے ذہن و فکر کے جو سرچشمے پھوٹے تھے انھوں نے پورے ہندوستان کو دولت فکر و نظر سے مالا مال کر دیا۔ اگر اردو شاعری سے شعرائے دلّی کو الگ کر لیجیے تو اردو کی کلاسیکی شاعری میں کچھ باقی نہیں بچتا۔ اسی موضوع پر یوں تو تذکرہ و تنقید کی ہر کتاب میں دلّی اسکول شاعری کا ذکر ملتا ہے۔ مگر ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے دلی کا دبستان شاعری" لکھکر اس شہر کی عظمت کا گویا علمی اعتراف کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دلّی اسکول شاعری کا مقصد محض شعر سے نہیں ہے بلکہ وہ روایتی اور تہذیبی اقدار کا نشو و نما ہے جو دلی کے کے ذریعہ اردو شاعری کو نصیب ہوا وہ تمدنی جلوے ہیں جن سے دلی نے ہماری شاعری کو عظمت کے بلند زینہ تک پہونچایا کیونکہ کسی قوم کی شاعری اس قوم کے اقدار حیات کی ترجمان ہوتی ہے۔

ان تمام بحثوں سے ایک بنیادی نکتہ کی جانب اشارہ ملتا ہے یعنی یہ کہ ہماری شاعری اور ہماری تہذیبی زندگی میں دلی کو ایک بنیادی اہمیت حاصل ہے اور یہ شہر صدیوں سے ہماری ذہنی زندگی کے سوتوں کو سیراب کرتا رہا ہے جسکا سب سے بیّن ثبوت اردو زبان اور اس کی شاعری ہے۔

دلی کی تباہی کا ذکر اردو شاعری میں بہت ملتا ہے اور بہت سے اردو شعرا نے اس موضوع پر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے اس سے دو حقیقتیں بہت نمایاں طور پر واضح ہو جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو شاعری

۱؎ لکھنؤ کا دبستان شاعری از ابواللیث صدیقی اردو مرکز لاہور صفحہ ۲۳۶

محض گل و بلبل کی داستان اور عشق کے فسانے پر منحصر ہے ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارے شعرا نے زمانے کے حالات سے پوری طرح تاثر قبول کیا ہے۔ میر و سودا اور ان کے بعد کی شاعری میں کتنی مثالیں اس طرح کی ملتی ہیں ایک دو اشعار کو چھوڑ دیجیے مسلسل غزلیں دلی کے موضوع پر ہماری شاعری میں موجود ہیں جو اس کی تباہی اور سیاسی احوال کا مرقع ہیں۔

دوسرا نتیجہ جو ہم ان نظموں سے اخذ کرسکتے ہیں وہ ہے وطن کی محبت اور اس سے شعرائے اردو کا گہرا تعلق یہ ایک علمی اور معقول جواب اس اعتراض کا ہے کہ اردو شعراء سرزمین ہند سے بے تعلق رہتے ہیں ....

ہمیں اس امر کا یقین ہے کہ ہندوستان کی کسی زبان میں سرزمین دلی سے قلبی تعلق، جذباتی لگاؤ اور اس کے لئے تڑپ و سسک کی وہ کیفیت نہیں ملتی جو ہم کو شعرائے اردو کے یہاں ملتی ہے۔ ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا تعلق ہندوستان کی سرزمین سے کسی طرح کم نہیں ہے البتہ اگر ہماری شاعری میں غیر ملکی عناصر ملک کی عظمت و محبت کو اپنے جلو میں سمیٹے ہوئے موجود ہیں تو یہ زبان کی آفاقیت وسعت اور عظمت کی دلیل ہے۔

دلی پر جو مصیبت آئی اور احمد شاہ ابدالی نے جس طرح حملہ کرکے دلی کی بساط الٹی اس کا ذکر میر ذکر میر میں تو کرتے ہی ہیں مگر اپنی ذاتی پریشانی کا حال ایک مخمس میں بیان کرتے ہیں کہ دلی میں وہ کیسی زندگی گذار رہے تھے، طوالت سے بچنے کیلئے ایک بند لکھتا ہوں :—

کا ہے کو تلخ کام اٹھایا مرے تئیں — دلی میں بے دلانہ پھرایا مرے تئیں
ہم چشموں کی نظر سے گرایا مرے تئیں — حاصل کہ پیس سرمہ بنایا مرے تئیں

میں مشت خاک مجھ سے اس قدر غبار[1]

لیکن سودا اپنے ذاتی احوال سے آگے بڑھ کر دلی کی تباہی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :—

باغ دلی میں جو اک روز ہوا میرا گذر — نہ وہ گل ہی نظر آیا نہ وہ گلشن نہ بہار
نخل بے بار پڑے سوکھی پڑی ہیں روشیں — خاک اڑاتی ہے ہر اک طرف پڑے ہیں خس و خار
مسکراتا تھا جہاں غنچۂ و گل ہنستا تھا — اشک شبنم کے بھی قطرہ کا نہیں واں آثار
جس جگہ جلوہ نما رہتے تھے سرو و شمشاد — مشت پر قمری کے اس جا نظر آئے اک بار
دیکھتا کیا ہوں مگر سوکھی سی اک شاخ اوپر — عندلیب ایک ہے بے بال و پر و دل افگار
بہ دم سرد بصد حسرت و صد سوز جگر — دیکھکر سوئے چمن کہتی ہے با نالہ و زار
حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد — روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد[2]

---

[1] میر تقی میر مصنفہ خواجہ احمد فاروقی صفحہ ۱۷۲ [2] شعر الہند مصنفہ مولانا عبدالسلام ندوی صفحہ ۲۲۶

مصحفی کا نوحہ دہلی بہت طویل ہے یہاں چند منتخب اشعار پیش ہیں:۔۔۔

کہتی ہے اسے خلق جہاں سب شہ عالم
شاہی جو کچھ اس کی ہے سو عالم پہ عیاں ہے

اطراف میں دلی کے لٹھ ماروں کا ہے شور
جو آوے ہے باہر سے وہ بشکستہ دہاں ہے

اور پڑتے ہیں راتوں کو جو نت شہر میں ڈاکے
باشندہ جو واں کا ہے بہ فریاد و فغاں ہے

اس شہر کا جس دن سے ہوا سندھیا حاکم
چوروں کی وہاں سیندھ سے ہر ایک نگراں ہے

بیداد سے نائب کی یہ احوال ہے واں کا
ہر روز نیا قافلہ پورب کو رواں ہے

روتا ہوا گذرے جو کوئی ابر کا ٹکڑا!
احوال غریباں ہی پہ وہ اشک فشاں ہے

اس شہر کے باشندوں سے جاکر کوئی پوچھے
جز خون جگر کچھ بھی غذائے دل و جاں ہے

نواب نہ خان کوئی رہا شہر میں باقی
نواب جو گوجر ہے تو میواتی بھی خاں ہے

گو گاؤکشی شہر میں موقوف ہوئی ہے
اب ان کی جگہ خون رعیت کا رواں ہے

فاقوں کی زبس مار ہے بیچاروں کے اوپر
جو ماہ کہ آتا ہے وہ ماہ رمضاں ہے

ایک بغلیں بجا خوان کو لیں دیکھ کہے ہے
کچھ نام خدا آج تو یہ خوان گراں ہے

حل جائے زباں میری کروں ہجو گراں کی
یہ تنگ معاشی کا سلاطیں کے بیاں ہے

اے مصحفی اس کا کروں مذکور کہاں تک
ہے صاف تو یہ گلشن دہلی میں خزاں ہے[1]

مہدی مجروح نے دلی کی تباہی کو ایک نظم میں بیان کیا ہے صرف چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں:۔۔۔

ذکر بربادیٔ دلی کا سنا کر ہمدم
نیشتر زخم کہن پر نہ لگانا ہرگز

آب رفتہ نہیں پھر بحر میں پھر کر آتا
دلی آباد ہو یہ دھیان نہ لانا ہرگز

وہ تو باقی ہی نہیں جس سے کہ دلی تھی مراد
دھوکہ اس نام پہ دہلی کے نہ کھانا ہرگز

اب تو یہ شہر ہے اک قالب بے جاں کی طرح
کچھ یہاں رہنے کی خوشیاں نہ منانا ہرگز

میں ہوں اک مجمع احباب کا بچھڑا گلچیں
مجھکو گلدستۂ رنگیں نہ دکھانا ہرگز

جمع ہے مجمع احباب فضا میں تیری
اے تصور یہ مرقع نہ مٹانا ہرگز

---

[1] پورا قصیدہ ملاحظہ ہو کلیات مصحفی صفحہ ۲۳۶ بحوالہ لکھنؤ کا دبستان شاعری صفحہ ۲۳۲

اسی زمین میں مولانا حالی کا مرثیہ دلی بھی ہے جس کے چند اشعار پیش ہیں۔

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ — نہ سنا جائیگا ہم سے یہ فسانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی — کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
لیکے داغ آئیگا سینہ پہ بہت اے سیاح — دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک — دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی — ہمکو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
شاعری مرچکی اب زندہ نہ ہوگی یارو — یاد کرکرکے اُسے جی نہ کڑھانا ہرگز
غالبؔ و شیفتہؔ و نیرؔ و آزردہؔ و ذوقؔ — اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز
مومنؔ و علویؔ و صہباؔ و ممنوں کے بعد — شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
داغؔ و مجروحؔ کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں — نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز[۱]

یہ اشعار جو دلی کی عظمت و صحبت کا نقشہ پیش کرتے ہیں در اصل اردو شاعری کا ایک صحت مند عنصر ہیں دلی کی بربادی کا حال شعرائے اردو کی سماجی زندگی سے گہرے تعلق کو ظاہر آتا ہے۔ میرا مقصد پوری شاعری کا اس نقطۂ نظر سے استقصا نہ تھا بلکہ اردو شاعری پر غور و فکر کرنے والے اور اس سے دلچسپی رکھنے والے طبقہ کی توجہ اس جانب مبذول کرانی مقصود تھی۔

(بہ سلسلہ صفحہ ۳۶)

نقطۂ چشم تماشائی کو آسودگی نہیں ملتی بلکہ اس کی جمال آگینیوں سے دل و ذہن کے دریچے بھی وا ہوتے ہیں ان کی شاعری اپنے دامن میں ادب عالیہ کے وہ عناصر سموئے ہوئے ملتی ہے جو کسی زبان کی ادبی عظمت کے ضامن ہوسکتے ہیں

ادب اردو نے ابھی امجد نجمیؔ کے شاعرانہ خد و حال کو پوری طور پر نہیں دیکھا ہے اور نہ انھیں اپنے قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ وہ ہر اعتبار سے اس کے مستحق ہیں کہ ہمارا ادب نہ صرف ان کا استقبال کرے بلکہ انھیں گلے بھی لگائے۔

✣ ✣ ✣ ✣ ✣

۱۔ شعر الہند صفحہ ۴۲۷

ملک زادہ طیب انصاری

سب رس

ملّا وجہی کا عظیم نثری کارنامہ

اُردو نثر کا اولین ادبی شہ پارہ "سب رس" ملّا اسد اللہ وجہی کی اصلی شہرت کا سبب ہے۔ وجہی بلاشبہ ابراہیم قطب شاہ کے دورِ حکومت (سنہ ۹۵۵ھ تا سنہ ۹۸۰ھ) میں پیدا ہوا اور بادشاہوں کے دورِ حکومت میں دکنی شاعر کی حیثیت سے بے حد مقبول رہا۔ لیکن یہی مقبولیت، دوامی صورت اس وقت اختیار کر گئی جب اس نے مشہور زمانہ ابن سیبک فتاحی کی فارسی نثری کتاب "قصہ حسن و دل" کو دکنی زبان میں ایک مستقل کارنامہ کے طور پر ترجمہ کیا۔ ابن سیبک فتاحی نے پہلے پہل "دستور العشاق" کے نام سے مثنوی لکھی تھی۔ بعد میں خود اس نے سنہ ۸۵۴ھ میں (۵۰۰) اشعار پر مشتمل اس مثنوی کو نثری جامہ پہنایا اور اس کا نام "قصہ حسن و دل" تجویز کیا۔ اس حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے دکنی زبان و ادب پر ابتدا ہی سے ایرانی ادبیات کا گہرا اثر رہا ہے۔ ویسے بھی وجہی جہاں فیروز اور محمود سے شاعری میں تلمذ حاصل کرتا رہا وہیں اس نے روح الامین کی شاگردی بھی قبول کی۔ اس شاگردی کا لازمی نتیجہ یہ رہا کہ وجہی کی روح میں روحِ امین کچھ اس انداز میں حل ہو گئی کہ بہت کم امتیاز باقی رہا۔ فارسی زبان اور ادب سے واقفیت کا وجہی نے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی شاعری کو جلا دینے کی کوشش کی اور اسی فارسی سے واقفیت کے نتیجہ میں وہ فتاحی کے نثری کارنامہ سے بھی روشناس ہوا۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ "سب رس" وجہی کا تخلیقی اور اپجی کارنامہ نہ ہونے کے باوجود تاریخ ادب اردو کا وہ لافانی نقش اول ہے جسے وجہی نے اپنے خون جگر سے رنگین بنایا۔ وجہی کا اندازِ بیان، رنگین زبان اور دکھنی ماحول کی عکاسی ہمیں اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ اس نقل کو اصل سمجھیں۔ ہمیں یہاں "سب رس" کے قصے سے بحث نہیں ہے بلکہ اس کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائیگا کہ وجہی نے جو نثر لکھی ہے اور جس انداز میں لکھی ہے۔ اس کی کیا اہمیت ہے؟ اور اس لحاظ سے کیا واقعی "سب رس" اردو نثر کا قابل ستائش اور لازوال کارنامہ ہے۔

وجہی کی زبان بالفاظِ دیگر اردو کے الفاظ میں تین سو برس کی ہے۔ باوجود اس کے بامحاورہ اور فصیح زبان لکھی ہے اور جو محاورے وجہی نے استعمال کئے ہیں وہ آج بھی بولے جاتے ہیں مثلاً شان نہ گمان، فار کا گھر گھرے گھر، دیکھا دیکھی وغیرہ۔ زبان کے قدیم ہونے کے باوجود پڑھنے میں کوئی ایسی زیادہ دشواری پیش نہیں آتی اور نہ ہی تحریر کی لذت میں کوئی کمی محسوس

ہوتی ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور ان کا استعمال برمحل ہوتا ہے اور پڑھنے پر شکرہ ہونے کے ساتھ ساتھ پرکشش نظر آتے ہیں۔ قصہ طویل ہے لیکن "سب رس" کی شیرینی و لطافت میں کسی قسم کی بے لطفی یا بدمزگی پیدا نہیں ہوتی۔

اُردو نثر میں مقفیٰ اور مسجع زبان لکھنے کا سہرا "فسانہ عجائب" کے مصنف مرزا رجب علی بیگ سرور یا "نو طرز مرصع" کے خالق عطا حسین خاں تحسین کے سرباندھا جاتا ہے۔ نثر میں قافیہ بندی، اختصار، ندرت و فصاحت اور سلامت و سادگی یہ ساری خوبیاں ہیں اس ادیب کی تحریر میں ملتی ہیں جو ان ادیبوں سے تقریباً دو ڈھائی سو سال قبل دکن میں پیدا ہوا ہے وجہی نے حسن کا روپ اس طرح پیش کیا ہے۔

"حسن ناز، ادنانہ، خوش دیدار، خوش گفتار، خوش رفتار، دبدیاں کا سنگار، دل کا آدھار
پھول ڈالی تے خوب نکتی چلنے میں ہنس کوں ٹھکتی، داویں تے میٹھی بولے بات، آواز
تے قمری کو کرے مات، کنول پھول کی پھنکڑیاں جیسے ہات، چمن میں پھول شرم سوں لاتا
تے آسمان پر چڑھے سور مست بھی تے مغرور اتی بھاتی کسے خاطر نیں لیاتی، بال جانو
کالے ناگ، گال جانو عشق کی آگ، یو من دھن عجائب موہنی ہے سورج اس کے درس
کا درسنی ہے ..... جوبن الماس تے گھٹ، ادھر یا قوت تے اعلیٰ پینٹ، مٹکیاں انکھیاں
جانو لالے، جانو شراب کے پیالے، داتاں دیکھ موتی کے دانے گھر گھر پھرتے دیوانے....."

زبان سادہ ہونے کے علاوہ رنگین بھی ہے۔ الفاظ کا استعمال اپنی جگہ موزوں، ہر لفظ موتی کی طرح ٹنکا ہے اور اپنی آب و تاب دکھا رہا ہے۔ بیان کا یہ انداز کس کو نصیب ہوگا۔ نثر میں نظم کا مزہ ہے اسی وجہ سے وہ لوگ جو مقفیٰ اور مسجع نثر سے واقف نہیں ہوتے "سب رس" کو وجہی کا شعری کارنامہ قرار دینے پر تل جاتے ہیں! یہاں ایسے حضرات کی علمی کم مائیگی سے بحث نہیں لیکن اس سے وجہی کے کمال فن کا پتہ ضرور چل جاتا ہے۔ وجہی نے نثر میں شاعری کی ہے، یہ بات قدیم تو قدیم جدید ادیبوں میں بھی ناپید ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ وجہی نے اعلیٰ نثر نگاری میں انداز تحریر کے انمول نشان چھوڑے ہیں۔

کئی اعتبار سے "سب رس" کو ادب اُردو میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ زبان کی سلاست بیان کی روانی قصہ کا تسلسل جذبات کی فراوانی، عشق مجاز کی بے سروسامانی اور عشق حقیقی کی بلند پروازیاں، وصل کی راحتیں، فراق کی کلفتیں، راہ کی دشواریاں، منزلوں کی آسانیاں کیا نہیں ہے، اور کیا کچھ ہے! وجہی کے قلم اور وجہی کے خیال ' دونوں نے ادب میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ اس قصہ کی مقبولیت انداز تحریر کی وجہ سے اس طرح عام ہوئی کہ بعد کے شعرا نے بھی اسے منظوم کیا ہے مغلیہ عہد کے دکنی شعرا میں ذوقی کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی اس کی وجہ "سب رس" کو قصہ حسن و دل (سنہ ۱۱۱۹ء) میں منظوم کرنا ہے۔ اسی دور کے شعرا میں محرمی نے بھی "گلشن حسن و دل" کے نام سے "سب رس" ہی کے قصہ کو مثنوی میں تبدیل کیا۔

محترمہ رفیعہ سلطانہ صاحبہ نے "سب رس" کی ترتیب کی یہ خوبی بتلائی کہ اس کا ہر حصہ بجائے خود ایک انشائیہ ہے۔ مثلاً حسن عشق، عقل اور دل وغیرہ پر علیحدہ علیحدہ مضامین تصور کئے جاسکتے ہیں۔ حالانکہ یہ حصے ایک مسلسل واقعہ کے جزو ہیں۔ یقیناً وجہی کی تحریر کا یہ کمال ہے کہ جز کل نظر آئے بعد کی تحریروں میں یہ بات نظر نہیں آتی۔ اسی بنا پر "قصہ حسن و دل" کو ترتیب دیتے ہوئے جاوید وشسٹ نے لکھا ہے، وجہی کے انشائیے ([illegible]) بھی بہت حسین اور ہر اعتبار سے مکمل ہیں۔ وجہی ان معنوں میں اردو کا سب سے پہلا انشائیہ نگار ہے۔

"سب رس" کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ وجہی نے قصہ کو لکھتے وقت انسانی شرافت، حجاب وحیا اور ستر پوشی کا لحاظ نہیں رکھا حسن و دل کی وصل کی ساعتیں انتہائی رومانی ہیں، جذبات عریاں ہوگئے ہیں مثلاً حسن و دل کی سہاگ رات کا نقشہ یوں پیش کیا گیا ہے:

"پانوں میں پانوں، سینے سوں سینہ، ادھر پہ ادھر، ہات میں ہات، دونوں مل یوں
سونے جانو ایک وجود ایک ذات، نازاں تے گھونگھٹ کھولے، غمزیاں تے باتاں بولے
مروت چلبلنے لگی، محبت انکھیاں میں کھلنے لگی، بنگڑیاں شور کیاں گھنگرو غل اچانے کرتی
زر کر کلیاں ہاراں سینے پر دندلاے" وغیرہ۔

قصہ میں عریانیت اور بے حجابانہ منظر نگاری اخلاقی نقطہ نظر سے تنقید کا نشانہ بن جائے تو تعجب کیا ہے! لیکن واقعہ کا جہاں تک تعلق ہے وجہی نے ایسے موضوع کو منتخب کیا جس میں عریانی اور جذبات نگاری نہ ہوتی تو کچھ نہ ہوتا! یہ وجہی کی حقیقت نگاری اور واقعیت پسندی نہیں ہے تو اور کیا ہے کہ اس نے انسانی جذبات کا اہتمام کیا ہے اور رشید حسن کے خیال کے مطابق شاید وجہی کی عمر اس قابل نہیں تھی کہ وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ شب وصل گذارتا لیکن جذبۂ عشق و جنوں نے بالآخر قلم کا سہارا لیا اور پھر وہی جذبات موتیوں کی طرح صفحۂ قرطاس پر بکھر گئے۔ سب رس کے اس والہانہ انداز اور قصہ کی ان ہی عجیب و غریب منزلوں کو دیکھکر مولوی عبدالحق نے کہا کہ "قصہ بھی عجیب ہے اور طرز بیان بھی عجیب! مصنف نے ایک عام اور عالمگیر حقیقت کو مجاز کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اور حسن و عشق کی کشمکش اور عشق و دل کے معرکے کو قصہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔

عزیز احمد نے "سب رس" کے متعلق جو کہا ہے صحیح کہا ہے کہ "سب رس میں ناول کے خدوخال نظر آتے ہیں کیونکہ اس میں ضمنی کہانیاں نہیں ہیں۔ اور وجہی کا ایمائی انداز اس میں جدید طرز ناول کی خصوصیت پیدا کردیتا ہے۔ اس رائے سے شمیم انہونوی نے اختلاف کیا ہے وہ کہتے ہیں، یہ بات صحیح نہیں کیونکہ اسطرح تو ہر داستان اور ہر قصہ میں ناول کے خدوخال نظر آسکتے ہیں۔ کیونکہ ان میں بھی پلاٹ ہوتا ہے اور کردار بھی۔ ناول کی خصوصیت تو یہ ہے کہ اس میں زندگی کی اصلیت نظر آئے کوئی بات مافوق الفطرت نہ معلوم ہو۔ یہی اصلیت ناول کو داستانوں، حکایتوں وغیرہ سے ممتاز کرتی ہے۔" اگر اس بات کو

مان لیا جائے تو سرشار کی کہانیاں اور طول طویل واقعات کو ناول میں شامل کر لینا چاہیئے اور ایسا کیا بھی جاتا ہے لیکن سرشار اور شرر کے ناول کا مطالعہ فن میں غیر معمولی تبدیلیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس طرح ناول کے معنوں میں وسعت اور تبدیلی نظر آتی ہے۔ درحقیقت زبان و ادب کی قدریں ہر وقت اور ہر زمانہ میں یکساں نہیں رہی ہیں۔ یکسانیت یا جمود زبان و ادب کی موت کا پیش خیمہ ثابت ہوا کرتے ہیں۔ انسانی زندگی جاری وساری ہے' رواں دواں ہے۔ حیات کی قدریں خوب سے خوب تر کی جانب بڑھ رہی ہیں۔ ہمارا ادب حرکی ہے۔ نئی قدریں اور نئے رجحانات کے امکانات ہمیشہ روشن ہیں۔ اسی وجہ سے کسی صنف ادب کی معینہ صورت گری اور مقررہ تعریف بے معنی ہے۔ وجہی کا زمانہ ہماری زبان و ادب کا قدیم اور ابتدائی زمانہ ہے۔ اگر ہم اس زمانہ کی تصانیف وشاعری کو دور جدید کے پیمانوں میں جانچنے کی کوشش کریں تو یہ بات اپنی تمام تر سنجیدگی کے باوجود مضحکہ خیز بن جاتی ہے "سب رس" جدید معنوں میں مکمل ناول نہ سہی لیکن ناول کی طرف پہلا قدم ضرور ہے۔ یا پھر اس کو آپ جدید ناول کی ابتدائی کوشش کا نام دے سکتے ہیں۔

"ہندی یا سنسکرت ادب میں جہاں دولت وعلم کو مجسم کرنے کی ضرورت پڑی وہاں لکشمی اور سرسوتی کے کردار پیش کر دیئے اور فرانسیسی اور انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں کے ادب میں یونانی دیومالا سے کام لیا گیا۔ مثلاً حسن کو مجسم اور جاندار پیش کرنا ہے تو زہرہ کو پیش کر دیا عشق کو زندگی بخشی ہے تو کیوپڈ کی شکل سامنے لے آئے لیکن اسلامی ممالک میں چونکہ اصنام پرستی ممنوع ہے اس لئے وہاں کے مصنفین کو ان غیر مجسم کیفیات کو مجسم اور جاندار بنانے کیلئے دقت پیش آئی سوائے اس کے کہ وہ انھیں کو مجسم بناویں یعنی عشق کو عشق اور حسن کو حسن اور کوئی صورت ان میں جان ڈالنے کی نہیں تھی" ان خیالات کی روشنی میں شمیم انہونوی نے سب رس اور سب رس کے کرداروں کا مطالعہ کیا اور اس طرح یہ کتاب ایک تمثیل کا اعلیٰ نمونہ قرار پائی۔

ڈاکٹر اعجاز حسین جنوبی ہند میں اردو نثر کا جائزہ لیتے ہوئے رقمطراز ہیں "جنوبی ہند میں بھی پہلے پہل اردو نثر نویسی کا رجحان مذہبی تھا ...... اس دور میں جتنی کتابیں لکھی گئیں ان کا زیادہ تر موضوع مذہب تھا .... قصے کہانیوں کی جو کتابیں لکھی گئیں وہ زیادہ تر فارسی کتابوں کا ترجمہ تھیں۔ افسانے عام طور پر فوق الفطرت عادات و کردار پر مبنی ہیں۔ اخلاق و مذہب کا خیال زیادہ رکھا گیا ہے۔ حسن و عشق کی داستانوں سے بزم آرائی کی گئی ہے۔ فارسی ادب کے دلکش و پر اثر قصوں کو اردو کے قالب میں ڈھالنا بھی کوئی کم مفید کام نہ تھا اتنی کم عمر میں اردو نثر کا فارسی عبارت آرائی و پختگی و نصب العین سے روشناس ہو جانے کے یہ معنی تھے کہ خود اردو کا معیار دفعتاً فصاحت و سلاست و معنویت کے لحاظ سے بلند ہو گیا" بلاشبہ سب رس کے کردار غیر مجسم کیفیات "انسانی" ہیں اور واقعات مافوق الفطرت لیکن اس اعتراض سے پہلے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے سامنے جو ادب ہے وہ آج کا جدید ادب نہیں بلکہ اس نوزائیدہ زبان کا ہے جبکہ وہ ارتقائی نہیں بلکہ ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی اور جو مذہب و اخلاق کے دائرے سے نکل کر ادب کی طرف خراماں خراماں

قدم بڑھا رہی تھی۔ ایسی صورت میں سب رس کو جدید معیار کی کسوٹی پر پرکھنا مناسب نہیں۔ یقیناً سب رس تمثیل (Allegory) کے زمرہ میں شامل کی جاسکتی ہے لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے یہ جدید ناول کی طرف پہلا اور اہم قدم بھی ہے۔ نذیر احمد کے ناول اور سرشار کے ناولوں میں، سرشار کے ناول اور شرر کے ناولوں میں آپ تدریجی ارتقاء کے نشان پائیں گے۔ اردو ادب میں ناول نگاری کا سہرا ان ہی تینوں حضرات کے سر ہے۔ خود ان تینوں ناول نگاروں کی تحریروں میں کیا بہ لحاظ کیا زبان اور کیا بلحاظ فن ـــــ بہت بڑا فرق موجود ہے۔ تو پھر "سب رس" کو جو ان حضرات سے پہلے لکھی گئی ہے اور ان حالات میں جبکہ انگریزی ادب کے رجحانات کا دور دور تک بھی پتہ نہ تھا انگریزی معیار پر جانچنے کی کوشش کرنا کس حد تک درست ہے؛

وجہی کے زمانے تک ہمیں خالص ادبی کتاب نہیں ملتی اور خود "سب رس" میں مذہبی رنگ نمایاں ہے۔ "سب رس" خالص ادب کا نمونہ پیش بھی نہیں کرسکتی تھی' اول تو وجہی کے زمانے میں مذہب کی گرفت مضبوط تھی اور عام رجحان مذہب ہی کی طرف مائل تھا۔ وجہی کی تعلیم و تربیت مذہبی احول میں ہوئی اس وجہ سے اگر سب رس میں مذہبی رنگ نمایاں ہے تو تعجب کیا؛ وجہی حقیقت پسند تھا۔ اس وجہ سے وہ ایک ادبی شہ کار میں بھی مذہبی خیالات کو پیش کئے بغیر نہ رہ سکا' وجہی اپنے زمانہ کا ترجمان تھا۔ اپنے ماحول کا عکاس ـــ جس نے اپنے وقت کے افکار و خیالات کو اپنی تحریر میں پیش کیا وجہی عشق کا پروردہ تھا' وہ فطرتاً حسن پرست واقع ہوا تھا اس وجہ سے "سب رس" میں حسن و عشق کی جولانیاں آپ کو ملیں گی۔ وجہی نے "سب رس" میں "سکون" کی جستجو کی ہے اور ہر زمانے میں مذہب راحت کدہ سکون سمجھا جاتا رہا ہے۔ اسی طرح زمانے کے رجحان اور وجہی کی فطرت نے مل کر سب رس کو حسن و مذہب کا دلچسپ اور حسین مرقع بنا دیا ہے۔ "سب رس" عام مذہبی کتابوں کی طرح خشک نہیں۔ یہاں آپ کو حسن کی رنگینی نظر آئے گی' حسن جلوہ گر ہے اور اپنی تمام تر رعنائیوں اور آب و تاب کے ساتھ اس کی تازگی' اس کی روشنی' اسکی جاذبیت بھی کچھ "سب رس" میں موجود ہے۔ عشق کی تڑپ نے تو سب رس میں آگ لگادی ہے۔ عشق کی بے چینیاں' تڑپ اور ہنگامہ آرائیاں اپنے نقطہ عروج پر نظر آتی ہیں۔ جس تحریر میں حسن و عشق کی مسلسل کشمکش ہو وہ آگ کا دریا ہی ہوسکتی ہے۔ نصیحت و فضیحت کا پلندہ نہیں!

"سب رس" اپنے دور کی مایۂ ناز تصنیف ہے' یہ ماننا پڑیگا کہ وجہی جدید نثر کا محسن اعظم ہے جس نے پہلی مرتبہ دکنی زبان کو ادبی مقصد کیلئے نثر میں استعمال کیا۔ زبان و ادب کی موجودہ وسعت وجہی کی بے تابی اور اضطراری کیفیت کا نتیجہ ہے اور "سب رس" نثر کا اولین نقش ہوتے ہوئے نقشِ آخر ہے کہ اس میں جدید اصناف کی نشاندہی ملتی ہے

سید حرمت الاکرام

"طلوعِ سحر" اور امجد نجمی

امجد نجمی نے اڑیسہ کی خاک سے جنم لیا ہے جو ہندوستان کا دور افتادہ علاقہ ہے اور تقریباً ہر دور میں اردو دنیا سے منقطع رہا ہے لیکن اس خطۂ ارض سے اردو کے شاعر ہمیشہ ابھرتے اور دادِ سخن دیتے رہے ہیں۔ نجمی بھی تقریباً نصف صدی سے اردو شعر و ادب کی خدمت میں منہمک ہیں جو ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا' دونوں سے بیگانہ ہیں۔ انھوں نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جو علم و ادب کی روشنی سے معمور تھا۔ اِن کے والد نہ صرف اچھے شاعر تھے بلکہ عربی' فارسی اور اڑیا کے جید عالم بھی تھے، اور یہاں اعتبار نجمی کو شعر و ادب کی جاگیر وراثتاً ملی ہے۔ انھیں خود بھی اعلیٰ تعلیم سے فیضیاب ہونے کا موقعہ ملا جس نے ان کے ادبی ذوق کو نکھارنے اور عام سطح سے بلند تر کرنے میں اُس جذبہ کی معاونت کی جو تخلیقِ شعر کا اینِ وضامن ہوتا ہے۔

"طلوعِ سحر" ان کی ۸۴ نظموں کا مجموعہ ہے جو منظر امام کے پیش لفظ کے علاوہ نیاز فتح پوری' پروفیسر سید احتشام حسین' پروفیسر آل احمد سرورؔ' ڈاکٹر اختر اورینوی' ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نیز متعدد اکابرین ادب کی آراء کا حامل ہے۔ اس مجموعہ کی ترتیب پروفیسر کرامت علی کرامت کے مذاقِ سخن کی ممنون ہے جنھیں نجمی کے تلامذہ میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اور جو خود بھی اچھے شاعر اور بلند پایہ ادیب ہیں۔ انھوں نے نجمی کی کم و بیش ڈھائی سو نظموں میں سے ان نظموں کا انتخاب کیا ہے جس سے ان کی ادبی ذہانت و فراست کا اظہار ہوتا ہے۔

نجمی کے متعلق علامہ نیاز فتحپوری نے چند الفاظ میں بڑے پتہ کی بات کہی ہے:۔

> "میں کبھی اس کی توقع نہیں کرسکتا تھا کہ سرزمین اڑیسہ سے کبھی کوئی ایسا شاعر ابھر سکتا ہے جس کو اگر شمالی ہند کی صفِ شعراء میں بٹھا دیا جائے تو اس کی آواز سن کر ہم تو زغاصگان (؟) ملی کہنے پر مجبور نہ ہوں"۔

نجمی کے متعلق پروفیسر آل احمد سرور کی رائے یہ ہے:۔

> "اڑیسہ کی سرزمین سے اردو زبان کا یہ خوش فکر اور خوش گو شاعر حسن و عشق کی زبان میں زندگی' تہذیب اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اس کی زبان میں قدرت اور اس کے لہجہ میں شعریت اور لطافت ہے۔ اسے ہماری شاعری کے معیاروں کا

احساس ہے اور ہمارے تمام اہم میلانات کا عرفان۔ اس کی شاعری حسن خیال اور
حسن اظہار کا ایک قابل قدر نمونہ ہے۔"

ایک جانب نجمی کی شاعری میں ان خصوصیات کی جلوہ پیرائی ہے جو اہل زبان کے کلام میں پائی جاتی ہیں تو دوسری طرف اس کا نمایاں تر پہلو یہ ہے کہ وہ تازگی و شگفتگی کا سرمایہ رکھتی ہے۔ ان کے ذہن کا رشتہ ہماری ادبی روایات سے نہایت گہرا ہے لیکن وہ ان روایات کے معتقد نہیں جو فکر کو محدود کرتی ہیں بلکہ ان کی شاعری کی فضا نہایت کشادہ اور وسیع ہے جس میں زندگی کی تغیر پذیر اقدار اور ادب کے نئے مسائل کی بھرپور عکاسی ہے' اگرچہ اس کی توقع اس دور کے شاعروں سے عموماً نہیں کی جاسکتی جس میں نجمی کی شعر گوئی کی ابتدا اور نشو و نما ہوئی۔ ان کی شاعری میں فکر و خیال کی رعنائی ہی نہیں توانائی بھی ہے اور دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ذہن کی وہ آواز بھی ہے جو شاعری کو نئی آفتوں سے مانوس کرتی اور اس قابل بناتی ہے کہ وہ موضوعات کے بکھرے ہوئے ذروں کو سمیٹ کر ان کی جبینوں کو مہر و ماہ کی تابانیاں دے سکے۔

وہ اپنی شاعری کو صرف جذبات کی زنگا رنگیوں سے نہیں سجاتے بلکہ اس سے بالاتر ہو کر فکری نیرنگیوں کی وہ مشعل فروزاں کرتے ہیں جس سے زندگی کے بڑھتے ہوئے قافلے کو روشنی ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں حسن خیال بھی ہے اور حسن اظہار بھی۔ ان کی شاعری جس کی اساس مشاہدات و تجربات پر استوار کی گئی ہے' عصری میلانات کے مختلف پہلوؤں کا آئینہ ہے۔ نجمی کے یہاں ان عناصر کی کارفرمائی ہے جو عزائم کو حرارت و صلابت دیتے ہیں نیز نوع انساں کو ارتقا کی راہ پر آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ نالہ و فریاد اور حزن و یاس کے شاعر نہیں بلکہ ان کی نظموں میں زندگی کا شوخ تبسم اور دہکتے ہوئے حوصلوں کا وہ تلاطم ہے جس کا فقدان پست حوصلگی اور افسردہ دلی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

وہ عزم و عمل' نئے ولولوں اور نئے حوصلوں کے نقیب ہیں جس کا اظہار "طلوع سحر" کی ابتدائی نظم "تعارف" میں صراحتاً پایا جاتا ہے وہ اپنے لغت میں خستگی' واماندگی' بیچارگی اور دوں ہمتی کے الفاظ نہیں دیکھنا چاہتے' ان کا چراغ تیز و تند ہواؤں کی زد پر بھی جگمگاتا رہتا ہے۔ ان کا دل مآل اندیش ہے اور آنکھیں دوربین' تیز گامی' سخت کوشی اور سعیٔ دوام ان کے کردار کے اجزائے خاص ہیں۔ ان کا دل بھی وسیع ہے اور نگاہ بھی' اسی لئے ان کی شاعری اپنے گرد و پیش تک محدود نہیں رہتی بلکہ بین الاقوامی شعور کا پھیلاؤ رکھتی ہے۔

ان کے ہونٹوں میں بانسری بھی ہے اور ہاتھ میں تیغ خونچکاں بھی لیکن نہ وہ بانسری کو نذر آتش کرنے کے قائل ہیں نہ محض تلوار کو جہد حیات کا حاصل تصور کرتے ہیں ان کے سامنے تصویر کے دونوں رُخ ہیں اور وہ ان دونوں پہلوؤں کو متوازن رکھنے میں بڑی حسن کاری سے کام لیتے ہیں وہ ان مقامات سے بھی آگاہ ہیں جہاں بانسری کے سماعت نواز زمزموں کی ضرورت ہوتی ہے اور ان مواقع سے بھی باخبر ہیں جہاں چمکتی ہوئی تلوار کے جوہر دکھائے جاتے ہیں لیکن ان کی شاعری کسی جگہ آپے سے باہر نہیں ہوتی اور نہ لوازم شعری سے عاری ہونا پسند کرتی ہے۔ بزم کی رنگینیاں ہوں یا رزم کی خوں آشامیاں' ان کے شاعرانہ لہجہ کی دلپذیری

اور دل نشینی، اس کی لطافت اور نفاست میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ان کے یہاں سیاسی نظموں کی کمی نہیں لیکن ان نظموں میں وہ ہنگامہ خیزی اور شور انگیزی نہیں جو فکر کی متانت کو مجروح کرتی ہے۔

ان کی عہد بہ عہد نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی سے ان کے شعور کا گہرا تعلق رہا ہے لیکن ان کا جذبۂ حریت وقتی نہیں بلکہ اس میں ابدیت اور ہمیشگی ہے وہ اپنی نظم "آزادی" میں کہتے ہیں:۔

شعور آزادی سے ہے لبریز سازِ کائنات ۔۔۔ دے رہا ہے جس کا ہر اک نغمہ پیغام حیات
حسنِ آزادی! ترے جلووں سے روشن ہے شعور ۔۔۔ تیری صہبائے طرب ہے مایۂ کیف و سرور
شاعرِ رنگیں نوا کو بھی محبت تجھ سے ہے ۔۔۔ اسکے باغِ دل کی ساری زیب و زینت تجھ سے ہے

نجمی ایک بالغ نظر، روشن خیال اور نکتہ ور شاعر ہیں اور ان کا ذہن علوم جدیدہ کے کارواں کے ساتھ کافی دور تک چلا ہے۔ وہ اُردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی ادب پر بھی اچھی نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے تقریباً ہر صنف سخن میں اپنی طباعی کے جوہر دکھلائے ہیں اور ان کا قلم ہر دور میں حالات اور ماحول کا جائزہ لیتا رہا ہے۔ ان کی شاعری کو سوچی سمجھی ہوئی شاعری کہنا زیادہ بہتر ہے، وہ محض جذبات کی رو میں بہہ کر شعر نہیں کہتے بلکہ بات کہنے سے قبل اس کو فکر کی میزان میں پوری طرح تولتے ہیں جو کسی اچھے شاعر کے لئے لازمۂ فن کا درجہ رکھتا ہے اور اس میں مقصدی یا غیر مقصدی شاعری کا امتیاز نہیں برتا جا سکتا۔ اس سے قطع نظر کہ شاعری کے لئے کسی مقصد یا پیغام کا حامل ہونا ضروری ہے یا نہیں اور اسکا افادی ہونا مستحسن ہے یا غیر مستحسن، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نجمی کی شاعری پر مقصد پسندی ایک حد تک حاوی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ ان کی شاعری میں وہ سپاٹ پن یا ناہمواری نہیں جس کے لئے مقصد پرست شاعری رسوا ہو چکی ہے البتہ ان کی مقصدیت یہ بتاتی ہے کہ وہ اپنے دور کے اُن میلانات سے کما حقہ، روشناس ہیں جو انسان کے سیاسی معاشی اور سماجی سفر میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں نیز انھوں نے ان اثرات کو اپنے نظریات کی آنچ میں تپانے اور گھلانے کی سعی کی ہے۔

نجمی متصوفانہ ذہن رکھتے ہیں اور غالباً اسی بنا پر ان کی شاعری ہر نوع کی تنگ نظری اور تنگ دلی سے پاک ہے وہ انسانی اخوت و محبت کی آفاقی فضاؤں میں پرواز کرتے ہیں اور ان کی نگاہ ہمیشہ بلندیوں کی جانب رہتی ہے وہ مذہب کی حدود میں ضرور رہتے ہیں لیکن اپنے کو کسی دائرے میں اسیر نہیں ہونے دیتے اور نہ ان کے تصوف میں دنیا سے بیزاری کے ان رجحانات کا عکس پایا جاتا ہے جن سے سعی و عمل کی نفی ہوتی ہے۔ انھیں دنیا، اس کی رونقوں، اس کی رنگینیوں سے اسی قدر محبت ہے جتنی کسی شخص کو ہو سکتی ہے ان کا رُخ ہمیشہ کارزارِ حیات کی جانب رہتا ہے، نہ وہ "خانقاہ" کی طرف دیکھتے ہیں نہ اُسے اپنی منزل سمجھتے ہیں۔

نجمی اردو شعر و ادب کے کئی ادوار سے گذرے ہیں۔ تمام ادبی رجحانات و تحریکات کا خیر مقدم کرتے رہے ہیں لیکن انھوں نے غم جاناں اور غم دوراں کو کبھی ایک دوسرے کی ضد نہیں بننے دیا بلکہ انھیں ہم آہنگ کر کے ایک نیا نغمہ پیدا کیا

جس میں بڑی ہمہ گیری توانائی اور کشادگی ہے وہ سائنس کے مختلف تاروں کو ملانے اور ان کو معتدل عمل سے چھیڑ کر دلپذیر زمزموں کی تخلیق کا ہنر جانتے ہیں۔

نجمی کے لہجہ کا تجزیہ کیا جائے تو ایک طرف جوش اور اقبال کے اثرات کا پتہ چلتا ہے اور دوسری طرف وہ حالی اور نظیر سے بھی کسی قدر متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ جوش اور اقبال کے اثرات بڑی حد تک نمایاں ہیں لیکن حالی اور نظیر کے اثرات اپنے نقوش میں کوئی گہری تابناکی نہیں رکھتے۔ نظیر اور جوش کا اثر صرف بیان کی حد تک ہے اور معمولی ہے لیکن حالی اور اقبال کا اثر معنوی حیثیت رکھتا ہے۔ جو ان کی نظموں کے باطن میں پیوست ہے۔ حالی اور اقبال دونوں کے یہاں عمل پسندی اور اصلاح پرستی کی جو روشنی ہے وہ نجمی کے یہاں بھی موجود ہے۔ ان کی شاعری کو پیغمبری کا جزو قرار دیا جائے یا نہ دیا جائے لیکن وہ اس نظریۂ سخن کے معتقد ضرور ہیں نیز ان کی شاعری کسی نہ کسی حد تک اس کی نمائندہ ہے اور اسی سے ان کی مقصد پرستی کی بھی نقاب کشائی ہوتی ہے۔

ان کی تصنیفات کی تعداد کثیر ہے جس کی پشت پر ان کے ذہن کی وسعت کے ساتھ مختلف موضوعات پر ان کی چابکدستانہ دسترس نیز زبان و ادب سے ان سے والہانہ عشق کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ان کی نگاہ ہمیشہ حالات و واقعات کے سینوں میں اتری رہتی ہے اور رد عمل نثر و نظم کی مختلف اصناف کے قالب میں ڈھلتا رہتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے ڈرامے بھی لکھے ہیں اور علمی ادبی اور تنقیدی مضامین بھی جو اس امر کی دلیل ہے کہ ان کے قلم پر کبھی ماندگی نہیں طاری ہوتی اور نہ وہ رکنا جانتا ہے۔ ان کی خاموشی و گوشہ گیری اپنے سینہ میں بڑے بڑے طوفان چھپائے بیٹھی ہے۔

"طلوع سحر" صرف نظموں پر مشتمل ہے اور نجمی میرے نزدیک اصلاً نظموں ہی کے شاعر ہیں۔ بات کہنے کا جو اسلوب انھوں نے اختیار کیا ہے، وہ نظموں ہی کے لئے زیادہ موزوں بھی ہے۔ وہ کسی واقعہ کو محض اشاروں یا کنایوں میں بیان کر دینے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کے خاص خاص گوشوں اور پہلوؤں کو اجاگر کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں جس کے لئے قدرے تشریح و تفصیل لازمی ہے۔ ان کی شعر گوئی کا آغاز اڑیا زبان کی شاعری سے ہوا جس میں غزل جیسی کسی صنف کا وجود نہیں اور نظم نگاری سے ان کی اس قدر مضبوط و عمیق وابستگی کی وجہ غالباً یہی ہے کہ در اصل ان کی شاعری کا خمیر ہی اس سے اٹھا ہے

ان کی نظم گوئی کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کرنے کے لئے ان کی بعض نظموں کے اقتباسات کا مطالعہ ضروری ہے کرۂ ارض کے لئے رات اور دن دونوں اہمیت رکھتے ہیں نیز روشنی و تاریکی کا وجود اس توازن کا امین ہے جس کے بغیر کائنات کی دل فروزیوں کا تصور نہیں کیا جا سکتا لیکن فطری اور منطقی طور پر دن کو رات اور روشنی کو تاریکی پر ترجیح دی جاتی ہے، ہم تاریکی سے بیزار اور روشنی کے آرزومند رہتے ہیں۔ نجمی بھی رات کے اندھیروں کو شکست دینے کے لئے آگے بڑھتے ہیں اور اپنی نظم "روشنی نہ کر دو" میں لکھتے ہیں:-

ظلمتوں سے ابھی معمور ہیں یہ ارض و سما

تشنہ ہے تقاضوں کا تقاضا
ابھی پیالۂ ہستی میں ہے غم کی صہبا
تلخیٔ وقت کو کاوشِ کرا تیز کرو
روشنی تیز کرو، تیز کرو، تیز کرو

کارواں عزم کا ہونے کو ہوا گرمِ سفر
ہے مگر دوریٔ منزل کا وہی خوف و خطر
نہیں آتی ہے دھندلکے میں کوئی چیز نظر

تیرہ و تار فضا ہے اسے ضو بیز کرو
روشنی تیز کرو، تیز کرو، تیز کرو

شاعر کا منصب ان کی نظر میں کس قدر ارفع و اعلیٰ ہے، اس کا اندازہ ان کی نظم "شاعر کا دل" سے بآسانی ہو سکتا ہے وہ کہتے ہیں۔

مدعی تو نے ابھی دیکھا نہیں شاعر کا دل — جلوہ ہائے رنگ و بو ہوتے ہیں جن میں منتقل
دل نہیں اک مستقل آئینہ ہے جذبات کا — عکس کھنچ آتا ہے جس میں سارے موجودات کا
کون شاعر جس کا سینہ محرمِ رازِ حیات — کون شاعر جس کے قالب میں ہے روحِ کائنات
گونجتا ہے زندگی کا گیت جس کے راگ میں — جو ہمیشہ کود پڑتا ہے پرائی آگ میں
ڈھونا کوہِ گراں کا جس کے آگے ہے وقار — ٹوٹ کر شیشے کا ٹکڑا جس کو کر دے بے قرار
اہلِ ظاہر کب سمجھ سکتے ہیں یہ رازِ نیاز — اشک ہے جس کا وضو اور درد ہے جس کی نماز

بلندیوں کی جانب بڑھنا اور پرواز کرنا فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے اور یہی وہ کیفیت ہے جسے ارتقا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قدرت نے مٹی پیدا کی اور انسان نے اس سے چراغ بنایا جو ذہن و دل کے متعدد مراحل سے گذرتا ہوا برقی قمقمے کی منزل تک آ پہنچا لیکن علوم و فنون کی جدید تر ترقیوں کے باوجود نوعِ انساں کو ابھی وہ منزل نہیں ملی ہے جس کا وہ روزِ اول سے متلاشی و متمنی ہے۔ نجمی اس موضوع کو اپنی نظم "ابھی" کے پیکر میں ڈھال کر اس طرح پیش کرتے ہیں:-

ابھی چراغ کو خطرہ ہے بادِ صرصر کا
ابھی ہے شیشۂ نازک کو خوف پتھر کا
ابھی عقاب سے لرزاں ہے دل کبوتر کا

بھری ہے راہزنوں سے ہر ایک راہگذر
ابھی اداؤں میں ہے اوراک اور ا باقی

ابھی ہے عقل کا اک رقص شعلہ زا باقی
ابھی ہے جنگ خلائی کا تجربہ باقی
ابھی نہیں ہے کسی کو سکونِ قلب و جگر

انسان کو جس طرح اپنا ماضی عزیز ہوتا ہے، اسی طرح اس کو ماضی کے تاریخی سرمایوں سے بھی یک گونہ ربط ہوتا ہے جنھیں یاد کے آئینہ اور تصور کے پردوں پر سجا کر گاہ وہ فخر محسوس کرتا ہے اور گاہ شوکتِ رفتہ پر اس کا دل پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ عام انسانوں کے مقابلہ میں شاعر زیادہ حساس ہوتا ہے، چنانچہ "قلعہ کٹک" کی تاریخی عظمتوں سے نظر ٹکراتے ہی نجمی کی آنکھیں خونبار ہو جاتی ہیں اور وہ چیخ اٹھتے ہیں:۔

اے چراغِ کشتہ! اے ماضی کی ویراں یادگار — اے شکوہِ عہدِ رفتہ! اے خزاں دیدہ بہار
اے درِ مضبوط و محکم! اے فصیلِ خشت و سنگ — اے حدِ سنگین فاضل! اے حصارِ لالہ رنگ
اے مذاقِ حسنِ صناعی کی تابندہ مثال — اے کسی نقش آفریں کے دستِ چابک کا کمال!
اے اڑیسہ دیش کی تاریخ کا رنگین باب — تو کسی کے قلبِ مضطر کا ہے گویا پیچ و تاب
اے کہ عظمت تیری رشکِ گنبدِ افراسیاب — گردشِ ایام نے کر دی تری مٹی خراب
آنکہ اس کی دور میں تھی دل تھا اس کا دردمند — ہو گیا تعمیر سے تیری امر راجہ مکند
یہ مہاندی کا نظارہ، یہ تیرے خد و خال — جیسے جمنا کے کنارے تاج کا حسن و جمال!
یہ حصارِ آب یہ خندق کا ہالہ چار سو — اس میں "درگہ" کی جھلک جیسے چراغِ آرزو
کھائی کے اندر یہ چمکیلا یہ نیلا فرشِ آب — یہ کنول کے پھول گویا جن کو پانی کا گلاب

شکست خوردگی بجائے خود اتنی ضرر رساں نہیں جتنی کم حوصلگی کیونکہ یہ ضائع شدہ قوتوں کی بحالی کی دشمن ہے، یاوسی کو اسی لئے خطرناک اور ہلاکت خیز کہا جاتا ہے کہ وہ انسان سے حوصلہ چھین لیتی ہے اور اسے پستیوں سے ابھرنے کا موقع نہیں دیتی مگر نجمی کسی بھی عالم میں اپنے اوپر یاس و ہراس کو غالب نہیں آنے دیتے اور وہ پیکارِ حیات میں سپر ڈالنے کے قائل ہیں۔ ان کی نظم "امیدوں کا چراغ" کا آخری بند ملاحظہ ہو:۔

ذہن میں یوں تو ہے ناکام خیالوں کا ہجوم — روح میں کشمکشِ بیم و رجا ہے پھر بھی
فکرِ امروز میں فردا کے ہیں دھندلے سائے — نیلگوں چرخ پہ جیسے کوئی تارا ابھرے
یا شبِ تار میں جیسے کوئی جگنو چمکے — میرے سینہ میں فروزاں ہے امیدوں کا چراغ

بعض معنوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری میں تاثیر کی کمی ہے کیونکہ ان کے یہاں نہ سوز و گداز کی وہ شعلہ سامانیاں ہیں جو میر کو زندگی بھر جلاتی رہیں اور نہ آنسوؤں کی وہ تلاطم خیز باریاں ہیں جنھوں نے فانی کو ہمہ تن ڈبو دیا، شبلی کا مقولہ

ہے کہ ہمارے شیریں ترین گیت وہی ہوتے ہیں جو سب سے زیادہ غم انگیز خیالات کے حامل ہوں۔ ورڈسورتھ کا کہنا ہے کہ ٹریجڈی ہماری روح کو پاکیزہ کرتی ہے۔ بلاشبہ وہ نغمات جن میں حزنیہ لے گھلی ہوئی ہو زیادہ دلپذیر ہوتے ہیں نیز شاعری کی آواز کو تاثیر کا سرمایہ عطا کرنے میں اس لے کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ لیکن محسوسات میں اتنی یکسانیت ممکن نہیں کہ ہر شاعر حزن و اندوہ کی انہیں کیفیات سے دوچار ہو جنھوں نے شیلی، میر یا فانی کو درد مجسم بنا دیا۔ نجمی اپنے وجود کو غم کی ہیبت پرچھائیوں میں چھپنے نہیں دیتے اور ایسے مقامات آتے بھی ہیں تو وہ ان سے خنداں و شاداں گذر جاتے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی پلکوں پر آنسوؤں کے ستارے کبھی جگمگائے ہی نہیں یا ان کے دل میں درد کے شعلے بھڑکے ہی نہیں۔ چوٹ کھا کر وہ بھی تڑپے ہیں اور ان کی روح میں بھی کسک کی لہریں اٹھی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ ایسے موقع پر پسپائی یا مغلوبیت کی کیفیت طاری نہیں ہونے دیتے

نجمی کا شباب زندگی کے ان موڑوں سے بھی گذرا ہے جہاں لغزشِ مستانہ ناگزیر ہوتی ہے۔ انھوں نے زلفوں کی طرح کالی اور بھیانک رات میں ہمہ تن انتظار بن کر محبوب کی راہ بھی دیکھی ہے اور ان کے دل نے وقت کی چلچلاتی دھوپ میں سایۂ دیوارِ یار کی آرزوؤں کو بھی پروان چڑھایا ہے۔ چنانچہ حالی کی طرح انھیں بھی جوانی کی یاد بے اختیار آتی ہے اور اس کی کج ادائیوں کے نقوش یکے بعد دیگرے ابھرنے لگتے ہیں۔ نجمی اپنی مثنوی "جوانی" میں کہتے ہیں:۔

جوانی شعلۂ آتش فشاں ہے　　جوانی زیست کا رازِ نہاں ہے
جوانی زندگی کا اک تبسم　　جوانی زندگی کا اک ترنم
جوانی زندگی کا خونِ تازہ　　جوانی چہرۂ انساں کا غازہ
جوانی زندگی کا نقشِ اول　　جوانی ایک شورش ایک ہلچل

"شبِ انتظار" سے "مون لائٹ" تک ان کی شاعری متنوع موضوعات کا ایک لامتناہی سلسلہ رکھتی ہے جس میں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ روزگار بھی، حدیثِ دل بھی اور فسانۂ حیات بھی۔ دوسرے شعراء کی طرح وہ موضوعات کے قحط کا شکوہ نہیں کرتے لیکن ان کی شاعری موضوعات کی اسیر بھی نہیں بلکہ موضوعات ان کی شاعری کے اسیر ہیں، وہ ہر موضوع کی زلف کو سلجھاتے اور اس کے پیچ و خم کو شانۂ فن سے سنوارتے ہیں۔ فی الاصل ان کی شاعری اسی قدر وسیع اور متنوع ہے جتنی وسیع اور متنوع یہ کائنات اور یہ زندگی ہے۔

اردو کے ادبی ارتقاء میں داغ کے دور تک تقریباً یکساں انداز میں غزل کا جادو چلتا رہا اور اس طویل مدت کو غزل ہی کا دور کہا جائے گا۔ اس کے بعد مولانا حالی، محمد حسین آزاد اور ان کے رفقائے کار نے ہمارے شعری ادب کو ایک نئی تحریک، ایک نئی ڈگر سے متعارف کرایا اور نظم گوئی کی داغ بیل ڈالی جس کو فروغ دینے اور کمالِ فن کی رفعتوں تک پہنچانے کا سہرا اقبال کے سر ہے۔ نظم نگاری کو اقبال نے پہنائی و گیرائی، عظمت و رفعت، بانکپن و کج کلاہی کی جو تابانیاں دیں وہ بڑی خیرہ کن تھیں۔ ان کے بعد اور ان کے علاوہ اردو کے بیشتر شاعروں نے نظم گوئی کے باب میں بڑے محدود ذہن کا ثبوت دیا۔ ایسا

[illegible] مقررہ اور پامال موضوعات کے سوا اور کچھ نہیں اور نہ انھیں حیات و کائنات کی [illegible] کیفیتوں اور ان کی [illegible] سے کوئی سروکار ہے لیکن نجمی اس کمزوری کا شکار نہیں۔ ان کے ذہن و فکر کی گرفت [illegible] گہری ہے اور وہ گردو پیش کی پوری زندگی نیز کائنات کی ہر رنگا رنگی کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ محض آزادی، انقلاب، مزدور اور محبوب کو موضوع سخن نہیں بناتے اور نہ انھیں پامال وادیوں میں گھر کر رہ جاتے ہیں۔ بلکہ وہ ایک ایسے آذر ہیں جو ہر نوع اور ہر رنگ کے پتھروں پر تیشہ آزمائی کرتا اور ان سے مجسمے تراش کر صنم خانہ فن کو سجاتا ہے۔ ان کا موضوعاتی کینوس کس قدر وسیع ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے ان کی "انسان اور تارا" "چراغ" "بجلی" "شاعر کا دل" "نیچرل اور [illegible]" "چلیکا" "اری کٹ" "منافق" وغیرہ جیسی نظمیں کافی ہیں۔

شاعر میں خواہ وہ کسی زبان کسی قوم یا کسی خطۂ ارض سے تعلق رکھتا ہو حسن فطرت کی پرستاری فطرتاً عام ہے۔ نجمی کی بھی بعض نظموں سے اس کا اظہار ہوتا ہے جس کے ثبوت میں ان کی دو نظمیں "چلیکا" اور "اری کٹ" پیش کی جا سکتی ہیں۔ "اری کٹ" کٹک کا ایک بند ہے جس کی تعمیر دریائے مہاندی کی موجوں کو اسیر کرنے کے لئے بروئے عمل لائی گئی ہے۔ یہ بند ڈھائی میل لمبا ہے۔ "چلیکا" ایک جھیل ہے جس کو اڑیا زبان کے مشہور شاعر رادھا ناتھ رائے نے "اپسرا بھون" کے نام سے یاد کیا ہے۔ نظم "چلیکا" کے چند بند ملاحظہ ہوں ؂

(۱)
جھیل ہے یہ چلیکا کی
یا زمیں کے دامن پہ
اک حسین ہے پانی کا
نقش ہے یہ مانی کا
سلسلہ پہاڑوں کا
رنگ سرمئی جن کا
دلفریب ہے کتنا
یہ سلوری جھالری

(۲)
اور ان کی رعنائی
جن پہ ابر کے ٹکڑے
چھا رہے ہیں کچھ ایسے
کوئی ڈال دے جیسے
عاشقان مضطر پر
عکس اپنے گیسو کا
سایہ اپنے پلو کا
؎ ؎ ؎

(۳)
سینکڑوں پرندے ہیں
جن کا یہ نشیمن ہے
یہ جزیرۂ آبی
ان کا گھر ہے آنگن ہے
سرزمین یہ چلیکا کی
مست ہر ادا جن کی
کیا ہری بھری ہے یہ
سبز اک پری ہے یہ

نجمی کی نظر میں "چلیکا" سیرگاہ بھی ہے اور صیدگاہ بھی۔ وہ کبھی اسے چشمۂ خضر کے نام سے پکارتے ہیں اور کبھی یہ ان کو ایک چھلکتا ہوا پیمانہ معلوم ہوتی ہے۔ کبھی وہ اسے ایک مرقع زرین کہتے ہیں اور کبھی اس کو دست قدرت کا آراستہ کیا ہوا نگار خانہ قرار دیتے ہیں۔

نجمی ایک آزمودہ کار اور ہنرمند شاعر ہیں۔ وہ شعر گوئی کو نہ ذریعۂ تفریح تصور کرتے ہیں اور نہ اس کو وقت گزاری کے لئے استعمال کرنے کی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ انھیں "دل بیدار" اور "دیدۂ بینا" دونوں میسر ہیں جن کی مشعل فروزاں انھیں [illegible] ہے اور راہ کے نشیب و فراز میں گم نہیں ہونے دیتی۔ ان کی شاعری ایک ایسا رباب ہے جس کے نغمات محض سرور [illegible] نہیں بخشتے بلکہ روح کو بالیدگی و بیداری بھی دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے فن کو ایک ایسی جلوہ گاہ بنا چاہتے ہیں [illegible] ۲۳)

محمد اکبر الدین صدیقی

مٹھے بچن سناؤں

گذشتہ شمارے میں مرزا بیجاپوری کے علاوہ قایم، احمدی، عبدی اور سری کا ایک ایک مرثیہ پیش کیا گیا۔ مرزا کا ایک اور مرثیہ جو چھوٹی بحر میں ہے، اب پیش کیا جا رہا ہے۔ مزید تین مرانی امامی، علی اور غلامی کے اس شمارے میں پیش ہیں۔ ان شعرا کے ناموں کا مرثیہ گو شعرا کی حیثیت سے صرف نام ملتا ہے لیکن نہ ان کے زمانے کا تعین ہو سکا اور نہ مقام کا لیکن چونکہ یہ سنہ ۱۱۰۰ھ سے قبل کے تحریر شدہ ہیں اس لیے علی عادل شاہ ثانی اور سکندر عادل شاہ کے عہد ہی کے شعرا قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ ان کا ایک ایک مرثیہ ہی اس بیاض میں شامل ہے لیکن مرزا اور علی عادل شاہ شاہی کے دو دو یا تین مراثی ہیں۔ شاہی کے مراثی اس کے کلیات میں شائع ہو چکے ہیں۔

مرثیہ مرزا

جنم یو ماتم کرو عزیزاں
یو داغ دل پر کرو عزیزاں

ماہ محرم جہاں میں آیا | عجب درد نی اگن لگایا
چھپا خوشیاں کی دلاں دلاں میں | اسی الم سوں علم اوچایا
ہزار افسوس او شاہ دیں کا | دیکھ کر زخماں سوں لہو میں نہایا
کرن کے کانٹے سورج میں جیوں ایوں | نین میں پلکاں یو غم سلایا
جگر پہاڑاں کوں گال یو غم | انجو جھرے کر سدا رولایا
حسین ابن علی کے داغاں | جلا سینے میں چمن کھلایا
بغیر انجو ہوا و ذات کا مسل | نہ یو ندا اس وقت اپنے بھی پایا

۱ دل ۲ آگ لگایا ۳ بلند کیا ۴ چھپا ۵ پگھلا کر۔ گلا کر ۶ آنسو۔ ۷ آپ خود بھی۔

بغیر از خون جگر او سرود   دو توت کچھ کربلا میں پایا!
نکوں موت کا چراغ یر تن   او ساس اس غم تھے بجھا بجھایا
بشر کے دل کوں نہ کیوں گلاوے   جو دل بھیتر کا یو غم گلایا
سینے کے صحرا میں غم یو دل کوں   سو کا پتے کر سدا رولایا
کھڑا ہے ولیاں پہ غم یو کاری   جیسے کہ جبرئیلؑ آکر بلایا
. . . . غم کیا پاتاں   . . . . نہ پایا
دنیا میں پایا یو بخت مرزا   کہ عمر اس غم میں سب گنوایا

مرثیہ امامی

نبیؐ کے نور چشماں کا خزینا   اوزین بوجھا ہے ظالم سخت سینا!
شرع غم آل پیغمبرؐ کا ملکینے   کیا ہوں دل کوں میں اپنے سفینا
جلا تن اس لعین کا جن شکستہ   کیا خاتم نبیؐ کا او نگینا!
دیکھی بابا کا جب تن سوں جدا سر   دیسے یک آہ میا نے جیو سکینا
سو اس ذات مقدس سوں دلیغا   ہوا ہے کیوں مقابل او کمینا
نبوت کے صدف کے تھے رتن دو   ہوا کربل منے ان کا دفینا
محرم میں طلب غم کی لگی ہے   مگر یو چاند ہے غم کا خزینا
فلک ایسا ستم لاکھیا روا کیوں   کہاں او سنگ کہاں او آبگینا
امامی جس او پر شہ کی نظر ہے   دو عالم میں رہے انکا قرینا

مرثیہ علی

آیا عاشورا ہے یاراں تمیں ساماں کرو   خوشی سب دل تھے سکلؑ جھاڑ کے میدان کرو
کعبہ کربل کو تمیں جان محباں ہو سکل   چھوڑ کے ہی غم کی الیس جیو کوں قربان کرو
لہو دنیاں کوں کرائی میں بجھا دل کوں اپس   لگا غم آگ کلیجے کوں سو بریان کرو

ع۱ آہیں ع۲ جدکر، نکال کر ع۳ تمام ع۴ ڈال کر۔

ایس کے دل کیرے بھرنے بھر غم کی انگار
جلانے جیو کوں ایس اس منیں تو جہان کرو

کانٹاے غم کا ایس ہات حسینا کے بدل
پیرہن پھول تمن ۱ چاک گریبان کرو

تن کے اس شہر میں کر دل کوں تخت جیو کوں چھتر
بسلا غم اس کے اوپر سب تمیں سلطان کرو

خوشی راحت کے گھراں توڑ شہیداں کے بدل ۲
بسا غم پر ڈ نگر دل کیرے اویران کرو

انجو کے نیر ۳ ستی دل کی خوشی دیو بہا
اپینے دس دیس میں ....

ثانی یوسف کے بدل سب اپنا بکدل ہوں تمام
رو رو انکھیاں کوں اندھے جیوں تمیں کنعان کرو

ایسا دو کام کیا ہے جو کینے ۴ نبیچ کیا
جینے لک لعن اوسے سب تمیں انسان کرو

سینے کے صفحے اوپر غم کے بیاں لک ۵ کو تمیں
نبی کے سامنے پڑنے اوسے دیوان کرو

صدقے حضرت کے حسینا تمیں محشر کوں اپے
علی کا نسکر تمیں اس وقت آسان کرو

مرثیہ غلامی

قلم پر جب نقاشہ کا کیا ظاہر یو غم رو رو
لکھیا تب لوح پر کر سرنگوں ایسیں قلم رو رو

بہانہ کر کے گندم کا سینے پر شہ کا غم آدم
سٹے خط عیش و عشرت کا او جنات ارم رو رو

ملایک عرش و کرسی کے اسی ماتم میں حیراں ہیں
گلن اس لوح تھے غم کے کیا ہے قد کوں خم رو رو

سکندریا کے امرت کا او شیشہ خضر کے ہات ہوں
سنے پر یو خطرشہ کا سنیا یت تھے ستم رو رو

تجیا ۱ او کرو فر شاہی کا کے خسرو ایس دل تھے
چھپیا جا غار میں بولیا اسے جب جام جم رو رو

...... منصور کے بلبل چڑھے کر خار کوں سولی
نرگس نیناں بھم ہو شبنم سات نم رو رو

شفق نیں کھن ۲ مگر ہر شام مغرب کے دکھن ۳ باراں
کیا ہے کربلا نمنے کھڑا خونیں علم رو رو

چنار اس اگ سوں اپنی جوانی کے انبردت میں
سلگ سر پاؤں لک ایسیں او کرتا ہے بھسم رو رو

ایس پر فرض ہو تا ظم بیاں غم کا سیچ دایم
غلامی ۴ کے ادب سوں مرثیہ خواں ہے جنم رو رو

---

۱ زبان ۲ طرح، اند ۳ جھاکر ۴ کے، واسطے ۵ پانی ۱ کسی نے ہرگز نہیں کیا ۲ زندگی بھر ۳ ملکہ کر ۱ چھوڑ دیا ۲ آسمان میں ۳ مغرب کی طرف ۴ با اعتبار مضمون تخلص ناظم ہونا چاہئے لیکن بیاضوں میں مرثیے غلامی عنوان دیا ہے اس لئے اسی کا اتباع کیا گیا۔ (ص)

نقد و نظر

بہادر شاہ ظفر منجو قمر یداللہی - ناشر نگاہ پبلی کیشنز - بیگم بازار حیدرآباد ۱۲ صفحات ۱۵۰ - مجلد مع گرد پوش قیمت دو روپے پچپن پیسے۔

جناب منجو قمر صاحب حیدرآباد میں ناٹک اور ڈراموں سے ہمیشہ دلچسپی لیتے رہے ہیں اور اسٹیج اور ڈرامے کی نزاکتوں سے آگاہی رکھتے ہیں ۱۹۶۲ء میں جب سارے ہندوستان میں آزادی کے رہنما سراج الدین بہادر شاہ ظفر کی صد سالہ برسی منائی گئی اس وقت بطور یادگار قمر صاحب نے یہ ڈرامہ لکھا۔ ڈرامہ کی ابتدا ناٹک کی تاریخ سے ہوتی ہے جو ۱۶ صفحات پر محیط ہے۔ اس میں مختلف ملکوں اور زبانوں میں ابتدائی ڈراموں کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان میں پہلا ڈرامہ اندر سبھا بتایا ہے۔ پھر کلکتہ' بمبئی وغیرہ میں کئی تھیٹریکل کمپنیوں کا ذکر کیا ہے۔ دکن میں بھی ڈرامہ کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔ قمر صاحب سے توقع تھی کہ وہ اس حصہ پر سیر حاصل بحث کرتے یہ بحث ابھی تشنہ معلوم ہوتی ہے شمس الدین امیر حمزہ اور ان کے ساتھیوں نے ڈرامے کے سلسلے میں اپنا جو حصہ ادا کیا ہے اس کا ذکر نہیں ہے لیکن اس مختصر سے تذکرہ میں شاید اس کے لئے گنجائش نہ نکل سکی۔

ڈرامہ صفحہ ۱۸ سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے ڈرامے کی ضروریات اور لوازمات کی تفصیل دی گئی ہے جو اس ڈرامے کو پیش کرنے والوں کیلئے مفید ثابت ہوگی۔ ڈرامہ کی ابتدا دگانوں بھیم پلاس اور شاہانہ سے ہوتی ہے اور یہ مصنف کی موسیقی دانی کی غماز ہے۔ اس کا ثبوت ڈرامے کے اختتام تک ملتا ہے۔

ڈرامہ کا زمانہ ۱۸۵۶ء تا ۱۸۵۸ء ہے ۱۸۵۷ء میں جو صورت پیش آئی اور جن لوگوں نے بہادر شاہ ظفر کے دربار میں اہمیت اختیار کی ان سب کو ان کے مراتب کے لحاظ سے پیش کیا ہے۔ اس میں تاریخ اور زبان کے اعتبار سے پروفیسر آغا حیدر حسین کی یہ رائے ہے کہ :— "تاریخ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا' مکالمہ بھی لال قلعہ کی صحیح بولی میں ہے۔

جو مغلیہ معاشرہ کا رنگ ہے' وہ بھی خوب چوکھا آیا ہے۔

ڈرامہ بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری اور رنگون بھیجدینے کی تجویز تک انتہائی تاثر کے ساتھ چلتا ہے۔ اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنی قوم کے نوجوانوں میں حب وطن اور آزادی کے شعور کی جوت جگانے کیلئے داستان کو طول دیدیا ہے اور ختامی مہ جاتی چند بود کو ان کے مولد پر سلامی دیتے دکھایا ہے۔ قمر صاحب نے ڈرامہ لکھنے میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے اور اس کو دلچسپ اور قلعہ معلی کی زبان میں پیش کرنے کیلئے کافی جرأت آزما اقدام کیا ہے توقع ہے کہ یہ ڈرامہ نہ صرف یہ کہ پڑھا جائیگا بلکہ ضیاء آزادی کو پھیلانے اور اس کو دوام عطا کرنے کیلئے جا بجا اسٹیج کیا جائے گا۔ (م - ص)

درمیلکن اس ایک نام کے مطابق واقعہ ہونے سے پوری روایت کا صحیح ہونا ہرگز ضروری نہیں کیوں کہ حدیث کے قابل وثوق مجموعوں میں بیان شدہ روایت کی کسی اصلیت کا کہیں کوئی پتہ نشان بالکل نہیں ملتا اور اگر کسی "عربی کتاب" میں اس روایت کا موجود ہونا فرض بھی کیا جائے جیسا کہ فاروقی باور کرانا چاہتا ہے، تب بھی اس کا موضوع ہونا از روئے درایت بادنیٰ تامل معلوم ہو سکتا ہے۔ یہاں اس کے بے اصل ہونے کا ذکر محض یہ یاد دلانے کے لیے کیا گیا کہ دکھنی زبان کے بہت سے "معجزہ نگار" شاعروں کی طرح فاروقی کو بھی اس کی پرواہ نہیں تھی کہ کسی شرعی حیثیت سے رسول اللہ صلعم سے جو بات منسوب کی جارہی ہے وہ صحیح ہے یا غلط افسانے میں بعض تاریخی نام لے لینا اور :-

یو کم اور زیادہ کہوں تو گناہ　　مجھے دم بہ دم فاطمہ کا پناہ

تولد نہ تھے فاطمہ کے رتن　　امام حسین و امام حسن

نبیؐ فاطمہ تھے بھی مولا علی　　روایت سنو اس وقت سو چلی

کہنا اس پر تاریخی رنگ چڑھانے اور سامعین میں اثر پذیری کے لیے معلوم ہوتا ہے۔ گو یہ بھی ممکن بل کہ اغلب ہے کہ فاروقی اور اس جیسے سادہ لوح و زود اعتقاد لوگوں نے اس قصہ کو حقیقی تاریخی واقعہ سمجھ لیا ہو۔ غرض واقعہ کچھ بھی ہو روایت کے مصنوعی و جعلی ہونے کو نظر انداز کیا جائے اور مثنوی کو دکھنی معاشرتی تاریخ کے ایک یکرنی تصویر یا شاعری کے ایک فن پارے کی حیثیت سے دیکھا جائے، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑکی کا نام محض رمز کے طور پر لایا گیا ہے۔ وہاں ہم فاروقی کی واقعاتی عکاسی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ اس نے ایک شریف و مسکین عورت کی نفسیاتی کیفیت کی ترجمانی جس فن کارانہ خوبی سے کی، وہ تو اتنی مکمل ہے کہ اس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکے گی۔

معلوم ہوتا ہے کہ فاروقی نے در اصل ایسی عورتوں کو مخاطب کیا ہے جن کے آبا و اجداد زیادہ تر فوجی و کشوری عہدے دار تھے اور اپنی ذاتی و اجتماعی روایتوں کی بنا پر پہلے معزز و ممتاز تھے مگر اب اپنے حکمرانوں کی بے راہ روی، مغلوں کے حملوں اور مرہٹوں کی یلغاروں سے پس ماندہ و پس افتادہ ہو گئے تھے۔ جیسا کہ ہر ملک اور ہر زمانہ میں ہوتا آیا ہے رسوم و آئین کی پابندی زیادہ تر متوسط الحال شریف طبقہ پر عاید ہوتی ہے اور معاشرت کے اوضاع و اطوار اسی سے قائم رہتے ہیں۔ اس طبقہ کے افراد کو اپنی معاشرتی ذمہ داریوں کا احساس بھی عموماً نہایت شدید ہوتا ہے۔ یہ لوگ ایسے فرو مایہ نہیں ہوتے کہ کسی تقریب میں محض تماشہ دیکھنے کے لیے گھس جائیں اور نہ ایسے ندیدے ہوتے ہیں جو بریانی کی خوشبو سے میزبان کے گھر کا پتہ لگالیں، شرم و حیا، سنجیدگی و وقار، تحمل و بردباری ان کی نمایاں خصوصیتیں ہوتی ہیں۔ یہ اپنے معاشرتی درجہ و مرتبہ کو بہر حال قائم رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ تہذیبی حیثیت سے مرفہ الحال لیکن معاشی حیثیت سے پس ماندہ خاندانوں کو زائد اخراجات کا بار سخت آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی پُر مسرت تقریب میں کیوں نہ ہو۔ ہندوستان کے انتہائی سرمایہ دارانہ خصوصاً سترھویں صدی عیسوی کے زوال پذیر جاگیری

...حویلی کے ... اکثر پیش آتی ہیں مگر دکھنی سلطنتوں کے دور زوال میں اس نے جو صورت اختیار کی ہوگی اس کا اندازہ کرنا زیادہ دشوار نہیں۔ اس زمانے میں پرانے پرانے معزز و باحیثیت دکنی گھرانے جس نادار ہو گئے تھے اسی تناسب سے ایسے ہی نئے نئے گھرانے ان کی جگہ نہیں لے رہے تھے۔ شمال کے متکبر و مغرور ... کی نظر میں محض خود ولے آفاقی تھے۔ ایسے اجتماعی ماحول میں شریف و نجیب اور پابند رسوم و آئین مگر معاشی حیثیت سے پسماندہ و آفت زدہ عورتوں کو شادی کی رسموں کے موقعوں پر جن آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہوگا اس کا مشاہدہ و تجربہ اس بیسویں صدی کے نصف آخر میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ بیچارے فاروقی اور اس جیسے بے شمار لوگوں کے یہاں ایسا عورتوں کو ان موقعوں پر دلاسا دینے کے لئے اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ انھیں ان کی برگزیدہ شخصیتوں کی ایسی آزمائشیں یاد دلائی جائیں جو کچھ اسی طرح کے حالات میں پیش آئی تھیں اور اسی طرح ان کی اشک شوئی کی جائے۔ اس غرض کیلئے محبتی کی طرح فاروقی نے بھی ایسا قصہ منتخب کیا ہے جس کا مرکزی کردار سیدہ فاطمہؓ جیسی شخصیت ہے جو سنیوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر ہونے کی وجہ سے اور شیعوں میں اس سے زیادہ تر سیدنا حسینؓ کی والدہ ہونے کی وجہ سے غیر معمولی مقبولیت رکھتی ہیں۔ بیجاپور و گولکنڈہ کی عام مذہبی حالت کے اعتبار سے ایسی ہی شخصیت ضروری بھی تھی جو نہ صرف سب مسلمانوں کے لئے بلکہ غیر مسلموں کے لئے بھی جاذب توجہ ہو۔

محبتی کی مثنوی دیکھنے کے بعد فاروقی کی مثنوی پر نظر ڈالنے سے باسانی اندازہ ہو جائے گا کہ اول الذکر کی طرح اس نے حمد و نعت و منقبت وغیرہ سناتے ہوئے سامعین کا زیادہ وقت لے کر ان کے تحمل کا امتحان نہیں لیا بلکہ چند تمہیدی ابیات کے بعد اصل موضوع پر اپنی توجہ منعطف کر دی اور اس طرح اس حسن تناسب کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا جو مثنوی کی خوبی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور جس کو پیشہ ور مثنوی نگار اکثر نظر انداز کر جاتے اور ذرا سا موقع ملنے ہی ایک عدہ وعظ کر دیتے یا تصوف چھانٹنے لگتے ہیں۔ اس سے عام قاری اکثر اکتا جاتا ہے اور قصہ سے اپنی دلچسپی باقی نہیں رکھ سکتا حالانکہ اس بے محل کلام سے خود مصنف کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے اور لوگ جو اس قسم کے قصوں سے غیر محسوس طور پر عبرت و نصیحت حاصل کر سکتے تھے مصنف سے کبیدہ خاطر ہو کر اس پر ملامت کرنے لگتے ہیں۔

قصہ کا اختتام بھی فاروقی نے بڑے خوش گوار طریقہ سے کیا ہے۔ اس نے محبتی کی طرح قصہ کو یک لخت اس طرح ختم نہیں کر دیا کہ سننے والے کا اشتیاق باقی رہے اور وہ ایسا محسوس کرنے لگے گویا آخری نوالہ لینے اور پانی پینے سے پہلے ہی اس کو دسترخوان پر سے اٹھ جانا پڑا۔

مثنوی کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فاروقی کی مخاطب اسی مرکب تہذیب کی پروردہ خواتین ہیں جو صدیوں کے بین الملی و نسلی امتزاج سے وجود میں آئی تھی اور جو بجا طور پر دکھنی تہذیب کہلاتی تھی۔ چنانچہ یہ شادی کے گھر سے رخصت نہیں بھجوائے جاتے کیوں کہ دکھن میں رقعے مردانی دعوت کے لئے ہوتے ہیں۔ ...

[illegible] نہیں جاتی ہو اور چونکہ دعوت زنانہ کی گئی ہے اس لئے صرف دو دائیاں [illegible] بھیجی جاتی ہیں جو زنانے ہی میں آتے جاتے رہنے کی وجہ سے عورتوں کے لئے اجنبی نہیں سمجھی جاتیں۔ دائیاں [illegible] کے آداب اور اس کے رکھ رکھاؤ سے بھی بخوبی واقف ہوتی ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ سیدہ کی خدمت میں الائچی پیش کر کے عرض کرنا کہ :-

شادی کا کام ہے بار بار نہیں ہوتا۔ آپ ہماری سگی اور سعدنی ہیں اس لئے اس کو اپنے گھر کا کام سمجھئے اور تشریف لا کر شادی سرانجام کیجئے۔ اگر آپ نہیں آئیں گی تو ہماری جگ ہنسائی ہوگی اور سعد ونزدیک کے مہمان طعنہ دیں گے کہ دیکھو جن سے شادی کی رونق تھی وہ گھڑی سواری بھی نہیں آئیں۔ غرض الائچی قبول کرنے پر آمادہ کرنا لیکن الائچی قبول نہ کرنا اور واپس پھیر دینا دعوت رد کرنے کی علامت ہے۔ ———— تو یہ دائیاں سیدہ کی شخصیت کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے آپ کے قدموں کو بوسہ دیتیں اور الائچی پیش کر کے شرکت شادی پر آمادہ کرتی ہیں۔ سیدہ فرماتی ہیں۔ میرے شوہر آنے پر ان سے مشورہ اور اپنے والد سے اجازت لوں گی ان کی اجازت کے بغیر نہیں آسکتی۔

شاعر نے سیدہ کے جواب میں آپ کی دین داری نیز شوہر اور باپ کے فرقِ مراتب کا اظہار جس خوبی سے کیا ہے قابلِ ملاحظہ ہے۔ کہتا ہے :-

دیئے فاطمہؑ نے ان کو جواب ۔۔۔ یہ بیٹی کی شادی کا کر آنا ثواب
نہیں گھر میں خاوند گئے ہیں شکار ۔۔۔ وہ آویں تو ان سے کروں میں پکار
رضا لیوں بابا سے میں عرض کر ۔۔۔ حکم ان کا مجھ کو ہے فرض تر

اور اگر وہ اجازت نہ دیں تو "رضا بن ان کے کیوں آؤں کنا"۔ پھر یہ فرما کر دائیوں کو رخصت کیا کہ [illegible] کہو میری طرف سے دعا اور سلام تم کل صبح آؤ اور اس دم یہ آنے نہ آنے کا لیجو جواب۔

دائیوں کے رخصت ہو جانے کے بعد سیدہ کو طبعاً یہ خیال ستانے لگا کہ ضیافت میں اللہ سرداروں کی عورتیں جمع ہوں گی۔ سب لمبے لمبے لباس سر سے پاؤں تک گہنے میں لدی ہوئی ہوں گی ہیں ایسی محفل میں [illegible] وہاں میرا ہم تو دق وہم ورد [illegible] کوئی ہوگا نہیں سب دینِ جاہلیت کے پیرو ہوں گے۔ میں ان میں کس طرح [illegible] وہ تو مجھے دیکھ کر اور اینٹھے اکڑنے لگیں گی، خدا کرے [illegible]۔ یہ بابا رضا نہ دیئے تو بھلا کہ اس [illegible] جاؤں۔ خدا کرے [illegible] یہ خاوند جانے کو کرنا کلاٹ تا کہ [illegible] کی نوبت نہ آئے۔

[illegible] کی طرح لڑکیاں ابھی خاص شائستہ عورتوں کی طرح بھی سیدہ شادی میں شریک ہونے [illegible] پایا [illegible] کے لئے شوہر یا والد [illegible] اجازت [illegible] ان کے [illegible] کی چیز بھی بہت [illegible] ہیں۔ [illegible] ان سے [illegible]

بیٹی اللہ ہی سے رجوع نہ ہوتیں تو کس سے ہوتیں۔ بار بار عرض کرتی ہیں یا اللہ! تو ہمارے فقر و فاقے کو ظاہر نہ کر مجھے میرے مجرے ہی میں رکھے تو بہتر ہے۔

دوپہر تک سیدہ اسی طرح فکرمند بیٹھیں' اللہ سے رجوع تھیں کہ شوہر داخل ہوئے بیوی کو دل گیر و ملول دیکھا پوچھا، کہو کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے۔ میں شب و روز تمہارے ساتھ ہوں' رسول اللہ ہمارے سرتاج ہیں اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ اللہ تم پر مہربان ہے پھر یہ دل گرفتگی کیوں؟ کہئے کیا بات ہے؟ کیوں آزردہ ہو؟

سیدہ نے دائیوں کے آنے اور دعوت پہنچانے کی اطلاع دی پھر پوچھا: —

سو اس بات پر کیا تمہارا امر　　　کہو جاؤں کر یا نکو جاؤں کر؟

یہ سن کر سیدنا علیؓ بھی شاید سوچ میں پڑ گئے۔ اجازت دیں تو بیوی کی سبکی کس طرح گوارا کریں؟ منع کردیا تو کیا عذر کریں نیک کام ہے تعاون علی البر ضروری ہے۔ مناسب یہی معلوم ہوا کہ رسولؐ اللہ کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے چناں چہ فرمایا ع تمہاری رضا ہے محمدؐ کے ساتھ۔ اس لئے —

رضا جائز کر کئیں محمدؐ رسول　　　جو کچھ او کہیں سوچ میں بھی قبول

ع: — سو ایسے میں حضرت کا آنا ہوا' سیدہ نے دعوت کا ذکر کیا اور عرض کی —

سو اس باب میں حکم کیا ہے کہو　　　کرو حکم جاؤں نہ جاؤں رہوں

(یہاں بھی طرز تخاطب کا فرق قابل توجہ ہے) آپ صلعم نے فرمایا! عبداللہ کے گھر جاؤ اور ع کرو جا کو شادی تمہیں سربسر۔ سیدہ نے عرض کیا۔ بابا! کپڑا لتّا یا زر زریۃ نہ سہی ع یہ ہدیہ لجانے اچھے کچھ تو بھی۔ آپ صلعم نے وہی جواب دیا جو آپ صلعم کو دینا چاہیئے تھا۔ وَمَا لَنَا اَلَّا نَتَوَکَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدَانَا سُبُلَنَا ط بیٹی! —

نکو فکر اس بات کا تم کرو　　　توکل سو اپنے خدا پر دھرو

اس جواب سے سیدہ کو بڑی فکر دامن گیر ہوئی۔ بیٹی اپنے باپ سے شکوہ نہ کرتی تو کس سے کرتی بار بار کہتی تھیں ع یہ بابا رضا جائز کر کیوں دیئے؟ بہر حال باپ کا کہنا حکم کا درجہ تو رکھتا ہی تھا چہ جائیکہ وہ رسول بھی ہو مجبوراً آنگ پر ہی کا کرتا دھونے بیٹھ گئیں۔ کرتا بھی کیسا؟ ع نہ تھا جائے پیوند یوں تھا کہن! بہرحال جیسا کچھ ہوسکا دھو یا لیکن حال یہ تھا کہ —

یہ دھو پیرہن کو سکاتے اتھے　　　کہ انجواں سوں غم کے بھگاتے اتھے

اور زبان پر یہی ورد تھا کہ اے پاک پروردگار! مجھے دشمنوں میں شرمسار نہ کر ع ترے بن مجھے کوئی ہیں جگ منے۔ مرا دکھ سوا تیرے کس سے کہوں؟ غرض اس طرح رات گزری' نور کا تڑکا ہوا آپ بیدار ہوئیں سنت و فرض ادا کئے۔ سورج نکلا تو دعوت کا خیال آیا خیال آتے ہی پھر آپ سجدہ ریز ہوگئیں۔ بہت دیر کے بعد سر اٹھایا تو کیا دیکھتی ہیں۔ پانچ حوریں دست بستہ کھڑی ہیں۔ پوچھا کیسا آنا ہوا؟ جواب ملا۔ اللہ نے ہمیں آپ کی خدمت کے لئے

رعا کیا ہے۔ ہمارے ساتھ کئی طبق ہیں، طبق میں آپ کے غسل کا سامان ہے، پوشاک زر زرینہ اور سکے ہیں اٹھئے غسل فرمائیے، کپڑے بدلئے، عطر لگائیے اور تشریف لے چلئے۔

صبح ہوتے ہی عبداللہ کی بھیجی ہوئی دائیاں بھی ڈولی لئے ہوئے حاضر ہو گئی تھیں مگر حوروں نے انھیں یہ کہہ کر پرے ہٹا دیا کہ کہاں تم سیاہ رو کہاں یہ شرف۔ پھر خود ہی سجی سجائی ڈولی لائیں، اعلان کر دیا گیا کہ ؎

یو گرشہ کئے شہر اور دار میں　　نہ کوئی مرد اچھے کوچہ بازار میں

سارے شہر میں دھوم مچ گئی کہ خاتون جنت عبداللہ کے گھر تشریف لے جا رہی ہیں۔ چنانچہ آپ سینکڑوں ہزاروں حوروں کی جلو میں میزبان کے مکان پر آئیں۔ صدر محفل میں رونق افروز ہوئیں، ادھر ادھر ایک نظر ڈالی اور کڑک کر کہا: ـــ

کہاں ہیں مشرکوں کی عورتیں جو مجھے حقیر گردانتی تھیں، ذرا سامنے تو آئیں۔ جو مجھے اپنے پاس بٹھانا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ کب آئیں گی؟ کہاں گیا ان کا وہ زر زرینہ جس پر انھیں اکڑ فوں تھی غدا کو بھولی ہوئیں، دنیا پر پھولی ہوئیں ذرا میرے سامنے تو آئیں۔ اپنی ہستی پرستی کرنے والی کسی کا اتنا جی ہے کہ مجھ سے نظر ملا کر بات کر سکے؟

یہ سننا تھا کہ حاضرین میں ہل چل مچ گئی۔ کچھ عورتیں تو شرمندہ ہو کر فوراً ہی سامنے سے ہٹ گئیں۔ بہت سوں نے حجروں میں منہ چھپایا، بہت سوں کو کہیں اور جگہ نہیں ملی تو ؎

کتیاں جا کو سنڈاس میں منہ چھپائیں　　کتیاں جا کو موری میں اپ سر ڈھائیں

اور جو ذرا ڈھیٹ تھیں کھڑی رہیں مگر دہشت کے مارے زرد پڑ گئیں۔ کچھ ایسی بھی تھیں جو اپنی بدبختی پر پچھتاتی ہوئی رونے لگی تھیں۔

ملحوظ خاطر رہے کہ سیدہ فاطمۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ضرور تھیں مگر بہرحال عورت تھیں جذبات رفتہ پیرزال نہیں تھیں۔ خواہشات کو فنا کر دینا جذبات کو مٹا دینا ان کا مقصد تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ صرف ان کو اپنے حدود میں رکھنا ہی انسان کا کمال ہے اس لئے یہ خیال نہ فرمایئے کہ سیدہ کو تن زیب کپڑوں کی خواہش ہونی چاہئے تھی اور نہ زیور کی یہ چیزیں تو عورت کی سرشت میں داخل ہی ہیں لہٰذا ان کے میسر نہ ہونے پر سیدہ کا دل گیر ہونا ہرگز بے محل نہیں بلکہ عین مطابق فطرت ہے۔ الغرض یہاں یہ دیکھنا ہے کہ شادیوں میں شرکت کے موقعوں پر ایک معتدل مزاج شریف و مسکین مگر غیور و خود دار عورت سے جن جذبات کا عادتاً اظہار ہوتا ہے شاعر نے ان کی ترجمانی کا فن کارانہ حق ادا کیا ہے یا نہیں۔

سیدہ فاطمۃ نے محفل میں صدر نشین ہو کر جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بھی ایسے ہی طبعی و فطری ہیں جو ایک معتدل مزاج انسان کے ہونے چاہئے اور جو دنیا میں تو انسان ہے ہی آخرت میں بھی انسان ہی رہتا ہے۔ کیا حج

[illegible] بھی پیش نظر رہیں جن کا ترجمہ ہے جو لوگ مجرم (بدباطن) تھے وہ ایمان والوں پر [illegible] [illegible] کے ایمان دار ان کی طرف سے گزرتے تو یہ کور باطن آپس میں ایک دوسرے کو آنکھوں سے [illegible] اور جب [illegible] وں (اپنے لوگوں) میں ہوتے تو وہاں بھی ایمان داروں کا ذکر نکال کر استہزا کرتے ..... [illegible] آج [illegible] ایمان والے ان کافروں پر ہنستے ہوں گے (قرآن ۔ سلسلہ سورت ۸۳ شمار آیات ۲۹ تا ۳۴) لہٰذا کبھی کو یہ خیال نہ ہونا چاہئے کہ سیدہ نے آخرت فراموش عورتوں پر جو فقرے کسے وہ آپ کی شان سے بعید یا بے محل تھے [illegible] بات [illegible] بھی سرسری نہ سمجھئے کہ آپ نے جو کچھ فرمایا اگرچہ وہ فطرتاً عورتوں کے مزاج کے موافق اور مقتضائے حال کے مطابق تھا مگر سیدہ فاطمہؓ کی ساری زجر و توبیخ کا حقیقی مقصد سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ [illegible] مال و دولت پر ریجھئے بلکہ مٹنے والے کبھی بے نواؤں اور فقیروں کو حقیر و ذلیل نہ سمجھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اویر یا سویر بہر طور نوازنے والا ہے اور اتنا اور ایسا نوازنے والا ہے کہ دنیا داروں کو اس کا شان و گمان بھی نہیں۔ اس لئے آپ نے اپنی تقریر کا رخ جلد ہی دلہا دلہن کی طرف پھیرتے ہوئے بڑی دل سوزی سے فرمایا ؂ کہو کیا تمہارا یہ ایمان ہے۔ یہ بول رسول اللہ کی بیٹی کے دل سے نکلے تھے دونوں کے دل میں بیٹھ گئے۔ اور اپنا اثر دکھایا چناں چہ ؂۔ شو عادوس دونوں کہے یک بران۔

خدا ایک برحق محمدؐ رسول — یہ اُمت تمہاری کرو تم قبول

شادی تو ہو رہی تھی حقیقی شادی اسی وقت ہوئی۔ آپ نے دونوں کو حوروں کی لائی ہوئی پوشاک پہنائیں عقد ہوا پھر آپ میاں بیوی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت بن لے آئیں اور ؂

شو عادوس دونوں کو کر سرفراز — شفقت کئے ان پو عالی جناب

ہوئے شاد اصحاب یاراں تمام — نبی پر پڑھو سب درود و سلام

اس خوش انجامی کی داد دیتے ہوئے توقع ہے کہ آپ نے شاعر کے اس ماہرانہ توازن کو نظر انداز نہیں کیا ہوگا جو اس نے سیدہ کی عام نسوانی حیثیت اور بنتِ رسول ہونے کی حیثیت میں برقرار رکھا ہے۔ مضامین کے خوش گوار تناسب کے ساتھ ساتھ شاید یہی اس مثنوی کی سب سے زیادہ نمایاں خوبی ہے۔

باوجود ان خوبیوں کے یہ بھی واقعہ ہے کہ مصنف ایک آدھ جگہ اپنے بیان میں توافق نہیں پیدا کر سکا یا ایسا بے جان مبالغہ کیا ہے جو مربکا بے معنی سا معلوم ہونے لگتا ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ سیدہ کی سواری نکلتے وقت ؂

کئے حکم یوں شہر پر یک اوّل — گھراں سوں چلے مرد۔ سارے نکل

ایسا ہونا اس زمانے کے حالات میں کس طرح ممکن تھا؟ پورے شہر سے نہیں بلکہ سیدہ کے گھر سے شہزادی کے گھر تک مردوں کو ہٹایا جاتا تو ایک بات بھی تھی اور پھر جب سب مرد باہر کر دیئے گئے تو یہ محفل میں [illegible]

[illegible] سے نسخوں میں یہاں صرف ایک بیت خفیف اس طرح پڑھی جاتی ہے۔

یہ سُن کو عبداللہ گیا تلملا ؛ ہوا جل کو ہوں جیوں کہ کالا توا

تو پورا بیان ہی نکل جاتا۔ یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ پانچ حوریں تو خیر حق پاک کی روایت سے [illegible] کے ساتھ یہاں سو حوریں کیا معنی ؟ کیا پانچ ضرب پانچ پچیس حوریں اور ساز و سامان کے اتنے ہی طبق یا [illegible] تھے یہ پچیس سو حوریں اور ہر ایک کے سر پر ایک طبق جملہ ڈھائی ہزار طبقوں میں سامان کا انبار کیوں ؟ [illegible] کیا ہوا کسی شک انتشار کا قائل ہوا۔

ان معمولی استفام سے قطع نظر مثنوی کی معنویت اور اس کے مقصد کے متعلق دکنی تہذیب کی تاریخ کا طالب علم بار بار یہ پوچھتا ہے کہ گو یہاں جبرئیل کو چوب داری کے لئے نہیں گھسیٹا گیا لیکن بنت رسول کی برتری و [illegible] کیا واقعی حوروں کی محتاج تھی ؟ کیا ایمان کی قوت اور عمل کی عظمت کافی نہیں تھی ؟ کیا فاستانہ مجھ جارے سے [illegible] کے بچو مومن کی کشتی پار نہیں کر سکتے تھے ! بےچارہ فاروقی ان سوالوں کا جواب سوائے اس کے اور کیا دے [illegible] حق بیان کرنے کے لئے جب آپ کے ممدوح بھی اعتراف عجز کرتے ہیں کہ [illegible] نہیں ہے باوہ و ساغر [illegible] کی بےثباتی بتانے کے لئے میں نے حوروں سے مدد لی تو کیا حرج ہوا ؛ کل حزب بما لدیہم فرحون اور کچھ نہیں تو یہ سے اور اپنے زمان و مکان کے فرق کو تو ملحوظ رکھئے اور میری معذرت قبول فرمائیے۔

فاروقی کی مثنوی پانچ مختلف مخطوط نسخوں کے مقابلہ و مقارنہ کے بعد مرتب کی گئی ہے۔ ان پانچ نسخوں کے [illegible] اوصاف مختصراً یہ ہیں :-

الف۔ یہ نسخہ میرے کرم فرما جناب عنایت الحقیت صاحب صدیقی نے مستعار عنایت فرمایا تھا۔ اس نسخہ پر کوئی ترقیمہ نہیں ہے خط نسخ نما اور کاغذ قدیم ہے۔ اس میں جملہ صرف ایک سو ستانوے ابیات ہیں۔

ب۔ مختاریہ (سالار جنگ) (۷) ہاشمی مرحوم نے اپنی فہرست میں اس کے ترقیمہ کا صرف خلاصہ [illegible] فرمایا ہے۔ پورا ترقیمہ وعن یوں ہے :-

تمت الکتاب روایت خاتون معجزہ روز پنجشنبہ بتاریخ سات ویں ماہ شہر رجب المرجب [illegible]
خصوم یافت این روایت چاند صاحب بجہت نسبت برجوی کاتب الحروف میراں صاحب [illegible]
جانشین اولاد فضل [illegible] مقام [illegible] تمت تمام شد۔

ج۔ ادارہ ادبیات اردو (۵) یہ نسخہ الف سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے دونوں کی املائی غلطیاں قریب قریب مشترک ہیں۔

نسخہ ب کی آخری [illegible] بیت یا کسی اور نسخوں میں موجود نہیں ہے۔ [illegible] اس نسخہ کے [illegible]

کیا میں شروع یہ روایت نقل — کر لکھتا ہے خوش خط لکری نیچل

سے بھی اس ظن کی تائید ہوتی ہے۔
اس نسخہ کے دو سو اٹھارویں شعر کے مصرعہ ثانی کر عاجز بندہ ہے نبیؐ کا غلام، سے ہاشمی مرحوم نے "عاجز" کو شنوی
کا مصنف سمجھ لیا ہے جو صحیح نہیں ہے کیوں کہ اس سے پہلے دو سو بارھویں شعر میں "خاور تیا" بغیر کسی دشواری کے صاف

پڑھا جاتا ہے۔
ڈاکٹر زور مرحوم نے "خاور تیا" کو "قادر" پڑھا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ ادارہ کے نسخہ میں تخلص والے مصرع کی کتابت
اس طرح ہے "اے مارتنا بول صبح شام" اصل یہ ہے کہ "قادر" کا راءے مہملہ اور "تو" ثبت ہونے سے رہ گئے ہیں اور مصرع
ناموزوں ہو گیا۔ ناقل فہرست نگار نے مصرع کو موزوں بنانے کے لیے "اے قادر ثنا بولنا صبح شام" بنا دیا ہے۔ جس
وقت ادارہ ادبیات اردو کے مخطوطوں کی پہلی فہرست مرتب ہوئی (۱۳۶۳ ہجری) اس وقت اس مثنوی کے دوسرے نسخوں
کا پتہ نہیں لگا تھا اس لیے ایسی غلطی پر کسی کو تعجب نہ ہونا چاہیے۔

د:- کتب خانہ آصفیہ نشان ۴۷۷۷۔ جدید۔
کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات کی فہرست شائع ہونے کے بعد جن مزید (اردو) مخطوطوں کا پتہ لگا انھیں میں
یہ مخطوطہ بھی شامل ہے۔ اس میں جملہ نو ورق اور تعداد اشعار ایک سو پچانوے ہے۔ ہر صفحہ پر کہیں بارہ اور کہیں تیرہ
سطریں ہیں۔ خط نسخ نما شکستہ لیکن پختہ۔

اس کا ترقیمہ یہ ہے :—

(۹) ۱۲۶۲ھ۔ تحریر فی التحریر راقم حسن علی شاہ شانور در مقام
تاریخ۔ بتاریخ ماہ چراغان بندہ نواز ششم بیس دیں ۱۲۶۲ھ۔ تمت تمام شد
محمد خاں

س:- کتب خانہ آصفیہ۔ نشان = ۴۷۵۱ - جدید۔
تعداد اوراق نو۔ تعداد سطر فی صفحہ تیرہ اور تعداد ابیات دو سو تین۔ نہایت غلط، خط صاف لیکن خام۔ اس کے
ساتھ تین اور نظمیں بھی ہیں جن کے عنوان مچھلی نامہ، چکی نامہ اور بیان تنبولی کی دوکان ہیں۔
انھیں مخطوطوں میں شامل ہے جو فہرست ہاشمی کی اشاعت کے بعد دریافت ہوئے۔ اس کا قصہ طویل
ترقیمہ درج ذیل ہے :—

تمت تمام شد کار من نظام شد
دیول آجا رشد سعد تیار شد

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء فون - ۳۵۲۰۹
جلد ۲۹ شمارہ ۷
جولائی سنہ ۱۹۶۶ء

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

نگران
پروفیسر سید علی اکبر

مجلس مشاورت
میر حسن ۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ۔ من راج سکسینہ

معتمد
محمد اکبرالدین صدیقی

مہتمم
محمد جمال الدین

منتظم
وقار خلیل

زر سالانہ چھ روپے غیر ممالک سے دس روپے
ششماہی تین روپے فی پرچہ پچاس پیسے

مہتمم ادارہ ادبیات اردو کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد ۴ سے شایع ہوا

نقد و نظر

اپنی بات

جون کا سب رس مئی کے آخری ہفتے میں پریس میں تھا کہ حضرت نیاز فتح پوری کے انتقال کی اطلاع ملی۔ نیاز نے ۲۴ مئی کو کراچی میں ۸۰ سال کی عمر میں رحلت کی انہوں نے اپنی ساری زندگی ادب کی خدمت کرتے ہوئے گذاری ویسے ابتداً تو محکمۂ پولیس کی ملازمت اختیار کی لیکن جلد ہی اس سے کنارہ کش ہوگئے اور بھوپال سے اپنا رسالہ "نگار" جاری کیا۔

ڈاکٹر زور مرحوم نے اپنے ابتدائی تنقیدی مضامین نگار میں اشاعت کیلئے بھیجے نیاز مرحوم نے ان مضامین کی ضرورت پر زور دیا انہیں سراہا اور بڑی حوصلہ افزائی کی۔ ڈاکٹر زور مرحوم کے یورپ جانے تک ان کے مضامین نگار میں چھپتے رہے ہیں۔

نیاز جب حیدرآباد آئے تو ان سے میں نے ہوش بلگرامی کے دولت کدہ پر ملاقات کی اور خواہش کی کہ وہ اپنے خیالات سے کالج کے طلبا کو استفادہ کا موقع دیں۔ نیاز نے بڑی شان بے نیازی سے فرمایا کہ "میں جو کچھ لکھتا ہوں وہی پڑھئے۔ میں مقرر نہیں کہ تقریریں کرتا پھروں" ان کے لب و لہجہ میں تحکمانہ انداز بھی تھا اور کبر و نخوت کی جھلک بھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ادب برائے ادب کی ترجمان "نگارستان" اور "جمالستان" کا مطالعہ بڑی دلچسپی سے کیا جاتا "شہاب کی سرگذشت" راتوں کی نیند اڑا دیتی اور پڑھے لکھے لوگ علم فراست الید لیکر اپنے ہاتھ کی لکیریں گھورتے بیٹھتے۔ غرض نیاز کی تحریریں طلبا کے ذہنوں پر چھائی ہوئی تھیں۔

جب نیاز کے خیالات سے مذہبی تصورات کو ٹھیس پہنچی تو حکومت حیدرآباد نے نگار کا داخلہ ممنوع قرار دیا اور بہت دن تک نیاز کی تحریریں پڑھنے کے لئے لوگ ترسا کئے کچھ دن بعد نگار پر سے پابندی برخواست ہوئی لیکن مذہبی ماحول میں پرورش پائے ہوئے قاریوں نے انہیں زیادہ کشش محسوس نہ کی۔ اب نیاز کی تحریریں ادبی چاشنی کی خاطر پڑھی جانے لگیں۔ وہ خطوط بھی مرکز نظر تھے جو فرضی محبوباؤں کے نام لکھے گئے یا بعض مرد نیاز کی محبوبہ بن کر خط لکھتے رہے ان میں سے ایک سے مجھے بھی نیاز حاصل ہے۔ نیاز جب حیدرآباد آئے تو یہ راز ان پر بھی منکشف ہوا تھا۔ باب الاستفسار نے بھی دلکشی کے سامان فراہم کئے نیاز کی معلومات پر لوگ عش عش کر اٹھتے۔ "من و یزداں" نے غور و فکر کی دعوت دی۔ نیاز کے خیالات نے کسی کو قایل کیا اور کوئی منحرف بھی رہا۔ غرض اردو دنیا نیاز کے علم و فضل سے ہمیشہ مستفید ہوتی رہی۔ نگار نے اپنے رف کاغذ اور بے جاذبۂ کشش ٹائٹل کے ساتھ وقت کی پابندی اور ہر دلعزیزی کا جو مظاہرہ کیا وہ ہماری صحافت میں یادگار رہے گا۔

اب ادب و انشا کے وہ سوتے خاموش اور اسلوب کا ایک خاص انداز ختم ہوچکا ہے۔ رہے نام اللہ کا

گذشتہ جون کے شمارہ میں "چند دکھنی مثنویاں" کا سلسلہ شایع ہوا ہے مجھے افسوس ہے کہ اس میں آخری شعر جو مخطوطہ کے ترقیمہ کا ہے ترتیب کے وقت حذف کئے جانے سے رہ گیا۔ قارئین اس سلسلے کا آیندہ انتظار نہ فرمائیں۔

میر محمود حسین ام اے لکچرار فارسی
شعبہ تحقیق اردو جامعہ میسور۔

علامہ اقبال کی داستانِ دکن

ٹیپو سلطان شہیدؒ کے روضے پر دو ڈھائی گھنٹے مراقبہ کرنے کے بعد علامہ اقبال گنبدِ سلطانی سے باہر نکلے تو شدتِ گریہ سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور سوج گئی تھیں، کچھ دیر صحن گنبد میں بنگلور اور میسور کے عمائدین کے ساتھ تشریف فرما رہے۔ میسور کے درباری موسیقار علی جان صاحب مرحوم نے ساز پر نہایت دل گداز انداز میں کلامِ اقبال سنایا تو پھر اشکباری کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ حاضرین پر بھی رقت طاری ہو گئی، علی جان صاحب یہ کیفیت دیکھ کر گھبرا گئے اور گاتے گاتے رک گئے تو علامہ نے بڑے اضطراب کے عالم میں کہا "کیوں رک گئے" "خدا کے لئے جاری رکھو"۔ علی جان صاحب گاتے رہے اور علامہ آنسو بہاتے رہے، گانا ختم ہوا تو میسور کے مشہور و معروف قومی کارکن محمد اباسیٹھ نے آپ سے پوچھا کہ آپ نے روضہ سلطان شہید میں اتنی دیر مراقبہ فرمایا ہے، ہمیں بھی بتلائیے کہ آپ کو وہاں سے کیا فیض حاصل ہوا اور کیا پیغام ملا۔ علامہ نے جواب دیا کہ وہاں میرا ایک لمحہ بھی بے کار نہیں گذرا۔ ایک پیغام یہ ملا ہے ؎

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست　　　ہم چو مردان جان سپردن زندگیست

یہ شعر اسی عالم میں مرتب ہوا ہے۔

میسور سے واپسی کے بعد علامہ نے اس پر اور چار شعر اضافہ کئے اور یہ قطعہ بنا دیا۔

آتشی در دل دگر بر کردہ ام　　　داستانی از دکن آوردہ ام
در کنارم خنجر آئینہ فام　　　کشتم او را بند در تیغ از نیام
نکتہ گویم ز سلطانِ شہید　　　زان کہ ترسم تلخ گردد لعد عید
پیشتر رفتم کہ بوسم خاک او　　　تا شنیدم از مزار پاک او

در جہاں نتوان اگر مردانہ زیست
ہمچو مردان جان سپردن زندگیست

یعنی میں دکن سے ایک داستان لایا ہوں جس نے میرے دل میں ایک نئی حرارت پیدا کر دی ہے۔ میرے پہلو میں آئینے کا سا ایک چمکدار خنجر ہے جسے میں دھیرے دھیرے نیام سے نکال رہا ہوں۔ سلطان شہید کے واسطہ

یا اُن سے پایا ہوا ایک نکتہ بیان کئے دیتا ہوں، مجھے ڈر ہے کہیں عید کی مسرتوں میں تلخی کا رنگ نہ بھر جائے میں ان کے مزار کو بوسہ دینے کے لئے وہاں تک گیا تو ان کے مزار پاک سے ندا آئی کہ زندگی دنیا میں مردوں کی طرح جینے کا نام ہے یا ایسا نہ ہو سکے تو مردانہ وار جان قربان کر دینا حیات جاودانی ہے۔

یہ قطعہ علامہ اقبال کے کسی مطبوعہ مجموعہ کلام میں شامل نہیں، نہ مکاتیب اقبال میں کہیں اس کا ذکر ملتا ہے، البتہ تاریخ سلطنت خداداد کے مصنف محمود خان محمود بنگلوری نے اپنی مشہور آفاق تصنیف میں اس کا ذکر کیا ہے اور شہاب یزدانی بنگلوری نے اپنے گلدستے میں اسے شامل کیا ہے جو چند سال قبل بارگاہ ٹیپو کے نام سے بنگلور سے شائع ہوا تھا۔ ماہنامہ برہان دہلی کی اشاعت برائے دسمبر ۱۹۷۶ء میں عابد رضا بیدار صاحب، رضا لائبریری رام پور نے "جوئے کہستاں کی موج رواں، اقبال کے کچھ غیر مرتب نوادر" کے عنوان سے علامہ اقبال کے کچھ غیر مطبوعہ مکاتیب پیش کئے ہیں، ان میں سے ایک مکتوب میں یہ قطعہ بھی درج ہے، بیدار صاحب کا قیاس ہے کہ یہ قطعہ ۱۹۲۸ء کا ہے۔ حالانکہ علامہ اقبال ۱۹۲۹ء جنوری میں میسور تشریف لائے تھے اور یہ قطعہ یہاں سے واپسی کے بعد ہی کہا تھا، بظاہر یہ قطعہ جاوید نامے کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتا ہے جس میں آپ نے ٹیپو سلطان کا تفصیلی ذکر فرمایا ہے۔ لیکن یہ اس میں بھی شامل نہیں ہے، اُسے اس مثنوی میں بڑی خوبی کے ساتھ کھپایا جا سکتا تھا، خدا جانے علامہ نے اسے کیوں اس میں شامل نہیں کیا۔ بنگلور کے محمد جمیل صاحب نے غالباً اسی قطعے کے بارے میں آپ کو لکھا تھا تو آپ نے ۱۴ر اگست ۱۹۲۹ء کو جواب میں لکھا تھا۔

> "سلطان شہید پر میری نظم اس کتاب کا حصہ ہوگی جسے میں اپنی زندگی کا ماحصل بنانا چاہتا ہوں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لئے آپ کو کافی انتظار کرنا پڑے گا، میں نے اس کا ایک حصہ کچھ عرصہ ہوا مرتب کیا تھا، لیکن پھر دوسری مشاغل کی بنا پر اس کو نامکمل چھوڑ دینا پڑا"۔

(اقبال نامہ ـ دوم ـ صفحہ ۹۲)

اس قطعے میں علامہ اقبال نے ٹیپو سلطان کی شہادت کے واقعے کو داستان دکن کے عنوان سے تعبیر کیا ہے اور اس میں اس جانباز اور سرفروش مجاہد اسلام کی ساری تفصیل حیات کا خلاصہ اور جوہر پیش کر دیا ہے۔ شہادت سے کچھ دیر پہلے کسی نے رائے دی تھی کہ آپ انگریزوں سے مصالحت کرلیں تو ٹیپو سلطان نے فوراً جواب دیا تھا "گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی اچھی ہے"۔ سلطان کے اسی قول کو اس عظیم فن کار شاعر نے اس قطعے کے آخری شعر میں شاعرانہ کمال کے ساتھ بیان کیا ہے اور ایجاز و بلاغت اور اثر انگیزی کے جوہر دکھائے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے اس مشہور شعر میں داستان حرم کا ذکر کیا ہے اور یہاں بھی اپنی اعجاز بیانی اور فکر کاری

کا کمال دکھایا ہے ۔

عجیب و سادہ و رنگین ہے داستان حرم — نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت حسینؓ کی قربانیوں کا شاید اس سے زیادہ بلیغ اور موثر بیان نہیں ہو سکتا ان دونوں عظیم الشان واقعات کو آپ نے ابتدا اور انتہا قرار دے کر داستان حرم کا حسین اور موزوں ترین عنوان قائم کر دیا۔ گویا للٰہیت اور قربانی کی کہانی کا پلاٹ حضرت اسمٰعیل کے واقعے سے شروع ہوتا ہے اور حضرت حسینؓ کی شہادت اسے نقطۂ کمال پر پہنچاتی ہے لیکن یہ کہانی وہاں پہنچکر ختم نہیں ہو جاتی قربانی اور جان نثاری کا سلسلہ امت مسلمہ میں جاری رہتا ہے، للٰہیت خودی کی بنا ہے اور شہادت اور جان بازی اس کی معراج چنانچہ تاریخ اسلام میں اس سلسلے کی ایک اور کڑی نظر آتی ہے۔ ٹیپو سلطان کی شخصیت اور شہادت سے بھی علامہ اقبال اسی طرح متاثر ہوئے ہیں اور ان کو داستان دکن کے عنوان کے تحت بیان کرتے ہیں۔

آج سے سینتیس سال قبل ۱۹۲۹ء کے اوائل میں علامہ اقبال نے اپنی تشریف آوری اور صحیح معنوں میں قدوم میمنت لزوم سے ریاست میسور کو رونق بخشی تھی، اس طویل سفر کی زحمت گوارا کرنے کا مقصد بنگلور اور میسور شہروں کی سیر نہیں تھا۔ بلکہ دراصل آپ سلطان شہیدؒ کے روضے کی زیارت کرنا چاہتے تھے جس کی خواہش مدت سے آپ کے دل میں موجزن تھی۔ آپ اولیاء کرام اور شہداء عظام کے معتقد تھے اور ان کے مقبروں کی زیارت کو تشریف لے جاتے تھے، آپ مسلمانوں کی اجڑی ہوئی سلطنتوں کے کھنڈر دیکھنے جاتے ان کی عظمت و شان کو یاد کر کے آنسو بہاتے اور سبق آموزی کرتے تھے، جس مرد مجاہد کے حالات اور واقعات سے آپ متاثر ہوئے تھے، جس کے کردار کے آپ مداح اور معتقد تھے اور جسے آپ خودی کا ایک آئیڈیل اور مظہر جانتے تھے۔ اس کی خاک پاک کو بچشم خود ملاحظہ کرنا چاہتے تھے اور اس خطے کی بنفس نفیس سیر کرنا چاہتے تھے جہاں جان سپاری اور جاں بازی کا یہ خونیں ڈراما کھیلا گیا تھا۔ ۱۹۲۹ء کے آخری ہفتے میں لکچروں کے سلسلے میں مدراس تشریف لانا ہوا تو آپ نے اس موقع سے یہ فائدہ بھی اٹھایا۔ اس زمانے میں عسکر بنگلور کا علاقہ جہاں انگریزی فوج کی چھاؤنی تھی برطانوی رزیڈنٹ کے ماتحت تھا اور اس کا تعلق براہ راست مدراس کے گورنر سے ہوتا تھا، اس علاقہ کے مخیر اور علم دوست رئیس اعظم فخر التجار حاجی سر اسمٰعیل سیٹھ کو خبر ملی تو آپ بذات خود مدراس تشریف لے گئے اور علامہ اقبال کو بنگلور آنے کی دعوت دے آئے۔

علامہ اقبال مدراس سے بذریعہ ٹرین ۱۰ر جنوری ۱۹۲۹ء کو بنگلور تشریف لائے، بنگلور کنٹونمنٹ کے ریلوے اسٹیشن پر ہزاروں معتقدین اور شائقین آپ کو خوش آمدید کہنے کے لئے حاضر تھے جن میں حاجی سر اسمٰعیل سیٹھ، امین الملک سر مرزا اسمٰعیل وزیر اعظم ریاست میسور، بنگلور کے مشہور و معروف اخبار "الکلام" کے مدیر کلیم الملک

سید غوث محی الدین اور "تاریخ سلطنت خداداد" کے مصنف محمود خاں محمود بنگلوری قابل ذکر ہیں۔ "اقبال کامل" میں صفحہ ۲۲ پر مولانا عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے کہ علامہ اقبال بنگلور پہنچے تو شمالی ہند کے ہزاروں آدمی ان کی زیارت کے لئے اسٹیشن پہ پہنچے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ندوی صاحب نے یہ جملہ منشی محمد الدین فوق کے مضمون "ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال" سے نقل کر لیا ہے جو نیرنگ خیال لاہور کے اقبال نمبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا، یہ اس کی نقل ہے تو صاف ظاہر ہے کہ غلط نقل ہے منشی صاحب نے تو لکھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب بنگلور کے اسٹیشن پر پہنچے تو ہزارہا آدمی شمالی ہند کے اس نامور عالم کو دیکھنے کیلئے اسٹیشن پر موجود تھے، ندوی صاحب کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو اصحاب ہزاروں کی تعداد میں علامہ اقبال کے خیر مقدم کے لئے بنگلور کے ریلوے اسٹیشن پر جمع ہوئے تھے وہ شمالی ہند کے تھے اور بنگلور کے باشندے کم آئے تھے یا سرے سے غائب ہی تھے۔ انھوں نے علامہ کی تشریف آوری کو کوئی اہمیت نہ دی، شمالی ہند کے ہزاروں آدمیوں کا جمع ہونا غلط محض ہے، یہ بنگلور ہی کے عوام تھے جو اس شاعر مشرق کا استقبال کرنے کے لئے بڑے جوش اور عقیدت سے بڑی تعداد میں جمع ہوئے تھے، بنگلور اور میسور کے مسلمانوں نے علامہ اقبال کی تشریف آوری پر جس دلی مسرت اور جوش عقیدت کا اظہار کیا تھا وہ آج تک یاد ہے، خود علامہ اقبال اس سے بہت متاثر ہوئے تھے، بنگلور کے استقبالی مجمع میں ہندو عہدہ دار اور علما بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔

ریلوے اسٹیشن سے حاجی سر اسمٰعیل سیٹھ کے بنگلے تک راستہ کو جھنڈیوں سے آراستہ کیا گیا تھا، جا بجا مسلمانوں نے آپ کی خدمت میں پھولوں کے ہار پیش کئے اور تکبیر کے نعرے لگائے، اسٹیشن ہی پر سید غوث محی الدین صاحب نے "الکلام" کا خاص نمبر "اقبال نمبر" علامہ کی خدمت میں پیش کیا، یہ نمبر چوبیس صفحات پر مشتمل تھا، سرورق پر علامہ کی تصویر اور خیر مقدم شائع ہوا تھا، باقی صفحات پر بنگلور کے شعرا کا طرحی کلام چھپا تھا، سید صاحب نے پہلے سے تیاری کر کے علامہ کے اعزاز میں یہ خاص نمبر نکالا تھا، شعرا کو طبع آزمائی کے لئے طرح یہ دی تھی۔ ع

مسلم خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو

وزیر اعظم سر مرزا اسمٰعیل بہت خوش ہوگئے اور سید صاحب سے درخواست کی کہ علامہ جب تک ریاست میں رہیں ان کی رفاقت کریں، مرزا صاحب نے علامہ سے یہ درخواست بھی کی کہ آپ سرکاری مہمان بننا قبول فرمائیں، لیکن حاجی اسمٰعیل سیٹھ نے نہ مانا اور کہہ دیا کہ آپ کو میں نے دعوت دے کر بلایا ہے، بنگلور میں آپ میرے ہی مہمان رہیں گے، بنگلور سے باہر آپ سرکاری مہمان بن کر جائیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، علامہ کے ساتھ حکومت پنجاب کے افسر اطلاعات چوہدری محمد حسین اور دکن کالج پونا کے پروفیسر عبداللہ چغتائی بھی تشریف لائے تھے۔

بنگلور کے مختصر سے قیام میں علامہ کے اعزاز میں دو جلسے ہوئے، ایک مسلم لائبریری عسکر بنگلور کے زیر اہتمام

جس کی صدارت صدر ادارہ محمود شریف صاحب نے کی' یہاں علامہ کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا' اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ نے اسلامی کتب خانوں پر کچھ روشنی ڈالی اور اس کتب خانے کو ترقی دینے پر زور دیا یہ جلسہ مہاتما گاندھی روڈ پر واقع آپرا ہاوز میں ہوا' یہاں سے علامہ کتب خانے کی عمارت پر تشریف لے گئے اور کتابوں کا معائنہ فرمایا' پھر کتاب آرا میں تحریر فرمایا۔

"جنوبی ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں اور خصوصاً بنگلور کے مسلمانوں میں اسلامی کلچر کی اشاعت کا پورا احساس پیدا ہوچکا ہے جس کو میں تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے فال نیک تصور کرتا ہوں' میں سمجھتا ہوں کہ بنگلور کی مسلم لائبریری نے اس احساس کے پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ مستقبل قریب میں اس لائبریری کے اثر کا دائرہ اور بھی وسیع ہو جائے گا' اراکین کتب خانہ کو چاہیئے کہ تاریخ میسور کی قلمی کتابوں کی طرف بالخصوص توجہ فرمائیں۔

دوسرا جلسہ گورنمنٹ آرٹس اینڈ سائنس کالج کے میدان میں ہوا' یہ عام اور پبلک جلسہ تھا اور اس کی صدارت ڈائرکٹر تعلیمات پروفیسر این یس سبا راؤ نے کی جو انگلستان میں آپ کے ساتھی رہ چکے تھے' اس جلسے میں ہر طبقے کے ہندو مسلمان بہت بڑی تعداد میں جمع ہوئے تھے' یہاں علامہ نے ایک پر مغز فلسفیانہ تقریر فرمائی۔

بنگلور میں علامہ اقبال حیدر علی خاں بہادر اور ٹیپو سلطان شہیدؒ کا محل' قلعہ اور ان کا لگایا ہوا لال باغ' صدر انجمن مسلمانان ریاست میسور زنانہ اور مردانہ یتیم خانے وغیرہ مختلف مقامات اور ادارے دیکھے سلطانی آثار کا تعارف محمود بنگلوری کراتے جاتے تھے' بنگلور کے مسلم قائدین نے درخواست کی کہ آپ مسلمانوں سے بھی خطاب کریں مگر کم فرصتی کے باعث آپ نے معذرت کر دی۔

۱۱ جنوری کی صبح علامہ اقبال بنگلور سے سرکاری کاروں میں اپنے رفقاء اور مقامی احباب کے ساتھ شیوا سمندر روانہ ہوئے وہاں بجلی گھر دیکھا' یہ مقام بنگلور سے اسی میل کے فاصلے پر واقع ہے اور یہاں مصنوعی آبشار سے پن بجلی تیار کرنے کا مشہور و معروف کارخانہ ہے۔ جس سے ریاست بھر میں بجلی کی روشنی اور قوت فراہم کی گئی ہے۔ پھر وہاں سے بارہ بجے کے قریب سری رنگ پٹن پہنچے "گنبد سلطانی" میں عمائدین میسور شاہی محل کے عہدہ دار اور سرکاری افسر استقبال کو حاضر تھے ملاقاتوں کے بعد آپ روضہ سلطانی میں بڑے اشتیاق اور ادب کے ساتھ آنسو بہاتے ہوئے داخل ہوئے اور اندر سے دروازہ بند کر لیا' ڈھائی گھنٹے تک اندر مراقبہ کرتے رہے' باہر نکلے تو کثرت گریہ سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں' روضے سے ملحق صحن میں کچھ دیر مجلس احباب میں بیٹھے علی جان صاحب سے ساز پر کلام سنتے رہے' خود روتے اور دوسروں کو رلاتے رہے' عجیب سماں بندھا ہوا تھا' علی جان صاحب درباری موسیقار تھے اور راج محل کی طرف سے ان کو آپ کی خدمت میں بھیجا گیا تھا' خود بھی اچھے شاعر تھے اور اساتذہ کا کلام بڑی خوبی کے ساتھ سناتے تھے' علامہ

آپ کی سیر و سیاحت سے بہت متاثر ہوئے۔ محمد ابا سیٹھ صاحب سے جو گفتگو اس محفل میں ہوئی۔ اس کا بیان ابتدا مضمون ہی میں ہو چکا ہے۔ میسور کے علم دوست، علم پرور منصف مزاج اور بے تعصب مہاراجہ کرشنا راجہ وڈیر نے اپنے مصاحب خاص صدیق الملک صادق زین العابدین شاہ کو آپ کے استقبال کے لئے سرنگا پٹم بھیجا تھا اور ان کے زیر اہتمام اپنی طرف سے ٹیپو سلطان شہید کے مشہور "قصر دریا دولت باغ" میں ضیافت طعام کا انتظام کرایا تھا۔ صادق شاہ صاحب کے ساتھ علامہ اقبال اور رفقا وغیرہ گنبد سے وہاں پہنچے، کھانے سے فراغت کے بعد علامہ نے متعدد آثار سلطانی کی سیر کی جیسے مسجد اعلیٰ، قلعہ، وہ مقام جہاں سلطانؒ کی شہادت واقع ہوئی۔ دہلی دروازہ، قید خانہ، میر صادق کی مفروضہ قبر، لنگڑے غلام علی کا مقبرہ وغیرہ، محمود بنگلوری ہر مقام کا تعارف کراتے اور تاریخی واقعات بیان کرتے جاتے تھے۔ "دریا دولت" کی دیواروں پر وفادار جان نثار سید غفار شہیدؒ کی تصویر دیکھ رہے تھے تو کسی نے بتایا کہ رفیق سفر سید غوث محی الدین صاحب مدیر "الکلام" بنگلور انہیں کے پوتے یا پڑپوتے ہوتے ہیں تو علامہ نے فرط عقیدت سے انہیں گلے سے لگا لیا اور فرمایا "سید صاحب! آپ اس نامور شہید کی یادگار ہیں، ان کے ہاتھ میں تلوار تھی، اب آپ کے ہاتھ میں قلم ہے۔ آپ قلم سے وہی کام لیجئے" سید صاحب نے اپنی ایک نظم میں یہ روایت یوں بیان کی ہے۔

سنا اقبالؔ نے جب اس مجاہد کا میں پوتا ہوں تھیں حامل فوج سلطانی ہی جن کو خاص توقیریں
مسرت سے لپٹ کر آپ نے مجھ سے یہ فرمایا قلم سے کام لو سید! ہیں اب بے کار شمشیریں!

سید غفار افواج سلطانی کے سپہ سالار تھے اور سلطان سے پہلے شہید ہوئے تھے۔
غدار لنگڑے غلام علی کی قبر پر آپ نے اس کی تاریخ وفات کا یہ شعر سنا تو پھڑک اٹھے ؎

ہیچ می دانی چہ دید از دست او اہل شہید آں چہ اولاد محمد دید از دست یزید

روضہ سلطانی پر علامہ اقبالؔ نے ایک کتبے کی یہ رباعی بھی پڑھی اور بہت متاثر ہوئے تھے۔

آں سید شہدائے عرب سبط نبیؐ لخت جگر فاطمہؓ و جان علیؓ
از فاطمہ و حیدر دکنی ٹیپو سلطان شہیداں شدہ از جان و دلی

سلطان کی والدہ کا نام بھی فاطمہ تھا، ان دونوں کی باہمی مناسبت سے علامہ بہت محظوظ ہوئے، سری رنگ پٹن کی سیر کرتے ہوئے ایک مقام پر علامہ نے فرمایا "مغل دور کے بعد مسلمانوں کو ایک موقع اور نشاط ثانیہ کا ملا تھا مگر افسوس ہے کہ غداروں نے ان کو آگے بڑھنے نہیں دیا۔

محمود بنگلوری کی تاریخ دانی سے علامہ اقبال بہت متاثر اور محظوظ ہوئے اس وقت تک محمود صاحب شعر کم کہتے لیکن اخباروں اور رسالوں میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ آپ کی صرف ایک کتاب "سلطان شہیدؒ"

ایک سال قبل شائع ہوئی تھی ۔ اور اس وقت آپ تاریخ سلطنت خداداد کی تصنیف میں مشغول تھے، علامہ اقبال نے آپ کی اس تصنیف اور دوسری کتاب کے مسودے دیکھے اور بہت پسند فرمایا۔ محمود بنگلوری کو رائے دی کہ وہ مضمون نگاری اور شاعری چھوڑ دیں اور چند سال تک انہاک سے کام لے کر سلطنت خداداد کی ایک مکمل تاریخ پیش کریں مسلم لائبریری بنگلور میں علامہ اقبال نے کتاب الرائے میں لکھا تھا کہ وہاں تاریخ میسور کی قلمی کتابیں جمع کرنے کی طرف توجہ کی جائے۔ سرینگ پٹن میں بھی آپ کو اس کا خیال لگا رہا اور آپ نے عمائدین میسور سے بھی یہ خواہش ظاہر کی کہ سلطنت خداداد کی تاریخ اور ثقافت پر چند مستند اور معتبر مخطوطات آپ کے لئے فراہم کئے جائیں تاکہ آپ سلطان شہید پر نظم لکھنے میں ان سے فائدہ اٹھائیں۔

سرینگ پٹن سے علامہ اقبال عصر کے وقت میسور پہنچے اور گورنمنٹ گسٹ ہاوز میں مہاراجا صاحب کے مہمان کی حیثیت سے فروکش ہوئے، شہر میسور میں آپ کے اعزاز میں دو عام جلسے ہوئے، ایک جلسہ یونیورسٹی میں ہوا جہاں فلسفے کے مشہور پروفیسر واڈیا کی صدارت میں آپ نے ایک بلند پایہ فلسفیانہ تقریر فرمائی، جلسہ گاہ پروفیسروں اور طلباء سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، پروفیسر واڈیا نے اپنی صدارتی تقریر میں علامہ کی بہت توصیف و تعریف کی اور کہا کہ تقریر میرے فہم سے بالا رہی۔

جلسہ شروع ہونے سے قبل ڈاکٹر گوپال سوامی نے جو نفسیات کے مشہور پروفیسر اور ماہر تھے آپ سے ملاقات کی، دونوں میں نفسیات پر کچھ دیر بڑی دلچسپ گفتگو ہوتی رہی، گوپال سوامی نے اپنے نفسیاتی آلے کے عمل کا جلسہ گاہ میں یوں مظاہرہ کیا کہ علامہ کی نبض پر اس کا تار باندھ دیا اور آپ سے کہا کہ ایک سے دس تک آپ کسی عدد کو اپنے ذہن میں رکھیں، میں وہ عدد بتا دوں گا۔ علامہ نے چھ کا عدد اپنے ذہن میں معین کر لیا گوپال سوامی، ایک دو گننے لگے ، چھے پر پہنچے تو آلے کا کانٹا زور سے حرکت کرنے لگا، یہ نبض کی روانی کا اثر تھا، آپ نے کہہ دیا کہ علامہ کے ذہن میں چھے کا عدد ہے جسے سن کر علامہ کی نبض کی رفتار میں کچھ فرق آگیا ۔ علامہ نے بھی اسے مان لیا ۔ اور بتایا کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں، مثنوی رومی کی پہلی حکایت میں طبیب الٰہی بھی نبض ہی کے ذریعے کنیزک کے مرض کا راز دریافت کر لیتا ہے اور بوعلی سینا نے قابوس بن وشم گیر کے مرض کی تشخیص بھی اسی طرح کی تھی، سات سو اور ہزار سال قبل بھی اس اصول سے کام لیا گیا ۔ ڈاکٹر گوپال سوامی نے جلسے کے اختتام پر علامہ اقبال کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر اقبال کو مسلمان لاکھ اپنائیں وہ ہم سب کے ہیں، وہ کسی ایک جماعت یا مذہب کی ملکیت نہیں ہو سکتے ، اگر مسلمانوں کو ناز ہے کہ ڈاکٹر اقبال ان کے ہیں تو ہم کو بھی فخر ہے کہ وہ ہندوستانی ہیں اس موقع پر یونیورسٹی کے مسلمان طلبہ نے علامہ کے ساتھ ایک گروپ فوٹو لیا جسے میں نے مخزن مہاراجہ کالج میسور کی سنہ ۱۹۲۹ء کی اشاعت میں پیش کیا ہے، دوسرا جلسہ ٹون ہال میسور میں مسلمانان شہر میسور کی طرف سے منعقد ہوا

جس میں مسلمانوں کی جانب سے علامہ کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے آپ نے ریاست میسور، اس کے منصف مزاج مہاراجا اور اس کے وزیراعظم کی تعریف کی اور مسلمانوں کو وفادار اور پرامن رہنے کی تاکید کی، اس جلسے کا آغاز میرے والد مرحوم مولانا ابوالمظفر مرحوم نے تلاوت قرآن مجید سے کیا جس کے بعد علی جان صاحب نے اپنے بینڈ کے ساز پر یہ نعت شریف نہایت موثر انداز میں سنائی۔

اے بادِ صبا پیغام مرا کملی والے سے جا کہیو

علامہ اقبالؔ نے دوبارہ پڑھا کر سماعت کیا۔ جلسے کے اختتام پر علی جان صاحب نے اسی طرح ترانہ قومی "چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا"۔ سُنایا۔

اس جلسے سے کچھ دیر قبل مہاراجا صاحب میسور نے علامہ کو راج محل میں دعوت دی اور آپ کو چاندی کے فریم میں لگی ہوئی اپنی ایک تصویر کا تحفہ بھی پیش کیا تھا، علامہ اقبالؔ راج محل سے سیدھے اس جلسے میں پہنچے تھے، اپنی تقریر میں آپ نے مہاراجہ صاحب کے حسن خلق کی بہت تعریف فرمائی، شہر میسور میں علامہ نے مسلمانوں کا یتیم خانہ دیکھا اور شام کے وقت کرشنا راج ساگر بند کی سیر بھی کی، اس وقت برنداون باغ کی تشکیل نہیں ہوئی تھی، تاہم اس مقام کی سیر سے آپ بہت محظوظ اور مسرور ہوئے، یہ بند دراصل سد محمی کے نام سے ٹیپو سلطان شہیدؒ نے بنانا شروع کیا تھا اور شہادت سے لگ بھگ سال بھر قبل اس کا سنگ بنیاد خود اپنے ہاتھوں سے رکھا تھا، یہ فارسی کتبہ آج بھی وہاں نصب ہے، علامہ اقبال نے اس کا بڑے غور سے مطالعہ فرمایا اور سلطان شہید کی تعریف میں دیر تک رطب اللسان رہے۔

میسور سے علامہ اقبالؔ اور رفقائے سفر سرکاری کاروں ہی کے ذریعے بنگلور واپس تشریف لے گئے اور وہاں سے ٹرین کے ذریعے حیدرآباد روانہ ہوئے۔ بنگلور سے سید غوث محی الدین صاحب کو بھی اپنے ساتھ لے گئے انکو آپ کچھ دن اور اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے اس لئے وزیراعظم حیدرآباد سر اکبر حیدری کو تار دیکر آپ کو مدعو کرایا تھا، اس طرح علامہ اقبالؔ کا چار دن کا سفر میسور تکمیل کو پہنچا۔

شہر میسور میں جو اپنی خوش نمائی اور خوبصورتی کے لئے مشہور ہے علامہ نے معاشی حالت پر بھی نظر ڈالی اور یہ شعر کہا۔

کیا خوب صفائی شہر کی ہے اور پارک بھی بنتے جاتے ہیں گو پیٹ میں اپنے خاک نہیں پر تازہ ہوا تو کھاتے ہیں

مسلمانان میسور کے جلسے سے علامہ بہت متاثر ہوئے، حاضرین بڑے ادب اور عقیدت کے ساتھ خاموش بیٹھے ہوئے تھے گویا گوش بر آواز تھے علامہ نے فرمایا کہ "ایسا جلسہ میں نے کہیں نہیں دیکھا، یہاں ٹیپو سلطان کے آداب و اخلاق کا اثر ابھی باقی ہے" علامہ ہر شخص سے بڑی خندہ پیشانی کیساتھ ملتے تھے، نماز کے پابند تھے، صبح صادق سے پہلے بیدار ہوجاتے اور ٹہلتے ٹہلتے مثنوی رومی کی ابیات گنگناتے رہتے تھے، دن بھر ملاقاتوں میں قوم و ملت اور دین و مذہب کے موضوعات پر بڑی پر مغز گفتگو کرتے رہتے تھے سفر میسور اور زیارت روضہ سلطانی کا آپ کی شاعری اور فکر و خیال پر قابل لحاظ اثر ہوا اور دوسری طرف آپکی تشریف آوری کا ریاست میسور کے مسلمانوں کی ملی زندگی پر بھی کافی اثر پڑا، میں بھی اس جلسے میں موجود تھا جس میں میسور کے مسلمانوں نے آپکی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا تھا۔

(باقی آئندہ)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

رفتارِ ادب

کہتے ہیں کہ انشاء اللہ خاں انشا کو نواب سعادت علی خاں کے دربار میں دو لطیفے روز سنانے پڑتے تھے۔ چند ہی روز میں ان بیچاروں کی یہ حالت ہوگئی کہ دربار کو جانے لگتے تو جو راہ میں ملتا اسی سے پوچھتے کہ کوئی لطیفہ یا چٹکلا یاد ہو تو بتاؤ ہمیں نواب کو سنانا ہے۔ کچھ ایسی ہی حالت اس ادیب کی ہوتی ہے جسے تھوڑے تھوڑے وقفے کے ادب پر تبصرہ کرنا ہو۔ ناموں کی کھتونی پیش کرکے دوسروں کو بے مزہ کرنے والوں کی بات اور ہے' ورنہ اصل یہ ہے کہ کبھی کبھی وقت ایسا صاف گزر جاتا ہے کہ کوئی بھی بات تو قابل ذکر نہیں ہوتی۔ لیکن اسے اتفاق ہی سمجھئے کہ ان چند مہینوں میں اردو ادب کے بارے میں بہت سی باتیں کہنے سننے کی ہیں۔ اس زمانے میں کچھ نئی کتابیں سامنے آئی ہیں' نثر کی بھی اور نظم کی بھی۔ پرانے شاعروں نے نئے مجموعے مرتب کیے ہیں اور نئے شاعروں نے پرانی ہمدردیوں کو خیرباد کہا ہے۔ کلاسیکی سرمایہ کو بھی کھنگالا گیا ہے اور حال کے ہیجے کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن ان سب کا ذکر چھیڑنے سے پہلے اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے دنوں دو بزرگ شخصیتوں کے ہم سے جدا ہو جانے سے ہماری اگلی صفوں کی رونق اور بھی کم ہوگئی ہے۔ میری مراد حضرت زار دہلوی اور جناب تلوک چند محروم سے ہے۔ زار دہلوی بڑے کہنہ مشق اور قادرالکلام شاعر تھے۔ اردو کے علاوہ فارسی اور سنسکرت کے بھی عالم تھے اور داغ کی روایت کی آخری یادگار تھے۔ حضرت محروم نے زندگی بھر بڑی بھرپور شاعری کی۔ پچھلی تین نسلوں کی ذہنی تربیت میں اس لحاظ سے ان کا اہم حصہ ہے کہ تقریباً نصف صدی سے ان کی نظمیں ہر درجے کے نصاب میں شامل رہی ہیں۔ محروم کی شاعری دراصل تعمیری عناصر یعنی CHARACTER BUILDING ELEMENTS کی شاعری ہے۔ کردار کی تعمیر میں اقدار سے جو دلچسپی ہے' ان کی ترجمانی جس دلسوزی اور انہماک کے ساتھ محروم نے کی ہے اس کی دوسری مثالیں اردو میں بہت کم ہیں۔ وطنیت کے جذبے سے بھی وہ تمام عمر سرشار رہے۔ بیسویں صدی میں ہماری تحریک آزادی کا شاید ہی کوئی موڑ ہو جہاں محروم کی پرسوز اور پرخلوص آواز ہمیں واضح طور پر سنائی نہ دیتی ہو۔ ان کے اٹھ جانے سے اردو شاعری کا ایک باب ختم ہوگیا۔

یہاں ساہتیہ اکاڈمی کے اس انعام کا ذکر کرنا بھی مناسب ہوگا جو اس سال راجندر سنگھ بیدی کو ان کے ناولٹ

"ایک چادر میلی سی" پر دیا گیا ہے۔ بیدی اردو کے چوٹی کے افسانہ نگار ہیں۔ کہانی کے فن پر انھیں جو قدرت حاصل ہے۔ اس کا لوہا سبھی مانتے ہیں۔ "دانہ و دام" اور "گرہن" کے افسانوں سے "اپنے دکھ مجھے دے دو" اور "ایک چادر میلی سی" تک ایک لمبا ذہنی سفر ہے۔ اس سفر کا بڑا حصہ خاموشی کے پل پر سے بھی گزرا ہے۔ جسے ذہنی کرب، ناآسودگی، خود کلامی یا اپنی بازیافت کا وقفہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد سے بیدی کا فن زندگی کی بصیرت بن گیا ہے۔ انھوں نے زندگی کو اس کی پوری جامعیت (TOTALITY) کے ساتھ پیش کیا ہے۔ گھریلو زندگی کے جو مرقعے انھوں نے کھینچے ہیں، وہ تخلیق کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے قدیم و عظیم ذہنی سرمایے سے بھی استفادہ کیا ہے۔ جو لوگ بیدی کے ہاں جنس کے ذکر کو شک و شبہے کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، غالباً ان کی نظریں ان دیو مالائی عناصر پر نہیں گئیں جن کا استعمال بیدی نے "اپنے دکھ مجھے دے دو" میں وسیع پیمانے پر کیا ہے اور جن کی جھلک "ایک چادر میلی سی" میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ جنس کے معاملے میں ہندوستانی ذہن ایک خاص تصور رکھتا ہے۔ وہ اس کے حیوانی پہلو پر ہی نہیں، اس کے وجدانی اور آفاقی پہلو پر بھی زور دیتا ہے۔ یہی چیز بیدی کے ہاں بھی نمایاں ہے۔ بیدی کے ہاں جنسی جذبے کی بالیدگی اور وسعت کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ جس طرح فراق کی سرکردگی میں جدید غزل ہماری جذباتی اور جمالیاتی انتقاد کا ساتھ دینے کے لئے ہندوستان کے قدیم سرمایہ سے اپنا رشتہ از سر نو جوڑ رہی ہے۔ اردو افسانہ بھی کم از کم عرفانِ جنس کے معاملے میں اسی منزل کی طرف قدم بڑھاتا ہوا نظر آتا ہے۔

اب نئی کتابوں کو لیجئے ان میں تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی ہر طرح کی کتابیں شامل ہیں۔ مالک رام اور ڈاکٹر مختار الدین احمد نے کربل کتھا کو مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ سید احتشام حسین کے مضامین کا مجموعہ "اعتبارِ نظر" کے نام سے اور ڈاکٹر سیدہ جعفر کا "فن کی جانچ" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کی "مطالعہ سودا" اور ایم۔ حبیب خاں کی "اردو تنقید کے معمار" بھی حال ہی میں سامنے آئی ہیں۔ لیکن شاعری کے مجموعوں کی تعداد ان کتابوں سے کہیں زیادہ ہے۔ ان میں نئے بھی ہیں اور پرانے بھی۔ علی سردار جعفری نے کبیر کا انتخاب "کبیر بانی" کے نام سے شائع کیا ہے۔ انھیں کے ادارے نے اردو رباعیوں کا ایک انتخاب بھی شائع کیا ہے۔ اختر انصاری دہلوی کے منتخب قطعات کا مجموعہ "پر طاؤس" کے نام سے نکلا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کا مجموعہ "نیا عہد نامہ"، ڈاکٹر منیب الرحمٰن کا "بازدید"، ڈاکٹر کلیم الدین احمد کا "۲۴ نظمیں"، شہریار کا "اسم اعظم"، کمار پاشی کا "پرانے موسموں کی آواز" اور عمیق حنفی کی طویل نظم "سند باد" بھی ان ہی چند مہینوں میں شائع ہوئی ہیں۔ نیز علی سردار جعفری کا "پیراہن شرر" اور وحید اختر کا "پتھروں کا مغنی" زیر طباعت ہیں۔ یہ فہرست اور بھی بڑھائی جا سکتی ہے۔ یہاں اس کے پیش کرنے کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان چند مہینوں میں دوسری کتابوں کی بہ نسبت شاعری کے مجموعوں کا پلّہ کہیں زیادہ بھاری ہے اور ان میں بھی جدید شاعری اور نئی شاعری کے مجموعوں کا ہے۔ یہاں ان میں سے تجزیے کے لئے میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے مجموعے "نیا عہدنامہ" کو

ہوں گا۔ اس لئے نہیں کہ یہ باقی مجموعوں سے بہتر اور بلند تر ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں جس جدید ذہن کی کارفرمائی ہے۔ اس سے موجودہ عہد کی حسیت اور شعور کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

"نیا عہدنامہ" میں غزلیں بھی ہیں نظمیں بھی اور تجربات بھی۔ سب سے پہلے غزلوں کے یہ چند شعر دیکھئے

ہجر تو ہجر تھا اب دیکھئے کیا بیتے گی — اس کی قربت میں کئی درد نئے اور بھی ہیں

دنیا عجب جگہ ہے کہیں جی بہل نہ جائے — تجھ سے بھی دور آج تری آرزو گئی

ہم بھولتے جاتے ہیں اس چہرۂ زیبا کو — اے خواب ذرا اس کی صورت تو دکھا جانا

کیا جانے کب سے دل میں ہے اپنے بسا ہوا — ایسا نگر کہ جس میں کوئی راستا نہ جائے

اس در پہ بھی لگتا نہیں جی دیکھئے کب ہو — ہے اب کے عجب دل کی لگی دیکھئے کیا ہو

ان کو پڑھتے ہی احساس ہوتا ہے کہ یہ شعر نہ تو کلاسکیت کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں اور نہ ہی افادی ادب کی صلیب اٹھائے ہوئے ہیں۔ ان میں روایت کا رچاؤ ہے اور اس سے انحراف بھی ہے۔ لیکن یہ انحراف اتنا نہیں کہ روایت سے رشتہ ہی باقی نہ رہے۔ ان اشعار میں نفس انفرادی کی جس بنیادی الجھن کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ اس کا تعلق ایسے دور سے ہے جسے کلاسکیت یا رومانویت یا مقصدیت کے کھلونے دے کر نہیں بہلایا جا سکتا۔ جدید ذہن کے جذباتی اور جمالیاتی تقاضے کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔ ان اشعار میں ایک ہلکا سا انوکھا پن تجربے کی ایک دھندلی سی لکیر اور فکر کی باریک سی نوک ملتی ہے جو ذرا دیر کیلئے احساس کو گدگداتی ہے اور ذہن کو جھٹکا سا لگاتی ہے۔ اعظمی کی بنیادی خصوصیت یہی ہے کہ نہ انھوں نے شاعری سے سلانے کا کام لیا ہے نہ جگانے کا اور نہ ہی چونکانے کا، بلکہ انھوں نے اپنے عہد کی حسیت کے پس منظر میں خود اپنی آواز کو پانے کی کوشش کی ہے۔ اعظمی نے ہر طرح کے اثرات کو پرکھا ہے لیکن ان کی افتاد طبع اجتماعیت سے کہیں زیادہ انفرادیت کا ساتھ دیتی ہے۔ ان کے ہاں غیر خود (NON SELF) کے مقابلے میں "خود" (Self) کی اہمیت زیادہ ہے۔ روایت اور جدیدیت کا جو امتزاج ان کے ہاں ملتا ہے، اس میں بھی "خود" سے ان کی یہ وابستگی واضح طور پر سامنے آتی ہے۔ ان کی طبیعت کی موضوعیت (SNBJECTIVITY) انھیں میر کی طرف لے گئی ہے۔ ان کے لہجے میں جو دھیماپن، سادگی اور نرمی ہے، وہ میر اور فراق کی یاد دلاتی ہے۔ میر کے ہاں لہجے کے دھیمے پن کا تعلق عرفان غم سے ہے اور فراق کے ہاں جنسی ترفع سے ہے۔ اعظمی کی شاعری بھی چونکہ اپنی ذات میں گم ہونے کی وجہ سے داخلی کیفیتوں کی شاعری ہے دھیما لہجہ اُسے خوب راس آیا ہے۔

اپنی ذات میں گم ہونے سے یہاں میری مراد خود شناسی یا خود آگہی کی خواہش سے ہے اعظمی کے ہاں یہ خود پسندی کا روپ اختیار کر سکتی ہے۔ لیکن خود پرستی کا نہیں۔ اعظمی کی شاعری کو عرفان ذات کی شاعری کہنا بھی صحیح نہ ہوگا۔

کیونکہ اپنی ذات سے ان کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کی بنیادیں نہ مذہبی ہیں نہ روحانی، بلکہ اس کا تعلق موجودہ دور کے بعض ذہنی تقاضوں سے اور ان کی اپنی رفتار طبع سے ہے۔ اس لحاظ سے ہم اسے ایک طرح کے ذہنی تجسس یا وجدانی تحیر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان چند شعروں سے اس بات کی وضاحت ہو جائے گی۔

اب دور کہیں چل کے ذرا اپنے کو ڈھونڈیں
اپنے ہی سے لگتے ہیں سبھی دیکھے کیا ہو۔

پوچھ کر گردشِ دوران سے بتادو ہم کو
یہ بھی ہم بھول گئے نام ہمارا کیا تھا

زندگی! دیکھ کبھی غور سے چہرا میرا
تو بھی خوابوں میں اُلٹی ہی ڈھونڈلوں میں تجھے

میرے آئینے سے روٹھا ہے سراپا میرا
میں نے دیکھی نہیں برسوں سے خود اپنی صورت

پہچانتے نہیں ہیں ہم آج سے کسی کو
گھر سے نکل پڑے ہیں اب کس کی جستجو میں

سایہ سایہ پکارتا ہوں
میں دیر سے دھوپ میں کھڑا ہوں

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

ساہتیہ اکیڈیمی / نیشنل اکیڈیمی آف لیٹرس
رابندر بھون۔ نئی دہلی

مورخہ ۳ جون سنہ ۱۹۶۶ء

مکرم بندہ! آداب۔

بہت دن ہوئے میں نے درخواست کی تھی کہ جن اصحاب کے پاس مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے خطوط ہیں وہ انھیں (اصل یا ان کی نقل) میرے پاس بھیج دیں تاکہ انھیں مکاتیب مولانا آزاد میں شامل کیا جا سکے، جو زیر ترتیب ہے۔ اس درخواست پر بہت سے احباب نے لبیک کہا اور خطوط بھیج دیئے۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ ابھی تک کئی اصحاب نے معاملے کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا اور اسی لئے خطوط نہیں بھیجے۔ میں دوبارہ درخواست کرتا ہوں کہ یہ خطوط جلد از جلد بھیج دیئے جائیں۔ اس طرح سے وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائینگے، ورنہ افراد کے پاس پڑے رہنے سے ان کا تلف ہو جانا یقینی ہے۔ اصلی خطوط کا کام ختم ہو جانے پر واپس بھیج دیئے جائینگے۔

خاکسار
مالک رام

ڈاکٹر محمد اسلام

جگر کے نقّاد

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جگر کے نقادوں[1] کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے نقاد اور تنقید کے متعلق بعض اہل قلم (جو دنیائے اردو ادب میں اپنا ایک بلند مقام رکھتے ہیں) کی معقول رائیں پیش کردی جائیں اور انھیں اصولوں کی مدد سے جگر کے نقادوں کو جانچا جائے کہ وہ جگر پر تنقید کرنے میں کس حد تک حق بجانب ہیں۔

نقاد کے فرائض

سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ نقاد کے کیا فرائض ہیں، نقاد کے فرائض کے متعلق کلیم الدین احمد لکھتے ہیں "نقاد کا یہ اہم ترین فرض ہے کہ وہ ذاتی جذبات، رجحانات تعلقات کو وقتی طور پر فراموش کردے ..... تنقید کے لئے تیز ادراک، زندہ احساس، عمیق دماغ، وسعت نظر جو دنیائے ادب کے ساتھ ساتھ دنیائے علوم وفنون پر محیط، مذاق صحیح، ان جملہ اوصاف کی ضرورت ہے"[2]

آل احمد سرور کا خیال ہے کہ نقاد جب تک کسی چیز کی روح تک نہیں پہنچ جائے گا وہ اس کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :۔ "رچرڈس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک اچھے نقاد میں تین خوبیاں ہونی چاہئیں۔ اس کیفیت ذہنی تک پہنچنا جو مصنف یا تصنیف کی ہے، تجربات اور تجربات میں امتیاز کرنا تاکہ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوسکے، قدروں کا نباض ہونا.........

اچھا نقاد چیزوں کو پسند کرے یا نہ کرے ان کی اچھائی کا اعتراف تو کرسکتا ہے۔ نارمل تنقید بہت مشکل کام ہے

---

[1] ناظرین سے عرض ہے کہ "جگر کے نقاد" میرے مقالہ کا صرف ایک عنوان ہے اور جگر کی مخالفت اور موافقت میں اس قدر لکھا گیا ہے کہ اس کے لئے ایک الگ "باب" نہیں بلکہ الگ سے ایک ضخیم کتاب کی ترتیب دینے کی ضرورت ہے اگر حالات نے اجازت دی تو انشاء اللہ جگر کے نقادوں پر الگ سے ایک کتاب ترتیب دے دوں گا۔ اس موقع پر تفصیل کی گنجائش نہیں اسلئے جہاں تک ممکن ہوسکے گا اس عنوان کے تحت مختصراً جگر کے نقادوں پر اس طرح عرض کیا جائے گا کہ مطلب بھی خبط نہ ہونے پائے اور ناظرین کے سامنے جگر کے نقادوں کے متعلق ایک خاکہ بھی پیش ہو جائے۔

[2] اردو تنقید پر ایک نظر حصہ اول ۴۶۔۱۱۷۔

اس میں نئی بات کی خاطر یا انوکھی بات کی صحیح بات کو قربان نہیں کیا جاتا........ شاعری اور تنقید دو علٰحدہ چیزیں ہیں مگر دونوں میں ایک اہم رشتہ بھی ہے کوئی شاعر اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتا جب تک وہ شعر، شاعری یا شعر کے متعلق شعور نہیں رکھتا نہ کوئی نقاد اس وقت تک اچھا نقاد بن سکتا ہے جب تک وہ شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی اس خیال کو دوبارہ اپنے ذہن میں پیدا نہ کرے جو شاعر کے ذہن میں تھا۔[1] سرور صاحب ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں "نقاد مبصر ہوتا ہے، مبلغ یا مفتی نہیں ہوتا وہ بعض رنگوں کا مداح ہو سکتا ہے بعض کا مخالف مگر وہ محض یک طرفہ نہیں ہوسکتا........ ادبی تنقید محض علمی صحیفہ نہیں ہے علم کا عطر ہے"[2]۔ اور سید احتشام حسین لکھتے ہیں کہ:۔ "نقاد کی تعریف ہی یہ کہی گئی ہے کہ وہ ایسا پڑھنے والا ہے جو سمجھتا بھی ہے اس لئے کم سے کم اس کے لئے تو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ادیب کی ذہنی ساخت، افتادِ مزاج اور فلسفۂ حیات سے واقف ہو...... عام پڑھنے والے اور نقاد میں فرق یہ ہوتا ہے کہ نقاد پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی تشریح بھی کرسکتا ہے اور وجہیں بھی بیان کرسکتا ہے عام مطالعہ کرنے والے نتیجہ کے لحاظ سے نقاد کا ہم نوا ہونے ہوئے بھی صرف اپنے وجدان پر بھروسہ کرتا ہے"[3]۔

مجنوں گورکھپوری کی رائے ہے کہ "بغیر ماضی کے مطالعہ۔ حال کے مشاہدے اور مستقبل کے تصور کے نہ کوئی صحیح معنوں میں فن کار ہوسکتا ہے اور نہ نقاد اس لئے کہ ان تینوں اجزا کے امتزاج کے بغیر ہمارے اندر تاریخی بصیرت نہیں پیدا ہوسکتی ہے اور یہ تاریخی بصیرت کے بغیر نئی تخلیق ایک اسقاطی کوشش سے زیادہ قابل قدر نہیں ہوسکتی ہے"[4]۔

سید شبیہ الحسن نونہروی کی یہ رائے بھی قابل اعتنا ہے کہ:۔ "نقاد کا بنیادی کام فن کی قدر و قیمت معین کرنا ہے....... نقاد کے فرایض کا اگر تعین کیا جائے تو ایک موٹی تقسیم یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ ادب کیا ہے؟ کیونکر پیدا ہوتا ہے اور اس کی قدر و قیمت کیا ہے....... تنقید کے سلسلے میں فن کار کی شخصی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کسی فن پارہ کو فن کار کی شخصیت سے جدا کرکے سمجھنے کا خیال مہمل ہے فن کار کی شخصیت کو سمجھتے وقت تحلیل نفسی سے نقاد کا گریزاں رہنا عملی طور پر فن کار کی شخصیت سے جدا کرکے سمجھنے کے مرادف ہے"[5]۔

---

[1] "نئے اور پرانے چراغ" (دیباچہ) ص ۸-۹، ۱۷۸ [2] "ادب اور نظریہ" ص ۷-۸
[3] "ادب اور سماج" مطبوعہ ۱۹۴۸ء ص ۱۸-۱۸ [4] "نکاتِ مجنوں" ص ۶
[5] "تنقید و تحلیل" ص ۶۱، ۶۲۔

چونکہ فن کار یا فن شلاً شاعر، اس کا کلام اس کے باطن کا آئینہ ہوتا ہے اس کے اشعار میں اس کا زاویۂ نگاہ اس کا اندازہ اور اس کا ظرف جھلکتا ہے اس لئے اس کے کلام پر نقد و تبصرہ کرتے وقت اس کے اخلاق و کردار کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے اور شاعر کے صحیح ذوق کو متعین کرنے کے لئے نیاز فتحپوری کی تحریر کے مطابق "ہم کو زیادہ تر اس کے اچھے اشعار سامنے رکھنا چاہیئے بشرطیکہ اس کی تعداد معقول ہو اور فنی حیثیت متعین کرنے کیلئے رطب و یابس سبھی کو دیکھنا چاہیئے" ۔[1]

جگر مرادآبادی کے خیال میں خود شاعر سے زیادہ اس کے کلام پر کسی دوسرے کو نقد و نظر کا حق ہی نہیں وہ لکھتے ہیں کہ :- " امکان ہے کہ اکثر حضرات اپنے کلام پر اپنی ہی جنبش قلم کو پسند نہ فرمائیں گے لیکن ازراہ انصاف غور فرمائیں گے تو یقیناً مان لینا پڑے گا کہ شاعر سے زیادہ کسی دوسرے شاعر یا غیر شاعر کو اس کے کلام پر نقد و نظر کا حق نہیں بشرطیکہ احتساب نفس کے ساتھ ہو........

ہندوستان میں ناقدین کا گروہ اس قدر پست و گمراہ اور کور چشم بن چکا ہے کہ اسے کھلے کھلے اور ابتدائی امورِ ضروری تک کی خبر نہیں کیا اس کا پہلا فرض نہیں کہ وہ ملک کی آب و ہوا کے ماتحت مشرق و مغرب کے مزاج کا تعین کر لینے کے بعد آگے قدم اٹھائے لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے غلامانہ ذہنیت کا یہ عالم ہے کہ مشرق کی ہر چیز کی تنقید مغربی نقطۂ نگاہ سے کی جاتی ہے یہاں تک کہ اسناد و دلائل میں بھی ہمارے ناقدین کی تمام و کمال توجہ مغرب ہی کی جانب منعطف رہتی ہے" ۔[2]

جگر کے اس بیان کے ثبوت میں کہ شاعر کے کلام پر کسی دوسرے کو نقد و نظر کا حق نہیں انھیں کا ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے ۔ ایک دفعہ بحث جگر صاحب کے اس شعر پر تھی ؎

زمانہ گرم رفتار ترقی ہوتا جاتا ہے	مگر اک چشم شاعر ہے کہ پُرنم ہوتی جاتی ہے

ایک صاحب نے غیر ترقی پسند ادب کے رجعت پسندانہ کردار کی مثال میں جگر صاحب کا یہ شعر پڑھ دیا جگر صاحب نے جواب میں جو کچھ کہا اس کے الفاظ کچھ اس قسم کے تھے ۔ کیوں جناب اس شعر سے رجعت پسندی کا اظہار کیسے آپ نے سمجھا ؟

معترض ۔ زمانہ کی ترقی اور اس سلسلے میں اس کی گرم رفتاری پر چشم شاعر اگر آنسو بہائے تو شاعر کی رجعت پسندانہ ذہنیت کا اظہار نہیں تو اور کیا ہے ؟

کمال ذہانت کے ساتھ جگر صاحب نے کہا " آپ اسے طنز کیوں نہیں سمجھتے جو ارتقاء پر خوش ہونے کے بجائے

۱۔ نگار جولائی ۱۹۶۲ء ۲۔ .... اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۳۳

پہنچانے والے شاعر کیا گیا ہے۔ بس ایک اشارے نے جگر صاحب کے مفہوم کو اتنا واضح کر دیا کہ ان کا یہی شعر رجعت پسند ادب سے بیزاری کا ایک بین ثبوت ہو گیا۔"[1]

اس مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ واقعی شاعر کے کلام کی تشریح اس سے بہتر کوئی دوسرا شخص نہیں کر سکتا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ دوسرے حضرات شعر اکے کلام پر تنقید و تبصرہ کرنا ہی چھوڑ دیں البتہ شعر کو سمجھنے اور اس پر تنقید کرتے وقت بڑی سنجیدگی و ذہانت سے غور و فکر کر کے کوئی رائے پیش کریں۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ نقاد کا فرض ہے کہ وہ تنقید کے وقت ذاتی جذبات و رجحانات کو دور رکھے۔ کلام یا تصنیف کی روح تک پہنچنے کی کوشش کرے تجربات اور تجزیات میں اعتماد کرے نئی یا انوکھی بات کی خاطر صحیح بات کو قربان نہ کرے یک طرفہ فیصلہ نہ کرے ماضی حال اور مستقبل کے تصور کو پیش نظر رکھے، فنکار کی شخصی اہمیت کو نظر انداز نہ کرے، ممالک کی آب و ہوا کے ماتحت فنکار کے مزاج کا تعین کرے مشرق کے ادب پر مغربی نقطۂ نگاہ سے تنقید نہ کرے۔ وغیرہ وغیرہ

جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے ناقد کو چاہیے کہ وہ شاعر کے بہترین اشعار کو شاعرانہ حیثیت سے ان کو صحیح درجہ دے اس کے کلام میں شاعری کی اصل روح کو تلاش کرے اور اگر اس معیار پر اس کا کلام پورا اترے تو اس کے شاعرانہ کمال سے انکار نہ کرے۔

تنقید کیا ہے؟: نقاد کے فرائض کا جائزہ لینے کے بعد اب یہ دیکھنا چاہیے کہ تنقید کیا ہے اس سلسلے میں بھی ہم پہلے دنیائے اردو ادب کے بلند مقام نقادوں کی رایوں کو حوالے ساتھ نقل کرنے کے بعد کوئی رائے قائم کریں گے۔ تنقید کے متعلق کلیم الدین احمد لکھتے ہیں کہ:۔

"اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر"[2] ......

تنقید کوئی کھیل نہیں ہے ہر شخص بہ آسانی کھیل سکے یہ ایک فن۔ ایک صناعی ہے۔ صرف ایک فن ہی نہیں یہ ایک مشکل ترین فن ہے۔ ہر فن کی طرح اس کے بھی اصول و ضوابط اور اغراض و مقاصد ہیں۔ ادب و زندگی میں

---

[1] "فروغ اردو" ۱۹۶۱ء ص ۲۶۷ - ۲۶۸

[2] یہ کلیم الدین صاحب کی انتہا پسندی ہے وہ مشرقی ادب کو مغربی عینک سے دیکھتے ہیں اور اسی معیار سے اس پر تنقید کرتے ہیں کلیم الدین صاحب اردو ادب کے ساتھ یہ انصاف نہیں کرتے ہیں انھیں کو جواب دینے کے لئے جگر نے کہا تھا کہ ہمارے ناقدین مغرب زدہ ہیں اگر ایمانداری سے دیکھا جائے تو کلیم الدین کے اس بیان میں صداقت کا فقدان ملے گا کیونکہ اردو ادب میں بھی تنقید کا وجود رہا ہے اور اب بھی یہ بات دوسری ہے کہ اس کا وہ معیار قائم نہیں کیا جا سکا ہے جو مغربی ادب میں ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی ادب اردو ادب سے کئی سو سال زیادہ قدیم ہے اور اس میں بہت سے تجربات کئے جا چکے ہیں اس کے مقابلہ میں اردو ادب کو نہیں پیش کیا جا سکتا۔

اس کی مخصوص وقیمتی جگہ بنتا ہے۔ اس لئے ہر شخص ایک نقاد کے فرائض انجام نہیں دے سکتا ہے۔ نقاد شاعر وانشا پرداز کی طرح چند مخصوص اوصاف کا حامل ہوتا ہے جو اسے عوام سے تمیز کرتے ہیں۔ اسے فن تنقید کے ہر پہلو سے واقفیت ہوتی ہے۔ . . . نقاد میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ شاعر کے دماغ میں سما کر اس کے تجربے کے ہر عنصر کو سمجھ سکتا اور خود سمجھ کر دوسروں کو سمجھا بھی سکتا ہے۔ وہ اس تجربے کی قدر وقیمت کا اندازہ کرتا ہے اور اس سلسلے میں اپنے ذاتی خیالات وجذبات اور رجحانات کو وقتی طور پر فراموش کر دیتا ہے۔ اردو کے نقاد عموماً ان اوصاف کے حامل نہیں ہوتے ہر شخص محض اپنی پسند و نفرت کا اظہار کرتا ہے اور بزعم خود ایک جلیل القدر نقاد بن بیٹھتا ہے[1]

پروفیسر رشید احمد صدیقی فرماتے ہیں :—

"تنقید نہ یزداں کا فن ہے نہ اہرمن کا وہ انسان کا فن ہے اور انسان کے ادبی کارناموں کے پرکھنے کا فن۔ پرکھنے میں دیانت۔ دانشمندی اور احترام سے کام لینا چاہیئے نہ کہ نالہ ونفیر سے۔ شعر وادب کی دنیا میں نہ ہر مرض کی دوا اور درود شریف ہے' نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند!

تنقید نگار نہ تو پولیس کے مانند روزنامچے تصنیف کرتا ہے نہ شانہ نشیں فرشتوں کے مانند اعمال نامے مرتب کرتا ہے نہ عدالتوں کی طرح قانون کا منہ تکتا ہے۔ . . . . . میں اکثر نقادوں سے بالخصوص غزل کے نقادوں سے کہوں گا۔ " دل بدہی بخوف ما طعنہ مزن سرشت ما"

جب تک فنکار نقاد کے برابر یا اس سے بلند نہ ہو اس کو کسی ادبی یا شعری تخلیق کے پیش کرنے میں تامل کرنا چاہیئے اعلیٰ تنقید ہمیشہ اعلیٰ تخلیق سے برآمد ہوتی ہے اور اعلیٰ تخلیق کا مدار تمام تر اس پر ہے کہ تخلیق کرنے والا کائنات کی عظمت اور فن وزندگی کی اعلیٰ قدروں کا حامل ہے یا نہیں۔ شعر وادب کا اعلیٰ مقام وہ ہے جہاں نقاد اور فنکار کو ایک دوسرے سے ممیز کرنا ناممکن ہو جاتا ہے[2]"

آل احمد سرور لکھتے ہیں :—

"تنقید ایک فن ہے مگر اس کے حاصل کرنے کے لئے شعریت' دوسرے کی بنائی ہوئی دنیا یا اس کے تجربہ تک پہنچنے کی صلاحیت اور زندگی کی اچھی قدروں کا شعور ضروری ہے۔ رچرڈس نے غلط نہیں کہا ہے "جو کام ایک ڈاکٹر جسم کے لئے کرتا ہے' تنقید ادب کے لئے کرتی ہے"[3]

سرور صاحب دوسری جگہ لکھتے ہیں :—

---

[1] اردو تنقید پر ایک نظر (حصہ اول) ص ۱ تا ۹
[2] جدید غزل (مطبوعہ ۱۹۵۵ء) ص ۲۱-۲۲۔
[3] "تنقید کیا ہے" ص ۱۶۷ تا ۱۸۴۔

بڑے تخلیقی ہمارے نزدیک اچھے تنقیدی شعور کے وجود میں نہیں آسکتے تخلیقی جوہر بغیر تنقیدی شعور کے گمراہ ہوجاتا ہے اور تنقیدی شعور بغیر تخلیقی استعداد کے بے جان رہتا ہے ....

تخلیقی ادب میں تنقیدی شعور کی کارفرمائی ہوتی ہے تنقید اس کو واضح کردیتی ہے تنقید خلاصہ یا تفصیل نہیں ہے مگر اس کا تخلیق کے بنیادی خیال تک پہنچنا ضروری ہے ....

بڑی تنقید تخلیقی ادب سے کسی طرح کمتر نہیں ہوتی بلکہ وہ خود تخلیق ہوجاتی ہے ... تنقید کے لئے ایک مقدس سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے ... ہڈسن نے تو صاف کہا ہے کہ سچی تنقید بھی چونکہ اپنا مواد اور جذبہ زندگی سے لیتی ہے اس لئے اپنے رنگ میں وہ بھی تخلیق ہے ..... اچھی تنقید کسی طرح اچھی تخلیق سے کم نہیں بلکہ بعض وجوہ سے اس پر فوقیت رکھتی ہے ....

اچھی تنقید محض معلومات ہی فراہم نہیں کرتی بلکہ وہ سب کام کرتی ہے جو ایک مورخ، ماہر نفسیات، ایک شاعر اور ایک پیغمبر کرتا ہے۔ تنقید ذہن میں روشنی پیدا کرتی ہے اور یہ روشنی اتنی ضروری ہے کہ بعض اوقات اس کی عدم موجودگی میں تخلیقی جوہر میں کسی شئے کی کمی محسوس ہوتی ہے ..... تنقید کا کام فیصلہ ہے تنقید دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کردیتی ہے۔ تنقید وضاحت ہے، صراحت ہے، ترجمانی ہے، تفسیر ہے، تشریح ہے، تحلیل ہے، تجزیہ ہے تنقید قدریں متعین کرتی ہے ادب اور زندگی کو پیمانہ دیتی ہے۔ تنقید انصاف کرتی ہے، ادنیٰ اور اعلیٰ اور جھوٹ اور سچ پست و بلند کے معیار قایم کرتی ہے۔ تنقید ہر دور کی ابدیت اور عبدیت کی عصریت کی طرف اشارہ کرتی ہے تنقید ادب میں ایجاد کرنے اور محفوظ کرنے دونوں کا کام انجام دیتی ہے وہ بت شکنی بھی کرتی ہے اور بت گری بھی تنقید کے بغیر ادب ایک ایسا جنگل ہے جس میں پیداوار کی کثرت ہے، موزونیت اور قرینہ کا پتہ نہیں .....

فاعلاتن فاعلات کی گردان اگرچہ تنقید نہیں ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ کوئی بھی اچھا نقاد عروض اور اس کے قواعد سے بے نیاز ہوسکتا ہے، ادب کا اچھا نقاد زبان کا بھی اچھا نباض ہوتا ہے[1]۔ تنقید کے سلسلے میں شبیہ الحسن نونہروی کی یہ رائے بھی اہم ہے۔

"وہ وقت ختم ہوچکا جب ادب کو سمجھنے کے لئے اصول بلاغت کی کتابیں اور لغت کام آتی تھی اب ادب کو زندگی کے نامیاتی انسائیکلو پیڈیا ہی کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے اس سلسلے میں زبان و اسلوب۔ مکان و زماں فن کار کی شخصیت اور ذاتی زندگی اس کے عقائد و توہمات معاشی اور معاشرتی روابط زمانہ کی تاریخ اور تہذیبی قوتیں اور محرکات بیرونی دنیا کے مختلف الاقسام ہنگامے اور پھر فن کار کے ذہن کے اندرونی ہنگامے سب ہی پر غور

---

[1] "تنقید کیا ہے" ص ۱۶۰ تا ۱۸۴۔

کرنا پڑتا ہے۔ یہ تمام مراحل اور اسی قسم کے اور بہت سے مراحل اس وقت تک طے نہیں ہو سکتے جب تک کہ چند دوسرے علوم سے کام نہ لیا جائے۔ یہ پس منظری معلومات اگرچہ فن تنقید سے کوئی براہ راست ربط نہیں رکھتے، مگر ان کے بغیر ادب کو باقاعدگی کے ساتھ سمجھنا ممکن نہیں ہے۔"[1]

غزل کی تنقید میں اس بات کو بھی دھیان میں رکھنا چاہیئے جس کی طرف عندلیب شادانی نے اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:— "درحقیقت شدت احساس اور خلوص جذبات ہی سے غزل غزل بنتی ہے اس کے بغیر وہ دماغی ورزش ہے اور بس۔"[2]

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ:—

"جگر اور فانی دونوں کا شاعرانہ نقطۂ نظر شخصی شاعرانہ ہے غزل گوئی میں ہوتا بھی کچھ ایسا ہی ہے شاعری شخصی بھی ہوتی ہے آفاقی بھی، میں دونوں کا قائل ہوں لیکن سراسی کے آگے جھکاتا ہوں جس کے یہاں دونوں میں تمیز کرنا دشوار ہو جائے"— نیاز فتحپوری لکھتے ہیں کہ:—[3]

"اچھی شاعری تمام تر اسلوب بیان کی خوبی پر منحصر ہے، اور اصطلاحی حیثیت سے یہ بڑی وسیع المعانی چیز ہے اس میں ۔ ۔ ۔ ۔ صحت زبان، صحت الفاظ و تراکیب خیال، ندرت اظہار کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں شامل ہیں مثلاً یہ کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ شعر کے الفاظ سے بھی متبادر ہے یا نہیں، اس نے محض وزن پورا کرنے کے لئے کسی غیر ضروری لفظ کا اضافہ تو نہیں کیا، یا کوئی ضروری لفظ ترک تو نہیں کر دیا، دونوں مصرعوں میں ربط و تسلسل پایا جاتا ہے یا نہیں کوئی ایسا دعویٰ تو نہیں کیا گیا جس کا ثبوت پیش نہ کیا گیا ہو کوئی نحوی غلطی تو اس میں نہیں پائی جاتی صرف خطاب و تخاطب دونوں واضح ہیں یا نہیں —— شعر میں کوئی ایسا ابہام تو نہیں جو ذہن سامع کو الجھن میں ڈال دے، تشبیہ، استعارہ و کنایہ قریب الفہم ہیں یا نہیں، تعبیر و تعلیل میں کوئی منطقی تضاد تو نہیں، مضمون عامیانہ و سخیف تو نہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ شعر بغیر غور و تامل کے فوراً سمجھ میں آجاتا ہے یا نہیں۔

الغرض شعر کو مفہوم و ٹکنک کے لحاظ سے سانچے کی ڈھلی ہوئی چیز ہونی چاہیئے جس میں کسی تغیر و تبدل حذف و اضافہ یا مزید ترقی کی گنجایش نہ ہو۔"[4]

تنقید کے سلسلے میں اہل علم و ادب کی یہ جو رائیں پیش کی گئی ہیں، ان سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ تنقید

۱؎ تنقید و تحلیل ص ۵۸ - ۵۹

۲؎ آتش گل مطبوعہ ۱۹۵۸ء ص ۲۵

۳؎ دورِ حاضر اور غزل گوئی مطبوعہ ۱۹۵۸ء ص ۱۴

۴؎ نگار جولائی ۱۹۴۱ء ص ۵ -

کرتے وقت نقاد کو تنقید کے مطالبات اور اس کے اغراض و مقاصد کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ اعلیٰ تنقید کے لئے اصلی تخلیقی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ انسان اور اس کے ادبی کارناموں کے پرکھنے کا فن ہے اس سے صحیح اور ذہن کا معیار قائم کیا جاتا ہے تنقید سے تخلیق ادب کو واضح کیا جاتا ہے اس سے ذہن میں روشنی پیدا ہوتی ہے اس کا کام فیصلے عیب جوئی یا قصیدہ خوانی نہیں ہے اس کے ذریعہ ادب کی وضاحت، صراحت، ترجمانی، تفسیر، توضیح تحلیل، تجزیہ کیا جاتا ہے اور ادنیٰ و اعلیٰ، جھوٹ سچ اور پست و بلند ادب کو پرکھ کر اس کے ساتھ انصاف کیا جاتا ہے اس سے ادب میں ایجاد و محفوظ کرنے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔

موجودہ دور میں تنقید کے لئے زبان و اسلوب، مکان و زمان، فن کار کی شخصیت اور ذاتی زندگی اس کے عقائد و توہمات، معاش و معاشرتی روابط زمانے کی تاریخ اور تہذیبی قوتیں اور محرکات بیرونی فن کار کے ذہن کے اندرونی ہنگاموں کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ غزل پر تنقید کرتے وقت شدت احساس اور خلوص جذبات کے ساتھ اس کی شخصی اور آفاقی شاعری میں بھی تفریق کرنا چاہیئے۔ اس کی زبان، الفاظ، تراکیب، صفات وغیرہ کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

جگر کے نقادوں پر تنقید و تبصرہ

نقاد کے فرائض اور تنقید کی اہمیت کا جائزہ لینے کے بعد اب ہمیں جگر کے نقادوں کے متعلق بھی کچھ کہنا ہے۔

جگر کے نقادوں میں ایک طرف سید سلیمان ندوی، مرزا احسان احمد، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور جیسی سخن فہم اور سخن شناس شخصیتیں ہیں جو ائمہ فن اور اکابر شعر و ادب ہیں اور جگر سے اس قدر خلوص و عقیدت رکھتے ہیں کہ ان کی ہر چیز انھیں پسند ہے اپنی پسندیدگی کی ہی بنا پر انھوں نے جگر کی تعریف و توصیف کی ہے ان کو جگر کی ہر بات میں یہاں تک کہ کلام میں بھی صرف خوبی ہی خوبی نظر آئی ان کی خامیوں پر ان کی نظر ہی نہیں پڑتی جو انتہائے خلوص و محبت کی دلیل ہے تو دوسری طرف پروفیسر کلیم الدین احمد، عندلیب شادانی، مجنوں گورکھپوری اور علامہ نیاز فتحپوری جیسے جید اور مستند ناقد و مبصر ہیں، جنھوں نے جگر کی کوتاہیوں اور نارسائیوں پر نکتہ چینی کی ہے اور کسی طرح جگر کو عظیم شاعر ماننے ہی کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مندرجہ بالا اکابرین میں سے اگر جگر کے موافقین نے کچھ غلو سے کام لیا ہے تو مخالفین نے بھی انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے۔ پھر بھی مندرجہ بالا ہستیوں میں سے جنھوں نے جگر کی حمایت یا مخالفت کی ہے ان میں جزوی صداقت بھی پائی جاتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ جگر کی شاعری کو پسندیدگی اور استحسان کی نظروں سے دیکھنے والوں کو بجائے طرفداروں کے زمرے میں شامل کرنے یا ان کی سخن فہمی سے بدگمان ہونے کے ان کی پسندیدگی اور استحسان میں صداقت کی تلاش کی جائے۔ اسی طرح جگر کی شاعری کے منکروں کے بیان میں جنھیں انھوں نے جگر کی

(باقی بر صفحہ ۳۳)

طیب انصاری

ولی کی عظمت

اردو زبان کے شعری سرمایہ میں بہت کم ایسے ——— شعراء ہیں جنھوں نے گراں قدر اضافے کئے ہوں۔ ہماری شاعری میں فیروز بیدری، محمد قلی قطب شاہ، نصرتی، وجہی اور غواصی نے ابتدائی زمانہ میں زبان و بیان کے نئے تجربے کئے، زبان کے لغوی سرمایہ میں نئے الفاظ، نئے روزمرہ اور نئے محاوروں کا اضافہ کیا اور فن کے لحاظ سے بھی فارسی شعر و ادب سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جو سانچے، پیمانے اور معیارات شاعری میں برتے گئے اور جن کا رواج آج بھی بکثرت ہے ان ہی عظیم شعرا کی کد و کاوش اور ذوق و شوق کا نتیجہ ہے اردو زبان کو جو معنی عطا کئے گئے اور اردو شاعری کی صورت تشکیل پائی ہے اس میں ان ہی شعرائے قدیم کا خون جگر رواں دواں ہے ان قدیم اور عظیم شعرا کے بعد جن شاعروں نے زبان و ادب کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی ہے اس میں میر کی سادگی و برجستگی، ناسخ کی نظر انتخاب اور غالب کی مرقع نگاری و تصویر کشی کا دخل ہے۔ ان تینوں نے اور اس دور سے دوسرے تعلق رکھنے والے شاعروں نے اس بازاری بھجوکری کو دنیا کی بڑی زبانوں کے سامنے اس طرح لا کھڑا کیا کہ یہ قدیم زبانیں منہ دیکھتی رہ گئیں۔ ان قدیم و دور وسطیٰ سے تعلق رکھنے والے عظیم شعرا کی عظمت کو تسلیم کرنے کے باوجود اردو زبان و ادب کی تاریخ ادھوری رہ جائے گی اگر ہم اس شاعر کا ذکر نہ کریں جو درحقیقت فیروز، محمد قلی اور نصرتی کی تخلیق ہے اور جس نے میر و غالب کی تخلیق کی ہے۔ محمد حسین آزاد نے اس درمیانی اور اہم ترین شخصیت کو "آدم ریختہ" یعنی اردو شاعری کا باوا آدم کہا ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ولی کی شخصیت عہد آفریں شخصیت ہے۔ وہ ایک زمانہ کا محل ہے وہ ایک زمانہ کا خالق ہے۔ اردو زبان میں بہت سے عظیم شاعر پیدا ہوئے ہم بجا طور پر محمد قلی معانی، نصرتی، میر اور غالب و اقبال کی عظمت کے ترانے گا سکتے ہیں، ہم حالی کی گراں بہا خدمات کو بھی فراموش نہیں کر سکتے لیکن ان تمام شاعروں میں ولی کی شخصیت انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ افلاطون نے شاعر کو مجذوب کہا ہے۔ سچتا ہوں اس اعتبار سے اردو شاعری میں ولی کا کیا درجہ ہوگا۔ ولی تو بہر حال ولی ہی ہے۔ میر کی عظمت یوں بھی ہے کہ ناسخ سے لیکر حسرت تک سبھی بڑے شاعروں نے ان کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔ اس لئے بے بہرہ کہا گیا جو معتقد میر نہیں" لیکن خود میر نے کسی شاعر کی عظمت کو تسلیم نہیں کیا ان کے نزدیک کوئی آدھا شاعر ہے تو کوئی پونا۔ البتہ وہ خود اکو پورا ایک شاعر مانتے ہیں۔ بر خلاف اس کے

بھی ولی کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔ حاتم، آبرو اور یکرنگ نے ولی کو زبردست خراج تحسین ادا کیا ہے۔

حاتم یہ فن شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں ۔۔۔ ولی ولی ہی ہے جہانِ سخن کے بیچ

آبرو نے کہا ؂

آبرو شعر ہے ترا اعجاز ۔۔۔ پر ولی کا سخن کرامت ہے

اور یکرنگ نے ولی کے مخالفین سے جھنجھلا کر کہا ؂

ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں

ان شعرا سے ہٹ کر اپنے وقت کے تقریباً سبھی تذکرہ نویسوں نے ولی کی عظمت، فوقیت اور اہمیت کو محسوس کیا ہے۔ چنانچہ میر، گردیزی، قایم، علی ابراہیم، علی لطف، فایق، میر حسن اور مصحفی نے ولی کا ذکر اپنے تذکروں میں کیا ہے اس سے ولی کی غیر معمولی مقبولیت، شہرت اور اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زبان دکھنی کے بارے میں ان ہی شعرا نے علم بغاوت بلند کیا۔ اسے بعض لوگ مظہر کی عصبیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ میر نے بھی کہا ؂

ریختہ کا ہے کو تھا اس رتبۂ عالی میں میر ۔۔۔ جو زمیں نکلی اسے تا آسماں میں لے گیا

اور قایم نے دکنی زبان کو "لچر سی" زبان قرار دیا۔ اگر واقعتاً یہ سب کچھ عصبیت کی وجہ سے ہوا ہے تو جہاں اس کا منفی پہلو ہمارے سامنے آتا ہے وہیں اس کی افادیت پر بھی نظر رکھنی چاہئے کہ اسی "لچر سی" زبان کے نکھار سدھار میں شب و روز جو محنت کی گئی اس کے نتیجہ میں لکھنو کی ٹکسالی زبان نمودار ہوئی۔ بلاشبہ ڈاکٹر مسعود حسین (مرتب "پرت نامہ" رسالہ قدیم اردو۔ جامعہ عثمانیہ ۱۹۶۵ء) نے فیروز کو استاد دبستان گولکنڈہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور فیروز نے زبان کی سدھار کے لئے جو کوششیں کی تھیں اس کا اعتراف کرتے ہوئے ذوق و ناسخ کی طرح گولکنڈہ کا استاد سخن کہا ہے۔ فیروز کی "لچر سی" زبان جب ذوق اور ناسخ کے ہاتھوں پہنچی ہے تو وہ بن سنور کر سامنے آتی ہے اور دیکھنے والوں کو متحیر کر دیتی ہے۔ اردو زبان کے نکھار میں بلاشبہ مظہر اور قایم کی عصبیت کو بہت بڑا دخل ہے اگر وہ زبان دکنی سے بغاوت نہ کرتے اور فارسی زبان سے پوری طور پر استفادہ نہ کئے ہوتے تو اردو زبان کا یہ رنگ و روپ نہ ہوتا مظہر کی عصبیت کے اس مثبت پہلو کے اجاگر کرنے کے بعد جو بات زیادہ قابل توجہ ہے وہ خود ولی کی ذات اور شخصیت ہے۔ شمالی ہند میں زبان دکنی سے جس نفرت کا اظہار کیا گیا وہ نفرت صرف اسی "لچر سی" زبان سے تھی نہ کہ ولی سے۔ ولی کی شاعری اور اس کی شخصیت اسی قدر قابل تعظیم تھی جس قدر کہ حاتم اور میر کی تھی۔ جہاں تک زبان سے انحراف کر کے فارسی زبان کی طرف رجوع ہونے کا معاملہ ہے وہ صرف زبان دکنی کی "تنگ دامانی" اور کم مائگی کا نتیجہ ہے خود ولی کے کلام کا جب آپ تجزیہ کریں گے تو یہ بات صاف طور پر سامنے آئے گی کہ زبان کے اعتبار سے کلیات ولی تین حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ دیوان کے پہلے حصہ پر دکنی زبان کا اثر نمایاں ہے درمیان میں (بزمانہ قیام گجرات) گجراتی اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ اور دہلی وردہلی کے بعد کے کلام میں فارسی زبان کا زبردست اثر نظر آتا ہے۔ اسی وجہ

ولی کو دورِ قدیم کے "خاتم الشعرا" اور جدید دور کا "باوا آدم" کہا بس اتنی سی حقیقت ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مولوی عبدالحق (قدیم اردو) کو "باوا آدم" کی اصطلاح سے جو پریشانی پیدا ہوگئی ہے وہ ایک سادہ سی بات ہے کہ ولی نے جدید اردو کو جنم دیا۔ اس طرح ولی اردو شاعری میں مخلوق بھی ہے اور خالق بھی۔ یہ دوہری اہمیت کسی دوسرے شاعر کی نہیں۔

ولی ہمارے ادب کا اہم ترین شاعر ہے۔ اس کے کلیات کا مطالعہ اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے ہر فرد کے لئے لازمی ہے۔ ولی کی عظمت کا راز یہ ہے کہ بیک وقت ممتاز شاعر، مصلح زبان اور ہندوستانیت کا علمبردار ہے۔ وہ لوگ جنھیں خالص فن سے دلچسپی ہے اور جو شاعری میں سقراط کی طرح حسن کی تلاش کرنا چاہتے ہیں تو انھیں کلیات ولی میں ایسے بے شمار شعر ملیں گے جو فن کے معیار سے کہیں بلند ہیں۔ سادگی و سلاست، روانی و جاذبیت، زبان و بیان، لطافت و موسیقیت سبھی کچھ آپ کو مل جائے گا۔ اگر آپ اردو زبان کی تاریخ میں دلچسپی رکھتے ہیں تو ولی کا کلام آپ کو زبان کے ارتقا کو سمجھانے میں غیر معمولی مدد دے گا اور اگر آپ قومی نقطۂ نظر سے جانچ کرنا چاہتے ہوں تو آپ کو سن کر تعجب نہ ہونا چاہئے کہ ولی محمد قلی قطب شاہ معانی کا جانشین ہے۔ جو جذبہ معانی کے کلام میں کار فرما نظر آتا ہے وہی جذبہ ولی کی شاعری میں رواں ہے سچ بھی یہی ہے کہ ولی کی ہمہ گیر شخصیت ایک عصر پر چھا نظر آتی ہے۔ اس لئے اس کا مختلف زاویوں سے مطالعہ ازبس ضروری ہے

احتشام حسین نے غالب کے تفکر (تنقید عملی تنقید) کا جائزہ لیتے ہوئے یہ اعتراض کیا ہے کہ ہم کسی بھی شاعر کا مطالعہ چند بندھے ٹکے اصولوں کے پیش نظر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہماری رسائی ادیبوں اور شاعروں کی روح تک نہیں ہو سکی ہے وہ روح جو بدلتے ہوئے حالات میں بھی انھیں عظمت بخشتی ہے۔ اردو ادب کی روایات میں فارسی کی تقلید اور غالب کے معاملہ میں بیدل کی پیروی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے کی وجہ سے شعرا اپنے ماحول سے کٹ کر اپنے شعور کے محض معینہ اور مفروضہ شعور کے ترجمان بن کر رہ گئے ہیں۔ اور یہ مقید شعور چند الفاظ کے الٹ پھیر یا چند تاثرات سے ظاہر کیا جاتا رہا ہے۔" واقعی یہ کس قدر غلط انداز ہے کہ ہم شاعر میں تصوف، زبان، تغزل، اختراع و ایجاد، تشبیہات، صنائع و بدائع، حسن طلب اور ایہام جیسے مخصوص خوبیوں کو تلاش کر کے کسی بھی شاعر کو عظیم شاعر قرار دیتے ہیں۔ اور ان ساری خوبیوں کے جواب میں کلیات سے اپنے مطلب کے اشعار ڈھونڈ نکال کر پیش کر دیے جاتے ہیں۔ تنقید میں صورت سے انکار نہیں۔ لیکن صورت پر ضرورت سے زیادہ توجہ "معنی" کی افادیت اور اہمیت کو پس پشت ڈال دیتی ہے۔ بلاشبہ حنیف نقوی کے خیال کے مطابق اچھی چیز کو بیان کرنے کے لئے بھی اچھی زبان کی ضرورت ہوا کرتی ہے (غزل اور مسائل) اس وجہ سے ان کے نزدیک "اردو ادبی تنقید کا پہلا فرض فن اظہار کی اس مستقل حیثیت کو پرکھنا" بن جاتا ہے۔ شعر کو پرکھنے کے لئے یقیناً ادبی مذاق کو کسوٹی

قرار دینا ضروری ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم اس روح اور جذبہ کو فراموش کر دیں جس نے شاعر کو شعر کہنے پر مجبور کیا ہے۔ اس وجہ سے شاعر اور اس کے ماحول کو پیش نظر رکھنا اور حیات انسانی کے لافانی و ابدی اقدار کی روشنی میں فکر کی جانچ ضروری ہو جاتی ہے۔ ارسطو نے بھی اسی معیار تنقید کو اپنے طور پر واضح کیا ہے۔ ارسطو شاعر کو دو خانوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شاعر تو وہ ہوتا ہے جو خارجی حقایق سے فیضان حاصل کرتا ہے اور اس میں ہمدردی کا فوری جذبہ موجود ہوتا ہے اور دوسرا وہ ہوتا ہے جو بالکل ہی مجذوب ہوتا ہے۔ اگر ارسطو کی اس تقسیم کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس عظیم مجذوب یعنی "ولی" کو کس خانہ میں رکھیں؟ آیا وہ بالکل ہی "مجذوب" ہے یا شاعر بھی ہے ؟!

روسی ادیب بلنسکی کا یہ خیال کہ "تاریخی تنقید بغیر جمالیاتی تنقید اور اس کے برعکس جمالیاتی تنقید بغیر تاریخی تنقید کے ایک طرفہ ہوگی اور آخر کار جھوٹی ہوگی"۔ بنیادی طور پر فن اور فن کے حسن کی اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور وہ جو کل تک کہا جاتا تھا کہ صداقت اہم ہے چاہے اس کا اظہار جس انداز میں بھی ہو جھوٹ تھا۔ کسی نظریہ تنقید پر ایقان رکھنے والے روسی اور ہندوستانی نقاد سبھی جمالیات کی ضرورت کو محسوس کرنے لگے ہیں چنانچہ ماسکو میں منعقدہ سمپوزیم (مارچ ۱۹۵۶ء) میں "سوویت روس میں جمالیات" کے موضوع پر بحث کی گئی۔ اس سمپوزیم میں کوزنسیٹوف ادموکانوف وغیرہ نے شدت سے محسوس کیا کہ سوویت دیس میں جمالیات کی سائنس بہت غیر مطمئن عالم میں ہے لوکانوف نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر جمالیات کو بہ حیثیت سائنس کے آگے نہ بڑھایا جائے گا تو تمام فنون پیچھے رہ جائیں گے"۔ اس حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ انسانی حیات میں حسن کی اپنی اہمیت ہے۔ حسن کے تصور کے بغیر یہ زندگی روکھی پھیکی ہے، بے کیف سی زندگی کی کشاکش، جہد پیہم اور شب و روز کی گردش سبھی کچھ تلاش حسن میں ہے۔ حسن کی رنگینیوں سے یہ جہاں رنگین ہے، انسانی زندگی کا افسانہ رنگیں حسن کے وجود ہی کی وجہ سے ہے اور قلب انسانی میں آرزوؤں کی شورش اسی حسن کی جلوہ سامانیوں کا نتیجہ ہے ؎

جلوۂ حسن کہ ہے جس سے تمنا بے تاب پالتا ہے جسے آغوشِ تخیل میں شباب

ولی سے قبل بھی دکنی شعرا میں شعریت اور حسن کی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ محمد قلی قطب شاہ کا پورا دیوان شعریت، حسن اور لطافت سے بھرپور ہے، نصرتی، وجہی اور غواصی کے کلام میں بلا کا رس ہے۔ نصرتی کی مثنوی "گلشن عشق" تو حسن اور حسن کی جلوہ گری سے زندہ جاوید شہ کار بن گئی ہے۔ حسن کی جتنی فراوانی اس مثنوی میں ہے کہیں اور نظر نہیں آتی۔ اس کے کلام میں عشق کی بے چینیاں اور ہنگامہ آرائیاں بھی موجود ہیں وصل و فراق کی کیفیتوں کو نصرتی نے اس حسن کمال سے بیان کیا ہے کہ زندگی جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ولی اسی سرمایہ کا وارث ہے اس کے یہاں بھی خیالات کی فراوانی، حسن و عشق کی نیرنگیاں، انداز بیان، پاکیزہ زبان و فنکارانہ صنعت گری

مل کر اردو غزل کے قالب میں روح پھونک دی ہے۔ ظہیر الدین مدنی (ولی گجراتی) کے الفاظ میں "غزل ہی ولی کا یہ جہتا اس کی امتیازی شان ہے اور غزل گو شاعر کی حیثیت سے یہ اس کی شاعرانہ عظمت کا مدار ہے۔ جب اس خضر سخن نے آب حیات کو غزل کی صورت میں پیش کیا تو ہر طرف سے اس کی رہنمائی کا غلغلہ اٹھا اور شمالی ہند کے معجز بیاں اساتذۂ فن نے اس کی رہنمائی کی محض داد ہی نہ دی بلکہ اس کی تقلید کو اپنے لئے باعث فخر بھی سمجھا۔" غزل کے ظاہری و معنوی محاسن کی روشنی میں ولی کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو نقش ہائے رنگ رنگ نظر آتے ہیں۔ جس طرح جے۔ پی۔ روسو کے گیت فرانسیسی ادبیات میں امتیاز رکھتے ہیں اسی طرح ولی کا کلام اپنی شیرینی و لطافت اور حسن ادا کی وجہ سے ہندوستانی زبان میں اہمیت رکھتا ہے وہ وارفتۂ حافظ اردو زبان میں فارسی کی چمن بندی کرتا ہے تو آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور قلب و ذہن کو راحت نصیب ہوتی ہے۔ تغزل ملاحظہ فرمایئے اس میں آپ کو واردات عشق درد و الم، کیف و سرور، یاس و حرماں، لذت و مسرت اور رنج و حسرت سبھی کچھ نظر آئے گا ؎

شراب شوق سے سرشار ہیں ہم　　کبھی بے خود کبھی ہشیار ہیں ہم

اے صنم تیرے دہن کے شوق میں　　ہر کلی میں نغمۂ ناقوس ہے

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا　　بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

سادگی اور سلاست تو میر کی مشہور ہے لیکن میر کے یہاں یہ سادگی اور انداز بیان ولی سے ہو کر ہی آیا ہے ؎

تیرے لب کے حقوق ہیں مجھ پر　　کیوں بھلا دوں میں دل سے حق نمک

یا پھر ؎

جسے عشق کا تیر کاری لگے　　اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

اگر ولی نے اپنے آپ کو "والئ ملک سخن" کہا ہے تو بے جا بھی نہیں۔ اس کے کلام میں جہاں تغزل اور غنائیت بدرجۂ اتم موجود ہے وہیں وہ تشبیہات کا شہنشاہ بھی نظر آتا ہے ؎

کرتا ہے اس کی زلف کی تعریف ولی　　جو ہے مرید سلسلۂ مستقیم کا

یک نقطہ ترے صفحۂ رخ پہ نہیں بے جا　　اس مکھ کو ترے صفحۂ قرآں سے کہوں گا

آسماں اوپر نہیں ہے چادر ابر سفید　　جا نماز زاہد عزلت نشیں برباد ہے

رحیم بے جا، موج بے تابئ دل، صرف دانا پسند، دیدۂ حیراں، وفا دشمن، سکوت بے معنی، منزل شبنم، کوہسار خاموشی، برگ یاقوت، سلسلۂ مستقیم، صفحۂ قرآں، جا نماز زاہد، چادر ابر سفید، شاہ حسن، پر ظل ہما اور آب حیواں ولی ہی کی اختراع و ایجاد ہیں۔

حسن تعلیل یا صنائع و بدائع شعر گوئی کا ایک خاص وصف ہے اور یہ ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں لیکن ولی کے یہاں حسن تعلیل کی کمی نہیں ایک شعر سنئے ؎

اس آبِ روحِ قزل کے کمال لطف کو دیکھ چھپا ہے پردۂ ظلمت میں آبِ حیوانی

ایک اور شعر: آج تیری نگہ نے مسجد میں ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا

صنعت رد الصدر علی العجز کی چند مثالیں پیش ہیں ؎

بے وفا گر تجھ کو بولوں ہے بجا اے نازنیں نازنیں عالم میں ہوتے ہیں اکثر بے وفا

کم نما ہے نوجواں میرا بہ رنگ ماہِ نو ماہِ نو ہوتا ہے اکثر اے عزیزو کم نما

مدعائے عاشقاں ہر آن ہے دیدارِ یار یار کے دیدار بن دوجا عبث ہے مدعا

ایہام گوئی کی صنعت دکنی نہیں ہے یہ شمالی ہند کے سفر کا حاصل ہے کہ ولی نے اس جانب بھی توجہ کی اور جو کمی رہ گئی تھی وہ بھی فنی لحاظ سے پوری ہوئی: —

مذہبِ عشق میں تری صورت دیکھنا ہم کو فرضِ عین ہوا

موسیٰ جو آکے دیکھے تجھ نور کا تماشا اس کو پہاڑ ہووے پھر طور کا تماشا

اور حسنِ طلب کا انداز دیکھیے ؎

لب تمھارے ہیں شفا بخش، ولی ہے بیمار حیف صد حیف جو اس وقت میں درماں نہ کرو

مولانا احسن مارہروی نے 'کلیاتِ ولی' کو ترتیب دیا ہے۔ اس جدید ایڈیشن میں چار سو بائیس (۴۲۲) غزلیں، سات مستزاد، بارہ مخمس اور ترجیع بند، چھ قصائد، دو مثنویاں، چھبیس رباعیاں، چھ قطعات اور چالیس مفردات شامل ہیں۔ اس دیوان کے مطالعہ کے بعد ولی کی عظمت کھل کر سامنے آتی ہے۔ محمد حسین آزاد اور ان سے پہلے کے سبھی تذکرہ نگاروں نے ولی کو ریختہ کا پہلا شاعر قرار دیا۔ حالانکہ اس میں جہاں ولی سے پہلے کے شعرا خصوصاً محمد قلی معانی کے دیوان کی عدم دستیابی کی وجہ سے ایسی غلط فہمی رہی ہے بلکہ خود تذکرہ نویسوں میں تنقیدی شعور کی کمی بھی اس کی دوسری اہم وجہ ہے۔ ورنہ ولی کے کلام کی روانی اور سلاست اور اس کی زبان کا حسن و نکھار اور پھر خسرو کی پہیلیوں اور مکرنیوں کی زبان کا فرق خود بتاتا ہے کہ خسرو سے ولی تک زبان کا ایک تدریجی ارتقا ہے اور اس تدریجی ارتقا میں کچھ کڑیاں کہیں نہ کہیں گم بھی ضرور ہونی چاہئیں۔ تذکرہ نویسی کی اس کوتاہی کو آج بھی ہمارے نقاد سینہ سے لگائے رکھے ہیں۔ ہمیں کسی بھی شاعر کی زندگی اور اس کے فن سے زیادہ دلچسپی اس زمانہ سے ہے جس میں کہ وہ پیدا ہوا تھا اور زمانہ کے عام حالات سے، تہذیبی و ثقافتی، معاشی و معاشرتی اور سماجی و سیاسی حالات سے ہے تاکہ انسانیت کا وہ پورا دور ہمارے سامنے آئے۔ اس سے حیاتِ انسانی کے مستقبل میں چند اہم قدم اٹھانے میں مدد ملتی ہے۔ اس وجہ سے اگر ہم تنقید میں شاعر کے فن سے زیادہ اس کے مواد، خیالات، شعور پر غور کرتے ہیں اور شاعری میں حقیقت و صداقت کی تلاش کرتے ہیں تو اس سے ہمارا مقصود فن اور فن کی اہمیت سے انکار نہیں ہوتا

اسی طرح ایسے شعرا جنھوں نے زبان کو متاثر کیا ہے اور زبان کے ارتقا میں مدد دی ہے ان کا کلام لسانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بیحد مددگار و معاون ثابت ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق کا اعتراض کہ ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم قرار دینا غلط ہے جب کہ محمد قلی کا دیوان منظر عام پر آچکا ہے' غلط ہے جیسا کہ میں نے اس سے پہلے کہا ہے ولی کی حیثیت دوہری ہے۔ "خاتم الشعرا" ہے۔ قدیم دور کا خاتمہ ولی پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔ اور ولی باوا آدم ان معنوں میں ہے کہ وہ حور و قصور اور ملائک کی جنت سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں قدم رکھتا ہے وہ ایک نئے جہان میں نئی توانائی' نئی قوت اور نئی زبان کو لے کر آتا ہے اور ایک جہان تازہ کو نیا رنگ روپ' نیا آہنگ دے جاتا ہے اس کی یہ زمانی اہمیت زبان و بیان میں غیر معمولی انقلاب کا نتیجہ ہے۔ اور یہ انقلاب خود ولی کی شاعری سفر دہلی (سنہ ۱۷۰۰ء) کی وجہ سے رونما ہوا۔ آزاد نے 'آب حیات' میں لکھا۔ ولی تین مرتبہ دہلی گئے۔ ولی سیلانی طبیعت کے مالک تھے وہ تین سے بھی زاید مرتبہ دلی کا سفر کر سکتے ہیں لیکن دیگر تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ وہ صرف ایک بار دہلی گئے۔ اہل دلی کا دل لوٹ لیا' خود متاثر ہوئے اوروں کو بھی متاثر کیا' اپنی زبان کو سدھارا' فارسی کے اثر کو قبول کیا' شاعری کو نئے معنی پہنائے' سلاست' روانی' خوش آہنگی' خوش مزاجی اور لطافت و رنگینی پیدا کی۔ اسی طرح اہل دلی کو تحفتہً ایک نئی زبان عطا کی' گو یہ زبان نئی تھی اس زبان میں شعر گوئی بھی نئی بات نہیں تھی۔

دیوان فائز کے مرتب مسعود حسن رضوی اور 'بکٹ کہانی' کو منظر عام پر لانے والے محقق ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا کہنا کہ شمال میں ولی سے قبل ہی شاعری کے دور کا آغاز ہو چکا تھا غلط بھی نہیں ہے۔ فائز کا دیوان ثبوت میں موجود ہے 'بکٹ کہانی' کے رنگین بول موجود ہیں جسے محمد افضل نے ۱۶۲۵ء میں آپ بیتی کو منظوم کیا صرف لسانی نقطۂ نظر سے اہم نہیں فن کے لحاظ سے بھی اہم کارنامہ ہے۔ اس سے ہٹ کر ایک نیا نام عبدالحلیم عطا سندھی کا بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ میمن عبدالمجید نے اردو نامہ (کراچی شمارہ ۲۳) میں عبدالحلیم عطا کا تعارف کرایا ہے۔ اس کی پیدائش (۱۶۳۰ء) سنہ ۱۰۴۰ھ کی ہے اور تقریباً (۸۰) سال بقید حیات رہتا ہے۔ وہ فارسی کا شاعر ہے لیکن اس کے اردو (قدیم) کلام کا نمونہ بھی ملتا ہے۔ عطا کا زمانہ شاہ جہاں سے لے کر محمد شاہ تک کا ہے۔ گویا عطا ولی کے سفر دہلی سے قبل ہی اس دار فانی سے کوچ کر جاتے ہیں۔ کلام کا نمونہ ہے:

اے مسلمانان وطن بیداد ہے بیداد ہے فریاد ہے

اس سے اندازہ ہوتا ہے شمالی ہند میں ولی سے قبل ہی اردو شاعری کا آغاز بعید از حقیقت نہیں ہے لیکن اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں بھی ہمیں پس و پیش نہیں کرنا چاہئے کہ جس طرح ولی سے قبل فیروز' معانی' نصرتی' وجہی' اور بہت سارے قدیم شعرا پیدا ہو چکے تھے جن کے کارنامے اردو شعر و ادب کے قابل فخر کارنامے ہیں ان ہی قدیم شعرا میں خسرو' قائم' محمد افضل اور عطا کو بھی شامل کر لیجئے۔ میں سمجھتا ہوں تب بھی ولی کی شاعرانہ عظمت پر حرف

جیسی آتا ۔ وہ ایک دور کا خالق ہے ۔ فیروز بیدری، ذوق اور ناسخ نے اردو زبان و ادب کو بلاشبہ متاثر کیا ہے لیکن زبان و بیان میں جو انقلابی تبدیلیاں ہوئیں اور خصوصاً شمالی ہند میں اردو شاعری کا چلن عام ہوا ایسا ولی سے پہلے کبھی نہیں تھا۔ ولی کی اولیت اور فوقیت زمانی و مکانی نہیں ہے فن و زبان کے اعتبار سے ہے۔ جس طرح حالی نے آہنگ میں نیا رنگ بدلا، اردو غزل میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی کوشش کی اردو نظم کو رواج دینے میں تگ و دو کی ہے اسی وجہ سے حالی کو دور جدید کا بانی قرار دیتے ہیں اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ حالی اردو شاعری کا بانی ہے وہ ایک دور کا بانی ہے ایسے ہی جیسے ولی عہد آفریں ہے۔ ولی نے شمالی ہند میں شاعری کے شعور کو عام کیا ہے وہ فن جو دل کے بہلانے کی حد تک رائج تھا یا محض تفنن طبع کے لئے، شعوری طور پر رائج ہو گیا۔ اس کا اعتراف شمالی ہند کے تقریباً سبھی تذکرہ نویسوں نے کشادہ دلی سے کیا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم ولی کے مرتبہ کو چھین لیں اور اس کے ادبی کارنامہ کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کریں۔ ولی شمال و جنوب میں یکساں طور پر اہم شاعر ہے وہ عظیم ہے ان معنوں میں کہ اس نے دکن کی شاعری میں فنی و لسانی تبدیلیاں کی ہیں، دکنی شاعری کو نیا حسن نیا آب و رنگ اور نئے رجحانات بخشے ہیں۔ غزل کا تغزل اسی کے شاعرانہ مزاجی کی وجہ سے زیادہ رنگین اور جاذب نظر ہو گیا۔ اور شمال میں اس نے حاتم، سودا اور میر کو متاثر کیا۔ انھیں اردو زبان میں (ریختہ) شعر کہنے کی دعوت دی اور وہ محفلیں جہاں کہیں صرف فارسی کلام سنائی دیتا تھا وہاں ریختہ کی سحر انگیز آواز بھی سنائی دینے لگی اور یہ آواز ولی کی آواز تھی۔ اس آواز نے جو تاثر پیدا کیا اسی اثر آفرینی کی وجہ سے ولی کی عظمت بڑھ جاتی ہے۔ گویا لسانی اور فنی اعتبار سے جو قدیم شاعری میں تبدیلیاں آئیں وہ ولی کے سفر دہلی کا حاصل ہیں۔ ولی نے جہاں ریختہ گوئی کے رجحان کو عام کیا ہے شمال میں، وہیں اس نے شمال سے بہت کچھ حاصل بھی کیا ہے۔ یقیناً اس نے شمالی ہند میں ریختہ گوئی کی دعوت عام دی اور اس کی پیروی اردو زبان کے بڑے شاعروں نے کی ہے ساتھ ہی ولی نے زبان کی سلاست و روانی سادگی و حسن، نئے الفاظ، نئے محاورے و استعارے سبھی کچھ ایک پیر فن شناس حضرت سعد اللہ گلشن کے فیضان کا صدقہ ہے۔ یہ رجحان ہی بنیادی طور پر غلط ہے کہ شمالی ہند والوں نے دکن والوں کو اور دکن والوں نے اہل دہلی کو کیا دیا ہے اور کہاں کا شاعر عظیم ہے۔ یہ جذبۂ فوقیت و برتری کا مسابقتی حد تک ہو ٹھیک ہے اس مسابقت میں جیسے کہ دلی اور لکھنؤ کے دبستانوں میں جاری تھی اردو زبان و ادب کے حق میں مفید بھی ثابت ہوئی یا اس سے پہلے مظہر جان جاناں نے جو اسپرٹ دکنی کے خلاف پیدا کر دی تھی لسانی اعتبار سے بے حد مفید ثابت ہوئی لیکن جب یہی رجحان مسابقت مخالفت ______ تک بڑھ جاتا ہے تو اس کا منفی پہلو اپنا اثر دکھانے لگتا ہے۔ اگر میں میر و غالب کی شاعرانہ عظمت سے انکار کر دوں محض اس وجہ سے کہ ان شعرا کا تعلق شمال سے اور میرا دکن سے ہے تو آپ مجھ پر ہنس دیں گے اور آپ کا یہ تمسخر بیجا بھی نہیں۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ ایک ہے

اردو زبان کا ملک ایک ہے، ارتقائی تدریجی کڑیاں کہیں ٹوٹتی ہیں اور کہیں بڑھتی ہیں اس سے اکائی اور وحدت میں فرق نہیں پڑتا۔ بہرحال اردو زبان نواح دہلی میں پیدا ہوئی، اس کا ڈھانچہ وہیں بنا۔[1] حضرت دہلی "ہی کی دین ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی پرورش دکن کی فضا میں ہوئی۔ ولی نے کیا کیا —؟! ولی نے شمال کی امانت کو حاتم و میر کے ہاتھوں پہنچادیا اسی زبان کو جو خسرو کی تھی جو اولیائے دہلی کی خانقاہوں میں آنکھیں کھولی تھی۔ اس طرح ولی کے بعد اردو زبان اہل ہند کی مشترکہ ملکیت بن گئی ولی نے جو کارنامہ اردو تاریخ میں انجام دیا ہے اس کو تسلیم کرنے میں کیا امر مانع رہ جاتا ہے؟!

ولی کے سفر دہلی اور قیام گجرات کی وجہ سے اس کی شاعری میں اہم ترین تبدیلیاں آئیں۔ اردو غزل میں امرد پرستی کا رجحان کہاں تھا؟ لیکن شمال میں فارسی غزل اس رجحان سے مملو نظر آتی ہے اور ولی کے کلام میں اردو شاعری میں یہ رجحان فارسی غزل ہی سے ہو کر آیا ہے اردو غزل اسی دور میں فارسی سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوئی۔ یہ صحیح ہے محمد قلی نے بھی حافظ کے غزل در غزل شعر کہنے کی کوشش کی ہے اس نے تو بعض غزلیات کا جوں کا توں دکنی میں ترجمہ بھی کردیا لیکن فارسی کے رجحانات قبول نہیں کئے اور رنگ تو وہی دکنی رہا، ماحول دکنی رہا افکار وخیالات دکنی رہے، فضا دکنی ہی رہی۔ لیکن شمال میں بات الٹ گئی اردو غزل کو فارسی غزل کا چربہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ ولی نے عراقی، جامی، انوری، خاقانی، خیالی، ہلالی اور امیر خسرو کے رنگ و آہنگ سے اثر قبول کیا قیام گجرات کے زمانے میں اس نے نورالدین صدیقی کی درسگاہ میں تربیت پائی اور شاہ گلشن سے (سنہ ۱۱۱۲ھ اور ۱۱۱۳ھ کے دوران) احمد آباد (گجرات) میں ملاقات ہوئی تھی جس کا ذکر ولی نے اپنے فارسی رسالہ "نورالمعرفت" میں بھی کیا ہے (ولی گجراتی اور شاہ سعد اللہ گلشن۔ اردو نامہ کراچی مضمون نگار اکرام چغتائی) ان بزرگوں کی تربیت اور ملاقات نے اپنا اثر دکھایا ہے۔ ولی کے یہاں تصوف کا جو رنگ نظر آتا ہے اس میں اس کی ذاتی کوششوں کے ساتھ ساتھ ان بزرگان دین کے فیضان کا بھی بڑا دخل ہے۔ ولی کے کلام کی تیسری خصوصیت ایہام گوئی بھی سفر دہلی کے بعد میں پیدا ہوئی۔ شمال میں آبرو، ناجی، یکرنگ، اور فائز کے یہاں بڑی شدت کے ساتھ ایہام اور صنعتوں کا استعمال نظر آتا ہے یہ رجحان بھی دکنی رجحانات سے مختلف ہے۔ مظہر نے جو تحریک چلائی تھی اس کی وجہ صرف دکنی سے انحراف نہیں بلکہ ہندی کے ثقیل الفاظ کی کانٹ چھانٹ اور فارسی الفاظ کو جگہ دینا تھا۔ اس سے اردو زبان میں حسن پیدا ہوا، نکھار آیا لیکن اس تحریک کا منفی پہلو یہ ہے کہ اردو شاعری "فارسی نژاد" کہلائی تصوف کا مردہ رجحان جو فارسی میں موجود تھا، سوقیانہ پن، امرد پرستی، ایہام گوئی اور داخلیت کے رجحانات

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔

فارسی سے ہندوستان منتقل ہو گئے۔ اور یہ رجحانات حالی کے دور تک جوں توں باقی رہے۔ اس سے اردو شاعری میں جو جمود کا اضافہ ہوا یعنی اضمحلال، جمود، ٹھہراؤ اور زندگی کا جو گھٹیا پن پیدا ہو گیا وہ ناقابل تلافی نقصان کا سبب بنا۔ فارسی سے اردو زبان کی سودا بازی بڑی مہنگی پڑی۔ اس سے زندگی کا اعلیٰ ترین تصور متاثر ہوا، فضا برباد ہوئی اور شاعری میں کوئی حیات آفریں رجحان پرورش نہ پا سکا۔ اس حیثیت سے ولی سے حالی تک پہنچتے پہنچتے ہماری شاعری نے بہت ظلم ڈھائے ہیں۔ زبان و بیان کی وجہ سے ولی، میر اور غالب کتنے ہی عظیم شاعر کیوں نہ ہوں انھوں نے حیات انسانی کو کیا دیا ہے ؂

چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط ؟!

ولی دیگر پیشرو شعرا اور معاصرین کی طرح خوابوں کی دنیا میں محبوس رہا، زندگی کا حرکی تصور اس کے یہاں نظر نہیں آتا۔ ولی صاحب عقل و فہم شاعر تھا۔ قرآن، حدیث، اور فقہ کی تعلیم اس نے حاصل کی تھی لیکن اس کی تعلیم وہی روایتی انداز میں ہوئی تھی ایسی تعلیم جو اسلامی تو کہلاتی تھی لیکن اسلامی روح اس میں نہ تھی۔ درحقیقت تصوف کا جو رجحان ہندوستانی خانقاہوں میں عام ہوا وہ اس رجحان سے عاری تھا جو حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں پرورش پایا تھا۔ اس میں ایرانی افکار اور ہندی رجحانات کی آمیزش اچھی طرح ہو چکی تھی۔ دوسری وجہ دولت کی فراوانی، عیش کوشی، اور زندگی سے فراریت کا رجحان بھی ہے۔ اسلامی تصوف کی جو مٹی پلید ہوئی اور تن آسان ملاؤں نے جن رجحانات کو تصوف کے نام پر پھیلایا ہے اردو شاعری اس کا شکار ہو کر رہ گئی۔ ممتاز حسین (نئے تنقیدی گوشے) کسی شاعر کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ "یہ رجحان چونکہ اس زمانہ میں نہیں تھا اس وجہ سے ہم اس کی توقع شاعر سے نہیں کر سکتے" یا پھر ضمیر حسن فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہوئے فسانہ عجائب کو تمام عیوب کے باوجود اردو کا گرانقدر سرمایہ اس وجہ سے قرار دیتے ہیں کہ اردو کے کلاسیکی ادب میں کچھ سرمایہ باقی نہیں رہے گا ___ اس انداز سے مجھے اختلاف ہے۔ نقاد کا ایک نظریہ ہوتا ہے جانچنے کا اور یہ نظریہ اس کے ادبی عقیدہ کا حاصل ہوتا ہے کوئی شاعر یا ادیب نقاد کے نظریہ پر پورا نہ اترتا ہو جب بھی اس کو سراہنا یا اس کے کلام کو باقی رکھنے کی کوشش کرنا درحقیقت اپنے فرض سے کوتاہی برتنا اور نظریہ سے انحراف کرنا ہے۔ ولی اور اس کے بعد کے شعرا جن کا تعلق ہماری قومی تاریخ کے انتہائی پرآشوب دور سے ہے (خصوصاً میر و غالب کا دور) ان کا شعور اس قابل ہونا چاہئے تھا کہ وہ اپنے فن کا صحیح اور جائز استعمال کرتے۔ شعور کا نہ ہونا کوئی قابل معافی بات نہیں ہے ساری بات جو ہدف ملامت بنتی ہے وہ یہی ہے کہ ان میں وہ شعور کیوں پیدا نہیں ہوا ؟! واقعہ تو یہ ہے حالی سے پہلے وہ تنقیدی شعور کہاں تھا حالی بھی ایسے ہی گزر جاتے اور قوم چند سال مزید کسی حالی کا انتظار کرتی۔ کارل مارکس نے اپنے شعور کی خوشہ چینی کہاں سے کی ؟ جو شخصیتیں حیات آفریں ہوتی ہیں جو ایک

زمانہ کو اپنی کوکھ سے جنم دیتی ہیں اور جو افکار وخیالات کے بل بوتے پر جہاں تحریکی تشکیل و تعمیر کرنا چاہتی ہیں وہ خود ہے صفحۂ ہستی پر ابھرتی ہیں۔ ولی اور سودا کے بعد کے شعرا خصوصاً میر وغالب اپنے دور کے انتہائی انقلابی شاعر ہو سکتے تھے یقیناً قوم وملک کی بدبختی ہے کہ ان شعرا نے حیات کا رس نہیں شعریت و موسیقیت کے ذریعہ زہر پلایا ہے۔ میر وغالب کی شاعری ہمارے جذبات کی شاعری ہے لیکن ہمارے خیالات کا گھٹیا پن، سوقیانہ پن، اوچھا پن اور فراریت کا رجحان بھی اس سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ بات تغزل پر جان چھڑکنے والے نقادوں پر گراں گزرے گی اگر کہوں کہ شمشیر و سناں کو بہرحال چنگ ورباب سے اولیت حاصل ہونا ہی چاہئے۔

واقعہ تو یہ ہے کہ ولی کی شاعری عہد آفریں ہے حیات آفریں نہیں۔ اس نے ایک زمانہ کو متاثر کیا ہے نئی زبان عطا کی ہے، نیا آہنگ و نیا آب و رنگ دیا ہے۔ بحیثیت فن کار ولی مصلح زبان ہے وہ عظیم فن کار ہے لیکن فکر وخیال کے لحاظ سے اس کی شاعری ادبی شاعری ہے۔ آپ فن کے پیش نظر اسے عظیم شاعر قرار دیں کہ اس کی عظمت کا راز اس کے فن و زبان میں ہے۔ میں اسے مواد کے پیش نظر دیگر شعرا کی طرح (جن میں میر و غالب خصوصیت سے شامل ہیں) روایت پرست اور غیر ترقی پسند کہوں تو غلط نہ ہوگا۔

(بسلسلہ صفحہ ۲۲)

شاعری کو سطحی بنایا ہے۔ ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں پر ان کو ٹوکا اور بے دردی کے ساتھ نشتر چلایا ہے ان کو بدذوقی ہٹ دھرمی اور متعصب کہنے کے بجائے ان کے بیان میں بھی سچائی کے عناصر کی تلاش کی جائے تاکہ جگر کی شاعری کے بارے میں کوئی صحیح متوازن اور منصفانہ رائے قائم کی جا سکے، اسقام اور اغلاط سے جگر کیا دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے شاعر کا کلام پاک نہیں ہے اس لئے میرے خیال میں یہی بہتر ہوگا کہ جگر کے موافقین و مخالفین دونوں کی رایوں کا الگ الگ جائزہ لے کر دیکھا جائے کہ کس کی کونسی رائے کہاں تک صحیح اور کہاں تک غلط ہے۔

(بسلسلہ صفحہ ۳۸)

دیکھا۔ وہ بھاری بھرکم ساہوکار کو اپنی رکشہ میں لادے تیز رفتاری سے سیاہ ڈانبر روڈ پر بڑھتا جا رہا تھا تھوڑی ہی دیر بعد وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

"وہ کسی ضلع پر کسی دفتر میں ملازم ہے۔ اس کی بیوی یہاں شہر میں رہتی ہے۔ اور وہ یہاں آتا جاتا رہتا ہے" میرے کانوں میں جانی پہچانی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اور سینے میں کوئی شے جل رہی تھی۔ ... مجھے احساس ہو رہا تھا کہ دنیا کا نگاہوں کے آگے تیرہ و تار ہو جاتا کیا ہوتا ہے۔

اور مجھے یاد آ گیا کہ ملک کے مشہور اور بلندپایہ شاعر فیروز کو میں نے پہلی بار کب اور کہاں دیکھا تھا۔

اکرام جاوید (افسانہ)

پھول کا داغ

ابھی فیروز نے چند شعر ہی سنائے تھے کہ مجھے محسوس ہوا جیسے اس کی آواز پہلے بھی کہیں سن چکا ہوں۔ دراز قد اور صحت مند سڈول جسم کے گورے گلابی فیروز کا چہرہ کتابی تھا۔ سر کے بال بڑھے ہوئے خشک اور ماتھے پر پریشان تھے۔ ماتھا جو کافی کشادہ تھا۔ پتلی پتلی سیاہ خمدار ابروؤں تلے گہری سیاہ آنکھوں کے چراغ بڑی مدھم لو میں جل رہے تھے۔ لانبی ستواں ناک کی نوک پر ایک سیاہ تل تھا۔ اور پتلے پتلے خوبصورتی سے ایک تنگ دہانہ میں جڑے ہوئے ہونٹوں کا رنگ سرخ تھا شعر پڑھتے ہوئے جب بھی اس کے لب وا ہوتے سفید دانتوں کی قطار بجلی کی طرح چمک اٹھتی تھی۔ اس کے صاف شیو کیئے ہوئے چہرے پر بلا کی نرمی اور ملاحت تھی۔ اسکی آواز غضب کی پرسوز اور مترنم تھی اور شعر سناتے ہوئے وہ مجسم شعر دکھائی دیتا تھا ــــــ!

اُس کے چہرے پر نگاہیں جمائے میں سوچ رہا تھا کہ یہ چہرہ مجھے اس قدر جانا پہچانا کیوں دکھائی دیتا ہے؟ میں نے اس چہرے کو کہاں دیکھا ہے؟ اس آواز کو کب اور کہاں سنا ہے؟ فیروز اپنی غزل سنا کر چلا گیا... یکے بعد دیگرے کئی شاعر آتے گئے' مشاعرہ چلتا رہا۔ لیکن فیروز کے بعد میں کسی بھی شاعر کو نہیں سن سکا۔ میرا خیال حافظے کے ایوانوں میں بھٹک رہا تھا۔ میری نگاہیں فیروز پر جمی ہوئی تھیں جو ڈائس پر ایک طرف دوسرے شاعروں سے الگ خیالوں میں گم مجسم صورت بنا بیٹھا تھا ــــــ!

مشاعرہ ختم ہوا تو سامعین نے شاعروں کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ شعر و ادب کے پرستاروں نے فیروز کو بھی گھیر لیا تھا۔ زرق برق ملبوسات اور زیورات میں غرق شہر کی خوبصورت ادب نواز خواتین اُس پر مہربان ہو گئی تھیں۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اُس کے آٹوگراف لینے کے لئے جد و جہد کر رہے تھے۔ وہ میری طرح بوکھلایا ہوا دکھائی دیتا تھا جیسے شعر و ادب کی پرستش اور قدردانی کا اُسے زندگی میں پہلی بار تجربہ ہو رہا ہو۔ فیروز کا نام دنیائے ادب میں جانا پہچانا نام تھا۔ اُس کی شہرت مشک کی خوشبو کی طرح ملک بھر میں پھیلی ہوئی تھی لیکن اس کے جسم و صورت سے کوئی بھی آشنا نہ تھا۔ اس کی تصویر تک کہیں نہیں چھپی تھی۔ آج سے پہلے وہ کسی بھی مشاعرے میں دیکھا نہیں گیا تھا۔ اس کی شخصیت پُراسرار تھی۔ وہ بے حد خلوت نشیں اور گمنامی کا دلدادہ تھا لیکن کسلم تو

وہ نہیں رہ سکا تھا، البتہ خلوت نشیں ضرور تھا۔ اور آج پہلی بار مشاعرے میں اُسے دیکھ کر لوگ حیران و ششدر رہ گئے تھے، جیسے انھیں یقین نہیں آرہا ہو کہ قلب و نظر کی کائنات پر حکومت کرنے والا۔ دلوں میں جذبات کے طوفان اٹھانے والا، تشنگی، نا آسودگی اور اضطراب کی آگ کو بجھانے والا، خوابوں کا شہزادہ، اُن کا محبوب شاعر ایک جسمانی وجود بھی رکھتا ہے۔ وہ سب کے لئے اجنبی تھا لیکن مجھے وہ اجنبی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میں نے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہے۔ ضرور دیکھا ہے۔ لیکن کہاں؟ کب؟ مجھے کچھ بھی یاد نہیں آرہا تھا۔ میں نے اپنے افسانہ نگار دوست آصف سے پوچھا؟

"تم فیروز کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

"بالکل نہیں ـــــ میں اس کے نام سے واقف ہوں بس۔" آصف نے جواب دیا۔

"وہ شاید اسی شہر میں رہتا ہے"؟ جرنلسٹ خاں نے بے یقینی سے کہا۔

"سچ تو یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی فیروز کے تاریخ و جغرافیہ سے واقف نہیں ہے۔" جواں سال شاعر فاروق نے جذباتی آواز میں کہا۔ "میں تو آج پہلی بار اس کی صورت دیکھ رہا ہوں۔"

"کوئی بھی اس کی شخصی زندگی سے واقف نہیں۔" میری آواز میں مایوسی کا درد تھا۔

"ٹھہرو ـــ" آصف جلدی سے بولا اس شاعرے کے معتمد کو یقیناً اس کے بارے میں بہت کچھ علم ہوگا میں کمالی کو لے آتا ہوں۔ فیروز کو اسی سندباد نے دریافت کیا ہے۔"!

اور تھوڑی دیر بعد دُبلا پتلا لمبا تڑنگا سیاہ فام کمالی ہمارے سامنے تھا۔

"دوستو۔ مجھے بھی اس کے بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں ہے۔ وہ .... ہمارے اسی شہر میں رہتا ہے۔ مجھے اس کے مکان کا پتہ تک نہیں معلوم تھا۔ میں ایک دوست کی وساطت سے اس تک پہنچا۔ اور لاکھ منت و سماجت کے بعد اُسے مشاعرہ میں لا سکا۔ وہ تو منظرِ عام پر آتے ہوئے ڈرتا تھا ـــ"

"وہ کسی ضلع پر کسی دفتر میں ملازم بھی ہے۔" کمالی کے ساتھی نے انکشاف کیا۔ "اس کی بیوی یہاں شہر میں رہتی ہے اور وہ یہاں آتا جاتا رہتا ہے۔"

"اچھا تو فیروز صاحب ملازم شاہ بھی ہیں۔" جواں سال فاروق نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"ہائے رے ملک کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس ـــ!"

"ارے وہ جا رہا ہے۔" لمبا تڑنگا بانس بدن کمالی ہڑبڑا کر یکایک کھڑا ہوا۔

اور ہم نے چونک کر دیکھا۔ فیروز ہال سے باہر نکل گیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک عجیب سی کشمکش تھی۔ میں یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور مجھے کچھ بھی یاد نہیں آرہا تھا ـــــ!

میں رات خاطرے سے واپس آنے کے بعد میں دیر تک فیروز کے بارے میں سوچتا رہا۔ لیکن صبح اٹھا تو ایک شاعر کی یاد پر زندگی کے دوسرے مسائل نے گرد سی جما دی تھی۔ میں جائداد اور پانی کے جھگڑوں میں الجھ کر رہ گیا۔ میں رہتا تو شہر میں تھا لیکن زندگی زراعت کی آمدنی پر بسر کرتا تھا۔ زراعت جو گاؤں میں تھی۔ زمین جائداد کے انتظامات اور جھگڑوں کے سلسلے میں مجھے یاد آیا کہ دو چار دن کے اندر مجھے گاؤں جانا ہے۔ گیہوں کی فصل کٹ چکی تھی۔ اور میرے کارندے راس کرنے کے لئے میری آمد کے منتظر تھے۔ اس طرح اپنے مسائل میں الجھ کر میں فیروز کو بھول سا گیا ——!

اس دن گجردم نکلنے والی پہلی ٹرین سے میں گاؤں کے لئے چل پڑا۔ جب میں شانتی پور ریلوے اسٹیشن پر اترا تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ شانتی پور سے میرا گاؤں کوئی سات میل دور واقع تھا۔ شانتی پور سے میرے گاؤں تک آر۔ ٹی۔ سی کی بس دن میں دو چار بار جاتی تھی۔ ٹرین چونکہ لیٹ تھی اس لئے بس جا چکی تھی۔ اور میرے پاس وقت نہیں تھا کہ دوسری بس کا انتظار کرتا۔ میرے قدم خود بخود آبادی کے آخری حصے کی طرف بڑھ گئے جہاں ڈامبر روڈ کے برگد کے برسوں پرانے گھنے پیڑ کے زیر سایہ دو چار رکشا والے ہمیشہ سواریوں کے انتظار میں کھڑے رہتے تھے۔ بس سے دوگنے کرائے پر کوئی بھی رکشا مجھے گاؤں پہنچا سکتی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ میل کی مسافت پیدل طے کر کے جب میں برگد کے گھنے پیڑ کے قریب پہنچا تو صرف ایک رکشا وہاں خالی دکھائی دی۔ لیکن رکشا ران کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں نے رکشا کے قریب پہنچ کر رکشا کی ہینڈل پر لگی ہوئی گھنٹی بجائی تو برگد کے موٹے تنے کی اوٹ سے ایک نرم اور شائستہ سی آواز بلند ہوئی۔

" ابھی حاضر ہوا صاحب !"

" مراد پور چلو گے بابو ؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

" ضرور چلیں گے۔ ڈیڑھ روپیہ کرایہ ہوگا" رکشا والے نے بدستور برگد کے تنے کی اوٹ سے کہا۔

" ٹھیک ہے۔ ذرا تیز چلنا ہوگا" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا" چلو۔ جلدی کرو بابو۔ !"

" ابھی ایک منٹ میں حاضر ہوتا ہوں" تنے کی اوٹ سے آواز آئی۔

اور میں خالی رکشا میں سوار ہو گیا۔ بریف کیس کو سیٹ پر ایک طرف رکھ کر میں نے جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکالی۔ اور ایک سگریٹ سلگا لیا۔ اور بے صبری سے بولا" جلدی کرو بھائی۔ دیر ہو رہی ہے"

" ابھی آیا حضور" کہتے ہوئے وہ برگد کے تنے کی اوٹ سے نکل آیا۔ وہ گورے رنگ اور صحت مند جسم والا اونچا پورا نوجوان تھا خاکی رنگ کی نیکر اور نیلی سوتی قمیص میں ملبوس، سر پر ایک میلی سی فیلٹ ہیٹ اس طرح پہنے ہوئے تھا کہ اس کا نصف چہرہ چھپ گیا تھا۔ وہ جلدی سے آیا۔ اور آتے ہی میری طرف پشت کر کے رکشا کی ہینڈل

تھام کر سڑک پر آ گیا۔ اور پھر ایک جھٹکے سے سیٹ پر بیٹھ کر زور زور سے پیڈل مارنے لگا ــــــ!

سرما ختم ہو رہا تھا اور گرمیوں کے آغاز کا زمانہ تھا۔ گہرے نیلے آسمان پر سفید ابر کے چھوٹے چھوٹے برف کی پہاڑیوں کی طرح جمے ہوئے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ فضا سورج کی تمازت سے گرم تھی۔ قابلِ برداشت گرم اور خوشگوار۔ چاروں طرف ہرے بھرے میدان پھیلے ہوئے تھے' میدانوں میں جابجا سرسبز و شاداب جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں' اور جوار کے کھیتوں میں ننھی منی کالی اور خاکی رنگ کی چڑیاں دھوم مچا رہی تھیں۔ پس منظر میں لطیف سُرمئی دھند میں ڈوبے ہوئے جنگل اُفق کے ساتھ ساتھ دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ سرخ مٹی کے میدانوں کے درمیان سیاہ ڈانبر روڈ ایک سیدھی مانگ کی طرح مراد پور کی طرف چلی گئی تھی سڑک کے دونوں طرف آم' املی' جامن' کیکر اور گولر کے درختوں کی قطاریں ایستادہ تھیں۔ ہوا کے آوارہ جھونکوں میں جوار کے بھٹوں' پکتے ہوئے گنے کے رس اور جنگلی پھولوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ رکشہ راں جوان اور صحت مند آدمی تھا۔ رکشا ہوا کے دوش پر جیسے اُڑتی جا رہی تھی۔ تیز تیز پیڈل مارتے ہوئے رکشہ والے کے گھٹنوں تک عریاں گورے رنگ کے پاؤں میری نگاہوں میں تھے۔ گورے رنگ کے پاؤں جن پر گھٹنے سے پنڈلیوں تک گھنے سیاہ بال اُگے ہوئے تھے۔ سیدھے پاؤں کے گھٹنے پر ہلکی سی خراش کا نشان تازہ تھا جس پر مٹی اور گرد جم رہی تھی۔ اُس کے پاؤں میں سیاہ رنگ کے بھاری فوجی جوتے تھے جو شہر میں پرانے سامان کی دکانوں پر سستے داموں مل جاتے تھے۔ میں رکشہ میں بیٹھا بے فکری اور آرام سے سگریٹ پیتا' نوجوان رکشہ راں کے متحرک صحت مند جسم کو' کھیتوں' میدانوں درختوں اور آسمان پر جمے سفید ابر کے ٹکڑوں کو دیکھتا رہا۔ رکشا تیز رفتاری سے سڑک پر چلی جا رہی تھی۔ خاموش بیٹھے بیٹھے میرا جی اُکتا گیا۔ اور میں نے ایک سگریٹ اور سلگایا اور رکشہ والے سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈنے لگا۔ سوچتے سوچتے میں نے رکشہ راں کے خاکی نیکر کی پھولی ہوئی جیب کی طرف دیکھا جس میں سے ایک رسالہ کسی شوخ حسینہ یا شریر بچے کے چہرے کی طرح جھانک رہا تھا۔

"اچھا تو تمھیں مطالعہ کا بھی شوق ہے؟" میں نے خاموشی کا طلسم توڑ دیا۔

"جی ــ جی ہاں۔ رکشا راں نے تیز پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان مختصر سا جواب دیا۔

"یہ تمھاری جیب میں کونسا رسالہ ہے؟"

"شب ماہ" وہ پیڈل پر تیزی سے پاؤں چلاتے ہوئے بولا۔

"شب ماہ تو بڑا معیاری رسالہ ہے" میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔ "خوب۔ آدمی با ذوق معلوم ہوتے ہو"!

"جی۔ جی ہاں" وہ تقریباً ہانپتے ہوئے بولا "شب ماہ کا تازہ شمارہ ہے۔ آپ چاہیں تو اسے دیکھ سکتے ہیں" کہتے ہوئے اُس نے رکشا کو روکے بغیر جیب سے رسالہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے پوچھ

لے لیا۔ اور وہ بدستور رکشہ چلاتا رہا۔ رکشہ کے پہیوں، چین اور پیڈلوں سے طرح طرح کی آوازیں بلند ہوتی رہیں میں نے شوق و مسرت سے "شب ماہ" کو دیکھنا شروع کیا۔ "شب ماہ" ایک مشہور ادبی پرچہ تھا۔ اس میں صرف بہترین ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ "شب ماہ" کے حصۂ شعر کو دیکھتے ہوئے مجھے بے اختیار فیروز یاد آ گیا۔ گزشتہ مشاعرے کی رات کا سارا رومانی ماحول ذہن میں تازہ ہو گیا۔ "شب ماہ" کے اس شمارے میں فیروز کی غزل نمایاں طور سے شایع ہوئی تھی۔ فیروز واقعی بڑا پیارا شاعر تھا۔ وہ ہمیشہ ہی سے میرا محبوب شاعر رہا تھا۔ لیکن کھلی آزاد فضاؤں میں، سفید ابر کے ٹکڑوں سے سجے ہوئے بیکراں نیلے آسمان کے زیر سایۂ خوبصورت مناظر فطرت کے درمیان، ہواؤں کی سی رفتار سے دوڑتی ہوئی رکشہ میں بیٹھ کر فیروز کی غزل پڑھتے ہوئے مجھے نشہ سا ہو رہا تھا۔ میں نے مسرور اور مخمور لہجے میں کہا "بڑا پیارا شاعر ہے۔ لاجواب لازوال فیروز!"

رکشہ راں نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ خاموشی سے رکشا چلاتا رہا ——!

ساتھ ہی مجھے اس ذہنی کشمکش کا خیال آیا جو فیروز کو مشاعرے میں پہلی بار دیکھ کر ابھری تھی۔ وہی سوال میرے ذہن میں پھر گونج اٹھے۔ وہ مجھے اجنبی کیوں محسوس نہیں ہوا۔ میں نے اسے مشاعرے سے پہلے کب اور کہاں دیکھا تھا؟ میں نے "شب ماہ" کے رسالے کو نشست پر بریف کیس پر رکھ دیا۔ اور سگریٹ کے کش لیتے ہوئے سوچنے لگا۔ کب اور کہاں میں نے فیروز کو دیکھا تھا؟

ابھی میں ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا کہ رکشا ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ میں نے چونک کر دیکھا سامنے مراد پور کا بس اسٹاپ تھا۔ بس اسٹاپ کے سامنے گھانس پھونس کی بنی ہوئی خستہ حال ہوٹل میں گراموفون پر کوئی گھٹیا سا فلمی ریکارڈ بج رہا تھا۔ ہوٹل کے سامنے میرے کار ندے کھڑے ہوئے تھے۔ نوجوان رکشاراں میری طرف پشت کئے میلی سی دستی سے چہرے کا پسینہ پونچھ رہا تھا، اور اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی سعی کر رہا تھا۔

"بہت خوب۔ صرف چالیس منٹ میں ہم مراد پور پہنچ گئے۔ تم بہت تیز آدمی ہو۔" میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اور پاکٹ سے دو روپیے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ لو۔ تمہارا کرایہ۔"!

کرایہ لینے کے لئے وہ میری طرف پلٹا۔ عین اسی وقت ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اس کے سر پر جمی ہوئی میلی سی فیلٹ ہیٹ کو اڑا لے گیا۔ اور حیرت سے میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ اس نے دوڑ کر زمین پر سے اپنی ہیٹ اٹھائی۔ جلدی سے پچاس پیسے کا ایک سکہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور انتہائی تیز رفتاری سے رکشا لے کر سڑک پر اس طرف بڑھ گیا جہاں گاؤں کا ادھیڑ عمر بھاری بھرکم سیاہ فام ساہوکار شانتی پور جانے والی بس کے انتظار میں کھڑا بے چین ہو رہا تھا۔ میں نے حیرت کے کوہ گراں کے نیچے دبے ہوئے گھور کر اس کی طرف

(بقیہ ص ۴۳ پر)

پانچ غزلیں*

علی احمد جلیلی

خوشی نے مجھکو ٹھکرایا ہے درد و غم نے پالا ہے
گلوں نے بے رخی کی ہے تو کانٹوں نے سنبھالا ہے

محبت میں خیالِ ساحل و منزل ہے نادانی
جو ان راہوں میں لُٹ جائے وہی تقدیر والا ہے

جہاں بھر کو متاعِ لالہ و گل بخشنے والو
کسی کے دل کا کانٹا بھی کبھی تم نے نکالا ہے

کناروں سے مجھے اے ناخداؤ دور ہی رکھنا
وہاں لیکر چلو طوفاں جہاں سے اٹھنے والا ہے

نشیمن ہی کے لُٹ جانے کا غم ہوتا تو غم کیا تھا
یہاں تو بیچنے والوں نے گلشن بیچ ڈالا ہے

چراغاں کر کے دل بہلا رہے ہو کیا جہاں والو
اندھیرا لاکھ روشن ہو اجالا پھر اُجالا ہے

علیؔ وہ زیست کیا جو رات بھر میں ختم ہو جائے
چراغوں کی ہنسی اڑتی ہے تڑکا ہونے والا ہے

(٭)

میر سراج الدین علیخاں
سراجؔ

لب رہے خاموش آنسو بہہ گئے
آنکھوں آنکھوں میں فسانہ کہہ گئے

آشیاں یوں نذر صرصر ہو گیا
دیکھنے کو چار تنکے رہ گئے

اب خوشی بھی کتنی درد آمیز ہے
کچھ ہنسی آئی کہ آنسو بہہ گئے

سو گیا پھر لے کے انگڑائی کوئی
کتنے فتنے اٹھتے اٹھتے رہ گئے

کارواں منزل پہ جا پہنچا سراجؔ
دیکھتے ہی دیکھتے ہم رہ گئے

(٭)

* جناب علی احمد جلیلی کی ادارہ میں تشریف آوری کے موقع پر ایک مختصر سی محفل شعر کی پانچ غزلیں پیش ہیں۔

میر یٰسین علی خان

ایک ناتمام غزل کے صرف تین شعر

اے اشکِ غم گسار تو پلکوں پہ جم نکو
وہ خوش ہیں ان کے سامنے اظہارِ غم نکو

اے صبح کے نقیب ذرا راستہ بدل
منزل تری قریب ہے صحرا میں رم نکو

میرا دیار خاک نشینوں کا شہر ہے
اس میں فسانہ شانِ دارا و جم نکو

وقار خلیل

مطلعِ فکر پہ پھر رات کی رانی مہکے
زلف در زلف وہی شام سہانی مہکے

خلوتِ دل میں بسا لیتے ہیں یادوں کی شمیم
دشتِ تنہائی میں ایک ایک نشانی مہکے

کوئی چہرہ کوئی جھونکا کوئی خوشبو کا سفیر
چاندنا بکھرے نہ کوئی رات سہانی مہکے

رات کے وقت امنگوں کو بھی نیند آتی ہے
دن جو نکلے تو اجالوں کی کہانی مہکے

شاعری آتشِ گل بھی ہے گل تر بھی وقار
حسنِ الفاظ کھلے حسنِ معانی مہکے

محمد منظور احمد

ساغرِ عیش چھلکتا ہے بہت رات گئے
رنگِ میخانہ بدلتا ہے بہت رات گئے

کون آتا ہے درِ دل پہ بصد عشوہ و ناز
کس کا غم اور نکھرتا ہے بہت رات گئے

کیا سناتے ہو غمِ دل کا بیاں آخرِ شب
ایسی باتیں کوئی سنتا ہے بہت رات گئے

اُف یہ یادیں! انہی یادوں کے جھروکے سے کبھی
ایک سایہ سا ابھرتا ہے بہت رات گئے

دُور افق سے بھی پرے یاس کی تاریکی میں
اک ستارہ سا چمکتا ہے بہت رات گئے

ایک آہٹ سی ہے سنسان سے شہرِ دل میں
کیا مسافر کوئی چلتا ہے بہت رات گئے

اپنے بھی حسنِ طلب کا ہے انوکھا انداز
پیرِ میخانہ سمجھتا ہے بہت رات گئے

وہم ہے، خواب ہے، خواہش ہے نہ جانے کیا ہے!
مجھ سے باتیں کوئی کرتا ہے بہت رات گئے

اپنے دامن سے گریباں سے تو اب بھی منظور
کوئی دیوانہ الجھتا ہے بہت رات گئے

محمد اکبر الدین صدیقی

نقد و نظر

نذرِ عرشی | مرتبہ مالک رام و مختار الدین آرزو۔ صفحات حصہ اردو ۴۴۷، حصہ انگریزی ۱۲۲، کاغذ کتابت طباعت نفیس مجلد مع گرد پوش قیمت چالیس روپے۔ پتہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔

جناب امتیاز علی خاں صاحب عرشی اردو دنیا کے ان مایہ ناز افراد میں ہیں جنھوں نے اردو کی عظمت و وقار کو بلند کرنے میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ غالب پر آپ کی شاندار تحقیق اور تخلیقات نے نہ صرف غالب کی اہمیت میں اضافہ کیا بلکہ اردو تحقیق اور طباعت کے اعلیٰ معیار کو بھی بطور نمونہ پیش کیا۔

"نذرِ عرشی" جناب عرشی صاحب ناظم کتب خانہ رام پور کی اکہتر ویں سالگرہ کے موقع پر ۸ر دسمبر ۱۹۶۵ء کو پیش کی گئی۔ اس کا مقدمہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھارت رتن نائب صدر جمہوریہ صدر مجلس نذر عرشی نے تحریر فرمایا ہے۔ وہ پیشکشی کے سبب کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:۔

"گذرنے کو تو ہر ایک شخص کی زندگی بہر حال گذر ہی جاتی ہے کیونکہ مہینے اور سال کسی کے روکے نہیں رکتے لیکن کیسی اچھی ہے وہ زندگی جو کار خیر میں گذرے اور جس سے دوسروں کے دل میں بھی عمل خیر کی ترغیب پیدا ہو۔ عرشی صاحب کی زندگی بھی آج تک ایسے ہی مفید کاموں میں بسر ہوئی ہے اور بہت لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا ہے اس لئے مجھے خوشی ہے کہ ان کے احباب اور قدر شناس ان کی اکہتر ویں سالگرہ پر ایک مجموعہ مضامین ان کی نذر کر رہے ہیں یہ گویا ہم سب کی طرف سے ان کی علمی خدمات کا اعتراف ہے۔"

کتاب اردو اور انگریزی دو حصوں پر منقسم ہے۔ حصہ اردو کے بھی دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں عرشی صاحب کے سوانح حیات اور دیگر ان قدر دانوں پر تفصیلی مضامین ہیں۔ حالات زندگی، مرتب کتاب جناب مالک رام صاحب نے لکھے ہیں اور تصانیف کے بارے میں اکبر علی خاں صاحب نے "نگارشات عرشی" کے عنوان کے تحت اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کے مطبوعہ ۳۰ کتب اور غیر مطبوعہ ۲۳ مسودوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ مطبوعہ مقالات کی تعداد [illegible] ہے اور غیر مطبوعہ کی دس۔

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے "شمع علم و یقین دلیل سحر" کے زیر عنوان عرشی صاحب کی شخصیت

... پیش کیا ہے اور سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے عرشی صاحب کی اس لگن اور محنت کا جائزہ لیا ہے جو موصوف نے ستائش سے بے پروا اور صلے سے بے نیاز ہو کر زاویہ خمول میں بیٹھ تحقیق و جستجو میں ظاہر کی ۔ اور اپنی قدآور اور شاندار تصانیف اردو کو عطا کیں۔

اردو کے دوسرے حصے میں پہلا مقالہ قاضی عبدالودود صاحب کا ہے ۔ عنوان ہے بعض فارسی کتابوں کے مفردات و مرکبات' پروفیسر محمد مجیب نے ایک اہم آثار قدیمہ کی حیثیت سے ہندو مسلم کلچر اور مشترکہ فن تعمیر کے رموز و نکات کو پیش کیا ہے ۔ مشہور حنفی فقیہ علامہ سرخسی پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا نہایت ہی عالمانہ مضمون ہے جس میں ان کے حالات زندگی اور تاریخ پیدائش وفات ایام اسیری اور علمی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے ۔

ڈاکٹر شادانی نے اپنے مقالے میں بتایا ہے کہ ابوسعید ابوالخیر نے اپنی زندگی میں ایک شعر اور ایک رباعی کے علاوہ کبھی ایک مصرع بھی موزوں نہیں کیا ۔ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی نے ہندوؤں کے علوم سے استفادہ اور تحصیل کے متعدد حوالے قدیم تاریخوں سے پیش کئے ہیں' سنسکرت سے عربی میں ترجمہ شدہ کتابوں کے متعلق الفہرست (ندیم) تاریخ الحکماء (ابن القفطی) اور طبقات الاطبا (ابن ابی صیبعہ) کا حوالہ دیا ہے ۔ ہندوستان میں دور وسطیٰ میں سنسکرت کے حصول کیلئے جو توجہ کی گئی اس کے متعلق وافر معلومات فراہم کی گئی ہیں ۔

مولانا سید احمد نے حضرت امام رازی کے ایک مخطوطہ نفثۃ المصدور کا اور پروفیسر سروری نے سالک کشمیری کی مثنوی سندر بدن کا تعارف کرایا ہے ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے "نذر عرشی" کی مناسبت سے غالب کے اردو اور فارسی کے ہم مضمون اشعار پیش کئے ہیں۔ مولانا مسعود حسن رضوی ادیب نے رسالہ قافیہ کا تعارف کرایا ہے ۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے نون غنہ کی تین علیحدہ علیحدہ آوازوں کی تقسیم اس طرح کی ہے ۔ (۱) م ن (متحرک و ساکن) یہ خالص انفی ناک کی آوازیں ہیں ۔ (۲) غنہ (ن وصلی یا مخلوط) (۳) مغنونہ (غنائی ہوئی حرکات و علل)

اور ان آوازوں کو علیحدہ علیحدہ ممیز و موسوم کرنے کی سفارش کی ہے ۔ نظم کی زبان پر آل احمد سرور نے اپنے مقالے میں راشد' میراجی' اقبال اور جوش وغیرہ کی زبان کا تجزیہ کیا ہے اور بتلایا ہے کہ زندگی کی ترجمانی کرنے والے شعراء نے ہمیشہ ایسی زبان استعمال کی ہے جو عوام سے قریب اور کتاب سے دور رہی ہے ۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے بدیعی سمرقندی کا تعارف کرایا ہے جو برہان نظام شاہ (۹۱۱-۹۶۱) کا درباری شاعر تھا اور جس کی تین غزلوں اور چھ قصیدوں تک رسائی ہو سکی ہے ۔ قصیدے تاریخی ماخذ کا کام دے سکتے ہیں ۔

چغتائی آرٹ کے خالق عبدالرحمن چغتائی نے فنون اور تحریک اسلام پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور ہندوستان میں آرٹ کے اس ارتقاء پر جو مغل عہد میں ہوا تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ۔

ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے نظیر اکبرآبادی کی فارسی نثر کی کتابوں کا تعارف کرایا اور نظیر کے سبک ہندی (اسلوب)

پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ شبیر احمد خاں غوری نے محقق طوسی کی سوانح حیات اور ان کی متعدد تصنیفات کے علاوہ انکی تصنیف تجرید الکلام کے بارے میں کافی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے کتب خانہ رضائیہ رام پور کا تعارف کراتے ہوئے بتلایا ہے کہ پبلک اور سیاسی لائبریری کے مخطوطات کے تذکرے انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز شائع کر رہا ہے چنانچہ صولت لائبریری فارسی مخطوطات کی فہرست شائع ہو چکی ہے۔ رضا لائبریری میں ۲۷ ہزار مطبوعہ کتب ہیں جن میں اردو کتابوں کی تعداد پندرہ ہزار ہے۔ انگریزی عربی فارسی کتب بالترتیب ۵۔۴ اور ۳ ہزار ہیں۔ اس کتب خانہ کی تنظیم اور اس کو بام شہرت تک پہنچانے کا سہرا جناب عرشی صاحب کے سر ہے۔ کئی ایسے نادر مخطوطات کا بھی ذکر ہے جو بادشاہوں اور مصنفین کی دستخط سے مزین ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند نے مشترک رسم خط کی بحث چھیڑی ہے۔ لیکن اپنے مضمون کو نہایت دلچسپ اور معلوماتی بنایا ہے اعداد و شمار کے ذریعہ انگریزی ناگری اور فارسی رسم خط کے محاسن اور معائب حوالوں کے ساتھ پیش کئے ہیں اور آخر میں اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ عقل کی ہر دلیل اصلاح شدہ رومن کو مشترک رسم خط کے طور پر اپنا لینے کی تائید کرتی ہے: وہ انتباہ بھی دیتے ہیں کہ ہم وطن کی حدود میں محصور رہکر خود کفیل نہیں ہو سکتے۔ یہ بین الاقوامیت کا زمانہ ہے۔ اردو کا تو یہ حال ہے کہ نستعلیق اور ٹائپ ہی کے مخمصوں اور خرخشوں سے نجات نہیں ملی اصلاح شدہ رومن خط کی بات تو دور ہی ہے۔

ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو نے فضلی کی کربل کتھا کے ساتھ جو شائع ہو چکی ہے۔ ایک نایاب تذکرہ شعرا تذکرہ خرابات کا بھی پتہ چلایا اتفاقاً ایک نسخہ انھیں ماربرگ (جرمنی) کے کتب خانہ اور دوسرا پیرس کے کتب خانہ ملی میں ملا اس میں ایسے شعراء کا بھی ذکر ہے جو ہندوستانی تھے۔

حصہ اردو کا آخری مضمون ملفوظات بزرگان دین کی تاریخی اہمیت پر خلیق احمد صاحب نظامی کا ہے جس میں بعض تذکروں سے تاریخی حوالے دیئے ہیں۔ ملفوظات کے بارے میں عام خیال یہی ہے کہ اس میں مریدوں اور معتقدین کو فقر کے راستے سمجھائے گئے ہیں لیکن نظامی صاحب کی طرح کسی کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا اس شوق میں ممکن ہے کہ مستقبل میں کچھ اور ملفوظات بھی منظر عام پر آجائیں اور ان پر اچھا کام ہو۔

انگریزی مقالات کی فہرست پیش ہے:—

G. R. Driver: *Professor of Semitic Philology,* University of Oxford.	**Intoxicated Elephants.**
A. J. Arberry: University of Cambridge.	**A Biography of Dhul-Nun-Al-Misri.**
W. Montgomery Watt: *Reader in Arabic,* University of Edinburgh.	**The Sociologist and the Prophet**

Ludo Rocher : *Professor of Sanskrit,* University of Brussels.	**The Divinity of Royal Power in Ancient India According to Dharma Sastra.**
A. K. Julius Germanus : *Professor of Islamic History,* University of Budapest.	**Abul Ala Ma-arri in the Light of New Investigations.**
M. Nizamuddin : Hyderabad.	**Al-Biruni-Apioneer Muslim Scientist.**
A. I. Tirmizi : New Delhi	**Husam Khan Gujrati.**
Syed Hasan Askari : Patna.	**Mirza Muhammad Baqir Najm-i-Thani.**

اس سے آسانی سے اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے کہ نذر عرشی کس پایہ کی کتاب ہے ہم نذر عرشی کے فاضل مرتبین جناب مالک رام اور جناب مختار الدین صاحب آرزو کو مبارک باد دیتے ہیں اور ساتھ ہی جناب عرشی صاحب کی خدمت میں بھی ہدیہ تہنیت پیش کرتے ہیں کہ وَمَا قدرو اللہ حقَّ قدرہٖ کے دور میں بھی ان کے قدرداں موجود ہیں۔

آئین وفا ڈاکٹر سید صفدر حسین پرنسپل گورنمنٹ کالج جوہرآباد مغربی پاکستان۔ ناشر مکتبہ دانش افروز ۔ ۵۵ ۔ شردھانند اسکوائر ارجن روڈ۔ کرشن نگر لاہور۔

آئین وفا دراصل سیرت وحیات حضرت ابو الفضل العباسؑ کے بیان میں ایک مرثیہ ہے۔ کتاب کی ابتدا تقریظوں سے ہوتی ہے۔ پروفیسر عابد علی عابدؔ مجتبیٰ حسینؔ مولانا ماہر القادری اور ڈاکٹر محمد حسن فاروقی نے مرثیہ نگاری اور ڈاکٹر صفدر صاحب کی مرثیہ خوانی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ دولھا صاحب عروجؔ کے بعد ڈاکٹر صفدر صاحب ہی نے مرثیہ خوانی کا ایک خاص انداز پیش کیا ہے۔

حضرت عباسؑ کے کارناموں پر تقریباً ہر مرثیہ نگار نے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے ان کے کمالات سے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں ان کی وفاداری اور طریق جنگ کے اظہار میں شعراء نے اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لایا ہے۔ ڈاکٹر صفدر صاحب نے بھی اسی انداز میں اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے اور تمام شعری محاسن کو مرثیہ میں سمونے کی کوشش کی ہے جس سے "آئین وفا" حضرت عباسؑ کی شان میں ایک بلند پایہ مرثیہ کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

اس کا صرف ایک بند یہاں پیش کیا جاتا ہے: —

بس کہ عاشور کے دن سخت تھی عباس کی پیاس — پھر بھی دریا میں جو اترے تو رہے جمع حواس
یوں بھری مشک کہ حیراں ہوئے خضرؑ و الیاسؑ — خشکیٔ آب کو آنے نہ دیا ہاتھ کے پاس
آبرو فرض کو توقیر وفا کو بخشی
تپش نور دلِ ارباب ولا کو بخشی

ذہانت نمایاں کی ایسی مثالیں مرثیے میں مختلف مقامات پر ملیں گی اس سے شاعر کی قوت مدرکہ اور قوت تخیل کا اندازہ ہوتا ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر کے علاوہ ادبی نقطۂ نظر سے بھی "آئین وفا" آنکھوں سے لگانے کے قابل ہے۔

میر و سودا کا دور تحقیق و تصنیف نثار الحق، ایم اے (علیگ) ڈیمی سائز۔ مجلد صفحات [illegible] قیمت بارہ روپے۔ ناشر ادارہ [illegible] حیدرآباد۔ کراچی [illegible]۔

کتاب کے چار ابواب ہیں پہلے باب میں وفات عالمگیر سے [illegible]ء تک سیاسی معاشی، معاشرتی اور مذہبی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ بنگال بہار اور اودھ میں طوائف الملوکی کی جو یادگاریں قائم ہوئیں ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرے باب میں اردو شاعری کے آغاز و ارتقا اور متقدمین کے پہلے دور سے بحث ہے۔ دکنی ادب پر ایک جو مواد پیش ہوا ہے غالباً فاضل مصنف کے سامنے نہ آسکا۔ بیجاپور کے ادیبوں میں قاضی محمود بحری اور وجیہ الدین وجدی کو بھی شریک کیا گیا ہے۔ بحری گوگی کے رہنے والے تھے وہ بیجاپور میں سکندر عادل شاہ کے عہد میں گئے اور تانا شاہ کے عہد میں حیدرآباد آئے اور زیادہ عرصہ یہیں گزارا۔ اپنے وطن واپس ہو کر انتقال کیا۔ وجدی دھارور سرکار فتح آباد صوبہ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے اور شاہ صادق اورنگ آبادی سے ان کا یارانہ تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے بارے میں لکھا ہے "فارسی کے علاوہ اردو کا مکمل دیوان موجود ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فارسی دیوان کا ذکر ہی ملتا ہے اور اردو دیوان ردیف الف سے صرف ش تک ہے جس میں جملہ ۹۷ غزلیں ہیں۔ یہ شائع ہو چکا ہے۔

"تانا شاہ کے بارہ باٹ" والے شعر کے متعلق بابائے اردو نے بعد تحقیق یہ ثابت کیا ہے کہ یہ بحری کا ہے۔ صفحہ ۷۹ پر ولی دکنی کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ وہ ولی اورنگ آبادی سے مختلف ہیں۔ یہ ولی ویلوری ہیں جن کی روضۃ الشہدا کا ذکر اسی صفحہ پر موجود ہے۔ ان کا نام محمد فیاض تھا۔ صفحہ ۸۰ پر لکھا ہے۔ اورنگ زیب نے اپنے دور حکومت کے آخری ایام اورنگ آباد میں گزارے حالانکہ اورنگ زیب نے آخری نصف صدی یہیں صرف کر دی یہاں یہ لشکر کا تھا اور ولی نے اورنگ آباد کو اسی لئے خیرباد کہا۔ اورنگ زیب کے انتقال کے بہت بعد سراج، داؤد، عبدالقادر سامی پھر میر غلام علی آزاد وغیرہ اکثر محفل شعر سجاتے ہیں۔

صفحہ ۸۰ پر فاضل مصنف نے گولکنڈہ اور بیجاپور کی زبان کو اورنگ آباد سے علٰحدہ بتایا ہے اور اس دبستان کا پہلا شاعر ولی کو قرار دیا ہے وہ اس حقیقت کو پیش نظر نہ رکھ سکے کہ ولی نے غواصی (ملک الشعرائے گولکنڈہ) کی غزلوں پر غزلیں کہیں اور غواصی کے مضامین کو لے کر اپنے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ دلی جانے کے بعد انھوں نے اپنی زبان اور اظہار و ابلاغ میں تبدیلی کی ان کے سنہ وفات کے بارے میں بابائے اردو نے قطعیت دیدی ہے کہ وہ ۱۱۱۹ھ میں فوت ہوئے لیکن احسن مارہروی کے سنہ کا کتاب میں اتباع کیا گیا ہے۔ اسی صفحہ پر ولی کا ۱۱۱۲ھ میں دلی پہنچنا تسلیم کرتے ہیں لیکن ایک جگہ صفحہ ۹۲ پر ۱۱۳۳ھ میں ولی کے دیوان کے

پہنچنے کی اطلاع دیتے ہیں۔ اس سے قاری کے ذہن میں انتشار پیدا ہوتا ہے اور وہ فاضل مصنف کی تحریر کا ساتھ دینے سے ابا کرتا ہے۔

اس کے بعد داؤد، سراج وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں اور دہلی میں اردو شاعری کے آغاز پر روشنی ڈالتے ہیں۔

تیسرا باب۔ میر و سودا کا دور ہے جس کو بجا طور پر عہد زریں کہا گیا ہے۔ ابتداً ان تمام اصلاحوں پر روشنی ڈالی ہے جو اس دور کے بانی حضرت مظہر جان جاناں اور ان کے پیروؤں نے کی پھر مختلف اصناف سخن میں جو ارتقا ہوا نہایت دقت نظر سے اس کا اظہار کیا ہے۔

چوتھے باب سے شعراء عہد میر و سودا کا آغاز مظہر جان جاناں سے ہوتا ہے۔ یقین، بیان، حزیں، تاباں، فغاں، درد، سودا، میر، سوز، قائم، حسن، کلیم، بیدار، اثر وغیرہ کا ذکر ہے۔ لیکن اس میں ایک بات یہ کھٹکی کہ میر حسن کا ذکر مقدم ہے اور ان کے والد ضاحک کا موخر خواہ وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ آخر میں مرزا جان طپش کی تصنیف "بہار دانش" فارسی کا تو ذکر کیا گیا ہے لیکن ان کے طوطی نامے یا قصہ جہاندار شاہ کا ذکر نہیں حالانکہ قیام کلکتہ کے موقع پر طپش نے ساڑھے چار ہزار شعر کی مثنوی لکھی تھی اور یہ شائع ہو چکی ہے۔

سودا سے لے کر آخر تک شعرا کی ولادت و وفات کے سنین کی تصحیح کی طرف فاضل مصنف نے جو توجہ کی ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ میر و سودا کے دور کا یہ تذکرہ نہایت ہی مفید اور جامع ہے اور اردو ادب کی تاریخ پڑھنے والوں کیلئے ایک گراں قدر تحفہ ہیں توقع ہے کہ اس کی خاطر خواہ قدر کی جائے گی۔

۴۲ نظمیں | پروفیسر کلیم الدین احمد: لیرو بکاری سائز صفحات ۴۲ مجلد مع گرد پوش۔ ناشر: کتبہ طوبیٰ سبزی باغ۔ سول ایجنٹ۔ کتاب منزل۔ سبزی باغ۔ پٹنہ ۴ قیمت ۵۰ء۵ روپے

یہ پروفیسر کلیم الدین احمد کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں ۴۲ نظمیں ہیں ان میں بعض مقفی و مردف ہیں اور بعض آزاد۔ ان دونوں قسم کی نظموں میں مقصدیت کار فرما نظر آتی ہے اور شعر میں جہاں مقصد کو تقدم حاصل ہوتا اثر پیچھے رہ جاتا ہے۔ اکثر اشعار عروض کے پابند نہیں مثلاً ؎

دل کو ٹھوکر کبھی لگاتے ہیں   کسی کو تخت پر بٹھاتے ہیں

بعض مصرعے حروف سے شروع ہوتے ہیں مثلاً

بھلا اس ابر تیز رو   کو میرے کیا یہ ہوگیا
ہیرے کی چمک نیلم کی دمک   یا   سے دیکھو آنکھیں خیرہ ہیں

اسی طرح ذیل کے مصرعے محل نظر ہو جاتے ہیں۔

سناٹے سارے رستے ہیں   میا پھر کتنا دوڑا دھویا

غزلیں چپ سنا تی ہیں   وہ جاں میں گھر بنائے گا

سبزے مہک رہے ہیں۔ شبنم چمک رہی ہے وغیرہ۔

بعض مقامات پر ہمیں خیال سے بھی اختلاف ہے۔ فرماتے ہیں ؂

شعر ہو عشق ہو کہ حسن ازل   ایک بھی نقش پا شمار نہیں

یا

دور وہ خلاؤں میں   تیرے دیکھتے ہیں   تیرہیں کہ شعلے ہیں

ایک مصرعے میں طویل کی بجائے طول استعمال ہوا ہے۔ یعنی کہ ؂

کتنی طول ہیں اللہ   انتظار کی گھڑیاں

بہ حیثیت مجموعی شعر میں طنطنہ اور دبدبہ تو نظر آتا ہے۔ لیکن تاثیر کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ دل سے نکلی ہوئی بات کچھ اور ہوتی ہے۔ بظاہر یہ ایک نیا تجربہ ہے جو فن شعر میں پیش کیا گیا ہے۔

مجموعے میں بعض نظمیں بڑی رواں اور دل آویز بھی ہیں ہو سکتا ہے کہ شاعر کے خیال سے ہمیں اتفاق نہ ہو نظم ۲۲ (کسی نظم کا کوئی عنوان نہیں ہے) اقبال کے اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامہ زمانہ ہوا   جہاں سے باندھ کے رخت سفر روانہ ہوا

اس کا بہاؤ، تسلسل خیال، انداز اظہار، دلکش، مرعوب کن اور قابل مطالعہ ہے۔ کتاب نہایت جلی قلم ہے اور کتابت اور طباعت میں کافی اہتمام کیا گیا ہے۔

فن کی جانچ

مصنفہ ڈاکٹر سیدہ جعفر (شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی)۔ ناشر۔ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔ ملنے کا پتہ نیشنل بک ڈپو مچھلی کمان حیدرآباد صفحات ۲۸۴ مجلد خوبصورت گرد پوش قیمت چار روپے۔

ماسٹر رام چندرا اور من بھاون کی مصنفہ ڈاکٹر سیدہ جعفر کی یہ تیسری کتاب "فن کی جانچ" ان کے بارہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں مومن، جگر، ظفر اور فانی کی غزل گوئی پر نہایت سلجھے ہوئے انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے اردو نظم میں ہیئت کے جو تجربے کیے گئے ہیں ان کا پورا جائزہ لیا ہے اور اس کے ساتھ انگریزی شعرا نے جو تجربے کیے ان کا بھی ضمناً ذکر آگیا ہے۔ دوسرا مضمون تذکروں کی تنقیدی اہمیت پر ہے۔ عام طور پر تذکرہ نگاروں کو بدنام ہی کیا جاتا رہا ہے کہ انھوں نے صرف ایک ایک دو جملوں کے ساتھ ایک ایک دو دو شعر دینے پر اکتفا کی لیکن محترمہ موصوفہ نے بتایا کہ تذکرہ نگاروں نے کس طرح اپنے تنقیدی شعور کا اظہار کیا ہے خواہ میر ہوں یا شیفتہ، شفیق ہوں یا کریم الدین بہرحال انھوں نے فن نقد کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہ فن انیسویں صدی کا ہے بیسویں صدی کا فن بیسویں صدی میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ ہمارے جدید نقادوں نے یہی کیا ہے لیکن محترمہ موصوفہ نے تاریخ کو پیش نظر رکھ تنقیدی ارتقا کو

[illegible] کتاب کے [illegible] مضامین سرسید کے سماجی تصورات، داستانوں کے ثقافتی عناصر، فراق کی [illegible] یا
اور جدید شاعری کے انتشار جیسے فکر انگیز اور غور وخوض کی دعوت دینے والے مضامین ہیں امید کہ تنقید سے
دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں گے۔ (ا-ص)

اُردو (سہ ماہی رسالہ) ادارت - جمیل الدین عالی و مشفق خواجہ - چندہ - بارہ روپے سالانہ - مقام اشاعت انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ کراچی ۱ -

یہ رسالہ سابق میں بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی ادارت میں اورنگ آباد دکن سے ۱۹۲۱ء میں جاری ہوا اور ۱۹۶۱ء تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ درمیان میں بند ہوگیا۔ اب جنوری ۱۹۶۶ء سے اُس کا دورِ جدید ایک مجلس ادارت کی نگرانی میں شروع ہوا ہے۔ یہ اردو زبان اور ادب کا ایک معیاری رسالہ تھا۔ اس کے مضمون نگار بھی اردو کے ممتاز اہل قلم ہوتے تھے۔ اس رسالے نے (۴۰) سال کے عرصے میں اردو کی بڑی شاندار خدمت انجام دی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ "انجمن ترقی اردو پاکستان" نے مولوی عبدالحق مرحوم کی یادگار باقی رکھنے کے لئے اس کا دوبارہ اجرا کیا ہے۔ زیرِ نظر رسالہ اس کا دوسرا شمارہ ہے۔ اس میں اداریہ، مضامین، بادۂ کہن، نئی کتابیں، لغت کبیر اردو اور اشاریہ مضامین اردو عنوانات شامل ہیں۔ بادۂ کہن میں غیر مطبوعہ کلام اور نئی کتابوں کے ذیل میں تبصرے ہیں۔ مضامین میں ۱۸۵۷ء سے پہلے کی تھیٹریکل کمپنیاں اور انگریزی ادب کے آغاز پر ایک نظر معلومات آفریں ہیں اور شاد عظیم آبادی کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ خاصے کی چیز ہے۔ اردو جیسے بلند پایہ رسالے کے پیشِ نظر اُس کے مضامین کا معیار اور بھی بڑا ہونا چاہیے۔ سابقہ معیار پر لانے کے لئے مشہور اہل قلم اور ادیبوں کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ بادۂ کہن میں کبھی کبھی قدیم اردو کلام کو بھی جگہ دینی چاہیے۔ لغت کبیر اردو اور اشاریہ مضامین اردو یہ دونوں چیزیں نہایت مفید اور کارآمد ہیں۔ اوّل الذکر سے اردو والوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا اور موخر الذکر سے علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کو بڑا فایدہ پہنچے گا۔ موجودہ رسالے میں معیار کے ساتھ ساتھ اس کی ضخامت میں بھی اضافہ ضروری ہے، تاکہ اس کا علمی وقار برقرار رہ سکے۔

اردو دنیا میں علمی اور ادبی رسالوں کی ناقدری کے سبب عموماً اُن کی اشاعت بند ہو جاتی ہے۔ لے دے کے صرف حکومت کا سہارا رہ جاتا ہے۔ پس حکومت پاکستان کو اردو جیسے علمی اور ادبی رسالے کی سرپرستی اور اس کی مالی امداد کرنی چاہیے تاکہ وہ اردو کو ایک ترقی یافتہ زبان بنانے میں کما حقہ خدمت انجام دے سکے۔

(غ-ا)

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا : ۱۹۳۸ء
فون : (۳۵۲۰۹)

اگست ۱۹۶۶ء

جلد : [illegible]
شمارہ : [illegible]

ماہنامہ

سب رس

(ادارہ نمبر)

نگراں
پروفیسر سید علی اکبر

مجلس مشاورت
مسیح حسن • ڈاکٹر گوپی چند نارنگ • رتن راج سکسینہ

معتمد
محمد اکبر الدین صدیقی

منتظم
وقار خلیل

زرِ سالانہ : چھ روپے — غیر ممالک سے : دس روپے
ششماہی : تین روپے — فی پرچہ : ۵۰ پیسے

[illegible] نے شائع کیا۔

ترتیب

اپنی بات

ادارہ کی سالانہ رپورٹ (ادارہ سنہ ۱۹۶۵ء میں "سب رس" کے اس شمارے میں چند در چند وجوہات کے سبب تاخیر سے طبع ہو رہی ہے۔

"ادارۂ ادبیاتِ اُردو" اب سے ۳۶ سال پہلے جن اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے قائم ہوا تھا وہ اپنا منصب اب بھی ادا کر رہا ہے۔ اس کا یہ ماہانہ ادبی ترجمان "سب رس" ادب کی اشاعت اور ترجمانی کا کام انجام دے رہا ہے۔ اس کا گرانقدر کتب خانہ (شعبۂ مطبوعات و مخطوطات) علمی و ادبی اور تحقیقاتی کام کرنے والوں کے لئے پوری ذمہ داریوں سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہے۔ "ایوانِ اُردو" کا دارالمطالعہ تشنگانِ خبر و نظر اور تشنگانِ علم و ادب کی تسکینِ طبع میں مصروف ہے، اور ادارے کی طرف سے مختلف موقعوں پر لکچر اور تقریریں بھی منعقد ہوا کرتی ہیں، سمپوزیم، ادبی اجلاس اور شعری محفلوں کے علاوہ علم و ادب، تنقید و تحقیق کے باب میں نئی کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں اور پھر ادارے کے زیرِ اہتمام کم پڑھے لکھوں کی تعلیم کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ ادارے کے امتحانات اُردو عالم اور اُردو فاضل (مسلمہ جامعہ اُردو علی گڈھ) سے جو طالب علم استفادہ کرتے ہیں ان کو زبانِ اُردو کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم کے حصول سے فیض یاب ہونے کے مواقع ملتے ہیں۔

اس رپورٹ کے ملاحظہ کے بعد قارئین محسوس کریں گے کہ سن ۱۹۶۵ء میں ادارہ کے تمام شعبوں نے اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دیئے۔ ادارہ اپنے ان کرم فرماؤں کا بطورِ خاص ممنون ہے جنہوں نے اس کے کتب خانے کے لئے بیش بہا علمی و ادبی اور قیمتی کتابیں اور قدیم رسائل عنایت فرمائے۔

ادارے کے شعبۂ تاریخ و تمدن اور اُردو میوزیم نے بھی اس سال قابلِ قدر ذخیرہ جمع کیا ہے جس سے لوگ تہذیب و تمدن سے دلچسپی رکھنے والے استفادہ کرتے ہیں۔

ہمیں مسرت ہوتی ہے کہ ادارہ کے علمی و ادبی اور تہذیبی کاموں کو اُردو دنیا میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے حکومت اور دیگر حلقوں کے تعاون کا ادارہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے اور مستقل تعاون کا متوقع رہتا ہے۔ (ادارہ)

مختار خلیل

نادر مخطوطات ایوانِ اُردو میں

(مطبوعہ روزنامہ "سیاست" حیدرآباد مورخہ ۲۲ جون ۱۹۶۵ء)

چھاپہ کے عام ہونے سے پہلے کتاب کی قدر و قیمت بہت زیادہ تھی، اتنی زیادہ کہ یونان کے ایک فلسفی نے یہاں تک کہہ دیا کہ :- "جو شخص کسی کو کتاب مستعار دے وہ احمق اور جو شخص کسی سے کتاب مستعار لے کر پھر واپس کر دے وہ کم عقل"۔ کتابوں کے مالک اپنی ملکیت کے اظہار کے لئے کتاب کے اول و آخر میں عموماً اور کبھی کبھی درمیان کے ورقوں پر بھی اپنی نشانی لگاتے اور دستخط ثبت کرتے تھے اور بعض اوقات دستخطوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا کرتے تھے کہ کتاب ہم تک کس ذریعے سے پہنچی اور ہم اس کے قانوناً جائز مالک ہیں یا نہیں۔ اس طرح جتنی تحریریں اور یادداشتیں کتابوں پر ثبت ہوتی ہیں ان سے بھی بڑی دلچسپ اور مفید باتیں علم میں آجاتی ہیں۔ اتنی دلچسپ اور مفید کہ اگر ان سب کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو پڑھنے والے کو قصہ کہانیوں کا لطف آنے لگے۔

قلمی کتابوں کے پاس شعور اور زبان دونوں ہوتے ہیں اور وہ اپنی سرگزشت سنا کر ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ تاہم "روئیم بہ بیں عالم پیرس" کی دعوت اُن کی زبانِ حال ابھی دیتی رہتی ہے۔ مولانا امتیاز علی عرشی ناظم رضا لائبریری رامپور ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"عام طور پر قلمی کتاب کے اول و آخر میں مختلف اشخاص کے قلم کی عبارتیں پائی جاتی ہیں۔ یہ ہمیں بتاتی ہیں کہ کتاب کب لکھی گئی، کس کے لئے لکھی گئی، کس نے لکھی، کس کے پاس رہی اور کہاں سے کہاں پہنچی۔ چنانچہ ایسا بھی ہوا ہے کہ دمشق کی خشک فضا میں ایک کتاب لکھی گئی، عراق کی گرم و خشک سرزمین کی انیسِ خلوت رہی، ایران کی گلبار مجلسوں میں رفیقِ جلوت رہی اور وہاں سے دکن کی گرم اور پہاڑیوں کی سیر کرتی ہوئی دلی کے شاہی کتب خانے کی زینت بنی، بعد ازاں لکھنؤ پہنچی اور وہاں سے لُٹ پِٹ کر رامپور گئی اور یہاں مرکا کتب خانہ

روپوش ہوگئی، یا لندن و برلن کے کتب خانوں میں جلوہ باری کرنے جا پہنچی۔"

ہندوستان بھر کے اہم کتب خانوں میں اردو کے مخطوطات ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ انڈیا آفس لائبریری، لندن، برلن اور سوویت روس کے کتب خانوں میں بھی قلمی کتابیں موجود ہیں۔ پٹنہ، رامپور، حیدرآباد، بھوپال، علی گڑھ، دہلی اور کلکتہ خصوصیت سے قلمی کتابوں کے نادر ذخیروں کے سبب شہرت رکھتے ہیں۔ ویسے اکابر مشاہیر اور مشائخوں کے گھرانوں میں بھی کتب خانے وراثتاً چلے آرہے ہیں۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ، رضا لائبریری رام پور، انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی، کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ سالار جنگ، کتب خانہ ادارۂ ادبیاتِ اردو، کتب خانہ جامعہ عثمانیہ اور کتب خانہ جامعہ علی گڑھ و دلی کے علاوہ نیشنل لائبریری کلکتہ کے قلمی کتابوں کے بارے میں بیشتر اہم معلومات شائع ہو چکی ہیں اور یہ ادارے اپنے قیمتی ذخیروں کی بدولت دنیائے ادب میں حیاتِ جاوید پا چکے ہیں۔ اردو مخطوطات میں ایسی کتابیں بھی شامل ہیں جن کے لکھنے والوں میں والیٔ گولکنڈہ محمد قلی قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے علاوہ علی عادل شاہ ثانی، واجد علی شاہ والیٔ لکھنؤ اور نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور شامل ہیں۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا قیام اس کے بانی ڈاکٹر زور مرحوم کی کوششوں سے ۱۹۳۱ء میں ہوا اور اس کے کتب خانہ کا آغاز صحیح معنوں میں ۱۹۳۳ء سے عمل میں آیا۔ جب ادارہ کی عمارت "ایوانِ اردو" بن گئی تو اس کے شعبۂ کتب خانہ میں مطبوعات اور مخطوطات منتقل ہوگئیں جن سے آئے دن علم و ادب کے شائقین اقطاعِ ہند و پاک سے آکر استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ ادارہ کی قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست ڈاکٹر زور مرحوم نے پانچ جلدوں میں سائنٹیفک طریقے پر عالمانہ انداز میں مرتب کرکے شائع کردی ہے جنھیں ادبی اور تحقیقی کام کرنے والے حلقوں میں قدر و منزلت سے دیکھا جاتا ہے۔ تذکرۂ مخطوطات کی پانچ جلدوں میں (۱۱۵۰) مخطوطات کے بارے میں تفصیلات منظرِ عام پر آچکی ہیں لیکن ہزاروں کتابوں کا بیان باقی ہے۔ ان فہرستوں کی ترتیب و تیاری کے وقت ڈاکٹر زور جن مشکلوں سے دوچار ہوئے اور جو وقت صرف ہوا اس کا صحیح اندازہ وہی اصحاب ہی بخوبی کر سکتے ہیں جنھیں قلمی نسخوں پر کام کرنے کا تجربہ ہو۔ اکثر مخطوطوں کے مصنفوں کے نام، سن یا زمانۂ تصنیف اور دیگر کیفیات معلوم کرنے کے بارے میں بڑی چھان بین سے کام لینا ہوتا ہے جس میں قلمی و مطبوعہ کتب و رسائل کی مدد لی جاتی ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر زور "تذکرۂ مخطوطات جلد اول مطبوعہ ۱۹۴۳ء" کے [illegible]

ادارے کے کتب خانہ میں جمع ہو چکے ہیں۔ ادارہ میں مخطوطات کو محفوظ کرنے کا خیال اس وقت پیدا ہوا جب راقم الحروف کی جدو ماجدہ اور مولانا انوار اللہ خاں فضیلت جنگ کی ممانی حضرت قادر بی بی زوجہ نعمت اللہ مرحوم جاگیردار سکلی کے کتب خانے کے عربی، فارسی اور اُردو مخطوطات کی فہرست راقم کے شاگرد سید ابوالفضل نے لکھنی شروع کی اُس وقت تک راقم الحروف مرحومہ موصوفہ کے ذخیرۂ مخطوطات کی اہمیت سے ناواقف تھا، جب اس کا علم ہوا تو ان کے کتب مطبوعہ کی طرح قلمی ذخیرے کو بھی بطور عطیہ ادارہ میں داخل کرنے کا تہیہ کیا گیا۔ چند شفیق احباب محمد حسین جعفری اور عنایت جنگ جب اس سے واقف ہوئے تو ان علم دوستوں نے راقم کے اس عزم کو راسخ بنانے کے لئے اپنے یہاں کے مخطوطات بھی ادارے کو عطا فرمائے" ـــــ ان عطیہ دہندوں میں خود ڈاکٹر زور، نواب میر یسین علی خاں، ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ، نصیر الدین ہاشمی مرحوم، پروفیسر سید محمد، علی اصغر بلگرامی، تمکین کاظمی، نواب مہدی نواز جنگ، بشیر النساء بیگم بشیر، صغرا ہمایوں مرزا، احمد اللہ خاں، ڈاکٹر حفیظ سید، سعادت علیخاں، فیروزا معصومہ بیگم، برق موسوی، خواجہ حمید الدین شاہد اور عمر یوسفی اور دیگر کئی اصحاب شامل ہیں۔

ادارہ کے کتب خانہ میں بہت قدیم مخطوطات کی تعداد زیادہ ہے' ان میں ایک مخطوطہ "مشکوٰۃ المصابیح" کی کتابت آج سے چھ سو اڑتالیس سال قبل یعنی سنہ ۷۳۰ھ میں کی گئی تھی۔ یہ مخطوطہ حدیث کی مشہور کتاب کا ناقص الاول نسخہ ہے جو خطِ ثلث میں لکھا گیا ہے اور (۲۵۳) اوراق پر مشتمل ہے۔ عنوانات سُرخ روشنائی میں ہیں۔ ایسے کئی مخطوطے بھی ادارے کے کتب خانے میں ہیں جو تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل نقل کئے گئے تھے۔

ادارے کی چند قلمی کتابوں کے بارے میں تفصیلات ڈاکٹر زور مرحوم کے مرتب کردہ تذکرہ کی مدد سے درج جاتی ہیں جن سے قارئین پر مخطوطات کی قدامت اور اُن کی اہمیت کسی حد تک واضح ہو جائے گی۔

۱۔ سالوترِ اسپان : ـــــ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے حکم سے عبد اللہ ابن صیفی نے یہ کتاب بمقام گلبرگہ سنہ ۸۱۰ھ میں مرتب کی۔ چہارشنبہ ۷ ذی قعدہ سنہ ۱۲۳۰ھ کو اس نسخے کی کتابت مکمل ہوئی۔ راجہ بسوراج کے لئے لالہ منوہر لال نے اس کو نقل کیا۔ پہلے ورق پر سُنہرے نقش و نگار ہیں اور پوری کتاب گھوڑوں کی رنگ برنگ تصویروں سے آراستہ ہے جس میں گھوڑوں کے خصائص در دِ شکم اور تپ کے موضوعات پر تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ ادارہ کے مصوّر نسخوں میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ عطیہ محمد ایاز سیٹھ حیدرآباد ۷۵ ورق۔

۲۔ جنگ نامہ : ـــــ حضرت خواجہ بندہ نواز کی تصنیف ہے۔ اس نظم میں بارہ بند ہیں جو جنگ نامہ

لکھے گئے ہیں۔ اس نظم کا نسخہ کسی اور کتب خانہ میں دستیاب نہیں ہوا۔ دو اوراق پر مشتمل ہے
خط نستعلیق پاکیزہ اور فی صفحہ گیارہ سطور ہیں۔ کتابت سنہ ۱۲۲۲ھ۔

آغاز :—
دیکھو واجب حق کی چکی پیو جا تر ہو کے سکی
سو کن الیس کھینچ کھینچ تھکی کئے یا بسم اللہ اللہ ہو

الف اللہ اس کا دستا میانے محمد ہو کر بستا
پنچی طلب یوں کو دستا کئے یا بسم اللہ اللہ ہو

اختتام :—
بندہ نواز حسینی سوا بندگی میں رہتے
کئے یا بسم اللہ ہو ہو اللہ

۳۔ مکاتیب خواجہ بندہ نوازؒ :— اس کتاب میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے دو مکاتیب درج ہیں جو انھوں نے ملک محمود شحنہ کے نام سنہ ۸۲۴ھ و سنہ ۸۲۵ھ میں لکھے تھے۔ ہر خط طویل اور مفصل ہے اور تصوف کے مختلف موضوعات پر محیط۔ یہ نسخہ بہت ہی قدیم ہے کاغذ اور نہج کتابت کے لحاظ سے سنہ ۱۱۰۰ھ سے قبل کی کتابت ہے۔ سرورق پر "سید شاہ برہان اللہ حسینی الرفاعی القادری عفی عنہ" کے دستخط اور کاتب کا نام ان ہی کے خط میں درج ہے۔ یہ صاحب ڈاکٹر زور کے جدِ امجد حضرت سید علی ساگرؒ سلطان مشکل آسان کی درگاہ کے سجادے تھے اور یہ نسخہ درگاہ کے کتب خانے کے ان نسخوں میں شامل ہے جس کو سجادہ صاحب موصوف کی وفات کے بعد اُن کے ورثاء نے فروخت کر دیا تھا، اور ان میں سے بعض کتب نواب سالار جنگ مرحوم اور بعض ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے خریدلی تھیں۔ خط نہایت پاکیزہ نستعلیق اور سیاہی بہت روشن ہے۔ ابتدائی چند صفحات میں ہر خط کا عنوان سُرخ روشنائی میں لکھا گیا ہے۔ (۱۹۴) اوراق، ۱۹ سطور فی صفحہ۔ تقطیع ۵ × ½۸ –

۴۔ نو سر ہار :— اوراق (۷۰) ابتدائی (۸) اوراق میں ۱۵ سطور فی صفحہ بقیہ میں ۱۴ سطور تقطیع ½۵ × ۹، خط نستعلیق، عنوانات سُرخی میں، سنِ تصنیف سنہ ۹۰۹ھ مصنف شیخ اشرف۔ کاتب : قاضی محمد جعفر ابن قاضی محمد حسین قاضی پرگنہ چاندور۔ یہ مثنوی ہے جس میں امام حسینؓ کے مصائب نو ابواب اور کئی عنوانات کے تحت بیان کئے گئے ہیں، بہ قول ڈاکٹر زور "یہ اردو میں (نظم) میں یہ پہلی کتاب ہے جو غالباً احمد نگر میں لکھی گئی ہے۔ سلطنتِ احمد نگر کی کسی ادبی

یہ کتاب کا اب تک پتہ نہیں چلا ورنہ غالباً اس کتاب نوسرہار کا کوئی اور نسخہ کسی کتب خانے میں موجود ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک نادر مخطوطہ ہے۔"

کتاب کا نام اور سن تصنیف ان ابیات سے واضح ہوگا ؎

ہجرت نبی نو سو نو ۔۔۔ کہیا اشرف تو سر بد
نوسرہار اس دھریا ناؤں ۔۔۔ جانے دیکھ تو اب ہر ٹھاوں
اے نو باباں نوسرہار ۔۔۔ قیمت اس کی لاکھ ہزار
بازاں جیوں کی تاریخ سال ۔۔۔ بعد از ہجرت نبیؐ سال
نو سو ہوئے اکلے نو ۔۔۔ یہ دُکھ لکھیا اشرف تو
ناؤں دھریا اس نوسرہار ۔۔۔ لیکن یہ سب دُکھ کا بھار

۵۔ باغ و بہار :۔ میر امن کی باغ و بہار اُردو کی مشہور کتاب ہے جس میں چہار درویش کا قصہ سلیس اور سادہ نثر میں گلکرسٹ کی فرمائش پر فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں لکھا گیا تھا۔ یہ کتاب کئی بار چھپ چکی ہے لیکن ادارہ کے مخطوطے کو اس لئے اہمیت حاصل ہے کہ یہ کتاب خود نظام دکن ناصر الدولہ آصف جاہ سابع نے نقل کرائی تھی اور اپنے امیر سید عبد الرحیم خاں بہادر کو عنایت کی تھی۔ ڈاکٹر زور نے لکھا ہے کہ :۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناصر الدولہ کو اُردو کے مطالعہ کا ذوق تھا اور وہ اپنے امیروں کو زر و جواہر و جاگیرات کے علاوہ کتابیں بھی عطا فرماتے تھے۔

اس مخطوطے کے آخر میں یہ ترقیمہ لکھا ہوا ہے :۔ "بتاریخ چہاردہم شہر شوال المکرم روز جمعہ ۱۲۶۱ھ کتابت قصۂ چہار درویش در عہد نواب ناصر الدولہ بہادر بلدۂ فرخندہ بنیاد حیدرآباد عرف بھاگ نگر سرانجام اختتام یافت۔ بتاریخ غرۂ شہر رمضان سنہ الیہ شروع نمود و شدہ و چہاردہم شوال ۱۲۶۱ھ اتمام رسید بروز جمعہ۔ نبرد و نبرد و نبرد بوقت فرصت نوشتہ شد۔ تمت تمام شد"۔ اس ورق پر پیچھے کی طرف نواب عنایت جنگ بہادر کی ایک بیضوی مہر ثبت ہے جس پر "مصدرِ الطاف و عنایت حسین" کندہ ہے۔ یہ نسخہ نواب صاحب محترم ہی کا عطیہ ہے۔

۶۔ تذکرۂ یادگارِ ضیغم :۔ یہ اُردو شاعروں کا ایک نادر اور مبسوط تذکرہ ہے جس میں کئی ہزار اُردو شاعروں کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام لکھے گئے ہیں جس کا ایک حصہ ۱۳۰۸ھ میں لکھنؤ سے چھپا تھا۔ مگر یہ مکمل مخطوطہ ہے جسے مصنف نے سولہ سال بعد کافی شرح و بسط کے ساتھ بطور ضمیمہ قلمبند کیا اور جگہ جگہ حاشیوں پر مزید معلومات وقتاً فوقتاً اضافہ کئے۔ ادارہ کا یہ نسخہ

غیر مطبوعہ اور خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اس لئے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں کئی شاعروں کی عکسی اور مطبوعہ تصویریں بھی شامل ہیں۔ ابتدا میں ایک طویل مقدمہ بھی درج ہے۔ اس کے مرتب محمد عبداللہ خاں ضیغم (۱۲۷۳ھ ۔ ۱۳۵۷ھ) شاعر تھے۔ خوش مزاج، یار باش اور خوش طبع۔ ضیغم کا یہ تذکرہ ردیکار ساٹز کے (۲۲۷) صفحات پر مشتمل ہے۔ مخطوطہ کے سرورق پر خود ضیغم کی یہ عبارت ملتی ہے: "یادگار ضیغم یعنی شعرائے ماضی و حال کا تذکرہ جو ۱۳۱۸ھ سے لکھا گیا اور ۱۳۲۴ھ میں مرتب ہوگیا۔ مولفہ محمد عبداللہ خاں ضیغم داماد آنریبل نواب سر شرف الامراء بہادر" اس تذکرہ میں حیدرآباد کے دیگر شعراء کے دوش بدوش محمد قلی قطب شاہ سے لیکر دکنی، غالب اور ان کے شاگردوں اور شاعر کے اپنے زمانہ تک کے شعراء کے حالات، کلام اور سنین کے ساتھ درج ہیں۔

تاثرات

دورانِ سال ۱۹۶۵ء میں ادارۂ ادبیاتِ اُردوؔ کے بارے میں جن اصحاب یا اداروں نے اپنے تاثرات تقریر یا تحریر میں ظاہر کیے یا شایع فرمائے، اُن کے چند اقتباسات درجِ ذیل ہیں۔ (ادارہ)

۱۔ حضرت بشیشور پرشاد مُنوّرؔ لکھنوی (دہلی)

میں زبان سے اُن جذبات کا اظہار نہیں کر سکتا جو مجھے "ادارۂ ادبیاتِ اردو" ایسے مفید اور وقیع ادارے کی سرگرمیوں کو دیکھ کر میرے دل میں پیدا ہو رہے ہیں۔ مجھے [illegible]س بات کا ہے کہ مجھے اس ادارے کے کارناموں کو دیکھنے کا موقع اس وقت حاصل ہوا جب اردو زبان اور ادب کے محسنِ عظیم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میں نے ادبیاتِ اردو کے تمام شعبوں کا اگرچہ سرسری طور پر معائنہ کیا، لیکن اس کے ساتھ اُن پر گہری نظر بھی رکھی۔ میں ادبیاتِ اردو کے ارکان کے خلوص اور جوشِ عمل سے بے حد متاثر ہوں اس کے اراکین اردو کی وفا زبردست کام نمایاں انجام دے رہے ہیں، جو کئی سو حضرات بھی مل کر انجام نہیں دے سکتے ہیں۔ اب ادارے کی ترقی و توسیع کے لئے دست بدعا ہوں۔ کاش یہ ادارہ ایک عالمگیر اہمیت اختیار کرلے۔ (۵۔ جنوری ۱۹۶۵ء)

۲۔ جناب نثار احمد فاروقی (لکچرار شعبۂ عربی، شعبۂ فنون۔ دہلی یونیورسٹی۔ دہلی)

"ادارۂ ادبیاتِ اُردو میں نے پہلے بھی چند بار دیکھا ہے اور آج پھر حاضری کا موقع ملا۔ اردو کے نام پر جو بھی خدمت ہو، جس سے بھی، جہاں بھی ہو، جیسی بھی ہو، مجھے عزیز و محترم رہی ہے۔ حیدرآباد اردو کا گہوارہ ہے مغلی شائستگی اور ہند ایرانی تہذیب کی علامت ہے، یہاں ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کی سماجی تاریخ کا آخری باب لکھا گیا ہے۔ اس لئے آج بھی اردو کا قد یہاں بہت اونچا نظر آتا ہے۔ اور "ادارۂ ادبیاتِ اردو" کو دیکھ کر یہ یقین ہوتا ہے کہ دکھن کے ساتوں کے دل میں اردو سے جو پریم ہے وہ اس چراغ کو مخالف ہواؤں سے ضرور بچالے گا۔ اردو کی خدمت جذباتی مسئلہ نہیں، قطعاً منطقی معاملہ ہے۔ یہ ہر دور میں شرافت اور تہذیب کی علامت رہی ہے۔ آج اسے کچھ دوسری نوعیت کی مخالفتوں سے پالا پڑا ہے۔ لیکن اگر ہم فنونِ لطیفہ کو انسان کی ریاضت کا سرمایہ اور انسانیت کے افتخار کا باعث سمجھتے ہیں، اگر مصوری اور نقاشی اور موسیقی اور رقاصی اور فنِ تعمیر کے ایسے نمونوں کی نگہداشت ضروری سمجھتے ہیں جنہیں ہمارے پیش رو بزرگوں نے میراث کے طور پر ہمارے لئے چھوڑا ہے تو ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ اردو بھی اسی ذیل میں آتی ہے اور اسی قبیل سے علاقہ رکھتی ہے۔

"ادارۂ ادبیاتِ اردو" کے کارکن نہایت مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ محدود وسائل میں قناعت اور خوش دلی کے ساتھ بڑے سلیقے اور عرق ریزی سے اس ادارے کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کا یہ بے لوث جذبہ بھی اسی قدر قابلِ تحسین ہے جتنے ادارے کے میوزیم کے دوسرے نوادر ہیں۔

مجھے امید ہے کہ یہ ادارہ دکن میں اسلامی ثقافت اور سرپرستی کے لیے ویسا ہی ثابت ہوگا جیسا کہ ...
استقامت ہے۔ (۹۔ جنوری ۱۹۶۵ء)

۳۔ جناب شمیم احمد قریشی (ریسرچ اسسٹنٹ)
شعبۂ فارسی۔ دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

ادارہ نے تصویروں کی زبانی ایک مکمل تاریخ بہم پہنچائی ہے۔ افسوس ہے کہ میں بذاتِ خود یہاں زیادہ وقت صرف نہ کر سکا۔ (۹۔ جنوری ۱۹۶۵ء)

۴۔ جناب اندرجیت تلسی (راج کوی پنجاب)

ایک عرصے سے ایک بھٹکن تھی جو کہیں بھی بیٹھنے نہ دیتی تھی، ایک سایہ تھا جو ہمیشہ میرے آگے آگے چلا کرتا تھا، ایک معصوم بچے کی طرح میری انگلی کھینچتا ہوا۔ اس اصرار کے ساتھ "مجھے وہاں لے چلو جہاں میرے کھلونے ہیں، جہاں میری سطح کی گہرائیوں میں سے ابھرتی ہوئی آوازوں کا شہر ہے جہاں میری تمناؤں اور خواہشوں کے بازاروں میں رنگ اور اس کے گلال اُڑتے ہیں"۔ وہ بھٹکن وہ تلاش، وہ شہر، وہ بازار، وہ رنگ اس کا اتنا ہوا گلال مجھے اس ادارۂ ادبیاتِ اردو میں ایک عظیم سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دیا۔ میری معصوم بھٹکن یہاں آکر جوان ہو گئی ہے، لیکن کم بخت کھلونا مانگنا نہیں بھولا اور وہ اس نے لے ہی لیا آخر...... ایک بہت قیمتی یاد کی صورت میں، ایک سوغات کی صورت میں، ایک عبادت کی صورت میں...
زندہ باد ڈاکٹر زور صاحب زندہ باد۔ (۱۲۔ جنوری ۱۹۶۵ء)

۵۔ جناب ڈاکٹر ہاشم امیر علی (جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

ایک حیدرآبادی کی حیثیت سے یہ ادارہ میرے لیے باعثِ فخر و مسرت ہے۔ خدا کرے اس کی افادیت میں سال بہ سال ترقی ہوتی رہے۔ (۱۳۔ جنوری ۱۹۶۵ء)

۶۔ جناب پروفیسر سید احتشام حسین
صدر شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی

مجھے ... کو ادارۂ ادبیاتِ اردو ایوانِ اردو ...

اس ادارہ کو آج دوبارہ تفصیل سے دیکھا۔ ڈاکٹر زور مرحوم کے ساتھ دیکھنے کا موقع نصیب نہیں ہوا، اور آج جب یہاں آیا تو پہلا احساس یہی تھا لیکن عبدالمجید صدیقی صاحب، اکبر الدین صدیقی صاحب اور دوسرے دوستوں کے ساتھ ان دونوں کو دیکھنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ ڈاکٹر زور مرے نہیں ہیں وہ ہر جگہ ساتھ ساتھ ہیں، مخطوطات دکھا رہے ہیں، تصویروں اور کتبوں کی اہمیت بتا رہے ہیں اور مستقبل کے منصوبوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے رفقا کو ساتھ لے کر جتنا کام اردو کی بقا اور ترویج کے لیے کیا ہے وہ انھیں زندہ رکھے گا۔ یہ جگہ حیدرآباد کی تہذیبی زندگی کا ایک مرکز بن گئی ہے اور اپنے اندر ایسا ذخیرہ رکھتی ہے جس کو دیکھ کر قدیم اور جدید حیدرآباد کے نقوش ذہن میں ابھر آتے ہیں۔ کاش حالات ایسی کروٹ لیں کہ یہ تہذیبی ادارے صرف زندہ اور باقی نہ رہیں بلکہ ترقی کر سکیں۔
(۱۰۔ فروری ۱۹۶۵ء)

۷۔ مسز کرن لینیرو (ریسرچ اسکالر وسکانسن یونیورسٹی امریکہ)
"بہت لطیف عجائب خانہ" پھر آؤں گی۔
(۲۳۔ فروری ۱۹۶۵ء)

۸۔ حضرت دیوان سید شاہ صولت حسین
سجادہ نشین خواجۂ اعظم غریب نواز (اجمیر شریف)

جناب ڈاکٹر زور مرحوم کے ادارۂ ادبیاتِ اردو کی خدمات کو دنیائے اردو فراموش نہیں کر سکتی۔ مجھ کو اس کا ملال ہے کہ میں اس ادارے کو تفصیل سے بوجہ مصروفیت نہیں دیکھ سکا۔ پھر بھی میں نے جو کچھ سرسری نظر سے دیکھا ہے اس سے روحانی مسرت اور خوشی کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔
(۱۷۔ مارچ ۱۹۶۵ء)

۹۔ جناب برہما دیو پرشاد
(ریسرچ اسکالر کے پی جیسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ)
نہایت ... اور ... کی ... سے ...

ادارہ ادبیات اردو کے معائنے کی سعادت حاصل کی اور اس کے کو تفصیل سے دیکھنے کا ایک نادر موقع ملا جس کے لئے میں [illegible] صاحب کا ممنون ہوں۔ میں اس حقیقت کو حیرت و تعجب کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ دکن کی تاریخی و تہذیبی معلومات اور اس کے تحت ادبیات و حقائق کا جامع اور نادر ذخیرہ ایک فرد واحد (ڈاکٹر زور مرحوم) کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ یہ ادارہ قدیم و جدید تاریخی و تہذیبی اقدار کے لئے جیتے جاگتے ورثے کا نمایندہ ہی نہیں بلکہ اہلِ دکن کے لئے سرمایۂ فخر و مباہات بھی ہے۔ (ترجمہ)

(۱۷۔ مارچ ۱۹۶۵ء)

۱۰۔ حضرت سکندر علی وجد (پن چکی روڈ۔ اورنگ آباد دکن)

آج میں نے ایوانِ اردو میں اس میخانۂ ادب کے زندۂ جاوید ساقی حضرت زور مرحوم کی روح کی یہی صلا سنی ہے۔

"کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق"

(۱۹، اپریل ۱۹۶۵ء)

۱۱۔ محترمہ رضیہ سجاد ظہیر

(۲۴، دوالی، حوض خاص۔ نئی دہلی ۱۶)

لفظ 'جنون' صرف سنتے آئے تھے 'ادارہ ادبیات اردو' میں اس کی صورت دیکھی اور اس کے معنی معلوم ہوئے۔

(۲۰۔ اپریل ۱۹۶۵ء)

۱۲۔ محترمہ سندری اتم چندانی (سندھی ادیبہ۔ بمبئی)

آپ نے اپنے ثقافتی ورثے کو محفوظ کرنے کے لئے جو سعی کی ہے میں اس کی قدر کرتی ہوں اور اس ادارہ کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔ (ترجمہ) ۲۹۔ اپریل ۱۹۶۵ء

۱۳۔ محترمہ پوپٹی ہیرانندانی (سندھی ادیبہ۔ بمبئی)

ایوانِ اردو کو دیکھ کر بے حد مسرت حاصل ہوئی کہ حیدرآبادی حضرات اپنی شاندار تہذیب، ادب اور زبان کو محفوظ کرنے کے لئے انتہائی کوشش کر رہے ہیں۔ (ترجمہ) (۲۹ اپریل ۱۹۶۵ء)

۱۴۔ جناب ڈاکٹر [illegible] (پروفیسر پولیٹیکل سائنس عثمانیہ یونیورسٹی)

آج مجھے مختصر وقت میں ایوانِ اردو کا معائنہ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس کی بنا پر یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں یہاں تفصیلی معائنے کے لئے ضرور دوبارہ حاضر ہوں گا اور مجھے یقینِ واثق ہے کہ یہاں کچھ کام بھی کر سکوں گا۔

(ترجمہ) (۲۴۔ مئی ۱۹۶۵ء)

۱۵۔ جناب شیخ ابوبکر صاحب (ماہر تعلیم حکومت نائجیریا)

ادارہ میں میرا آنا انتہائی مسرت کا موجب تھا۔ یہاں کے متعلقہ عہدہ داروں نے تفصیلی معائنہ کرایا اور مجھے یہ دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی کہ اردو زبان کو ترقی اور رواج دینے کے لئے یہاں ممکنہ کوشش کی جا رہی ہے۔ نیز یہاں کے میوزیم اور کتب خانے کے نادر ذخیرہ کو دیکھ کر بھی میں بے حد متاثر ہوا ہوں جس کے لئے میں ادارۂ ادبیات اردو کے مستعد کارکنوں کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ (ترجمہ) ۲۷۔ مئی ۱۹۶۵ء

۱۶۔ جناب آر۔ این اگورڈ (اسپرنٹنڈنٹ)

(محکمہ اعداد و شمار حکومت آندھرا پردیش)

ایوانِ اردو کے منتظمین اس پر فخر کر سکتے ہیں کہ وہ ایسے بیش بہا مخطوطات کو محفوظ کر رہے ہیں جن سے ان کی ثقافت، زبان اور ادب پر روشنی پڑتی ہے۔ یہاں قطب شاہی اور دکنی نوادر کا لاقیمت سرمایہ محفوظ ہے اور ان کے متعلق اعلیٰ تحقیقاتی کام ہو رہا ہے۔ میں ادارۂ ادبیات اردو کے فروغ کی دلی تمنا رکھتا ہوں۔ (ترجمہ) ۱۶۔ جون ۱۹۶۵ء

۱۷۔ جناب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

(صدر شعبۂ اردو۔ دہلی یونیورسٹی۔ دہلی)

ادارۂ ادبیات اردو کا کتب خانہ اور ذخیرۂ نوادر دیکھ کر روح بالیدہ ہو گئی۔ ان چیزوں کے جمع کرنے میں کتنی ریاضت اور محنت کرنا پڑی ہوگی اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا علمی کاموں سے واسطہ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ادارے کو فروغ بخشے، ان نوادر کو آفاتِ ارضی و سماوی سے محفوظ رکھے اور ڈاکٹر زور مرحوم کی قبر کو نور سے بھر دے۔

(۲۹۔ جون ۱۹۶۵ء)

۱۸۔ جناب ڈاکٹر خواجہ افضل امام
(پروفیسر انچارج شعبۂ ملفوظات۔ پٹنہ یونیورسٹی)

"مجھی اگرچہ خانہ خراب ہنر شدم
دارم ہوائے صحبت اہلِ ہنر ہنوز"

(۱۸۔ جولائی ۱۹۶۵ء)

۱۹۔ جناب عزیز احمد جلیلی (فرزند حضرت جلیل)

میں نے آج اپنی صاحبزادی عمیرہ جلیلی (ایم۔اے) کے ساتھ ایوانِ اردو میں ایک گھنٹہ گزارا۔ یہاں اردو کے تعلق سے اتنا کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے کہ جس کو دیکھ کر حیرت کے ساتھ ساتھ اطمینان بھی ہوتا ہے۔ اس دور میں یہاں جو کچھ بھی کیا جا رہا ہے اس سے اردو کا مستقبل بہت شاندار نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر زور صاحب کا لگایا ہوا یہ پودا ایک عظیم سایہ دار درخت بن چکا ہے۔ علم کے پیاسے جس کے سایہ میں بیٹھ کر اپنی تشنگی بجھا سکتے ہیں اور تسکینِ ذوق پا سکتے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ ادارہ ہمیشہ ترقی کے قدم آگے ہی بڑھاتا رہے گا۔ (۱۱۔ اگست ۱۹۶۵ء)

۲۰۔ محترمہ برندرا اندرجیت سنگھ
(راجکوٹ ہاؤس۔ کرنال (پنجاب))

میرے نزدیک ہندی ثقافت کا بہترین مظہر اردو زبان ہے۔ "ایوانِ اردو" مختصر وقفے میں دیکھ کر میری حیرت اور مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ خصوصاً یہ محسوس کرکے کہ اس حسین زبان کو زندہ رکھنے کے لئے یہاں سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ (ترجمہ)

(۲۷۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء)

۲۱۔ جناب مولانا سید محمد ایم ایل اے۔ حیدرآباد

مولوی اکبر الدین صدیقی صاحب کی عنایتِ خاص سے مجھے ادارۂ ادبیاتِ اردو کو تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں سمجھتا ہوں کہ حیدرآباد کی تاریخ کا کوئی جزو ایسا نہیں ہے جو یہاں کی حفاظت میں نہ لے لیا گیا ہو۔ علمی و ادبی سرمایہ کا بھی ذخیرہ اس کا خاص موضوع ہے جو دکن کی تہذیب کی حیات [illegible] سکتی ہے ایک زندہ خدمت کی حیثیت میں

قابلِ تعریف ہے۔ (۱۸۔ اگست ۱۹۶۵ء)

۲۲۔ جناب سید علی ید اللہی روشن میاں [illegible]

ادارۂ ادبیاتِ اردو کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوا کہ گجرات سے آنا خاص اسی کے لئے تھا جس کو میں دیکھ کر [illegible] یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اس ادارہ نے اردو کی جو خدمت کی ہے اور کر رہا ہے یہ علم کی خدمت ہے۔ اس ادارہ کی خدمات اور اردو زبان کی حفاظت سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں اور بے حد مسرور ہوا ہوں کہ خدمت اور علمی خدمت اس کو کہتے ہیں۔

(۲۹۔ اگست ۱۹۶۵ء)

۲۳۔ جناب علی سردار جعفری
(۱۰۔ پیٹنا محل، بھوا جی پٹیل روڈ بمبئی ۲۶)

آج جب زورؔ مرحوم کے انتقال کے بعد "ایوانِ اردو" میں آیا ہوں تو مجھے اس کے در و دیوار میں مرحوم کی شخصیت اور کام نظر آ رہے ہیں۔ اردو کے لئے اور خاص طور سے دکن کی اردو ادبیات کے لئے ان کی خدمات لافانی ہیں اور آج کے اندھیرے میں "ادارۂ ادبیاتِ اردو" ایک مینارِ نور کی طرح جگمگا رہا ہے

اس اندھیرے میں کہ ملتی نہیں انساں کو راہ
صرف تابندہ ہے شاعر کی نوائے ساقی

(۱۳۔ ستمبر ۱۹۶۵ء)

۲۴۔ پروفیسر نعیم الدین۔ ناگپور مہاودیالیہ، ناگپور

آج کئی سال کے بعد پھر سے ادارہ اور ایوانِ اردو کی زیارت نصیب ہوئی۔ بڑی مسرت کی بات ہے کہ زور مرحوم کے بعد بھی کارکنانِ ادارہ بڑی تن دہی اور دل سوزی سے تنظیمِ ادارہ اور خدمتِ زبان و ادب میں مصروف ہیں۔ دل دعا ہے کہ یہ خوب پھولے پھلے۔

(۵۔ دسمبر ۱۹۶۵ء)

۲۵۔ جناب عبدالاحد [illegible]

آج ادارۂ ادبیاتِ اردو میں حاضر ہونے کا موقع ملا [illegible] ڈاکٹر زور صاحب مرحوم کے کارنامے [illegible]

[illegible] سے متعلق بہت [illegible] ساری چیزیں ایک
[illegible] نے کیسا [illegible] اردو زبان و ادب
[illegible] کا اہتمام کیا ہے۔

[illegible] کہا جا سکتا ہے کہ یہاں نہ صرف پورے حیدرآباد
[illegible] ادب کا اتنا بڑا ذخیرہ شاید ہی کہیں محفوظ
ہے۔ [illegible] ادارہ خوب پھلے پھولے اور اردو دنیا اس سے
[illegible] اٹھائے۔ (۱۷۔ دسمبر ۱۹۶۵ء)

۲۶۔ آقائی [illegible] سرقونصل شہنشاہی ایران۔ بمبئی

یوں تو دنیا میں بہت سے کتب خانے ہیں لیکن یہ کتب خانہ ایک لاجواب ذخیرہ ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے دیکھنے کیلئے جو وقت ملا وہ بہت کم تھا۔ چنانچہ ایران ادبیات کا ذخیرہ بھی یہاں موجود ہے۔ اس کی عمارت بے حد دلکش اور نہایت دیدہ زیب ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس کے تفصیلی معائنہ کی مکرر سعادت حاصل ہوگی۔ (فارسی سے) (۲۲۔ دسمبر ۱۹۶۵ء)

۲۷۔ ڈاکٹر آر۔ ایس۔ کیلکر اسسٹنٹ سکریٹری ساہتیہ اکیڈیمی دہلی

ادارۂ ادبیات اردو کے نادر علمی ادبی اور تہذیبی ذخیرہ سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ یقین ہے کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ اسکی قدر و قیمت میں کثیر اضافہ ہوتا جائے گا۔ یہاں خلوص اور انہماک سے اس کا تحفظ کیا گیا ہے۔ میں اس کی قدر کرتا ہوں۔ (ترجمہ)

(۲۷۔ دسمبر ۱۹۶۵ء)

۲۸۔ پروفیسر ڈاکٹر بھالچندر راؤ تیلنگ
صدر شعبۂ ہندی مرہٹواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد

جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب کے ہمراہ ادارۂ ادبیات اردو کے معائنہ کا موقع ملا اور اس کے ذخیرہ کو دیکھ کر مجھے دلی مسرت حاصل ہوئی۔ یہ ادارہ نہایت عمدہ اصولوں پر کام کر رہا ہے۔ یہاں کا ذخیرہ لاجواب ہے اور یہاں سائنٹفک طریقوں پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ یقین ہے یہ ترقی کی منزلیں طے کرے گا۔ یہاں کی فہرست مخطوطات و مطبوعات دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔
(ترجمہ) (۳۰۔ دسمبر ۱۹۶۵ء)

محمد قلی قطب شاہ

اداریہ نوٹ مطبوعہ ماہنامہ "پیام" حیدرآباد

"دکن میں قطب شاہی خاندان نے اپنے دو سو سالہ دورِ حکومت میں علم و ادب کی جو گرانقدر سرپرستی کی ہے وہ ایک ناقابلِ فراموش حقیقت ہے۔ ۱۹۵۱ء سے اب تک ہر سال "ادارۂ ادبیات اردو" کی طرف سے قطب شاہی خاندان کے پانچویں تاجدار اور شہرِ حیدرآباد کے بانی شاعر محمد قلی کی یاد اور اس کے سماجی و ادبی کارناموں کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے یوم محمد قلی قطب شاہ جس قدر اہتمام کے ساتھ منایا جاتا ہے اس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اگر ادارۂ ادبیات اردو کے اراکین کی دلچسپی اسی طرح برقرار رہی تو مستقبل قریب میں اس یوم کو حیدرآباد کی تہذیبی زندگی میں ایک کلچرل تہوار کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ (فروری ۱۹۶۵ء)

● اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے متعلق جتنا کثیر مستقل اور تحقیقی و مفید کام یہ ادارہ نہایت خاموشی سے کر چکا ہے اور کر رہا ہے کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے غالباً اردو کا کوئی بھی خواہ ادارہ اس کے مماثل نہیں ہو سکتا۔ میں بانیِ ادارہ کے خلوص، ہمت اور محنت و عمل سے بہت متاثر ہوا۔ اس خصوص میں جتنے ساعی [illegible] ہندوستان میں دیکھے، یہ ادارہ کئی حیثیتوں سے ان پر مرجح ہے، جس کا اندازہ ادارے کے تفصیلی معائنے ہی سے ہو سکتا ہے۔" (مولانا حسرت موہانی [illegible])

★

● اگر میں یہاں نہ آتا تو مجھے بڑا افسوس ہوتا۔ کام کرنے کے ایسے ہی طریقے سب کو یہاں سے سیکھنے چاہئیں۔" (ڈاکٹر) عبدالقادر۔ لاہور

(ایوانِ اردو کے آدمی قدیم کے دستخط)

مصروفیات ادارہ

علمی ــــ ادبی ــــ اور ــــ ثقافتی

۱۹۶۵ء

ادارے کی ڈائری سے

جنوری ۱۹۶۵ء

سہ شنبہ ۵۔ جنوری: حضرت منشی ششیشور پرشاد منور لکھنوی ۴ بجے شام ایوانِ اردو تشریف لائے اور ادارہ کے مختلف شعبوں کو تفصیل سے دیکھا۔ اس موقع پر ایوانِ اردو میں جناب محمد اکبرالدین صدیقی معتمد کتب خانہ، جناب میر سراج الدین علی خان اعزازی آفس سکریٹری، جناب گوپی چرن داس سکریٹری عاجز اور جناب منوہر پرشاد ماتھر ایڈوکیٹ موجود تھے۔ وقار خلیل نے ایوانِ اردو کی معزز مہمانوں کو سیر کرائی۔

ہفتہ ۹۔ جنوری: جناب نثار احمد فاروقی لکچرار شعبہ عربی سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی یونیورسٹی اور جناب نسیم احمد قریشی ریسرچ اسسٹنٹ شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا اور ادارہ کے مخطوطات و مطبوعات کے سرمایہ سے استفادہ کیا۔

پیر ۱۱۔ جنوری: پنجاب کے طرح گوئی جناب اندر جیت سنگھ تلسی جنھیں ہندی اور اردو کے ادیب کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل ہے، ۴ بجے شام ایوانِ اردو کے شعبہ جات میوزیم کتب خانہ اور دارالمطالعہ کا معائنہ کیا۔

چہار شنبہ ۱۳۔ جنوری: ۱۰ بجے صبح [illegible] پرنسپل زرعی کالج [illegible] جناب [illegible] علی خان صاحب استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ [illegible] ادارہ کے مختلف شعبوں اور بالخصوص کتب خانہ و میوزیم [illegible] معتمد [illegible] امین علی خان صاحب آفس سکریٹری

اور محمد جمال الدین صاحب ناظم ادارہ نے موصوف کو ایوانِ اردو کی سیر کرائی۔

ہفتہ ۱۶۔ جنوری: نواب عنایت جنگ بہادر نے اردو میوزیم کا معائنہ فرمایا اور مختلف فنی شہ پاروں سے لطف اندوز ہوئے۔ اس موقع پر نائب صدر ادارہ پروفیسر محمد عبدالمجید صدیقی اور جناب اکبرالدین صدیقی ایوانِ اردو میں موجود تھے۔

• جناب ڈاکٹر غلام عمر خان ریڈر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کی کتاب "اقبال کا تصورِ عشق" ادارہ کی طرف سے شائع ہوئی۔ اس طرح ادارہ کی طرف سے ۲۰۹ کتابیں مختلف علمی، ادبی، تحقیقی اور تہذیبی موضوعات پر شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔

اتوار ۱۷۔ جنوری: ۱۱ بجے جناب [illegible] احمد علی بیگ چغتائی جرنلسٹ نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔ ادارہ کی طرف سے موصوف کی مرتبہ کتاب "تاریخ ناز" [illegible] چند سال پہلے شائع ہو چکی ہے۔ محمد زہیر الدین صاحب [illegible] نے چغتائی صاحب کو ایوانِ اردو کی سیر کرائی۔

فروری ۱۹۶۵ء

پیر یکم فروری: ادارہ کی نئی کتاب جس [illegible] ۲۰۰ [illegible] شائع ہوئی۔ یہ کتاب [illegible] کلیات [illegible] [illegible]

[illegible] کی تحریریں شامل ہیں [illegible] جناب محمد [illegible] صدیقی لکچرار شعبہ اردو جامعہ [illegible] مجلس مشاورت "سب رس" کے تعاون سے مرتب کیا ہے۔

جمعہ ۵۔ فروری: اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر [illegible] کے اولین علمبردار سلطان محمد قلی قطب شاہ کی یاد میں ادارہ کی طرف سے منائی جانے والی سالانہ سہ روزہ تقریب "یوم قلی قطب شاہ" کے بارے میں صحافت کے لئے پریس نوٹ جاری کیا گیا جو مختلف زبانوں کے تمام اخبارات میں شائع ہوا۔

ہفتہ ۶۔ فروری: دہلی کے مشہور ادبی ماہنامہ "چراغِ جہاں" کی اشاعت فروری ۶۵ء میں "سب رس" کے ہاشمی نمبر پر تبصرہ شائع ہوا۔

اتوار ۷۔ فروری: یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں [illegible] بجے شام "ایوان اردو" کے آڈی ٹوریم میں بین کلیاتی اور بین المدارس تقریری و تحریری مقابلے منعقد ہوگئے۔ ڈاکٹر غلام عمر خان ریڈر جامعہ عثمانیہ و کنوینر مقابلہ جات، نے مقابلوں میں شریک طلباء و طالبات کی ہمت افزائی کی۔ تقریری مقابلہ جات جناب میر حسن ساجی اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو مدراس کی صدارت میں منعقد ہوئے۔ پروفیسر مغنی تبسم اور ڈاکٹر غلام عمر خان نے حکم کے فرائض انجام دیئے۔ مقار خلیل نے شکریہ ادا کیا۔

منگل ۹۔ فروری: ایوان اردو میں ۵ بجے شام پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ اور پروفیسر مجید صدیقی صاحب نائب صدر ادارہ کے علاوہ جناب سدرشن راج سکسینہ معتمد تقاریب یوم محمد قلی نے پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ انگریزی، تلگو اور اردو اخبارات کے نمائندوں نے شرکت کی۔ ارباب صحافت کو تیاری کمیٹی یوم محمد قلی قطب شاہ کی طرف سے عصرانہ بھی دیا گیا۔

چہارشنبہ ۱۰۔ فروری: "یوم محمد قلی قطب شاہ" کی پریس کانفرنس اخبارات میں شائع ہوئی۔

[illegible] ۱۱ بجے ممتاز نقاد پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبۂ اردو [illegible] یونیورسٹی نے "ادارۂ ادبیات اردو" کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔

پروفیسر عبدالمجید صدیقی نائب صدر ادارہ نے "ایوان اردو" میں احتشام صاحب کا خیر مقدم کیا۔ ادارہ کے تمام شعبوں کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد پروفیسر احتشام نے مختلف علمی و ادبی موضوعات پر تبادلۂ خیالات کیا۔ اس موقع پر ایوان اردو میں ڈاکٹر غلام عمر خان، پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی، جناب میر حسن، نواب میر یسین علی خان، جناب سریواس لاہوٹی اور میر سراج الدین علی خان صاحب آنریری سکریٹری موجود تھے۔

۵ بجے شام "یوم محمد قلی قطب شاہ" کے سلسلے میں بمقام علی کالج واقع معظم جاہی روڈ بین کلیاتی بیت بازی کے مقابلوں کا آغاز ہوا جس میں مختلف کالجوں کی ٹیموں نے حصہ لیا۔ حکیم یوسف حسین خان صاحب پرنسپل نظامیہ طبی کالج نے صدارت فرمائی، جناب ناصر کرنولی (یم۔ اے)، مدیر ماہنامہ "پونم" اور مقار خلیل نے حکم کے فرائض انجام دیئے۔ جناب صلاح الدین نیر (کنوینر) نے شکریہ ادا کیا۔ ابتداء بیت بازی کے مقابلوں کے انعقاد کی وضاحت کرتے ہوئے نواب طاہر علی خان صاحب پروپرائٹر علی برادرس کے تعاون کا ذکر کیا۔

جمعرات ۱۱۔ فروری: ۵ بجے شام علی کالج میں بیت بازی کے بین کلیاتی مقابلوں کا تسلسل جاری رہا اور مختلف کالجوں کی ٹیموں نے اپنا ریکارڈ بنایا۔ حکیم یوسف حسین خان صاحب کی صدارت میں جناب کنول پرشاد کنول مددگار ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ اور مقار خلیل نے حکم کے فرائض انجام دیئے۔ اس موقع پر کئی علمی و ادبی حضرات اور اساتذہ نے "بیت بازی" کے مقابلوں کو سراہا اور طلباء کے معیاری اشعار کی داد دی۔ صلاح الدین نیر صاحب کنوینر نے شکریہ ادا کیا۔

جمعہ ۱۲۔ فروری: جناب کرک [illegible] ریسرچ اسکالر [illegible] یونیورسٹی نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔ موصوف پی ایچ ڈی کے مقالے "واجد علی شاہ، عہد اور کارنامے" کے موضوع پر [illegible] ہیں۔

ہفتہ ۱۳۔ فروری: [illegible] بجے شام یوم محمد قلی قطب شاہ [illegible]

تقاریب کا افتتاحی جلسہ عام محمد قلی قطب شاہ کے گنبد واقع گولکنڈہ پر سیاسی وزیر برائے نواب میر احمد علی خان کی صدارت میں منعقد ہوا اس اجلاس سے قبل ہی کلیاتی بیت بازی کا فائنل مقابلہ اختتام کو پہنچا۔ صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر نے یوم قلی کے سلسلے میں آئے ہوئے مختلف پیامات سنائے۔ معتمد عمومی ادارہ پروفیسر ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ نے خیر مقدمی تقریر کی۔ پیا مہیشن پرشاد اکبر علی خان رکن پارلیمان اور جناب ورانی ڈپٹی میئر بلدیہ عظیم تر حیدرآباد نے محمد قلی کے عہد حکومت اور اس کے شعری خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا۔ ممتاز موسیقاروں نے سازوں پر محمد قلی کا کلام سنا کر داد تحسین حاصل کی۔ محترمہ باڑ طاہرہ سعید نے منظوم خراج عقیدت ادا کیا۔ فارسی خطبہ اور فارسی کلام محمد قلی کے علاوہ عزیز احمد خان وارثی کی قوالی اور آتشبازی بھی ہوئی۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی کے مزار پر ادارہ کی طرف سے چادر گل چڑھائی گئی اور کیپٹن عباس عابدی نے محمد قلی کے مرثیے سنائے۔ اس تاریخی اور عظیم اجتماع میں مختلف مذاہب کے افراد اور بہ زبانوں شاعروں کے علاوہ ممتاز سیاسی و تہذیبی اداروں کے قائدین کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ جناب رمن راج سکسینہ معتمد تیاری کمیٹی یوم محمد قلی نے شکریہ ادا کیا۔

• ۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کے افتتاحی اجلاس کی ریڈیائی رپورٹ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے ریکارڈ کی۔

جمعرات ۱۴۔ فروری: یوم قلی قطب شاہ کا دوسرا ادبی اجلاس صبح ۱۰ بجے ایوان اردو میں بصدارت پروفیسر سید علی اکبر صاحب منعقد ہوا۔ پروفیسر سید محمد، مولوی غلام رسول، جناب میر حسن، جناب محمد عبدالرحیم خان ناظم محکمۂ آثار قدیمہ، جناب ضیاء الدین احمد شکیب ایم اے علیگ اور جناب احمد حسین ایم اے عثمانیہ نے محمد قلی کی شخصیت، شاعری اور کلیات کے موضوع پر مقالات پڑھے اور ڈاکٹر زینت [illegible] حسینی اور [illegible] نے [illegible] پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی عالمانہ صدارتی تقریر کے بعد محمد اکبر الدین صدیقی معتمد ادبی اجلاس نے شکریہ ادا کیا۔

• ۔ ایوان اردو کے میوزیم گیلری میں صبح ۱۰ بجے یوم محمد قلی کے سلسلے میں نمائش آثار و نوادر قطب شاہیہ کا افتتاح حیدرآبادی ادبیات اور تہذیب کے رمز آشنا قابل احترام شخصیت نواب عنایت جنگ بہادر نے کیا۔ جناب مولوی خواجہ محمد احمد سابق ناظم آثار قدیمہ ریاست حیدرآباد اور میر سراج الدین علی خان صاحب آنریری سکریٹری ایوان اردو نے اس نمائش کا خاص اہتمام کیا تھا جس میں قطب شاہی ادبیات کے وافر ذخیرہ مخطوطات و مطبوعات کے علاوہ فرامین سکے اور دیگر تہذیبی اشیاء رکھے گئے تھے۔ حیدرآباد کے علمی و ادبی حضرات اور اردو دوستوں نے تین روز تک دلچسپی لی۔

• ۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں روزنامہ "نظام گزٹ" میں خصوصی اداریہ شائع ہوا جس میں ادارہ کی سرگرمیوں اور اس تقاریب کی افادیت و اہمیت کا تذکرہ تھا۔

• ۔ اسی سلسلے میں روزنامہ ملاپ حیدرآباد میں سابق میئر بلدیہ جناب کرشنا سوامی مدیراج کا مضمون "محمد قلی قطب شاہ" شائع ہوا

• ۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کی آخری اردو تقریب محفل شعر و سخن ½۹ بجے شب ایوان اردو کے بجائے مشرقی طرز کے حسین و جمیل آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ جسٹس گوپال راؤ ایکبوٹے صاحب نے مشاعرہ کی صدارت فرمائی۔ میر سراج الدین علی خان صاحب نے مشاعرہ کی کارروائی چلائی۔ ممتاز قدیم و جدید مکتب فکر کے شعراء نے کلام سنایا۔ اور باذوق سامعین نے پورے سکون و ضبط سے قریب تین گھنٹے مشاعرہ سنا۔

جمعہ ۱۵۔ فروری: یوم محمد قلی قطب شاہ کی آخری اور سہ روزہ تلگو تقریب ۷ بجے شام ایوان اردو میں منعقد ہوئی۔ ادارہ کا آڈیٹوریم تلگو داں خواتین و حضرات سے بھرا ہوا تھا۔ صدر شعبۂ تلگو جامعہ عثمانیہ ڈاکٹر وینکٹ اودھانی نے جلسہ کی صدارت کی۔ ڈاکٹر رام کوٹی شاستری، ڈاکٹر [illegible] اور شیواجی [illegible] اجلاس [illegible] ڈاکٹر [illegible] نے محمد قلی کے عہد اور اس دور کی علمی و سماجی خدمات پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر محمد عبدالمجید صدیقی نے

سامنے ... کا غیر مقدم کیا گیا۔

۲۰۔ فروری: حیدرآباد کے مشہور علمی و ادبی ماہنامہ "پونم" کی اشاعت ماہ فروری میں "یوم محمد قلی" کے سالانہ انعقاد پر ادارتی ... شائع ہوا جس میں ادارہ کے زیر اہتمام ہر سال منائی جانے والی یادگار تقریب کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ادارہ کے ... علمی و ادبی خدمات کی ستائش کی گئی۔

۲۱۔ فروری: ڈاکٹر غلام عمر خان کی مطبوعہ کتاب "اقبال ... " پر ہفتہ وار "شعور" حیدرآباد میں تبصرہ شائع ہوا۔

[illegible] ۲۱۔ فروری: ۹ بجے ساعت شام آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے افتتاحی اجلاس یوم محمد قلی قطب شاہ کی اردو اور ... رپورٹ نشر ہوئی۔ اردو رپورٹ مشہور ڈرامہ نویس جناب ... مصنف ساونل، کی مرتبہ تھی جسے موصوف ہی نے پیش کیا۔

۲۲۔ فروری: ادارہ کے ترجمان ماہنامہ "سب رس" کے ... ہاشمی نمبر پر روزنامہ سیاست حیدرآباد میں سیر حاصل تبصرہ شائع ہوا۔

... جناب شفیق تاتاری (کانپور)، رکن مجلس عاملہ متحدہ ... سوشلسٹ پارٹی نے ایوان اردو کے تمام شعبہ جات کا تفصیلی معائنہ کیا اور ادارہ کی علمی، ادبی اور اشاعتی سرگرمیوں پر مسرت کا اظہار کیا۔

۲۳۔ فروری: مشہور سہ ماہی مجلہ "صحیفہ" لاہور میں سب رس ستمبر اور اکتوبر کی اشاعتوں میں مطبوعہ مضامین "حرف آشنا" از جناب شیدا آبادی اور "نیا سورج نئی کرنیں" اردو شاعری میں ... ملک ... زاہد کی تلخیص "رفتار ادب" کے زیر عنوان ڈائجسٹ ہوئی ہیں۔

چہارشنبہ ۲۴۔ فروری ۴ بجے شام: مسٹر جان جی لیونارڈ اور مسز ... لیونارڈ (امریکن ریسرچ اسکالرس ورس کانسن یونیورسٹی امریکہ) نے ایوان اردو کا تفصیل کے ساتھ معائنہ کیا۔ میوزیم، کتب خانہ اور قلمی کتابوں کے گرانقدر ذخیروں کو دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔ اول الذکر ... ادبیات پر اور ثانی الذکر تاریخ ہند پر اسٹوڈنٹس میں تحقیقی کام انجام دے رہے ہیں۔

۲۵۔ فروری: آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے رات کے ۸ بجکر ۲۰ منٹ پر ادارہ کی مطبوعہ تاریخ "گولکنڈہ" طبع دوم از پروفیسر مجید صدیقی پر جناب محمد اکبر الدین صدیقی کا تبصرہ نشر ہوا۔

مارچ ۱۹۶۵ء

چہارشنبہ ۳۔ مارچ: مشہور مصور جناب ... اور ان کی بیگم نے ایوان اردو کا معائنہ کیا اور ... کو دلچسپی کے ساتھ دیکھا اور دکنی پینٹنگ کے بارے میں معلومات ... میر سراج الدین علی خاں اعزازی آفس سکریٹری کا نے ... کے تمام شعبہ جات سے متعارف کرایا۔

۴۔ مارچ: جناب مصلح الدین سعدی ایڈیٹر ماہنامہ "افق" حیدرآباد نے ایوان اردو کے مختلف شعبوں کا معائنہ کیا۔

۶۔ مارچ: ادارہ کے اردو امتحانات منعقدہ دسمبر ۶۴ء کے نتائج برائے اشاعت صحافت کے حوالے کئے گئے۔

۷۔ مارچ: یونانی طب کے مشہور محقق پروفیسر حکیم عبدالوہاب ظہوری نے ایوان اردو کی نادرات کا معائنہ کیا۔ نقاد خلیل نے موصوف کو مختلف شعبوں کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔

۱۱۔ مارچ: ماہنامہ "صبح امید" بمبئی بابتہ مارچ میں سب رس کے ہاشمی نمبر پر تبصرہ شائع ہوا۔

۱۲۔ مارچ ۱۲ بجے دوپہر امریکی نژاد ریسرچ اسکالرس کیرن لیونارڈ نے جناب محمد اکبر الدین صدیقی کے ہمراہ کتب خانہ اور میوزیم کا معائنہ کیا۔ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ تاریخ سے موصوفہ پی۔ ایچ ڈی کے لئے تاریخی کام کر رہی ہیں۔

منگل ۱۶۔ مارچ ۱ بجے ظہر حضرت پیر سید شاہ ... صاحب قبلہ دیوان جی اجمیر آستانہ نشین غریب نواز نے ایوان اردو کا مفصل معائنہ فرمایا۔ نائب صدر ادارہ ... نے ادارہ میں آپ کا استقبال کیا۔ پیر جی نے ... کے شعبوں سے مخطوطات و مطبوعات ... دلچسپی سے ملاحظہ فرمایا۔ اس موقع پر ترتیب دیئے گئے ...

متعلق ادارے کے اراکین کے علاوہ ممتاز اہل دانش حضرات نے شرکت فرمائی۔

۔ لکھنؤ کے پندرہ روزہ اخبار "سرورج" میں فروری کے نمبر میں سے پروفیسر سید احتشام حسین کا مضمون "دکن کا عاشق نصیر الدین ہاشمی" ڈائجسٹ ہوا۔

۲۴ مارچ: ظ۔ انصاری صاحب کے دو روزہ "آئینہ" بمبئی میں یوم محمد قلی قطب شاہ کو آخری دیکھا حال مرتبہ ذوالفقار خلیل اپنی تقریب کی دیگر تصاویر کے ساتھ شائع ہوا۔

۲۵۔ مارچ: ہفت روزہ "پرجا" نظام آباد میں مرکز نظام آباد کے کامیاب طلبا و طالبات کے نتائج شائع ہوئے جنہوں نے ادارہ کے اردو امتحانات میں شرکت کی تھی۔

۳۱۔ مارچ: ماہنامہ "عائشہ" کراچی بابتہ مارچ میں سب رس کے ہاشمی نمبر پر تبصرہ شائع ہوا۔ اور سب رس سے نجیب اسلم صاحب کی غزل بھی ڈائجسٹ ہوئی۔

اپریل ۱۹۶۵ء

یکم اپریل: کتابی دنیا کراچی بابتہ مارچ میں سب رس کے ہاشمی نمبر پر جناب ضیاء الدین احمد برنی کا تبصرہ شائع ہوا۔

۹۔ اپریل: مشہور دکنی شاعر سرور ڈنڈا مرحوم کے والد بزرگوار نے ادارہ کا معائنہ کیا۔

۱۰۔ اپریل: ادارہ کے مرکز اردو امتحانات نظام آباد کی اطلاع کے مطابق ایک شاندار جلسہ عام میں ادارہ کے اردو امتحانات میں شرکت کرنے والے طلبا و طالبات کو اسناد تقسیم کئے گئے جلسہ تقسیم اسناد کی صدارت ڈاکٹر محمد عبدالقدوس صاحب زعمی فاضل دیوبند نے انجام دی۔ معتمد مرکز امتحانات جناب حافظ قاری سید حفظ علی صاحب اور دیگر اصحاب ضلع نے تقریریں کیں اور ان امتحانات کی افادیت واضح کی۔ اسی رات جناب وحید مرزا صاحب ایڈوکیٹ معتمد انجمن ترقی اردو نظام آباد کی صدارت میں غیر طرحی مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔

جمعہ ۱۰۔ اپریل: جناب ... ریسرچ اسکالر کے۔ پی۔ جیسوال ریسرچ انسٹیٹیوٹ پٹنہ ... علی خان صاحب کے ہمراہ ایوان اردو کا معائنہ کیا ... تاریخ بہار بعہد مغلیہ پر ریسرچ کی خاطر ادارہ کے کتب خانے سے چند دنوں تک استفادہ بھی کیا۔

اتوار ۱۸۔ اپریل: پروفیسر ہاشم علی ریسرچ یونیورسٹی ... اور محترمہ مس محمودہ سکی شعبہ ریسرچ اسکالر میسور یونیورسٹی نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا اور اعزازی معتمد کتب خانہ جناب محمد اکبر الدین صدیقی سے علمی موضوعات پر تبادلہ خیال بھی کیا۔

پیر ۱۹۔ اپریل: اردو کے ممتاز شاعر حضرت ... کے ساتھ ایوان اردو کے خوبصورت آڈیٹوریم میں شعرائے دکن کی ایک یادگار شام کا ادارہ کی طرف سے اہتمام کیا گیا۔ الحاج مرزا اشکور بیگ نے صدارت کی۔ اس موقع پر حضرت وحید نے اپنا کلام سنایا اور مختلف علمی و ادبی موضوعات پر تبادلہ خیال ہوا۔ پروفیسر حکیم یوسف حسین خان پرنسپل نظامیہ طبی کالج، حضرت تاج قریشی، ذوالفقار خلیل، پرنس نقی علی خان ثاقب، میر سراج الدین علی خان اور صلاح الدین نیر نے کلام سنایا۔ مولوی خواجہ محمد احمد سابق ناظم آثار قدیمہ اور جناب میر حسن سابق اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو مدراس بھی اس موقع پر موجود تھے۔ حضرت وحید نے ایوان اردو کے تمام شعبہ جات کا معائنہ کیا اور کتب خانے میں موجود اپنی کتابوں پر آٹوگراف بھی دئے۔

چہارشنبہ ۲۸۔ اپریل: مشہور افسانہ نگار محترمہ رضیہ سجاد ظہیر صاحبہ نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔ ذوالفقار خلیل نے ادارہ کے تمام شعبوں سے متعارف کرایا۔ اس موقع پر پروفیسر ہاشم علی خاں رجسٹرار یونیورسٹی، جناب کنول پرشاد کنول ایڈیٹر اردو ہندی ماہنامہ آندھرا پردیش، محترمہ فاطمہ عالم علی معتمد اردو مجلس اور محترمہ محمودہ سکی ریسرچ اسکالر میسور یونیورسٹی بھی ایوان اردو میں موجود تھے۔

جمعرات ۲۹۔ اپریل: سندھی زبان کی ادیب خاتون محترمہ سندری اتم چندانی اور ان کے شوہر ... صاحب نے پروفیسر

محترمہ ثریت ساجدہ ریڈر جامعہ عثمانیہ کے ہمراہ ایوان اردو کا معائنہ کیا اور ادارہ و میوزیم کے نادر ذخیرہ کو دلچسپی کے ساتھ دیکھا میر سراج الدین علی خان صاحب اور وقار خلیل نے مہمانوں کو تمام شعبوں کی سیر کرائی

مئی ۱۹۶۵ء

یکم مئی۔ ادارہ کے شعبۂ امتحانات کی طرف سے انوار العلوم ہائی اسکول نامپلی میں طلبائے اردو عالم کی سہولت کے لیے مفت تعلیم کی کلاسوں کا آغاز ہوا۔

۳ مئی۔ بمبئی کے دو روزہ "دوریجات" میں سب رس مئی سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مضمون "اردو گھر سے باہر" ڈائجسٹ ہوا۔

۷ مئی۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی کے ہفت روزہ "صدق جدید" لکھنؤ میں ادارہ کی کتاب "اقبال کا تصور عشق" از ڈاکٹر غلام عمر خان پر تبصرہ شائع ہوا۔

۸ مئی۔ انجمن ترقی اردو ہند کے ہفتہ وار ترجمان "ہماری زبان" علی گڈھ میں سہ روزہ یوم محمد قلی قطب شاہ کی رپورٹ مرتبہ وقار خلیل شائع ہوئی

منگل۔ ۲۵ مئی۔ جرمن مستشرق ڈاکٹر ہنس کروز پروفیسر پولیٹیکل سائنس جامعہ عثمانیہ اور جناب ڈاکٹر محمد صابر خان پرنسپل جبار گرام گورنمنٹ کالج مغربی بنگال نے ادارہ کے تمام شعبہ جات کا تفصیلی معائنہ کیا۔ میر سراج الدین علی خان اور محمد جلال الدین صاحبان نے ایوان اردو کے بارے میں تفصیلات سے واقف کرایا۔

جمعرات ۲۷ مئی۔ ماہر تعلیم حکومت نائجیریا جناب شیخ ابوبکر دولانے حکومت آندھرا پردیش کے ڈپٹی ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم مسٹر ٹی۔ وی نارائن کے ہمراہ ایوان اردو کا معائنہ کیا۔ ڈپٹی ڈائرکٹر ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جناب خواجہ محمد احمد اور اعزازی آفس سکریٹری ادارہ جناب میر سراج الدین علی خان نے معزز مہمان کی سیر کرائی۔

۲۸۔ مئی۔ ماہنامہ کتابی دنیا کراچی بابتہ مئی میں سب رس مارچ میں مطبوعہ چند اہم مضامین کے اقتباسات شائع ہوئے۔

جون ۱۹۶۵ء

۶ جون۔ یوم محمد قلی منعقدہ ۱۹۶۵ء کے موقع پر پڑھے اور لکھے گئے مضامین نظم و نثر پر مشتمل ایک کتاب "یادگار محمد قلی" (مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی) شائع ہوئی جس پر ادارہ کا سلسلہ مطبوعات ۳۰۰ درج ہے۔

جمعرات ۱۰ جون۔ ۶ بجے شام انوار العلوم ہائی اسکول میں طلبائے اردو عالم کی طرف سے ادارہ کے زیر اہتمام اردو تعلیم کے اختتام پر اظہار تشکر کے لئے طلبا کی طرف سے عشائیہ ترتیب دیا گیا تھا۔ اس جلسۂ وداعیہ کی صدارت پروفیسر نصیر الدین نظامی نے کی۔ پروفیسر سید محمد، مولوی عارف الدین حسن معتمد اردو امتحانات جناب احمد جلیس (ایم۔ اے) اور طلبا نے مخاطب کیا۔

جمعہ، ۱۱ جون۔ وقار خلیل، بشیر انور صاحب اور ظہیر الدین صاحب صدر نگرانکار اردو امتحانات ادارہ علی الترتیب، محبوب نگر، نظام آباد اور نارائن کھیڑ کے مراکز اردو امتحانات کے لئے روانہ ہوئے۔

ہفتہ ۱۲ جون۔ ادارہ کے امتحانات اردو عالم، اردو فاضل اردو دانی اور زبان دانی مراکز حیدرآباد (انوار العلوم کالج ملے پلی سنٹرل جیل) کے علاوہ محبوب نگر، نظام آباد اور نارائن کھیڑ میں ایک ساتھ ۱۴ جون تک منعقد ہوئے۔ مرکز انوار العلوم کالج پر جناب محمد اکبر الدین صاحب صدیقی، ڈاکٹر خالدہ یوسف اور نصیر الدین نظامی صاحب نے نگرانی کے فرائض انجام دیے مرکز محبوب نگر پر "دار الامان" میں امتحانات منعقد ہوئے۔ صدر نگرانکار وقار خلیل کی معاونت مولانا قمر بہرامی جناب امیر الدین قادری صاحب، مجیب الرحمن صاحب، محبوب علی انجم و عبد الغنی صاحب معتمدین مراکز نے کی۔

مرکز نظام آباد پر حافظ معظم علی صاحب معتمد امتحانات نے صدر نگرانکار بشیر انور صاحب کا ہاتھ بٹایا۔ امتحانات کے دوسرے دن بشیر انور نے ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے ادارہ کے اردو امتحانات کی افادیت ظاہر کی۔

اتوار، ۱۳۔ جون۔ صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر جناب

ساجد علی صاحب سابق نائب ناظم تعلیمات جناب ظہیر حسین سابق ناظم بندوبست، الحاج مولانا سید تقی الدین قادری سجادہ نشین درگاہ حضرت ذوقم اور میر سراج الدین علی خاں صاحب نے مرکز امتحان انوار العلوم کالج کا معائنہ کیا۔ جناب مولوی عارف الدین حسن صاحب معتمد اعزازی امتحانات نے تفصیلات سے واقف کرایا۔

پیر ۱۴ر جون۔ ادارے کے اردو امتحانات بلدہ حیدرآباد اور اضلاع کے مرکزوں پر بخیر و خوبی اختتام کو پہنچے۔

منگل، ۱۵۔جون۔ وقار خلیل اور بشیر انور صاحب بعد فراغت امتحان مراکز سے حیدرآباد پہنچے۔

چہارشنبہ ۱۶۔جون۔ ۱۱ بجے دن، ڈاکٹر تنویر احمد علوی لیکچرار دہلی یونیورسٹی نے "ایوان اردو" کا تفصیلی معائنہ کیا۔ وقار خلیل نے آپ کو ادارہ کی سیر کرائی۔

• ۔ ۳½ بجے ریاستی وزیر فینانس ڈاکٹر چنا ریڈی کے اجلاس پر سکریٹریٹ میں ناظم کتب خانہ جات آندھرا پردیش کا ایک خصوصی اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں تلگو، اردو مطبوعات کی خریدی کے بارے میں مختلف مسائل زیر بحث آئے۔ میر سراج الدین علی خان صاحب آفس سکریٹری نے ادارہ کی نمائندگی کی۔

۱۹ر جون۔ ماہنامہ عارف لاہور بابتہ جون میں ایم اے س سے رزاق فاروقی صاحب کا مضمون "ابوالکلام آزاد کا ایک قدیم مضمون" ڈائجسٹ ہوا۔

• ۔ ترقی اردو بورڈ پاکستان کے سہ ماہی ترجمان "اردو نامہ" کراچی بابتہ جون میں "سب رس" کے ہاشمی نمبر پر تبصرہ شائع ہوا۔

۲۰ر جون۔ ماہنامہ "جالستان" دہلی بابتہ جولائی میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مضمون "اردو گھر سے باہر" سب رس سے ڈائجسٹ ہوا

پیر ۲۱ر جون۔ روزنامہ سیاست حیدرآباد میں "نادر مخطوطات ایوان اردو میں" کے زیر عنوان وقار خلیل کا مضمون شائع ہوا

چہارشنبہ ۲۳۔جون۔ جناب سید امیر الدین قادری استاد ماڈل بیسک اسکول، مخدوم علی صاحب صابر معتمد مرکز اردو امتحانات

اور محبوب علی انجم صاحب لائبریرین انقلاب سالار جنگ محبوب نگر سے ادارہ پہنچے اور ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

پیر ۲۸۔جون۔ وزارت تعلیم حکومت ہند کا ایک وفد دہلی سے حیدرآباد پہنچا۔ وفد ایوان اردو کے مختلف شعبوں کا معائنہ کیا۔ اراکین ادارہ سے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کیا۔

منگل، ۲۹۔جون۔ ممتاز ادیب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے ڈاکٹر فاروقی نے ایوان اردو میں ایک ادبی اجلاس کو "مولانا ابوالکلام آزاد کا مقام اردو صحافت میں" کے زیر عنوان مخاطب کیا۔ اس اجلاس کی صدارت ریاستی وزیر داخلہ نواب میر احمد علی خان نے کی۔ ڈاکٹر مع پروفیسر مہندر راج سکسینہ معتمد اعزازی ادارہ و انسٹی ٹیوٹ نے ایوان اردو میں خلیق صاحب کا خیر مقدم کیا اور ان کی ادبی و علمی خدمات کو سراہا۔

جولائی ۱۹۶۵ء

ہفتہ، ۱۷۔جولائی ڈاکٹر زیڈ اے دیسائی سپرنٹنڈنٹ شعبہ فارسی و عربی مخطوطات دفتر آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا ناگپور نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔ اردو میوزیم میں آپ نے ان کی کتبات کو خصوصی طور پر دیکھا جناب خواجہ محمد احمد سابق ناظم آثار قدیمہ حیدرآباد اور میر سراج الدین علی خان صاحب نے ادارہ کی سیر کرائی۔

اتوار، ۱۸۔ جولائی۔ ڈاکٹر خواجہ سید افضل امام صاحب لیکچرار ہیڈ مسٹیل کالج و انچارج فارسی مخطوطات پٹنہ یونیورسٹی نے ۹ بجے دن ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔ جناب محمد اکبر الدین صدیقی اور وقار خلیل نے ادارے کے ذخیرۂ علمی سے واقف کرایا۔

• ۔ مجلس اشاعت تاریخ و تمدن دکن ادارہ کا خصوصی اجلاس نواب عنایت جنگ کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں ایک تاریخی کتاب "مصادر سلطنت آصفیہ" کی اشاعت کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کمیٹی میں پروفیسر مہندر راج سکسینہ معتمد اعزازی ادارہ، نواب عباس حسین خان صاحب، مولوی سید محی الدین پاشاہ قادری

[illegible] شیوانی ایڈیٹر ہفتہ وار شیراز اور کنوینر کمیٹی میر سراج الدین علی خان صاحب نے شرکت کی۔

پیر ۱۹۔ جولائی۔ مس علیہ رحمانی متعلم ایم۔ اے جامعہ عثمانیہ نے ایم۔ اے کے مقالہ "ڈاکٹر زور۔ شخصیت اور فن" کے سلسلے میں ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔ مس کریم النساء بیگم متعلم ایم۔ اے بھی آپ کے ہمراہ تھیں۔

۲۴۔ جولائی۔ ہفتہ وار "مورچہ" گیا (بہار) میں سب رس کے ادارہ نمبر پر تبصرہ شائع ہوا۔

۲۷۔ جولائی۔ سہ ماہی صحیفہ لاہور بابتہ جولائی ۱۹۶۵ء میں سب رس سے ڈاکٹر سید یحییٰ احمد ہاشمی کے مضمون "مولوی نصیر الدین ہاشمی" کی تلخیص ڈائجسٹ ہوئی اسی رسالے میں پروفیسر سالم الدین صاحب رفعت کی ادارہ سے شائع شدہ کتاب "مقام غالب" پر تبصرہ بھی شائع ہوا۔

۲۸۔ جولائی۔ ادارہ کی سالانہ رپورٹ ادارہ سن ۱۹۶۴ء میں "مرتبہ محمد جمال الدین صاحب منتظم ادارہ شائع ہوئی جس پر ادارہ کا سلسلہ مطبوعات (۳۰۱) درج ہے۔

جمعرات ۲۹۔ جولائی۔ مجلس مشاورت اردو امتحانات ادارہ کا اجلاس انوار العلوم کالج میں ۲/۱ ۹ بجے پروفیسر سید علی اکبر صدر ادارہ ادبیات اردو کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں امتحانات کے نتیجوں کو قطعیت دی گئی۔ اس کمیٹی میں پروفیسر سید محمد، مولوی غلام رسول، جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحبان نے شرکت کی۔ معتمد امتحانات مولوی عارف الدین حسن نے بعد کمیٹی نتائج برائے اشاعت صحافت کے حوالے کئے۔

اگست ۱۹۶۵ء

چہارشنبہ ۱۱۔ اگست ۲ بجے حضرت فصاحت جنگ جلیل مرحوم کے صاحبزادے جناب عزیز احمد جلیلی انجکیوٹیو آفیسر پرگنی نے اپنی صاحبزادی جمیلہ جلیلی متعلم ایم۔ اے کے ہمراہ ایوان اردو کا معائنہ کیا اور حضرت جلیل کی تصانیف کتب خانہ کو تحفۃً بھجوانے کا وعدہ کیا۔ میر سراج الدین علی خان صاحب اور دفا خلیل نے ان حضرات کو ادارہ کی سیر کرائی۔

اتوار ۲۹۔ اگست۔ مولانا سید محمد ابل اکیلوی اور مولوی عبید علی الٰہی (بڑودہ گجرات)، نے جناب محمد اکبر الدین صدیقی کے ہمراہ ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

پیر ۳۰۔ اگست۔ ۶ بجے شام "ایوان اردو" میں پروفیسر سید علی اکبر صدر ادارہ کی زیر صدارت ادارہ ادبیات اردو اور ابو الکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ڈاکٹر زور مرحوم کی تیسری برسی کے موقع پر "بزم زور" کے ۲۲ تا ۲۴ اگست سہ روزہ تقاریب کے پروگرام کو قطعیت دی گئی جس میں افتتاحی اجلاس، ادبی اجلاس، طرحی مشاعرہ، نمائش تصانیف زور، بین کلیاتی تحریری مقابلہ وغیرہ شامل ہیں۔ مجلس مشاورت بزم زور میں راجہ جانکی پرشاد، پروفیسر مہندر راج سکسینہ، پروفیسر سید محمد، ڈاکٹر غلام عمر خان، نواب میر یٰسین علی خان، جناب بیر حسن، مولوی غلام رسول، جناب محمد اکبر الدین صدیقی، مولوی خواجہ محمد احمد، علامہ حیرت بدایونی، ڈپٹی میئر جناب رحمت علی، محترمہ فیض النساء، ایم۔ ایل۔ سی، میر سراج الدین علی خان صاحب، دفا خلیل، مسز ہر پرشاد ماتھر صاحب، جناب محمد منظور احمد، مراد علی صاحب طالع، الحاج تقی الدین فاروقی نے شرکت کی۔

ستمبر ۱۹۶۵ء

چہارشنبہ یکم ستمبر۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب صحافی اور فلم پروڈیوسر جناب خواجہ احمد عباس فلم آسمان محل کے کہانی نویس، جناب اندر راج آنند اور جناب میر عابد علی خان ایڈیٹر سیاست نے ایوان اردو کا معائنہ کیا اور فلم آسمان محل میں مشاعرہ کے منظر کو فلمانے کے لئے ایوان اردو کا انتخاب کیا۔ دفا خلیل نے ادارہ میں مہمانوں کو ایوان کی سیر کرائی۔

جمعرات ۲ ستمبر صبح ۸ بجے سے ایوان اردو میں فلم آسمان محل کی رسم افتتاح کے لئے جناب خواجہ احمد عباس، جناب علی سردار جعفری اور اس فلم سے متعلقہ اداکاروں کا یونٹ رات دیر گئے تک مصروف رہا۔ ۱۱ بجے ایوان اردو میں ریاستی چیف منسٹر جناب کے

برہانپوری نے فلم "آسمان محل" کی رسم مہورت انجام دی۔ اور جناب مخدوم محی الدین ریم۔ یل۔ سی۔ نے کیمرہ کا بٹن دبا کر کیمرہ کو حرکت میں لایا۔ اس فلم کے مشاعرہ کے مناظر تین روز تک ایوانِ اردو میں فلمائے گئے اور فلم کی تیاری کا منظر دیکھنے کے لئے ہزارہا افراد ایوانِ اردو میں موجود رہے۔ جس میں میئر بلدیہ محترمہ سروجنی دیوی چلرپیڈی کے علاوہ ادیب، شاعر اور سیاسی و سماجی رہنماؤں نے شرکت کی۔

● ۱۰ بجے شب، جناب سلیمان اریب ایڈیٹر "صبا" کے ہمراہ مشہور افسانہ نگار جناب رام لال ایوانِ اردو تشریف لائے اور فلم کی منظر بندی کے ساتھ ایوانِ اردو کی بھی سیر کی۔ وقار خلیل نے موصوف کو ادارے کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں۔

جمعہ، ۳ ستمبر، یومِ زورؔ کے طرحی مشاعرہ کے تعلق سے پریس نوٹ اخبارات میں شائع ہوا۔

۱۵ ستمبر، ہفتہ وار "ہماری زبان" علی گڈھ میں سہ روزہ یومِ زورؔ کے انعقاد کی اطلاع شائع ہوئی۔

جمعہ ۲۴ ستمبر، ملک میں ہنگامی حالات کے سبب حسبِ تصفیہ مجلسِ انتظامی ادارہ، ادارہ کے بانی معتمد ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم کی برسی کے تمام ادبی پروگرام منسوخ کرنے پڑے۔ بعد نمازِ عصر ادارہ کی طرف سے فاتحہ خوانی اور تلاوتِ کلام پاک کا انتظام کیا گیا اور مرحوم زورؔ صاحب کے والد حضرت زعمؔ کے مزار واقع خانقاہ عنایت اللّٰہی پر چادرِ گل چڑھائی گئی۔

۲۵ ستمبر، ہفتہ وار "ذوالقرنین" بدایوں میں "سب رس" کے ہاشمی نمبر پر تبصرہ شائع ہوا۔

۳۰ ستمبر، اکمال خوندمیری صاحب ایڈیٹر سہ روزہ "نغمۂ حیات" حیدرآباد نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔

اکتوبر ۱۹۶۵ء

جمعرات ۷۔ اکتوبر، ادارۂ ادبیاتِ اردو، انجمن ترقیٔ اردو، ہندی پرچار سبھا اور ساہتیہ اکیڈیمی کی طرف سے اردو ہال میں کشمیری صحیفہ نگاروں کے وفد کا خیر مقدم کیا گیا جس کی صدارت ریاستی انجمن ترقیٔ اردو کے صدر نواب میر احمد علی خان نے کی۔ وفد جناب شمیم احمد شمیم ایڈیٹر ہفتہ وار "آئینہ" سری نگر نے اردو کے شاعروں اور صحیفہ نگاروں سے خطاب کیا۔

ہفتہ، ۹۔ اکتوبر، ۵ بجے شام ایوانِ اردو میں صدرِ ادارہ پروفیسر سید علی اکبر کی صدارت میں مجلسِ انتظامی کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا جس میں مختلف تنظیمی، علمی اور اشاعتی امور کے بارے میں غور کیا گیا۔ راے جانکی پرشاد صاحب نائب صدر ادارہ، مولوی محامد علی عباسی، جناب محمد اکبر الدین صدیقی اراکین انتظامی اور پروفیسر مہندر راج سکسینہ اعزازی معتمد ادارہ نے شرکت کی۔

ہفتہ، ۱۶ اکتوبر۔ پروفیسر امین چند شرما صدر شعبۂ اردو و فارسی مہا کوشل مہا ودیالیہ جبل پور اور جناب سعید الظفر چغتائی ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی (لکچرار اردو و آثار کالج چپلون) نے ایوانِ اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔ آخر الذکر نے ادارہ کے مہمان خانے میں پانچ دن قیام کیا اور اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ "ملا وجہی کی تاج الحقائق" کے بارے میں مواد یکجا کیا۔

پیر، ۱۸۔ اکتوبر۔ جناب بشیر انور معتمد انجمن ترقی اردو منیپور و سکریٹری مرکزی حلقۂ فکر و نظر حیدرآباد نے ایوانِ اردو کی سیر کی۔

ہفتہ، ۲۳۔ اکتوبر۔ جلال الدین اکبری صاحب معتمد عوامی کتب خانہ چنچل گوڑہ نے ایوانِ اردو کے دارالمطالعہ، کتب خانہ اور ادارہ و میوزیم کا تفصیلی معائنہ کیا۔

۲۶۔ اکتوبر: بچوں کے ادیب جناب شاہ ظہیر نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔

۲۷۔ اکتوبر۔ محترمہ برنعما اندجیت سنگھ کرنال (پنجابی ادیبہ) نے محترمہ بانو طاہرہ سعید کے ہمراہ ادارہ ادبیاتِ اردو کے شعبوں کا تفصیل کے ساتھ معائنہ کیا۔

نومبر ۱۹۶۵ء

جمعرات ۴۔ نومبر، شعبۂ اردو امتحانات ادارہ کی طرف سے

...ماہنامہ میں [illegible] کے انعقاد کا پریس نوٹ اخبارات میں شائع ہوا۔

اتوار ۷۔ نومبر۔ ۱/۲ ۱۰ بجے صبح مجلس مشاورت سب رس کا جلسہ ایوان اردو میں منعقد ہوا جس میں طے کیا گیا کہ سب رس کا ایک وسٹاویزی قطب شاہی ادب نمبر شائع کیا جائے جو قطب شاہوں کے عہد کی رواداری اور یک جہتی کے مظہر مستند نظم و نثر پر مشتمل ہو۔ اس کمیٹی میں جناب میر حسن جناب زمن ہاؤ سکینہ ایڈوکیٹ، وفا خلیل اور جناب محمد اکبر الدین صدیقی معتمد مجلس مشاورت سب رس نے شرکت کی۔

پیر ۱۵۔ نومبر۔ جناب سید علی عباس موسوی معتمد استقبالیہ کمیٹی بزم انیس حیدرآباد نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

۱۸۔ نومبر۔ سب رس کے خصوصی شمارہ قطب شاہی ادب نمبر کی اشاعت اور قلمی معاونت کے لئے اخبارات میں ادارہ کا مجریہ پریس نوٹ شائع ہوا۔

• شعبۂ اردو امتحانات ادارہ کا پریس نوٹ بھی اخبارات میں شائع ہوا جس میں ۲۵۔ تا ۲۷۔ ڈسمبر کو مراکز بلدہ و اضلاع پر ایک ساتھ اردو امتحانات کے انعقاد کی تفصیلات درج تھیں۔

جمعہ ۱۹۔ نومبر۔ دس بجے صبح جناب ایس پالی نرنگا ریڈی معتمد رورل لائبریری اتھاریٹی کمیٹی حیدرآباد نے ایوان اردو کے کتب خانے، دار المطالعہ اور میوزیم کا تفصیلی معائنہ کیا۔ منتظم ادارہ محمد جمال الدین صاحب نے ایوان اردو کی سیر کرائی۔

چہارشنبہ ۲۴۔ نومبر۔ ادارہ کی طرف سے انوار العلوم ہائی اسکول میں اردو عالم کے طلبار کی سہولت کے لئے ایک ماہ کے مفت تعلیمی کورس کا آغاز پروفیسر سید محمد پرنسپل اردو کالج کے درس سے ہوا۔ جناب احمد جلیس، جناب طیب انصاری، جناب وحید الدین احمد اور احسان فاروقی نے ایک ماہ تک اعزازی طور پر درس دیا۔ جناب مولوی عارف الدین حسن معتمد اعزازی اردو امتحانات کی خصوصی کوششوں سے ہر سال دوبارہ ادارہ کی طرف سے مفت تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے جس سے طلبا و طالبات استفادہ کرتے ہیں۔

۲۹۔ نومبر۔ ماہنامہ کتابی دنیا کراچی بابتہ نومبر ۱۹۶۵ء میں ادارہ کی مطبوعات تماشائے اہل ہنر (رشید الحسن صاحب کے اسٹیج ڈراموں کا مجموعہ) اور شاہ برہان الدین جانم کے دکنی رسالہ تاج الحقائق (مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی صاحب) پر تبصرے شائع ہوئے۔

ڈسمبر ۱۹۶۵ء

یکم ڈسمبر۔ ادارہ کے اردو امتحانات کے کورس کی تکمیل کی خاطر شبینہ اسکول چلانے کے لئے حسب مشورہ مجلس مشاورت اردو امتحانات مرکز دار المطالعہ جامع مسجد سیتارام پیٹھ حیدرآباد کی منظوری دی گئی جہاں بستی کے قرب و نواح کے امیدواران امتحانات استفادہ کریں گے۔

اتوار ۵۔ ڈسمبر۔ ڈاکٹر سید نعیم الدین صدر شعبہ اردو و فارسی ناگپور یونیورسٹی ناگپور نے ایوان اردو کے تمام شعبوں کا معائنہ کیا۔

اتوار ۱۲۔ ڈسمبر۔ صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر نائب صدر جناب جانکی پرشاد نے انوار العلوم ہائی اسکول میں ادارہ کی طرف سے جاری کردہ اردو عالم کی مفت کلاسوں کا معائنہ فرمایا اور طلبار و اساتذہ کے جذبۂ تعلیم کی ستائش کی۔ جناب عارف الدین حسن معتمد اردو امتحانات نے معزز حضرات کا خیر مقدم کیا۔

۱۳۔ ڈسمبر۔ ماہنامہ شاہکار الہ آباد (۳۰۔۱۱۔۱۹۶۵ء) میں جناب ہاشمی کی سب رس میں مطبوعہ غزل ڈائجسٹ ہوئی۔

منگل ۱۴۔ ڈسمبر۔ ادارہ کے اردو امتحانات کے مرکز شمالی ہند جائس ضلع رائے بریلی کے لئے صدر نگران امتحانات کی حیثیت سے جواں سال ادیب طیب انصاری صاحب گرانڈ ٹرنک اکسپریس سے روانہ ہوئے۔

(باقی صفحہ ۵۷ پر ملاحظہ کیجئے)

اِمداد و اِعانت

۱۹۶۵ء میں حسبِ ذیل اصحاب نے ادارے کے کتب خانہ، دارالمطالعہ اور ایوانِ اردو میوزیم کو اپنے گراں قدر عطایا سے نوازا، جس کے لئے ادارہ ان اصحاب کا دلی شکرگزار ہے خصوصاً ادارہ کی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات و مطبوعات کو اقطاعِ ہند و پاک سے قدیم اور جدید کتابیں، رسالوں کی فائیلیں، قلمی نادرات، پوسٹل پیکٹوں، ریلوے پارسل کی صورت میں، پھر سب رس میں تبصرے کی غرض سے.... وصول ہوتی رہتی ہیں۔ ہم اپنے اُن علم دوست قارئین سے خواہش کریں گے کہ ایسے علمی و ادبی ذخیرے کو تلف ہونے سے بچائیں اور ایسی کتابیں، علمی و تہذیبی نادر اشیاء ادارے کو تحفۃً مرحمت فرماکر محفوظ کرائیں جن کی سالانہ فہرستِ معطی کے نام اور شکریہ کے ساتھ ادارہ کے ترجمان سب رس میں شائع کی جاکر تشہیر کی جاتی ہے اور سالانہ شائع ہونے والی ادارہ کی رپورٹ میں بھی اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ (ادارہ)

حضرت منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی (دہلی) نے اپنے والدِ بزرگوار حضرت دوارکا پرشاد افق کی صد سالہ تقریب کے موقع پر شائع شدہ جامع کتاب لمعاتِ افق کی ایک جلد ادارہ کے کتب خانہ کو تحفۃً عطا فرمائی۔

جناب ڈاکٹر ہاشم امیر علی خان سابق پرنسپل زرعی کالج (جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) نے اپنی مشہور تالیف "دی اسٹوڈنٹس قرآن" (انگریزی) اور ڈاکٹر ابوالفضل کی "غریب القرآن العرفان" کی کئی جلدیں برائے فروخت ادارہ کو تحفۃً عنایت کیں۔

ادارہ ادبیات حیدرآباد نے یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب کے دو عدد بکس اپنے انتہا میں اشاعت کے بعد

ایوانِ اردو کو تحفۃً بھجوائے۔

جناب چودھری بشیر احمد برانڈرتھ روڈ لاہور نے کتب خانہ ایوانِ اردو کو (۳۱) عدد علمی و ادبی کتب و رسائل کا پیکٹ روانہ کیا۔

ممتاز ترقی پسند شاعر جناب علی سردار جعفری نے قیامِ حیدرآباد کے دوران اپنا تازہ مجموعۂ کلام "ایک خواب اور" ادارہ کے کتب خانہ کو تحفۃً مرحمت فرمایا۔

محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ریڈر جامعہ عثمانیہ و صدر شعبہ اردو نظام کالج نے اپنی چار کتابیں ادارہ کے کتب خانہ کیلئے

تحفۃً روانہ فرمائیں۔

جناب مولوی سید ہادی حسن بلگرامی ناظم سنٹرل ریکارڈ آندھرا پردیش نے ادارہ کے کتب خانہ کو مختلف موضوعات پر مشتمل انگریزی۔ اردو۔ فارسی (۴۴) مجلد کتب و رسائل تحفۃً عنایت فرمائے۔

جناب پروفیسر سید محمد صاحب پرنسپل ارنڈو کالج گلبرگہ نے ادارے کے کتب خانے کو ۳۵ اہم مطبوعات و رسائل نذر کیے۔

ڈاکٹر ابوالنصر خالدی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی طرف سے حضرت عشقی اورنگ آبادی کا منظوم کتابچہ "پند بے سود" اور دیگر تین کتابیں کتب خانے کے لیے تحفۃً ملیں۔

* مولوی افضل شریف صاحب یو بی پی سکندرآباد نے اپنے موقر ماہنامہ "دیندار" کے ابتدائی تین سالانہ فائیل بطور ریکارڈ ادارے میں داخل فرمائے۔

محترمہ بیگم سید محمد نقی صاحب نے علی گڈھ کے رسالہ "خاتون" کے سات سالہ فائیل ۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۲ء ادارے کے کتب خانے کو تحفۃً عطا فرمائے۔

جناب یوسف علی خان ایم اے، ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ نے اپنی کتاب "نغمۂ نیم رنگ" کا ایک نسخہ کتب خانہ کو تحفہ دیا جس پر علامہ اقبال کے دستخط ہیں۔

محترم اسحاق ایوبی صاحب پریس انفارمیشن بیورو حکومت ہند (حیدرآباد) کی طرف سے ستر سے زائد سرکاری رپورٹیں اور کتابچے ادارہ کے کتب خانے کے لیے تحفۃً وصول ہوئے۔

پروفیسر حمید صدیقی صاحب نے کارنامہ پہلوی کا ایک نسخہ کتب خانے کو عطا فرمایا۔

کمیٹی دارالمطالعہ عام مسجد سیتا رام پیٹھ حیدرآباد کی طرف سے مشہور مجلہ نگار لکھنو کے سنہ ۱۹۶۲ء کا فائیل تحفۃً ملا۔

حکیم یوسف حسین خان صاحب پرنسپل نظامیہ طبی کالج حیدرآباد نے کتب خانے کو "صحت و حسن" کلکتہ کا سالگرہ نمبر عنایت فرمایا۔

محترمہ حمیرہ جلیلی متعلم ایم اے جامعہ عثمانیہ نے اپنے دادا حضرت فصاحت جنگ جلیل کے ۵ شعری مجموعے ادارے کو تحفۃً روانہ کیے۔

محترمہ شہر بانو صاحبہ نے ۴ مختلف کتابیں کتب خانہ کو عطا کیں۔

جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب نے اپنی تالیف فراقی بیجاپوری کے دو نسخے کتب خانے کو عنایت فرمائے۔

مصدر الطاف و عنایات نواب عنایت جنگ بہادر بالقابہم نے ادارے کے اردو میوزیم کے لیے مختلف تقاریب کے کئی سو دعوت نامے اور میوزیم کے لیے چار قسطوں میں نادر اشیا عطا فرمائے۔

استفادۂ کتب خانہ

اِدارے کے وقیع کتب خانہ (شعبہ مخطوطات و مطبوعات) اور دارالمطالعہ علم سے اردو کے شیدائی اور ریسرچ اسکالرس صاحبان استفادہ کی غرض سے دور و نزدیک کے مقامات سے آتے رہتے ہیں۔ ذیل میں چند ایک محققین کے نام رجسٹر کتب خانہ ادارہ کے حوالے سے درج کئے جاتے ہیں، جنہوں نے مختلف وقتوں یا پھر متواتر ادارہ کے کتب خانے کے مختلف شعبوں سے استفادہ فرمایا، مخطوطات کی ترتیب اور حوالوں کے سلسلے میں ان کی نقلیں لیں، یا نادر و نایاب مطبوعات سے ریسرچ کے سلسلے میں مواد یکجا کیا۔ [ادارہ]

۱۔ جناب مصطفیٰ کمال احمد صاحب متعلم ایم۔ اے جامعہ عثمانیہ

۲۔ محترمہ لیئق بیگم صاحبہ 〃 〃 علی گڑھ

۳۔ جناب صلاح الدین نیر صاحب ادارہ خاتونِ دکن حیدرآباد

۴۔ جناب زاہد علی خاں صاحب ابوالکلام آزاد اورینٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۵۔ جناب ذوالفقار خلیل (۲-۶۲۷، ۳-۲۳) سلطان شاہی حیدرآباد

۶۔ محترمہ رضیہ سرفراز صاحبہ (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

۷۔ جناب محمد منظور احمد صاحب سابق معتمد ادارہ و مجلس

۸۔ محترمہ مہرالنساء صاحبہ ایم۔ اے، ریسرچ جامعہ عثمانیہ

۹۔ مولوی غلام رسول صاحب پائیگاہ وقار الامراء/بوسٹن؟ حیدرآباد

۱۰۔ جناب ابوالفیض سحر صاحب مدیر مجلہ عثمانیہ حیدرآباد

۱۱۔ جناب داؤد اشرف صاحب متعلم ایم۔ اے عثمانیہ یونیورسٹی

۱۲۔ جناب جمیل احمد صاحب حیدرآباد

۱۳۔ جناب حفظ الرحمٰن صاحب 〃

۱۴۔ جناب شرف الدین احمد صاحب 〃

۱۵۔ محترمہ فیض النساء صاحبہ ایم۔ اے جامعہ عثمانیہ 〃

۱۶۔ 〃 فرزانہ بیگم صاحبہ 〃

۱۷۔ جناب شرف الدین صاحب متعلم ایم۔ اے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

۱۸۔ جناب وحید الدین صاحب 〃

۱۹۔ محترمہ اردے لکشمی ماتھر بی۔ اے عثمانیہ 〃

۲۰۔ جناب حمید آرموری صاحب ایم۔ اے عثمانیہ 〃

۲۱۔ ڈاکٹر راجیندر مہتا صاحب 〃

۲۲۔ جناب خواجہ معین الدین صاحب 〃

۲۳۔ جناب سید رزاق علی صاحب 〃

۲۴۔ جناب بشیر انور صاحب معتمد حلقۂ فکر و نظر 〃

۲۵۔ جناب ڈاکٹر جعفر حسین صاحب دیا کشی نیجا سوا ل 〃

۲۶۔ جناب کوکب قدر صاحب ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی

۲۷۔ جناب سید مظہر الدین صاحب حیدرآباد

۲۸۔ جناب میر احمد علی صاحب 〃

۲۹۔ جناب منتجب الدین صاحب 〃

۳۰۔ جناب سید بیدار علی صاحب 〃

۳۱۔ جناب شیخ ابراہیم صاحب گلبرگہ

۳۲۔ جناب ظہیر الحق صاحب ایم۔ اے عثمانیہ حیدرآباد

۳۳۔ جناب محی الدین احمد صاحب فانی میدان علی پلی 〃

۳۴۔ جناب مصلح الدین صاحب پیرانی — حیدرآباد
۳۵۔ جناب سیادت علی صاحب — "
۳۶۔ جناب ممتاز الحق صاحب — "
۳۷۔ جناب بالراج صاحب — "
۳۸۔ جناب ذکی الدین صاحب — "
۳۹۔ جناب محمد جمال شریف صاحب ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
۴۰۔ جناب ضیاء الدین احمد صاحب شکیب اسٹیٹ آرکائیوز حیدرآباد
۴۱۔ محترمہ حبیب النساء صاحبہ ایم۔اے — حیدرآباد
۴۲۔ محترمہ صفیہ اریب صاحبہ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۴۳۔ جناب یوسف الدین صاحب ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۴۴۔ محترمہ محمودہ خانم صاحبہ ریسرچ اسکالر میسور یونیورسٹی
۴۵۔ جناب افضل حسین خان صاحب — حیدرآباد
۴۶۔ جناب میر محمود حسین صاحب ڈپٹی سکریٹری فینانس — "
۴۷۔ پروفیسر عبدالغفار شکیل مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
۴۸۔ جناب سری نواس لاہوٹی آفس سکریٹری انجمن ترقی اردو — "
۴۹۔ پروفیسر ہاشم علی ریسرچ اسکالر میسور یونیورسٹی — میسور
۵۰۔ محترمہ اشرف رفیع صاحبہ متعلم ایم۔اے جامعہ عثمانیہ
۵۱۔ محترمہ زبیدہ رضا صاحبہ — حیدرآباد
۵۲۔ جناب محمد عمر خان صاحب حسامی — "
۵۳۔ پروفیسر محمد نشار الرحمٰن خان صاحب خشا ریسرچ اسکالر ناگپور
۵۴۔ جناب سلیمان اطہر جاوید ایم اے ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۵۵۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی دلی یونیورسٹی — دہلی
۵۶۔ جناب رفیق جعفر صاحب — حیدرآباد
۵۷۔ پروفیسر حسینی شاہد پرنسپل اردو آرٹس کالج — "
۵۸۔ محترمہ ڈاکٹر سیدہ جعفر لکچرر جامعہ عثمانیہ — "
۵۹۔ جناب میر حسن صاحب سابق اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو — "
۶۰۔ محترمہ عطیہ رحمانی متعلم ایم۔اے جامعہ عثمانیہ — حیدرآباد
۶۱۔ محترمہ کریم النساء بیگم صاحبہ — " — "
۶۲۔ جناب محمد حامد علی صاحب — "

۶۳۔ جناب نواب میر یٰسین علی خان صاحب باغ تاڑبن گنڈ روڈ حیدرآباد
۶۴۔ جناب وسیم اختر صاحب سب ایڈیٹر روزنامہ ملاپ — حیدرآباد
۶۵۔ جناب اختر زبیری صاحب — "
۶۶۔ جناب ساغر ملک صاحب ایم اے جامعہ عثمانیہ — "
۶۷۔ جناب طیب انصاری صاحب متعلم ایم اے جامعہ عثمانیہ — "
۶۸۔ جناب بدیع حسینی صاحب لکچرر اردو کالج — "
۶۹۔ جناب جاوید لطیفی صاحب عزیزیہ ہوٹل نامپلی — "
۷۰۔ جناب میر محبوب علی صاحب — "
۷۱۔ جناب رزاق فاروقی صاحب لکچرر عثمانیہ کالج — کرنول
۷۲۔ جناب محمد اکبر الدین صاحب صدیقی لکچرر جامعہ عثمانیہ — حیدرآباد
۷۳۔ جناب سوار رام سنگھ صاحب — "
۷۴۔ جناب قمر ساحری صاحب متعلم ایم اے جامعہ عثمانیہ — "
۷۵۔ جناب قدیر امتیاز صاحب — "
۷۶۔ جناب سید موسیٰ کاظم صاحب متعلم ایم اے جامعہ عثمانیہ — "
۷۷۔ جناب مغنی تبسم صاحب ایم اے ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ — "
۷۸۔ محترمہ سلمیٰ بلگرامی صاحبہ جامعہ عثمانیہ — "
۷۹۔ جناب یونس سلیم صاحب ایڈوکیٹ اردوگی — "
۸۰۔ پروفیسر سید امتیاز حسین خان صاحب پرنسپل سکندرآباد کالج — "
۸۱۔ پروفیسر نور السعید اختر ریسرچ اسکالر پونا یونیورسٹی
۸۲۔ جناب مجید الانصاری صاحب ریسرچ اسکالر — "
۸۳۔ جناب خواجہ محمد احمد صاحب سابق ناظم آثار قدیمہ — "
۸۴۔ جناب شاہد عباسی صاحب حیدرآباد — "
۸۵۔ جناب حامد عباسی و کوثر عباسی صاحبان — "
۸۶۔ جناب سید محمود صاحب ید اللٰہی — "
۸۷۔ جناب عظیم صدیقی صاحب بی کام — "
۸۸۔ جناب عبدالحق صاحب ایڈیٹر مشرقی اطلاعات — "
۸۹۔ جناب تاج قریشی صاحب منظورہ — "
۹۰۔ جناب وحید الدین احمد صاحب ایمان فاروقی ایم اے عثمانیہ — "
۹۱۔ جناب ارشاد علی خان صاحب منتظم اسمبلی — "

۹۲۔جناب محمد غوث صاحب سوز — محبوب نگر
۹۳۔جناب نصیر الدین خان صاحب — حیدرآباد
۹۴۔جناب ادیب حیدرآبادی مولف تصحیح الاغلاط — "
۹۵۔جناب عارف الدین حسن صاحب معتمد اردو امتحانات ادارہ — حیدرآباد
۹۶۔محترمہ لیاقت بیگم صاحبہ منتظمہ ابوالکلام انسٹی ٹیوٹ — "
۹۷۔جناب اصغر حسین نقوی صاحب — "
۹۸۔محترمہ نجمہ صادقہ صاحبہ جامعہ عثمانیہ — "
۹۹۔محترمہ خالدہ صاحبہ — — "
۱۰۰۔جناب ذکی الدین صاحب — "
۱۰۱۔جناب دھرمیندر پرشاد صاحب لکچرار ایونگ کالج — "
۱۰۲۔محترمہ زہرہ منظور حسین صاحبہ ریسرچ اسکالر کشمیر یونیورسٹی
۱۰۳۔محترمہ رشیدہ موسوی صاحبہ لکچرار ریڈنگٹ رلما ریڈی ویمنس کالج "
۱۰۴۔جناب سید یعقوب صاحب مولف محکمہ تعلیمات — حیدرآباد
۱۰۵۔جناب اظہر انصاری صاحب — "
۱۰۶۔جناب شمیم احمد قریشی ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی — دہلی
۱۰۷۔جناب میر یوسف علی خان صاحب ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی
۱۰۸۔پروفیسر حکیم عبدالوہاب طاہوری نظامیہ طبیہ کالج — حیدرآباد
۱۰۹۔محترمہ حبیب ضیا صاحبہ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ "
۱۱۰۔محترمہ زینت ساجدہ ریڈر جامعہ عثمانیہ — "
۱۱۱۔جناب نورالحسن صاحب ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی دہلی
۱۱۲۔جناب قاضی بشیر الدین صاحب منیجر اسٹیٹ بنک پتھر گھٹی "
۱۱۳۔محترمہ زبیدہ خاتون متعلم یم اے جامعہ عثمانیہ — حیدرآباد
۱۱۴۔مولوی سید محمد صاحب اہل اکبلری — "
۱۱۵۔پروفیسر سید مسعود حسین خان صاحب صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ
۱۱۶۔پروفیسر ایک چند شرما — جبل پور
۱۱۷۔پروفیسر محمد یوسف کوکن عمری صدر شعبہ اردو مدراس یونیورسٹی
۱۱۸۔ڈاکٹر غلام عمر خان صاحب لکچرار جامعہ عثمانیہ — حیدرآباد
۱۱۹۔پروفیسر سید نعیم الدین صاحب ناگپور یونیورسٹی — ناگپور
۱۲۰۔ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی
۱۲۱۔جناب حمید خان صاحب سلیم آزاد انشی ٹیوٹ — حیدرآباد

اعداد و شمار

استفادۂ دارالمطالعہ "ایوانِ اردو"

(جنوری تا ڈسمبر ۱۹۶۵)

جنوری	(۳۴۴) افراد	فروری	(۳۵۸) افراد
مارچ	(۲۹۸) "	اپریل	(۲۹۵) "
مئی	(۳۳۱) "	جون	(۳۰۰) "
جولائی	(۴۵۱) "	اگست	(۲۷۵) "
سپٹمبر	(۳۵۳) "	اکتوبر	(۳۳۱) "
نومبر	(۳۸۴) "	ڈسمبر	(۴۷۷) "

شعبۂ تاریخ و تمدنِ دکن

مجلس اشاعت تاریخ و تمدن شعبہ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے زیرِ عمل میں تاریخ دکن سے متعلق مفید کتابوں کی اشاعت داخل ہے۔ چنانچہ اب تک کئی اہم کتابیں اردو، فارسی، تلگو اور انگریزی میں شایع ہو چکی ہے۔

مجلس اشاعت نے طے کیا ہے کہ "وزرائے اعظم سلطنت آصفیہ" کے نام سے ایک مبسوط کتاب شایع کی جائے جو عہد آصفی کے تمام وزرائے اعظم کے حالاتِ زندگی اور اُن کے کارناموں پر مشتمل ہو اور جس کی ترتیب مستند تاریخی مواد کی روشنی میں عمل میں آئے۔ اس کتاب کی تصنیف کا کام عہدِ آصفیہ کے ریکارڈ کے ماہر جناب سید محی الدین صاحب ایم۔ اے سابق مددگار ناظم اسٹیٹ آرکیوز حکومت آندھرا پردیش کے تفویض کیا گیا ہے اور توقع ہے کہ صاحب موصوف اس کی تکمیل میں عجلت فرمائیں گے۔ اس کتاب کی اشاعت سے تاریخ دکن میں ایک اہم باب کا اضافہ ہوگا۔

—— میر سراج الدین سلیمان، معتمد مجلس اشاعت تاریخ و تمدن دکن

ادارے کا ترجمان ماہ نامہ "سب رس"

"ادارۂ ادبیاتِ اردو" کا ترجمان ماہ نامہ "سب رس" جنوری ۱۹۳۸ء سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے جنوری ۱۹۶۶ء سے یہ اپنی عمر کے انتیسویں ۲۹ سال میں داخل ہو چکا ہے۔ ادارے کے بانی اور معتمد "سب رس" کے موسس اور نگران ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم کی یادگار رہنے کا اعزاز بھی "سب رس" کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر زورؔ کے بعد یہ رسالہ معتمد اعزازی پروفیسر مہندر راج سکسینہ اور محترم صدر پروفیسر سید علی اکبر صاحب اور ادارے کی مجلس انتظامی کے منظورہ فیصلوں کے مطابق ممتاز مورخ پروفیسر محمد عبدالمجید صدیقی صاحب نائب صدر ادارہ کی نگرانی اور جناب محمد اکبرالدین صدیقی صاحب لکچرار ایوننگ کالج جامعہ عثمانیہ کی معتمدی اور مجلس مشاورت کے محترم اراکین ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جناب مبر حسن، جناب رمن راج سکسینہ اور وقار خلیل کے تعاونِ عمل سے "سب رس" ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

۱۹۶۵ء میں سب رس نے اپنے پڑھنے والوں کو پورے بارہ شمارے دیئے جن کے صفحات کی مجموعی تعداد (۷۴۶) ہے۔ اس سال ادارے کے رفیق، سب رس کے مشیر اور اردو کے مشہور ادیب جناب نصیرالدین ہاشمی مرحوم کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں سب رس نے ایک گرانقدر اور دستاویزی "ہاشمی نمبر" بھی شائع کیا۔ جس کی افادیت کے پیشِ نظر اسٹاک ختم ہو جانے کے سبب "یادگار ہاشمی" کے نام سے کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر "سب رس" نے "محمد قلی نمبر" بھی شائع کیا جس میں عہد قطب شاہیہ اور کلیات سے متعلق اہم اور خصوصی مواد نظم و نثر شامل ہیں جب سالہائے گذشتہ جولائی ۱۹۶۵ء میں "سب رس" کا "ادارہ نمبر" بھی شائع ہوا جس میں ادارہ کی سالانہ علمی، ادبی اور ثقافتی تفصیلات درج ہوئیں۔ ایک سال میں "سب رس" نے مختلف تحقیقی، تنقیدی، علمی اور شعری تحریریں شائع کیں۔ جن میں (۷۹) مضامین (۳۲)، نظمیں (۸۹)، غزلیں (۵)، افسانے اور (۹۴) نئی کتابوں اور رسالوں پر تبصرے وغیرہ شامل ہیں۔

مضامین کی ایک جامع فہرست ان صفحات پر ریسرچ اسکالروں کے استفادہ کیلئے بطرحت پیش کی جا رہی ہے۔

فہرست مضامین مطبوعہ "سب رس" حیدرآباد

جلد ۲۸ - شمارہ ۱ تا ۱۲ - جنوری تا دسمبر ۱۹۶۵ء

۴۱	محمد قلی کا کلام اور اس کے محرکات	سید حسن	اپریل محمد قلی نمبر	۶۰	عبدالماجد دریا بادی سے	اقبال کرشن	اگست
۴۲	محمد قلی کی غزل	ضیاءالدین احمد شکیب	"		ایک انٹرویو		
۴۳	محمد قلی تہذیب کا معمار	احمد جلیس	"	۶۱	سب رس مصنفہ وجہی میں	آزاد نصیرالدین شاتوف	ستمبر
۴۴	گولکنڈہ	سید ضیاء الحق	"		عربی اور فارسی الفاظ		
۴۵	یوم محمد قلی کا آنکھوں دیکھا حال	وقار خلیل	"	۶۲	اردو میں تلگو کے الفاظ	پروفیسر کرشنا مورتی	"
۴۶	اردو گھر سے باہر	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	مئی	۶۳	میٹھے بچن سناؤں (فراقی)	محمد اکبرالدین صدیقی	"
۴۷	مدراس میں اردو	پروفیسر عبدالمجید صدیقی	"	۶۴	ڈاکٹر زور مرحوم	ڈاکٹر ایس. آر. کلکرنی	"
۴۸	ذاتی ڈائری کا ایک ورق	سید ابو علی	"	۶۵	" "	ڈاکٹر غلام عمر خان	"
۴۹	دیوانِ جہاں پر ایک نظر	پروفیسر شیخ فرید	"	۶۶	خالق باری کے انداز تصنیفات	سعید انصاری	اکتوبر
۵۰	جامعہ عثمانیہ اور اس کی تاریخی	میر سراج الدین علی خاں	"	۶۷	میٹھے بچن سناؤں	محمد اکبرالدین صدیقی	"
	پس منظر			۶۸	حیدرآباد میں افسانے کی	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	"
۵۱	ذوقی دہلوی	پروفیسر سید محمد فضل اللہ	جون		ترویج و ترقی		
۵۲	دیوانِ جہاں پر	پروفیسر شیخ فرید	"	۶۹	گلنر نامہ اسماعیل	ڈاکٹر ابو نصر خالدی	"
	ایک نظر			۷۰	آسامی بنگالی رسم الخط	ڈاکٹر مہیشوری نیوگ	نومبر
۵۳	مثنوی داستانِ کلفت	پروفیسر رزاق فاروقی	"	۷۱	نگار خانہ نیر	پروفیسر ابوالظفر عبدالواحد	"
۵۴	سودا کا طنز و مزاح	حکیم محمود خاں محوی	"	۷۲	دکن میں آندھرا اور تلگو	ریاست علی صدیقی تاج	"
۵۵	ادارہ اور ایوانِ اردو	محمد اکبرالدین صدیقی	جولائی	۷۳	امجد کی رباعیات	کریم فاطمہ	"
۵۶	میٹھے بچن سناؤں	" "	اگست	۷۴	میٹھے بچن سناؤں	محمد اکبرالدین صدیقی	"
	(دسہیلا)			۷۵	ٹپا پرتی نارائن چارلو	جمال کرٹپوی	دسمبر
۵۷	رشید احمد صدیقی	نریش رام جوہر	"	۷۶	سرسید اور اکبر الہ آبادی	حکیم یوسف حسین خان	"
۵۸	خطۂ دکن اور	ڈاکٹر مسیح الزماں	"	۷۷	ہندوستانی مصوری کا	پرسی براؤن / مہاز رفعت	"
	کلام وجد				مسالہ اور تکنیک		
۵۹	مومن اپنی شاعری کے	پروفیسر امین چند شرما	"	۷۸	میٹھے بچن سناؤں	محمد اکبرالدین صدیقی	"
	آئینے میں			۷۹	اردو زبان کی داستان	مولوی غلام رسول	"

نظمیں "سب رس" جنوری تا دسمبر ۱۹۶۵ء میں جملہ (۳۳) نظمیں شائع ہوئیں۔ ذیل میں نظموں کے عنوانات اور شعراء صاحبان کے نام مندرج ہیں۔

رحلتِ ہاشمی (راگھویندر راؤ جذب عالمپوری)
پیرِ مغانِ اردو (ڈاکٹر مسعود حسین خان)، یادِ ہاشمی (فضل الرحمٰن صاحب نظر گیا (وقار خلیل)، یادِ رفتگاں (تحسین سروری) آہ ہاشمی (نازش جیدر)، آہ ہاشمی (امتہ الکریم خورشید نذیر) نذرِ ہاشمی (فیض الحسن خیال)، قطعۂ تاریخی (مجید فاروقی) نذرِ ہاشمی (صلاح الدین نیّر)، قطعۂ تاریخ وفات (محمد اکبر الدین صدیقی) رباعیات (کاشف الہاشمی)، دوراہا (مرزا سرفراز علی) دستک (زیدی جعفر رضا)، حسنِ شگفتہ (زیدی جعفر رضا) صبح وطن (دلشیشور پرشاد منوّر لکھنوی)، شہر وفا (پرنس نقی علی خان ثاقب)، محمد قلی کا پیام عوام کے نام (بانو طاہرہ سعید) محمد قلی شاہ ذی جاہ (فارسی)، (آقائی فرخ شیرازی) سلطان محمد قلی اور حیدرآباد (تاج قریشی)، مری تعبیرِ معمورے (فضا کوثری)، آنگن (عتیق تابش)، ایک نظم (جبار جمیل) ایوانِ اردو (یس یم اقبال)، رقاصہ (سلیمان خطیب) قصیدہ بحضور ڈاکٹر ذاکر حسین (کاوش بدری)، سرزنش (دلشیشور پرشاد منوّر لکھنوی)، بیادِ زور (محمد منشا الرحمٰن خان منشا)، ماضی اور آج (آنند پیا بانی)، گلاب روتے ہیں (جبار جمیل)، روشنی (ساحل رشید)، احساس (احمد رئیس)

غزلیں اس سال جملہ (۸۹) شعراء کی غزلیں شائع ہوئیں۔ ذیل میں ہم شعراء صاحبان کے نام درج کر رہے ہیں بعض شعرا کی اس سال میں ایک سے زائد مرتبہ مختلف اشاعتوں میں غزلیں چھپی ہیں:۔

اقبال متین ۔ عارف حجازی ۔ نجیب اسلم۔ منوّر لکھنوی۔ تلوک چند محروم۔ آشم کرنولی۔ اختر نظمی۔ کیف انصاری۔ حامد بھساوی۔ پروفیسر حبیب علی خان حبیب۔ صابر شاہ آبادی۔ سید حرمت الاکرام۔ منظم بشکل عظمت عبدالقیوم۔ نصیر پرواز۔ یس یم اقبال۔ ساحل ناگپوری۔ صلاح الدین نیّر۔ شمس الدین تاباں۔ محسن نقوی۔ احسان علی ہرشی۔ فرحت کیفی۔ نقی علی خان ثاقب۔ باقر منظور۔ نیاز بیجاپوری۔ بلال مدراسی۔ محمد منشا الرحمٰن خان منشا۔ حمیدہ رضوی۔ دلیپ بادل۔ حباب ہاشمی۔ جمیل کلیمی۔ انجم صدیقی۔ مرزا شکور بیگ۔ حسن بخت۔ فضا کوثری۔ نظر بدنی۔ طرب صدیقی۔ رضا وصفی۔ واحد پریمی۔ اختر فدائی۔ افغان ظہوری۔ حسن جعفری۔ محمودہ علی شبنم۔ علی احمد جلیلی۔ احمد خان درویش۔ اختر حمیدی۔ اقبال نصیب۔ حیرت بدایونی۔ تاج قریشی۔ کاوش بدری۔ میر لسین علی خان۔ جگن ناتھ آزاد۔ امین مدراسی۔ فضا کوثری۔ قیوم بیگ رومانی۔ محی الدین غنی۔ بشارت جے پوری۔ سلطان احمد صدیقی۔ اقبال نصیب۔ شباب صدیقی۔ مظفر رئیس۔ سہیل اختر۔ علیم اللہ حالی اور راہی قریشی۔

افسانے جملہ ۳ کہانیاں شائع ہوئیں۔ جن میں ایک عربی ترجمہ بھی ہے۔

۱۔ ابہام (سہیل عرفاں)، ۲۔ میں شاعر ہوں (یونس ادیب)،
۳۔ نیلے پردے (محمود دیاب)

طنزیہ مرزا شکور بیگ کا ایک طنزیہ "محبوب کے مظالم" شائع ہوا۔

انشائیہ اسحاق ایوبی کا ایک انشائیہ "انسان اور آئینہ" شائع ہوا۔

تبصرے "سب رس" نے ہمیشہ سیر حاصل اور معیاری تبصروں کو پیش کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ ۱۹۶۵ء میں جملہ (۹۴) تبصرے شائع ہوئے جن میں (۸۶) مختلف موضوعات پر مشتمل کتابیں اور (۸) رسائل یا رسائل کا خاص نمبر شامل ہیں۔ تبصرہ کرنے والوں میں پروفیسر عبدالمجید صدیقی۔ ڈاکٹر حکیم چند نیّر۔ پروفیسر سید علی المعین قادری۔ حکیم یوسف حسین خان۔ جناب میر حسن۔ یم۔ (عثمانیہ) مولوی غلام رسول۔ الحاج مرزا خورشید بیگ۔ جناب محمد اکبر الدین صدیقی

جناب ضیاءالدین احمد شکیب، یم۔اے، بی ٹی، جناب محمد جلیل خان، محمد افضل الدین جناب سید بشیر الدین اور محترمہ راشدہ تحسین شامل ہیں۔

مندرجہ ذیل کتب و رسائل پر تبصرے شائع ہوئے جن کے مصنف / مرتب اور مدیر کے نام محاذی درج کیے گئے ہیں۔

حیات و تصنیفات مرزا ابوطالب کلیم ہمدانی (ڈاکٹر شریف النساء انصاری) دکن میں اردو مختصر افسانہ۔ آندھرا میں اردو۔ اور دکھنی کے چند تحقیقی مضامین (نصیر الدین ہاشمی) محسن اعظم اور محسنین (کرنل وحید الدین)، علوم عمرانی کی قرآنی بنیادیں (رشید معین الدین قادری)، نیرنگ معانی (تلوک چند محروم) دلی میں اجنبی (جگن ناتھ آزاد)، دیوان فرزل دیلوری (پروفیسر فضل اللہ) ادارہ تعلیم و ترقی کے ۱۸ کتابچے (جامعہ ملیہ دہلی) نیا کنارے (علی عباس حسینی)، قومی کتابیات شعبہ اردو ۶۲ء (جمیل احمد) مسلمانوں کے فنون (پروفیسر شیخ عبداللہ)، اساس کتب مقدس (غلام احمد ناطق)، تبلیغی خطوط (سلطان نظامی)، فارقلیط (عبدالعزیز خالد)، روح اسلام اقبال کی نظر میں (ڈاکٹر غلام عمر خان)، لمعات افق (بشیشور پرشاد منور لکھنوی) دیکھا کو میرے خوابوں کا شہر (عارف حجازی)، کچھ یادیں کچھ افسانے (عارف حجازی حیدرآبادی)، الٹ پھیر (شوکت تھانوی) شرح دیوان علی (کاوش بدری)، یادگار جگر (محمد اسلام)، شعرائے جشن جمہوریت (عرش ملسیانی)، غالب سے معذرت کے ساتھ (احمد جمال پاشا)، تصحیح الاغلاط (احمد علی ادیب)، من سمجھاون (ڈاکٹر سیدہ جعفر)، رہنمائے کتب داری (مولوی غلام رسول)، اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو (ڈاکٹر گوپی چند نارنگ)، شعلۂ نوا (تلوک چند محروم)، سپنوں کا قیدی (کرشن چندر) تنقیدی نقوش (ڈاکٹر عبدالقیوم)، افکار کراچی فیض نمبر (صہبا لکھنوی)، ذکر نوشاہی (شریف احمد شرافت)، توحید (سلطان نظامی)، وحی رسول اللہ (سلطان نظامی)، حسین و یزید (عبدالرزاق ملیح آبادی)، محمد بن حنفیہ محمد صادق)، یگانہ چنگیزی (نورالحسن)، اقبال کا تصور عشق (ڈاکٹر غلام عمر خان)، برف نہیں انگارے (اندرجیت تلسی) سلطان حلیم لکھنؤ (نسیم انہونوی)، ملفوظات حضرت غوث اعظم (محمد سلطان نظامی)، جامعہ کی کہانی (محمد عبدالغفار مدھولی)، حرف آتشیں (قمر ساحری)، نقش جاوداں (پرنسپل نقی علی خان ثاقب) علوم عمرانی کی قرآنی بنیادیں (معین الدین قادری)، ابن ماجہ اور علم حدیث (عبدالرشید نعمانی)، مجالۂ نافعہ (شاہ عبدالعزیز) کوبلہ تیبتی، ہمالیں، سستی کتابیں (جامعہ ملیہ دہلی)، میرے گذشتہ روز و شب (جگن ناتھ آزاد)، ماتم نہرو (جگن ناتھ آزاد)، صد پارۂ جذب (ایکوبندر راؤ جذب عالمپوری)، فرخندہ بنیاد حیدرآباد (رائے ست گرو پرشاد سکسینہ)، تاریخ مصر و عرب قومیت دارے کالیشور راؤ / پی نرسمہا راؤ)، یادگار مومن (محمد منظور احمد یم۔اے)، ماہنامہ تعلیم و ترقی دہلی، ماہنامہ ادبی دنیا لاہور، ماہنامہ پیام تعلیم دہلی، صبح نو (علی عباس حسینی نمبر) پٹنہ ساقی (نذر اسلام نمبر)، کراچی۔ مومن حیات و شاعری (احسان دانش و عبدالرحمٰن اصلاحی)، شاہکار (فراق نمبر) الہ آباد، دبیلو تو (مظفر احمد لاری)، موج گل (ریورنڈ ریحانی)، گل تازہ (حامد حسین نیر) موج صبا (فیض الحسن خیال)۔

سب رس کے تبادلے میں آنے والے رسائل و جرائد کی تفصیلات

مندرجہ ذیل رسائل و جرائد "ایوانِ اردو" کے دارالمطالعہ عام میں قارئین کے مطالعہ کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک رسائل و جرائد کو چھوڑ کر باقی "سب رس" کے تبادلے میں آتے ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد ۱۷۱ ہے۔ اور بقول رشید احمد صدیقی: "میں نے ہندوستان کے کسی دارالمطالعہ میں، میں نے اس قدر تعداد میں معیاری رسائل و جرائد یکجا نہیں دیکھے۔ اس طرح "ایوانِ اردو" کا دارالمطالعہ اردو دنیا کا پہلا معیاری اردو کا مطالعہ خانہ ہے"۔

ہم ان تمام ہند و پاک اور بیرونِ ہند کے مدیرانِ جرائد کے ممنون ہیں جو پابندی کے ساتھ "سب رس" کے تبادلے میں اپنے رسائل و جرائد ارسال فرماتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ تعاون مستقلاً برقرار رہے گا۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ختم سال پر ایسے تمام رسائل و جرائد کی اچھی اور پائدار جلدیں بنوائی جاتی ہیں اور انھیں ادارے کے کتب خانے میں درج رجسٹر کر کے استفادہ کے لئے محفوظ کر دیا جاتا ہے اور ہر دوسرے یا تیسرے سال ادارے کے کتب خانے کی کتابوں اور رسالوں کی ایک باضابطہ ضخیم فن وار فہرست اشاریہ کے ساتھ شائع کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں اب تک "فہرست کتب خانہ ادارہ" کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور اب چوتھی جلد زیرِ ترتیب ہے۔ ادارے کے کتب خانے میں بے شمار اہم اور نادر قلمی کتب اور مطبوعہ کتابوں کے علاوہ کئی اہم رسائل و جرائد کی فائلیں بھی محفوظ ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے اور اب تک کے نادر علمی و ادبی ذخیرہ کے حامل اس کتب خانے سے آئے دن ادب دوست حضرات اور ریسرچ اسکالرس صاحبان ہر روز ۱۰ تا ۵ ساعت استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ جمعہ کو ایوانِ اردو کے دفاتر بند رہتے ہیں۔

اسی افادی پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اپنے قارئین اور اردو دوستوں کے ساتھ ساتھ مدیرانِ رسائل و جرائد سے خواہش کریں گے کہ وہ اس قسم کے ریکارڈ کی فراہمی اور یکجائی میں ہم سے بھرپور تعاون فرمائیں اور جب کبھی اپنا ایسا ادبی ذخیرہ (قدیم و جدید کتب و رسائل) چھاپنا یا نکالنا چاہیں تو براہ کرم تحفتہً مرحمت فرمائیں جو معطی کے شکریے کے ساتھ کتب خانے میں داخل کر لئے جائیں گے اور فہرست کتب خانہ میں معطی کے اسم گرامی کے ساتھ درج بھی کئے جائیں گے۔

امید ہے کہ معاصرین اور دیگر ادب دوست احباب اور مختلف علمی و ادبی تنظیموں کے سربراہ ہم سے تعاون عمل فرما کر ہمیں شکریہ کا موقع دیں گے۔

(ادارہ)

نمبر	نام رسالہ	مکمل پتہ	نام مدیر	صفحات	زر سالانہ
		(سالانہ)			
۱	اردو کالج میگزین	اردو کالج۔ اردو ہال۔ حمایت نگر حیدرآباد دکن	ارشاد علی خان	۲۰۰	۳=۰۰
۲	اردوئے معلیٰ	شعبۂ اردو۔ دہلی یونی ورسٹی دہلی	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	۲۰۰	۵=۰۰
۳	انوار	انوار العلوم کالج میگزین۔ ملے پلی، حیدرآباد	اختر حسن	۸۰	۰ ۰
۴	شب تاب	شعبۂ اردو ایوننگ کالج۔ عثمانیہ یونی ورسٹی "	سید عبدالعزیز صدیقی	۱۳۶	۰
۵	عکس	شعبۂ اردو، یوراجا کالج میسور	م، ن، سعید	۷۶	۲=۰۰
۶	فانوس	بزم ادب۔ سٹی کالج چاٹگام (مشرقی پاکستان)	محمد علی	۱۱۲	۰
۷	کوثر	سوشیل کالج۔ پتھر گٹی حیدرآباد	عظیم عسکری	۷۲	۰
۸	قدیم اردو	شعبۂ اردو۔ عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد ۷	پروفیسر مسعود حسین خان	۵۳۶	۱۳=۰۰
۹	مجلۂ عثمانیہ	شعبۂ اردو۔ عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد (۷)	ڈاکٹر غلام عمر خان ابوالفیض سحر	۲۵۶	۵=۰۰
۱۰	نظام ادب	شعبۂ اردو۔ نظام کالج حیدرآباد دکن (آ۔پ)	ڈاکٹر سیدہ جعفر	۸۲	۰
۱۱	نیا شعور	شعبۂ اردو، جموں و کشمیر یونی ورسٹی۔ سری نگر	ڈاکٹر شکیل الرحمٰن	۱۱۲	۰
		(سہ ماہی)			
۱۲	اردو نامہ	ترقی اردو بورڈ۔ اردو منزل۔ جمشید روڈ۔ کراچی (۵)	شان الحق حقی	۱۷۰	۴=۰۰
۱۳	الثقافۃ العربیہ (ماہد)	حبانسی کیسل۔ کوپریج۔ بمبئی ۱	ڈاکٹر ایم۔ ندیان	۳۲	۰
۱۴	امریکن میویو (انگریزی)	یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن سروس۔ سکندرا آباد روڈ نئی دہلی	۰	۱۲۶	۴=۰۰
۱۵	مہاگیرتھ (انگریزی)	پبلی کیشنز ڈویژن، پوسٹ بکس ۲۰۱۱ اولڈ سکریٹریٹ دہلی (۶)	ایس۔ کے۔ رنگپا	۴۰	۱=۲۰
۱۶	پیام مہلی	محکمہ تعلقات عامہ۔ اولڈ سکریٹریٹ بلاک ۹۔ دہلی	گوپی ناتھ امن	۸۰	۳=۰۰
۱۷	خرام	۳۰۔ اسد گنج روڈ۔ چاٹگام (مشرقی پاکستان)	اصغر راہی	۱۴۴	۴=۰۰
۱۸	دی ایکنی ریویو (انگریزی)	بہادلپور ہاؤس۔ سکندرہ آباد روڈ۔ نئی دہلی ۱۔	آر۔ آر۔ بہروکس	۹۴	۴=۰۰
۱۹	سرتال (پنجابی)	۱۰۳۔ سنٹرل ٹاؤن۔ جالندھر (پنجاب)	جگتار سنگھ	۱۰۰	۴=۰۰
۲۰	صحیفہ	مجلس ترقی ادب۔ نرسنگھداس گارڈن۔ کلب روڈ لاہور	پروفیسر عابد علی عابد	۱۱۰	۶=۰۰
۲۱	نخلستان	ساہتیہ اکیڈیمی آف راجستھان۔ اودے پور	پروفیسر شنکر سری واستیوا	۱۰۸	۴=۰۰
۲۲	نوائے ادب	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ ۸ خیبر روڈ بمبئی ۸	پروفیسر نجیب اشرف ندوی	۹۴	۶=۰۰

(دو ماہی)

۲۳	شیرازہ	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس اینڈ کلچر، سری نگر (کشمیر)	محمد یوسف ٹینگ	۱۲۶	۱۰۰۰۰
۲۴	محور	۱۲-۱۶-۷ ویسٹرن ایکس ٹینشن ایریا قرول باغ - دہلی (د)	نریندر نشتیل	۱۴۸	۹۰۰۰
۲۵	کوئل	ڈالٹن گنج - بہار	نادم بلخی	۴۸	۲۰۰۰

(ماہ نامے)

۲۶	آذر	باغ فرحت افزا - جہانگیر آباد - بھوپال	ڈاکٹر شفا گوالیاری	۸۰	۳۰۰۰
۲۷	اعلیٰ حضرت	محلہ سوداگران - بریلی (یو-پی)	امید رضوی	۳۲	۵۰۰۰
۲۸	آندھرا پردیش (اردو)	محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ - کرم جاہی روڈ - حیدرآباد	کنول پرشاد کنول	۴۸	۴۰۰۰
۲۹	ادب لطیف	سرکلر روڈ - لاہور	سید انتظار حسین	۸۰	۱۰۰۰۰
۳۰	ادبی دنیا	مال روڈ - لاہور	حامد علی خان	۱۲۰	۱۰۰۰
۳۱	اردو ڈائجسٹ	۵ - مین روڈ - سمن آباد - لاہور	الطاف حسین قریشی	۱۶۰	۱۵۰۰۰
۳۲	ارژنگ	۳۰ - عنایت منزل - سکندر ٹاؤن - پشاور	تاج سعید	۱۰۰	۷۰۰۰
۳۳	ارشاد	دارالارشاد - مغل پورہ - حیدر آباد - ۲	پیرزادہ جاوید قادری	۴۸	۵۰۰۰
۳۴	اسپان (انگریزی)	بہادر پور ہاؤس - سکندرہ ۱ روڈ - نئی دہلی ۱	ڈین کے براؤن	۵۴	۵۰۰۰
۳۵	استقلال	محکمۂ اطلاعات - ۲۱ - ایبٹ روڈ - لاہور	میر عبدالصمد خان	۴۸	۳۰۰۰
۳۶	اسرار حکمت	15/A پیر مکی شریف لاہور	حکیم نور محمد چوہان	۳۲	۲۰۵۰
۳۷	اشارہ	صادق پور سرائے پٹنہ - ۷ (بہار)	قیوم خضر	۴۸	۶۰۰۰
۳۸	افکار	مکتبۂ افکار - رابسن روڈ - کراچی	صہبا لکھنوی	۱۰۴	۱۲۰۰۰
۳۹	الشجاع	ٹائمز پریس - مینسفلڈ اسٹریٹ - صدر کراچی	سلمان الارشد	۷۴	۹۰۰۰
۴۰	القدیر	صاف منظر، چھاونی نادر علی بیگ حیدر آباد دکن	احمد اللہ قدیری	۴۰	۶۰۰۰
۴۱	المعرفت	ٹنڈو طیب حیدر آباد - سندھ (پاکستان)	حشمت علی ستار الافاضل	۶۴	۹۰۰۰
۴۲	امریکن لیبر ریویو (انگریزی)	امریکن ایمبیسی - چانکیہ پوری - شانتی پتھ - نئی دہلی ۱۲	بی. ایچ. میلون	۴۲	۱۰۰۰
۴۳	انڈین لٹریچر (انگریزی)	A/2 رام نگر - نئی دہلی - ۱	لکشمن شاستری	۳۲	۹۰۰۰
۴۴	انجمن اسلامیہ میگزین	۵۸ الف - گرچن والا مارکٹ - کراچی - ۲	مفتی انتظام اللہ شہابی	۶۴	۵۰۰۰
۴۵	بانو	آصف علی روڈ - اجمیری گیٹ - نئی دہلی	بیگم زینت کوثر دہلوی	۶۴	۸۰۰۰
۴۶	برہان	جامع مسجد، اردو بازار - دہلی	سعید احمد اکبر آبادی	۶	۴۰۰۰

۴۷	بیسویں صدی	انصاری مارکٹ ۔ دریا گنج ۔ دہلی ۶	خوشتر گرامی	۹۶	[illegible]
۴۸	پاسبان	سیول سکریٹریٹ ۔ چنڈی گڑھ (پنجاب)	امر ابد آبادی	۴۸	۳۰.۰۰
۴۹	پگڈنڈی	ادبستان اردو ۔ ہال بازار ۔ امرتسر	امریک آنند	۴۸	۲۰.۰۰
۵۰	پونم	۳۰۱ ۔ ۷ ۔ ۱۶ ۔ محلہ اعظم پورہ ۔ حیدر آباد	ناصر کرنولی (یم اے)	۶۴	۴۰.۰۰
۵۱	پیغام صحت	سلامت محل ۔ موہنی روڈ ۔ لاہور	حکیم اقبال حسن	۴۰	۳۰.۰۰
۵۲	پیام تعلیم	مکتبہ جامعہ ملیہ ۔ جامعہ نگر ۔ نئی دہلی ۲۵	محمد حسین حسان	۷۲	۵۰.۰۰
۵۳	تجلی	دیوبند ضلع سہارن پور (اتر پردیش)	عامر عثمانی	۶۴	۷۰.۰۰
۵۴	تحریک	۹ ۔ انصاری مارکٹ ۔ دریا گنج ۔ دہلی	گوپال متل	۴۸	۴۰.۰۰
۵۵	تعلیم و ترقی	ادارۂ تعلیم و ترقی ۔ جامعہ نگر ۔ نئی دہلی ۲۵	برکت علی فراق	۴۴	[illegible]
۵۶	تعمیر انسانیت	موچی دروازہ ، لاہور ۔ (پاکستان)	عبد الحمید	۴۸	۵۰.۰۰
۵۷	ثانی	۱۰ ۔ گوتم بدھ مارگ ۔ لکھنؤ ۔ ۱ ۔ (یو پی)	اوصاف احمد	۴۰	۲۰.۰۰
۵۸	ثقافت	ادارۂ ثقافت اسلامیہ ۔ کلب روڈ لاہور	شاہ حسین رزاقی	۷۲	۹۰.۰۰
۵۹	جاسوسی پنجہ	پنجابی پبلشنگ بھنڈار ۔ دریبہ کلاں ۔ دہلی ۶	وی ۔ دہلوی	۱۲۰	۸۰.۰۰
۶۰	جامعہ	جامعہ ملیہ اسلامیہ ۔ جامعہ نگر ۔ نئی دہلی ۲۵	ضیاء الحسن فاروقی	۴۸	۶۰.۰۰
۶۱	جائزہ	۶ ۔ حجاز ہوٹل ۔ گرانٹ روڈ ۔ کراچی	محمد یعقوب خاں	۱۴۴	۱۲۰.۰۰
۶۲	جستجو	اندرون پنج محل ۔ حیدر آباد ۔ ۲ (اے ۔ پی)	سید عبد اللہ	۳۲	۳۰.۰۰
۶۳	جمالستان	۳۶۴ ۔ بازار بٹیا محل ۔ جامع مسجد دہلی ۶	نجم صدیقی	۶۴	۵۰.۰۰
۶۴	جوار بھاٹا	D4/E ۔ کملانگر ۔ دہلی ۶	تاجور سامری	۹۶	۶۰.۰۰
۶۵	چائنا ری کنسٹرکٹ انگریزی	عوامی جمہوریہ چین ۔ پیکنگ	•	۴۴	۴۰.۰۰
۶۶	حریم	نسیم بکڈپو ۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ (یو ۔ پی)	نعیم انہونوی	۴۸	[illegible]
۶۷	حنفی	کوچہ تیرگراں ۔ موچی دروازہ ۔ لاہور	صوفی غلام غوث فاروقی	۳۲	۱۵.۰۰
۶۸	خاتون پاکستان	پوسٹ بکس ۱۹۹ ۔ صدر کراچی ۳	شفیق بریلوی	۷۴	[illegible]
۶۹	خاتون دکن	منگر باؤلی ۔ حیدر آباد ۲ ۔ (اے ۔ پی)	صالحہ الطاف	۴۸	[illegible]
۷۰	درد دل	۷ ۔ نواب عبد الرحمن اسٹریٹ کلکتہ ۱۶	ولی صدیقی	۳۲	[illegible]

۷۱	[illegible]	ایس ۱۹۰۱۔ گریٹر کیلاش۔ نئی دہلی	چھاجو رام	۴۸	۵۰۰۰
۷۲	" " (ہندی)	" " " "	"	۴۸	۵۰۰۰
۷۳	[illegible] (انگریزی)	ایشیا پبلشنگ ہاؤس بمبئی	ایس۔ پی۔ جے سنگھ	۸	۳۰۰۰
۷۴	" " (ہندی)	" " "	"	۸	۳۰۰۰
۷۵	دین و دنیا	جامع مسجد۔ دہلی	شوکت علی فہمی	۶۰	۵۰۰۰
۷۶	ساقی	پی۔ آئی۔ بی کالونی کراچی ۵	شاہد احمد دہلوی	۶۴	۱۰۰۰۰
۷۷	ساہتیہ اکیڈمی جرنل (انگریزی)	رابندرا بھون۔ نئی دہلی۔ ۱۔	پی۔ اچریے	۴	۱۰۰۰
۷۸	سٹی اسپورٹس میگزین	نزد کریم ہوٹل۔ جامع مسجد دہلی ۶	علیم الدین	۳۲	۳۰۰۰
۷۹	سروج	پوسٹ بکس ۱۰۵۱ قصاب پورہ دہلی ۶	حکیم حمید صدیقی	۴۸	۵۰۰۰
۸۰	سوز	۲۸۔ مدن موہن برمن اسٹریٹ کلکتہ۔ ۷	سوز سکندپوری	۳۲	۵۰۰۰
۸۱	سویت لٹریچر (انگریزی)	۹/۱۱ دوبرولودا اسٹریٹ۔ ماسکو یو ایس ایس آر	واسلی ازہیو	۲۰۴	۰
۸۲	سلسبیل	ادارہ تصوف۔ اردو بازار۔ لاہور	محمد اقبال	۶۴	۷۰۰۰
۸۳	سہیل	باری روڈ۔ گیا (بہار)	ادریس سنہاروی	۴۰	۴۰۰۰
۸۴	سیارہ ڈائجسٹ	نوائے وقت بلڈنگ ۴۔ کوئینز روڈ۔ لاہور	نعیم صدیقی	۸۰	۵۰۰۰
۸۵	شاخسار	بخشی بازار۔ کٹک۔ ۱۔ اوڑیسہ	امجد نجمی	۳۲	۳۰۰۰
۸۶	شاعر	مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس ۴۵۲۶ بمبئی ۸	اعجاز صدیقی	۶۴	۷۰۰۰
۸۷	شان ہند	۶۔ انصاری مارکٹ دریا گنج دہلی ۳۱	سرور تونسوی	۴۰	۵۰۰۰
۸۸	شاہکار	ممتاز باغ۔ کٹھرگنج۔ الہ آباد۔ ۱	محمود احمد ہنر	۱۲۸	۱۰۰۰۰
۸۹	شب خون	۳۱۳۔ رانی منڈی۔ الہ آباد ۳	ڈاکٹر اعجاز حسین	۸۴	۱۰۰۰۰
۹۰	شمع	آصف علی روڈ۔ اجمیری گیٹ دہلی ۱	یوسف دہلوی	۹۶	۸۰۰۰
۹۱	صبا	۱۷۔ مجردگاہ۔ معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد	سلیمان اریب	۹۶	۱۰۰۰۰
۹۲	صبح	انجمن ترقی اردو "علی منزل" کوچہ پنڈت دہلی ۶	عبداللطیف اعظمی	۸۰	۲۰۰۰
۹۳	صبح امید	بلاسیس روڈ بمبئی ۸	عبدالحمید بوہیرے	۵۰	۲۰۰۰
۹۴	صبح نو	قطب الدین لین۔ پٹنہ ۴۔ (بہار)	وفا ملک پوری	۴۰	۲۰۰۰
۹۵	عالمگیر	ٹمپل روڈ۔ لاہور۔ ۷	عبدالرحمٰن شوقی	۴۸	۳۰۰۰

۹۶	عصمت	بسمعشہ ۔ کراچی ۔ ۳ ۔ (پاکستان)	رازق الخیری	۴۸	۶۰.۰۰
۹۷	فاران	کیمبل اسٹریٹ ۔ کراچی (پاکستان)	ماہر القادری	۶۴	۷.۰۰
۹۸	فروغ اردو	۳۷ امین آباد ۔ پارک لکھنؤ (یو ۔ پی)	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	۴۸	۳.۰۰
۹۹	فکر و خیال	پی ۔ آئی ۔ سی ۔ ایچ ۔ ایس ۔ کراچی ۲۹	شمیم جاوید	۸۸	۶.۰۰
۱۰۰	فنکار	مکتبہ چراغ ۔ لطیف آباد ۱۰ (حیدرآباد سندھ ۔ پاکستان)	چراغ الہ آبادی	۸۰	۵.۰۰
۱۰۱	فیض الاسلام	اقبال روڈ ۔ راول پنڈی (پاکستان)	غلام قادر غبار	۶۴	۵.۰۰
۱۰۲	قلمکار	مغل اکیڈیمی ۔ مہندی محبوب ۔ حیدرآباد ۲ ۔ (اے ۔ پی)	احمدی بیگم	۸۰	۶.۰۰
۱۰۳	قومی زبان	انجمن ترقی اردو ۔ پاکستان ۔ بابائے اردو روڈ کراچی	مشفق خواجہ	۹۶	۸.۰۰
۱۰۴	کاوش	۱۲۲ ۔ ۴ ۔ ۱۳ ٹپہ چبوترہ حیدرآباد	مصطفےٰ اشا باکش	۲۴	۲.۴۰
۱۰۵	کتاب	چوک لکھنؤ ۔ ۳ (اتر پردیش)	جمیل احمد	۴۲	۶.۰۰
۱۰۶	کتابی دنیا	گیدومل لیکھراج روڈ ۔ کراچی ۔ ۱	ضیاء الدین احمد برنی	۳۲	۲.۰۰
۱۰۷	کتاب نما	مکتبۂ جامعہ ملیہ ۔ جامعہ نگر ۔ نئی دہلی ۲۵	ریحان احمد عباسی	۳۲	۱.۰۰
۱۰۸	کلیان	نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ ۔ لکھنؤ (یو ۔ پی)	شمیم انہونوی	۵۰	۴.۰۰
۱۰۹	سنگم	۳۹/۴۰ نوبیل بازار کلیان (مہاراشٹرا ۔ بھارت)	شمس کنول	۵۰	۵.۰۰
۱۱۰	گل خنداں	کشمیری بازار ۔ لاہور ۸	عبد الرؤف ملک	۴۸	۴.۰۰
۱۱۱	گھریلو علاج	سدی عنبر بازار ۔ حیدرآباد دکن ۱۲	ڈاکٹر حبیبہ سندر اشٹروادی	۲۴	۱۲.۰۰
۱۱۲	ماہ نو	ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی	رفیق خاور	۳۲	۵.۵۰
۱۱۳	مجلس	ریلوے روڈ ۔ لاہور	رضوی خیرآبادی	۱۳۲	۵.۵۰
۱۱۴	محفل	رائل پارک لاہور	طفیل ہوشیارپوری	۴۴	۹.۰۰
۱۱۵	معارف	دار المصنفین ۔ اعظم گڑھ (یو ۔ پی)	معین الدین احمد ندوی	۶۴	۸.۰۰
۱۱۶	معیار	۳۳۸ ۔ ۲ ۔ ۱۲ مراد نگر ۔ حیدرآباد	اکبر کاظمی	۳۲	۸.۰۰
۱۱۷	منادی	درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ ۔ نئی دہلی ۱۳	حسن ثانی نظامی	۴۸	۱۲ ۱۲
۱۱۸	نگارش	لیاقت آباد کراچی ۲۹	معید ناصر	۴۲	۵.۰۰
۱۱۹	نگاہ	بیگم بازار حیدرآباد دکن ۱۲	ایس یم کاظم	۲۰	۲.۰۰
۱۲۰	نیرنگ خیال	۶۰ ۔ فلیمنگ روڈ ۔ لاہور	حکیم یوسف حسن	۶۴	۸.۰۰

۱۲۱	ہمایوں	۳۴ - ای - کملانگر ۔ دلی ۷	تاجور سامری	۱۸۰	۱۰،۰۰۰
۱۲۲	ہم ساز	وصول پیٹھ ۔ حیدرآباد ۶ (اے۔پی)	منیر احمد خان	۳۲	۱،۰۰۰
۱۲۳	ہم قلم	پاکستان رائٹرس گلڈ ۔ اسٹریچن روڈ ۔ کراچی	جمیل الدین عالی	۶۴	۶،۰۰۰
۱۲۴	یونسکو کرانیکل (انگریزی)	یونسکو ہاؤس ۔ پیرس ۷	ناظم یونسکو	۴۴	۸،۰۰۰
		(پندرہ روزہ)			
۱۲۵	امریکن لیبر ریویو (انگریزی)	یونائیٹڈ اسٹیٹس انفارمیشن سروس سکندرا روڈ نئی دہلی ۱	مورلیس ورباینز	۲۸	۱،۰۰۰
۱۲۶	آئینہ	۲۳ - شیر ب ، ۳۱ - قلابہ روڈ ۔ بمبئی ۵	ظ ۔ انصاری	۲۴	۱۰،۰۰۰
۱۲۷	العرب (انگریزی)	۱۶/۸/۴۸ چانکیہ پوری روڈ ۔ نئی دہلی	ڈاکٹر کلوویس مقصود	۱۶	۵،۰۰۰
۱۲۸	دورِ حیات	پرنس بلڈنگ ۔ ابراہیم رحمت اللہ روڈ ۔ بمبئی ۳	شبیر مظہر حسین	۲۸	۱۰،۰۰۰
۱۲۹	سرپنچ	نسیم بکڈپو ۔ لاٹوش روڈ ۔ لکھنؤ	شمیم انہونوی	۸	۲،۰۰۰
۱۳۰	سوادِ اعظم	موچی گیٹ ۔ لال کھوہ ۔ لاہور	حکیم غلام معین الدین	۸	۲،۰۰۰
۱۳۱	سوویت دیس (اردو)	۲۵ - بارہ کھمبا روڈ ۔ نئی دہلی	جمیل اختر	۴۸	۵،۰۰۰
۱۳۲	شعورِ حیات	جہانگیر آباد ۔ بھوپال (یم۔پی)	یم۔ عرفان	۱۶	۴،۰۰۰
۱۳۳	صراط (انگریزی)	۴ - ۱۸۰ کلاں محل ۔ دہلی ۶	محمد غالب فدائی	۸	۶،۰۰۵
۱۳۴	علمی دنیا	نام پلی روڈ ۔ حیدرآباد دکن (اے۔پی)	عثمان شبیلا	۱۶	۴،۵۰۰
۱۳۶	کاکل	عامرہ گیسٹ ہاؤس ۔ عابد روڈ ۔ حیدرآباد ۔ ا۔	محمود انصاری	۸	۲،۰۰۰
۱۳۵	موج	روبرو مسجد ٹیک ۔ نام پلی ۔ حیدرآباد دکن	محمد فضل الرحمن فضل	۸	۲،۰۰۰
		(ہفت روزہ)			
۱۳۷	آندھرا پنچ	اوپل کلاں ۔ حیدرآباد ۱۴ (اے۔پی)	ملک محمد علی خان	۴	۴،۰۰۰
۱۳۸	امریکن رپورٹر (انگریزی)	بہاولپور ہاؤس ۔ سکندرا روڈ ۔ نئی دہلی ۔ ۱	ڈونالڈ آر نیوزمن	۸	۱،۰۰۰
۱۳۹	" (تلگو)	" " "	"	۸	۱،۰۰۰
۱۴۰	ایشیا	اردو بازار ۔ دہلی	میر مشتاق احمد	۱۲	۹،۰۰۰
۱۴۱	پنچ	اعظم روڈ ۔ نظام آباد	عابد انصاری	۸	۴،۰۰۰

۱۴۲	پرچم ہند	جامع مسجد اردو بازار دہلی	انیس الرحمن	۲۴	۱۲۰۰۰
۱۴۳	ترجمانِ سرحد	پشاور (مشرقی پاکستان)	امیر عالم اعوان	۸	۶۰۰۰
۱۴۴	تعمیر	کالج روڈ۔ محبوب نگر (اے۔پی بھارت)	محمد عبدالعزیز	۸	۱۲۰۰۰
۱۴۵	حیات	۵۔ رانی جھانسی روڈ۔ نئی دہلی	احمد معظم	۱۲	۹۰۰۰
۱۴۶	خبرنامہ (اردو)	پریس بیورو عرب ری پبلک سفارت گھر نئی دہلی	•	۸	•
۱۴۷	رضائے مصطفےٰ	چوک دارالسلام۔ گوجرانوالہ (پاکستان)	حفیظ نیازی	۱۲	۵۰۰۰
۱۴۸	ذوالقرنین	نظامی پریس بدایوں (اتر پردیش)	وحید الدین نظامی	۴	۴۰۰۰
۱۴۹	رقاصۂ سیاست	عثمان پورہ۔ حیدرآباد۔۲۴ (اے۔پی)	انور ادیب	۸	۴۰۰۰
۱۵۰	رنگِ زمانہ	بیل طرف۔ نظام آباد (اے۔پی) بھارت	محمد یوسف الدین	۴	۴۰۰۰
۱۵۱	شعور	مہر منشن۔ نارائن گوڑہ۔ حیدرآباد۔ ۲۹	رحیم قریشی	۱۲	۶۰۰۰
۱۵۲	محبوبِ حق	جامعہ رضویہ۔ لائل پور (پاکستان)	احسان الحق قادری	۱۲	۷۰۰۰
۱۵۳	مورچہ	بیراگی۔ گیا (بہار)	پروفیسر کلام حیدری	۱۲	۶۰۰۰
۱۵۴	نیا رنگ	قرول باغ۔ نئی دہلی	سودیش کمار	۱۲	۶۰۰۰
۱۵۵	ہماری زبان	انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ (اتر پردیش)	پروفیسر آل احمد سرور	۱۲	۳۰۰۰
۱۵۶	ہماری منزل	۵۵۵: سی کلاس ملے پلی۔ حیدرآباد	شفیع اقبال	۸	۹۰۰۰
۱۵۷	ساگر	۴۔ حاجی شیخ حبین اسٹریٹ رائے پیٹھ مدراس ۱۴	بیگم خورشید حسن	۶	۶۰۰۰
		(دو روزہ)			
۱۵۸	آج کا امریکہ	یونائیٹڈ اسٹیٹس انفارمیشن سروس سکندرا روڈ نئی دہلی	•	۸	بلا قیمت بے موقت
۱۵۹	خبریں اور رائیں	پریس انفارمیشن بیورو حکومت ہند۔ دہلی	•	۱۲	〃
۱۶۰	پریس ریلیز (اردو)	سفارت خانہ سوویت پوسٹ بکس ۲۴۱ دہلی	•	۱۲	۴۰۰۰
۱۶۱	سائنس اس کے ایجادیں	یونائیٹڈ اسٹیٹس انفارمیشن سروس سکندرا روڈ۔ نئی دہلی	•	۸	بلا قیمت
۱۶۲	سوویت زمین کی خبریں	۲۵۔ بارہ کھمبا روڈ۔ نئی دہلی	•	۱۲	[illegible]

۱۶۳	سوویٹ فیچر (اردو)	۲۵ - بارہ کھمبا روڈ۔ نئی دہلی	-	۱۲	بلا قیمت تقسیم
۱۶۴	میڈیکل نیوز (اردو)	یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن سروس۔ دہلی	-	۱۲	"
		(روزنامے)			
۱۶۵	سٹیٹس مین (انگریزی)	کناٹ سرکس۔ نئی دہلی	انوائرا بوان چارلٹن	۱۲	۴۴۰.۰۰
۱۶۶	خدمت	دی نیڈو۔ سری نگر (کشمیر)	بی بن۔ ورنل	۴	۱۲۰.۰۰
۱۶۷	رہنمائے دکن	افضل گنج۔ حیدرآباد۔ ۱۔ (بھارت)	محمد منظور حسن	۶	۳۶۰.۰۰
۱۶۸	سیاست	جواہر لال نہرو روڈ۔ حیدرآباد دکن۔۱۔ (بھارت)	میر عابد علی خان	۸	۳۶۰.۰۰
۱۶۹	ملاپ	کرم جاہی روڈ۔ حیدرآباد دکن۔۱۔ (" ")	یدھ ویر	۸	۳۶۰.۰۰

اِدارہ کی مطبوعات

معاصرین کی نظر میں

۱۹۶۵ء میں ادارہ کی مختلف تازہ مطبوعات اور رسالہ "سب رس" کے خصوصی شماروں پر ہند و پاک کے رسائل و جرائد میں جو تبصرے شائع ہوے ان میں سے چند کے اقتباسات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ اب تک ادارۂ ادبیات اردو مختلف علمی، ادبی، تحقیقی اور تاریخی موضوعات پر (۳۰۳) کتابیں شائع کر چکا ہے جن میں بیشتر مطبوعات کا شمار ادبِ عالیہ میں ہوتا ہے۔ ادارہ کی کئی کتابیں ایسی ہیں جو ہندوستان کی مختلف جامعات اور فوقانی مدرسوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ (ادارہ)

کلمۃ الحقائق (مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی)

"معراج العاشقین" کی طرح یہ کتاب بھی تصوف سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں مصنف حضرت سید شاہ برہان الدین جانم بیجاپوری نے بہت سے ان سوالات کا جواب دیا ہے جو وقتاً فوقتاً مریدین ان سے پوچھا کرتے تھے۔ یہ رسالہ پرانی دکھنی زبان میں ہے کہیں کہیں اردو میں سوالات کا فارسی میں جواب دیا ہے۔ یہ مسائل عام دلچسپی کے ہیں۔ آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ دیدی گئی ہے ادارہ کے سلسلۂ مطبوعات کی یہ (۲۷۸) ویں کتاب ہے۔ قدیم دکھنی قلمی کتابوں کی اشاعت کے بارے میں ادارہ جو خدمت انجام دے رہا ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔ شروع میں مرتب کا سیر حاصل مقدمہ ہے۔ (ضیاءالدین احمد برنی)

(مطبوعہ ماہنامہ "کتابی دنیا" کراچی بابتہ نومبر ۱۹۶۵ء)

تماشائے اہلِ ہنر (از رشید الحسن)

یہ (۸۷) صفحات کا کتابچہ تین ڈراموں پر مشتمل ہے جن میں غالب، مومن اور اقبال کے کلام اور واقعاتِ زندگی کو بہت پسندیدہ مگر نادرت آمیز پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے۔ لکھنے والے ہیں سید رشید الحسن ایم اے، جو متعدد ڈرامے دنیائے ادب کو دے چکے ہیں۔ یہ ڈرامے دلچسپی سے پڑھے جانے کے قابل ہیں۔

(مطبوعہ ماہنامہ "کتابی دنیا" کراچی بابتہ نومبر ۱۹۶۵ء)

مقامِ غالب (مرتبہ: پروفیسر سید مبارز الدین رفعت)

غالب پر تنقیدی کتابوں کا مفید سلسلہ مدت دراز سے قائم ہے۔ لکھنے والوں کی اطلاعات و معلومات کے مطابق یہ چھوٹے چھوٹے کتابچے اہم بھی ہیں اور غیر اہم بھی۔ غیر اہم کتابوں میں عموماً

مطبوعات فائل ہیں جو چھوٹے طلباء کے لئے قلمبند ہوئے ہیں کہ ان میں نہ تشبیہی بیان ہے نہ دلکش عبارت، نہ بچوں کو غالب سے قریب لانے کی سعی کامیاب ہے۔ اس کے بعد ان کتابوں کا نام آتا ہے جو بالغ طلباء کے لئے یا عام قاری کے لئے لکھی گئی ہیں بتوسط کتابیات میں میاں رزالدین صاحب کی زیرِ نظر کتاب "مقام غالب" ہے سادہ زبان، مسلسل و مربوط حالات، مناسب اور مختصر انتخاب نظم و نثر اردو، آخر میں غالب پر اہم تالیفات کا تعارف ہے۔ مطالعہ کتاب سے یہ معلوم ہوتا ہے جیسے کسی استاد نے بعض اہم کتابوں کا خلاصہ لکھ دیا ہے "تاکہ طالب علم غالب و غالبیات کو سمجھنے کی استعداد پیدا کرلے۔ اگر کتاب اسی مقصد سے لکھی گئی ہے تو بلاشبہ فاضل مولف بڑی حد تک اپنے عہدے سے عہدہ برآ ہوگئے۔ انہوں نے موٹے موٹے معاملات اور قابلِ تعارف گوشوں کا تعارف کرا دیا ہے اور "غالب پر لکھی ہوئی اہم کتابیں" لکھ کر طالب علم کو بنیادی کتابوں کی طرف متوجہ کرنے کے لئے واضح اشارہ بھی کر دیا۔

خوبی یہ کہ کتاب اگرچہ فن اور تعین مقام سے بحث اور مفصل گفتگو نہیں کرتی مگر مرزا کی اپج، تخلیقی رجحان اور اسبابِ شہرت پر تھوڑی سی روشنی ڈال کر افادیت بڑھاتی ہے اگر رفعت صاحب نے اپنی کتاب کو مسلسل نظر میں رکھا اور مناسب اضافے جاری رکھے تو ان خطوط پر بڑی کامیاب کتاب تیار کر سکیں گے۔ (مرتضیٰ حسین فاضلؔ)

(اقتباس سہ ماہی صحیفہ لاہور جولائی ۱۹۶۵ء)

اقبال کا تصورِ عشق (از ڈاکٹر غلام عمر خاں)

زیرِ نظر کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ فاضل مولف کو اپنے موضوع سے گہری دلچسپی ہے اور اس خصوص میں ان کا مطالعہ بھی کافی وسیع معلوم ہوتا ہے ایک سو تیس صفحوں کے اس مختصر سے رسالے میں موصوف نے عالمانہ اختصار سے کام لے کر عشق سے متعلقہ مختلف مشرقی اور مغربی تصورات کی کامیابی سے وضاحت کی ہے اور اقبال کے تصورِ عشق کے تاریخی پس منظر اور عناصر ترکیبی کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

اس کتاب میں پیش کردہ مسائل پر مناسب غور و خوض موجودہ زمانے کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اقبال کا تصورِ عشق حرکی ہے اور سارے موجودات پر حاوی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق مکمل انسان وہ ہے جو اپنے ماحول سے ہم آہنگ ہو کر اس کی قوتوں سے کام لیتا ہے اور اس طرح حاصل شدہ اختیار اور توانائی کو دنیا میں حیات آفریں اور انسان پرور مقاصد کی پیش رفت کے لئے استعمال کر کے تخلیقی ترقی اور تحفظِ کائنات میں اپنے خالق کا مددگار اور معاون بن جاتا ہے۔

جیسا کہ ڈاکٹر غلام عمر خاں نے ایک جگہ وضاحت کر دی ہے کہ ان کی اس تالیف کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ اقبال کے نقطۂ نظر سے وجودِ انسانی میں عشق کا کیا مقام ہے قلب یا دل کو انسانی شخصیت میں کیا حیثیت حاصل ہے عقل اور دل کے منطقوں کا باہمی تعلق کیا ہے۔ عشق کا معروض کیا ہے اس تک رسائی کا طریقۂ عمل کیا ہے اور اس طرح شخصیتِ انسانی کے نقطۂ نظر سے عشق کی تخلیقی قدر کیا ہے۔ (زبیر حسن)
(مطبوعہ روزنامہ "سیاست" حیدرآباد یکم مارچ ۱۹۶۵ء)

○

نظام کالج حیدرآباد کے استادِ اردو ڈاکٹر غلام عمر خاں صرف اقبالیات کے ماہر نہیں بلکہ اسلامیات و عقلیات میں بھی بالغ نظر رکھتے ہیں اس لئے انہیں حق حاصل تھا کہ ایسے نازک و دقیق موضوع پر قلم اٹھائیں۔ چنانچہ وہ اپنے اس حق کو کام میں لائے اور دکھا دیا کہ اقبال کے فلسفہ اور قرآنیات کا ایک لطیف آمیزہ تیار کیا ہے۔

(مولانا) عبدالماجد دریابادی
مطبوعہ ہفتہ وار صدق جدید لکھنؤ
بابت ۷ مئی ۱۹۶۵ء

ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع کردہ یہ کتاب دیدہ زیب اور جاذب نظر ہے۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں نے اس سے قبل "روحِ اسلام اقبال کی نظر میں" لکھ کر نقادانِ فن سے داد و تحسین حاصل کی ہے۔ چنانچہ نیاز فتح پوری نے لکھا ہے کہ "محدود گنجائش میں وہ سب کچھ کہدیا ہے جو اقبال کے فلسفہ کے تعلق کہا جاسکتا ہے۔"

پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب نے لکھا ہے کہ "آپ کا اقبال کا مطالعہ بڑا وسیع اور وقیع ہے"۔ زیر نظر کتاب اقبال کے تصورِ عشق کی تشریح ہے۔

مضمون بلند پایہ فلسفیانہ مباحث کا طالب ہے اور مصنف نے بالاختصار اس حق کو خوب ادا کیا ہے۔ گر یہ بات کھٹک جاتی ہے کہ مباحث مزید عام فہم بنائے جاسکتے تھے موجودہ حالت میں بلند پایہ علمی ذوق والوں کے لئے کام کی چیز ہے۔ آئندہ اشاعتوں میں اکثر فارسی اشعار کا اردو ترجمہ دے دیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ بہت سے اردو داں فارسی پر اتنی دستگاہ نہیں رکھتے کہ اقبال اور رومی کے اشعار پوری طرح سمجھ سکیں۔ ہمیں یقین ہے کہ کتاب پڑھنے والا ہر شخص رشید احمد صدیقی کا ہمنوا ہوگا۔ "وہ کہتے ہیں کہ آپ سے استدعا ہے کہ اس کام کو جاری رکھیے۔"

(منشور ہفتہ وار حیدرآباد ۱۹۔ فروری ۱۹۶۵ء)

تاریخ گولکنڈہ (از پروفیسر محمد عبدالمجید صدیقی)

حال ہی میں ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے پروفیسر عبدالمجید صدیقی کی کتاب "تاریخ گولکنڈہ" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ یہ ایڈیشن ٹھیک ایک ربع صدی بعد چھپا ہے۔ اس کتاب کو تاریخ گولکنڈہ کی بجائے موجودہ دور میں سلطنت آندھرا کی تاریخ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس لئے کہ سلطنت گولکنڈہ کے جو حدود اس میں بتائے گئے ہیں، آندھرا پردیش کے حدود بھی وہی ہیں یعنی شمال میں سیکاکول یا موجودہ سریکاکولم سے شروع ہو کر جنوب میں چتور تک یہ علاقہ چلا گیا ہے اس کے مغرب میں کوہیر اور شمال مغرب میں کولاس واقع ہیں۔ اور مشرق میں ساحلی مسولی پٹم۔

ہندوستان اپنی وسعت کے اعتبار سے کئی سلطنتوں میں منقسم تھا اور ہر سلطنت اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے لیکن جب مورخ ہندوستان کی تاریخ پر قلم اٹھاتا ہے تو ان سلطنتوں کی تاریخیں پس منظر میں آجاتی ہیں۔ حالانکہ جنوبی ہندوستان میں ایسی کئی سلطنتیں تھیں جنہوں نے ہندوستان کو اپنے تمدنی اور ثقافتی ورثے سے مالا مال کیا ہے۔ گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت بھی ایسی ہی ایک سلطنت تھی جو صفحۂ دہر پر تقریباً دو سو سال تک قایم رہی اور اس کے بابرکت آثار آج تک بھی باقی ہیں۔ حیدرآباد اسی کی ایک شاندار یادگار ہے۔

قطب شاہی زمانے میں بھی اس کو کافی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس لئے کہ یہ سلطنت بیرونی سیاحوں کیلئے ہندوستان کا دروازہ سمجھی جاتی تھی اور اس کو ہیروں کی سلطنت کہا جاتا تھا

زیر تبصرہ کتاب اسی سلطنت کی ایک مبسوط تاریخ ہے اس کو پہلے پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر حصے میں الگ الگ باب دیئے گئے ہیں۔ پہلا حصہ سلطنت کی تاسیس پر ہے جس میں تین باب ہیں۔ دوسرے حصے میں سلطنت کے استحکام سے بحث کی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں سلطنت کے عروج کا ذکر پانچ ابواب میں ہے۔ چوتھے حصے میں سلطنت کے زوال کے اسباب پر آٹھ باب تحریر کئے گئے ہیں آخری حصہ قطب شاہی تمدن پر ہے جس میں چار ابواب ہیں اس کے بعد شاہجہاں اور سلطان قطب شاہ کی مراسلت دی گئی ہے اور آخر میں اشاریہ بھی ہے جس نے کتاب کی قدر و قیمت میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔

پہلے ایڈیشن کے مقابلے میں اس میں زائد از سو صفحات کا

موازنہ پیش کیا گیا ہے۔ اس لئے زائد مواد میں قطب شاہی عہد کی عوامی زندگی پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قطب شاہی سلاطین نے ہمیشہ اس امر کو پیش نظر رکھا کہ ملک ہر جہتی ترقی کرے اور رعایا خوشحال ہو محمد قلی قطب شاہ بانی حیدرآباد کا طویل عہد حکومت تو اس قدر پر امن رہا کہ قتل و غارت گری اور خون ریزی بے معنی الفاظ بن گئے تھے

اس کتاب میں سب سے اہم حصہ گولکنڈہ کا تمدن ہے یہ انتہائی دلچسپ بھی ہے اور دلکش بھی۔ دلچسپ اس لئے ہے کہ اس عہد کی بہت سی یادگاریں آج بھی صفحہ ہستی پر موجود ہیں اور ہم انہیں اکثر و بیشتر دیکھتے رہتے ہیں۔ ان کی روایات آج بھی حیدرآباد کے گوشہ گوشہ میں نظر آتی ہیں۔ اِن باعظمت بادشاہوں نے اپنی مختلف مذاہب اور عقائد رکھنے والی رعایا کو اس طرح ایک رشتے میں منسلک کیا تھا کہ ان کے گذرنے کے چار سو سال بعد آج بھی ان میں انتشار نہیں پیدا ہوا۔ وہ اپنی رعایا کے بہی خواہ اور اس کے محافظ رہے اور رعایا بھی ان کی جاں نثار رہی۔

۴۵۶ صفحات کی یہ کتاب رائل سائز کے عمدہ کاغذ پر واضح کتابت کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ مجلد ہے۔ سات روپے قیمت حالاتِ حاضرہ کے لحاظ سے کم ہی معلوم ہوتی ہے۔

کتاب کے مصنف پروفیسر عبدالمجید صدیقی تاریخ دکن پر ماہرانہ نظر رکھتے ہیں۔ کتاب میں معاصر تاریخوں کے حوالے جابجا ملتے ہیں جس سے فاضل مولف کی وقت نظر کا پتہ چلتا ہے۔

٭۔ (محمد اکبرالدین صدیقی کا نشری تبصرہ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے ۲۷۔ فروری ۱۹۶۵ء کو نشر ہوا۔)

○

سب رس (نصیرالدین ہاشمی نمبر)

جنوری کا شمارہ ہاشمی نمبر ہے جو نصیرالدین ہاشمی کی یاد میں شائع کیا گیا ہے۔ اس میں ۱۲۸ صفحات ہیں۔ ابتداء اُن آپ بیتی سے کی گئی ہے جو مرحوم نے "نقوش" کے لئے تحریر کی تھی۔ اس نمبر میں تعزیتی خطوط بھی ہیں اور مضامین بھی، خطوط لکھنے والوں میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پروفیسر ہارون خان شروانی اور ہم۔ اسلم جیسے بزرگ شامل ہیں جن مضمون نگاروں نے مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ان میں تحسین سروری، ڈاکٹر شریف النساء انصاری، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، خدیجہ ہاشمی اور عبدالقادر سروری قابلِ ذکر ہیں۔ ان مضامین کو پڑھ کر اس امر کا اندازہ کرنے پر کوئی دقت نہ ہوگی کہ مرحوم ساری عمر طالب علم ہی رہے۔ آخر میں چند نظموں میں مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مرحوم کا شمار اردو کے محسنین میں کیا جائے گا اور دکن کو ہمیشہ ان کی ذات پر فخر رہے گا۔

(کتابی دنیا۔ کراچی، بابتہ مارچ ۱۹۶۵ء)

○

سب رس جنوبی ہندوستان کا ایک محترم ماہنامہ ہے جو ایک لمبے زمانے سے اردو ادب و زبان کی خدمت اور اشاعت میں معروف ہے اس کی روش بہت متین اور سنجیدہ رہی ہے ایسے موضوع اس کے پیش نظر رہے ہیں جو محض اسی کا خاصہ رہا ہے اب تک اس کے بہت سے سالانہ نمبر شائع ہو چکے ہیں جو اپنی جگہ بہت اچھے اور کارآمد ہیں۔ اب اس کا ہاشمی نمبر شائع ہوا ہے۔ حق یہ ہے کہ ہاشمی مرحوم کے بارے میں اتنا اچھا اور کارآمد نمبر صرف سب رس ہی شائع کر سکتا تھا۔ ہاشمی مرحوم حیدرآباد کے فرزند تھے ان کی علمی خدمات بھی تمام طور سے آندھرا پردیش اور دکنیات سے متعلق رہی ہے اور اسی اعتبار سے ہاشمی مرحوم سارے

ہندو پاک میں جانے اور مانے جاتے رہے ہیں۔

اس نمبر میں خود ان کی آپ بیتی موجود ہے جس سے ان کی زندگی کے بعض حقیقی پہلوؤں اور ان کے مزاج سے شناسائی ہوتی ہے۔ ایک فہرست مضامین ہے اتنی طویل کہ حیرانی ہوتی ہے۔ یہ ان مضامین کی فہرست ہے جو ہاشمی مرحوم کے قلم سے نکلے ہیں اس کے علاوہ جو مضامین دوسرے اہل قلم نے ہاشمی صاحب کے بارے میں لکھے ہیں قابلِ مطالعہ ہیں۔ نمبر دیکھنے کی چیز ہے دیکھنے میں بھی کشش ہے۔

(تاجور سامری۔ جوار بھاٹا دہلی۔ فروری ۱۹۶۵ء)

○

"سب رس" ایوان اردو حیدرآباد کا ایک قدیم رسالہ ہے جس کے بانی ڈاکٹر زور مرحوم تھے۔ یہ رسالہ علمی و ادبی حلقوں میں کافی مشہور ہے۔ زیرِ نظر شمارہ اردو کے مشہور مصنف اور تاریخ نویس حضرت نصیرالدین ہاشمی کی یادگار میں شائع کیا گیا ہے۔ نصیرالدین ہاشمی نے اپنی زندگی میں اردو زبان و ادب اور تاریخ کی ناقابلِ فراموش خدمت انجام دی ہیں اس پرچہ میں مشہور اہل قلم حضرات نے معلومات آفریں مضامین سے ہاشمی صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ دو تصویریں ہاشمی صاحب کی یادگار ہیں۔ اس میں ہاشمی صاحب کی آپ بیتی بھی ہے جو دلچسپ ہے یہ رسالہ علیحدہ کتابی صورت میں بنام "یادگار ہاشمی" شائع ہوا ہے جو ادارہ سے دو روپے میں مل سکتا ہے۔

(مطبوعہ ماہنامہ "صبح امید" بمبئی بابتہ مارچ ۱۹۶۵ء)

○

ماہنامہ "سب رس" ادبی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہندو پاک کے چند معیاری جرائد میں اس کا شمار ہوتا ہے جو علمی و فکری مواد اس میں ملتا ہے وہ اردو کے چند ہی جرائد کا حصہ ہے ۱۹۳۶ء میں اس کا اجرا ہوا تھا۔ اتنی مدت سے یہ اپنی قدیم اور درخشاں روایات کو لئے ہوئے انتہائی شان و شوکت کے ساتھ نکل رہا ہے ورنہ آئے دن کے تجربات بتاتے ہیں کہ کتنے ہی علمی و ادبی پرچے منظر عام پر آئے اور اس سبک روئی سے گذر گئے کہ ان کے نقشِ پا کا سراغ بھی نہ مل سکا۔ ادبی محفل میں فکر و نظر کے کتنے چراغ روشن کئے گئے لیکن وہ بادِ مخالف کے ایک جھونکے سے بجھ گئے یا بے نور ہو گئے۔ ان حالات کے پیش نظر "سب رس" جیسے وقیع ادبی جریدے کا پابندی سے شائع ہونا معجزے سے کم نہیں۔ زیر تبصرہ پرچہ ہاشمی نمبر ہے جس میں نصیرالدین ہاشمی کی موت پر ادبا اور شعرا نے عقیدت میں اشکوں کا نذرانہ پیش کیا ہے۔

نصیرالدین ہاشمی کی موت علمی دنیا کے ایک گوہر نایاب کی موت ہے۔ اس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

"سب رس" نے یہ نمبر نکال کر ہاشمی صاحب مرحوم کی گرانقدر خدمات کو سراہا ہے جس کے لئے وہ شکریہ کا مستحق ہے، یہ نمبر بھی "سب رس" کی شاندار قدیم روایات کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے جس کا مطالعہ ادب کے طالب علموں کے لئے ضروری ہے۔

(ماہنامہ "جائزہ" کراچی۔ مارچ ۱۹۶۵ء)

○

نصیرالدین ہاشمی کی شخصیت اور ادبی خدمات پر مندرجہ ذیل اہل قلم کے مضامین شامل ہیں۔ نجیب اشرف ندوی، ہارون خان شروانی، عبدالمجید صدیقی، میر لئیق علی خان، شعیب اعظمی، سید مصطفےٰ کمال، طیب انصاری، نادم سیتاپوری، مسعود حسین خان، محمد اسحٰق ایوبی، تحسین سروری، جہاں بانو نقوی، سعید جہاں، شریف النسا انصاری، منیرہ بانو کاظمی، شاکرہ بیگم، ذاکرہ غوث، رضوانہ اقبال، اصغر سلطانہ

شمارے کے شروع میں نصیرالدین ہاشمی کی آپ بیتی بھی شامل ہے جو اس سے پہلے نقوشِ لاہور کے شخصیات نمبر میں شائع ہو چکی ہے۔ شعرا نے اظہار عقیدت کیا ہے۔ چند اشعار یہ ہیں۔ ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
کس کے گھر جائے گا اب بارِ گرانِ اسعد

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
اب فقط رہ گئے ہم پیشہ ورانِ اردو
(ڈاکٹر مسعود حسین خان)

واقفِ شرحِ صحفِ عارض
حافظِ سورۂ لسان نہ رہا
(فضل الرحمن)

تو نے جو شمع جلائی ہے بجھے گی نہ کبھی
ہم خواتینِ دکن تجھ کو نہ بھولیں گے کبھی
(ناز حیدر)

نقد و نظر میں ڈاکٹر شریف النساء انصاری کی کتاب "حیات و تصنیفات" مرزا ابوطالب کلیم ہمدانی ملک الشعرائے دربار شاہ جہاں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب نصیر الدین ہاشمی کے ذاتی کتب خانہ سے شائع ہوئی ہے جو انہوں نے خواتین کے استفادۂ عام کے لئے رجسٹرڈ کرایا ہے اس کے ساتھ ادارۂ تحقیق بھی ہے۔

(سہ ماہی اردو نامہ کراچی شمارہ ۲۰ ۔ ۱۹۶۵ء)

○

"ادارۂ ادبیات اردو کے ترجمان ماہنامہ "سب رس" کا شمار اردو کے ان چند اہم ادبی رسالوں میں ہوتا ہے جنہوں نے گذشتہ پچیس سال سے خالص اور صحت مند علمی و ادبی خدمات انجام دی ہیں۔ ہاشمی صاحب کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں "سب رس" کا یہ خصوصی شمارہ (۱۹) علمی و ادبی مضامین، چند تعزیتی مکاتیب اور دس نظموں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ہاشمی صاحب کی "آپ بیتی" بھی شامل ہے جس کے مطالعہ سے مرحوم کی شخصیت کے بارے میں بہت سی رنگا رنگ اور دلچسپ باتیں قاری کو متاثر کرتی ہیں۔

زیر تبصرہ نمبر میں پروفیسر مجید صدیقی، پروفیسر سروری، ڈاکٹر مسعود حسین خان، جہاں بانو نقوی، ڈاکٹر شریف النساء، مصطفیٰ کمال نے ہاشمی صاحب کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ پروفیسر مجید صدیقی اور میر لئیق علی خان کے مضامین مرحوم نصیر الدین ہاشمی کی سارہ پرکار علمی و ادبی اور شخصی زندگی کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں۔ شیب اعظمی، طیب انصاری، شاکرہ بیگم، رسید سلطانہ اور ذاکرہ غوث کے مضامین سے کسی حد تک ہاشمی صاحب کی گرانقدر ادبی خدمات پر روشنی پڑتی ہے۔ دکنی ادبیات پر اسحاق ایوبی صاحب نے مختصراً سہی لیکن اجمالی طور پر ہاشمی صاحب کی خدمات پر لکھا ہے۔

حضرت جذب عالم پوری، فضل الرحمن، ڈاکٹر مسعود حسین خان، وقار خلیل، تحسین سروری، نیتر اور ناز حیدر کے علاوہ دیگر شعرا نے ہاشمی صاحب کے فکر و فن کو منظوم خراجِ عقیدت ادا کیا ہے۔

آخر میں مرحوم کی صاحبزادی خدیجہ ہاشمی کی مرتب کردہ ایک بسیط فہرستِ مضامین ہے جس کے مطالعہ سے تعجب ہوتا ہے کہ ہاشمی صاحب نے ادب کے مختلف گوشوں میں اپنے رشحات چھوڑے ہیں (۳۸۸) مضامین کی اس فہرست سے ہاشمی صاحب مرحوم پر تحقیقی کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی۔

مجموعی حیثیت سے "سب رس" کا ہاشمی نمبر دستاویزی اہمیت کا حامل ہے۔ اردو ادبیات کا ذوق رکھنے والوں اور تحقیقاتی کام کرنے والوں کے لئے یہ شمارہ کافی سود مند ہوگا۔

(مطبوعہ روزنامہ سیاست حیدرآباد مورخہ ۲۲۔ فروری ۱۹۶۵ء)

○

"نصیر الدین ہاشمی مرحوم حیدرآباد کے ان سپوتوں میں سے تھے جنہوں نے اپنے علمی کارناموں سے حیدرآباد کا نام روشن کیا ہے۔ کم و بیش دو درجن کتابیں ان کی تصنیف ہیں اور مقالوں کی گنتی ہی نہیں۔ "دکن میں اردو" ان کی پہلی کتاب اور "دکنی کلچر" آخری کتاب ہے۔ دکنی ادب کے مورخ کی حیثیت سے وہ مدتوں تک یاد رکھے جائیں گے۔ "سب رس" کا یہ نمبر ہاشمی مرحوم پر ایک مستند دستاویز ہے۔ آگے چل کر جو لوگ ان سے

واقفیت چاہنے والے اسے ایک کتاب کی طرح مفید پائیں گے۔

(ہفتہ وار ذوالقرنین بدایون م ۲۱ ستمبر ۱۹۶۵ء)

سب رس (ادارہ نمبر)

"سب رس" ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کا ترجمان ہے جو جنوری ۱۹۳۸ء سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس ادارہ کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم نے قایم کیا تھا۔ اور یہ انہیں کا کرشمہ ہے کہ آج ادارۂ ادبیات اردو ہندوستان کا ایک بہت ہی بڑا ایسا ادارہ ہے جہاں تحقیق اور ریسرچ کے لئے دور دراز سے ہر سال طلباء آتے ہیں۔

"سب رس" کے اس ادارہ نمبر سے ادارۂ ادبیات اردو کی منزل بہ منزل ترقی کے ادوار، اس کی سرگرمیاں، اس کی ادبی خدمات، آمدنی و خرچ کا حساب کتاب، نظم و نسق اور دیگر تفصیلات ہمیں ملتی ہیں اور ہم یہ جان کر خوشی اور فخر سے پھولے نہیں سماتے کہ اس ہندوستان میں ایک ایسا بھی ادارہ ہے جو اردو زبان و ادب کی صحیح معنوں میں خدمت کر رہا ہے اور اردو داں عوام کے تعاون سے پھل پھول رہا ہے۔

مصروفیات ادارہ کے عنوان سے ۱۹۶۴ء سے علمی، ادبی اور ثقافتی کارروائیوں کی تفصیلات درج ہیں جسے بڑے اچھے ڈھنگ سے تاریخ بہ تاریخ ترتیب دیا گیا ہے۔

"امداد و امانت" کے عنوان سے ایک لمبی چوڑی فہرست ان حضرات کی شائع کی گئی ہے جنہوں نے ۱۹۶۴ء میں کتب خانہ اور میوزیم کو عطیات دیئے ہیں۔

"استفادہ کتب خانہ" کے عنوان سے ان تشنگان علم و ادب کے نام درج ہیں جو وقتاً فوقتاً اپنی پیاس بجھانے اس میکدۂ علم و ادب میں آئے۔

صفحہ ۳۳ پر سب رس کے تبادلے میں آنے والے تمام رسائل و جرائد کے نام اور پتے شائع کئے گئے ہیں جو واقعی ایک بہت ہی بڑا کام کیا گیا ہے۔

سب رس کا ادارہ نمبر اس لحاظ سے زیادہ اہم ہے کہ اس نمبر سے دوسرے اداروں کو اس قسم کا نمبر نکالنے میں بڑی مدد ملے گی۔ اس قسم کا یہ نمبر میرے خیال میں پہلا نمبر ہے۔ ہم تمام لائبریریوں، کتب خانوں اور ادبی اداروں سے پُر زور سفارش کرتے ہیں کہ وہ سب رس کے سالانہ خریدار بن جائیں۔

معین شاہد

(ہفتہ وار مورچہ گیا (ہند) م ۲۴ جولائی ۱۹۶۵ء)

○

"سب رس" ماہ جولائی ۱۹۶۵ء ادارہ نمبر ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کے متعلق مختلف مضامین پڑھ کر اس کی افادیت اور ہمہ گیر سرگرمیوں کا سکہ دلوں پر بیٹھ جاتا ہے۔

(مطبوعہ ماہنامہ "کتابی دنیا" کراچی۔ اگست ۱۹۶۵ء)

○

"سب رس"

"سب رس" مارچ ۱۹۶۵ء کے شمارے میں دو مضمون خاص دلچسپی کے ہیں۔ ایک آزاد نعیم الدین شاتروف (ماسکو) کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں مخلوط المعرف الفاظ سے بحث کی گئی ہے۔

شاتروف کو دکھنی سے خاص شغف ہے۔ دوسرا مضمون قصیدۂ بُردہ کا دکھنی میں منظوم ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ محمد بن ضیا کا ہے جو شاہ عبداللہ کا مرید تھا۔ رائے محبوب نارائن کوڑتے نے منشی دوارکا پرشاد افق پر بہت اچھا مضمون لکھا ہے اور ان کی شاعری کے نمونے بھی دیئے ہیں۔ خلاصہ حیات شبلی بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

(ماہنامہ کتابی دنیا کراچی۔ مئی ۱۹۶۵ء)

علمی و ادبی و کلچرل تعاون

۱۹۶۵ء ـــــ ادارے کی ڈائری سے

دکنی زبان کے مشہور اور ہر دل عزیز شاعر جناب سرور ڈنڈا مرحوم کے والد صاحب کی خواہش پر ادارہ کی طرف سے ایک "صداقت نامہ" جاری کیا گیا۔

جناب فیض احمد ریم اے، ریسرچ اسکالر (یونیورسٹی اورینٹل کالج) لاہور کو ایم اے کے مقالہ "نصیر الدین ہاشمی" کے سلسلے میں مختلف علمی و ادبی مواد اور دیگر تفصیلات روانہ کی گئیں۔

جناب محمد اختر الحسن لکچرار شعبہ اردو و فارسی پنڈول کالج پانڈول ضلع دربھنگہ (بہار)، کو "عبدالغفور شہباز" پر ریسرچ کے سلسلے میں ادارے کی طرف سے رہبری کی گئی۔

انور کمال خوندمیری صاحب ایڈیٹر پندرہ روزہ "نغمۂ حیات" حیدرآباد کو علمی و ادبی شخصیتوں کے بارے معلومات بہم پہنچائی گئیں۔

جناب عظیم حیدرآبادی ڈائرکٹر فزیکل گورنمنٹ ملٹی پرپز ہائی اسکول نلگنڈہ کو مختلف ادیبوں کے بارے میں استفسارات کا جواب تحریر کیا گیا۔

جناب جلال الدین اکبری معتمد عوامی دارالمطالعہ و کتب خانہ چنچل گوڑہ حیدرآباد کو مختلف موضوعات پر ادارہ کی طرف سے رہنمائی کی گئی۔

جناب ایم، ایچ، رضوی ڈپٹی لائبریرین جموں و کشمیر یونیورسٹی لائبریری سری نگر (کشمیر)، کو کشمیری اردو لغت کی تدوین کے سلسلے میں استفسارات کا جواب دیا گیا۔

جناب سید علی عباس موسوی معتمد استقبالیہ تیاری کمیٹی یوم انیس (حسینیہ منڈی میر عالم حیدرآباد) کو ادارہ کی طرف سے ادیبوں کے پتوں کی فہرست فراہم کی گئی۔

ادارہ کی طرف سے بزم اردو کوہیاد ناگا لینڈ کے سکریٹری جناب ابراہیم الدین انصاری حبیب لکچرار شعبہ زوالوجی کی خواہش پر کتابیں اور رسائل تحفۃً روانہ کی گئیں۔

جناب ڈاکٹر گیان چند جین پروفیسر و صدر شعبہ اردو جموں و کشمیر یونیورسٹی جموں ڈویژن کو اردو کے مختلف ادبی رسائل کے پتوں سے مطلع کیا گیا۔

ڈاکٹر خلیق انجم صاحب لکچرار شعبہ اردو کروڑی مل کالج دہلی یونیورسٹی کو درگاہ قلی خاں کی مرقع دہلی کے بارے میں استفسارات کا جواب دیا گیا۔

ڈاکٹر وائی، ڈی، اہرجہ ہیڈ انسٹیٹیوٹ آف پوسٹ گریجویٹ (ایوننگ)، اسٹڈیز دہلی یونیورسٹی کو قدیم مخطوطات اور ان کے بارے میں معلومات فراہم کی گئیں۔

ادارے کا مہمان خانہ

ادارے کی اپنی تعمیر شدہ عمارت "ایوان اردو" میں دو کمروں اور ایک ورانڈے پر مشتمل ایک مہمان خانہ ہے جس میں متحدہ ہند کی مسلمہ چودہ زبانوں میں تحقیقاتی کام کرنے والے ریسرچ اسکالر، ادیب، شاعر اور صحافی ایک ہفتہ قبل معتمد ادارہ کو مطلع کر کے اور اجازت ملنے پر مقررہ تاریخ اور وقت سے قیام کر سکتے ہیں ریسرچ اسکالروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے شعبے کے صدر کی توثیقی تحریر کے ساتھ قیام کیلئے درخواست بھیجائیں۔ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے لئے تعارفی مکتوب کا درخواست کے ساتھ ملنا ضروری ہے۔ مہمان خانے میں صرف چار روز قیام کیا جا سکتا ہے۔ اگر مزید ضرورت ہو تو صرف تین روز کی اجازت دی جا سکے گی۔ مہمانوں سے یومیہ مقررہ شرح پر کرایہ لیا جاتا ہے جس کے بارے میں مراسلت ضروری ہے۔ ایوانِ اردو کا مہمان خانہ ہند و پاک کی ادبی اور تہذیبی اداروں کی تاریخ میں اپنے وجود کے صحت مند پس منظر کے تعلق سے اوّلیت اور اہمیت کا حامل ہے یہاں قیام کی سہولتیں مہیا ہیں۔ مہمان خانہ ایوانِ اردو سے ملحقہ عقبی حصے میں واقع ہے۔

اس سال مہاراشٹرا یونیورسٹی کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے ریسرچ اسکالر جناب پروفیسر نور السعید اختر معرفت مرا ٹھواڑہ کالج، چپلون (مہاراشٹرا) نے ۱۶ اکتوبر تا ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۵ء پانچ یوم ایوانِ اردو کے مہمان خانے میں قیام کیا۔

میوزیم ایوانِ اردو

ڈاکٹر زور نے ادارۂ ادبیاتِ اردو قائم کر کے نہ صرف اردو زبان کی ناقابلِ فراموش خدمت انجام دی ہے بلکہ دکن کے تاریخی و ثقافتی آثار کے تحفظ و نگہداشت کا انتظام کر کے آئندہ نسلوں کو اپنے ماضی سے روشناس ہونے کے مواقع فراہم کر دیئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ایوانِ اردو کا میوزیم دکن کی تاریخ و آثار کا ایک اہم مرکز ہے۔ جہاں شاہانِ سلف کے اصل فرامین، قدیم سکے اسلحہ، ظروف، رنگ کاری کے نمونے، قلمی و عکسی تصاویر، خطاطی کے نمونے، مشاہیر ہند و دکن کے اصل مکتوبات اور نادر مخطوطات وغیرہ کا ذخیرہ موجود ہے۔

میوزیم کی نادر اشیا میں آئے دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس سال میوزیم کے سرپرست نواب عنایت جنگ بہادر نے کئی نادر اشیا عنایت فرمائی ہیں۔ جن میں دکنی خوشنویسوں کے قطعات، قدیم تیر و کمان، وصلی۔ واسطی قلم گھوڑے کا نقلی نیچہ، چلم، جست کا کٹورہ مع سرپوش، جست کا لوٹا مع تھالی، وغیرہ داخل ہیں۔

جناب لچھمی نارائن صاحب سکینہ والا جاہی نے بھی ایک نادر قطعہ عطا فرمایا ہے۔

ہماری کوشش یہ ہے کہ ایسے تمام دکنی آثار جن کا تحفظ انفرادی طور پر ممکن نہیں ہے۔ ایوانِ اردو کے میوزیم میں جمع ہو جائیں تاکہ محققین تاریخ و آثار ان سے استفادہ کر سکیں اور آنے والی نسلیں اپنے اسلاف کے کارناموں اور شاندار ماضی سے واقف ہوں۔

میر سراج الدین علی خان
معتمد اعزازی میوزیم

اردو امتحانات ادارۂ ادبیاتِ اردو

گذشتہ کئی سال سے ادارہ کے اردو امتحانات اردو دانی، اردو زباں دانی، اردو عالم، اردو فاضل شعبہ اردو امتحانات کی مجلسِ مشاورت کے فیصلوں کے مطابق سال میں دو بار جون اور ڈسمبر میں اضلاع کے علاوہ شہر حیدرآباد کے مختلف مرکزوں پر منعقد ہوا کرتے ہیں جن میں اعلیٰ تعلیم کے خواہشمند اصحاب کے علاوہ جیل کے قیدی بھی بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ .....

ادارے کے امتحان "اردو عالم" کی شہرت اور مقبولیت گذشتہ چند سالوں سے دہ چند ہوگئی ہے۔ ایسے طلباء و طالبات جو میٹرک یا اس کے مماثل امتحانات میں شرکت کا بار نہیں اٹھا سکتے یا پھر کسی وجہ سے شرکت کے بعد ناکامی کا منہ دیکھنا ہوتا ہے وہ بجائے مایوس ہونے کے "ایوانِ اردو" کا رخ کرتے ہیں اور ادارے کے امتحان "اردو عالم" میں شرکت کی درخواست دیتے ہیں۔

"اردو عالم" کے کامیاب امید واروں کو جامعہ اردو علی گڈھ کے امتحان "ادیب کامل" میں داخلہ مل جاتا ہے جس کا مقام علی گڈھ یونیورسٹی میں انٹر کے برابر ہے۔ اس کے بعد طلباء یا تو علی گڈھ یونیورسٹی، جامعہ اردو یا پھر عثمانیہ یونیورسٹی کے کورس سے فائدہ اٹھاکر دو تین سال کے عرصے میں "بی۔ او۔ ال" یا اردو پنڈت کامیاب ہوجاتے ہیں اور پھر اگر وہ چاہیں تو ایم۔ اے میں داخل ہوکر یا پھر انگریزی کا امتحان دیکر بی۔ اے بھی ہوسکتے ہیں یا ملازمت اختیار کرکے اردو درس و تدریس کا کام آغاز کرسکتے ہیں۔

ادارے کے امتحانات کے اس پس منظر کی وضاحت کے بعد ۱۹۶۵ء کے جون اور ڈسمبر کی میقاتوں میں شرکت کرکے کامیاب ہونے والے امیدواروں کی ایک مکمل فہرست درج کرتے ہیں۔ (ادارہ)

نتائج اردو امتحانات ادارۂ ادبیاتِ اردو بابتہ جون ۱۹۶۵ء

اردو دانی

رول نمبر، محمد عبدالمقیت

جملہ شرکاء میں اول مرکز نارائن کھیڑ

مرکز بیدر :-

کامیاب بہ امتیاز

۲۰۔ غلام محمود

کامیاب

۱۔ محمد امام الدین

۲۔ شہناز بیگم

۴۔ احمد محی الدین

۵۔ سید جہانگیر

۳۲۔ حمید خان

۳۴۔ یوسف علی خان

مرکز نارائن کھیڑ

کامیاب بہ امتیاز

۸۔ محمد عبداللطیف

مرکز نظام آباد

کامیاب بہ امتیاز

۲۶۔ حمیدہ خان

کامیاب

۱۲۔ سید شوکت علی

۲۱۔ عبدالمنان خان

۲۲۔ محمد عبدالمقیت

۲۳۔ محمد عبدالوحید

۲۴۔ محمد عثمان
۲۷۔ محمد عبدالمقتدر
۲۹۔ سلیم النساء بیگم
۳۰۔ صالحہ بیگم
۳۱۔ عبدالرب

اُردو دانی:۔

مرکز محبوب نگر

۱۳۔ محمد برہان کامیاب
۱۴۔ محمد جعفر "
۱۵۔ محمد عبدالنعیم "
۱۶۔ محمد فاروق "
۱۷۔ محمد اسمعیل "
۱۸۔ محمد محمود علی "
۱۹۔ عبدالرؤف "

اردو زباندانی:۔

مرکز بلدہ

۲۔ محمد طاہر دوم
۳۔ محمد عبدالحفیظ دوم
۱۹۔ محمد رحمت اللہ سوم
۲۰۔ سید طاہر محی الدین سوم
۲۱۔ محمد یوسف دوم

مرکز نارائن کھیڑ

۶۔ سید عبداللطیف دوم
۷۔ محمد عبدالغفور سوم
۹۔ محمد مختار حسین دوم
۱۰۔ محمد عبدالقدیر دوم
۱۱۔ محمد عبدالخالق سوم

۱۲۔ سید جلال الدین حیدری دوم
۱۳۔ محمد محبوب علی دوم
۱۴۔ سیدہ رفیعہ بانو دوم
۱۵۔ محمد عبدالوحید دوم

مرکز نظام آباد

۱۷۔ ساجدہ بیگم سوم
۱۸۔ حافظ سید ریاض علی سوم

اُردو عالم:۔

۱۴۴۔ محمد ابراہیم کل شہر کاریب اوّل
(مرکز محبوب نگر)

مرکز بلدہ

۱۔ ابو محمد ناصر الدین صدیقی سوم
۲۔ محمد ابراہیم دوم
۳۔ چاند سلطانہ دوم
۴۔ میر حافظ علی باقری دوم
۵۔ محمد حفیظ خان دوم
۶۔ محمد حیدر علی خاں سوم
۷۔ سید محسن دوم
۹۔ سید رشید احمد دوم
۱۴۔ تاج سلطانہ سوم
۱۵۔ اختر النساء بیگم سوم
۱۶۔ خواجہ یوسف معین الدین احمد سوم
۱۷۔ خورشید سلطانہ سوم
۱۸۔ محمد صالح جمال سوم
۱۹۔ محمد شریف الدین حسین سوم
۲۰۔ کاظمہ دوم
۲۱۔ سید منظور علی سوم
۲۲۔ ابوالاثر عبدالحفیظ سوم

۲۳۔ محمد ظہیر الدین سوم
۲۴۔ بشیر النساء بیگم سوم
۲۵۔ یوسف بیگم دوم
۲۶۔ حافظ سید ثناء اللہ سوم
۲۷۔ تاج سلطانہ دوم
۲۸۔ سعیدہ افتخار دوم
۳۰۔ محمد احمد الدین خان سوم
۳۱۔ محمد عبدالرحمن خان سوم
۳۲۔ انور النساء بیگم دوم
۳۳۔ ساجد جمیل سوم
۳۵۔ سید اسمعیل حسینی دوم
۳۶۔ بیجاج بیگم سوم
۳۷۔ میر محبوب علی سوم
۳۸۔ محمد قطب الدین سوم
۳۹۔ محمد حمایت علی دوم
۴۰۔ حسیبہ کوثر دوم
۴۲۔ سید سعید الدین احمد دوم
۴۳۔ سیدہ امۃ الجلیل سوم
۴۴۔ خواجہ لطیف احمد دوم
۴۸۔ سعدیہ سروری سوم
۴۹۔ محمد عارف الدین / شیخ احمد قادری سوم
۵۲۔ محمد عبدالسلام دوم
۵۶۔ محمد بلال سوم
۱۰۲۔ قدیر احمد دوم
۱۰۳۔ زیب کریم دوم
۱۰۴۔ محمد احمد اللہ سوم
۱۰۵۔ حبیب خاں سوم
۱۰۶۔ کمال النساء نہری سوم

۱۰۷۔ فضل احمد	دوم
۱۰۹۔ سید ابراہیم علی	سوم
۱۱۱۔ سید محمد اسمٰعیل	سوم
۱۱۳۔ میر امداد علی خان	دوم
۱۱۵۔ میر سعید اظہر	سوم
۱۱۸۔ محبوب خان	دوم
۱۲۰۔ محمد رحمت اللہ	سوم
۱۲۱۔ محمد صابر	سوم
۱۲۳۔ کے محمد علی	سوم
۱۲۵۔ محمد جلال البین اکبر	دوم
۱۲۶۔ طاہرہ بیگم	سوم
۱۲۷۔ ممتاز جہاں	دوم
۱۲۹۔ مظہر النساء	دوم
۱۳۱۔ افضل بیگم	سوم
۱۳۴۔ رضیہ جبیں	سوم
۱۳۶۔ اقبال بیگم	سوم
۱۳۱۔ محمد حامد علی	سوم
۱۴۱۔ حافظ محمد عبداللہ	سوم
۱۴۲۔ محمد عبداللطیف	سوم
۱۴۸۔ محمد خواجہ ابوالحسن	دوم
۱۴۹۔ قاریہ طیبہ بیگم	سوم
۱۵۱۔ قاریہ احمدی	دوم
۱۵۲۔ حنیفہ بیگم	سوم
۱۵۳۔ سید جمیل احمد	سوم

مرکز محبوب نگر

۸۸۔ محمد غوث سوز	اول
۹۰۔ محمد جہانگیر	دوم
۹۱۔ تاج احمد خان	سوم
۹۳۔ محمد عبدالسلام	دوم
۹۴۔ محمد سردار علی	دوم
۹۵۔ ٹی۔ راجیا	دوم
۹۶۔ ڈی۔ بالیا	دوم
۹۷۔ وینکٹیشور راؤ	اول
۹۸۔ بی۔ سرینواس لو	دوم
۹۹۔ سری دھر راؤ	اول
۱۴۵۔ محمد عبدالغفار	دوم
۱۴۶۔ محمد لیسین	دوم
۱۵۴۔ قدرت اللہ خان	دوم
۱۵۵۔ محمد احمد اللہ خان	دوم
۱۵۶۔ محمد محبوب علی	دوم
۱۵۷۔ محمد ذاکر حسین انصاری	دوم

مرکز نارائن کھیڑ

۵۷۔ میر غلام محمد انصاری	دوم
۵۸۔ شیخ بایزید	دوم
۶۱۔ میر بہاء الدین سلیم	دوم
۶۲۔ محمد عبدالحبیب	اول
۶۳۔ مرزا انور علی بیگ	سوم
۶۴۔ جمیل احمد خان	دوم
۶۵۔ محمد یونس قریشی	دوم
۶۶۔ محمد عبدالرافع	دوم
۶۷۔ محمد عبدالحمید	دوم
۶۸۔ محمد عبدالسلیم	دوم
۶۹۔ میر احمد علی	دوم
۷۰۔ میر جواد علی	دوم
۷۱۔ احمد عبدالغنی	دوم

مرکز نظام آباد

۷۶۔ زیب النساء بیگم	سوم
۷۷۔ صاحبی بیگم	سوم
۷۸۔ سلیم النساء بیگم	سوم
۷۹۔ قادری بیگم	دوم
۸۰۔ وقار النساء بیگم	سوم
۸۱۔ شمیم آرا بیگم	دوم
۸۲۔ محمد عبدالوہاب	سوم
۸۴۔ عبدالسلام خان	دوم

معتمد اعزازی

اردو امتحانات ادارہ

نتائج اردو امتحانات بابتہ دسمبر ۱۹۶۵ء

بلحاظ رول نمبر

۱۔ مرکز بلدہ :۔

رول نمبر۔	اردو دانی	
۲۔	رام چندر	کامیاب
۷۵۔	محمد لطیف الدین	〃
۷۷۔	محمد عبدالرشید	〃
۷۔	سبحانی بیگم	〃
۴۲۔	شمیم سلطانہ	〃
۴۴۔	ناہید سلطانہ	〃

۲۔ مرکز جائس ضلع رائے بریلی

۱۰۔	ممتاز جہاں بیگم	کامیاب بالامتیاز
۱۱۔	آل سیدہ	کامیاب
۱۲۔	ہشانہ خاتون	

۳۔ مرکز جونیر سرٹیفائیڈ اسکول

۱۳۔	محمد اسمٰعیل	کامیاب
۱۴۔	سید عبدالحمید	〃
۱۶۔	سالم	〃
۱۹۔	فتح محمد	〃
۲۱۔	یوسف علی	〃
۲۲۔	نارائن	〃
۲۳۔	علیم الدین	〃
۲۵۔	ایوب بن احمد	〃
۲۷۔	عبدالجبار	〃
۲۹۔	پاشا	〃
۳۰۔	سید جعفر	کامیاب
۳۱۔	عبدالرؤف	〃
۳۲۔	بابو خان	〃
۳۳۔	محمد اختر	〃
۳۴۔	بابو	〃
۳۵۔	محمد صابر	〃
۳۶۔	عبدالغفار	〃
۳۷۔	محمد یوسف	〃
۳۸۔	برہان الدین	〃
۳۹۔	رامچندر	〃
۴۰۔	محمد رفیق	〃
۴۱۔	عبدالرحیم	〃
۴۲۔	خواجہ معین الدین	〃
۴۴	پربھاشنکر	〃

۴۔ مرکز سنٹرل جیل

		کامیاب بالامتیاز
۴۵۔	محمد معین الدین	〃
۴۶۔	سید احمد	〃
۴۷۔	عبدالمجید خان	〃
۴۸۔	واسدیو ریڈی	〃
۵۰۔	حاجی حسین	〃
۵۱۔	محمد خواجہ	〃
۵۲۔	بدیع الدین	〃
۵۳۔	سید یوسف علی	کامیاب
۵۴۔	ملک احمد علی خان	〃
۵۵۔	محمد غوث	〃
۵۶۔	گھرٹوشاہ	〃
۵۷۔	غلام دستگیر	〃
۵۸۔	چاند پٹیل	〃
۵۹۔	محمد عبدالواحد	〃
۶۰۔	جی۔ نرسلو	〃
۶۱۔	کے۔ راملو	〃
۶۲۔	محمد بھرو	〃
۶۳۔	سی۔ بالریڈی	〃
۶۴۔	قلندر خاں	〃
۶۷۔	بڑے صاحب	〃
۶۸۔	محمد حسین	〃
۷۰۔	وی۔ راجلو	〃
۷۹۔	چاند میاں	〃
۹۹۔	ایم۔ اپائی	〃

امتحان اردو زباندانی

۱۔ مرکز بلدہ :۔

۳۔	محمد فہیم الدین	دوم
۵۔	علی بن صالح	سوم
۶۔	معین الدین	سوم

٢۔ مرکز جائس ضلع رائے بریلی

٩۔ محمد رفیق — سوم
١٠۔ عمرانہ بیگم — دوم
١١۔ احمدیہ خاتون — سوم
١٢۔ رضوانہ بیگم — دوم
١٥۔ بیگم جہاں — سوم

٣۔ سنٹرل جیل

٢٤۔ معین الدین — دوم
٢٥۔ وریا — اوّل
٢٧۔ عبدالوحید چودھری — دوم
٢٨۔ سید عزیز احمد — اوّل

امتحانِ اردو عالم

مرکز بلدہ

١۔ مختار حسین — دوم
٢۔ محمد امیر الدین — دوم
٥۔ سید محمد مہدی رضوی — دوم
٦۔ میر حسن علی — دوم
٨۔ سید احمد — دوم
٩۔ صلاح الدین شجاعی — اوّل
١٣۔ پی۔ عبدالوہاب — دوم
١٤۔ سید نصرت احمد علی خان — دوم
١٧۔ صاحبزادہ میر احمد علی خان — دوم
١٨۔ محمد ابراہیم — دوم
١٩۔ عبدالرحمٰن خان — دوم
٢٠۔ میر ابراہیم شریف — سوم
٢٢۔ محمد طاہر خان — سوم
٢٣۔ محمد یوسف — سوم
٢٧۔ محمد فضل الرحمٰن عثمانی — دوم
٢٩۔ خواجہ جبیر الدین — سوم
٣١۔ عاصف احمد — دوم
٣٣۔ محمد عزیز الدین — سوم
٣٦۔ میر محمد علی — دوم
٣٩۔ غلام محبوب — دوم
٤٠۔ محمد عثمان علی خان — دوم
٤١۔ سید ضمیر حیدر رضوی — دوم
٤٢۔ احمد سراج الحق — دوم
٤٣۔ سید حمید الدین — دوم
٤٦۔ محمد احمد علی مظفری — دوم
٤٨۔ عائشہ بانو — سوم
٤٩۔ مہدی بیگم موسوی — دوم
٥١۔ بتول بیگم — دوم
٥٢۔ راشدہ انیس — دوم
٥٥۔ سعدیہ بیگم — دوم
٥٦۔ رشیدہ عزیز — دوم
٥٨۔ فوزیہ بیگم — سوم
٦١۔ نعمت خاتون — اوّل
٦٢۔ شاہانہ خاتون — دوم
٦٤۔ ذکیہ سلطانہ — سوم
٦٥۔ عائشہ بیگم — دوم

٢۔ مرکز جائس ضلع رائے بریلی

٧٠۔ النوری بیگم صدیقی — سوم
٧١۔ پروینہ خاتون — دوم
٧٢۔ قیصر جہاں — سوم
٧٣۔ زرینہ خاتون — سوم

بقیہ: مصروفیات ادارہ
صفحہ ٢٤ سے آگے

چہارشنبہ ٢٢ر دسمبر ١١ بجے صبح،

آقائی بہمن خان آہن سر قنصل دولت شہنشاہی ایران مقیم بمبئی نے اپنے اسٹاف کے ساتھ ایوانِ اردو کے تمام شعبوں کا تفصیلی طور پر معائنہ کیا۔ آقائی حسین ضابط، معتمد انجمن ایرانیان حیدرآباد اور آقائی فرخ شیرازی بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ محمد جمال الدین صاحب مہتمم ادارہ اور وقار خلیل نے ادارہ کی سیر کرائی۔ آقائی بہمن نے فارسی ادبیات کے کتب و رسائل ادارہ کو تحفتہً بھجوانے کا وعدہ کیا۔

ہفتہ ٢٥ر دسمبر۔

ادارہ کے اُردو امتحانات حیدرآباد کے مراکز انوار العلوم کالج، سنٹرل جیل اور جونیئر سرٹیفکیٹ اسکول کے علاوہ اضلاع محبوب نگر اور اُتر پردیش کے جائس ضلع رائے بریلی میں ایک ساتھ تین دن کے لئے منعقد ہوئے۔ مرکز انوار العلوم کالج پر جناب محمد اکبر الدین صدیقی، مولوی غلام رسول، مولوی عارف الدین حسن نے نگرانی فرمائی۔ سنٹرل جیل کے مرکز کی نگرانی جناب محمد منظور احمد نے کی اور جونیئر اسکول کے نگران بشیر انور صاحب تھے۔ مرکز محبوب نگر پر ظہیر الدین صاحب اور جائس مرکز کے صدر نگران کمار طیب انصاری تھے۔

اتوار ٢٦ر دسمبر

ہندی کے مشہور شاعر جناب دولی چند "ششی"، ہندی ماہنامہ "اگروالی سماج" کے ایڈیٹر نے ایوانِ اُردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآباد ۴ (اے۔پی)

تختہ آمد و خرچ برائے سال یکم اپریل ۱۹۶۴ء لغایتہ ۳۱ مارچ ۱۹۶۵ء

ابواب جمع	روپے	پیسے	روپے	پیسے
سلک افتتاحی نقد اور بنک				
ا۔ نقد	۱,۳۷۲	۱۷		
ب۔ " بہ کرنٹ اکاؤنٹ اسٹیٹ	۴,۸۲۰	۶۱		
بنک آف حیدرآباد صدر دفتر				
ج۔ اسپیشل سیونگس بنک اکاؤنٹ				
بہ کنرا بنک لمیٹڈ۔ حیدرآباد				
(۱) ادارہ اکاؤنٹ ۱۹۹۔۰۳				
(۲) سب رس " ۱,۰۸۴۔۵۲	۱,۲۵۳	۵۵		
د۔ کلکشن اکاؤنٹ رگھوناتھ مل بنک				
لمیٹڈ ضم شدہ بہ کنرا بنک				
(ادارہ اس رقم کو حاصل نہیں کرسکتا)	۱۸۱	۵۹		
ڈ۔ فکسڈ ڈپازٹ بہ اسٹیٹ بنک حیدرآباد صدر دفتر	۵,۴۰۸	۰۰	۱۳,۰۳۹	۹۲
آمد از مطبوعات ادارہ			۱,۹۳۲	۴
" از ماہنامہ سب رس			۵۹۸	۴۷
" از کارب باغ			۱۰۷	۱۴
امداد از حکومت آندھرا پردیش				
(۱) برائے عام کاروبار ادارہ	۶,۰۰۰			
(۲) جلسۂ یوم محمد قلی قطب شاہ				
الف۔ بابت ۱۹۶۳-۶۴ ۵۰۰۔۰۰				
ب۔ بابت ۱۹۶۴-۶۵ ۵۰۰۔۰۰	۱,۰۰۰		۷,۰۰۰	۰۰
کرایہ اور صرفہ بجلی وصول از آزاد انسٹی ٹیوٹ				
ا۔ بابتہ کرایہ	۱,۲۰۰	-		
ب۔ " بجلی	۵۰	-	۱,۲۵۰	--
منافع از بنکس اکاؤنٹس				
منافع از سیونگس بنک			۳۷	۳۵
آمد از اردو امتحانات بابتہ فیس			۱,۶۵۸	۵۰

ابواب خرچ	روپے	پیسے	روپے	پیسے
برائے اخراجات اشاعت کتب			۱,۲۵۳	۱۳
خریدی کتب برائے فروخت				
معاوضہ مصنفین			۶۸۰	۰۰
اخراجات اشاعت ماہنامہ سب رس			۳,۳۷۰	۶۱
محصول اراضی کارب باغ			۲۲	۴۹
اخراجات کتب خانہ				
(۱) خریدی کتب و رسائل	۶۶	۰۰		
(۲) جلد بندی " " "	۱۰۰	۰۰		
(۳) صادر و متفرق اخراجات	۱۴	۸۵		
(۴) تنخواہ عملہ کتب خانہ	۹۵۰	۰۰		
(۵) خریدی فرنیچر	۱۹۰	۰۰	۱,۳۲۰	۸۵
اخراجات میوزیم	۰	۰	۱	۵۰
کلچرل مصروفیات				
(۱) اخراجات برائے ادبی و کلچرل	۱۰۸	۵۱		
مصروفیات لشمول رقم عطیہ مبلغ ۵۰ روپے				
(۲) اخراجات یوم محمد قلی قطب شاہ	۷۴۳	۶۴	۸۵۲	۱۵
اخراجات دفتر				
(۱) تنخواہ عملہ دفتر	۴,۳۳۰	۵۰		
(۲) ٹیلیفون۔ بجلی اور پانی	۱,۰۱۲	۴۵		
(۳) سامان طباعت و ڈاک خرچ	۶۷	۸۲		
(۴) متفرق اخراجات	۲۶۹	۷	۵,۶۷۹	۸۴
فیس تنقیح حسابات			۱۰۰	۰۰
اخراجات اردو امتحانات			۹۱۲	۰۰
بنک کمیشن اور چارجز			۷	۹۰
قرضے اور پیشگی				
قرض جو آزاد انسٹیٹیوٹ [illegible]			۴۹۹	۰۰

عطیات				
ا۔ برائے یوم محمد قلی قطب شاہ	۲۵۱	۰۰		
ب۔ " " شادوسا	۱۴۹	۰۳	۴۰۰	۰۳
متفرق آمدنی				
ا۔ جرمانے اور متفرقات	۳۱	۰۵		
ب۔ واپس وصول از ڈیس وغیرہ	۲	۰۰	۳۳	۰۵
قرض اور پیشگی رقوم				
(۱) قرض واپس وصول از آزاد انسٹی ٹیوٹ	۱،۶۰۰	۰۰		
قرض جو حاصل کیا گیا				
ا۔ از آزاد انسٹی ٹیوٹ ... ۴۹۹۔۰۰ (بطور عمل جمع و خرچ)				
ب۔ از منتظمین جشن یوم محمد قلی ۹۳۔۱۰۶ قطب شاہ	۶۰۵	۹۳	۲،۲۰۵	۹۳
پیشگی برائے اخراجات جو واپس وصول ہوئے				
(۱) برائے اشاعت ماہنامہ سب رس (اپریل ۱۹۶۳ء کی اشاعت)	۱۰۰۰	۰۰		
(۲) برائے اخراجات یوم قلی قطب شاہ (بطور عمل جمع و خرچ)	۳۰۰	۰۰	۴۰۰	۰۰
صدر میزان	۔	۔	۱۸،۶۸۲	۳۳

پیشگی برائے اخراجات				
(۱) برائے اشاعت ماہنامہ سب رس (اشاعت مارچ و اپریل ۱۹۶۵ء)	۲۲۷	۸۵		
(۲) برائے اخراجات یوم محمد قلی قطب شاہ (بطور عمل جمع و خرچ)	۳۰۰	۰۰	۵۲۷	۸۵
سلک اختتامی نقد و بنک				
(الف) نقد	۱،۳۳۰	۱۹		
(ب) کرنٹ اکاؤنٹ بہ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد صدر دفتر	۵،۹۹۵	۱۸		
(ج) اسپیشل سیونگس بنک اکاؤنٹ در کنرا بنک لمیٹڈ حیدرآباد				
(۱) ادارہ اکاؤنٹ ۱۸۸۔۲۸				
(۲) سب رس ۔ ۲۶۱۔۷۷	۴۴۰	۰۵		
(د) کلکشن اکاؤنٹ جی۔ رگھوناتھ مل بنک لمیٹڈ ضم شدہ بہ کنرا بنک (ادارہ اس رقم کو حاصل نہیں کر سکا)	۱۸۱	۵۹		
فکسڈ ڈپازٹ بہ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد۔ صدر دفتر	۵،۵۰۸	۰۰	۱۳،۴۵۵	۰۱
صدر میزان			۱۸،۶۸۲	۳۳

شرح دستخط
ایس۔ جی۔ دستگیر اینڈ کو
چارٹرڈ اکاؤنٹس، حیدرآباد

اِدارۂ ادبیاتِ اُردو کے صدر، نائب صدر، کارکن مجلسیں اور شعبے

ایوانِ اُردو بیک نظر

۱۵ جنوری ۱۹۳۱ء ادارۂ ادبیات اردو قائم ہوا

۸ جنوری ۱۹۴۱ء فراہمی زمین و عمارت کیلئے جدوجہد شروع کی گئی ۳۰ جنوری ۱۹۴۶ء حضرت خواجہ حسن نظامی نے عمارت کا نام "ایوانِ اردو" تجویز فرمایا۔

۲۷ جنوری ۱۹۵۵ء ادارے کی سلور جوبلی منائی گئی۔

۱۵ اپریل ۱۹۵۵ء مجلس انتظامی نے محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور سے ادارے کیلئے زمین عطا کرنے کی خواہش کی

۲ اکتوبر ۱۹۵۵ء بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور نے اس قطعۂ زمین کی ادارے کے نام بطور عطیہ رجسٹری کرادی

۲۵ اکتوبر ۱۹۵۵ء بہزاد دکنی نیاز الدین نظامی چیف ٹاؤن پلانر نے نقشہ مکمل کیا

۶ نومبر ۱۹۵۵ء حیدرآباد کے چیف منسٹر ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ نے سنگ بنیاد رکھا حکومت ہائے ہند، کشمیر، آندھرا پردیش کے علاوہ حضور نظام کے چیریٹی ٹرسٹ، سالار جنگ اسٹیٹ، نظام شوگر فیکٹری، سنگارینی کالریز اور عوامی عطیوں اور چندوں سے تقریباً پانچ سال کی مدت میں سوا لاکھ روپیوں کے صرفے سے اسکی تعمیر مکمل ہوئی

۱۲ مارچ ۱۹۶۱ء بخشی غلام محمد وزیر اعظم جموں و کشمیر نے اس ایوان کا افتتاح فرمایا۔ اور جناب بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش نے افتتاحی جلسے کی صدارت فرمائی۔

۱۔ ادارے کے صدور

نواب سر مہدی یار جنگ بہادر ۱۹۳۲ء تا ۱۹۴۷ء
نواب لیاقت جنگ بہادر ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۸ء
نواب زین یار جنگ بہادر ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۱ء
پروفیسر سید علی اکبر ۱۹۶۱ء

۲۔ ادارے کے معتمدین

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۱۹۳۱ء تا ۱۹۶۲ء
ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ ۱۹۶۲ء

۳۔ نائب صدور

نواب لیاقت جنگ بہادر
۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۷ء
نواب زین یار جنگ بہادر
۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۸ء
پروفیسر سید علی اکبر
۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۱ء
پروفیسر عبد المجید صدیقی ۱۹۵۸ء
جناب سید دلدار حسین صاحب ۱۹۶۱ء
رائے جانکی پرشاد صاحب ۱۹۶۲ء

۴۔ مجلس انتظامی

صدر: پروفیسر سید علی اکبر
نائب صدر: پروفیسر عبد المجید صدیقی
" " رائے جانکی پرشاد صاحب
اراکین: شری پی ین گپتا (آئی۔ اے۔ ایس)
جناب محمد علی عباسی صاحب (…)
جناب سید دلدار حسین صاحب انجینیر
جناب نواب عنایت جنگ بہادر
جناب محمد اکبر الدین صدیقی
معتمد: ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ

۵۔ مجلس اشاعت تاریخ و تمدن

صدر: پروفیسر عبد المجید صدیقی
اراکین: نواب عنایت جنگ بہادر
ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ معتمد عمومی
جناب آفاقی حسین ضابطہ
نواب عباس حسین
چراغ علی صاحب بکار
معتمد:
میر سراج الدین علی خان

۶۔ مجلس تعلیم بالغان و اردو امتحانات	۷۔ مجلس انتظامی سب رس	۸۔ مجلس نشر و اشاعت
صدر: پروفیسر سید علی اکبر ارکین: ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ معتمد عمومی پروفیسر سید محمد صاحب مولوی غلام رسول صاحب جناب نصیر الدین صاحب نظامی جناب محمد منظور احمد صاحب جناب محمد اکبر الدین صدیقی جناب کنول پرشاد صاحب کنول معتمد: جناب عارف الدین حسن صاحب	نگران: پروفیسر سید علی اکبر مولوی میر حسن صاحب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب جناب رمن راج سکسینہ صاحب جناب وقار خلیل صاحب معتمد: محمد اکبر الدین صدیقی صاحب	صدر: پروفیسر عبد المجید صدیقی ارکین: ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ معتمد عمومی پروفیسر ایم۔ اے۔ رحمن جناب میر عابد علی خان صاحب ایڈیٹر سیاست جناب میر سراج الدین علی خان صاحب جناب وقار خلیل صاحب جناب منظور احمد صاحب معتمد: محمد محمود حسین صاحب
۹۔ مجلس انتظامی کتب خانہ	**۱۰۔ مجلس ادب اطفال**	**۱۱۔ مجلس انتظامی اردو انسائیکلو پیڈیا**
ارکین: نواب عنایت جنگ بہادر پروفیسر عبد المجید صدیقی جناب خواجہ محمد احمد صاحب جناب مولوی غلام رسول صاحب معتمد: جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب	صدر: شری پی ہنمنت راؤ (یم۔ پی) ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ معتمد عمومی جناب دھرمیندر پرشاد صاحب جناب مرزا سرفراز علی بیگ صاحب جناب مراد علی صاحب طالع جناب وقار خلیل صاحب جناب محمد منظور احمد صاحب معتمد: ڈاکٹر محمد مصلح الدین صاحب	صدر: پروفیسر سید علی اکبر پروفیسر عبد المجید صدیقی ڈاکٹر محمد محسن محشر عابدی جناب خواجہ یوسف الدین صاحب رائے جانکی پرشاد صاحب ڈاکٹر حفیظ قتیل صاحب معتمد: ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ
عملہ دفتر ادارۂ ادبیات اردو	جناب میر سراج الدین علی خان صاحب آفس سکریٹری (اعزازی) جناب محمد جمال الدین صاحب منتظم ادارہ جناب ترصیص الدین صاحب القادری لائبریرین جناب وقار خلیل صاحب	جناب میرزا ... علی خان ... محمد ... محمد ...

۱۹۶۵ء میں ادارۂ ادبیاتِ اردو کی مطبوعات

نمبر	نام کتاب	مرتب/مصنف	موضوع	صفحات	سائز	قیمت
۱	تاریخِ ادب اردو (طبع پنجم)	ادارۂ ادبیاتِ اردو	تذکرہ	۲۰۰	1/16 کراؤن	۲=۰۰
۲	ادارہ سن ۱۹۶۴ء میں	کارکنان ادارہ	"	۶۴	1/8 کراؤن	۰=۵۵
۳	یادِ قلی	محمد اکبرالدین صدیقی	ادب و تذکرہ	۵۶	"	۱=۰۰
۴	سب رس (دوم محمد قلی نمبر)	مجلس مشاورت سب رس	"	"	"	۰=۵۰
۵	" (ادارہ نمبر)	" "	"	۶۴	"	۰=۵۰
۶	سافوکلی اور دوسرے ڈرامے	مرزا اظہر افسر	ڈرامے	۱۸۰	1/16 کراؤن	۲=۰۰

زیرِ طبع کتابیں

نمبر	نام کتاب	مرتب/مصنف	موضوع	صفحات	سائز	قیمت
۱	تاثیرِ نظامی (دارالسلام)	سید محی الدین (ایم۔ اے)	تاریخ	.	.	.
۲	تذکرہ قواعدِ ایوان اردو (جلد سوم)	میر سراج الدین علی خان	تذکرہ	.	.	.
۳	برف میں آگ	حامدی کاشمیری	افسانے	.	.	.
۴	فہرست کتب خانہ مطبوعات ادارہ (جلد چہارم)	محمد اکبرالدین صدیقی ایم۔ اے	تذکرہ	.	.	.
۵	؟ کلام	کنول پرشاد کنول	شعر			
۶	غزل در غزل	اوج یعقوبی	"			

فہرست کتب اور تازہ مطبوعات و دیگر کتابوں کے بارے میں لکھیے:۔
سب رس کتاب گھر۔ ایوان اردو۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد۔۴ (اے۔ پی) انڈیا
ایجنٹ:۔ ۱۔ مسرز رائٹرس ایمپوریم پرائیویٹ لمیٹڈ، سرفیروزشاہ مہتا روڈ۔ بمبئی۔ (دہلی۔ لکھنؤ۔ الہ آباد۔ کلکتہ
حیدرآباد کے دیگر تاجرانِ کتب سے بھی ادارہ کی تمام مطبوعات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

فہرستِ مطبوعاتِ ادارۂ ادبیاتِ اردو

بہ لحاظِ حروفِ تہجی

جنوبی ہند (حیدرآباد دکن) کے سب سے بڑے علمی وادبی مرکز "ادارۂ ادبیاتِ اردو" نے اپنے قیام ۱۹۳۱ء سے اب تک تقریباً تین سو تین (۳۰۳) کتابیں مختلف موضوعات پر شائع کی ہیں جن میں ادب۔ تحقیق۔ تنقید۔ تذکرہ۔ شاعری۔ افسانہ۔ تاریخ۔ کلچر۔ سائنس۔ ادب المقال۔ سوانح۔ رپورٹیں۔ ترجمے۔ دکنیات۔ غرض سبھی موضوعات شامل ہیں۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو نے خصوصاً دکنی کلچر اور تہذیب وادب کے نادر اور اہم گوشوں پر گرانقدر ادب پیش کیا ہے۔ اس کی کئی کتابیں ادب میں نہ صرف حوالے کی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ سنگِ میل قرار دی گئی ہیں۔ علمی، ادبی اور تحقیقاتی کام کرنے والوں کے نزدیک تو یہ مطبوعہ اوراق گرانقدر سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ادارے کی کئی ایک کتابیں اپنی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر سررشتۂ تعلیم کے نصاب میں شامل ہو گئی ہیں۔ ذیل میں اب تک شائع شدہ مطبوعات ادارہ کی ایک مکمل فہرست بلحاظ حروفِ تہجی شائع کی جا رہی ہے۔ جس کتاب پر یہ ⊛ علامت ہو اُسے خارج از اسٹاک سمجھا جائے۔ (ادارہ)

نمبر	نام کتاب	مصنف/مرتب	قیمت	نمبر	نام کتاب	مصنف/مرتب	قیمت
۱	آب دوز اور سرنگ	فیض محمد صدیقی	۷۵ پیسے	۹	اردو مثنوی کا ارتقاء ⊛	پروفیسر عبدالقادر سروری	۲۰.۰۰
۲	آبِ گہر بار شعر (مجلد)	بشیر النساء بیگم بشیر	۶.۰۰ روپے	۱۰	اردو میں سائنسی ادب	خواجہ حمیدالدین شاہد	۱۰.۵۰
۳	آریائی زبانیں ⊛	ڈاکٹر سید حشور وما	۱.۵۰	۱۱	ارمغانِ امجد	خواجہ حمیدالدین شاہد	۱۰.۰۰
۴	ادبی تحریریں (مجموعہ مضامین ڈاکٹر زور)	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	۲.۰۰	۱۲	ارمغانِ جذب	راگھویندر راؤ جذب	۱۰.۰۰
۵	اردو املا	مولوی غلام رسول	۰.۵۰	۱۳	ارمغانِ محمد قلی ۱۹۵۸ء	ادارہ	۰.۵۰
۶	اردو دانی کی پہلی کتاب	اظہر الدین	۰.۲۵	۱۴	اسلامی عدل گستری	عبدالحفیظ صدیقی	۱.۶۳
۷	اردو دانی کی دوسری کتاب	اظہر الدین	۰.۳۵	۱۵	اشوکِ اعظم	سیدہ مہدی جعفری	۰.۵۰
۸	اردو کی لاج	بشیر النساء بیگم بشیر	۰.۲۵	۱۶	اقبال کا تصورِ عشق	ڈاکٹر غلام عمر خاں	۱.۷۵

۱۷/۱	انوار	علی اختر	۲=۰۰	۳۸	ترجمان زندگی	سید علی منظور	۲=۵۰
۱۷/۲	ایمانِ سخن	پروفیسر سید محمد	۰=۷۵	۳۹	تعلیم کا مسئلہ	ڈاکٹر رضی الدین صدیقی	۱=۰۰
۱۸	باتیں	شجاع احمد قائد	۱=۰۰	۴۰	تماشائے اہلِ ہنر	رشید الحسن (ایم۔اے)	۱=۵۰
۱۹	بادۂ سخن	ڈاکٹر زور	۰=۷۵	۴۱	تنویرِ تخیل	نجم الدین المعی	۳=۵۰
۲۰	باغ و بہار (بیرالقرن)	ڈاکٹر زور	۲=۰۰	۴۲	ٹھنڈی بجلیاں	بھارت چند کھنہ	۲=۰۰
۲۱	بلاغت ⊛	ڈاکٹر کلیم اللہ حسینی	۰=۷۵	۴۳	ٹیگور اور اُسکی شاعری ⊛	مخدوم محی الدین	۲=۵۰
۲۲	بلقان	عبدالحفیظ صدیقی	۰=۷۵	۴۴	جب میں طالب علم تھا	شاہ غیاث	۰=۲۵
۲۳	بہمنی سلطنت	پروفیسر مجید صدیقی	۲=۵۰	۴۵	جیونٹی ⊛	ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ	۰=۷۵
۲۴	پانی کی کہانی	فیض محمد صدیقی	۰=۷۵	۴۶	حدیقۃ السلاطین (فارسی)	علی اصغر بلگرامی	۱۰=۰۰
۲۵/۱	پن چکی	مبارز الدین رفعت	۱=۰۰	۴۷	حرفِ شیریں	قاضی غلام محمد	۱=۵۰
۲۵/۲	پودوں کی کہانی ⊛	پروفیسر سعید الدین خان	۱=۰۰	۴۸	حیات بخشی بیگم	نصیر الدین ہاشمی	۰=۷۵
۲۶	تاریخ ادب اردو	ادارہ	۲=۰۰	۴۹	حیدرآباد	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	۰=۶۲
۲۷	تاریخ ادبیات عربی ⊛	سید ابوالفضل	۳=۰۰	۵۰	حیدرآباد فرخندہ بنیاد	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۲=۵۰
۲۸	تاریخ گولکنڈہ	منشی فیض الدین	۲=۵۰	۵۱	حیدرآباد کے بڑے لوگ	غلام پنجتن شمشاد	۲=۰۰
۲۹	تاریخ سیاسیات	پروفیسر مجید صدیقی	۳=۵۰	۵۲	خطابیات	ڈاکٹر رحیم الدین کمال	۱=۷۵
۳۰	تاریخ نانڈیڑ دکن	احمد علی بیگ چغتائی	۲=۰۰	۵۳	دادا بھائی نوروزجی	ظہیر الدین احمد	۰=۲۵
۳۱	تحفۃ الشعرا (افضل)	ڈاکٹر حفیظ قتیل	۳= .	۵۴	دار العلوم کے سپوت	حافظ محمد مظہر	۱=۰۰
۳۲	تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول ⊛	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۷=۰۰	۵۵	داستانِ ادب حیدرآباد	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۲=۵۰
۳۳	" " (جلد دوم) ⊛	" "	۷=۰۰	۵۶	دفتری معلومات	ظہیر الدین احمد	۰=۳۷
۳۴	" " (جلد سوم)	" "	۷=۰۰	۵۷	دکنی ہندو اور اردو	نصیر الدین ہاشمی	۳=۵۰
۳۵	" " (جلد چہارم)	" "	۷=۰۰	۵۸	دیوانِ ہاشمی بیجاپوری	ڈاکٹر حفیظ قتیل	۹=۰۰
۳۶	" " (پنجم)	" "	۷=۰۰	۵۹	رادھا اور رنگ محل	وزیر حسن دہلوی	۱=۵۰
۳۷	تذکرہ نوادر ایوان اردو (جلد اول)	" "	۷=۰۰	۶۰	راہرو اور کاروان	ڈاکٹر حفیظ قتیل	۲=۰۰

۶۱	رباعیات الہام	ڈاکٹر راگھونندن راج سکسینہ	۲.۵۰
۶۲	رسائل طیبہ	طیبہ بیگم	۳.۰۰
۶۳	رفیقِ اردوداں	مرزا عصمت اللہ بیگ	۳.۲۵
۶۴	رم جھم	سری کرشن سنہا	۱.۵۰
۶۵	رمزِ سخن (بہاری لال رمز)	ڈاکٹر زور	۱.۰۰
۶۶	روحِ غالب	"	۳.۰۰
۶۷	ریاضِ متشابہ	دلاور علی دانش	۵.۰۰
۶۸	زہریلے پودے	ڈاکٹر محمد عبدالسلام	۰.۷۵
۶۹	ساؤ ینیر ایوانِ اردو (انگریزی)	سید دلدار حسین	۲.۰۰
۷۰	سائنس کے کرشمے	میر حسن	۱.۰۰
۷۱	سانولی اور دوسرے ڈرامے	مرزا اظہر افسر	۲.۰۰
۷۱/۱	سب رس (امجد نمبر)	محمد اکبر الدین صدیقی (معتمد سب رس)	۱.۰۰
۷۲	" (بہادر شاہ ظفر نمبر)	" "	"
۷۳	" (ٹیگور نمبر)	" "	"
۷۴	" (زور نمبر باتصویر)	" "	۶.۰۰
۷۵	" (عزیز جنگ ولا نمبر)	" "	۰.۵۰
۷۶	" (یادگارِ قلی نمبر) (۶۶)	" "	۱.۰۰
۷۶/۱	سچ کا جادو	عبدالحبیب الحضرمی	۰.۵۰
۷۷	سراجِ سخن	پروفیسر عبدالقادر سروری	۱.۰۰
۷۸	سرسید احمد خان	ظہیر الدین احمد	۰.۲۵
۷۸/۱	سرگزشتِ ادارہ	خواجہ حمید الدین شاہد	۲.۰۰
۷۹	سرگزشتِ حاتم	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۲.۰۰
۸۰	سرگزشتِ غالب	"	۱.۰۰
۸۱	سروجنی نائیڈو	وزیر حسن دہلوی	۲.۰۰
۸۲	سنگِ گوہر	جلال الدین اشک	۰.۵۰

۸۳	سلسلہ سوانح سلاطینِ آصفی (باتصویر ۶ کتابچوں کا سیٹ)	سید مراد علی طالع	۲.۰۰
۸۴	سمندری عجائبات	احمد حسین نقوی	۱.۲۵
۸۵	سوغاتِ ادارہ ⊛	ادارہ	۱.۵۰
۸۶	شاد و اقبال ●	ڈاکٹر زور	۳.۰۰
۸۷	شعرائے عثمانیہ	معین قریشی و باقی صدیقی	۴.۰۰
۸۸	سیر گولکنڈہ	ڈاکٹر زور	۱.۰۰
۸۹	طالب و موہنی	"	۱.۵۰
۹۰	طبعیاتی کائنات	پروفیسر محمد علی خان	۰.۷۵
۹۱	عرب اور عربستان	جہاں بانو نقوی	۰.۷۵
۹۲	عروض	ڈاکٹر کلیم اللہ حسینی	۰.۷۵
۹۳	علم خانہ داری	محمودہ صدیقی	۱.۵۰
۹۴	عماد الملک	فیض محمد صدیقی	۰.۵۰
۹۵	فنِ تقریر	ادارہ	۱.۵۰
۹۶	فیضِ سخن ⊛	ڈاکٹر زور	۰.۷۵
۹۷	فہرستِ کتب خانہ مطبوعات (جلد اول)	مولوی غلام رسول و محمد اکبر الدین صدیقی	۳.۰۰
۹۷/۱	" " (جلد دوم)	محمد اکبر الدین صدیقی	۲.۷۵
۹۸	" " (جلد سوم)	" "	۲.۵۰
۹۹	قطب شاہی سلاطین اور آندھرا سنسکرتی (انگریزی)	ڈاکٹر زور	۱.۲۵
۱۰۰	قواعدِ اردو / امتحانات ادارہ	شعبہ اردو امتحانات	۰.۱۰

۱۰۱	قطب شاہی سلاطین اور آندھرا سنسکرتی (تلگو)	ڈاکٹر سلم راجو	۲٫۰۰	۱۲۱	معلم بالقان	سید زاہد حسین	۱٫۰۰
				۱۲۲	مکاتیب سلاطین	عباس علی خان	
۱۰۲	کاغذ کی ناؤ	میر محمد علی خان میکش	۱٫۵۰		قطب شاہیہ		
۱۰۳	کشمکش ثانی ⊗	شجاع احمد قائد	۰٫۷۵		بنام شاہان مغلیہ و		
۱۰۴	گلستہ الحقائق (جانم)	محمد اکبر الدین صدیقی	۲٫۰۰		ایران (فارسی)		
۱۰۵	کلیات غواصی	پروفیسر محمد بن عمر	۴٫۰۰	۱۲۳	مکتوبات شاد	ڈاکٹر زور	۳٫۰۰
۱۰۶	کیف و کم	یوسف ناظم	۳٫۰۰		(عظیم آبادی)		
۱۰۶/۱	کیف سخن	ڈاکٹر زور	۰٫۷۵	۱۲۴	من کی دنیا	رشید قریشی	۱٫۰۰
۱۰۷	گارساں دتاسی	"	۱٫۵۰	۱۲۵	مرقع سخن (جلد اول) ⊗	ڈاکٹر زور	۵٫۰۰
۱۰۸	گاندھی جی	خورشید احمد جامی	۰٫۷۵	۱۲۶	" " (جلد دوم)	"	۷٫۰۰
۱۰۹	گنج طلسم (دوآلہ)	ڈاکٹر زور	۱٫۵۰	۱۲۷	سلمان شاہی خاندان	محمد عبدالرحمن خان	۵٫۰۰
۱۱۰	لیلیٰ	عظیم النساء بیگم	۱٫۵۰	۱۲۸	مشاہیر قندھار دکن	محمد اکبر الدین صدیقی	۱٫۵۰
۱۱۱	مال والوں کی تاریخ	مراد علی طالع	۱٫۲۵	۱۲۹	مغربی تصانیف کے اردو تراجم ⊗	میر حسن	۱٫۵۰
۱۱۲	ماہ لقا اور دوسری نظمیں	عزیز احمد	۱٫۲۵				
۱۱۳	متاع سخن ⊗	ڈاکٹر زور	۰٫۷۵	۱۳۰	مقام غالب	مبارز الدین رفعت	۲٫۰۰
۱۱۴	مجموعہ نظم حالی	ادارہ	۱٫۷۵	۱۳۱	مقدمہ تاریخ دکن	پروفیسر عبدالمجید صدیقی	۱٫۷۵
۱۱۵	محبت کی چھاؤں	مرزا ظفر الحسن	۱٫۵۰	۱۳۲	مولانا ابوالکلام آزاد	وقار خلیل	۰٫۵۰
۱۱۶	محمد حسین آزاد	جہاں بانو نقوی	۲٫۵۰	۱۳۳	مہینوں کی کہانیاں	حبیب ابراہیم	۰٫۷۵
۱۱۷	محمد قلی کی جیون کہانی	وقار خلیل	۰٫۵۰	۱۳۴	میاں داد خان سیاح	ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی	۲٫۰۰
۱۱۸	مختار الملک سالار جنگ	فیض محمد صدیقی	۰٫۵۰	۱۳۵	میر محمد مومن	ڈاکٹر زور	۳٫۰۰
۱۱۹	مدراس میں اردو ⊗	نصیر الدین ہاشمی	۳٫۰۰	۱۳۶	نذر دکن	سکینہ بیگم	۱٫۵۰
۱۲۰	معانی سخن (انتخاب)	ڈاکٹر زور	۱٫۵۰	۱۳۷	نذر محمد قلی قطب شاہ	ڈاکٹر زور	۵٫۰۰
	(کلام محمد قلی قطب شاہ)	-		۱۳۸	نذر معانی	وقار خلیل	۱٫۰۰

۱۳۹	نذرِ دلی	جہاں بانو نقوی اور دیگر خواتین	۳:۵۰
۱۴۰/۱	نمود زندگی	سید علی منظور	۲:۰۰
۱۴۰/۲	نقدِ سخن ⊛	ڈاکٹر زور	۰:۷۵
۱۴۱	نیل کنول مسکائے	محمود حسین بدخشی	۲:۵۰
۱۴۲	ورڈسورتھ اور اس کی شاعری ⊛	میر حسن	۱:۵۰
۱۴۳	وہی	وزیر حسن دہلوی	۱:۵۰
۱۴۴	ہمارے پھول	پروفیسر محمد سعید الدین	۱:۰۰
۱۴۵	ہندوستانی تمدن	ڈاکٹر ایشور ٹوپا	۳:۷۵
۱۴۶	ہوش کے ناخن ⊛	میر حسن اور مخدوم محی الدین	-
۱۴۷	طیبہ	فضل الرحمٰن	۱:۰۰
۱۴۸	یادِ امجد	محمد اکبر الدین صدیقی	۲:۰۰
۱۴۹	یادِ معانی	"	۰:۷۵
۱۵۰	یادگارِ حسن سیمین	حمید الدین شاہد	۱:۰۰
۱۵۱	یادگارِ زور	محمد اکبر الدین صدیقی	۶:۰۰
۱۵۲	یادگارِ صفی اورنگ آبادی	حمید الدین شاہد	۱:۰۰
۱۵۳	یادگار محمد قلی قطب شاہ	ڈاکٹر زور	۰:۱۵
۱۵۴	یادگار عنبر الدین ہاشمی	محمد اکبر الدین صدیقی	۲:۰۰
۱۵۵	یورپ جنگ سے پہلے	پروفیسر ہارون خان شروانی	۳:۵۰
۱۵۶	ارسطو جاہ ⊛	پروفیسر عبدالمجید صدیقی	-

اِدارہ کی اہم مطبوعات

۱۔ تذکرۂ اُردو مخطوطات جلد سوم مرتبہ : ڈاکٹر زورؔ ۷ روپے
تذکرۂ اُردو مخطوطات جلد چہارم مرتبہ : ڈاکٹر زورؔ ۷ ״
تذکرۂ اُردو مخطوطات جلد پنجم مرتبہ : ڈاکٹر زورؔ ۷ ״

۲۔ فہرست مطبوعات کُتب خانہ ادارہ جلد اول مرتبہ : محمد اکبرالدین صدیقی، مولوی غلام رسُول ۳ ״
״ ״ ״ ״ جلد دوم مرتبہ : محمد اکبرالدین صدیقی ۲ ״ ۷۵ پیسے
״ ״ ״ ״ جلد سوم ״ ״ ۲ ״ ۵۰ ״

۳۔ حدیقۃ السلاطین (فارسی مکمل) ٹائپ کی طباعت ״ علی اصغر بلگرامی ۱۰ ״
۴۔ مقامِ غالب ״ سید مبارزالدین رفعت ۲ ״
۵۔ کلمۃ الحقایق (برہان الدین جانمؔ) ״ محمد اکبرالدین صدیقی ۲ ״
۶۔ دیوانِ ہاشمی (بیجاپوری) ״ ڈاکٹر حفیظ قتیلؔ ۶ ״
۷۔ کلیاتِ غواصی ״ محمد بن عمر (مرحوم) ۴ ״
۸۔ دیوانِ داؤد ״ ڈاکٹر خالدہ یوسف ۱ ״ ۵۰ ״
۹۔ دیوانِ عشق ״ محمد اکبرالدین صدیقی ۲ ״
۱۰۔ حرفِ شیریں (مزاحیہ نظموں کا مجموعہ) از پروفیسر قاضی غلام محمد شیرؔ زیدی ۱ ״ ۵۰ ״
۱۱۔ کیف و کم (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ) ״ یوسف ناظم ۲ ״
۱۲۔ تاریخ گولکنڈہ ״ پروفیسر عبدالمجید صدیقی ۷ ״
۱۳۔ یادگارِ زورؔ مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی ۶ ״
۱۴۔ سانولی (اور دوسرے ڈرامے) از مرزا ظفر افسر ۲ ״

ملنے کا پتہ

ایوانِ اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن ۴

(پروفیسر) سید علی اکبر ایڈیٹر، پرنٹر اینڈ پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد میں چھپوا کر ایوانِ اردو
خیریت آباد حیدرآباد ۴ سے شایع کیا۔

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء جلد ۲۹ شمارہ ۹

ستمبر ۱۹۶۶ء

ماہنامہ

سب رس

نگران

پروفیسر سید علی اکبر

(مجلس مشاورت)

میر حسن ڈاکٹر گوپی چند نارنگ رمن راج سکسینہ ڈاکٹر غلام عمر خاں

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

مہتمم — محمد جمال الدین

منتظم — وقار خلیل

زر سالانہ چھ روپے غیر ممالک سے دس روپے

ششماہی تین روپے فی پرچہ پچاس پیسے

مہتمم ادارہ ادبیات اردو کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات

اگست سے رسالہ کی اشاعت میں بڑی تاخیر ہوگئی۔ اس کا سبب مجلس انتظامی کے حکم سے رسالے کے انتظامی امور میں تبدیلیاں تھیں لیکن ستمبر میں جب مجلس انتظامی کا اجلاس منعقد ہوا اور اشاعت میں تاخیر کے اسباب کی چھان بین کی گئی تو ان کا ازالہ کر دیا گیا۔ اب حسب سابق رسالہ قارئین کی خدمت میں پابندی سے پہنچتا رہے گا۔ لیکن یہ پابندی نومبر ہی سے عمل میں آنے کا امکان ہے۔ کوشش کی جائے گی کہ نومبر کا پرچہ ۱۰ نومبر کو ڈاک کے حوالے ہو۔ اس تاخیر کیلئے ہم اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

پیش نظر رسالے میں علامہ اقبال کی داستان دکن کی دوسری اور آخری قسط شامل ہے۔ جناب ڈاکٹر محمد اسلام اور جناب سید امین الدین صاحب جلالی شاہجہاں پوری کے مضامین بھی طوالت کے باعث ہم قسطوں میں چھاپنے پر مجبور ہیں کوشش تو یہ ہوگی قسطیں بڑھنے نہ پائیں اور قارئین کو انتظار کی زحمت نہ ہو۔

ستمبر ادارہ ادبیات اردو، آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے بانی اور سب رس کے اولین نگران کے انتقال کا مہینہ ہے۔ اس سال ادارہ نے شایان شان طریقہ پر اپنے بانی کی یادمنائی اور چار روزہ کا مسلسل پروگرام تیار کیا جناب میر سراج الدین علی خاں صاحب ادارہ آفس سکریٹری کنوینر مقرر ہوئے۔ یوم زورؔ کی تقاریب کا آغاز ۲۳ ستمبر یوم جمعہ بعد نماز عصر مسجد افضل گنج میں ختم قرآن سے ہوا۔ ۲۴ کو ایوان اردو میں افتتاحی اجلاس عالی جناب نواب مہدی نواز جنگ بہادر سابق گورنر گجرات کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس کا افتتاح جناب ایل۔ این گپتا صاحب آئی۔ اے۔ ایس نے کیا۔ اس نمائش کی معتمدی کے فرائض جناب محمد عبدالوحید خانصاحب ناظم آثار قدیمہ نے انجام دئے۔ شام میں ادبی اجلاس منعقد ہوا۔ جس کی صدارت جناب حامد علی صاحب عباسی آئی، اے، ایس معتمد فینانس نے کی اس کی معتمدی جناب میر حسن صاحب کے تفویض تھی۔ رات میں جناب مخدوم محی الدین صاحب کی صدارت میں مشاعرہ تھا اور معتمدی کے فرائض محترمہ عائشہ رشاد نے انجام دئے۔ ۲۶ ستمبر کو رات میں قوالی کی محفل منعقد ہوئی۔ یہ پروگرام کا آخری جزء تھا۔

آئندہ شمارے میں یوم زورؔ کے اجلاسوں کی روئیدادیں اور تقاریر پیش ہوں گی۔ یہ شمارہ "ڈاکٹر زورؔ کی یاد میں" کے عنوان سے پیش کیا جائے گا۔

مسٹر محمود حسین
لکچرار فارسی شعبۂ تحقیق اردو
جامعہ میسور

بسلسلۂ گزشتہ

علامہ اقبالؒ کی داستانِ دکن

علامہ اقبالؔ کے سفرِ میسور کا محرک دراصل روضۂ سلطانی کی زیارت کی خواہش تھا چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

پیشتر رفتم کہ بوسم خاکِ او ⁂ تا شنیدم از مزارِ پاکِ او

اس کے سوا آپ کے کلام میں میسور سے متعلق اور کسی چیز کا ذکر نہیں ملتا۔ سفرِ میسور نے ایک طرف آپ کے افکار اور شاعری کو متاثر کیا اور دوسری طرف یہاں کی ثقافت پر گہرے نقوش چھوڑے۔ آپ کا شاہکار جاوید نامہ اسی سفر کا مرہونِ منت ہے۔ "فتوحاتِ مکیہ" رسالۂ غفران" اور طربیہ خداوندی کا سا ایک معراج نامہ لکھنے کا خیال اس سے پہلے بھی آپ کے ذہن میں موجود تھا لیکن سفرِ میسور کے بعد ہی آپ نے اسے عملی جامہ پہنایا اور دو سال کی مدت میں اسے تکمیل کو پہنچایا یہاں آپ نے سلطان شہید کے دار الخلافہ سرینگا پٹن کے آثار کو بچشم خود دیکھا اور اس تمثیل کے لئے آپ کو سلطان شہید کا عظیم الشان کردار مل گیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سفرِ میسور سے قبل آپ سلطان شہید اور ان کے حالات سے واقف نہیں تھے۔ تاہم — شنیدہ کی بود مانند دیدہ۔

جاوید نامہ کی قدر و قیمت اور رفعت خود علامہ کی نظر میں کیا تھی اور اس کی تحریر و تکمیل کب ہوئی۔ خود علامہ کی زبان سے سن لیجئے۔ لکھتے ہیں:—

"سلطان شہید پر میری نظم اس کتاب کا حصہ ہوگی جسے میں اپنی زندگی کا حاصل بنانا چاہتا ہوں"۔[۱]

"آخری نظم جاوید نامہ جس کے دو ہزار شعر ہوں گے ابھی ختم نہیں ہوئی، ممکن ہے مارچ تک ختم ہو جائے یہ ایک قسم کی "ڈیوائن کامیڈی" ہے اور مثنوی مولانا روم کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس کا دیباچہ بہت دلچسپ ہوگا اور اس میں غالباً ہند و ایران بلکہ تمام دنیائے اسلام کے لئے نئی باتیں ہوں گی"[۲]

"کتاب جاوید نامہ جو میں لکھ رہا تھا ختم ہو گئی ہے، آج کل کاتب کے حوالے کر دی جائے گی"[۳]

اس مثنوی کو علامہ اقبالؔ مصور بنانے کے خواہش مند تھے اور اس کا ترجمہ بھی کرانا چاہتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:—

۱؎ اقبال نامہ دوم صفحہ ۹۲ مکتوب مورخہ ۲۶ اگست ۱۹۲۹ء
۲؎ اقبال نامہ اول صفحہ ۲۱۲ مکتوب مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۳۱ء
۳؎ اقبال نامہ دوم صفحہ ۳۰۰

"اہم کام یہ ہے کہ جاوید نامہ کا تمام و کمال ترجمہ کیا جائے مترجم کا اس سے یورپ میں شہرت حاصل کر لینا یقینی امر ہے۔ اگر وہ ترجمے میں کامیاب ہو جائے اور اگر اس ترجمے کو کوئی عمدہ مصور مصور بھی بنا دے تو یورپ اور ایشیا میں مقبول تر ہو گا۔ اس کتاب میں بعض بالکل نئے تخیلات ہیں اور مصور کیلئے عمدہ مسالہ ہے"[1]

"میرے خیال میں میری کتابوں میں سے صرف جاوید نامہ ایک ایسی کتاب ہے جس پر مصور طبع آزمائی کرے تو دنیا میں نام پیدا کر سکتا ہے مگر اس کے لئے پوری مہارت فن کے علاوہ الہام الہٰی اور صرف کثیر کی ضرورت ہے"

"اور میں سمجھتا ہوں کہ جب یہ چیز ایسی شان کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی تو دنیا یقینی طور پر اس کو کاظمی سکول کے نام سے موسوم کرے گی۔ آپ محض مصوری میں اضافہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ دنیائے اسلام میں بحیثیت مصور اقبال ایک زبردست خدمت انجام دے رہے ہیں جو کہ قدرت شاید آپ ہی سے لینا چاہتی ہے۔ پوری مہارت فن کے بعد اگر آپ نے جاوید نامہ پر خامہ فرسائی کی تو ہمیشہ زندہ رہیں گے"[2]

مگر علامہ اقبال کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ ان بیانات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آپ جاوید نامہ کو اپنی زندگی کا ماحصل قرار دیتے تھے اور اس کے جن کرداروں اور احوال کا تصور آپ کے ذہن میں موجود تھا اس کی ترجمانی تصویروں میں کرنے کا شوق بھی آپ کے دل میں موجود تھا۔ بہرطور جاوید نامہ ایک کامیاب اور بے نظیر شاعرانہ اور تخیلی معراج نامہ ہے جس میں سیاحت علوی اور مشاہدات و تجلیات روحانی کا سادہ اور موثر بیان ہے۔ اس میں علامہ اقبال نے اپنی ہنرمندی اور پرکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ معراج نبویؐ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں شامل ہے اس کا تفصیلی بیان قرآن مجید اور حدیث شریف میں موجود ہے۔ اس کے بعد صوفیہ نے اپنے روحانی معراج نامے پیش کئے جو عموماً کشف و الہام اور واردات قلبی پر مبنی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اسلامی شعرا نے بھی تخیلی معراج نامے لکھے جن کی نقطۂ ادبی حیثیت ہو سکتی ہے۔ صوفیہ میں حضرت ابن عربی کا معراج نامہ فتوحات مکیہ کے متعدد ضخیم دفتروں پر مشتمل ہے۔ سیاحت علوی میں ※ زبان سے مختلف اور متنوع موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح عربی کے مشہور نابینا شاعر ابوالعلاء المعری نے رسالۃ الغفران میں اپنا ادبی معراج نامہ پیش کیا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ توبہ کرنے کے بعد بدکار اور سیہ کار آدمی بھی جنت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کے بعد اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے نے اپنا معراج نامہ

---

[1] اقبال نامہ اول صفحہ ۲۰۰ مکتوب مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۳۳ء

[2] اقبال نامہ اول صفحہ ۲۰۴ مکتوبات مورخہ ۲۵ جون ۱۹۳۵ء و ۱۰ اپریل ۱۹۳۸ء

※ عالم دین اور ایک فلسفی آپ کی رفاقت اور رہنمائی کرتے ہیں اور ابن عربی ان کی

پیش کیا اس میں اس نے عیسائی اقوام کی اخلاقی کمزوریوں پر روشنی ڈالی اور سیاسیات یورپ کا
مرقع کھینچکر رکھ دیا۔ اس کے اس کارنامے نے یورپ میں ایک بیداری سی پیدا کردی اور عوام وخواص
کے دل ودماغ میں ایک ہیجان برپا کر ڈالا' اس کا نتیجہ کچھ ہی سال بعد نشاۃ ثانیہ کی شکل میں ظاہر ہوا
یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ڈانٹے کا یہ کارنامہ فتوحات مکیہ اور رسالہ غفران کا مرہون منت ہے' مغربی نقادوں
نے خود اس کا کھلا اعتراف کیا ہے ان تینوں معراج ناموں کے پیش نظر علامہ اقبال نے جاوید نامہ لکھا اگرچہ
آپ کا یہ کارنامہ بڑی حد تک ڈانٹے کے کارنامے کا جواب ہے' جاوید نامہ دینی' ادبی' تاریخی' سماجی' قومی
اور فلسفیانہ وغیرہ تمام حیثیتوں کا مالک ہے' دوسرے معراج ناموں کے مقابلے میں جاوید نامہ صاف'
سادہ اور واضح ہے' اس میں کوئی معما یا اغلاق نہیں' اس میں جن مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انکا
تعلق عہد حاضر سے ہے اور اس میں کوئی ایسا فلسفہ پیش نہیں کیا گیا جس کا ترجمہ عمل میں نہیں کیا جاسکتا۔

علامہ اقبال مولوی رومی یا پیر رومی کی رہنمائی میں پہلے افلاک اور فردوس بریں کی سیر کرتے ہیں۔
مرشد رومی متعدد احوال آپ کو دکھاتے ہیں اور مختلف شخصیتوں کی روحوں سے آپ کو ملاتے ہیں' جو مکالمے
ان سب سے ہوتے ہیں ان کے ذریعہ اہم اور مفید دینی' تاریخی اور ملی مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ گوتم' زرتشت'
طالسطائی' ابوجہل' فرعون' کچنر' مہدی سوڈانی' منصور حلاج' ابلیس' نطشے' شرف النسا' سید علی ہمدانی' بھرتری ہری'
نادر' ابدالی' ناصر خسرو وغیرہ اس تمثیل کے کردار ہیں۔ لیکن پیر رومی کے بعد سب سے زیادہ ابیات
ٹیپو سلطان اور ان سے متعلق موضوعات پر ہیں' ٹیپو سلطان کی روح سے ملاقات گویا اس ڈراما کے
پلاٹ کا نقطۂ کمال ہے۔ آپ کی باری سب اکابر کے بعد آخر میں آتی ہے۔ اور آپ سے ملاقات کے بعد
صرف حوران بہشتی سے کچھ گفتگو ہوتی ہے' پھر حضور میں حاضر ہوتے ہیں تو "ندائے جمال" سے سرفراز ہوتے ہیں'
یہ سب جنت سے رخصت کے موقع پر ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے دریائے کاویری کو زندہ رود کے نام سے یاد
کیا ہے اور اس کے مقابلے میں اپنے لئے بھی اس مثنوی میں زندہ رود ہی کا لقب اختیار کیا ہے' سلطان
شہید کی زبان سے دریائے کاویری کے نام پیغام دلاتے ہیں تو فرماتے ہیں ؎

در جہاں تو زندہ رود او زندہ رود
خوشتر ک آید سرود اندر سرود

دنیا میں دریائے کاویری بھی ایک جیتا جاگتا دریا ہے اور علامہ اقبال بھی علم ودانش کا زندۂ جاوید
دریا ہیں۔ دونوں کا سرود مل جائے تو خوب ہوگا۔

یہ حقیقت بھی اس امر کا ایک ثبوت ہے کہ جاوید نامہ جو آپ کا شاہکار ہے اور جسے آپ اپنی زندگی
کا ماحصل بنانا چاہتے تھے۔ اس کا خاکہ آپ کے ذہن میں سفر میسور ہی میں مرتب ہوا تھا۔

پانچ افلاک سے گزر کر فلک زحل پر پہنچتے ہیں تو بنگال کے میر جعفر اور میسور کے میر صادق کی روحیں دکھائی دیتی ہیں۔ اس منظر میں ان غداروں کو علامہ اقبال جس زبوں حالی میں پیش کرتے ہیں اس سے بہتر ترجمانی ان کی غداری اور اس کے نتائج کی نہیں ہو سکتی۔ ان کی روحوں کو دوزخ نے بھی قبول نہیں کیا۔ وہ دونوں ایک خونین قلزم میں گرفتارِ عذاب ہیں' وہ طاغوت کہیں ہیں جن کے کرتوت نے ایک قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا

جعفر از بنگال وصادق از دکن ! ٭ ننگ آدم ننگ دیں ننگ وطن

اس خونین قلزم میں ایک چھوٹی سی کشتی ہیں دو نوں سوار ہیں اور نہایت ہی مایوس اور پریشان ہیں

زرد رو' عریاں بدن' آشفتہ مو ہی

روح ہند ان کو دیکھتی اور فریاد کرتی ہے کہ انہوں نے مجھے تباہ کر کے رکھ دیا' جو ملت بھی تباہ و غارت ہوئی ہے اس کی بربادی کا ذمہ دار کوئی جعفر یا کوئی صادق ہی ہوا ہے۔ آج بھی ایسے غدار موجود ہیں۔

ملتی را ہر کجا غارت گری ست ٭ اصل او از صادقی یا جعفری ست

الاماں از روح صادق الاماں ٭ الاماں از جعفران ایں زماں :

میر جعفر اور میر صادق اپنی زبوں حالی کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ افسوس ہمیں نہ عدم قبول کرتا ہے نہ وجود' دوزخ نے بھی ہمیں قبول کرنے سے انکار کر دیا' اس نے کہدیا کہ ان دو کافروں سے میرا شعلہ پاک ہی رہے تو اچھا ہے' میرے لئے دو سراخس و خاشاک بہتر ہے۔ ان کی پریشاں حالی اور حد سے گزری ہوئی مایوسی کا عجیب عالم ہے ؎

گفت دوزخ را خس و خاشاک بہ ٭ شعلۂ من زیں دو کافر پاک بہ

ہم کو موت نے بھی کوئی سہارا نہ دیا' اس نے کہدیا کہ موت سے غدار کی روح کو آرام نہیں ملتا۔

ایں چنیں کاری نمی آید ز مرگ ٭ جان غداری نیا ساید ز مرگ

غرض ان غداروں کا جو مرقع علامہ اقبال نے کھینچا ہے یہ بس آپ ہی کا حق معلوم ہوتا ہے۔ ان کا ذکر آپ یوں شروع کرتے ہیں کہ :-

"یہ وہ ارواح رذیلہ ہیں جنہوں نے ملک و ملت سے غداری کی اور جن کو دوزخ نے بھی قبول نہیں کیا۔"

یہاں سے گزر کر علامہ "آنسوی افلاک" جا پہنچتے ہیں اور فردوس بریں کے کاخ سلاطین میں نادر اور ابدالی کے بعد سلطان شہید کی روح سے ملاقات کرتے ہیں۔ یہاں بھی آپ نے منظر نگاری اور کردار نگاری کے جوہر دکھائے ہیں' قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ خود بھی اس ماحول میں موجود ہے۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور اپنے کانوں سے سن رہا ہے۔

پہلے پیر رومی سلطان شہید کا یوں تعارف کراتے ہیں، ان پانچ ابیات میں علامہ اقبال نے سلطان شہید کی جو مدح سرائی کی ہے اس کے مقابلے میں تعریف و توصیف کے ضخیم دفاتر ہیچ نظر آتے ہیں۔

آں شہیدان محبت را امام! آبروئے ہند و چین و روم و شام
تابش از خورشید و مہ تابندہ تر خاک قبرش از من و تو زندہ تر
عشق رازی بود بر صحرا نہاد تو ندانی جاں چہ مشتاقانہ داد
از نگاہِ خواجۂ بدر و حنین: فقر سلطان وارث جذب حسینؓ
رفت سلطاں زیں سرای ہفت روز نوبت او در دکن باقی ہنوز

عشق الٰہی کے شہیدوں کا وہ امام جو ہند و چین و روم و شام کی آبرو ہے۔ اس کی چمک مہر و ماہ سے بڑھی ہوئی ہے اور اس کی قبر کی خاک میں مجھ سے اور تجھ سے زیادہ زندگی ہے، اس نے عشق الٰہی کے راز کا افشا کر دیا، تو نہیں جانتا کتنے شوق سے اس نے جان قربان کی اور جام شہادت نوش کیا۔

نادر، ابدالی اور سلطان شہید تینوں کا مشترکہ تعارف پیر رومی اس طرح کراتے ہیں۔ یہ بیت ایجاز و جامعیت کا ایک بلند پایہ نمونہ ہے ؎

خسروانِ مشرق اندر انجمن ؎ سطوت ایران و افغان و دکن

کا نغ سلاطین کی کافی تعریف کی گئی ہے پھر بھی کہا گیا ہے کہ اس کی تعریف کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا زبان اور فکر اس سے قاصر ہیں ؎

حرف و صوتم خام و فکرم نا تمام ؎ کی تواں گفتن حدیث آں مقام

ٹیپو سلطان ہندوستان اور دکن کی یاد بڑے دردناک انداز میں کرتے ہیں۔ اقبال کے فکر و سخن کی تعریف کرتے ہیں اور دریائے کاویری کے نام اپنے پیغام میں موت و حیات اور شہادت کا فلسفہ ایسے موثر پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ ایک ایک حرف دل میں اتر جاتا ہے، ان سارے مکالموں اور مباحث کا مقصد فقط تعلیم و تفہیم ہے، سلطان پوچھتے ہیں ؎

زائر شہر و دیارم بودہ ای! چشم خود را بر مزارم سودہ ای
ای شناسای حدود کائنات در دکن دیدی ز آثارِ حیات

آپ نے میرے شہر اور علاقہ سلطنت کی سیر کی ہے۔ میرے مزار پہ آنسو بہائے ہیں، اے دوربین اور دور اندیش مفکر، دکن میں آپ نے کچھ آثار حیات بھی دیکھے ہیں؟

علامہ اقبال جواب دیتے ہیں کہ میں نے دکن میں اشکوں سے تخم ریزی کی ہے اب وہاں اس کی پیداوار

ہوئی کاویری ندی جو اپنے دائمی سفر پر لگی ہوئی ہے۔ اس کے بہاؤ میں اب ایک نیا ہی شور پیدا ہو گیا ہے۔
سلطان شہید علامہ اقبال کے فکر و شعر کی تعریف کرتے ہیں ؎

ای ترا داد ند حرف دل فروز ؛ از تپ اشکت توی سوزم ہنوز

آپ کو قدرت نے دلوں کو جلا دینے والا سخن عطا فرمایا ہے، آپ کے آنسوؤں کی حرارت مجھے اب تک جلا رہی ہے۔ میں مولائے کل کے حضور میں حاضر تھا جہاں کسی کو لب کشائی کی جرات نہیں ہو سکتی لیکن ؎

سوختم از گرمی اشعار تو ؛ بر زبانم رفت از افکار تو

مجھ کو ضبط کا یارا نہ رہا، آپ کے اشعار نے مجھ میں اتنی حرارت پیدا کر دی تھی کہ آپ کے افکار میری زبان پر آ ہی گئے تو مجھ سے وہاں دریافت کی گئی کہ یہ کس کا کلام ہے جس میں زندگی کے ایسے ہنگامے پوشیدہ ہیں، خیر میرا یہ پیغام کاویری تک پہنچا، بنا وہ بھی زندہ رود ہے، آپ بھی زندہ رود ہیں، دونوں کے سرود مل جائیں تو بہت خوب ہوگا۔

رود کاویری کے نام سلطان شہید کا پیغام اکتالیس اشعار پر مشتمل ہے، میرا یہ کہنا بے جا نہیں کہ یہ ساری مثنوی کا جوہر اور بہترین حصہ ہے، اس میں علامہ اقبال نے موت و حیات کا فلسفہ نہایت اختصار کے ساتھ اپنے خاص انداز میں بیان کیا ہے، پہلے سلطان شہید کاویری کی تعریف کرتے ہیں اور اسے اپنی یاد دلاتے ہیں جو نہایت ہی درد انگیز ہے ؎

ای مرا خوش تر ز جیحون و فرات ؛ ای دکن را آب تو آب حیات

اے کاویری جو مجھے جیحون اور فرات سے عزیز تر ہے، تیرا پانی دکن کے لئے آب حیات ہے میرا شہر تیرے آغوش ہی میں تو آباد تھا، تو جانتی ہے کہ یہ پیغام کس کا ہے!

آں کہ می کردی طواف سطوتش ؛ بودہ ای آئینہ دار دولتش

یہ اس تاجدار کا پیغام ہے جس کی شوکت و عظمت کا تو طواف کرتی تھی اور جس کی دولت اور سطوت کی تو آئینہ دار تھی۔ جس کی تدبیر سے صحرا بہشت زار بن گئے تھے، جس نے اپنے خون سے اپنا نقش بنایا تھا۔ جس کا مزار سینکڑوں ہزاروں آرزوؤں ارمانوں کا مرجع ہے جس کی شہادت نے تیری موجوں میں اضطراب پیدا کر رکھا ہے۔

آں کہ گفتارش ہمہ کردار بود ؛ مشرق اندر خواب و او بیدار بود

وہ جس کی گفتار سراسر اس کا کردار تھی، جس کے قول اور فعل میں کوئی تفاوت نہیں تھا۔ جو اس وقت ہشیار اور بیدار تھا جب سارا مشرق محو خواب غفلت تھا۔

اس کے بعد موت و حیات کا فلسفہ یوں بیان کیا جاتا ہے ؎

ای من و تو موجی از رود حیات ؛ ہر نفس دیگر شود ایں کائنات

زندگی دریا ہے تو بھی اور تو دونوں اس کی موجیں ہیں، سن لے کہ ہر لحہ یہ کائنات دگرگوں ہوتی رہتی ہے۔

زندگانی انقلاب ہر دمی ست ؛ زانکہ او اندر سراغ عالمی ست

دنیا کی زندگی میں ہر دم ایک انقلاب آتا ہے کیونکہ وہ عالم آخرت یا عالم حقیقت کی طرف سفر کر رہی ہے۔

کاروان و ناقہ و دشت و نخیل ؛ ہر چہ بینی نالد از درد رحیل

دنیا کی ہر چیز اور ہر مخلوق فنا ہونے والی ہے اور سب غم رحلت میں گرفتار ہیں۔ گلشن میں پھول کچھ دیر کا مہمان ہوتا ہے غنچہ دل کوش اور نغش گل بدوش ہے وجود کی تعمیر و تشکیل خس و خاشاک سے ہوتی ہے وجود میں آنے کی سزا حسرت ہے۔

عدم سے وجود میں آنا ہی بڑا ہے - یہ کسی کے امکان میں نہیں۔ مگر تخلیق پانے کے بعد خود فراموش نہ ہو جانا چاہیئے بلکہ شرار کی طرح خرمن کی تلاش میں نکلنا چاہیئے۔ خود میں حرارت ہے تو سورج کی طرح آسمان کی وسعتوں میں پہنچنا چاہیئے۔ تیر کھانے کے لائق کسی کے سینہ ہے تو دنیا میں شاہین کی طرح جیے اور شاہین ہی کی طرح مرے، یاد رہے جو کچھ ہے عرض حیات ہی ہے، طول حیات کچھ نہیں۔ زندگی کا مذہب اور دین یہی ہے کہ شیر کی طرح ایک لمحہ جینا بھیڑ کی طرح سو سال جینے سے بہتر ہے۔

یہ ٹیپو سلطان کا آخری قول ہے جسے علامہ اقبال نے اس خوبی سے نظم کیا ہے کہ موت کیا ہے، ایک نیرنج، ایک طلسم، ایک سیمیا، بندہ حق موت کی طرف اسی طرح لپکتا ہے جس طرح شیر آہو پر جھپٹتا ہے موت بس اس کے سینکڑوں مقامات میں سے ایک مقام ہے، موت کے ڈر سے غلام کو زندگی حرام ہوتی ہے کیونکہ وہ ہر لحہ موت کے خوف سے مرتا ہے۔ لیکن مرد آزاد کی شان ہی اور ہوتی ہے۔ موت اُسے ایک اور ہی زندگی عطا کرتی ہے وہ خود اندیش ہوتا ہے، مرگ اندیش نہیں، اس کی موت بس ایک آن کی ہوتی ہے۔

او خود اندیش است مرگ اندیش نیست ؛ مرگ آزاد ان ز آنی بیش نیست

وہ موت جو خاک میں پہنچاتی ہے دام و دد کی موت ہوتی ہے، مرد مومن کی موت تو اسے خاک سے اٹھاتی اور انتہائے راہ شوق کے بلند ترین مقام تک پہنچا دیتی ہے۔

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر ؛ مرگ پور مرتضیٰ چیزی دگر

مومن کے لئے تو ہر قسم کی موت شہد و شکر ہوتی ہے لیکن شہید کربلا کی موت ایک اور ہی چیز ہے جس کا مقام ہے۔

آخرین تکبیر در جنگاہ شوق

جنگ اور جنگ میں بڑا فرق ہے، دنیوی بادشاہوں کی جنگ کا مقصد غارت گری ہوتا ہے، لیکن مومن کی جنگ اعلاء کلمۃ الحق کے لئے ہوتی ہے، یہ سنت پیغمبری ہے۔

جنگ شاہان جہاں غارت گری ست ؎ جنگ مومن سنت پیغمبری ست

مومن باطل کا مقابلہ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کرتا ہے، برضا و رغبت اس دنیا کو ترک کر کے کوئے دوست میں پہنچ جاتا ہے ؎

جنگ مومن چیست؟ ہجرت سوئے دوست ؎ ترک عالم، اختیار کوئے دوست

اس حقیقت سے صرف شہید واقف ہوتا ہے جو اپنی جان کی قیمت دے کر یہ جنس خریدتا ہے۔

کس نداند جز شہید این نکتہ را ؎ کو بخون خود خرید این نکتہ را

اس کے بعد علامہ اقبال نے سلطان شہید کے موضوع پر اُردو میں بھی ایک نظم کہی ہے جو ٹیپو سلطان کی وصیت کے عنوان سے ضرب کلیم میں شامل ہے، اس میں بھی وہی راہ شوق کا ولولہ انگیز بیان ہے، گو جاوید نامہ کے اشعار کے مقابلے میں یہ نظم بالکل پھیکی معلوم ہوتی ہے تاہم اردو میں اس موضوع پر علامہ کی واحد نظم ہے اور اپنی جگہ بے شک و شبہ نہایت دل کش اور پُر لطف ہے، ملاحظہ ہو۔

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول ؎ لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز ؎ ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں ؎ محفل گداز! گرمئ محفل نہ کر قبول

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے ؎ جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

علامہ اقبال سفر میسور کے بعد سلطان شہید کی شخصیت اور عظمت سے اتنے متاثر رہے کہ اس کا اندازہ اس مکتوب کے ایک ایک لفظ سے بھی ہو سکتا ہے جو آپ نے کسی میجر صاحب کو جواب میں لکھا تھا انہوں نے ایک فوجی سکول کو آپ کے نام سے موسوم کرنے کی اجازت مانگی تھی، آپ نے جواب دیا۔

"ایک معمولی شاعر کے نام سے فوجی سکول کو موسوم کرنا زیادہ موزوں نہیں معلوم ہوتا میں تجویز کرتا ہوں کہ آپ اس فوجی سکول کا نام ٹیپو فوجی اسکول رکھیں، ٹیپو ہندوستان کا آخری مسلمان سپاہی تھا جس کو ہندوستان کے مسلمانوں نے جلد فراموش کر دینے میں بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے، جنوبی ہندوستان میں جیسا کہ خود میں نے مشاہدہ کیا ہے اس عالی مرتبت مسلمان سپاہی کی قبر زندگی رکھتی ہے۔ بہ نسبت ہم جیسے لوگوں کے جو بظاہر زندہ ہیں یا اپنے آپ کو زندہ ظاہر کر کے لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں[1]۔"

---

[1] اقبال نامہ، دوم صفحہ ۲۷۲ منقول از سیرت اقبال۔

اسلامی علوم و فنون قدیم ریاست میسور میں عہد عادل شاہی میں سرا اور ڈوڈ بالاپور یا بالاپور کلاں کی راہ سے پہنچے، عہد سلطنت خداداد میں یہاں ان کا بازار گرم ہوا مخطوطات کی پیداوار یہاں کافی ہوئی لیکن زوال سلطنت کے بعد سیاسی انتشار نے انہیں مختلف مقامات میں بکھیر دیا۔ ان کی قدر و قیمت کما حقہ نہ ہو سکی اور دست برد زمانہ سے انہیں بچانے کا اہتمام نہ کیا جا سکا، علامہ اقبال کی تشریف آوری نے میسور اور بنگلور میں ان کی اہمیت اور قدر و قیمت کا شدید احساس پیدا کر دیا اور اس کی تعمیل بھی ہونے لگی۔

آپ سلطان شہید کی ایک مستند قلمی تاریخ اور ان کی دستی تحریروں کے متلاشی تھے تاکہ جاوید نامہ لکھنے میں ان سے مدد لیتے۔ بنگلور، میسور اور سری رنگ پٹن میں آپ نے بار بار یہ خواہش ظاہر کی اور لاہور واپسی کے بعد بھی اس بارے میں یہاں کے شناساؤں سے سلسلہ جنبانی کرتے رہے، مکاتیب میں تحریر فرمایا ہے۔

"مجھے اس اطلاع سے بے حد مسرت ہوئی کہ میرا سفر میسور مسلم نوجوانوں میں تاریخی تحقیق کے شوق و ذوق کا باعث ہوا۔ سیٹھ ابا نے مجھے سلطان ٹیپو رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ سے متعلق ایک قلمی مسودہ جو ایک شخص کے پاس ہے جو ہمیں سلطان کے مقبرے پر ملا تھا ارسال فرمانے کا وعدہ فرمایا تھا، مجھے امید ہے کہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہوں گے، ان تک میرا اسلام شوق پہنچا دیجئے اور ان سے کہئے کہ اسلام کی خدمت کے لئے ان کے ذوق و شوق نے میرے دل پر ایک ایسا اثر پیدا کیا ہے جو کبھی محو نہ ہوگا۔"[1]

"سلطان شہید کے کسی روزنامچے کا مجھے علم نہیں لیکن اگر واقعی کوئی روزنامچہ موجود ہو تو اس کا ایک نسخہ نہایت شوق سے حاصل کروں گا۔ اگر آپ کے پاس موجود ہو تو کچھ دیر کیلئے مستعار مرحمت ہوئیے"[2]

"سلطان شہید کے روزنامچے کے لئے جو سلسلہ جنبانی آپ نے شروع کی ہے اس کیلئے سراپا سپاس ہوں، اگر آپ ایک نسخہ بھجوا سکیں تو میرے لئے یہ ایک گنج گراں بہا ہوگا، اس روزنامچے سے امید ہے کہ سلطان سے متعلق مجوزہ نظم میں مجھے سلطان شہید کی صحیح صحیح حالت پیش کرنے میں بہت امداد ملے گی، ازراہ کرم مطلع فرمائیے کہ وہ مالک کتاب قیمت چاہتے ہیں تو کیا، میں بخوشی مناسب قیمت ادا کرنے کو تیار رہوں، اگر وہ آپ کو کتاب کی نقل لینے دیں تو خوشخط نقل لے لیجئے۔"[3]

---

[1] اقبال نامہ دوم۔ صفحہ ۸۸ مکتوب مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۲۹ء [2] اقبال نامہ دوم صفحہ ۹۲ مکتوب مورخہ ۹ اگست ۱۹۲۹ء
[3] اقبال نامہ دوم صفحہ ۹۳ مکتوب مورخہ ۹ نومبر ۱۹۲۹ء

چنانچہ علامہ کی تحریک و تشویق سے بنگلور میں آپ کے ایک پرخلوص معتقد محمد جمیل صاحب جن سے آپ کی باقاعدہ خط و کتابت رہی اور جو خود صاحب علم اور بڑے علم دوست تھے اور میسور میں مشہور و معروف قومی قائد محمد ابا سیٹھ صاحب مخطوطات جمع کرنے لگے۔ سیٹھ صاحب نے میسور میں اس کی بڑی پرزور تحریک چلائی اور تھوڑی ہی مدت میں سینکڑوں قیمتی مخطوطات مسلم کلب میں جمع فرمادیے جو اس دور میں شہر میسور کے مسلمانوں کا ایک اہم ثقافتی مرکز تھا یہ کلب ختم ہوا تو مخطوطات انجمن رفاہ المسلمین کے حوالے کر دیے گئے' مولوی عبدالحق مرحوم میسور تشریف لائے تھے تو انہوں نے ان میں سے چند مخطوطات انتخاب کر لئے جو شاید آج کل انجمن ترقی اردو' علی گڑھ' کی مخطوطہ لائبریری میں موجود ہیں' باقی مخطوطات کچھ مدت کے بعد انجمن اتحاد اسلام کے کتب خانے میں پہنچا دیئے گئے۔ پانسال قبل ان میں سے بہت سے اہم مخطوطات انتخاب کر کے ہم نے جامعہ میسور کے اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے شعبہ اردو و فارسی و عربی میں محفوظ کر دیئے ہیں' اس کے علاوہ مخطوطات جمع کرنے کی اور بھی انفرادی کوششیں اسی زمانے سے شروع ہوئیں اور آج مختلف شوقین اصحاب کے ذاتی کتب خانوں میں قیمتی مخطوطات کے ذخیرے موجود ہیں۔

اسی طرح علامہ اقبال کی تحریک و ترغیب نے مسلم لائبریری بنگلور کے ارباب انتظام کے سمند شوق کے حق میں مہمیز کا کام دیا انہوں نے اس ادارے کو اور زیادہ استحکام بخشا اور جمع کتب کی کوشش کو تیز کر دیا۔ یہ کتب خانہ ریاست بھر میں اردو فارسی اور عربی کا سب سے بڑا اور مایہ ناز کتب خانہ ہے جہاں آٹھ ہزار کے لگ بھگ کتابیں موجود ہیں خاص خوبی یہ ہے کہ ریاست میسور کی اردو' عربی اور فارسی مطبوعات یہاں کافی تعداد میں محفوظ ہیں۔ چند نادار اور نہایت قیمتی مخطوطات بھی ہیں' اس پہلو پر علامہ اقبال نے خاص توجہ دلائی تھی یہاں کی کتاب آرا میں آپ نے جو رائے لکھی تھی اس میں اس امر پر بہت زور دیا تھا۔

خدا مغفرت کرے محمود خاں صاحب محمود بنگلوری نے بزم ادب' مہاراجا کالج میسور کے بھرے جلسے میں بتایا تھا کہ علامہ اقبال کے فیض سے وہ مورخ اور مصنف بنے تھے اس وقت تک آپ نے صرف ایک چھوٹی سی کتاب لکھی تھی جو سلطان شہید کے نام سے شائع بھی ہو چکی تھی' عموماً اخبارات اور رسائل کیلئے اکثر آرٹیکل لکھا کرتے تھے کچھ شعر گوئی کا شوق تھا۔ علامہ اقبال نے آپ کو شاعری اور آرٹیکل نگاری سے روکا اور ٹیپو سلطان کی تاریخ پر وقف ہو جانے کا شوق دلایا' چنانچہ آپ کی اس ترغیب و تحریص سے متاثر ہو کر مرحوم نے اپنی ساری عمر اسی پر صرف کر دی اور اس کے بعد اپنی گیارہ تصانیف پیش کیں جن میں سے تاریخ سلطنت خداداد اور تاریخ جنوبی ہند سب سے زیادہ مشہور و معروف ہیں۔ ہند و پاک میں آپ کی تخلیقات کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور ان کو بڑا قبول عام نصیب ہے۔

ریاست میسور میں علامہ اقبال کا کلام زبان زد خاص و عام رہا ہے' اردو اور فارسی کے نصاب میں آپ کے مختلف مجموعے شامل ہیں' مختلف اور متعدد مقامات پر ہر سال یوم اقبال بڑے شوق اور عقیدت سے منایا جاتا ہے' اقبالیات میں بہت دلچسپی لی جاتی ہے' بڑی اچھی تقریریں ہوتی ہیں' مقالے' مضامین اور قصائد بھی لکھے جاتے ہیں اور جامعہ میسور کی پروفیسر اردو ڈاکٹر حبیب النساء بیگم نے تصوف اقبال کے نام سے ایک مستقل تصنیف پیش کی ہے جسے ملک بھر میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا گیا ہے۔

حیدر صدیقی

جدید فنِ تعمیر

جس طرح زبان کسی قوم کے ذہنی اظہار کا ذریعہ ہوتی ہے، اسی طرح فنِ تعمیر منجملہ دوسرے فنونِ لطیفہ کے قومی تہذیب و تمدن کا آئینہ دار ہے۔ یہ ایک قسم کی اندرونی کیفیات ہیں جو اُن کے کارناموں میں اُجاگر ہوتی رہتی ہیں۔

جہاں معاشی ترقی اور سیاسی تبدیلیاں کسی قوم کی زندگی کے مختلف شعبوں پر اثر انداز ہوتی ہیں، وہاں ان کا فنونِ لطیفہ پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔

قبل اس کے کہ ہندوستان کے جدید طرزِ تعمیر کے متعلق کچھ کہا جائے مناسب ہوگا کہ قدیم تاریخی عمارتوں پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔

ہندوستان صدیوں سے فنِ تعمیر کا گہوارہ رہا ہے۔ ایلورہ اجنٹا اور نلندہ اس بات کا ثبوت ہیں۔ قبل مسیح کی بنی ہوئی عمارتوں کے بعد فنِ تعمیر میں نمایاں عروج ہندوستان میں مغلوں کے دورِ حکومت میں ہوا۔ مثال کے طور پر گول گنبد بیجاپور، لال قلعہ دہلی، جامع مسجد دہلی اور فتح پور سیکری کی اکثر عمارتیں۔ تاج محل ہندوستانی فنِ تعمیر کی لاثانی مثالیں ہیں۔

مشہور نقاد فرگیوسن نے احمد آباد اور بیجاپور کی طرزِ تعمیر کو سراہا ہے۔ فرنگی دورِ حکومت میں انگریز تعمیرکاروں نے جو بڑی بڑی عمارتیں یہاں بنوائیں ان میں ہندوستان کے فنِ تعمیر کی روایات کا پوری طرح خیال رکھا ہے۔ چنانچہ اس کی مثال گیٹ وے آف انڈیا اور پرنس آف ویلز میوزیم میں ملتی ہیں۔

بیسویں صدی کی جو عمارتیں انگریزی دورِ حکومت میں پایۂ تکمیل کو پہونچیں وہ ایڈورڈ لیوٹین اور ہربرٹ بیکر کے شاہکار ہیں جو ہندوستان کی جدید فنِ تعمیر کی اعلیٰ مثال ہیں۔ انھوں نے نئی دہلی کی تعمیر کے وقت جدید و قدیم طرزِ تعمیر کی آمیزش سے ایک نئے طرز کا فن جس خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے اس کی مثال دنیا میں بہت کم ملتی ہے۔ چنانچہ راشٹرپتی بھون، سکریٹریٹ، اسمبلی ہال کی عمارتیں اس کی مثال ہیں۔ ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی انفرادی شان و شوکت کے علاوہ ان میں ہندوستانی پن بھی موجود ہے۔ یہ عمارات یہاں کے موسمی اعتبار سے بھی بہت آرام دہ ہیں۔ غرض یہ کہ انگریزوں کے دورِ حکومت میں جو عمارات بنائی گئیں اس چیز کا خاص طور پر خیال رکھا گیا کہ ہندوستان میں بیرونی طرزِ تعمیر کو خواہ مخواہ گھسیڑا نہ جائے بلکہ یہیں کے طرزِ تعمیر ہی کو ترجیح دی جائے۔

ملک کی آب و ہوا اور طبعی حالات کے علاوہ سیاسی معاشرتی اور اقتصادی ضروریات اور ٹکنیکل ترقی کا بھی فن تعمیر پر اثر پڑتا ہے۔ یورپ اور مغربی ممالک میں صنعتی ترقی اور سیاسی انقلاب نے طرز تعمیر پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ شاہی راج کے دوران جس قسم کی عمارتیں بنتی تھیں ان کا رواج ختم ہوتا گیا اور عمارتیں عوام الناس کے لئے بنائی جانے لگیں۔

ھندوستان میں بھی سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد ایسا ہی ہونے لگا۔ روز بہ روز کی سائنسی ایجادات نے فن تعمیر میں بھی انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ نئی نئی اشیار تعمیر خاص طور پر R.C.C - لوہا - فولاد، المونیم، شیشہ، پلاسٹک وغیرہ کا استعمال عام ہو گیا ہے

آج کل ہمارے یہاں جو عمارتیں بن رہی ہیں۔ انکو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بدیشی عمارتی نمونوں کی نقالی کی گئی ہے۔ یہ عمارتیں سیدھی سادی نظر آتی ہیں۔ جدید اشیار کا پوری طرح استفادہ کیا جا رہا ہے اور عمارات کے نقشوں کی ترتیب کے وقت یہ خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ کم سے کم جگہ کا استعمال ہو اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے اور اس طرح عمارات کی لاگت میں کمی کی جائے۔ دیواروں کو پتلا بنایا جا رہا ہے تاکہ وہ کم جگہ گھیریں اور بنیادوں پر کم سے کم وزن آئے۔

جہاں گرمی کی شدت ہوتی ہے وہاں ایرکنڈیشنگ کی خاطر چھتوں کو پست کیا جاتا ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ اونچی چھتیں اور چوڑے ورانڈوں کا استعمال جو گرمی کو کم کرنے کے لئے ہوتا تھا۔ مفقود ہوتا جا رہا ہے لیکن یہ دیکھا جا رہا ہے کہ عمارات کی چھتیں بلا کسی لحاظ کے پست بنائی جاتی ہیں درست نہیں۔

عمارتوں کو مفید اور کم خرچ بنانے کے علاوہ ان کو خوبصورت اور دیدہ زیب بنانا فن تعمیر کا ایک اہم مقصد ہے جو آج کل کی عمارتوں میں ختم ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ آج کل معاشی اعتبار سے عمارتیں سادہ ترین اور کم خرچ ہونی چاہئیں اور غیر ضروری نقش و نگار سے بے نیاز بھی ہوں لیکن سادگی میں انفرادیت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے ایک عمارت جس مقصد کے لئے بنائی جاتی ہے اس کی بیرونی شکل و صورت سے اُس امر کا اظہار ہونا چاہیئے ورنہ مدرسہ، جیل، رہائشی مکان اور دفتر کی عمارتیں ایک جیسی بنیں تو یہ ایک عجیب مذاق ہوگا۔

آج کی عمارتوں کو لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سوائے دھوپ کو روکنے کے لئے آڑے اور کھڑے دھوپ روکوں کا کثرت سے استعمال کچھ بھی نہیں۔

ہمارے با مذاق وزیر اعظم نے اکثر و بیشتر موقعوں پر اس امر کا اظہار فرمایا ہے کہ ہماری عمارتیں خوش وضع اور دیدہ زیب ہونی چاہئیں۔ اور مغربی طرز کی اندھی نقالی سے ہم کو دور رہنا چاہیئے۔

محی الدین احمد

حیدرآباد کے قدیم دروازے

سلطان محمد قلی قطب شاہ اور اس کی ملکہ حیدر محل کی شاندار یادگار شہر حیدرآباد ہیں۔ پہلے جو
عمارتیں بنیں وہ جامع مسجد اور چار مینار ہیں۔ اس کے ساتھ ہی شاہی محلات اور امراء و عوام کے مکانات
بھی بننا شروع ہو گئے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے بعد سے تانے شاہ کے زمانہ تک ملک میں خوش حالی
رہی۔ امن و امان تھا۔ نہ چوروں ڈاکوؤں کا خوف نہ دشمن کے حملہ کا ڈر۔ اس لئے شہر میں روز بروز آبادی بڑھتی
گئی نئے نئے مکانات بنتے گئے اس لئے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ شہر کی وسعت کیا ہوگی اس کے علاوہ انتظامی
خوبیوں کی وجہ سے بیرونی حملہ کا کوئی خطرہ بھی نہ تھا اس لئے تمام مشرقی شہروں کی طرح اس شہر کے اطراف فصیل
کی تعمیر میں جلدی نہیں کی گئی۔ صرف موسیٰ ندی کے کنارے کنارے پرانے پل سے چادر گھاٹ تک فصیل بنادی
گئی۔ تاکہ طغیانی کے موقعہ پہ ندی کا پانی شہر کی آبادی میں نہ آسکے۔ اس میں پرانے پل کا دروازہ۔ چمپا دروازہ
اور دلی دروازہ بنایا گیا تھا۔ قطب شاہی حکومت کے خاتمہ کے بعد ملک میں نہ وہ خوشحالی باقی رہی اور
نہ وہ امن و امان۔ شہر کی آبادی بڑھنے کی بجائے خود یہاں کے لوگ تلاش معاش میں ترک وطن پر
مجبور ہوئے۔ چور اور ڈاکو شہر میں تاخت و تاراج کرنے لگے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ شہر کو محصور کرکے
حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ مبارز خاں صوبہ دار نے ارادہ کیا کہ فصیل شہر کی تکمیل کرے۔ اس نے
چادر گھاٹ سے دبیر پورہ تک فصیل تعمیر کروائی تھی کہ اس دوران میں نواب نظام الملک آصفجاہ اول
یہاں کے صوبہ دار ہو کر آئے اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد انھوں نے اپنی خود مختاری کا اعلان بھی کر دیا
اور انھوں نے اپنے فرزند نواب میر احمد خاں صلابت جنگ کو حکم دیا کہ شہر کی فصیل کی تکمیل کریں انھوں نے
مبارز خاں کی تعمیر کردہ فصیل کو ڈھاکر از سر نو کنگورہ دار فصیل پورے شہر کے گرد تعمیر کروائی۔ جس کا دور سوا چھ
میل اور اندرونی رقبہ سوا چار مربع میل تھا، اس میں بارہ دروازے تھے جن کی صراحت یہ ہے:-
مغربی جانب پرانے پل کا دروازہ۔ دودھ باؤلی کا دروازہ۔ فتح دروازہ۔ مشرقی جانب گنڈ تالاب
میر جملہ کا دروازہ۔ یاقوت پورہ کا دروازہ اور دبیر پورہ کا دروازہ۔ شمالی جانب چادر گھاٹ کا
دروازہ۔ دلی دروازہ اور چمپا دروازہ۔ جنوبی جانب علی آباد کا دروازہ۔ لال دروازہ اور

ان میں دلی دروازہ - چمپا دروازہ اور پل قدیم کے دروازے کو چھوڑ کر جو قطب شاہی دور میں بنائے گئے تھے۔ بقیہ دروازے آصف جاہی عہد حکومت میں بنے تھے۔ اس کے بعد دو دروازوں کا ان میں اضافہ ہوا جس کی وجہ یہ تھی کہ پانچویں نظام نواب افضل الدولہ کے زمانے میں افضل گنج کا پل تعمیر ہوا تو اس کی ابتدا میں ایک نہایت ہی خوشنما دروازہ بنایا گیا جس کے دونوں بازو دو چھوٹے چھوٹے دروازے تھے۔ جو پیدل چلنے والوں کے لئے تھے اور درمیانی بڑا دروازہ سواریوں کے لئے۔ اس دروازے کے اوپر ایک مینار بنایا جا کر اس میں گھڑی نصب کی گئی۔ یہ دروازہ دلی دروازہ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر بنایا گیا تھا۔ دوسرا دروازہ نواب میر محبوب علی خاں کے زمانہ حکومت میں ملک کے ایک بڑے امیر نواب مسلم جنگ نے اپنے نام سے ایک پل تعمیر کروایا تھا جو سٹی کالج کے قریب واقع ہے اس کے شروع میں یہ دروازہ بنایا گیا تھا۔ یہ دروازہ چمپا دروازے سے چالیس پچاس گز کے فاصلہ پر واقع تھا۔ ان دروازوں کی وجہ سے دلی دروازہ اور چمپا دروازہ عملاً بیکار ہو گئے تھے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہی دونوں دروازے سب سے پہلے توڑ بھی دیئے گئے۔ اعلیٰ حضرت یعنی نواب میر عثمان علی خاں کے زمانہ میں سڑک کو کشادہ کرنے کے لئے ان کو ڈھا دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ نظام الملک آصف جاہ کا ارادہ شہر حیدرآباد کو پایہ تخت بنانے کا نہیں تھا اور وہ زیادہ تر اورنگ آباد وغیرہ میں قیام کرتے تھے اور ان کا محل تو کھنڈہ جو گدی مبارک کا محل کہلاتا ہے اورنگ آباد ہی میں ہے اس لئے اس شہر کے دروازے بھی دارالسلطنت کے دروازوں کی طرح نہیں بلکہ عام شہروں کی طرح سادہ بنے ہوئے ہیں دارالسلطنت کے دروازے عموماً بہت مستحکم ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے گھونگھٹ کی دیوار ہوتی ہے۔ دروازوں کے تختوں پر مضبوط لوہے کی چادر چڑھائی جاتی ہے اور اس پر موٹے موٹے نوکدار کیلے جڑ دیئے جاتے ہیں تاکہ ہاتھی اس سے ٹکرا کر دروازے کو توڑ نہ سکے۔ دروازے کے دونوں جانب فوجی بیرکس بنے ہوئے ہوتے ہیں تاکہ دروازے اور شہر کی حفاظت کے لئے سپاہی ہر وقت موجود رہیں۔ اس کے برخلاف شہر حیدرآباد کے دروازے سیدھے سادے بنے ہوئے ہیں۔ ہر دروازے کے برج بنائے جا کر ان پر توپیں چڑھا دی گئیں تھیں اور ان میں پہرہ داروں کے لئے کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہ دروازے رات کے آٹھ بجے بند کر دیئے جاتے اور پھر صبح چار بجے کھول دیئے جاتے تھے۔ دروازوں کے بند ہونے اور کھلنے کیلئے اعلان ایک توپ کے ذریعہ کیا جاتا تھا ۱۹۵۰ء تک یہ انتظام باقی تھا اس کے بعد چونکہ اندرون شہر اور بیرون شہر کی آبادی برابر ہو گئی اس لئے دروازوں کا بند ہونا نہ صرف بے ضرورت تھا بلکہ عوام کو اس سے تکلیف بھی ہو رہی تھی۔ اس لئے اس کو برخاست کر دیا گیا۔ لیکن ان دروازوں کے بند ہونے اور کھلنے کے وقت جو توپ چلتی تھی وہ حکومت آصفیہ کے خاتمہ تک باقی رہی۔

... جو ایک قدامت کی یادگار تھی۔ ان دروازوں پر پہرہ چوکی اور بند کرنے اور کھولنے کا انتظام عہدیداران فوج مرزبانی کے تفویض تھا۔

قطب شاہی دور میں اگرچہ شہر کی فصیل نہیں بنی تھی لیکن پتہ چلتا ہے کہ شہر کے اطراف فوجی پہرہ چوکی کا معقول انتظام تھا اور اوقات مقررہ کے سوا آمد و رفت پر پابندی تھی اور غیر اجازت یافتہ اشخاص کی آمد و رفت پر نگرانی ہوتی تھی۔ چنانچہ تھیونو جو سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دور میں حیدرآباد آیا تھا اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ یہ شہر ایک بڑے میدان میں واقع ہے جس کے چاروں طرف شہر سے چند میل پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں۔ جن کی وجہ یہاں کی آب و ہوا بہت عمدہ ہوگئی ہے۔ گر گولکنڈہ کا ملک کافی بلند بھی ہے۔ بیرون شہر کے مکانات جہاں ہم اکثر ٹھیرے تھے صرف مٹی کے بنے ہوئے ہیں اور ان پر چھپر پڑا ہوا ہے اور وہ اتنے پست اور بد قطع بنائے گئے ہیں کہ ان کو جھونپڑی کہہ سکتے ہیں۔ اس محلہ میں ہم ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک گئے جو بہت لانبا ہے اور پل تک چلا گیا ہے۔ اب یہاں پل قدیم پر جاکر ٹھیر گئے۔ کیونکہ کوتوال شہر کی اجازت کے بغیر ہم کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ تجارتی مال بھی اولاً کوتوال کے مکان پر بھیجا یا جاتا ہے۔ اس دوران میں ایک ایرانی ایلچی جس کی ہمارے قافلہ کے بڑے تاجر سے ملاقات تھی، ..... کوتوال کا اجازت نامہ بھجوا دیا اور ہمکو شہر کے اندر کرنے کی اجازت مل گئی۔ اب ہم شہر پناہ کے دروازے سے گذرے جو ایک بڑی پھاٹک سے زیادہ نہ تھا۔

آگے چل کر یہی سیاح لکھتا ہے کہ "اس شہر کی لمبائی اس کی چوڑائی سے زیادہ ہے۔ دروازہ پل قدیم تک سیدھا راستہ ہے لیکن چارمینار سے آگے سڑک سیدھی نہیں ہے۔ چارمینار سے مجھے بائیں جانب مڑنا پڑا تو ایک میدان ملا۔ اس میں سے ہوکر ایک اور سڑک ملی جو شہر کے دوسرے دروازے تک گئی ہے۔ میں نے چلتے وقت شہر کی لمبائی ناپنے کی کوشش کی۔ دروازۂ پل قدیم سے دوسرے دروازے تک پانچ ہزار چھ سو پچاس قدم ہوئے۔ مصنف نے اس امر کی وضاحت نہیں کی کہ یہ کون دروازہ تھا لیکن چارمینار سے جو سمت اس نے بتلائی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ دلی دروازہ ہوگا۔ کوتوال شہر جس کی اجازت پر شہر میں داخل ہونے کی اجازت ملتی تھی اس کے اختیارات کی نسبت اس نے لکھا ہے "کوتوال شہر نہ صرف شہر کا انتظام کرتا ہے بلکہ پوری مملکت کی کروڑگیری کا حاکم اعلیٰ بھی یہی ہے اور دارالضرب بھی اس کے ماتحت ہے۔ اس کے علاوہ شہر کی دیوانی اور فوجداری عدالتوں کا بڑا حاکم بھی یہی ہے۔

قطب شاہی دور میں جو دروازے بنے تھے ان میں پرانے پل کا دروازہ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے موسوم ہوا۔ دوسرے دروازے کا نام دلی دروازہ اس لئے پڑا کہ یہ شہر دلی کے رُخ پر تھا اور شمال جانب کو

جانے والے یا وہاں سے آنے والے اسی دروازے سے شہر میں آتے تھے لیکن چپا دروازے کے نام کی کوئی صحیح وجہ معلوم نہ ہو سکی۔ آبادی شہر سے پہلے یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر چھوٹی چھوٹی بستیاں اور گاؤں آباد تھے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس نام کا کوئی گاؤں اس کے قرب و جوار میں ہو۔

آصف جاہی دور میں جو دروازے بنائے گئے وہ بھی اُن ہی محلوں کے نام سے موسوم کئے گئے جو اُن کے قرب و جوار میں واقع تھے جیسے۔ علی آباد، گولی پورہ، یاقوت پورہ وغیرہ۔ البتہ فتح دروازہ کی نسبت یہاں ایک قصہ مشہور ہے کہ حملہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے وقت فاتح افواج اس دروازہ سے شہر میں داخل ہوئی تھیں۔ یہ قصہ قلعہ گولکنڈہ کے فتح دروازہ کی حد تک تو صحیح ہے لیکن شہر حیدرآباد کی نسبت صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ فصیل شہر اس وقت تک بنی ہی نہ تھی۔ البتہ بعض کتب تواریخ سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ جب شہزادہ محمد اعظم نے حیدرآباد پر حملہ کیا تھا تو اس کا کیمپ شاہ علی بنڈہ سے بجانب مغرب تھوڑے سے فاصلہ پر واقع تھا۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ شائد وہ مقام یہی ہو جو بعد میں فتح دروازہ کہلایا۔

آج اس چار سو سالہ پرانے شہر کو پھر سے جوان بنانے کے لئے اس کے چہرہ سے قدامت کی جھریاں مٹائی جا رہی ہیں۔ چنانچہ شہر کو مسمار کر کے شہر کا چہرہ صاف کر دیا گیا اس کے ساتھ ہی سارے دروازے اور کھڑکیاں بھی جو چہرہ کے داغ اور دھبے تھے اب باقی نہیں رہے۔ البتہ بطور آثار قدیمہ دروازہ دبیر پورہ اور دروازہ پرانا پل باقی رکھے گئے ہیں جس میں سے دبیر پورہ کا دروازہ آصف جاہیوں کی یادگار اور دروازہ پل قدیم قطب شاہیوں کی نشانی ہے اور اب یہی دونوں دروازے اس خوبصورت شہر کے رخسار پر تل کا کام دے رہے ہیں۔

"بشکریہ آل انڈیا ریڈیو"

جناب [illegible] حیدری

ہندی تہذیب و ثقافت اور صنعت و تجارت کے مختلف ارتقائی دور

۱۔ دراوڑی دور

ہند قدیم کی صنعت و تجارت اور تہذیب و تمدن کی ابتدا اور ارتقا کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ابتدائی دور دراوڑی دور کے نام سے موسوم ہے۔ دوسرا تیسرا اور چوتھا دور بالترتیب ایرین، بدھ اور جدید برہمنی دور کہلاتا ہے۔

دراوڑی دور میں صنعت و تجارت اور تہذیب و تمدن کی بنیاد جن خطوط پر پڑی وہی خطوط آگے چل کر ہندوستان کی ہمہ گیر ترقیوں کے باعث ہوئے یا یوں سمجھئے کہ دراوڑیوں کا یہی ذوق صنعت آنیوالوں کیلئے مشعل راہ ثابت ہوا۔ دراوڑوں کی آبادیاں سندھ سے لے کر ہند کے تمام دوسرے حصوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور وہ ایک مخصوص تہذیب و تمدن کی مالک تھیں ان کی تہذیبی نشانیاں ایرین کی آمد کے بعد عرصہ تک موجود ہیں لیکن دنیا کے دوسرے فاتحین کی طرح ایرین نے بھی ان کی تہذیبی عمارت منہدم کرکے ایک نئی تہذیبی عمارت کی بنیاد رکھی جس کے نتیجہ میں پیش رو کے تمام تہذیبی آثار نظروں سے اس طرح اوجھل ہوگئے کہ دنیا کو یقین آگیا کہ ایرین سے پہلے سرزمین ہند میں کوئی تمدن آشنا اور تہذیب دوست قوم آباد ہی نہ تھی۔ دراوڑوں کی اصل اور ان کے وطن کے سلسلہ میں مورخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے ایک خیال یہ ہے کہ دراوڑ ہندوستان کے شمال مغرب میں پائے جانے والے حدوں سے ہندوستان آئے اور وہاں سے جنوبی ہند پہونچے دوسرا صحیح نظریہ یہ ہے کہ دراوڑ ہندوستان ہی کے قدیم ترین باشندے ہیں اور جنوبی ہند ان کا اصل اور بنیادی وطن ہے اور اسی جگہ سے وہ بلوچستان اور شمالی ہند میں پھیل گئے۔ دراوڑ یا دراوڈ جنوبی ہند کے "تامل" علاقہ کا پرانا نام ہے جہاں کے رہنے والے تامل، تیلگو، کنڑا اور ملیالم زبانیں بولتے ہیں۔

اس قدیم ترین تہذیب کا انکشاف ہڑپا (جنوبی پنجاب) اور وادی سندھ میں موہن جوداڑو کی کھدائیوں اور کچھ قدیم نوشتہ جات کی دستیابی سے ہوا ہے۔ اس کے بعد سوراشٹرا، گجرات اور جنوبی ہند وغیرہ میں جو کھدوائی ہوئی اس سے اس تہذیب کے متعلق مزید معلومات فراہم ہوئیں اور یہ انکشاف بھی ہوا کہ اس تہذیب کا زمانہ لگ بھگ تین ہزار قبل مسیح سے پانچ ہزار برس قبل مسیح تک کا ہے۔ لیکن دراوڑوں نے چونکہ حجری دور کے ختم ہی پر اس طرف توجہ شروع کردی تھی۔ اس لئے ہندی تہذیب کے آغاز کا اصل زمانہ چھ ہزار قبل مسیح متعین کیا گیا ہے۔ اسی بنا پر ان روایات کو حقیقت

[illegible] ہے کہ جس وقت شہنشاہ خوفو نے مصر میں بڑے اہرام کی بنیاد ڈالی تھی اس وقت [illegible] صنعتی ترقی شباب کی منزلوں میں تھی۔ مشہور انگریز مورخ مسٹر تھارنٹن نے اس حقیقت کو اپنی تصنیف "ہندوستان قدیم کی حالت" میں اس طرح لکھا ہے کہ:۔

"جس وقت دریائے نیل کے اہرام عام تعمیر میں ابھی نہ آئے تھے ہند کی وسیع فضا اس سے بہت پہلے آفتاب تہذیب کی ضیا پاشیوں سے جگمگا رہی تھی۔ ہندی صناع اپنے صنعتی اختراعات اور اہل ذرع انواع و اقسام کی پیداوار اور مہندس اپنی تحیر خیز ذہنی صلاحیتوں سے ملک کا نام روشن کر رہے تھے۔"

تہذیبی ارتقا کے سلسلہ میں مولانا عبدالرزاق کانپوری مصنف البرامکہ نے محققین تہذیب کی آرا کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"تہذیب کا خورشید سب سے پہلے مطلع ہند پر نمودار اور اس کے لمعات سے مصر کا ستارۂ تہذیب روشن ہوا۔ اور مصر و ہند کی تہذیبی روشنی کے مجموعہ نے فضائے یونان کو روشن کیا۔"

ان روشن حقائق کے سامنے دراوڑی تہذیب کا بنیادی عہد چھ ہزار قبل مسیح متعین کرنا کسی طرح خلاف نہیں بلکہ اسی کے مطابق یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ سرزمین فراعنہ میں جب تمدنی آثار کی بنیاد رکھی جا رہی تھی دراوڑی تہذیب کی خوشنما عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔

مذہبی تصورات:۔ دراوڑی تہذیب کی قدامت و برتری اور ان کے مذہبی تصورات کے انکشاف کا ذریعہ ایک ہی ہے۔ بیسویں صدی کی کھدائیوں کے نتیجہ میں اگرچہ اب تک کسی مندر و حجرہ کی عمارت دستیاب نہیں ہوئی ہے لیکن مٹی اور پتھر کی ایسی مورتیاں اور تیلیاں ضرور ملی ہیں جن سے ان کے مذہبی تصورات اور اس کے پس منظر پر ماہرین آثار قدیمہ نے ظن و تخمین کی عمارت قائم کی ہے۔ تین اور چار چہرے والی مورتیوں کی دستیابی سے قیاس کیا گیا ہے کہ دراوڑ شیوجی قسم کے کسی دیوتا کی پرستش کرتے تھے۔ متعدد چہروں کی بناء پر سر جان مارشل ڈائرکٹر جنرل محکمۂ آثار قدیمہ نے اس دیوتا کو آریائی دور کے شیو دیوتا سے تعبیر کیا ہے۔ اس خیال کے رو سے شیو دیوتا ہندوستان کا سب سے قدیم دیوتا ہے جس کی پرستش قبل از زمانۂ تاریخ چلی آ رہی ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دراوڑ اس دیوتا کو کس نام سے پکارتے تھے۔ ماتا دیوی کو گھر کا محافظ سمجھ کر عوام میں اس کی پوجا پاٹ کا رواج زیادہ تھا۔ چیچک کی دیوی سیتالہ اور اس کی چھ بہنوں کی پوجا پاٹ کا پتہ بھی مورتیوں ہی کے ذریعہ چلتا ہے۔ بعض مہروں کی تصاویر سے درختوں اور مہیب

عـلـہ خوفو نام کا مصر میں ایک اہم ترین شہنشاہ گذرا ہے جس نے ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح غازہ کے علاقہ میں ایک لاکھ آدمیوں کی مدد سے ایک بڑا اہرام تعمیر کرایا تھا اور سب سے پہلا اہرام شہنشاہ زوسر کے حکم سے ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح تعمیر ہوا تھا۔

جانوروں کی پوجا پاٹ کے رواج کا اندازہ ہوتا ہے۔ مخروطی شکل کے کچھ چکنے پتھروں کی دستیابی سے لنگ پوجا کا پتہ چلتا ہے بلکہ سرجان مارشل کے نظریہ کے مطابق لنگ پوجا ہند کی قدیم ترین پوجا میں سے ہے۔ دیوی دیوتاؤں کے سامنے پرستش کے وقت چراغ جلانا اور توجہ مرکوز کرنے کے لیئے پھول اور نذرانے چڑھانا اسی قدیم دور کی نشانی معلوم ہوتی ہے۔ ہند میں رقص و موسیقی کی مذہبی اہمیت کا سلسلہ دراوڑی عہد سے ملتا ہے کیونکہ بعض مورتیوں سے رقص کے مناظر بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ سمیریہ کے قدیم باشندوں کی طرح بدروحوں کی پرستش توہم پرستی کی حد کا پتہ دیتی ہے۔

دراوڑوں کے مذہبی تصورات نے ملی جلی بودوباش کی بنا پر ایرین کے مذہبی تصورات پر بھی اثر ڈالا۔ یہ ابتدا میں مظاہر پرست تھے جہاں بھی گئے، اسی مظاہر پرستی کا تصور ساتھ لے کر گئے لیکن دراوڑوں سے گریز کے باوصف مقامی رنگ و بو میں ایسے رنگے کہ اکثر و بیشتر مقامی مذہبی تصورات قبول کر لیئے اسی بنا پر محققین کے نزدیک ایرین کے اکثر مذہبی تصورات دراوڑوں کے قدیم مذہبی تصورات کی ایک اعلیٰ اور ترقی یافتہ صورت ہیں۔

علمی ترقی:۔ علمی ترقیوں کے بارے میں بھی بجز کھدائیوں کے کوئی دستاویزی ثبوت موجود نہیں، ہاں بدیہی قرائن سے رسم الخط کی موجودگی کے ساتھ ان کی تحریری واقفیت ظاہر ہوتی ہے اور یہ قرائن اُن مہروں کی دستیابی سے یقین وازعان سے بدل جاتے ہیں جو دراوڑی تاجر برآمد ہونے والے کپڑوں پر اپنے ناموں کے بجائے لگایا کرتے تھے لیکن رسم الخط کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا اُس وقت کے ترقی یافتہ اور تہذیبی خطوں میں دو قسم کے خطوط جاری تھے۔ تصاویری اور علامتی۔ یعنی ہر لفظ کیلئے ایک جداگانہ علامت، اس لیئے قیاس کہتا ہے کہ انہی دو رسم الخطوں میں سے کوئی ایک ہوگا۔ حروف تہجی پر مبنی رسم الخط کے بانی سامی فنیقی عرب کہے جاتے ہیں جو ساحلِ فلسطین پر آباد تھے اور اپنی بحری تجارت کے اعتبار سے وہ ایک طرف ایشیائی اور افریقی علاقوں پر اثر انداز تھے اور دوسری طرف اُن کا تہذیبی رنگ یونان تک پھیلا ہوا تھا۔ مصر و یونان اور جزائر کریٹ کے باشندوں نے بھی انکے حروف تہجی سے استفادہ کیا ہے۔ بدیں وجہ اہل قیاس کے نزدیک دراوڑی رسم الخط بھی ضرور متاثر ہوا ہوگا۔ حروف تہجی کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن اس وقت کے حروف تہجی کی تعداد سینکڑوں سے آگے تھی اس لئے آر۔ ڈی بنرجی اور سرجان مارشل کے متفقہ قیاس کے بموجب بابلیوں کے حروف تہجی کی طرح دراوڑی حروف کی تعداد بھی ڈھائی سو سے کم نہ تھی۔ بابلیوں کا خط بھی انہی تعداد کے ساتھ حمورابی کے زمانہ تک جاری رہا ہے۔ اسی سے ان دونوں ماہرین نے یہ رائے قائم کی ہے جو بڑی حد تک قرینِ عقل بھی ہے۔ وادی سندھ، گجرات، جنوبی ہند اور بنگال کی کھدائیوں سے جو مہریں ملی ہیں اُن سے علامتی اور ابجدی، دونوں رسم الخطوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس سے بعض اہل قیاس نے اندازہ لگایا ہے کہ ابتدا میں علامتی رسم الخط مروج تھا اور بعد کو ابجدی سلسلہ شروع ہوا۔ فادر ہیراس نے مختلف حصوں کی کھدائیوں سے برآمد شدہ مہروں کو پڑھ کر یہ رائے قائم کی ہے کہ دراوڑی رسم الخط ابتدائی

حروف تہجی پر مبنی تھا اور ان کی زبان تامل زبان سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی بہر حال اِن قرین عقل قیاسات سے یہ بات سرحدِ یقین تک پہونچ جاتی ہے کہ ڈراوڑ لکھنے پڑھنے کے فن سے بخوبی واقف تھے ان دستیاب شدہ اشیاء سے کسی تصنیف کا ثبوت نہیں ملتا لیکن تاریخی جستجو سے مختلف علماء و محققین کی تحقیقی کاوشیں نظروں کے سامنے آجاتی ہیں جن کو ترتیب دینے اور اُن سے نتائج اخذ کرنے سے حقیقت کی صحیح صورت روشن ہو جاتی ہے ان محققین کے نزدیک فطرت کی صحیح بخشی کی بنا پر علم کا آغاز اِسی سرزمین علم و حکمت سے ہوا یعنی دنیا کی پہلی کتاب ارض ہند میں تصنیف ہوئی۔ چنانچہ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنی مشہور تصنیف "غزالان ہند" میں شیخ علی اروی کی تصنیف "محاصر الاوائل و مسائر الاواخر" سے یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ: ۔

"اول موضع وضعت فیہ الکتب وانفجرت منہ ینابیع الحکمۃ کان الہند"[1]

یعنی سب سے پہلے جس سرزمین پر کتاب لکھی گئی اور جہاں سے علم و حکمت کا چشمہ نکلا وہ ہندوستان ہے۔ حضرت امیر خسرو نے بھی اپنی تصنیف "مثنوی نہ سپہر" میں علمی اور ایجادی اولیت کے بیان میں علم کی اولین بنیاد کا سہرا ہندوستان کے سر باندھا ہے۔ ان دونوں بیانات کی روشنی میں دنیا کی پہلی تصنیف کا دعوی ایرین دور نہیں کر سکتا کیونکہ ایرین اور یونانی تہذیب کا نقطۂ آغاز ایک ہی ہے۔ ان دونوں تہذیبوں سے صدیوں پہلے دجلہ اور فرات کی شاداب وادیوں میں بابلی نام کی تمدن آشنا اور علم دوست حکومت قائم تھی۔ جس کے ایک حکمراں حمورابی کا دو سو بیاسی دفعات پر مشتمل مسودہ قانونی تصنیفی سلسلہ کی موجودگی ظاہر کرتا ہے[2]۔ ملک میں محرروں منشیوں اور عاملوں کی کثرت۔ ملازمت کے لئے علمی ڈگری کی شرط اور مناور میں لائبریریوں کی موجودگی بھی تصنیفی موجودگی کی آئینہ دار ہے[3]۔ اس سے بھی صدہا برس پہلے سرزمین فراعنہ (مصر) میں آفتابِ علم پوری تابناکی سے روشن رہ چکا ہے۔ پادری مانیتھو (MANTHEW) کی تصانیف اور قدیم یونانی مورخ ہیروڈوٹس کے بیان سے متعدد علوم و فنون پر مصری تصانیف کا پتہ چلتا ہے

(باقی مضمون آئندہ شمارہ میں)

۱۔ مضامین شبلی ۔ ۲۔ حمورابی تقریباً سوا دو ہزار برس قبل مسیح بابل و نینوا کا ایک زبردست اور منصف مزاج بادشاہ گذرا ہے اس کا سب سے اہم کارنامہ اہل بابل کیلئے ایک قابل عمل دستور کا مرتب کرنا ہے' دنیا کا یہ قدیم ترین دستوری مسودہ 'دو سو بیاسی دفعات پر مشتمل تھا سنہ ۱۹۰۱ء کی کھدائیوں کے سلسلہ میں عراق میں سوسہ کے مقام پر پتھر کی ایک تختی پر کندہ صورت میں ملا ہے۔
۳۔ کاغذ کی عدم موجودگی کے باعث یہ تصانیف مٹی کی تختیوں پر ہوتی تھیں' لکڑی کی پنسل سے گیلی مٹی کی تختیوں پر لکھ کر پختہ کر لیا جاتا تھا اور یہ تختیاں مٹی کے مرتبانوں میں رکھ کر مناور میں رکھی جاتی تھیں۔

جگر کے نقاد

جگر کے نقادوں کی متوازی رائیں یہاں پر صرف انھیں حضرات کی رایوں سے بحث کی جائے گی۔ جنھوں نے اردو ادب میں کوئی مقام حاصل کر لیا ہے بعض غیر معروف حضرات نے بھی جگر پر اعتراض کرنے کے لئے قلم اٹھایا ہے لیکن ان کے اعتراضات کی کوئی خاص اہمیت نہیں، زیادہ تر ان کے اعتراضات برائے اعتراض ہیں اس لئے انھیں قصداً نظر انداز کر دیا گیا ہے ان غیر معروف حضرات کا تذکرہ آگے چل کر ضمناً کر دیا جائے گا۔

جگر مرادآبادی پر سب سے پہلا مقالہ مرزا احسان احمد صاحب (اعظم گڑھ) نے ۱۹۲۶ء کے "مخزن" میں لکھا تھا اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے احسان احمد صاحب کی رائے کی جانچ کی جائے انھوں نے جس وقت یہ مقالہ لکھا تھا اس وقت تک جگر کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا۔ ان کے پیش نظر جگر کا وہ کلام تھا جو بعد کو داغِ جگر کی شکل میں شائع ہوا۔ اس کلام کے پیش نظر مرزا احسان احمد صاحب نے اپنی متوازی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :- "ہمارا دوست نہ کوئی بڑا آدمی ہے نہ وہ فلسفہ یا پالیٹکس کہتا ہے نہ وہ تاریخی واقعات لکھتا ہے نہ وہ رہبران قوم کی مداحی کرتا ہے۔ وہ صرف شاعر ہے عشق و محبت اس کا خمیر ہے۔ وہ ازل سے ایک درد مند دل لے کر آیا ہے اس کا ہر شعر ایک جذبۂ مجسم ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنے دردِ دل کا اظہار کرتا ہے۔ اس کو اس کی پرواہ نہیں کہ کوئی اس کا سننے والا بھی ہے۔ خود اس کا دل اس کی شاعری کی داد دیتا ہے۔ اور یہی اس کے کمالِ شاعری کا حقیقی ثبوت ہے۔"[1]

مرزا احسان احمد کا مندرجہ بالا بیان حقیقت پر مبنی ہے اس کے ثبوت میں جگر کے اس دور کے کلام سے کچھ اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں جو احسان صاحب کے اس دعوے کی تصدیق کریں گے وہ اشعار یہ ہیں ؎

بیتابیوں نے کام دیا دستِ ناز کا — آخر لپٹ کے سو گئے دردِ نہاں سے ہم
قیدِ قفس میں یادِ بہار آئی ہے مجھے — نشتر بنے ہوئے ہیں پر و بال آج کل
کچھ کھٹکتا تو ہے پہلو میں مرے رہ رہ کر — اب خدا جانے تری یاد ہے یا دل میرا

۱؎ شبلی کالج میگزین (جگر نمبر) [illegible] صفحہ ۲

محفوظ اک جگہ بھی نہیں جسمِ زار میں
خود بن گیا ہوں اپنا گریباں بہار میں

دستِ جنوں میں عشق کی گلکاریاں نہ پوچھ
ڈوبا ہوا ہوں سر سے قدم تک بہار میں

مایوس شبِ ہجر نہ ہو اے دلِ بیتاب
اللہ دکھائے گا تو دیکھیں گے سحر بھی

ہم اور ان کے سامنے عرضِ نیازِ شوق
لیکن ہجومِ شوق سے مجبور ہو گئے!

یاد ہے آج تک مجھے پہلے پہل کی رسم و راہ
کچھ انھیں اجتناب سا کچھ مجھے احتمال سا

چلا یاد سے بھی تری کچھ نہ کام
بس اتنا ہوا آنکھ تر ہو گئی!

ہر قدم پر ہر روش پر ہر ادا پر ہر جگہ
دیکھنا پڑتا ہے اندازِ نگاہِ یار کو

محشر میں بات بھی نہ زباں سے نکل سکی
کیا جھک کے اس نگاہ نے سمجھا دیا مجھے

احسان صاحب کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے بھی "شعلۂ طور" کے مقدمہ میں "تعارف شاعر" کے عنوان سے اپنی گراں قدر رائے دی ہے انھوں نے جگر کے کلام "شعلۂ طور" کے پیش نظر ۱۹۳۳ء میں یہ صحیح ارشاد فرمایا تھا کہ:—

"جگر شاعر ہے مگر کیسا شاعر؟ تنہا شاعر، بلکہ ہمہ شاعر، انکا طرز ابنائے زمانہ کے طرز سے الگ لکھنؤ اور دہلی دونوں حکومتوں سے آزاد، موزوں الفاظ اور دلکش ترکیبوں کے باوجود بے ساختگی اور آمد سے معمور، تکلف، تعمق اور آورد سے پاک، طلسم الفاظ سے خیالات کی ایک دنیا بنا کر کھڑی کر دینے والا جگر کا کمال یہ ہے کہ سادگی اور تکلف کی ہر شان سے بے نیازی کے باوجود اس میں بے حد فطری آرائش اور خود نمائش حسن ہے جگر کی شاعری کے معنوی خیالات بہت مختصر ہیں وہ انھیں الٹ پلٹ کر دہراتے رہتے ہیں، مگر وہ جب کہتے ہیں تو سننے والوں کو وہ بلعت نئی معلوم ہوتی ہے[1]۔"

سلیمان صاحب کے اس ارشاد کی غمازی مندرجہ ذیل اشعار کرینگے ؎

فریاد کیسی؟ کسکی شکایت؟ کہاں کا حشر؟
دنیا اُدھر ہی ٹوٹ پڑی وہ جدھر ہوا

جو کچھ بچ رہا تھا مرا خونِ دل
وہی آسماں پہ شفق ہو گیا

مری موت سن کر کیا اس نے ضبط
مگر رنگ چہرے کا فق ہو گیا

جس کو نعمت یہ ملے کیوں وہ رہے آزردہ
سو خوشی ایک ترے غم میں پریشاں ہونا

---

[1] "فروغ اردو" اگست و ستمبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۲۔

مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں اختر علی تلہری کا یہ بیان بھی صحیح معلوم ہوتا ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ :۔

"جگر ایک خوش گو شاعر ہیں ان کے بیشتر اشعار دلپذیر ہوتے ہیں۔ صاحبان ذوق انھیں پڑھ کر سرور و انبساط حاصل کرتے ہیں انکی دلپذیری اور تاثیر کا راز ان کے خیالات کی بلندی انکی "متصوفانہ حیثیت" میں مضمر نہیں ہے کیونکہ حقیقت میں جگر نہ تو کوئی بلند خیال شاعر ہیں اور نہ "معارف تصوف" کے محرم راز انھوں نے اپنی غزل گوئی کے لئے کوئی نیا راستہ بھی نہیں بنایا ہے زیادہ تر وہی فرسودہ خیالات ہیں جنھیں پرانے اور موجودہ شعرا مختلف عنوانوں سے ادا کر چکے ہیں وہی رندی اور سرمستی کے افسانے ہیں، وہی عشق و محبت کی داستانیں، وہی ہجر و وصال کے قصے، وہی گل و بلبل کی حکایتیں، البتہ جگر کے انداز تخیل میں شگفتگی اور اسلوب ادا میں رنگینی ضرور پائی جاتی ہے اور جہاں کہیں ان دونوں کا امتزاج حسن کے ساتھ ہو جاتا ہے تو نشاط انگیزی اور سرور بخشی کی کیفیت خصوصیت سے ان میں پیدا ہو جاتی ہے[1]

تلہری صاحب کا یہ قول شعلۂ طور کے بارے[2] اور صرف اسی حصہ کے لئے یہ صحیح بھی ہے۔ اسی مجموعہ کے ایک شعر کے متعلق تلہری صاحب کی یہ رائے بھی صحیح ہے کہ ؎

برسائی آنسوؤں کی جھڑی چشم یار نے　　　کیا اٹھ کے کہہ دیا میری خاکِ مزار نے

"جھڑی لگتی ہے برسائی نہیں جاتی"[2]

شعلۂ طور ہی کی اشاعت کے بعد عندلیب شادانی نے بھی جگر پر اعتراضات کرنے شروع کئے تھے ان کے بعض اعتراضات معقول ہیں جو درج ذیل ہیں ؎

دل کی ہر چیز جگمگا اٹھی !　　　آج شاید وہ بے نقاب ہوا

کوئی معمولی شاعر اگر اسی خیال کو نظم کرتا تو یوں کہتا کہ " دل کا ہر ذرہ جگمگا اٹھا"..........

بیٹھا ہوں مست و بے خود خاموش ہیں فضائیں　　　کانوں میں آ رہی ہیں بھولی ہوئی صدائیں

مست و بے خود کو کیا خبر کہ فضا خاموش ہے یا شور سے گونج رہی ہے۔ خیر فرض کر لیا کہ فضا خاموش تھی اور فضا جب خاموش تھی تو کانوں میں صدائیں یقیناً آ رہی ہوں گی۔ یہ بات تو سمجھ میں آ گئی لیکن یہ معمہ پھر بھی

---

[1] جگر مراد آبادی شعلۂ طور کے آئینے میں" یہ اختر علی صاحب تلہری کا ایک مقالہ ہے جو راقم کو تلہری صاحب کے صاحبزادے آفتاب اختر سے دستیاب ہوا آفتاب اختر نے بتایا کہ یہ مقالہ "نگار" میں شعلہ طور کی اشاعت کے بعد فوراً شائع ہوا تھا مقالہ کی اصل کاپی۔ راقم کے پاس محفوظ ہے۔ [2] تلہری صاحب کا مقالہ جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے

حل نہ ہوا کہ جہاں آپ مست و بے خود بیٹھے ہوئے تھے وہاں کتنی فضائیں تھیں غالباً فضا تو ایک ہی ہوگی۔

میں دور ہوں تو روئے سخن مجھ سے کس لئے　　　تم پاس ہو تو کیوں نہیں آتے نظر مجھے

"روئے سخن" کسی کی طرف ہوتا ہے "کسی سے" نہیں ہوتا لہذا "میں دور ہوں تو روئے سخن میری طرف کس لئے" کہنا چاہیئے......

چین اسیران قفس کو یا دگلشن میں نہیں　　　دوڑتی ہیں بجلیاں سیلاب خوں تن میں نہیں

جسم میں خون کی گردش کو سیلان کہتے ہیں سیلاب نہیں.....

شمع چپ پروانے ششدر اہل دل سب دم بخود　　　ہائے کیا تصویر کا عالم تری محفل میں ہے۔

جگر صاحب کے محبوب کی محفل میں شمع چپ ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شمع کبھی بولتی بھی ہے اور اگر بولتی نہیں تو یہاں چپ کہنے کا کیا حاصل؟ اور اگر یہ چپ "خاموش" کا ترجمہ ہے تو ایک نئی مشکل کا سامنا ہے کیوں کہ فارسی میں شمع کا خاموش ہونا شمع کے بجھ جانے کو کہتے ہیں۔ اگر چپ سے مراد بجھی ہوئی شمع ہے تو پھر وہاں بیچ بیچ کے پروانوں کا کیا کام؟.....

چیخی ہے کس انداز سے کس کرب و بلا سے　　　دل ٹوٹ گیا نالۂ بلبل کی صدا سے

"کرب سے چیخنا" تو سمجھ میں آتا ہے لیکن بلا سے چیخنا کیا معنی؟......

لے لیا کام جو لینا تھا غم ہستی نے　　　گرچہ ثابت نہ ہوئی میری ضرورت مجھ کو

"میری ضرورت" کی جگہ "اپنی ضرورت" چاہیئے[1]

اسی عہد کے ایک شعر پر یگانہ کا بھی یہ اعتراض صحیح ہے —

منزل عشق اے خدا کی پناہ　　　ہر قدم کربلائیاں توبہ

کربلائیاں نئی جمع ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ لکھنؤ کی ہوا کھا کر پیدا ہوئی ہے اور اس آب و ہوا میں جتنی من گھڑت جمعیں بنائی گئی ہیں۔ ان میں یہ جمع کچھ معنویت رکھتی ہے۔ یعنی کربلائیاں بمعنی قربانیاں، جاں نثاریاں وغیرہ بلکہ وہ تمام مفہوم جو لفظ کربلا کے ساتھ وابستہ ہے[2]

شعلۂ طور ہی کے متعلق محمد ضیاء الاسلام نے بھی صحیح لکھا تھا کہ :—

"جگر نے غزل کو اپنا لیا ہے اور غزل نے ان کو...... جگر رنگ و بو کی دنیا میں رہ پڑے۔ ان کا دماغ ان کی خوشبو سے معطر ہو گیا انھوں نے اس رنگ و بو کی دنیا کو ہر دوسرے پہ مسلط کرنا شروع کر دیا۔ ان کو

---

[1] [illegible] جگر" [illegible] [2] "[illegible] خیال" لاہور سالنامہ [illegible]

ایک رنگین وادی میں جگہ مل گئی۔ اگر آوازِ گیر و دار اٹھے بھی تو وہ اس کو اہمیت نہیں دیتے اور حسن و عشق کے نغمے الاپے جاتے ہیں ؎

سنائے تھے لب نَے سے کسی نے جو نغمے — لبِ جگرؔ سے مکرر سنائے جاتے ہیں[1]

مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں کہ:۔

"جگر کٹر غزل گو شاعر ہیں اور حسن و عشق کے احساس سے علیحدہ ہو کر انھوں نے کبھی شعر نہیں کہا۔ انکے کلام میں بیشتر ربودگی پائی جاتی ہے۔ جس کو تغزل کا اصلی جوہر بتایا گیا ہے۔ ان کی زبان اور انداز بیان میں جو بے اختیاری ہوتی ہے وہ ان کی اپنی چیز ہے اور اردو غزل میں بالکل نیا عنوان ہے عشقیہ زندگی کے واردات و معاملات کی نزاکتوں کو جدید نفسیات کا لحاظ رکھتے ہوئے بیان کرنے میں وہ اکثر قابلِ رشک حد تک کامیاب ہیں"[2]

جگر کی اسی عہد کی شاعری کے متعلق مجنوں گورکھپوری نے لکھا تھا کہ:۔

جگر کی شاعری بہت سطحی شاعری ہے۔۔۔۔ جگر کی شاعری میں جو نیا پن ہے اس کا تعلق دراصل انداز اور اسلوب سے زیادہ ہے۔ فکر و احساس سے کم ہے اور جدید اردو غزل میں یہی اسلوب جگر کا اضافہ ہے۔۔۔۔

جگر کی شاعری میں فکر و تامل کا کوئی میلان نہیں ہوتا وہ زندگی کے عام انسانی اور کائناتی اسرار و رموز پر کوئی سوچی سمجھی رائے نہیں رکھتے۔ ان کی شاعری خالص جذباتی شاعری ہے اور اس جذباتی شاعری کا دائرہ بھی عشق کے موضوع تک محدود ہے[3]۔

مجنوں کے اس بیان میں بھی صداقت ہے کیونکہ جگر کا یہ دور ان کی سرشاری و سرمستی اور عشق و محبت کا دور تھا۔ شراب اور وہ دونوں لازم و ملزوم تھے۔ زندگی میں کوئی مستقل مزاجی نہیں تھی کبھی اِس شہر میں ہیں تو کبھی اُس شہر میں۔ احباب کی محفل سے جب فرصت ملتی تو شراب کا دور چلاتے۔ جس کی زندگی ان حالات میں گزر رہی ہو اس کے یہاں فکر و احساس کیسے پیدا ہو سکتا ہے اور انسانی اور کائناتی اسرار و رموز پر کوئی سوچی سمجھی رائے کیسے رکھ سکتا ہے جس کو اپنی خبر نہ ہو وہ کسی اور کی خبر کیا رکھے گا یا کوئی سوچی سمجھی رائے کیا قائم کرے گا۔ دراصل انھیں سوچنے سمجھنے کا موقع بھی تو نہیں ملا۔ لیکن جب انھوں نے شراب ترک کر دی اور باقاعدہ متاہل زندگی گزارنے لگے تو ان کے یہاں فکر و احساس کی گہرائی بھی پیدا ہونے لگی اور انسانی اور کائناتی اسرار و رموز پر ان کی ایک سوچی سمجھی رائے کا اظہار بھی پایا جانے لگا۔

(باقی آئندہ شمارہ میں)

۱۔ "ادیب" اکتوبر ۱۹۳۳ء ص ۱۱ ۲۔ "شعر اور غزل" ص ۱۲۴–۱۲۵ ۳۔ "آجکل" یکم ستمبر ۱۹۴۹ء ص ۶ تا ۹

دائم مہدی جامی

اکبر الہ آبادی اور ان کا فن

۱۹ء میں اکبر الہ آبادی کا انتقال ہوا ہے۔ جو زمانہ انھوں نے دیکھا وہ ہندوستان کے لئے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے فن اور عہد کو ایک دوسرے سے جدا کرکے نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ ایک ظرافت نگار شاعر تھے اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ظریف ہونے کے علاوہ کچھ اور نہ تھے۔ ظرافت کا مسئلہ بعض اوقات سنجیدہ شاعری سے بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ظریفانہ شاعری کا مقصد محض ہنسا ہنسانا نہیں۔ ہنس تو آپ ایک پاگل آدمی کی باتوں سے بھی سکتے ہیں۔ ادب زندگی سے نکلتا ہے زندگی سے متعلق ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور رہتا ہے ادب اپنے ہر شعبہ سے زندگی کے اعلیٰ مقصد کو حاصل کرنے کی تعلیم دیتا ہے خواہ دوڑ لاکر مقصد کی طرف اشارہ کرے خواہ ہنسا کر یا کسی اور طرح سے جذبات کو ابھار کر۔ اسی لئے ظرافت نگار کے لئے سنجیدہ ادب لکھنے والوں سے زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ ظرافت کے مدعا کو ہمیں سمجھنا چاہئے۔ ظرافت سے مراد اگر صرف وہ چیز جو ہمیں ہنسنے پر مائل کرے یا راغب کرے تو یہ اعلیٰ پایہ کی چیز نہیں جس کے ساتھ لٹریچر کو ملوث کیا جائے۔ قہقہہ اور ہنسی ظرافت کا مقصد نہیں۔ ظرافت اور اس کے وجود میں آنے کی ان معنوں میں محض ایک علامت ہے جیسے کہ بخار مرض کی علامت ہے۔ اگر ظرافت ٹھیک ہوگی تو آدمی میں انبساط پیدا ہو جائے گا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر قہقہہ کی تہ میں ظرافت ہو۔ ہنسانے کے لئے تو روزمرہ کی زندگی میں ایسی باتیں ہوا کرتی ہیں جو کافی ہیں۔ بچے کی معصومیت کی باتیں آپ کو ہنسا سکتی ہیں۔ تو ادب میں ظرافت کیوں پیدا کی جاتی ہے اور اس کا کیا مقصد ہے۔ تو جو ادب کا مقصد ہے وہ ظرافت کا بھی مقصد ہے۔ ادب بہترین ادب اس وقت ہو سکتا ہے جب زندگی کی صحیح قدروں کی طرف وہ رہنمائی کرے۔ سماج کی ظرافت کے مقصد ادبی ظرافت سے علیحدہ نہیں۔ اچھے قسم کی ظرافت وہ ہے جو اعلیٰ مقاصد کی طرف رہنمائی کرے۔

کارٹونوں کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ آدمی کی جو Idiosyncrasy ہوتی ہے اس کو دکھائے بنیادی طور پر یہ ایک ظرافت نگار کا کام ہوتا ہے کہ جو آدمی کے چھپے عیوب ہوتے ہیں اس کو ظاہر کرے تلاش کرے اور بتلائے نکتہ چینی اور عیب جوئی نہ اعلیٰ مقصد کبھی رہا ہے اور نہ رہے گا کیونکہ اس سے دوسروں کی

داخلی ہوتی ہے۔ ظرافت کی ہیئت کا رجو مقصد ہوتا ہے وہ بہت سنجیدہ قسم کا ہوتا ہے سنجیدہ ادب کی طرح اس کا بھی مقصد ہوتا ہے۔ انسانی مسائل کو حل کرنا' نفسیاتی الجھنوں کو دور کرنا سنجیدہ ادب اور ظرافت کا مقصد جب ایک ہے تو ظرافت نگار ایک مشکل میں ہوتا ہے کیونکہ ادب والوں کے مسائل بھی سنجیدہ ہوتے ہیں اور اسے پیرایہ بیان ظریفانہ اختیار کرنا ہوتا ہے اسی لئے عام طور پر ظرافت نگاری کو مشکل فن کہا گیا ہے کیونکہ ذریعہ اور مقصد میں فرق ہوتا ہے جبکہ مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ اس کی مطابقت میں ہونا چاہیئے۔

رشید احمد صدیقی صاحب نے ظرافت نگاری کے لئے دو نہایت ہی مناسب مثالیں دی ہیں' ایک تو بجلی سے دوسری سفلی عمل سے جو کہ خراب ہونے پر خود عمل کرنے والے پر پلٹ جاتا ہے ذرا سی لغزش جان لیوا بھی ثابت ہوتی ہے اور وہ پلٹ کر عمل کرنے والے کی طرف آجاتا ہے یہ فن اب بھی موجود ہے اس لئے اس کی مثال سمجھنا مشکل نہیں ظرافت نگاری کی نوعیت بھی ایسی ہے کہ اگر اس کی ہیئت میں ذرا فرق ہو تو وہ خود پلٹ کر ظرافت نگار کی طرف آجاتی ہے مشکل تو یہ ہوتی ہے کہ جب آپ کی کمزوری پر کوئی ٹھٹھا لگائے تو اس کو ٹھٹھا لگانا، تو در کنار مسکرانے کا بھی حق نہیں لیکن ظرافت نگار اس پر ہنس بھی سکتا ہے لیکن اگر کسی نے ذاتی چوٹ کی تو وہ پٹ پٹا بھی جائے گا لیکن اگر اس نے اس کو کسی اور فرضی کردار کے ذریعہ ظاہر کیا تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا وہ جن لوگوں کو اپنی ہنسی کا موضوع بناتا ہے وہ سماج کی کمزوریوں کے مجسم نمائندے ہوتے ہیں اور انفرادی مسائل کے آدمی نہیں ہوتے بلکہ سماج کے مسائل کے نمائندے ہوتے ہیں۔

اکبر کے یہاں اسی طرح سے جن موجود ہیں ان سے مراد کوئی خاص آدمی نہیں بلکہ سماجی رجحان کے مجسمے کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں اسی طرح سے ان کے یہاں کئی اور کردار ہیں جیسے کہ سید صاحب.......

بڑی شاعری کا مقصد ہنسی نہیں ہے بلکہ ان باتوں سے انسان کی کمزوریوں کا احساس دلا کر انھیں دور کرنا ہے۔ اکبر کی شاعری میں مزاحیہ عنصر زیادہ غالب ہے۔ کسی صنف میں مزاح کس کو کہتے ہیں مزاح کی کیا قسمیں ہیں یہ سب اکبر پر لکھتے وقت ذہن میں رکھنا چاہیئے۔

طنز' ظرافت' مزاح اردو میں ان تمام لفظوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن انگریزی میں Humour اور Satire اور Wit میں نمایاں فرق ہے لیکن ان میں سے کسی میں سے ہم ہنسی کے عنصر کو نکال نہیں سکتے ویسے اردو میں بھی طنز کا مطلب یہ نہیں کہ اس میں ہنسی کا عنصر نہیں بلکہ طنز میں سنجیدگی بھی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ نشتریت بھی ہونی چاہیئے۔

Wit کا تعلق محض ہنسی سے ہے ایک نکتہ سنج انسان کسی کا مذاق اڑاتا ہے نہ اس کو کسی سے نفرت ہی ہوتی اور نہ اس میں کسی کے خلاف نفرت کا جذبہ ہوتا ہے۔ ہجو میں ہنسی بھی ہوتا ہے

[illegible] بہت ہوتی ہے لیکن اس کو طنز کے ساتھ نہیں بلکہ ہنسی کے پیرایہ میں بیان کیا جاتا ہے ایسا
ہجو کو شخصی کسی صورت میں بھی نہیں ہونا چاہئے۔ کیوں کہ ظریف کو دو سوں سے لفت
ہوتی ہے۔ جیسے کوئی نسخہ بنتا ہے کہ کونسی دوا اس میں کتنی ڈالی جائے گی۔ ظرافت میں عام طور سے جو چیز پائے
جاتے ہیں ان میں ایک تو تمسخر ہے کیونکہ اگر آپ ہنس نہیں رہے ہیں تو وہ ظرافت نہیں۔ اگر آپ کسی سے یہ کہہ دیں
کہ آپ لنگڑے ہیں تو یہ عیب اچھالنا ہوا ہنسی کی بات تو نہ ہوئی۔ لیکن اگر آپ اس کو بطور رمز کے استعمال
کریں اور وہ شخصی .... نہ رہے بلکہ اس کو منتخب کر کے اس قوم کی علامت بنائیں اور فرضی کردار لے کر
آپ لوگوں کی کمزوریوں پر ٹھٹھا لگائیں گے تو عیب جوئی کا پہلو نہ رہے گا بلکہ فرضی آدمی کو قوم کی خرابی کا نشان بنا لیں گے
بعض لوگ جھنجھٹی ہوتے ہیں جیسے کہ امتیاز علی تاج کا چچا چھکن ہے ایک فرضی آدمی ہے لیکن وہ ایسے لوگوں کو

.... علامت بنا تے ہیں جو خواہ مخواہ کام میں اتنے شعبے نکال لیتے ہیں اور پھر بھی کام اس معیار کا
کا نہیں ہوتا جیسا کہ ہونا چاہئے جیسے کہ چچا چھکن نے خط لکھا یا تصویر لگائی یہ کوئی قصہ نہیں بلکہ ایک خاص طرح کی ذہنی
کیفیت ہے اس کے برخلاف بہت سے افسانے یا انشائیے مثال کے طور پر جو آپ کو شوکت تھانوی کے یہاں ملتے ہیں
ان میں گہرائی نہیں ہوتی ان میں تمسخر واقعی خرابیوں کا نہیں اڑایا جا رہا ہے بلکہ خرابیوں کا مضحکہ انگیز خاکہ
بنایا جا رہا ہے۔ ویسے تو کوئی بھی مزاح نگار مبالغہ سے خالی نہیں رہ سکتا۔ شوکت تھانوی کے یہاں مزاح ہلکے
قسم کا ہے اس میں بے تکلف قسم کا ماحول ہوتا ہے اور رل مل کر ایک ایسی فضا بن جاتی ہے جس میں فقرے کسے
جاتے ہیں اس پر وہ چلتا ہے اگر آپ اس میں گہرائی تلاش کریں تو نہ ملے گی۔ اس لئے بڑے نقادوں نے کہا ہے
کہ مزاح تو ظرافت کے لئے ایک اپیل ہے۔ اس میں سطحی چیز نہ ہونا چاہئے
اور جیسے جیسے سطحی پن آتا جائے گا وہ ٹھیک مزاح نہ رہ جائے گا۔ مثال کے طور پر رشید احمد صدیقی صاحب کا مزاح،
ان کے یہاں گہرے قسم کا مزاح ہے لیکن اس مزاح کو سمجھنے کے لئے ایک خاص قسم کے ماحول سے واقفیت ضروری
ہے اور وہ ماحول ہے علیگڑھ کا۔ اس ماحول سے قاری واقف نہیں تو ان کے مزاح سے ٹھیک طور سے وہ لطف
اندوز نہ ہو سکے گا۔ اس سے زیادہ بہتر مزاح وہ ہوگا جس میں آفاقیت ہو۔ مثال کے طور پر کنھیا لال کپور کا مزاح،
مزاح میں احساس برتری اور ہمدردی ہونی چاہئے اگر یہ عناصر ایک شکل میں جمع ہوں تو ان کو تمسخر کہہ لیجئے اور
کسی اور شکل میں تو طنز و ظرافت۔ میں آپ کا مذاق کیوں اڑاؤں اس لئے کہ میں اپنا احساس برتری آپ پر جتانا چاہتا
ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ مزاح نگار کے اندر یہی احساس چھپا ہوتا ہو لیکن جب وہ پیش کرتا ہے تو ایسا نہیں لگتا اور
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مزاح نگار کو اپنے کردار سے ہمدردی بھی ہو لیکن یہ ضروری نہیں ....

.... کہ مزاح کی تہہ میں احساس برتری کا بھی جذبہ ہو مثال کے طور پر ایک جذبہ آپ کے

سب میں
ظرافت پیدا ہوتا ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ بہت صالح قسم کا ہو۔ اگر آپ میں شدت کا احساس ہے اگر آپ کسی کو
اچھا ظرافت نگار دیں تو یہی مفید ہو سکتا ہے۔
یہ رہا اکبر الہ آبادی کے فن کا ٹکنیکل پہلو .... یعنی ظرافت کے معنی و مطلب
اور طریقہ اس کے علاوہ اچھی ظرافت کی خصوصیات' اب ہم ظرافت کے ذریعہ پر غور کریں گے۔
ظرافت کا ذریعہ:— بعض ظرافتیں وہ ہیں جو لفظوں کے ذریعہ سے پیدا کی جاتی ہیں بعض خیال کے ذریعہ سے
جیسے کہ اکبر کی نظم اک مس سیمیں بدن میں ظرافت صورت حال کو پیش نظر رکھنے کے ذریعہ سے پیدا کی گئی ہے — جب پوری
نظم کو پڑھ جائیے تو آخر کے شعر میں ؎

درمیانِ قعر دریا تختہ بندم کردہ ۔۔۔ باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

نتیجہ نکلتا ہے۔ اس میں الگ الگ ہر شعر میں ظرافت کا پتہ نہیں لیکن پوری نظم پڑھنے کے بعد ظرافت کا اندازہ ہوتا ہے
الفاظ کے بغیر ظرافت میں اثر نہیں ہوتا اس لئے اس میں ایک تیزی برجستگی اور آمد ہونی چاہیے خیال اگر ظریفانہ ہے
تو شاعر اس پر ظریفانہ کلام لکھ سکتا ہے اس کے علاوہ موقعی حالت کو پیش کرنے والی ظرافت پیچیدہ ....
اور مشکل ہوتی ہے کیونکہ سارا ماحول مل کر ظرافت پیدا کرتا ہے۔
اکبر کے یہاں ہم کو ہر طرح کی ظرافت ملے گی۔ موقعی حالت کو پیش کرنے والی کی ظرافت میں مختصر افسانے کی سی پیچیدگی
ہوتی ہے اور اس کی خصوصیت کو ہم اس طرح سے جانچ سکتے ہیں جیسے کہ اک مس سیمیں بدن ایسی ہی ....
ظرافت ہے کیونکہ لندن میں عقد کرنا اور پھر بعد میں نتیجہ نکالنا اور پھر اس کے اصل جز یا روح کو نکال کر ایک
قطعہ میں رکھ دینا شاعر کے لئے آسان نہیں۔ خیال' الفاظ اور ماحول ان تینوں ظرافتوں کو ایک دوسرے سے
الگ کرنا ممکن نہیں اچھی ظرافت تقابل ..... سے پیدا ہوتی ہے۔ ظرافت کی بنیاد میں یہ بات داخل ہے
کہ اس میں مقابلے کی کیفیت ہو جیسے جاہل کا پڑھے لکھے سے مقابلہ کیا جائے۔ بعض زمانے میں سوسائٹی میں تبدیلیوں
کی بنا پر تقابل ..... کی چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ جب زمانے میں سوسائٹی ایک ڈھرے پر چلتی ہے اس زمانے
میں اچھی ظرافت کا پیدا ہونا مشکل ہے کیونکہ ظرافت کی بنیاد میں یہ بات داخل ہے کہ وہ مقابلے سے پیدا ہوتی ہے
اس کے برخلاف ایسے زمانے میں جب گڑبڑ ہو رہی ہو سوسائٹی میں تبدیلیاں جلد جلد ہو رہی ہوں اچھے
ظرافت نگاروں کا پیدا ہونا آسان ہوتا ہے۔
اس خیال کی روشنی میں ہم دو سو سال کے ہندوستان کی تاریخ دیکھیں گے تو پتہ چلے گا کہ جب تک مغلیہ سلطنت
روبہ زوال نہیں ہوئی سوسائٹی ایک ہی ڈھرے پر چل رہی تھی۔ اس میں مقابلے کی کیفیت نہیں تھی اس لئے اچھے ظرافت
پیدا نہیں ہو سکی اس کے برخلاف ۱۸۵۷ء کے بعد سوسائٹی تیزی سے بدل رہی تھی ہمارے سماج میں انیسویں صدی

کے آخر تک کافی پیچیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع کا ہندوستان تھا۔ ایک تہذیب مٹ رہی تھی دوسری سات سمندر پار سے آکر جڑ رہی تھی یہ تمام جھگڑے پورے ہندوستان کے اندر رائج تھے ان جھگڑوں نے اچھے ظرافت نگار ہندوستان میں پیدا کئے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو فن کار پیش کر رہا ہے ہم اس کی اصلی شکل و صورت کو پہچان سکیں بلکہ اس تخلیق میں مبالغہ اور دوسری باتیں و واقعات ملکر اس کی صورت کو اس قدر مسخ کر دیتے ہیں کہ اس کی اصلی صورت کو پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ ہم اس میں سماجی باتوں کو پہچان نہیں سکتے۔ اس تضاد سے بھرپور سماج کا پہلا تحفہ ہمیں غالب کے خطوط کی صورت میں ملتا ہے اور اس زمانے میں ایسے پرچے بھی نکلنے لگے جو مزاحیہ تھے اگر مغلیہ سلطنت کے دوران میں ایسے پرچے نکلتے تو ان کے پاس لکھنے کے لئے مواد نہ ہوتا۔ اس زمانے میں نہ صرف اودھ پنچ نکلا بلکہ پنجاب سے بھی متعدد پرچے نکلے انھیں چیزوں کا عروج اکبر الہ آبادی کا کلام جاننا چاہیے۔ اس خیال کی روشنی میں کہ اچھی ظرافت سماجی تضاد سے پیدا ہوتی ہے اگر ہم آزادی کے بعد دیکھیں کیونکہ اب سوسائٹی ایک ڈھرے پر چلنے لگی ہے تو اچھی ظرافت کے نمونے نہ ملیں گے کنھیا لال کپور کو ہی لیجئے آزادی سے پہلے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اعلیٰ درجہ کی ظرافت نگاری کے نمونے ہیں اور آزادی کے بعد ان کی ظرافت میں وہ کیفیت باقی نہیں رہی کیونکہ سوسائٹی سے لکھنے کے لئے مواد نہ مل سکا۔

اخلاق فتحپوری

یہ اور بات ہے کہ رہے بے خبر سے ہم
تھے مستفید اُس نگہہ نیت نگر سے ہم

اُس زلف و رُخ کی یاد بنی مقصدِ حیات
اُکتا گئے تھے گردشِ شام و سحر سے ہم

جس سے کھلیں خیال کی کلیاں نظر کے پھول
لائے ہیں وہ بہار تری رہگذر سے ہم

خود کو تباہ کرتے ہیں تجدید شوق میں
لیتے ہیں انتقام یونہی چارہ گر سے ہم

کتنی ہی بار ہو کے زمانے سے بدگماں
دامن بچا گئے ہیں تمہاری نظر سے ہم

آئینۂ حیات پہ کرتے رہے جِلا
اکثر خیالِ جلوۂ آئینہ گر سے ہم

اب وہ ہیں اور ان کی پشیماں نگاہیاں
محجوب ہیں خود اپنی دعا کے اثر سے ہم

فرصت خیالِ یار نے بخشی جو ہجر میں
دامانِ شب ملائیں گے چاکِ سحر سے ہم

اِس دورِ انحطاط میں قدرِ ہنر کہاں
اخلاق شرمسار ہیں عرضِ ہنر سے ہم

سہیل اختر

صدیوں کے ظلم و جبر سے گو وقفِ یاس ہے
اچھے دنوں کی دل کو مگر پھر بھی آس ہے

سازِ ادب سُنا نہ سکا نغمۂ نشاط
افکارِ عالیہ کو فقط غم ہی راس ہے

جس دوستی کے گل سے تھی رعنائیِ چمن
اُس گل میں آج رنگ ہے کوئی نہ باس ہے

شاداں اگر ہے دل تو ہر اک شے نشاط بخش
ہر ایک شے اُداس اگر دل اُداس ہے

ساقی نگاہِ مست سے ہم کو [illegible] کچھ عطا
جام و سبو سے بجھ نہ سکے یہ وہ پیاس ہے

خونِ جگر سے پاتی رہی پرورش حیات
ذوقِ نمو کی خونِ جگر پہ اساس ہے

باوصف احتیاط بھی پیتا رہا بشر
زہراب غم میں دوستو کتنی مٹھاس ہے

پھرتا ہے تو جو خاک بسر در بدر سہیل
شہر بتاں میں کس کو ترے غم کا پاس ہے

اقبال منہاس

اس طرح شاخِ نشیمن کو نکھارا ہم نے
خود کیا برقِ تپیدہ کو اشارا ہم نے

لوگ کہتے ہیں جسے صبح قیامت کا اِک
تیری فرقت میں وہ لمحہ بھی گزارا ہم نے

اپنے برباد سفینے کا الم کچھ بھی نہیں
دے دیا ڈوبنے والوں کو سہارا ہم نے

ہائے یہ دردِ محبت بھی اُنہی کا نکلا
جس کو رکھا تھا دل و جان سے پیارا ہم نے

آ گئی نیند سلگتے ہوئے کانٹوں پہ ہمیں
کر لیا دامنِ احساس کو پارہ ہم نے

وجہِ بربادیٔ دل پوچھنے والوں سے کبھی
بھول کر بھی نہ لیا نام تمہارا ہم نے

کتنے بے نام خیالوں کے شبستاں چمکے
تیری تصویر کو جب دل میں اُتارا ہم نے

رنگ حالات کے چہرے کا نکھر آیا ہے
جب کبھی آپ کی زلفوں کو سنوارا ہم نے

وہ جسے گنجِ گلستاں میں ملے تھے اقبال
اُس کو جلتے ہوئے شعلوں میں پکارا ہم نے

جاوید شِشت

کوئی پوچھے تو یہی عشق کے میخواروں سے
آبگینوں کو بھی ٹکراتے ہیں دیواروں سے

اک نظر، ایک تبسم، اک اشارہ، اے دوست
زندگی ہنس کے گزر جائے گی انگاروں سے

میرے شیشے میں تری یاد کا عکسِ رنگیں!
جیسے نکلا ہو نیا چاند شفق زاروں سے

رنگ اُڑتے ہیں کہیں پھول کہیں بکھرے ہیں
ہنس کے گزرے ہیں ترے آبلہ پا خاروں سے

سابقہ دل کا اندھیروں سے نہیں پڑ سکتا
روشنی پھوٹتی ہے درد کے انگاروں سے!

ٹوٹ جاتی ہے دھنک سی تری انگڑائی میں!
آنکھ سجتی ہے ترے حسن کے نظاروں سے

بخش دیں ایک کرن دل کے سیہ خانے کو
اتنا بھی ہو نہ سکا وقت کے مہ پاروں سے

گل، شفق، جام، دھنک، چاند، کرن، دیپ، کنول
مل گیا رنگ سبھی کو ترے رخساروں سے

گلستاں کی وہی بنیاد پڑی ہے اک دن
زندگی پھول سی گزری ہے جہاں خاروں سے

دل کی دھڑکن سے اُبھرتا ہے اثر کا جادو
شعر جاوید عبارت ہے جگر پاروں سے

مظفر حنفی

باغبانوں کو اجازت ہے کہ من مانی کریں
آیئے نظمِ چمن پر نوحہ خوانی کریں

اک نہ اک دن صبحِ مرضی ہم تراشیں بھی اسے
آپ ہی اُس بت پہ مرمٹنے کی نادانی کریں

دل تو بے حس ہو چکا ہے کثرتِ آلام سے
وہ شرر باری کریں یا شبنم افشانی کریں

ہم انھیں سمجھا رہے ہیں حق پہنچتا ہے جنھیں
جان کر سب کچھ اگر چاہیں تو انجانی کریں

خود لٹا دیتے ہیں اپنا گھر کہ خدشہ تو مٹے
تا کجا احباب کی خاطر نگہبانی کریں

رہنمایانِ وطن بھی واقعی مجبور ہیں!
سوچیے تو دور کس کس کی پریشانی کریں

اے مظفر کان ہی دھرتا نہیں وہ سنگدل
ورنہ یہ اشعار تو پتھر کو بھی پانی کریں

حسرت سہروردی

راستے بدلتے ہیں راہبر بدلتے ہیں
پھر بھی اپنی ہمت ہے ساتھ ساتھ چلتے ہیں

شاعری محبت ہے شاعری حقیقت ہے
شاعری کے پردوں میں انقلاب پلتے ہیں

زندگی کا افسانہ خشک بھی ہے رنگیں بھی
اک چراغ بجھتا ہے سو چراغ جلتے ہیں

ہو سکے تو آیا کر چاکِ دل رفو کریں
چشمِ نم میں رہ رہ کر اشکِ خوں مچلتے ہیں

منزلوں کے دیوانے منزلوں کی چاہت میں
رہزنوں کے بھی اکثر ساتھ ساتھ چلتے ہیں

ہم نے دیکھے ہیں اکثر آفتاب ایسے بھی
جو طلوع سے پہلے خود ہی آپ ڈھلتے ہیں

"ہم کہاں کے دانا ہیں کس ہنر میں یکتا ہیں"
پھر بھی جانے کیوں حسرت لوگ ہم سے جلتے ہیں

سید حرمت الاکرام

ہر نفس تیشہ زنی ہو جیسے
یہ بھی اک کوہکنی ہو جیسے

دل کا یہ حال نجانے کیوں ہے
عالمِ بے وطنی ہو جیسے

تہمتیں خود کو دئے جاتا ہوں
آپ اپنے سے ٹھنی ہو جیسے

تیرہ سامانیٔ ماحول کی خیر
رات رہ رہ کے گھنی ہو جیسے

پارہ پارہ ہوئی جاتی ہے حیات
خودگری، خودشکنی ہو جیسے

جینے والے جئے جاتے ہیں مگر
کچھ دِل و جاں پہ بنی ہو جیسے

جنگ یزداں سے چلی جاتی ہے
زندگی، اہرمنی ہو جیسے

اِن دنوں اپنے ہی دل پر حرمتؔ
مشقِ ناوک فگنی ہو جیسے

ڈاکٹر محمد عقیل

نہیں معلوم کہ وہ کون و مکاں کیا ہوں گے
اُس گلی میں مِری یادوں کے نشاں کیا ہوں گے

جب کبھی بادِ صبا جھوم کے آتی ہوگی
اُن مہکتی ہوئی زلفوں کے سماں کیا ہوں گے

ہم کہ ہوتے تھے نہ اپنوں میں نہ بیگانوں میں
جانے اب ہم پہ حسینوں کے گماں کیا ہوں گے

زندگی بارگراں کب ہوئی دل والوں کو
شمع کے رُخ پہ ہواؤں کے نشاں کیا ہوں گے

وہ بھی کیا دور تھا تم تھے مرے ہمدم مرے دوست
اور اب تم سے بڑے دشمنِ جاں کیا ہوں گے

جو ہوا کرتے تھے آئینِ خرد کے پابند
اِن بہاروں میں وہ صاحب نظراں کیا ہوں گے

فصلِ گل آ بھی چکی، قفلِ قفس ٹوٹ چکا
چلو دیکھیں اب اسیروں کے جہاں کیا ہوں گے

تیشہ بر دوش چلو لے کے جنوں کی مشعل
لبِ اعجازِ مسیحا نفساں کیا ہوں گے

نقد و نظر

"سفینہ چاہیئے" از حضرت شاد عارفی۔ مرتب:- سلطان اشرف۔ ناشر:- رامپور پبلشنگ سوسائٹی۔ بنگلہ آزاد خاں۔ رام پور۔ یو۔ پی
قیمت، دو روپیہ پچھتر پیسے۔

شاد تجرباتی شاعر ہے اس لئے شاعری میں ہوائی قلعے تعمیر نہیں کئے اور نہ ہی اس کے یہاں تصوراتی محبوبائیں منظر نظر آتی ہیں۔ شاد ذہنی تعیش اور آسیب زدگی سے محفوظ نظر آتا ہے بلکہ اس نے فرائیڈ کی لذت جنسی پر بھرپور وار کیا ہے، مغرب زدگی کی مذمت کی ہے اور بے سروپا نظم یا غزل کہنے سے گریز کیا ہے۔ شاد زندہ دنیا کا زندہ شاعر ہے اسی وجہ سے اس کی نگہ زندگی کے ہر پہلو پر گہری نظر آتی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہر نظم اور غزل کئی پہلوؤں کی آئینہ دار معلوم ہوتی ہے۔ خود شاد نے بھی اپنے مضمون میں ان ہی باتوں کا ذکر کیا ہے۔

جہاں تک شاد مرحوم کے فکر و فن کا تعلق ہے بقول ڈاکٹر محمد حسن شاد عارفی کا ایک خاص طرز ہے۔ وہ اپنی عمر کے لحاظ سے قدیم اور فن کے لحاظ سے جدید دور میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ شاد نے مسلم معاشرے پر گہری چوٹیں کی ہیں، مولانا و مولوی کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ شاید اسی وجہ سے لوگ انہیں کمیونسٹ سمجھتے رہے۔ شاد مسلمان تھے۔ "یہ عبادت یہ رسوم" شب برات، پہلا روزہ وغیرہ ان کی مذہبی فکر و جذبات کے آئینہ دار ہیں۔ سفینہ چاہیئے میں فکر انگیز نظموں کے ساتھ ساتھ ان کی غزلیں اور قطعات بھی شامل ہیں۔ شاد کا یہ شعر اس کے شعور فن کو ظاہر کرتا ہے:-

مجھے بھی شاد رنگیں شاعری کا شوق تھا　　مگر وہ عمر سرخوشی کی تھی یہ آگہی کی ہے۔

چنانچہ "اس آگہی" کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے بخوبی ہوتا ہے:-

شریک جشن آزادی ہیں دونوں　　کوئی ننگا کسی کے سر دوشالا
نہیں دم مارتی گنگا کی وادی　　بڑی حیرت سے تکتا ہے ہمالہ

جس کی لاٹھی اسی کی بھینس ہے آج　　کیا اسی کو کہیں گے جنتا راج

ادارہ فروغ اردو "سفینہ چاہیئے" کی اشاعت کیلئے قابل مبارکباد ہے۔

(طیب انصاری)

"آبگینے" :- مرتب: حسن فرخ۔ ناشر: ادارہ مصنفین نو ۲۸۶۔ سی۔ اعظم پورہ۔ حیدرآباد۔ ۲۴۔ قیمت ایک [illegible]

"نیا کارواں" کے بعد ادارہ مصنفین نو کی دوسری پیش کش "آبگینے" نو شاعروں کے کلام کا مختصر اور خوبصورت مجموعہ ہے۔ کوائپریٹو اساس پر "نیا کارواں" کے نام سے جب حیدرآباد کے جواں سال و جواں فکر افسانہ نگاروں کی تخلیقات سامنے آئیں ملک بھر کے تقریباً سبھی گوشوں سے اسکی ہمت افزائی کی گئی "آبگینے" کی اشاعت اس بات کا ثبوت ہے۔ کوائپریٹو تحریک کی افادیت اور خود مجموعہ کلام کی دیدہ زیبی اور حسن کی وجہ سے بھی "آبگینے" کو اردو حلقوں میں سراہا جائے گا۔

جناب حسن فرخ صاحب کے اس احساس نے کہ "آبگینے" میں شامل سبھی تخلیقات معیاری نہیں ہیں نقاد کے بوجھ کو ہلکا کر دیا ہے۔ غیاث متین کی نظموں میں فکر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں "کفن" صلیب نو' اندھیروں کا خدا اور شعور سفر" اسکی مثال ہیں۔ مسعود عابد کی نظمیں "ڈرائیں اور "خواب نقصان" خیال کی تازگی کو ظاہر کرتی ہیں انور یابانی کی "اردو" پیاری نظم ہے۔ اکمل حیدرآباد کے نوجوان شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں فن کا نکھار ہے زیر نظر مجموعہ کی نظموں میں "ہمسفر" یاس سے بہتر نظم ہے۔ پرکاش فکری' روشن خیال' علی ذکی اور حسن عرفی کی نظمیں اور غزلیں فن کے اعتبار سے اچھی کہی جاسکتی ہیں۔ روحانیت یا روحانیت اتنی ہی مہلک ہے جتنی نری مادیت اور روحانیت کے حسین امتزاج ہی سے نیا جہاں تعمیر ہوگا اور "ایک نیا آدم" کی تخلیق بھی ممکن ہے۔ آج کا شاعر صرف شاعر نہیں وہ پیامبر بھی ہے اس وجہ سے شاعری میں تعمیری عناصر کا ہونا ضروری ہے۔ ہمیں "آبگینے" کے نئے شاعروں کی ذہنی اور فنی صلاحیتوں سے قوی توقع ہے کہ وہ اپنے فکر و فن سے حیات انسانی کو نئی فکر اور نیا خون بخشیں گے۔ (طیب انصاری)

متاع شوق:- از شاغل قادری۔ ناشر مجلس اشاعت بھاگلپور۔ قیمت تین روپئے پچاس پیسے۔

شاغل قادری ہندوستان کی قدیم تاریخی اور روحانی بستی "گیا" کے رہنے والے ہیں۔ ظاہر ہے اس ماحول کا اثر وہاں کے فکر و خیال پر پڑنا ضروری ہے۔ چنانچہ اسکی پرچھائیں شاغل کے کلام پر نمایاں نظر آتی ہیں۔ شاغل نے بڑی حد تک اسلامی فکر کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور کلام اقبال سے بھی اکتساب فیض کیا ہے۔ ویسے بھی ان کی فکر کا تدریجی ارتقا زیر نظر مجموعہ میں شائع شدہ شاعری کی ان دو تصویروں سے ظاہر ہوجاتا ہے جو شاغل قادری "کل اور آج" کے عنوان سے پیش کی گئی ہیں "متاع شوق" میں نظمیات' مرثیات' غزلیات' تضمینات اور قطعات وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر سید احمد حسن نے تعارف اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے تقریظ لکھی ہے۔ فکر و خیال کے لحاظ سے اقبال' جوش اور فیض نے جو رجحانات و میلانات اردو شاعروں کو دیے ہیں۔ انہیں صرف دہرایا جاسکتا ہے۔ اضافہ کی توقع فی الحال کم نظر آتی ہے۔ کچھ تو اقبال کی تقلید کو فخر سمجھتے ہیں اور بعض جوش کی فیض ترقی پسندوں کی رہبری کر رہے ہیں۔ شاغل کا تعلق پہلے گروہ سے ہے اور یہی بات امید افزا بھی ہے کہ شاغل کے کلام سے انسانیت کی قدروں کو غیر معمولی فائدہ نہ سہی کم از کم ضرر تو نہیں ہے ؎

قادری اک کارواں در کارواں آئے گا ساتھ
غیر ممکن ہے کہ منزل تک یہ تنہائی رہے

قادری اپنے مستقبل سے پُر امید ہے اس وجہ سے آئندہ بہتر توقع رکھی جاسکتی ہے۔ (طیب انصاری)

یادگار شخصیتیں۔ مصنف جواہر لعل نہرو۔ مترجم رفیق محمد شاستری۔ ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی۔ صفحات ۲۰۸
کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ۔ قیمت ۵/- روپے۔

عظیم اور تاریخ ساز شخصیتیں یا تو انسان دوستی اور عالم انسانیت کی فلاح و بہبود کے باعث زندۂ جاوید ہو جاتی ہیں یا پھر وہ اپنے پیچھے قتل اور غارت گری اور ظلم و ستم کی ایسی وحشتناک اور تباہ کن داستانیں چھوڑ جاتی ہیں جنھیں انسان بھلائے نہیں بھولتا۔ ان تاریخ ساز شخصیتوں کی سوانح اور ان کے کارنامے ایک عام قاری سرسری طور پر پڑھ کر لطف اٹھاتا ہے تو ایک خاص فرد۔ ان سوانح عمریوں کا مطالعہ گہری نظر سے کرتا ہے۔ انکی اچھائیوں کو اپناتا اور برائیوں سے سبق سیکھتا ہے۔ ہر بڑا شخص اپنے سے پہلے گزرنے والے عظیم انسانوں کی بڑائی کا راز جاننے کی سعی کرتا ہے تب ہی تو وہ خود بھی ان کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ ایک عظیم شخص جب دوسری بڑی شخصیتوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ ان کے کارناموں پر بے لاگ تبصرہ سپرد قلم کرتا ہے تو اس کا یہ کارنامہ بھی آنے والی نسل کیلئے گراں بہا اثاثے کی حیثیت سے کم نہیں ہوتا۔ کچھ یہی حال یادگار شخصیتیں نامی کتاب کا ہے۔

اس صدی کے ایک عظیم انسان پنڈت جواہر لال نہرو نے دنیا کی زندۂ جاوید اور تاریخی شخصیتوں پر اپنے مخصوص انداز اور اپنی زبردست تاریخ دانی کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ تین تین چار چار صفحات میں انھوں نے ان کے کارناموں کا اس طرح جائزہ لیا ہے کہ انکی عظمت اور بزرگی کا واضح ثبوت بہم پہنچ جاتا ہے۔ ان مضامین میں جو خاص بات نظر آتی ہے وہ ہے جواہر لعل نہرو کی تاریخ دانی اور ان کا ہندوستان سے پیار۔ جہاں کہیں بھی ہندوستان کا ذکر آیا ہے پنڈت جی نے اپنی ساری صلاحیتوں کو بروئے کار لایا ہے۔ جب بھی موقع ملا ہے ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر فخر کیا ہے۔

"چندر گپت موریا اور چانکیہ" "اشوک" ہرش وردھن اور ہیون سانگ' محمود غزنوی' چنگیز خاں' تیمور لنگ' اس بات کا ثبوت ہیں۔

"حضرت محمد اور اسلام" والا مضمون بہت تشنہ ہے اور اس میں پنڈت جی کے بیانات میں تضاد بھی ملتا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے اسلام کو "نئے عرب سامراج" سے تعبیر کیا ہے' پھر دوسرے ہی پیراگراف میں اسلام کے جمہوری اصولوں کا ذکر کرتے ہیں۔

"مارکو پولو" "دیم پرنس آف آرینج" "ڈاکٹر سن یات سین" "میزنی گیری بالڈی" کارل مارکس' کمال پاشا' معلوماتی اور عمدہ مضامین ہیں۔

"کمال پاشا" میں صفحہ ۲۷ پر پنڈت جی نے بڑی خاص بات بیان کی ہے۔ ذیل کا فقرہ پڑھ کر سنجیدہ اور سیاسی بصیرت رکھنے والا قاری محو حیرت ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔ "یہ عجیب بات ہے کہ کس طرح مدافعانہ قومیت جارحانہ قومیت کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور آزادی کی لڑائی دوسروں پر اقتدار جمانے کی لڑائی بن جاتی ہے۔ ۱۹۲۹ء میں کردوں نے دوسری بار بغاوت کی اور ترکوں نے پھر کچل دیا گیا۔ گرچہ ترکی قوم آزادی حاصل کرنے پر تلی ہوئی تھی اور اس کیلئے ہر قیمت چکانے پر تیار تھی۔ ہمیشہ ہمیشہ کوئی کس طرح کچل سکتا ہے؟" مختصر یہ کہ اس کتاب میں اہم مضامین ہیں جن میں چند ایک کو چھوڑ کر باقی سب اس قابل ہیں کہ انھیں درسی کتابوں میں شامل کیا جائے۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے ان کی بڑی اہمیت ہے۔

جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے رفیق محمد صاحب شاستری نے اسے اردو کا جامہ پہنانے میں بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ کہیں کہیں لفظی ترجمہ کھٹکتا ہے۔ جیسے:۔ (حضرت محمد صلعم کے) اس مذہب کو چلانے کی کوئی عجلت نہ تھی۔ صفحہ ۵۵
جہاں وہ نئے نئے لوگوں کے تعلق میں آیا۔ صفحہ ۱۹۳ کارل مارکس۔

ویسے انھوں نے بہت کم اس بات کا احساس ہونے دیا ہے کہ ہم انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ ہر اردو خواں سے اس کتاب کے پڑھنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

سید موسیٰ کاظم

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

سنہ اجراء ۱۹۳۸ء جلد ۲۹ شمارہ ۱۰

اکتوبر ۱۹۶۶ء

ماہنامہ

سب رس

یوم زور نمبر

نگراں
پروفیسر سید علی اکبر

مجلس مشاورت
میر حسن۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ رین راج سکسینہ۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں

معتمد
محمد اکبر الدین صدیقی

مہتمم
محمد جمال الدین

منتظم
وقار خلیل

زر سالانہ چھ روپے　　غیر ممالک سے دس روپے
ششماہی تین روپے　　فی پرچہ پچاس پیسے

مہتمم ادارہ ادبیات اردو کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد سے شائع ہوا

ترتیب

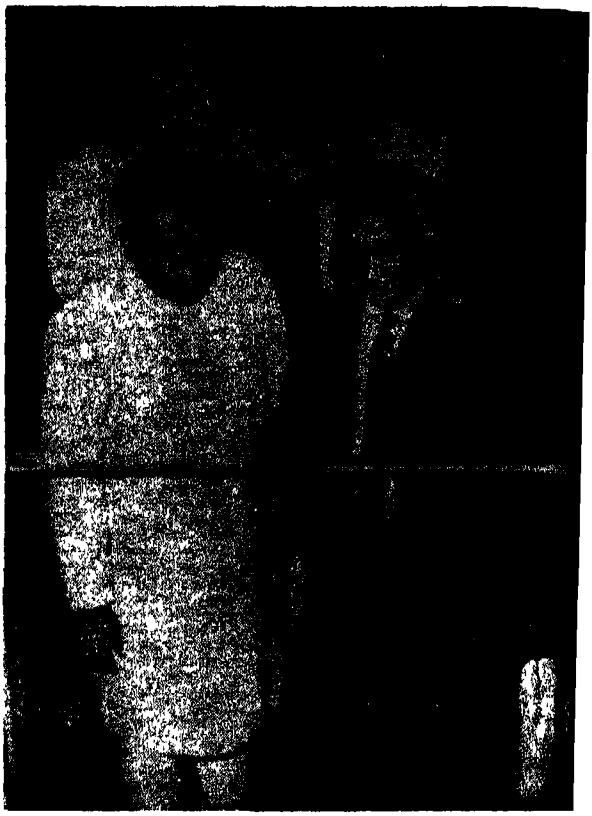
اپنی بات

سب رس کا یہ شمارہ اپنے بانی اور اردو کے ایک بڑے محسن ڈاکٹر زور کی یاد میں پیش کیا جا رہا ہے ۲۳ تا ۲۶ ستمبر ۱۹۷۲ء جو یوم زور منایا گیا اس کی پوری روداد اس میں شامل ہے ۔

اس کے ادبی اجلاس میں بعض مقررین نے ڈاکٹر زور پر لسانی عصبیت کا الزام لگایا ہے اور یہ کہا ہے کہ انھوں نے اردوئے قدیم کو دکنی کا نام دیا ہے۔ حالانکہ فاضل مقالہ نگار نے قائم کے الفاظ بھی دکنی سے متعلق پیش کئے ہیں قائم کا انتقال ۱۲۱۰ھ میں ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بھی بہت پہلے ۹۰۲ھ میں حضرت میراں جی شمس العشاق کا اور قریب ۹۹۰ھ میں حضرت برہان الدین جانم کا وصال ہوتا ہے اور ان دونوں بزرگوں نے اپنی زبان کو ہندی بھی کہا ہے اور گجری بھی۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دربار کے شاعر عبدل نے اس کو زبان دہلوی کہا۔ محمد عادل شاہ کے دور میں یہ زبان دکھنی سے موسوم ہوئی۔ ایسے متعدد شعرا ملیں گے جنھوں نے اس کو دکھنی کے نام سے موسوم کیا ہے۔

محمد تغلق نے جب دلی کو خالی کروا کر دولت آباد کو اپنا پایہ تخت بنایا آبادی کی اکثریت دولت آباد آ گئی لیکن بہت سے احمد آباد بھی چلے گئے اور ہر جگہ اس زبان کا ارتقا وہاں کے انداز پر ہونے لگا۔ دکن آ کر زبان دہلوی یا قدیم اردو نے دکنی کا روپ دھار لیا اور گیارھویں صدی ہجری کے اوائل میں یعنی ساڑھے تین سو سال قبل اس کا نام بھی دکھنی رکھ دیا گیا اور گجرات میں آج سے چار سو سال قبل یہ زبان گجری بھاکا بن گئی۔ گجرات میں دہلی کے پناہ گزینوں نے گجراتی تمدن اور معاشرت کے اثرات قبول کئے اور دکن آنے والوں کی زبان پر مرہٹی زبان کے الفاظ چڑھ گئے اور ان کے رسم و رواج اور تمدن و معاشرت میں مہاراشٹر کی کئی تقریبوں اور روایات کو جگہ مل گئی۔ آج بھی ایسی کئی تقریبیں ہیں جو سارے ہندوستان میں اردو زبان بولنے والے یکساں انداز میں نہیں مناتے۔ بلکہ ہر ملکے و ہر رسمے پر عمل ہوتا ہے۔ آج بھی گجرات میں لوگ اردو بولتے ہیں اور اس کو گجراتی کا نام دیتے ہیں۔ دکن کے اندرونی دیہی علاقوں میں یہ آج بھی دکنی ہے اور شہری علاقوں میں اردو۔ اس قدیم اردو کا تین سو سال تک دکھنی یا دکنی نام رہا اسی لئے مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زور نے اس کو دکھنی کہا۔ اگر آج ہم بنگال کے اطراف و اکناف خصوصاً مرشد آباد کے علاقہ میں دیکھیں تو قدیم اردو بدلی ہوئی شکل میں ملے گی لیکن اس کو کوئی قدیم اردو نہیں کہتا۔ اس لئے فاضل مقالہ نگار کا یہ کہنا کہ ڈاکٹر زور نے قدیم اردو کو دکھنی کا نام دیا غلط ہو جاتا ہے۔ ان کے سامنے صدیوں سے جو نام چلا آ رہا تھا اسی کو انھوں نے باقی رکھا اور چونکہ اسے زندہ اور جیتا جاگتا بلکہ حیات آفریں ادب موجود تھا اس لئے اس کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی۔ اسی طرح دکنی تمدن اور ثقافت کی کڑیاں بھی شمالی ہند سے ملتی ہیں لیکن امتداد زمانہ نے ان میں کافی تغیرات پیدا کر دئے اور تقریباً ہندوستان کے شمال جنوب، مشرق، مغرب ہر جگہ کے تمدن میں تبدیلیاں ہو گئیں۔ ڈاکٹر زور کی حیات تمام تر

(بقیہ صفحہ [illegible])

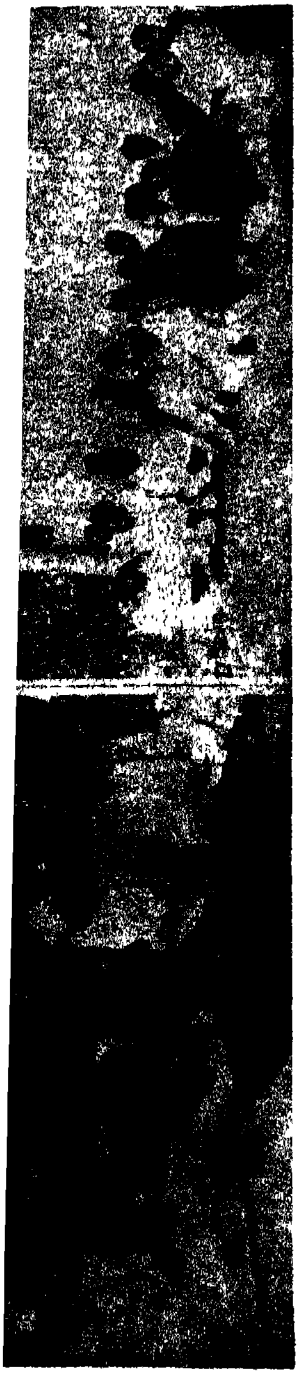


شری ایل. ین گپتا نمائش کا افتتاح فرمارہے ہیں
ناب عبدالوحید خاں صاحب ناظم آثار قدیمہ (معتمد نمائش)

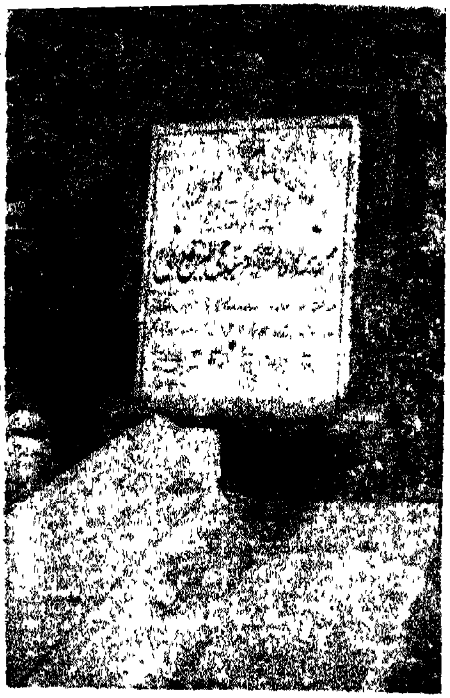
مشاعرہ یوم زور



جناب مخدوم محی الدین صاحب صدر مشاعرہ کلام سنارہے ہیں
محترمہ عائشہ رشاد معتمد مشاعرہ



بائیں سے دائیں - نواب ماندور خاں - پروفیسر سید علی اکبر - نواب مہدی نواز جنگ - الحاج سید شاہ نقی الدین قادری - شاہ صابر علی - رائے جانکی پرشاد
سید صفی الدین قادری - رمن راج سکسینہ - میر سراج الدین علی خاں - میجر احمد الدین (پرنسپل سیف آباد کالج) - عبدالوحید خاں -
اقبال چند آئی. اے. ایس - یادگار چینائی



ی برسی کے موقع پر خانیار شریف سری نگر میں
مزار ڈاکٹر زور پر فاتحہ خوانی



ے دائیں: عبدالعزیز (رجسٹرار جامعہ کشمیر) - ڈاکٹر حامدی کاشمیری - م ح. رضوی (ڈپٹی لائبریرین) -
پروفیسر جان محمد - پروفیسر اسداللہ کامل - پروفیسر سروری (صدر شعبہ اردو) - محمد امین چشتی
(شریک رجسٹرار) - الحاج سید شاہ تقی الدین قادری - سید علی الدین قادری - پیر علی (معتمد ارجامعہ کشمیر)

افتتاحی اجلاس یوم زور



پروفیسر سید علی اکبر صدر ادارہ خیرمقدمی تقریر فرمارہے
ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ (معتمد عمومی ادارہ
نواب مہدی نواز جنگ بہادر (صدر اجلاس
میر سراج الدین علی خاں (معتمد یوم زور)



ادبی اجلاس یوم زور

بھارت چند کھنہ مضمون پڑھ رہے ہیں
سن صاحب ایم۔ اے (معتمد ادبی اجلاس)
حامد علی صاحب عباسی (صدر اجلاس)

پیامات بہ سلسلہ "یوم زور"

ڈاکٹر رادھا کرشن صدر جمہوریہ ہند:-

یہ سن کر مسرت ہوئی کہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم بانی ادارہ ادبیات اردو کی یاد میں ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے یوم زور منایا جا رہا ہے۔ میں ان تقاریب کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین۔ نائب صدر جمہوریہ:-

یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کی یاد میں "یوم زور" منایا جا رہا ہے۔ در اصل کسی کی خدمت کا اعتراف کرنا اور اسے خراج عقیدت پیش کرنا بھی ایک بڑی خدمت ہے۔ مرحوم زور صاحب کی قابل قدر علمی خدمات اور خود ان کا قائم کیا ہوا یہ ادارہ ادبیات اردو ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔ میں اس کے لئے ادارہ کو مبارکباد دیتا ہوں اور میری دعائیں اور نیک خواہشات آپ سب کے ساتھ ہیں۔

شریمتی اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند۔

میں یوم زور کی کامیابی کی متمنی ہوں جو ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام منعقد ہو رہا ہے۔

جناب فخر الدین علی احمد وزیر آبپاشی حکومت ہند:-

بڑی خوشی کی بات ہے کہ ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام "یوم زور" کی سہ روزہ تقریبات منائی جا رہی ہیں۔ ڈاکٹر زور نے دکنی زبان اور اردو کی تاریخ۔ اردو لسانیات، صوتیات، تنقید و تبصرہ اور خالص ادب کی خدمت اپنا مقصد حیات بنایا اور اس کی تکمیل کے لئے اپنی تمام زندگی اور وسائل وقف کر دیئے۔ ادارہ ادبیات اردو کا قیام ڈاکٹر زور کا بہت بڑا کارنامہ ہے جس کی بدولت ہزارہا اردو مخطوطات محفوظ ہونگے اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کو ان سے استفادہ کرنے کی سہولتیں بھی مہیا ہونگیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ ڈاکٹر محی الدین قادری مرحوم کی زندگی اور کارناموں سے اردو ادیب شعراء نقاد معلم اور طالب علم بھی ہمیشہ سبق لینگے اور اپنی اپنی بساط کے مطابق اس عظیم اور حسین زبان کی خدمت کے فرائض انجام دیتے رہیں گے

جناب غلام محمد صادق وزیر اعظم جموں و کشمیر:-

میں یوم زور کی تقاریب کی کامیابی کا دل سے متمنی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ ادارہ کو اردو ادب کے عام فہم بنانے [illegible] کامیابی نصیب ہو۔

اکتوبر

مسیدرس

نواب علی یاور جنگ وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ:۔

میں ڈاکٹر زور مرحوم اور ان کی اردو ادب کی خدمات سے بخوبی واقف ہوں۔ ادارہ ادبیات اردو مرحوم کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ مرحوم نے جامعہ عثمانیہ میں میری وائس چانسلری کے زمانہ میں اور اس سے قبل اور بعد کے زمانے میں بڑی ذمہ دارانہ خدمات انجام دی تھیں اور اپنے جوش عمل اور احساس فرض شناسی کی وجہ سے ممتاز مقام حاصل کر لیا تھا۔

پروفیسر ہمایوں کبیر۔ سابق مرکزی وزیر حکومت ہند:۔

مجھے یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی کہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کی یاد میں یوم زور کی سہ روزہ تقاریب منائی جا رہی ہیں۔ ڈاکٹر زور مرحوم اپنے علمی و ادبی کاموں کی وجہ سے ہندوستان میں اردو زبان کے ممتاز ادیب تصور کئے جاتے تھے۔ مجھے توقع ہے کہ آئندہ نسلوں کے ادیب ڈاکٹر زور کی تصانیف سے استفادہ کر کے ہندوستان کے ثقافتی ورثہ میں اضافہ کریں گے۔

ڈاکٹر تارا چند رکن پارلیمنٹ:۔

یہ سن کر مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بانی ادارہ ادبیات اردو اور اردو زبان کے ممتاز ادیب کی یاد میں یوم زور کی تقاریب منائی جا رہی ہیں۔ میں ان تقاریب کی کامیابی کا متمنی ہوں۔ ڈاکٹر زور مرحوم نے اردو زبان و ادب کو ترقی دینے میں جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ہر سال اس طرح یوم زور کی تقاریب منائی جائیں۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی:۔

میں خوش ہوں کہ ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی یاد میں ۲۳، ۲۴، ۲۵ ستمبر کو یوم زور کی تقاریب منائی جا رہی ہیں۔ ڈاکٹر زور کی موت سے نہ صرف اردو زبان کے تحقیقی کاموں کو نقصان پہنچا ہے بلکہ ہندوستان کی ثقافت کو بھی نقصان ہوا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ یوم زور کی تقاریب کامیاب ہوں گی۔

جناب فضل الرحمٰن پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ:۔

پروفیسر محی الدین قادری زور مرحوم نے اردو زبان و ادب کی جو گرانقدر خدمت انجام دی ہے وہ اہل حیدرآباد کبھی نہیں بھلا سکتے۔ بہ حیثیت اردو ادیب و نقاد کے انھیں کل ہند شہرت حاصل ہے۔ اردو تصانیف و تراجم کی اشاعت اردو زبان کی ترویج میں ربع صدی سے زاید مدت تک ان کے شاندار کارناموں سے بھی اہل ہند واقف ہیں۔ زور صاحب کی ادبی اور علمی شہرت کے علاوہ ان کے دوست ہمیشہ مرحوم کی ہمدردی حسن اخلاق اور ان کی دلکش شخصیت کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

پروفیسر آل احمد سرور جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو علیگڑھ:۔

ڈاکٹر زور نے اردو کی بڑی خدمت کی۔ ان کی تحقیقات سے دکنی ادب کے کئی تاریک گوشوں پر روشنی پڑی

ان کی لگن اور جذبے سے اردو زبان و ادب کو بڑا فروغ ہوا۔ ادارہ ادبیات اردو ان کی خدمات کا بڑا اچھا اشاریہ ہے۔ ڈاکٹر زورؔ کی یاد تازہ کرنا اور ان کے کارناموں سے نئی نسل کو روشناس کرانا یقیناً بڑا اچھا کام ہے۔ امید کہ اس چراغ سے اور چراغ برابر جلتے رہیں گے۔

پروفیسر احتشام حسین صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی:۔

ڈاکٹر زورؔ مرحوم ایک باعمل انسان تھے وہ ایسی شمعیں جلانا جانتے تھے جن کی روشنی ان کے بعد بھی باقی رہے وہ ایسی بنیادیں رکھنا چاہتے تھے جن پر مستحکم عمارتیں کھڑی کی جاسکیں۔ یہ شمعیں اور بنیادیں ان کی تصانیف اور وہ ادارے ہیں جنھیں ان کے ذوق تخلیق نے جنم دیا یہی ان کی یادگاریں ہیں مجھے خوشی ہے کہ ادارہ ادبیات اردو جسے مرحوم نے اپنے خون سے سینچا تھا نہ تو ان کی یاد سے غافل ہے اور نہ ان کے کام سے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ:۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ اردو کے سچے عاشق تھے۔ وہ ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک اہم ادیب ایک سچے عالم اور ایک بے ریا و پرخلوص انسان تھے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ ہم سے عین اس وقت بچھڑ گئے جب اردو کو ان سے بہت سے کام لینے تھے۔ ان کی یاد منانا گویا انسانیت۔ شرافت علمیت اور اردو دوستی کی قدروں پر اپنا ایمان تازہ کرنا ہے۔ زورؔ یادگار کمیٹی مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے یوم زورؔ منانے کا اہتمام کیا۔

پروفیسر سید علی اکبر
صدر ادارۂ ادبیات اردو

خیر مقدمی تقریر افتتاحی جلسۂ یوم زورؔ

نواب مہدی نواز جنگ بہادر

خواتین و حضرات! آج ہم سید محی الدین قادری زورؔ کی چوتھی برسی کے موقع پر یہاں اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کریں۔ ادارۂ ادبیات اردو کے قدیم خادم اور صدر کی حیثیت سے میرا یہ خوشگوار فریضہ ہے کہ ادارہ کی جانب سے میں ہمارے مہمان خصوصی نواب مہدی نواز جنگ بہادر اور دوسرے مہمانوں کا خیر مقدم کروں۔ خواتین و حضرات یہ آپ سب کے تعاون عمل کا نتیجہ ہے کہ ڈاکٹر زورؔ کے انتقال کے بعد ادارہ خاموشی اور خلوص کے ساتھ اُن فرائض علمی ادبی اور ثقافتی کو ادا کر رہا ہے۔ جو مرحوم کو عزیز تھے اور جن کیلئے مرحوم نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اپنے محسنوں کی یاد تازہ رکھیں

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی

تجربہ شاہد ہے کہ خلوص ہمت اور اولوالعزمی سے جو کام انجام دئے جاتے ہیں وہ اپنا گہرا اثر چھوڑتے ہیں اور ایسے ہی نقوش میں رنگِ ثبات دوام رہتا ہے۔

یوم زورؔ کے افتتاحی جلسہ کی صدارت کیلئے نواب مہدی نواز جنگ بہادر سے زیادہ موزوں اور کوئی شخصیت نہیں ہو سکتی تھی یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ نواب صاحب نے ہماری استدعا کو قبول فرما کر آج یہاں تشریف لانے کی زحمت گوارہ فرمائی۔ ممدوح کو ہر نیک کام سے عملی دلچسپی رہی ہے اور صرف ہمارے ہی ادارہ میں نہیں بلکہ حیدرآباد کے تمام علمی ثقافتی سماجی اور ترقی پسند تحریکات میں آپ پیش پیش رہے۔ جس زمانے میں آپ کی خدمات گجرات کے لئے وقف ہو گئی تھیں۔ حیدرآباد کے علمی اور ثقافتی حلقوں میں ایک بڑی کمی محسوس کی جا رہی تھی۔ شکر ہے کہ حق بہ حق دار رسید کے مصداق آپ پھر حیدرآباد کے علمی اور ثقافتی ایوانوں میں رونق افروز ہو رہے ہیں۔ ادارہ کے قیام کی تاریخ سے آپ اس کی سرپرستی فرماتے رہے ہیں اور ہم کو یقین ہے کہ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا اور آپ کی ہمہ گیر مقبول شخصیت ہمارے ادارہ کے مقاصد کی تکمیل کے لئے بہترین ضمانت اور فال نیک ہوگی۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم کی عزت نواب صاحب کے دل میں ہمیشہ رہی ہے نواب صاحب مرحوم کی جرأت رندانہ اور ہمت مردانہ کے قائل رہے ہیں اور مرحوم کے وسیع کارناموں کو ہمیشہ قدر و منزلت سے دیکھتے رہے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی آج کے جلسہ کی کرسی صدارت پر نواب صاحب کی رونق افروزی ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی

روح کے لئے باعث تسکین اور فرحت ہوگی۔

ڈاکٹر زور کا اچانک انتقال سارے ملک کے علم دوست اور بالخصوص اردو نواز حلقوں کے لئے ایک بڑا سانحہ تھا۔ آج چار سال ہوتے ہیں کہ ڈاکٹر زور ہم سے ہمیشہ کیلئے جدا ہوگئے لیکن ہر سال ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ جلد تر وہ ہم سے جدا ہوگئے اور کس قدر اہم کام اور بھاری ذمہ داری ہم سب کے لئے چھوڑ گئے۔ ڈاکٹر زور ایک عالم باعمل تھے اردو ادب اور بالخصوص دکھنی اردو کے تعلق سے مرحوم نے جو ٹھوس کام انجام دیا اُس کا مقام اردو ادب کی تاریخ میں محفوظ ہوچکا ہے۔ ادارۂ ادبیات کے مختلف شعبوں کی تکمیل ایوان اردو کی تعمیر اور ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے قیام اور تنظیم میں مرحوم کی علمی دلچسپی یہ سب ایسے کارنامے ہیں جس کو ہماری نسلیں طویل مدت تک یاد رکھیں گی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جس نہج ڈھنگ اور انہماک سے مرحوم اپنے پروگرام کی تکمیل کر رہے تھے اسکو غور و فکر اور تدبر سے آگے بڑھایا جائے۔ ڈاکٹر زور مرحوم نہ صرف خود نہایت مستعد تھے بلکہ ان میں دوسروں سے کام لینے کی خاص صلاحیت تھی نیز وہ مردم شناس بھی تھے۔ مرحوم کی مردم شناسی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ کشمیر جانے سے پہلے انھوں نے محترمہ راج سکینہ کا انتخاب بہ حیثیت شریک معتمد ادارہ کیا۔ ڈاکٹر زور کے انتقال کے بعد مرحوم کی جانشینی کے لئے ڈاکٹر سکینہ ہی موزوں ہوسکتے تھے۔ ڈاکٹر سکینہ ایک جذبہ خدمت سے معمور شخصیت کے حامل ہیں اور آپ کو اردو ادب اور دکھنی تاریخ و تہذیب سے خاص دلچسپی ہے یہی وجہ ہے کہ میں ڈاکٹر سکینہ کو ادارہ کا ایک اہم ستون سمجھتا رہا ہوں۔ انکی رہبری میں وہ سب کام تسلی بخش طریقہ پر انجام پا رہے ہیں جن کا آغاز ڈاکٹر زور مرحوم نے کیا تھا۔ مثلاً رسالہ سب رس کی اجرائی جسکے مدیر جناب اکبرالدین صدیقی صاحب ہیں اور جو مجلس انتظامی کے رکن بھی ہیں سال میں دو دفعہ اردو امتحانات کا انعقاد جسکے معتمد جناب عارف الدین حسن صاحب ہیں۔ ہر سال یوم محمد قلی قطب شاہ کا انعقاد جس کے انتظامات کے تعلق سے ادارہ جناب راج سکینہ صاحب کا رہین منت ہے۔ ادارہ کے مختلف کاموں میں جناب سراج الدین علیخاں صاحب جس ایثار جوش اور ولولے سے حصہ لیتے ہیں وہ قابل قدر ہے۔ ادارہ کو نواب عنایت جنگ بہادر کی سرپرستی جس طرح ڈاکٹر زور مرحوم کی زندگی میں حاصل تھی وہ اب بھی حاصل ہے جیسا کہ آپ سب کو علم ہوگا کہ نواب صاحب نے ادارہ کے میوزیم کیلئے بیش بہا نوادر عطا فرمائے ہیں۔ نواب عنایت جنگ بہادر کے علاوہ ادارہ کی انتظامی کمیٹی کے اراکین میں جناب حامد علی عباسی صاحب۔ جناب جانکی پرشاد جناب ایل این گپتا صاحب اور جناب دلدار حسین صاحب شامل ہیں یہ سب حضرات حیدرآباد کی ملی جلی تہذیب کے آئینہ دار ہیں۔

حال میں ڈاکٹر زور کی بیگم صاحبہ کو بحیثیت نائب صدر اور اُن کے صاحبزادے جناب تقی الدین صاحب کو بہ حیثیت رکن مجلس انتظامی میں شریک کیا گیا ہے۔ اس سال جناب محمد عبدالوحید خاں صاحب کا باوجود انکی گوناگوں مصروفیات کے یوم زور کی کمیٹی کی صدارت کا قبول فرمانا اس تقریب کے پروگرام کی کامیابی کے لئے ایک نیک فال ہے۔

آخر میں میں آپ سب کا مکرر دلی خیر مقدم کرتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ ڈاکٹر زور مرحوم کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ جاگزیں رہیگی اور ہم ان مقاصد کی تکمیل میں ہمیشہ کوشاں رہینگے جو مرحوم کو عزیز تھے۔

عبارت چند کھنہ

ڈاکٹر زورؔ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کے متعلق کچھ کہنے کے لئے ادارہ ادبیات اُردو کیجانب سے دعوت نامہ کو مجھ ناچیز کے لئے باعث حوصلہ افزائی ہے لیکن یہ جانتے ہوئے کہ ایک ایسے عظیم مورخ، نثر نگار، شاعر، محقق اور ماہر صوتیات کے متعلق لب کشائی کی جسارت کرنا کسی عالم اور فاضل ہی کا حق ہے، میں نے اپنی اسوقت کی موجودگی کو غیر موجود بنانے کی بے پناہ کوشش کی مگر اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اسوقت حاضر خدمت ہوں۔ اس وضاحت کے بعد اُمید ہے کہ معزز سامعین مضمون کی تشنگی سے ناراض نہ ہونگے اور نہ ہی اسمیں گہرائی کی تلاش فرمانے کی زحمت فرمائینگے۔

گو کونسا ایسا حیدرآبادی ہوگا جو ڈاکٹر زورؔ کے نام اور عظیم الشان کارناموں سے واقف نہ ہوگا لیکن اُن سے بات کرنے کا موقعہ مجھے صرف چھ سات سال پہلے حاصل ہوا۔ ایک دن دفتر میں بیٹھا کسی فائیل پر ایسا نوٹ لکھنے کی کوشش میں مشغول تھا جس سے خود پر چوٹ نہ آنے پائے جبکہ ٹیلیفون بجنے پر آلہ اٹھایا تو زورؔ صاحب کی آواز آئی وہ اپنے کالج میں میرا لکھا ہوا ایک ڈرامہ اسٹیج کرانا چاہتے تھے اور اس کا مسودہ طلب فرما رہے تھے۔ میں نے اس ذرہ نوازی کیلئے شکریہ ادا کرنے کے بعد جب یہ کہا کہ میرے پاس اس ڈرامہ کے مسودہ کی صرف ایک ہی کاپی ہے تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ میں اس کاپی کو فوراً انکے پاس بھیج دوں اور وہ اسکی بہت سی کاپیاں کرواکر مجھے بھیج دینگے۔

خدا شاہد ہے کہ میرے ساتھ ایسے وعدے بہت سے رسالوں، اخباروں، کالجوں اور دیگر اداروں کی جانب سے کئے جاتے تھے مگر کسی وعدہ کرنے والے نے اسکو پورا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں اس بارے میں زورؔ صاحب سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ جرأت نہیں ہوئی۔ مسودہ اُن کو بھیج دیا۔ اس امید کے ساتھ کہ چلو چھٹی ہوئی اب اس ڈرامہ کے متعلق اور کوئی شخص مسودہ حاصل نہیں کر سکے گا۔ لیکن آپ میری حیرت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جبکہ متذکرہ واقعہ کے چند دن بعد جب میں محتاط قسم کے نوٹ فائیلوں پر لکھنے میں منہمک تھا کہ ڈاکٹر زورؔ خود بنفس نفیس میرے کمرے میں داخل ہوئے اور حسب وعدہ بارہ کاپیاں ڈرامہ کے مسودہ کی نہایت صاف اور واضح ٹائپ کی ہوئی میز پر رکھ دیں اور جہاں تک میرا خیال ہے نہ صرف موصوف نے اپنا وعدہ ایفا کیا تھا بلکہ مسودے کو زبان کے اعتبار سے سدھار بھی دیا تھا۔

مسودہ لیکر واپس کرنے کے وعدہ کو میرے تجربہ کے مطابق صرف ایک شخص نے پورا کیا اور وہ تھے ڈاکٹر زورؔ۔ یہ واقعہ چھ سال پہلے کا ہے اور میرے استدلال کی تصدیق اس امر سے بھی ہو سکتی ہے کہ زیر بحث مسودہ کی اب میرے پاس کوئی کاپی

نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چھ برسوں میں بارہ مختلف حضرات نے مجھ سے جھوٹے وعدے کئے!!

اس واقعہ سے میں جس چیز کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر زورؔ کے کردار کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ وعدہ کر کے اسکو فراموش کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔ یہ ایک بڑی اہم صفت ہے جس کی اہمیت کو اکثر و بیشتر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر زورؔ سے ملاقات ہوئی تو کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ پھر انہوں نے کہا کہ میرے چند مضامین اُن کی نظر سے گذرے تھے کہنے لگے کہ اگر ایسے چند مضامین غیر مطبوعہ ہوں تو وہ انکو کتاب کی شکل میں ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے چھپوا دینگے۔ اس بارے میں میں تفصیلات چھوڑتے ہوئے یہ عرض کر دیتا ہوں کہ ڈاکٹر زورؔ نے اپنا یہ وعدہ بھی پورا کیا چنانچہ میرے مضامین کا مجموعہ بعنوان "ٹھنڈی بجلیاں" اس ادارہ کی جانب سے شائع ہوا۔ جس کا مقدمہ صاحب موصوف نے خود لکھا اور میری بڑی ہمت افزائی کی۔ نتیجۃً نہایت ٹھوس قسم کے عالم بھی میری اس کتاب کو ڈاکٹر زورؔ کا مقدمہ پڑھنے کے لئے کبھی کبھار اُٹھا لیتے ہیں!

ڈاکٹر زور بڑی پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ دراز قد۔ سُرخ و سفید رنگت۔ کشادہ پیشانی۔ شاعرانہ بال۔ بھاری جسم۔ خوبصورت شیروانی۔ ڈھیلا پاجامہ۔ کھِلا ہوا چہرہ۔ لال لال ہونٹ۔ جسم کے اعتبار سے بھی وہ اپنی ادبی علمی، درسی اور تحقیقی کاوشوں کیطرح عظیم الشان تھے یہ ناممکن تھا کہ وہ تیس چالیس آدمیوں میں کھڑے ہوں اور اُن پر نظر نہ پڑے۔

ڈاکٹر زورؔ کی شخصیت کو اگر ایک جملے میں بیان کرنا ہو تو میرے خیال میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر زور ہر اعتبار سے ایک زوردار شخصیت کے حامل تھے۔ بولتے تو منہ سے پھول جھڑتے اور ان کا شعور اور زبان پر عبور فوراً عیاں ہو جاتا۔

گو بابائے اُردو کا لقب ڈاکٹر زور کو حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ مولوی عبدالحق صاحب اس کے حامل تھے مگر اُردو زبان کی جو خدمت ڈاکٹر زورؔ نے کی اور علم و ادب کے جن میدانوں میں انہوں نے اپنی کاوشوں کو پھیلایا اُن کا دائرہ یقیناً ایسا وسیع تھا کہ اس معاملہ میں ڈاکٹر زورؔ کا نام ابدی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ خصوصاً صوتیات پر ان کے مقالے منفرد ہیں۔

میں ڈاکٹر زور کے کارہائے نمایاں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ وہ ہر اُردو سے دلچسپی رکھنے والے کو معلوم ہیں لیکن یہ ایک بات ضرور کہونگا کہ ڈاکٹر زورؔ کو دیار دکن سے عشق تھا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دکن کی تہذیب اور اس بادشاہ کے پہلے .... صاحب دیوان شاعر ہونے کی حیثیت سے ڈاکٹر زور کو اس بادشاہ سے اسقدر محبت ہوگئی تھی کہ اگر ڈاکٹر زور سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دور میں پیدا ہوتے تو شاید انکی عالمانہ محبت میں یہ شعر و سخن کا دلدادہ شاہ اپنی بھاگ متی کو بھی بھول جاتا! اور اگر ایسا ہوتا تو یہ بھی ممکن تھا کہ آج ایوان اُردو کی جگہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ میں بنی ہوئی کوئی ایسی عمارت اُردو کی قدر و منزلت کو بڑھانے والی کھڑی ہوتی جو دلّی کے لال قلعہ یا تاج محل جیسی عمارتوں سے ٹکر لے سکتی۔ جہاں اس زبان کے دلدادہ آتے جیسا کہ آج ایوان اُردو میں رونق افروز ہیں۔ اور اس میں

جنکی عبارت کی خوبصورتی اور عظمت کے زیر اثر ان کے تخیل کی پریاں رقص کرنے لگتیں۔ خیالات الفاظ کے سانچوں میں ڈھل کر عبارت کے اثر سے شاعر، ادیب، مورخ وغیرہ از خود تربیت پاکر اردو زبان کو پروان چڑھاتے کاش کہ ایسا ہوتا اگرچہ ایسا ہونے سے ہم سب اس عظیم شخصیت کو اپنے دور حیات میں جاننے سے محروم ہو جاتے!

موضوع کے اعتبار سے ایسے موقعوں پر یہ رواج ہے کہ ممدوح کے دل و دماغ کی خوبیوں کو اجاگر کیا جائے مگر دل و دماغ کی خوبیوں کو بیان کرنے کا موضوع بجائے خود ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے بات یہ ہے کہ اگر شخصیت زیر بحث کی دماغی قوتوں پر غیر معمولی زور دیا جائے تو نتیجتاً یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ موصوف کا دل کمزور تھا۔ اس کے برعکس اگر دلی خوبیوں کو سراہتے ہوئے انکو غیر معمولی اہمیت دی جائے تو مقابلتاً یہ چیز واضح ہونے لگتی ہے کہ شخصیت متعلقہ کا دماغ کمزور تھا اور یہ وضاحت ایسی صورت میں آشکار ہونے لگتی ہے جبکہ مقرر ہرگز ہرگز ایسا کہنا نہیں چاہتا۔ اسلئے میں دل و دماغ کی خوبیاں بیان کرنے سے گریز کرتے ہوئے صرف یہ کہونگا کہ ڈاکٹر زور کو ملکِ دکن سے پیار تھا۔ ہر دکنی چیز بشمولِ اُردو سے انہیں والہانہ محبت تھی مثلاً دکنی زبان اور پان، قطب شاہی بال، دکنی چال اور کھٹی دال، حیدرآباد کی بریانی، گنڈی پیٹ کا پانی اور ہمرو کی شیروانی۔ ملغوبہ آم، میٹھے جام اور لسانیات پر کام۔

بہرحال ڈاکٹر زور اپنی زندگی میں بڑے ٹھاٹھ سے رہے۔ اُن کے علم اور علم دوستی کی وجہ سے شہرت اُن کے قدم چومتی رہی۔ جہاں جاتے وہاں انکا احترام ہوتا۔ ایسا احترام جو کسی عہدہ کا رہین منت نہ تھا۔ اب جبکہ وہ اس جہان فانی سے رخصت ہو چکے ہیں ان کے کارہائے نمایاں کی وقعت اور اُنکی عظمت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

اور موت جو انکو ہم سے چھین کر لے گئی ہے سکندر علی وجد کے الفاظ میں زور صاحب کی طرف سے یہ سُن لے:۔

ہنس کے شاعر نے موت سے یہ کہا
اے سبک دست زندگی دشمن!
وقت کی فصل کاٹنے والی
ایک زندہ خیال کی دھن میں
ایسے الفاظ میں نے لکھے ہیں
جن کو تو بھی مٹا نہیں سکتی

ضیاء الدین احمد شکیب

تاریخ اردو میں ڈاکٹر زور کی شخصیت کا تعین

یورپ کی تاریخ میں نئے زمانہ کا آغاز سترھویں صدی کے ساتھ ہو چکا تھا جبکہ ہندوستان میں ابھی قرون وسطیٰ ختم نہیں ہوئے تھے۔ ہندوستانی تاریخ کا عصر نو انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوتا ہے۔ جب سے یہاں کے نظام تعلیم، نظام عدلیہ، تجارتی اصول، حکومتی نظم و نسق، سیاسی جماعت بندی، ادب، لسانیات اور فن تاریخ نویسی سبھی نے ایک نئی شکل اختیار کی یہ نئی شکل ایک نئی طرز فکر کی دین تھی۔ ہندوستان میں سب سے پہلے اور مناسب شعور کے ساتھ عصر نو کے تقاضوں کو جس نے سمجھا جس نے اس سے مفاہمت کی کوشش کی اور اس کے مطابق ہندوستان کے قومی مسائل کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں فکری سطح پر بنیادی فیصلے کئے وہ سر سید کی شخصیت تھی۔ سر سید کی تحریک ہی سے اردو زبان و ادب کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

علیگڑھ تحریک نے ہندوستان اور اردو زبان کی تشکیل نو کے لئے جو منہاج قائم کیا تھا وہ سائنس اور روایات کا ایک غیر معمولی امتزاج تھا۔ لیکن مستقبل کی تشکیل کا جو خواب دیکھا گیا تھا اسے شرمندۂ تعبیر ہونے کے لئے ایک صدی سے زیادہ مدت درکار تھی جس کا اندازہ خود بانیانِ تحریک کو بھی تھا۔ چنانچہ گذشتہ ایک صدی کے دوران میں اس تحریک کی نشوونما سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی استواری کے ساتھ کافی دور تک آ چکی ہے۔ لیکن اس کی بہت سی منزلیں باقی ہیں۔

اس تحریک کے دور اول میں اردو زبان و ادب کے ماضی و مستقبل کیلئے بہت کچھ اہم کام ہوا ہے۔ جن میں آزاد، حالی، شبلی اور نذیر احمد کی خدمات اور ان کے اثرات ناقابل فراموش ہیں۔ ان لوگوں نے زبان و ادب دونوں کے بارے میں جو کچھ سوچا وہ یقیناً علمی ہے لیکن ان کے علمی نقاط نظر میں طبیعی اور مادی حقائق اتنے زیادہ پیش نظر نہیں رہے جتنے معاشرتی اور اخلاقی۔ دوسرے یہ کہ مغربی علوم سے پہلے دور کے لوگ بہت زیادہ گہرائی سے واقف نہیں تھے۔ اس لئے ان لوگوں نے جو کچھ کام کیا ہے وہ اس قدر تحقیقی نہیں ہے۔ جس قدر تاثراتی ہے۔ لیکن دوسرے دور میں سید علی بلگرامی، اقبال، راس مسعود اور حسرت موہانی جیسی شخصیتیں تھیں۔ علیگڑھ تحریک سے متاثرہ شخصیتوں کا یہ دور اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس دور کی شخصیتیں ملک بھر میں پھیل گئی تھیں اور ان کی تمام تر سرگرمیاں مختلف پہلوؤں سے قوم کو ایک ایسی شکل اور ایک ایسا کردار دینے پر مرکوز تھیں جو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ مطابقت کی اہلیت رکھتا ہو اور ان کو ایک زیادہ سائنٹیفک نقطۂ نظر دے اس دور کی شخصیتوں نے نئی نسلوں کے تجسس کو زبان اور ادب کی مختلف سمتوں میں زیادہ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ معروف کر دیا۔ اسی دور میں ہندوستانی طلباء تاریخ کے مطالعہ کے زیادہ سائنٹیفک طریقوں سے بھی متعارف ہوئے حیدرآباد میں نظام تعلیم

کو مرتب کرنے اور یہاں کے نوجوانوں کے ذہن و کردار کی تشکیل میں اس صدی کی شخصیتوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ڈاکٹر زور کی شخصیت بھی ان ہی لوگوں کے ہاتھوں بنی۔ لیکن حیدرآباد میں ہندوستانی عصر جدید یا علیگڈھ تحریک کے اثرات وہاں کے سیاسی حالات اور ماحول کے پیش نظر بظاہر مختلف رنگ کے تھے لیکن جہاں تک اقدار کا تعلق ہے وہ حیدرآباد میں بھی ویسے ہی موثر تھیں جیسے ہندوستان میں کہیں اور۔

ڈاکٹر زور کی علمی شخصیت کا آغاز بیسویں صدی کے تیسرے دہے سے ہوتا ہے اور چوتھے دہے کے وسط میں ان کا ذہن اور ان کی زندگی کا لائحہ عمل بنیادی طور پر تشکیل ہو جاتا ہے۔ ان کے ذہن کا تشکیلی دور مختصر ہے انہوں نے ایک مختصر عرصہ میں اپنی شخصیت کو جس جس طرح آزمایا اور بالآخر اپنی زندگی کا جو راستہ متعین کیا وہ ان کی خود شناسی، مستقبل بینی، قوت فیصلہ اور طبیعت کے استقلال کا آئینہ دار ہے۔ ڈاکٹر زور کے علمی کارناموں اور ان کے سوانحات کا ان کی معاصر ادبی و لسانی تاریخ کے ساتھ مربوط مطالعہ وہ شخص کریگا جو علمی اصولوں کے مطابق ان کی سوانح لکھے۔ یہاں ہماری دلچسپیاں ان کی علمی زندگی اور ان کی معاصر ادبی تاریخ سے ہیں اور ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس تاریخ میں ان کا مقام کس طرح متعین کیا جا سکتا ہے۔ ان کے ذہن کا تشکیلی دور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۵ء تک کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے۔ ان کی زندگی کا یہ دور معروف ترین لمحات کا حامل ہے۔ اس مختصر سے عرصہ میں ہندوستان اور بیرون ہند میں اپنی تعلیمی زندگی کو منزل پر پہنچانے کے علاوہ انہوں نے کم و بیش (۵۷) مضامین لکھے اور (۲۰) کتابیں تصنیف کیں۔ ان کے یہ ادبی کارنامے حسب ذیل زمروں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ تخلیقی ادب جس میں نظم و نثر کی تخلیقات شامل ہیں۔ (۲) تنقید (۳) تاریخ ادب (۴) لسانیات

جہاں تک ڈاکٹر زور کے تخلیقی ادب کا تعلق ہے، وہ ہمیں صرف ان کے ذہن کے تشکیلی دور ہی میں ملتا ہے اس میں ان کے ڈرامے، افسانے اور منظومات ملتی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی تخلیق اس معیار کی نہیں ہے جس سے اردو نظم، غزل، ڈرامہ یا افسانہ کی تاریخ میں ان کے کسی قابل لحاظ مرتبہ کو متعین کرنے میں مدد مل سکے۔ ان تخلیقات کی نوعیت اس بات کی غماز ہے کہ وہ ابتدائی شوق، یا جز وقتی مشغلہ یا عام تاثراتی تشفی کی خاطر لکھی گئی ہیں۔ تاہم ان کی ادبی تخلیقات کا سرمایہ مختصر ہونے کے باوجود دلکش اور قابل قدر ہے۔

جہاں تک ان کے تنقیدی کارناموں کا تعلق ہے اردو میں ٹھیٹ مغربی طرز کے اصول تنقید کو متعارف کروانے کی اولیت کا سہرا ڈاکٹر زور ہی کے سر ہے لیکن جہاں تک اصول تنقید کو پیش کرنے کا سوال ہے اس میں ڈاکٹر زور کا اشتراک اردو زبان کیلئے کتنا ہی نادر سہی، ان کے معاصر آفاقی نوعیت کے اصول ہائے تنقید میں، وہ ان کا اپنا حقیقی اشتراک نہیں تھا۔ بلکہ انگریزی زبان کے معتبر سرمایۂ نقد سے انہوں نے اردو کو متعارف کروایا۔ اس میں ان کی "روح تنقید" اور اصول تنقید سے متعلق دیگر مضامین شامل ہیں لیکن جہاں تک ان کی عملی تنقید یں ہیں۔ اس میں ان کا اپنا ایک تنقیدی شعور ہے جو سائنٹفک ہے۔ اور اس میں ان کی اپنی تہذیبی بصیرت کا عنصر شامل ہے۔ اُن کی ایسی تنقیدات میں اردو کے اسالیب بیان، حالی اور نثر اردو، دکنی اثر شمالی ہند پر، اور ان کے علاوہ

مقالات شامل کئے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے تخلیقی تنقید سے زیادہ تحقیقی تنقید کو اپنے لئے منتخب کیا۔

ان کے سارے علمی کارناموں کا تاریخی ترتیب سے جائزہ لینے پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ذہن شعری تخلیقات سے افسانوی تخلیقات کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ افسانوی تخلیقات کے بعد وہ اصول نقد اور تاریخی حکایات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں پھر ادبی تخلیقات اور تنقیدات کی طرف، بالآخر ان کی دلچسپیاں بنیادی طور پر لسانیات اور تاریخ ادب سے وابستہ ہو جاتی ہیں ان کے یہاں صوتیات اور ادبی تنقیدات کا مطالعہ بالترتیب لسانیات اور ادبی تاریخ کے مطالعہ کے لوازم کے طور پر ملتا ہے اور یہیں ان کا ذہن اپنے مستقبل کے منصوبوں کے ساتھ متشکل ہوتا ہے ان کی ذہنی نشوونما کا یہ وہ مرحلہ ہے جہاں وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے مسلک سے قریب محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی بعض سوانحی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں کے مسالک کی مماثلتوں نے آپس میں کچھ کشاکش پیدا کر دی تھی۔ اس کشاکش کی واقعاتی اور علمی وجوہات جو کچھ بھی ہوں وہ اس وقت راست طور پر ہمارے موضوع سے متعلق نہیں ہیں اتنا ضرور ہے کہ بابائے اردو اور ڈاکٹر زور کی جدوجہد کا ایک قابل لحاظ حصہ یکساں تھا لیکن اس جدوجہد اور اس سے زیادہ دونوں کے زاویہ ہائے فکر میں نمایاں فرق بھی تھا۔ جہاں تک قدیم ادبی سرمایہ کی بازیافت کا سوال ہے دونوں کی دلچسپیاں متوازی ہیں لیکن جہاں تک اردو زبان کی علاقائی دیکھ بھال کا سوال ہے وہاں تک بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور کی دلچسپیاں صرف دکن تک محدود تھیں اور بابائے اردو ہندوستان بھر میں بلکہ دنیا بھر میں اردو کا بول بالا دیکھنا چاہتے تھے لیکن یہ بھی ایک طرح کا استبعاد ہے۔ جب ہم ڈاکٹر زور اور بابائے اردو کے پورے مشن کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ بابائے اردو کی دلچسپیاں اردو کے ماضی کی نسبت اس کے مستقبل سے وابستہ تھیں ان کی یہ تمنا تھی کہ اردو دنیا کے زیادہ سے زیادہ علاقوں میں پھیلے اور ہند و پاک کے پیچیدہ لسانی حالات میں سب سے زیادہ سہل و موثر زبان ثابت ہو۔ اس کے لئے وہ اردو میں نری ادبی تخلیقات کے درپے نہیں تھے۔ بلکہ وہ تمام علوم سے جلد سے جلد اردو کو مالا مال کر دینا چاہتے تھے اس کی ترویج و ترقی کے لئے رسم الخط اور املا کے مسائل، پریس اور ٹائپ کے مسائل صحافت، سنیما اور دیگر سماعی اور بصری وسائل پر سنجیدگی سے غور کرتے تھے ان سب مسائل کو سلجھانے اور وسائل سے استفادہ کرنے کے لئے انہوں نے ہندوستان اور پاکستان میں قابل لحاظ جدوجہد کی۔

اس کے برخلاف ڈاکٹر زور کی دلچسپیاں زیادہ تر اردو کے ماضی سے وابستہ تھیں۔ ماضی میں اپنے ابتدائی دور میں اردو ہمیں ہندوستان کے ہر علاقہ میں نہیں ملتی بلکہ اس کا ایک اہم منبع و مرکز دکن میں ملتا ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر زور کی توجہ کا اور اس وجہ سے بھی کہ وہ خود دکن میں پیدا ہوئے تھے، دکن کی اس قدیم اردو کی جانب متوجہ ہو جانا عین فطری تھا۔ دکن سے ان کی دلچسپی کسی حد تک عصبیت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ان کے اس رویہ کا بھی مناسب جائزہ لیا جانا چاہیئے۔

شہنشاہیت کے بعد مغل شہنشاہیت کی سالمیت ٹوٹنے لگی تھی اور جیسے ہی مرکزی حکومت کا آفتاب غروب ہوا ہندوستانی سیاست کے مطلع پر چھوٹی چھوٹی علاقائی اور جرم خود مختار ریاستوں کا ایک انجم کدہ آباد ہو گیا ان علاقائی ریاستوں کی

[illegible] قومی مرکزیت کی عدم موجودگی کے دور میں جتنی بھی حقیقی معلوم ہوتی ہو سو ہوتی ہو لیکن قومی مرکزیت کے پس منظر میں ان کی حیثیت سیاسی مفروضوں سے زیادہ نہیں ہو سکتی تاہم ۱۸۵۷ء میں قومی مرکزیت اور اس کے اقتدار کے حصول تک ہندوستان کی علاقائی ریاستوں نے ایک ایسا رویہ اختیار کیا جو کسی قومی ریاست کا وصف ہو سکتا ہے ۔ لہذا ہر ریاست کے باشندے اپنے آپ کو اس ریاست کو تشکیل دینے والی ایک جدا قوم سمجھتے تھے گویا ع

ہندوستاں میں رہتے تھے ہندوستاں سے دور

ایسی علاقائی قومی نفسیات کا ابھارنا ان علاقائی ریاستوں کے استحکام کے لئے ظاہر ہے کہ از حد ضروری تھا۔ ریاست حیدرآباد بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھی۔ ہندوستان کی دیگر علاقائی ریاستوں کی طرح حیدرآباد بھی جو جمہوری ریاست نہیں تھی یہاں بھی انفرادی اور شاہی حکومت تھی جو ہندوستان کی ساری علاقائی ریاستوں میں ہر طرح سے سب سے بڑی تھی۔ اس ریاست نے سوا دو سو برس سے زیادہ عمر پائی۔ اس عرصے میں ہندوستان کے کئی تہذیبی مراکز کی طرح حیدرآباد میں بھی سیاسی تہذیبی اور معاشرتی روایات کا ایک سلسلہ ابھرا جس نے حیدرآبادی تہذیب کے موجود ہونے کا تاثر دیا۔ اس تہذیب کی بنیادیں ماضی میں اپنی روایات گولکنڈہ میں تلاش کرتی تھیں۔ گولکنڈہ سے حیدرآبادی تہذیب کے رابطہ کا مسئلہ جداگانہ طور پر تحقیق و توجہ کا متقاضی ہے یہاں اس کی جانب چند اشارات ضروری ہیں کیونکہ شاہان آصفیہ ابتداء ہی سے مغلوں سے وابستہ رہے اور قطب شاہیوں سے ان کو کوئی واسطہ نہ تھا۔ سرکاری طور پر ۱۸۵۷ء تک شاہان آصفیہ نے سلطنت دہلی کی سرپرستی کو تسلیم کیا اور عقیدتاً انہیں خراج ادا کرتے رہے۔ لیکن دکن میں خصوصاً آندھرا پردیش کے علاقوں میں مغل اقتدار کی تاریخ ۱۶۸۶ء سے ۱۷۰۷ء کے بیس اکیس سال سے زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ قطب شاہی حکمرانوں نے اپنے آپ کو دکن کے ماحول اور مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ کر لیا تھا اور وہ یہاں بے حد مقبول ہو چکے تھے ان کے بعد مغلوں کو دکن میں تہذیبی اثر و رسوخ پیدا کرنے کا موقع بھی نہ ملا تھا کہ خود ان کی شہنشاہیت کا دم ٹوٹ گیا۔ اس طرح دکن میں قطب شاہیوں کے تہذیبی وارث آصفجاہی حکمراں بنے جو خود غیر ملکی تھے لہذا شاہان آصفیہ کو سیاسی طور پر دہلی اور تہذیبی طور پر گولکنڈہ کی روایات سے مفاہمت کرنا اور رابطے استوار کرنا ضروری تھا۔ گولکنڈہ کی روایات سے اہل دکن کو جو عقیدت رہی ہے اس کی مادی اور حقیقی وجوہات کا پتہ نہیں چلتا۔ تاہم ان کی اخلاقی و روحانی وابستگی کا اندازہ۔ حیدرآباد کے کسی بھی جدید ترین مورخ کی تحریروں سے لگایا جا سکتا ہے۔ حیدرآباد کا زیادہ سے زیادہ روشن خیال باخبر اور غیر جانبدار مورخ بھی جب انصرام گولکنڈہ کا تذکرہ کرتا ہے تو اس رقت اور گلوگیری کے ساتھ کہ جیسے اس کا اپنا گھر لٹ گیا ہو۔ اس کا یہ غم کھانا کہاں تک درست ہے؟ یہ جدا بحث ہے۔ تاہم ان چند اشارات سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس چیز کو حیدرآبادی تہذیب کہا جاتا ہے وہ مغل تہذیب سے انحراف اور گولکنڈہ سے وابستگی کے رجحانات [illegible] وہ ایسی ہی تہذیب میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم نے ان میں ان تہذیبی سطحوں سے بلند ہو کر صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطحوں پر سوچنے کا حوصلہ پیدا کیا لیکن ان کے سامنے چند مسائل بہت نمایاں تھے۔ ایک تو اس علاقے کے تہذیبی رجحانات

کی پاسداری جہاں ان کو کام کرنا تھا دوسرے شمالی ہند کے تہذیبی اور ادبی رویوں کا ردعمل تہذیبی خود فہمی اور خود سری
دکن ہی کا خاصہ نہیں تھی بلکہ شمالی ہند میں اور خاص کر دہلی اور اس سے بڑھکر لکھنؤ میں یہ کیفیت بہت زیادہ شدید رہی ہے
تہذیبی خود فہمی اور خود سری تہذیبی انحطاط کی علامت ہے ۔ ڈاکٹر زور نے جو دن دیکھے وہ دن انحطاط پذیر علاقائی تہذیبوں کی
اوچھی چشمکوں کے دن تھے ۔ ڈاکٹر زور نے ان چشمکوں کی فضا میں جو رویہ اختیار کیا وہ بہت دانشمندانہ تھا۔ انہوں نے دکنی تہذیب
کی عصبیت کا سہارا لیتے ہوئے اس تہذیب کے قطب شاہی سرچشمے کے اصلی جوہر یعنی اردوئے قدیم کی بازیافت کی مہم
میں بہت سوں کو خلوص اور دردمندی کے ساتھ معروف کر دیا جو شمالی ہند کے اہل ادب کے نزدیک ایک لپر بات سے زیادہ
وقعت نہ رکھتی تھی اس ردعمل میں دکن کی اردوئے قدیم کو اگر کسی خاص زمانہ تک اور خاص مصلحتوں کے تحت دکنی کہا گیا ہو
تو اس اقدام پر تنقید سے پہلے تہذیب و تاریخ کے مناسب جائزہ کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر زور عام طور پر حیدرآباد کی اردو بولتے
تھے، لیکن ان کے شاگرد کی حیثیت سے میرا یہ تجربہ ہے کہ وہ اپنے درس میں یوپی کی ٹکسالی اردو بولتے اور طالب علموں کو
ان غلطیوں پر جو حیدرآبادی ماحول میں ناگزیر تھیں اسی انداز میں ٹوکتے تھے جس طرح یوپی کا کوئی معلم ٹوک سکتا ہے۔ خود ان
کی کوئی تحریر تکلفاً اور تصنعاً بھی دکنی میں نہیں ہے ۔ جس سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے دکن کی اردوئے
قدیم کو ضرورتاً دکنی کا نام دیا ہو تو دیا ہو اور اس طرح کی رائے ظاہر کی ہو تو کی ہو لیکن ان کے تحقیقی اعمال کی نیتوں سے یہ
ثابت نہیں ہوتا کہ انہوں نے دکنی کو عملاً ایک جدا زبان قرار دیا ہو۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بابائے اردو نے اردو کے مستقبل کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا۔ انہوں نے کالج قائم
کروایا، لغات لکھے، صحافتی وسائل بڑھائے اور ہر وہ کام کیا جس سے شجر اردو کی شاخیں اور زیادہ سے زیادہ بار ور ہوں
اور ڈاکٹر زور نے اس درخت کی اصل یا اردو کے ماضی کی طرف بر وقت اور مناسب توجہ دی تاکہ ہم دنیا کے سامنے اس زبان
کی حقیقی بنیادوں کو پیش کر سکیں ایک کا کام مستقبل آفرینی رہا اور دوسرے کا منصب ماضی کا تحفظ۔ اردو زبان و ادب
کی تاریخ میں زور صاحب کی شخصیت کا تعین اسی طرح کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر زور وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے ایک
طرف تو صوتی اور لسانی اصولوں کے مطابق اردو زبان کے مطالعہ کی بنا ڈالی اور اس کی تاریخ لکھی، دوسری طرف اپنی لسانی
تحقیقات کے زیر اثر اردو ادب کی تاریخ نویسی کے مسائل پر توجہ دی جس کے خاکے ڈھالے اور اس تاریخ کی اہم منزلوں پر
اس طرح تحقیقات کیں جس سے آنے والی نسلیں اردو ادب کی ایک ایسی باضابطہ تاریخ مرتب کر سکیں جو لسانی حقیقتوں کے
اعتبار سے مکمل اور معتبر ہو۔

اس معاملہ میں ڈاکٹر زور کی کوششوں پر ابتداً توجہ نہیں دی گئی اور پھر اس پر ایک ناگوار ردعمل کا سلسلہ شروع
ہوا جو کسی سے زیادہ عصبی تھا لیکن میں گزارش سے لسانیات اور تاریخ ادب کی جزئی مہم اٹھی اس نے محسوس کیا کہ اردو
کا لسانیاتی تحقیق کا کام بہت کم ہوا ہے اور جو کچھ ہوا ہے وہ ناقدری کے عالم میں پڑا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اردو ادب کی

[illegible] محدود جہ نامکمل اور ناقص ہیں۔ آزادی سے پہلے ہندوستانی جامعات میں اردو زبان و ادب کے مسائل میں تحقیقات کے وسائل غالباً نا کم تھے لیکن گزشتہ بیس برسوں میں زبان کے مختلف پہلوؤں ادب کے مختلف معاملات اور شخصیتوں کے تعلق سے جو تحقیقی کام خصوصاً علیگڑھ اور حیدرآباد میں ہوا ہے۔ اس سے ہمارے لسانی اور ادبی تصورات کو کافی وسعت ملی ہے اس سے زبان و ادب کی تاریخ کا نہ صرف زمانہ کافی پھیل گیا ہے بلکہ ان کے مختلف ادوار میں نئی حقیقتوں کے انکشاف سے ان تاریخوں کی نئی سائنٹفک تعبیروں کی ضرورت بھی محسوس کی جانے لگی ہے۔ جس سے رواداری کی جو فضا ضروری تھی وہ فراہم ہوئی جاتی ہے۔ زبان اور ادب کی تاریخ کے اس وسیع معاملہ میں ڈاکٹر زور کے پیش کئے ہوئے کینوس اور کھینچے ہوئے خاکہ سے اگلی نسلیں مناسب استفادہ کریں گی۔ اردو شہ پارے کی اشاعت کے بعد سے اردو ادب کی تاریخوں میں ایک خاص وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ کلیات قلی قطب شاہ، دکنی ادب کی تاریخ، تذکرہ گلزار ابراہیم واجد علی شاہ کے خطوط اور دکنیات ابن نشاطی اور پھول بن، زبان اور سیاسیات، اردو کا قدیم ترین معیار سخن، ہماری شاعری کا لفظی خزانہ، بابائے ریختہ دلی اور اورنگ آبادی، دکن میں اردو شعر و سخن کا ارتقا، اردو اور پنجابی، قدیم اردو ادب کی تازہ تحقیق، اردو کی ابتدا اور داستان ادب حیدرآباد، زور صاحب کے وہ کارنامے ہیں جو ان کی ان تمناؤں کی نمائندگی کرتے ہیں جو کہ ان کے دل میں اردو زبان و ادب کی تاریخ کی تشکیل و تعبیر کے تعلق سے تھیں۔ زور صاحب کسی ایسے جزوی کام کے درپے نہیں ہوئے جو بجائے خود ان کا اتنا بڑا تصنیفی کارنامہ سمجھا جاتا کہ جس پر ان کی شخصیت کو تولا جا سکتا۔ ڈاکٹر زور کا سب سے بڑا کارنامہ اردو زبان اور تاریخ ادب کا وہ تصور ہے جو انہوں نے نئی نسلوں کو دیا ہے۔ اس تصور کو عملی جامہ پہنانا نہ ان کے بس کا کام تھا نہ ہی ایک فرد کے بس کا کام ہے۔ بلکہ کئی نسلوں کی مساعی اس کی صورت گری کریں گی۔

ایوان اردو کی عمارت نہ تو کوئی لاثانی مظہر ہے نہ ہی زور صاحب کی تمناؤں کا تتمہ، بلکہ وہ اردو زبان و ادب کی بنیادوں کے تجسس میں نکلنے والے کاروانوں کی ایک سرا ہے جہاں انہیں اپنے راستوں اور اپنی منزلوں کا پتہ مل سکتا ہے۔ البتہ ایوان اردو کی تعمیر میں جو فنی ملحوظات پائے جاتے ہیں وہ کئی تہذیبوں کی تاریخ کا ملخص ہیں اور یہی وہ تہذیبیں ہیں جنہوں نے اردو زبان کی تاریخ مرتب کی ہے۔ ایوان اردو کا فن تعمیر جیسا کچھ بھی ہے۔ زور صاحب کے لسانی اور ادبی تصورات کا مادی مرقع ہے۔

حیدرآباد کے لئے یہ بات قابل فخر و مسرت ہے کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی شخصیت لسانی علوم میں گہری بصیرت رکھتی ہے اور دکن کی قدیم اردو سے ان کی جو گہری دلچسپیاں ہیں اس کے نتیجہ میں ڈاکٹر زور کے چھوڑے ہوئے مشن کی تکمیل کے لیے ان کی قیادت میں صحت مند اور توانا افراد پر مشتمل ایک نیا قافلہ نکل پڑا ہے جیسے جیسے دکنیات میں کام گہرائی اور گیرائی کے ساتھ بڑھتا جائیگا علمی اختلافات کے باوجود ڈاکٹر زور کی شخصیت زیادہ واضح طور پر نئی نسلوں کے سامنے آئیگی اور بالآخر اردو زبان و ادب کے ماضی اور بنیادوں کی بازیافت کی اولیت کا سہرا ڈاکٹر زور کے سر جائیگا اور وہی اسکے ابو الآبا کہلائیں گے

ڈاکٹر انور معظم

سید محی الدین قادری زور — ایک اہم شخصیت

ہر اہم شخص مشہور ہوتا ہے، مگر ہر مشہور آدمی اہم شخصیت نہیں ہوتا۔ شہرت کی عالی شان عمارت کمزور بنیادوں پر بھی کھڑی کی جاسکتی ہے جو وقت کے ہلکے جھٹکوں سے ڈھ سکتی ہے۔ لیکن اہمیت کا قلعہ مضبوط بنیادوں ہی پر تعمیر ہوتا ہے وہ سیاسی میدان ہو یا سماجی اور تہذیبی، شہرت حاصل کرنا مشکل نہیں۔ خصوصاً موجودہ دور میں۔ لیکن اہمیت حاصل کرنا بڑا کٹھن کام ہے پروپگنڈے کے ذرائع جتنے عام ہوتے جارہے ہیں اسی قدر اہم کارنامے انجام دینے کے راستے دشوار گذار بنتے جارہے ہیں کوئی شخص کسی جلوس کی رہبری کرکے یا مشاعرے میں غزل سرا ہوکر معروف ہوسکتا ہے لیکن کسی میدان میں اہم شخصیت بننے کے لیئے نہ صرف تاریخ اور اپنے عہد کی نوعیت کو پوری بصیرت کے ساتھ سمجھنا ضروری ہے بلکہ اکثر اوقات تاریخ میں توسیع کرنے اور اپنے عہد میں اپنی شخصیت کا رنگ شامل کرنے کی جدوجہد بھی لازمی ہے۔ اس جدوجہد میں جو جزوی طور پر کامیاب ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی قدر اہمیت حاصل کرجاتا ہے اور جو پورے طور پر کامیاب رہتا ہے اسے بڑا یا عظیم آدمی کہتے ہیں۔ میر، غالب اور اقبال شاعروں میں اور سرسید مصلحین و مفکرین میں بڑے آدمی تھے۔ حالی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، امیر علی، نظیر اکبرآبادی پرانے دور کے اور ابوالکلام آزاد، عبدالحق، جوش، فراق موجودہ دور کے اہم آدمیوں میں شمار کیئے جاسکتے ہیں (اچھے یا مشہور لوگوں کی تعداد بہت ہے) زورؔ صاحب کا شمار اہم شخصوں کے زمرہ میں ہوتا ہے۔ ایک محدود دائرے میں رہکر انھوں نے تاریخ ادب میں توسیع کی اور دکھنی ادب کے ذوق کو عام کرنے کے مشن کے توسط سے اپنے دور پر اپنی شخصیت کا نقش بھی چھوڑ گئے۔
ان کی اہمیت ان کے علمی کام کی اہمیت سے عبارت ہے اردو کی تاریخ میں چار سو سال کا اضافہ کرکے دکنی ادب کے خزانوں کو لاعلمی کے تہ خانوں سے مطالعے کے اجالوں میں لاکر ڈاکٹر زورؔ نے اردو کی لسانی اور ادبی تاریخ میں اپنی جگہ محفوظ کرلی۔ اسی لیئے ڈاکٹر زورؔ اہم ہیں۔

یہ اہمیت تقریباً چالیس برس کے مسلسل انہماک، لگن اور جدوجہد سے حاصل کی گئی ہے ڈاکٹر زورؔ نے تاریخ حیدرآباد کے جس دور میں اپنی علمی زندگی کا آغاز کیا وہ مادی منفعت، اعلیٰ سماجی حیثیت اور سرکاری اعزاز حاصل کرنے کا زرین دور تھا۔ وہ چاہتے تو اپنی صلاحیتوں کا رُخ موڑ کر ریاست کا کوئی اعلیٰ عہدہ بآسانی حاصل کرلیتے جیسا کہ کئی ذہین افراد نے کیا، شہرت کے پھلجھڑی کی طرح چھوٹے اور بجھ گئے۔ زورؔ نے اعزاز اور دولت کے اس قریبی راستے کی بجائے علم اور ادب کے طویل راستے کو ترجیح دی۔ ان کی علمی زندگی کے آغاز پر ایک سرسری نظر بتاتی ہے کہ ڈاکٹر زورؔ بہتے دریا سے نہریں نکال لینے کو

[illegible] نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ چٹان کا سینہ چیر کر جوئے شیر لانے کے قائل تھے۔ چنانچہ دکنی ادب، لسانیات، صوتیات، اسالیب بیان اور تنقید پر ان کی تالیفات اور تصانیف اسی کوہ کنی کے ثمر ہیں۔ روح تنقید اس میں شک نہیں اردو کے تنقیدی اصولوں کی کتاب نہیں۔ تنقید کے موضوع پر خام سہی مگر پہلی کتاب کہی جا سکتی ہے۔ "اردو کے اسالیب بیان" اپنے موضوع پر پہلی اور تعجب کی بات ہے اب تک آخری کتاب ہے۔ "ہندوستانی صوتیات" اور "ہندوستانی لسانیات" بھی اپنی نوعیت کی پہلی کوششیں ہیں جنہوں نے آئندہ اردو کی لسانی اور صوتیاتی تحقیقات کے لیے راہ ہموار کی۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ دکن اور دکنی ادب سے شیفتگی انھیں لسانی تحقیق کی طرف لے گئی یا لسانیات اور صوتیات کے مطالعے نے انھیں دکنی ادب کی طرف متوجہ کیا۔ آج ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ لسانیات اور صوتیات سے انکی دلچسپی کا دور ان کی زندگی کے اصل مشن کی ابتدا کے لیے ایک تیاری کا دور تھا...... یعنی دکنی ادبیات کی بازیافت۔ یہ صرف چند شعری اور نثری مجموعوں کی بازیافت نہ تھی۔ یہ ایک دور، ایک تہذیب کی بازیافت تھی۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ ایک دیوان نہیں ایک دور ہے یہ اس سنگلاخ زمین کی دریافت تھی جس میں اردو کی صنوبری بلندی کی پہنائیاں پنہاں ہیں۔ یہ اس میٹھے چشمے کی دریافت تھی جس کی ٹھنڈک اردو نثر کی کلیوں اور غزل کے پھولوں میں تیرتی ہوئی ہے۔ اس نے اردو ادب کو بیک وقت محبت اور اعتماد، رواداری اور تمکنت، گداز اور سنجیدگی عطا کی۔ کسی دور کا ادب اس دور کی تاریخ کے بارے میں اور زیادہ روشن بنجاتا ہے۔ زور نے "حیات قلی" اور "حیات میر محمد مومن" کے ذریعے اس کمی کو پورا کیا۔ سینکڑوں برس قبل گولکنڈے کے زرین دور میں قاری کو صرف ایک فن کار کا جادو ہی منتقل کر سکتا ہے۔ زور نے افسانے کی صنف کے سہارے یہ فضا بھی تعمیر کی۔ اور حیرت ہے کہ ایک محقق تخلیقی ادب کے میدان میں بھی کامیاب رہا۔ "سیر گولکنڈہ" اور "گولکنڈہ کے ہیرے" کے افسانے چاہے ہمارے موجودہ افسانے کے فنی معیاروں پر پورے نہ اتریں مگر اس کو کیا کیجیے کہ ان افسانوں کا قاری گولکنڈے کی سینکڑوں برس پہلے کی فضا کو اپنے اطراف جیتا جاگتا اور سانس لیتا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور مصنف کا مقصد شائد اس کے علاوہ اور کچھ تھا بھی نہیں۔

یوں زور نے دکنی تاریخ، تہذیب اور ادب چشموں کو نئی زندگی دی۔ شائد ہر اہم شخصیت اپنے ارتقا کے مختلف ناہموار مدارج سے گزر کر آخر کار ایک فیصلہ کن موڑ لینے کے بعد اپنی منزل کا تعین کر لیتی ہے اور اسکی طرف ثابت قدمی سے بڑھنا شروع کر دیتی ہے۔ بات تقابل کی نہیں (اور نہ کیا جا سکتا ہے) لیکن جس طرح سرسید تاریخ اور مذہب کے میدانوں سے ہو کر تعلیم کے مقصد اصلی تک پہنچے تھے اسی طرح زور کا سفر بھی تنقید، ناول اور افسانے، لسانیات اور صوتیات سے ہو کر بالآخر دکنیات کی منزل پر ختم ہوا۔ دکن سے انکی محبت دکنی تہذیب اور ادب کے احیا کی تحریک کی شکل میں نمودار ہوئی اور اس کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ ادارۂ ادبیات کا ۱۹۳۱ء میں قیام اس سمت ایک اہم قدم تھا۔ دکنی مخطوطات کا ادارہ سالار جنگ کی سرپرستی میں اسی غرض سے قائم ہوا۔ ادارہ ادبیات اردو ذرا ایک [illegible] مطابق

(یعنی ترقی اردو کے متوازی تنظیم کے طور پر قائم ہوا تھا) رفتہ رفتہ دکنی مخطوطات کی دریافت، ترتیب اور تہذیب کے ایک بڑے مرکز میں تبدیل ہو گیا۔ چند برسوں میں ڈاکٹر زور کے جنون کو دیکھ کر دکن کے دیوانوں کا ایک گروہ ان کے گرد جمع ہو گیا۔ ایک خیال ایک تحریک بن چکا تھا۔

اس تحریک پر جانبداری، تنگ نظری، نخوت و غرور اور دکن پرستی کے الزامات لگائے جاسکتے ہیں اور کیا کیجئے کہ آخری تجزیئے میں ماننا ہی پڑتا ہے کہ بعض وقت یہ عناصر بھی ایک تاریخ اور تہذیب کا دامن وسیع تر کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔ وہ تنگ نظر تھے کیونکہ ان کی نظر کو دکنی ادب کے دائرے ہی میں رہنا پسند تھا۔ وہ جانبدار تھے کیونکہ انھوں نے دکن کے تہذیبی سرمائے کو ہندوستان کے دوسرے خطوں کے تہذیبی سرمائے سے کم رتبے کا نہیں گردانا اور یہ بھی صد فیصد درست ہے کہ دکن کے باہر بھی انھوں نے اپنے دکنی ہونے پر ناز کیا۔ ڈاکٹر زور دکن پرست تھے مگر خشک تشکن بھی نہیں تھے۔ وہ اردو دنیا کے ایک خدمت گزار شہری تھے۔ خدمت ان کے مشن کا خلاصہ ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

یوں تو کرنے کو بہت کام ہیں لیکن اے زور کام آتا ہے ہنر کوئی نہ خدمت کے سوا

وہ اگر کچھ تھے تو اردو پرست تھے۔ خلوص اور لگن کے ساتھ انھوں نے دکن میں اردو کے لیے وہی کام کیا جو کل ہند سطح پر عبدالحق نے انجام دیا۔ ان کے تحقیقی کارناموں اور ادارۂ ادبیات اردو اور مولانا آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹیٹیوٹ کو ذہن میں رکھئے تو ڈاکٹر زور کے بارے میں یہ بات صادق آتی ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے۔

آج ہم زور کی یاد منا رہے ہیں۔ لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ یاد صرف ۲۴ ستمبر کے لیے ہی کیوں مخصوص ہے؟ کیا چند مضامین پڑھ دینے اور چند تقریریں کر دینے کا مطلب زور صاحب کی یاد کے ساتھ انصاف کرنا ہے؟ کیا انکی یاد ان کے مشن کی برقراری سے وابستہ نہیں؟ ادارۂ ادبیات اردو اور مولانا آزاد اورنٹیل انسٹیٹیوٹ کو زندہ رکھنا ان کی یاد تابندہ رکھنے کے مترادف ہے۔ افراد کی طرح ادارے بھی حالات کے تقاضوں سے اپنے کو ہم آہنگ کرتے اور مختلف ادوار سے گزرتے ہیں یہ حالات کا ساتھ دینے یا نہ دینے کے مطابق افراد کی طرح ادارے بھی پھلتے پھولتے یا ختم ہو جاتے ہیں۔ آج کچھ ایسا لگتا ہے کہ یہ دونوں ادارے کچھ خاموش سے ہیں۔ یہ خاموشی ٹوٹنی چاہیئے۔ ادارۂ ادبیات اردو دکنی تحقیق کے ساتھ ساتھ عصر کے تقاضوں کے پیش نظر نئی ذمہ داریاں اپنے سر لے سکتا ہے۔ ایسی ذمہ داریاں جو موجودہ ہند میں اردو زبان اور ادب سے متعلق ہیں۔ زور صاحب نے مخلص اور باعلم حضرات کا گروہ اپنے گرد تیار کیا تھا آج ضرورت ہے کہ نئی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لیے نئے مخلص اور باعلم افراد کا تعاون حاصل کیا جائے۔ ادارۂ ادبیات اردو کا مشن زور صاحب کے ساتھ ختم نہیں ہوا اسے نئی تبدیلیوں کے ساتھ باقی رہنا چاہیئے۔ مولانا آزاد اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ غالباً دکن میں اپنی نوعیت کا واحد انسٹی ٹیوٹ ہے۔ اس کی تنظیم نو کی ضرورت ہے۔ حیدرآباد کے عظیم الشان کتب خانوں میں ان تمام موضوعات پر کل اور نادر مواد موجود ہے جن سے مولانا آزاد کو دلچسپی تھی۔ اس مواد سے استفادے کے بعد

تحقیق اور تصنیف وتالیف کے لیے یہ انسٹی ٹیوٹ ایک بڑے مرکز کا کام دے سکتا ہے۔ جب تک اس کی نتیجہ خیز کارکردگی کے لیے سوچا سمجھا اور قابل عمل پروگرام تیار نہ کیا جائے اور موزوں افراد سے اس سلسلے میں تعاون حاصل نہ کیا جائے اس انسٹی ٹیوٹ کے باقی رہنے کو حق بجانب ٹھیرانا مشکل ہوگا "سب رس" ہندوستان میں اردو ادب کے رجحانات کی نمائندگی کرنے والے اچھے ادبی رسائل کی کمی کو پورا کرنے کا اہل بن سکتا ہے بشرطیکہ اس کا رشتہ آج کے ادبی رجحانات سے دوبارہ قائم کیا جائے۔

یہی زورؔ صاحب کی یاد زندہ وتابندہ رکھنے کا ایک طریقہ ہے۔ ہم چاہیں تو ان کے قائم کیے ہوئے اداروں کے ذریعے چند اور اہم شخصیتوں کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے دلوں میں ڈاکٹر زورؔ کا سچا احترام اور ان کے مشن کی اہمیت کا پورا احساس ہے؟ اگر ہے تو ۲۵ ستمبر ایک دن کی نہیں ایک دور کی تاریخ بن سکتا ہے۔

بقیہ صفحہ نمبر ۲ :—

میر محمد مومنؒ اور نصیر الدین ہاشمیؔ کی دکنی کلچر کا مطالعہ اس کی گواہی دے گا۔

اگر ان شہادتوں کے بعد بھی کسی کو اصرار ہو کہ دکنی کا نام عصبیت کی بنا پر زورؔ صاحب نے دیا یا یہاں کے کلچر کے بارے میں علحدگی پسند طرز عمل اختیار کیا تو ہم اس کی رائے سے متفق نہ ہو سکیں گے۔

ایک مقالہ نگار نے سب رس کے بارے میں اپنے اس خیال کا اظہار فرمایا ہے کہ سب رس آج کے ادبی رجحانات کی نمائندگی کرنے والا نہیں۔ سب رس کے اجرا کا منشا یہ تھا کہ دکن کے ہونہار اور نوخیز ادیبوں کی تحریروں کو منظر عام پر آنے کا موقع ملے۔ اس کے ذریعے ہم اپنے ادارہ کے کارناموں سے ادبی دنیا کو واقف کرائیں، دکنی ادب کی باقیات کو منظر عام پر لے آئیں۔

ان مقاصد کی تکمیل میں سب رس نے اپنی مقدور بھر کوشش کی جو اہل نظر سے مخفی نہیں اور عصری رجحانات رکھنے والے مضامین کبھی رد نہیں کیے گئے اور آج بھی سب رس کے صفحات اس کے لیے کھلے ہیں۔

ڈاکٹر غلام عمر خاں

ڈاکٹر زور

جامعہ عثمانیہ کے قیام سے حیدرآباد میں علوم و فنون کا ایک نشاۃ الثانیہ عمل میں آیا اور دکن کی سرزمین جہاں قطب شاہی عہد کے بعد علم و ادب کے سوتے کچھ خشک ہو چلے تھے۔ ایک نئے چشمے سے سیراب ہونے لگی۔ جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی عہد کے جن ممتاز سپوتوں نے اس نئے دور میں حیدرآباد اور سرزمین دکن میں علوم و فنون کی نئی روایات کی تشکیل کی ان میں ڈاکٹر زور مرحوم کا نام ہمیشہ سر فہرست رہےگا اور اردو زبان و ادب کے نقطۂ نظر سے اٹھارویں اور انیسویں صدی کا عرصہ، وہ زمانہ ہے جب کہ اردو زبان کی نشو و نما کے مراکز دکن سے شمال میں منتقل ہو چکے تھے اس عرصہ میں دکن کے عالم، شاعر اور ادیب ایک لسانی کشمکش کے عالم میں گرفتار تھے۔ ایک طرف اردو کا وہ روزمرہ اور محاورہ ان کا دامن تھامے ہوئے تھا۔ جو انہیں محمد قلی اور وجہی، غواصی اور ولی سے ورثہ میں ملا تھا۔ دوسری طرف میر اور سودا۔ میر حسن اور انیس کی زبان تھی۔ جس کا جادو سارے ہندوستان پر چل چکا تھا۔ اس لسانی کشمکش اور تذبذب کی کیفیت نے اہل دکن سے ان کی لسانی خود اعتمادی چھین لی تھی۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد اہل دکن کی خود اعتمادی کو بحال کرنے بلکہ ایک نئے ولولے اور حوصلے کے ساتھ زبان کے نئے معیار کی کمند سارے ہندوستان پر پھینکنے میں جس شخصیت نے اہل حیدرآباد کی رہنمائی کی وہ ڈاکٹر زور کی شخصیت تھی۔

زور مرحوم اپنے عہد کے ایک ممتاز محقق اور نقاد ہی نہیں تھے بلکہ ان کی شخصیت ایک عہد ساز شخصیت تھی۔ قطب شاہی عہد کی مخصوص ملی جلی تہذیب اور اس دور کے رنگا رنگ تمدن کی بازیافت کے ذریعہ انہوں نے سرزمین دکن کی عظمت رفتہ کو بے نقاب کیا اور موجودہ اور آنے والی نسلوں کو کام کرنے کا ایک نیا حوصلہ اور ولولہ بخشا۔

ڈاکٹر زور کا وہ کارنامہ جس کی بدولت ان کا نام اردو زبان کی تاریخ میں لافانی ہو چکا ہے یہ ہے کہ انہوں نے سرزمین دکن کے ایسے سیکڑوں شاعروں اور مصنفوں کو دوبارہ زندگی بخشی، جن کے کارنامے طاق نسیاں کی نذر ہو چکے تھے۔ اگرچہ ڈاکٹر زور سے پہلے بھی مختلف ادوار کے بعض عالموں نے قدیم دکنی کی بعض تصانیف پر روشنی ڈالی تھی لیکن دکنی ادب کی بازیافت کو ایک تحریک اور مہم کی حیثیت سے شروع کرنے اور اس خصوص میں گرانقدر کارنامے انجام دینے کا سہرا ڈاکٹر زور ہی کے سر ہے۔ انہوں نے اردو ادب کی تاریخ کو ساڑھے تین سو برس پیچھے ڈھکیل دیا۔ ان کی مساعی کی بدولت دکن کے بے شمار شعراء، ادیب اور مصنفین، سیکڑوں سال کی گمنامی کے بعد دوبارہ زندہ ہوئے اور اردو زبان اپنے ایسے گمشدہ محسنوں سے واقف ہوئی جن کے وجود سے وہ اب تک ناآشنا تھی۔ دکنی ادبیات کی حیات نو کا یہ صور ڈاکٹر زور ہی نے پھونکا تھا۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں لیکن اس صور کی آواز اب تک دکن کے

معلومات فراہم کر رہی ہے۔ آج سے ان صدیوں قبل کے نامعلوم شعرا اور مصنفین دوبارہ زندگی حاصل کر رہے ہیں اور یہ سلسلہ شائد عرصہ دراز تک جاری رہے گا۔

آج سے چالیس برس پہلے کی بات ہے کہ ہماری زبان کے ممتاز عالم اور ادیب دکنی زبان کو بقول قائم ایک لچری بات سمجھتے اور دکن کی بے پایاں ادبی دولت سے محض بے بہرہ تھے لیکن آج جبکہ ڈاکٹر زور مرحوم اور ان کے رفقاء کی کوششوں کی بدولت سیکڑوں کیا بیسیوں مصنفوں اور شاعروں کی تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں اور ہزاروں دکنی مخطوطات کی توضیحی فہرستیں شائع ہوچکی ہیں اب یہ بات ایک مسلمہ حقیقت بن چکی ہے کہ دکنی ہماری موجودہ معیاری اردو کی قدیم شکل ہے، وہ قدیم اردو ہے جس کو لچری بات سمجھنا شعور سے بے بہرہ ہونے کی علامت ہے۔ آج علم زبان کے محققین اردو کی اس قدیم شکل کا شرح و بسط کے ساتھ سائنسی مطالعہ کرنے کی کوشش میں معروف ہیں۔ آپ کو یہ جان کر مسرت ہوگی کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو نے گزشتہ چار سال کے عرصہ میں اردو کے ممتاز ماہر لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کی رہنمائی میں دکنی زبان و ادب پر تحقیقات کے متعدد منصوبے بنائے ہیں جن میں سے بعض زیر تکمیل ہیں جن کے مختلف ادوار کی زبان کا لسانیات کے جدید اصولوں کی روشنی میں جائزہ لیا جا رہا ہے۔ کلاسکی دکنی کی ایک مستند لغت تیار ہو رہی ہے جس کی ضرورت گزشتہ پچیس تیس سال محسوس کی جا رہی تھی۔ شعبہ اردو کی طرف سے ایک تحقیقاتی مجلہ "قدیم اردو" کا اجرا عمل میں آیا ہے جس کا مقصد دکنی کے ایسے مخطوطوں کو جو لسانی یا ادبی نقطۂ نظر سے اہمیت کے حامل ہیں ایڈیٹنگ کے جدید اصولوں کے مطابق مرتب کرکے شائع کرنا ہے۔ اس طرح جامعہ عثمانیہ میں دکنی ادب پر تحقیقات کے ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے اور ڈاکٹر زور نے جس پودے کو اپنے خون سے سینچا تھا آج وہ بار آور ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر زور کی ایک اہم یادگار یہ ادارہ ہے جہاں دکنی یا قدیم اردو کے ہزاروں مخطوطات کی وہ بیش بہا دولت جمع ہے جو ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندگی کا ماحصل ہے اور جس میں ہماری زبان کے تاریک دور کی چار سو سالہ تاریخ محفوظ کر دی گئی ہے یہ ڈاکٹر زور کی ایک مقدس امانت ہے جس کی حفاظت اور توسیع اہل اردو اور بالخصوص اہل حیدرآباد کا فرض ہے۔ یہ ادارہ کی خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹر زور مرحوم کے بعد اس ادارہ کو ان کے دیرینہ رفیق اور حیدرآباد کے ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر سید علی اکبر صاحب اور ڈاکٹر زور صاحب کے با اعتماد دوست اور عثمانیہ یونیورسٹی کے ممتاز پروفیسر ڈاکٹر مہندر راج صاحب سکسینہ کی رہنمائی میسر ہے۔ جن کا وقت صبح کے ۸ بجے سے رات کے دس بجے تک یونیورسٹی کی تجربہ گاہوں میں گزرتا ہے لیکن وہ ایک ایسی منتظم شخصیت ہیں جس کو اردو زبان و ادب اور اردو کلچر سے محبت پشتہا پشت سے ورثہ میں ملا ہے وہ اس یادگار تہذیب کے کمیاب نمائندے ہیں جسے حیدرآبادی تہذیب یا دکنی تہذیب سے موسوم کیا جاتا ہے۔ انھی محترم شخصیتوں کی بدولت آج بھی ملک میں ادارہ کی ساکھ قائم ہے، یقین ہے کہ ان بزرگوں کی رہنمائی میں ادارہ ڈاکٹر زور مرحوم کے مشن کو تکمیل کو پہنچانے میں پوری سعی کرے گا۔

ڈاکٹر زور
اردو کے عظیم خدمت گزار

پنڈت [illegible] آنجہانی

ڈاکٹر زور کو پہلے پہل میں نے اورنگ آباد میں دیکھا۔ اورنگ آباد میں عثمانیہ کالج جس کا نام اب گورنمنٹ کالج ہے۔ اس کی طرف سے مولانا الطاف حسین حالی کا صد سالہ جشن منایا جا رہا تھا وہ اس جلسہ میں مولانا حالی پر مقالہ پڑھنے کیلئے تشریف لائے تھے وہ اس وقت عین جوانی میں تھے۔ اور شائد کچھ مہینے پہلے ہی لندن سے واپس تشریف لائے تھے۔ ان کا تقرر ریڈر اردو کے شعبہ میں ہوا تھا۔ لیکن ان دنوں میں بھی ڈاکٹر زور کا نام عزت کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ ان دنوں میرے کچھ مضامین انجمن ترقی اردو کے رسالہ "اردو" میں شائع ہوئے تھے ان کو ڈاکٹر زور نے پڑھا تھا۔ ڈاکٹر زور جب پہلی دفعہ مجھ سے ملے تو کہنے لگے "اردو" میں آپ کے مضامین پڑھ کر میں نے تو یہ اندازہ لگایا تھا کہ آپ بوڑھے ہوں گے لیکن ماشاءاللہ آپ تو بالکل نوجوان ہیں یہ باتیں انھوں نے کچھ ایسی بے تکلفی سے کہی تھیں کہ جیسے میرا ان کا تعلق کئی برس پرانا ہو۔ میں نے اس وقت محسوس کیا کہ وہ کس طرح بے تکلفی سے پر تکلف رشتہ پیدا کر لیتے تھے۔

چند سال کے بعد میں عثمانیہ یونیورسٹی میں آگیا اس وقت تک انھوں نے ادارہ ادبیات اردو قائم کر لیا تھا۔ انھوں نے اپنے ساتھ کچھ ایسے نوجوانوں کو اکٹھا کر لیا تھا جو ہر وقت ان کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے تھے انھوں نے اردو۔ انسائیکلو پیڈیا کی اسکیم بھی بنائی اور کام بھی شروع کیا اس انسائیکلو پیڈیا میں مجھے بھی سنسکرت اور ہندی کا کام دیا تھا۔ میں نے انھیں کچھ کام کر کے دیا تھا جسے انھوں نے انسائیکلو پیڈیا کی پہلی جلد میں شائع کیا تھا۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے مجھے کئی دفعہ دعوت دیکر اپنے دولت خانہ پر بلایا بھی تھا۔ میں اس بات کو محسوس بھی کرتا تھا کہ ان کی یہ خواہش تھی کہ وہ اردو کی کوئی ایسی بڑی خدمت کر جائیں جس کی بنا پر ان کا نام ہمیشہ کیلئے یاد رکھا جائے۔ انسائیکلو پیڈیا کا کام بہت بڑا کام تھا۔ اس میں سینکڑوں عالموں کی ضرورت تھی وہاں کافی رقم کی بھی ضرورت تھی۔ یہ رقم کہاں سے آتی؟ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کام بہت دور آگے نہ بڑھ سکا۔

انھوں نے ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے بہت سی اہم کتابیں شائع کیں۔ ان میں "دکنی" کی پرانی کتابیں بھی ہیں دکن کے ادب کو اور لوگوں نے بھی مرتب اور شائع کیا ہے۔ لیکن وہ اس لٹریچر کے ساتھ کچھ اپنا پن اور لگاؤ محسوس کرتے تھے جب کبھی دکنی ادب کو ہندی رسم الخط میں مرتب کرنے کے لئے کمیٹیاں بنیں تو وہ بھی ان کے رکن تھے۔ انھوں نے اس کام میں بھی بڑی دلچسپی لی اور ساری کتابوں کو ہندی رسم الخط میں مرتب کر کے شائع کرنے میں بڑی امداد دی۔ گو دکن کی کئی کتابیں اردو اور ہندی میں شائع ہو چکی ہیں پھر بھی میرا خیال ہے کہ ان کا زبان اور ادب کی حیثیت سے جتنا گہرا مطالعہ کیا جا

چاہیئے ویسا ابھی تک نہیں ہوا۔ اب تک جو کچھ مطالعہ کیا گیا ہے وہ سرسری نظر سے ہوا ہے۔

انھوں نے ادارہ کی طرف سے شائع ہونے والے رسالہ کا نام "سب رس" رکھا تھا۔ اس لئے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ دکنی ادب سے انھیں کتنی دلچسپی تھی۔ یہ سچ ہے کہ "سب رس" اب بھی شائع ہو رہا ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اس رسالہ کو اس طرح شائع کیا جائے کہ وہ دنیائے ادب اردو میں پہلے سے زیادہ مقبول ہو اور وہ اردو کی ایسی یادگار بن سکے جیسے کہ "ماڈرن ریویو" راما نند چیٹو پادھیائے کی یادگار ہے۔ میں اکثر ان سے کہا کرتا تھا کہ "سب رس" کو ناگری رسم الخط میں بھی شائع کیجئے۔ اس میں ایسے مضامین شائع ہوں جو ادبی درجے کے ہونے کے علاوہ زبان کے نقطۂ نظر کے لحاظ سے ایسے سیدھے سادے ہوں کہ ان سے ہندی اور اردو قریب آسکے۔

عثمانیہ یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے سے قبل انھوں نے ایوانِ اردو اور مولانا آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹیٹیوٹ بھی قائم کیا تھا اس انسٹیٹیوٹ کیلئے انھوں نے زمین اپنے پاس سے دی تھی اور ,, اس کی عمارت جس طرح بنوائی یہ ان کا ہی کام تھا۔ اس انسٹیٹیوٹ کے ذریعہ وہ تحقیقاتی کام کرانا چاہتے تھے اور اردو کے ساتھ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مطالعہ کو بھی فروغ دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے اردو، ہندی اور تلگو میں ریسرچ کے لئے اسکالرشپس بھی دئے تھے۔ ہندی میں تحقیقاتی کام کیلئے بھی انھوں نے ہندی کی کچھ پرانی کتابیں لندن کی میوزیم سے منگوائی تھیں۔ یہ کتابیں یورپین پادریوں کی لکھی ہوئی تھیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے اس بات کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں اور اس کے کچھ وقت بعد تک ہندی اور اردو نثر کی کس طرح نشونما اور ترقی ہوئی تھی۔ ان کتابوں کو دیکھنے سے بہت سی نئی باتوں کا پتہ لگتا تھا اگر وہ زندہ رہتے تو ممکن تھا کہ اپنے اس ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے ذریعہ کچھ ایسا ہی کام کرجاتے جس طرح پونا کے بھنڈارکر ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں کیا گیا انھوں نے ایوان اردو میں اردو کی نئی پرانی کتابوں اور دیگر کئی چیزوں کا ذخیرہ اس طرح شوق سے اکٹھا کیا اسے دیکھتے ہی بنتا ہے۔ میں ان خوش نصیب لوگوں میں سے تھا جنھیں خود انھوں نے ایوان اردو کی ایک ایک چیز کو پوری تفصیل سے سمجھاتے ہوئے دکھایا تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے اردو کے بہت سے عالم پیدا کئے۔ بہت سے شاعر پیدا کئے۔ بہت سے انشاء پرداز پیدا کئے، بہت سے ادیب پیدا کئے لیکن عثمانیہ یونیورسٹی نے ڈاکٹر زور جیسے اردو کی خدمت کرنے والے بہت کم پیدا کئے۔ ان کے دل میں عثمانیہ یونیورسٹی میں اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی اردو کیلئے کچھ کر گزرنے کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا جو ان کی زندگی میں آخر تک قائم رہا وہ حیدرآباد میں اتنے معروف رہتے تھے کہ انہیں آرام کرنے کیلئے وقت میسر نہیں ہوتا تھا وہ کہتے تھے کہ کتنی میں میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔ لیکن حیدرآباد آتے ہی میں کچھ ایسا مشغول ہوجاتا ہوں کہ مجھے وقت نہیں ملتا جو شخص اس طرح کی انجمن بنا تاہے۔ اسے اپنے سے زیادہ دوسروں کو اہمیت دینی پڑتی ہے وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ بن گئے تھے اور ظاہر ہے ایسے آدمی کیلئے وقت کہاں؟!

انھیں اردو زبان سے محبت تھی لیکن یہ محبت ایسی نہیں تھی جس کی بناء پر وہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کی اہمیت کو نظرانداز کردیتے وہ ہندی زبان یا کسی اور دوسری زبان کو برا نہیں کہتے تھے۔ جب وہ کچھ دنوں کیلئے شعبۂ اردو کے صدر تھے تو انھی

دنوں کا ایک واقعہ ہے۔ اس وقت ہندی صرف اردو کے مضمون کے ساتھ پڑھائی جاتی تھی۔ وہ سلسلہ آج بھی جاری ہے انٹرمیڈیٹ میں ہندی میں (۲۵) بی اے میں (۳۰) اور ایم اے میں (۱۰۰) نمبر رکھے گئے تھے۔ کچھ لوگوں نے اردو کے بورڈ آف اسٹڈیز میں یہ مسئلہ اٹھایا کہ ہندی کیلئے اتنے نمبر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ بہت بحث ہوئی۔ کچھ لوگوں نے یہاں تک کہا کہ یہ اردو کا مضمون ہے ہمارے لئے ہندی رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ انٹرمیڈیٹ میں ہندی کیلئے (۲۰) بی اے میں (۲۵) اور ایم اے میں (۵۰) نمبر رکھے جائیں جب مجھے اس بات کا پتہ چلا تو میں ڈاکٹر زور کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ پہلے ہی ہندی کو بہت کم نمبر دئے گئے ہیں۔ اس میں مزید نمبر کیوں کم کئے جارہے ہیں۔ میں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ اس طرح کی باتوں کا اچھا اثر نہیں پڑ سکتا۔ انھوں نے مجھے جواب دیا کہ انھیں اس بات کا رنج ہے اور وہ اس بات کی پوری کوشش کرینگے کہ ایسا ہونے نہ پائے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ڈاکٹر زور نے اپنا زور لگا کر ہندی کے نمبروں میں کوئی کمی نہ ہونے دی۔ ایسی اور بھی کئی مثالیں ہیں وہ اردو اور ہندی کے جھگڑے کو قطعی پسند نہیں کرتے تھے وہ میل ملاپ کے حامی تھے اور وہ کہا بھی کرتے تھے کہ ہمیں نہ تو جھگڑا کرنا چاہیئے اور نہ جھگڑے کی فضا کو پیدا کرنا چاہیئے۔ جب ہم لوگوں نے ہندی ریسرچ انسٹیٹیوٹ قائم کرنے کی اسکیم تیار کی تو انھیں بھی اس کا رکن بنانے کا فیصلہ کیا ہم ان کے پاس گئے اس ادارے کی رکنیت کیلئے ایک سو روپیہ دینا پڑتا تھا۔ اگرچہ وہ خود اردو کیلئے اتنے کام کررہے تھے پھر بھی انھوں نے یہ نہیں کہا کہ وہ اس حالت میں نہیں ہیں کہ اس انسٹیٹیوٹ کیلئے کچھ دے سکیں۔ انھوں نے فوراً ایک سو ایک روپیہ کا چیک کاٹ کر دے دیا اور رکن بننا قبول کرلیا۔ ان کی زندگی کے آخری برسوں میں میرے اور ان کے تعلقات اور قریبی ہوگئے تھے کئی بار وہ میرے مکان پر تشریف بھی لایا کرتے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ میں کشمیر چلا آؤں اور ان کے ساتھ مل کر کام کروں میں نے ان کے ساتھ دہلی سے جموں اور جموں سے دہلی تک کا سفر کیا۔ دہلی سے پٹھان کوٹ تک تو پہلے درجہ کا سفر تھا لیکن پٹھان کوٹ سے جموں تک بس سے سفر کرنا پڑا۔ پانچ گھنٹے کا سفر تھا میں نے دیکھا کہ وہ ان پانچ گھنٹوں کے سفر میں اتنے زیادہ تھک گئے تھے کہ گورنمنٹ ہاؤس پہنچتے ہی بستر پر لیٹ گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ حیدرآباد چھوڑ کر یہاں کیوں آگئے، کہنے لگے "اس کا مجھے افسوس ہے میں چاہتا ہوں کہ اپنے کام سے استعفیٰ دے کر حیدرآباد چلا آؤں" کشمیر میں ان کا جسم تھا لیکن ان کا دل حیدرآباد ہی میں رہتا تھا . . . . مجھے پورا یقین ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے تو کشمیر سے استعفیٰ دیکر حیدرآباد آجاتے۔

سفر کے دوران انھوں نے اپنی زندگی کے کتنے ہی اچھے اور برے واقعات سنائے انھوں نے اپنی کچھ نظمیں بھی سنائیں۔ گاڑی دہلی کی طرف دوڑ رہی تھی۔ کھیت کھلیان گزرتے جارہے تھے لیکن ان کے حالات زندگی کے تبصرے ختم نہیں ہورہے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے ساتھ ان کا یہ آخری سفر ہے اور اس طرح کا موقع پھر کبھی نہیں آئے گا۔ وہ آج زندگی کا سفر طے کرچکے ہیں، اردو سے متعلق انکی بہت سی اسکیمیں ادھوری رہ گئی ہیں۔ ہم لوگوں کا یہ فرض ہے کہ انکی ادھوری اسکیموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ انکا لاشہ سری نگر کی خوبصورت گھاٹیوں میں دفن کیا گیا ہے۔ ان کا ایوان اردو آج بھی سربلند کھڑا ہے اور کھڑا رہے گا۔

عائشہ رشاد

سخنے چند

(مشاعرۂ یوم زورؔ کی معتمد نے آغاز مشاعرہ سے قبل ان الفاظ میں ڈاکٹر زورؔ کو خراجِ عقیدت ادا کیا)

اردو زبان و ادب کے ممتاز اور پُرخلوص خدمت گزار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کو ہم سے جدا ہوئے چار سال ہو گئے لیکن اردو کے اس مایہ ناز محقق، لسانیات کے ماہر اور ادبی قائد کی یاد اردو بولنے اور پڑھنے والوں کے دلوں میں مدتوں باقی رہے گی وہ ایک عملی انسان تھے۔ اس لئے اپنی دھن کے پکے تھے۔ تاریخ ادب اردو میں ان کا نام سرسید اور بابائے اردو مولوی عبدالحق جیسے محسنین اردو کے ساتھ لیا جائیگا ایک اعلیٰ مقصد سے والہانہ وابستگی، نصب العین کو پانے کے لئے سچی لگن اور تڑپ، بے پایاں محنت اور بے مثال جوش اور استقلال، خود کام کرنے اور دوسروں سے کام لینے کا عجیب و غریب سلیقہ، ان کی دلکش اور متاثر کن شخصیت کے ایسے نمایاں اوصاف ہیں جن کی بدولت انھوں نے خدمتِ اردو کے راستے کی ہر رکاوٹ پر ہمیشہ قابو پایا اور ان تھک محنت اور لگاتار جد و جہد سے اپنے بلند ارادوں کی صورت گری کی۔

زورؔ صاحب کی شخصیت، بڑی پہلو دار تھی۔ ان کی شخصیت میں مشرق اور مغرب کے بعض عمدہ اوصاف کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ وہ ایک عالی حوصلہ اور بلند ہمت انسان تھے اور کسی صورت میں بھی نچلا بیٹھنا جانتے ہی نہ تھے۔ اسی لئے مایوس کن حالات میں بھی وہ کبھی پست ہمت نہیں ہوئے اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک مشنری جذبے کے ساتھ، اردو زبان و ادب کی خدمت میں سرگرم رہے۔

پچھلے دو روز سے ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام یوم زورؔ کی تقاریب منائی جا رہی ہیں آج کی یہ محفل مشاعرہ اسی سلسلے کی ایک تقریب ہے جو ملک کے ممتاز اور ہر دلعزیز شاعر جناب مخدوم محی الدین کی صدارت میں منعقد ہو رہی ہے۔ میں جناب مخدوم صاحب سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ تختِ صدارت پر تشریف لائیں اور مشاعرہ کی کارروائی کے شروع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔

وقار خلیل

یادِ زورؔ

تو نہیں بزم میں ہر چیز وہی ہے کہ جو تھی
یہ ادارہ، یہ در و بام، یہ ایواں، یہ کلس
میوزیم اور کتب خانہ و سب رس کا وقار
وہ اثاثہ بھی ہے محفوظ وہ سرمایہ بھی
جن پہ نازاں ہے دکن، جن سے سرافراز ہے فن
جن کے ایک ایک نوشتے پہ ہے مہر تصدیق
تیری چاہت، ترا اخلاص ابھی زندہ ہے
تو نے جو شمع جلائی تھی وہ تابندہ ہے
تو نہیں بزم میں ہر چیز وہی ہے کہ جو تھی
وہی اگلی سی شرافت، وہی پہلا سا خلوص
حیدر آباد کے فن کاروں کی روشن نظری
فکر و دانش میں وہی پہلی سی آشفتہ سری
علم و تہذیب و ثقافت کی ہر اک وردی سے
تیری وارفتہ مزاجی کی صدا آتی ہے
تیری مہکی ہوئی یادوں سے معطر ہے دکن
اب بھی دامن کشِ دل ہے ترا محبوب چمن
زورؔ باقی ہے ترا شہرِ نگاراں اب بھی
یاد کرتی ہے تجھے صبح بہاراں اب بھی
تو نہیں بزم میں ہر چیز وہی [redacted] جو تھی
یہ ادارہ، یہ در و بام، یہ ایواں، یہ کلس

آخری آنسو

صلاح الدین نیر

(۱)
وقت کے آنسو رواں ہیں گردشِ ایام پر
ہے نسیمِ صبح گریاں، فصلِ گل کے نام پر
رو رہی ہے چشمِ شبنم پھول کے انجام پر
کیا جہاں بھی نیند آجائے وہیں سوتے ہیں لوگ
زندگی تیرے آخری دیدار کو روتے ہیں لوگ

(۲)
آج نبضِ گردشِ آفاق ہے ٹھہری ہوئی
قسمتِ ارضِ دکن ہے آج کیوں سوئی ہوئی
فکر و فن کی ہے نظر کیوں اس قدر سہمی ہوئی
زندگی جکڑی گئی ہے موت کی زنجیر میں
ہے دکن کی اک امانت وادیٔ کشمیر میں

(۳)
فیصلہ جیسے ہی موت اور زندگی میں ہو گیا
کاروانِ صبح، آغوشِ سحر میں سو گیا
چلتے چلتے اک مسافر راستے میں کھو گیا
موت آئی بھی تو کیا، فنکار پھر بھی زندہ ہے
زندگی کو چھین کر دستِ اجل شرمندہ ہے

(۴)
محفلِ کشمیر کو تو نے معطر کر دیا
انجمن کے گوشے گوشے کو منور کر دیا
خدمتِ اردو زباں نے تجھ کو بے گھر کر دیا
تو دکن میں یوں تو پہلی شام سے جلتا رہا
آخرِ شب وادیٔ کشمیر میں کیوں سو گیا

(۵)
گیسوئے اردو کو سلجھایا نئے انداز سے
کیسے کیسے نغمے بول اٹھے شکستہ ساز سے
کتنے دل ٹوٹے ہیں تیری آخری آواز سے
ٹوٹ کر پیہم صدا دیتا رہے گا سازِ دل
یوں ہی گونجے گی کئی صدیوں تلک آوازِ دل

(۶)
زندگی آواز ہے آواز ہی آواز ہے
موت کیا ہے زندگی کا نقطۂ آغاز ہے
زحمتِ عزم و عمل سب سے بڑا اعزاز ہے
عظمتِ فن کی قسم! جب تک کہے اردو زباں
زر کے حرفوں سے لکھی جائے گی تیری داستاں

(۷)
فصلِ گل کے واسطے جورِ خزاں رکتا نہیں!
برق کی زد میں بھی کارِ آشیاں رکتا نہیں
موت کے طوفان میں بھی کارواں رکتا نہیں
اس کا غم ہے چل بسا ایسا امیرِ کارواں
تذکرہ جس کا رہے گا داستاں در داستاں

(۸)
زور وہ دیوانۂ اردو کہ ہنگامِ سفر
آخری سانسوں میں تھی ایوانِ اردو پر نظر
آخری آنسو گرا اردو زباں کے نام پر
دل یہ کہتا ہے کہ روحِ نقد آب بھی ساتھ ہے
اپنے ان کمزور ہاتھوں میں کسی کا ہاتھ ہے

وقار خلیل

یومِ زورؔ کا آنکھوں دیکھا حال

دبستان دکن کے آخری معلم اردو، مایۂ ناز نقاد، دکنیات کے محقق اور صاحبِ طرز انشار پرداز ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ بانیٔ ادارۂ ادبیات اُردو و ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی چوتھی برسی کے موقع پر" ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام چہار روزہ "یوم زورؔ" کی تقاریب منعقد ہوئیں۔ جمعہ ۲۳ ستمبر کو بعد نمازِ عصر شہر میں واقع مسجدِ افضل گنج" میں فاتحہ خوانی و ختم قرآن کا انتظام کیا گیا اور بعد نمازِ مغرب ڈاکٹر زورؔ مرحوم کے والد حضرت زعمؔ کے مزار واقع خانقاہ عنایت اللّٰہی پر چادر گل چڑھائی گئی، فاتحہ گزرانی گئی اور تبرک تقسیم کیا گیا۔

پنجشنبہ ۲۴ ستمبر کی شام ۶½ بجے ایوانِ اُردو کے آڈی ٹوریم میں سابق گورنر گجرات نواب مہدی نواز جنگ بہادر سابق القابہ نے ادیبوں، دانشوروں، شاعروں، سیاسی اور سماجی قائدین، جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ صاحبان اور اردو دوستوں کے اجتماع میں افتتاحی اجلاس کی صدارت فرمائی۔ معتمد یوم زورؔ جناب میر سراج الدین علی خاں نے تحریک صدارت کرتے ہوئے اس تقریب کے انعقاد کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

صدر ادارۂ ادبیات اُردو، ماہر تعلیم پروفیسر سید علی اکبر نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ" زورؔ مرحوم کے بعد ادارہ خاموشی اور خلوص کے ساتھ اُن علمی، ادبی اور ثقافتی فرائض کو بہ حسن و خوبی انجام دے رہا ہے، جو مرحوم کو عزیز تھے اور جن کے لیے ڈاکٹر زورؔ نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی"۔ پروفیسر سید علی اکبر نے محترم صدر کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ" نواب صاحب کو ہر نیک کام سے عملی دلچسپی رہی ہے۔ ادارہ کے قیام کی تاریخ سے آپ اس کی سرپرستی فرماتے رہے ہیں اور یقین ہے کہ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ نواب مہدی نواز جنگ بہادر کی ہمہ گیر شخصیت ادارہ کے مقاصد کی تکمیل کے لیے بہترین ضمانت اور فالِ نیک ہے اور آج کے جلسہ کی کرسیٔ صدارت پر نواب صاحب کی رونق افروزی ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی روح کے لیے باعثِ تسکین اور فرحت ہوگی"۔ پروفیسر سید علی اکبر نے ڈاکٹر زورؔ کی بے وقت موت کے بارے میں گہرے رنج و الم کا اظہار کرتے ہوئے آپکی خدمات کو سراہا اور بتایا کہ ادارہ کا قیام ڈاکٹر زورؔ کا اہم کارنامہ ہے۔ زورؔ صاحب کی وفات کے بعد ادارہ کی سرگرمیاں کے جاری رہنے کے بارے میں ڈاکٹر محمد راج سکینہ اور اُن کے رفقائے کار کی صلاحیتوں کا تفصیلی طور پر ذکر کرتے ہوئے صدر ادارہ نے اردو دوستوں سے مزید تعاون کی خواہش کی۔

جواں سال قانون داں رمن راج سکینہ اعزازی معتمد یوم محمد قلی قطب شاہ کمیٹی نے یوم زورؔ کے سلسلے میں آئے ہوئے

پیامات

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن اور وزیر اعظم ہند محترمہ اندرا گاندھی نے یوم زورؔ کی کامیابی کے لئے دلی تمنائیں بھیجیں ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند نے اپنے پیام میں فرمایا کہ "مرحوم زورؔ صاحب کی قابل قدر علمی خدمات اور خود اُن کا قائم کیا ہوا یہ ادارۂ ادبیات اُردو ہمیشہ اُن کی یاد دلاتے رہیں گے۔ میں یوم زورؔ کے انعقاد پر ادارہ کو تہہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں"

مرکزی وزیر برقابی جناب فخرالدین علی احمد نے اپنے پیام میں ڈاکٹر زورؔ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ڈاکٹر زورؔ نے دکنی زبان اور اُردو کی تاریخ، اُردو لسانیات، صوتیات، تنقید و تبصرہ اور خالص ادب کی خدمت کو اپنا مقصد حیات بنایا اور اس کی تکمیل کے لئے اپنی تمام زندگی اور وسائل وقف کردیئے۔ ادارہ کا قیام ڈاکٹر زورؔ کا لافانی کارنامہ ہے جس کی بدولت ہزارہا اردو مخطوطات محفوظ ہوگئے اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کو ان سے استفادہ کرنے کی سہولتیں بھی مہیا ہوگئیں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کی زندگی اور کارناموں سے اردو ادیب، شعراء، نقاد، معلم اور طالب علم سبھی ہمیشہ سبق لیں گے اور اپنی اپنی بساط کے مطابق اس عظیم اور حسین زبان کی خدمت کے فرائض انجام دیتے رہیں گے"۔

ریاستِ جموں و کشمیر کے وزیر اعظم جناب غلام محمد صادق نے یوم زورؔ کی کامیابی کی توقعات کا اظہار کرتے ہوئے، اپنے پیام میں بتایا کہ "میری تمنا ہے کہ ادارہ کو اُردو ادب کے عام فہم بنانے اور تحقیقاتی کام کو ترقی دینے میں کامیابی نصیب ہو"۔

سابق مرکزی وزیر جناب ہمایوں کبیر نے اپنے پیام میں کہا کہ "ڈاکٹر زورؔ مرحوم اپنے علمی و ادبی کارناموں کی وجہ سے ہندوستان میں اُردو زبان کے ممتاز ادیب تصور کئے جاتے تھے۔ مجھے توقع ہے آئندہ نسلوں کے ادیب اُن کی تصانیف سے استفادہ کرکے ہندوستان کے ثقافتی ورثہ میں اضافہ کریں گے"۔

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ کا پیام تھا "میں ڈاکٹر زورؔ اور اُن کی اردو ادب کی خدمات سے بخوبی واقف ہوں۔ ادارۂ ادبیات اُردو مرحوم کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ مرحوم نے جامعۂ عثمانیہ میں میری وائس چانسلری کے زمانے میں اور اس سے قبل اور پھر بعد کے دور میں بڑی ذمہ دارانہ خدمات انجام دی تھیں اور اپنے جوشِ عمل اور احساسِ فرض شناسی کی وجہ سے ممتاز مقام حاصل کرلیا تھا"۔

ممتاز ماہر لسانیات ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی صدر نشین لجسلیٹو کونسل ویسٹ بنگال نے اپنے پیام میں بتلایا کہ "ڈاکٹر زورؔ کی موت سے نہ صرف اردو زبان کے تحقیقی کاموں کو نقصان پہنچا ہے بلکہ ہندوستانی ثقافت کا بھی نقصان ہوا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ یوم زورؔ کی تقاریب کامیاب ہوں گی"۔

مشہور مورخ ڈاکٹر تاراچند ایم۔ پی۔ نے یوم زورؔ کے لئے اپنے پیام کے ذریعہ ان توقعات کا اظہار کیا ہے: "ڈاکٹر زورؔ مرحوم نے اردو زبان و ادب کی ترقی میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں جو ناقابل فراموش ہیں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ہر سال اسی طرح یوم زورؔ کی تقاریب منعقد کی جائیں"۔

پیام بھوشن میر اکبر علی خاں بیرسٹر، جناب فضل الرحمن پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نثار احمد فاروقی صاحب شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی نے بھی اپنے گراں قدر پیامات سے نوازا جس میں ادارہ اور ڈاکٹر زورؔ کی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا گیا ہے۔

ممتاز نقاد پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی نے اپنے پیام میں کہا ہے کہ "ڈاکٹر زورؔ مرحوم ایک عملی انسان تھے، وہ ایسی شمعیں جلانا جانتے تھے جن کی روشنی ان کے بعد بھی باقی رہے۔ وہ ایسی بنیادیں رکھنا جانتے تھے، جن پر مستحکم عمارتیں کھڑی کی جاسکیں۔ یہ شمعیں اور یہ بنیادیں اُن کی تصانیف اور وہ ادارے ہیں جنھیں ان کے ذوقِ تخلیق نے جنم دیا۔ یہی اُن کی یادگاریں ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو جسے مرحوم نے اپنے خون سے سینچا تھا نہ تو اُن کی یاد سے غافل ہے اور نہ اُن کے کام سے"۔

مرکزی انجمن ترقی اُردو ہند کے معتمد عمومی پروفیسر آل احمد سرور صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنے پیام میں بتایا کہ "ڈاکٹر زورؔ نے زبانِ اردو کی بڑی خدمت کی اُن کی تحقیقات سے دکنی ادب کے کئی تاریک گوشوں پر روشنی پڑی اُن کی لگن اور جذبے سے اُردو زبان وادب کو بڑا فروغ ہوا اور وہ اُن کی خدمات کا بڑا اچھا اشاریہ ہے۔ ڈاکٹر زورؔ کی یاد کو تازہ کرنا اور ان کے کارناموں سے نئی نسل کو روشناس کرانا یقیناً بڑا اچھا کام ہے۔ امید ہے کہ اس چراغ سے اور چراغ برابر جلتے رہیں گے"۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ریڈر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے اپنے احساسات و تاثرات کو پیام کی صورت میں ظاہر کرتے ہوئے لکھا کہ "ڈاکٹر زورؔ اردو کے سچے عاشق تھے۔ وہ ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے، وہ ایک اہم ادیب، ایک سچے عالم اور ایک بے ریا، پر خلوص انسان تھے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ ہم سے عین اس وقت بچھڑ گئے جب اُردو کو اُن سے بہت سے کام لینے تھے۔ اُن کی یاد منانا گویا انسانیت، شرافت، علمیت اور اُردو دوستی کی قدروں پر اپنا ایمان تازہ کرنا ہے"۔

"از دل خیزد   بر دل ریزد" کے مصداق مخلصانہ بیانات کو حاضرین نے سماعت فرمایا، اور ڈاکٹر زورؔ کی آڈی ٹوریم میں آویزاں خوب صورت شبیہ چشم نگراں کی طرح اپنے چاہنے والوں، یاد کرنے والوں اور اردو زبان وادب کو فروغ دینے والوں کو دیکھتی رہی ایسے میں جواں سال شاعر صلاح الدین نیرؔ نے دل دوز ترنم میں اپنی متاثر کن نظم "آخری آنسو" پڑھنی شروع کی۔ جب نیرؔ نے یہ شعر پڑھا ؎

کیا جہاں بھی نیند آجائے وہیں سوتے ہیں لوگ   زورؔ تیرے آخری دیدار کو روتے ہیں لوگ

تو اہل محفل پر رقت طاری ہوگئی۔

جناب عبدالحمید خاں ناظم محکمہ آثار قدیمہ نے ڈاکٹر زورؔ کی علمی و ادبی اور ثقافتی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ "ڈاکٹر زورؔ نے مرتے دم تک ہندوستان میں رہ کر اُردو زبان وادب کی خدمت کی انہی خدمات کے سبب انھیں "اردو پتا" کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ نہ صرف دکنی ثقافت کو انھوں نے زندہ کیا بلکہ ہم دکھنیوں میں خود اعتمادی کی فضا بھی ڈاکٹر زورؔ نے پیدا کی۔ متاثر

مخدوم [illegible] اور ادیب میر حسن اُن ہی کے بنائے ہوئے ہیں۔ زورؔ صاحب نے قیام آندھرا کے بعد یوم محمد قلی کا انعقاد کرکے قومی یک جہتی کے مقصد کو آگے بڑھایا اور آج یہ تقریب آندھراؤں کی قومی عید کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ یہ سب زورؔ صاحب کے کرشمے ہیں۔ ناظم آثار قدیمہ نے اپنے محکمہ کی تنظیم جدید اور گنبدانِ قطب شاہی کے محکمہ کی تحویل میں آنے کے بعد کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ حکومت آندھرا پردیش اور محکمۂ آثارِ قدیمہ دکھنی آثار اور کلچر کی حفاظت اور ترقی کے لئے زورؔ صاحب کے بتائے ہوئے خطوط پر کام کرے گا اور "بسنت کے میلہ" کا آغاز بھی کیا جائے گا جو قطب شاہی زمانے میں منعقد ہوا کرتا تھا۔

الحاج مرزا شکور بیگ صاحب نے "نذرِ زورؔ" کے عنوان سے نظم سنائی۔ مرزا کے ان اشعار پر حاضرین نے خوب داد دی:

نام روشن کردیا اُردو نے بے شک زورؔ کا　　زورؔ نے بھی کی بہت اُردو کی خدمت زورؔ کی

کاروانِ اُردو کا مرزاؔ یوں تو اب بھی ہے رواں　　پھر بھی سب محسوس کرتے ہیں ضرورت زورؔ کی

ڈاکٹر غلام عمر خاں لکچرار مینجنگ ایڈیٹر مجلۂ قدیم اردو جامعہ عثمانیہ نے اپنی فاضلانہ تقریر میں بتلایا کہ ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی زندگی بیسویں صدی میں دکن کی علمی و ادبی تاریخ کا ایک روشن باب ہے وہ اپنے عہد کے ایک ممتاز محقق اور نقاد تو تھے ہی لیکن اُن کا جو کارنامہ انھیں اُردو زبان کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے گا۔ یہ ہے کہ انھوں نے دکن کے ایسے سینکڑوں شاعروں اور مصنفوں کو دوبارہ زندگی بخشی جن کے کارنامے طاقِ نسیاں کی نذر ہوگئے تھے۔ دکھنی ادبیات کی بازیافت کو ایک تحریک اور ایک مہم کی حیثیت سے شروع کرنے کا سہرا ڈاکٹر زورؔ ہی کے سر ہے۔ انھوں نے اُردو ادب کی تاریخ کو ساڑھے تین سو سال پیچھے ڈھکیل دیا۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں نے جامعہ عثمانیہ میں دکھنیات کے جدید کاموں اور تحقیقاتی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر زورؔ کے جانشین پروفیسر مسعود حسین خاں کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اُردو نے حال میں دکنی زبان و ادب سے جس غیر معمولی دلچسپی اور شغف کا اظہار کیا ہے اور دکنی کے تعلق سے مختلف تحقیقاتی منصوبوں اور مجلہ قدیم اُردو کا جو پروگرام بنایا ہے یقین ہے کہ ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی روح دکھنیات کے پودے کو بارآور ہوتا دیکھ کر مسرور ہوگی"۔

بین کلیاتی زورؔ یادگاری تحریری مقابلہ کے کنوینر ڈاکٹر غلام عمر خاں نے مقابلے میں انعام پانے والوں کے ناموں کا اعلان کیا اور صدر جلسہ نواب مہدی نواز جنگ نے سید مجیب الدین طالب علم ایوننگ کالج کو انعام اول محی الدین حبیبی طالب علم وِٹّل واڑی کالج کو انعام دوم اور اسلم فرشوری طالب علم انوار العلوم کالج کو انعام سوم عطا کیا۔ تالیاں بجیں اور کیمرے حرکت میں آئے۔

پدما بھوشن نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے صدارتی تقریر فرمائی اور بتایا کہ "آج کا یہ جلسہ محبت خلوص اور ڈاکٹر زورؔ کی یاد کو تازہ رکھنے والا جلسہ ہے۔ زورؔ صاحب بڑے علمی انسان تھے انھوں نے اردو زبان و ادب کے لئے مثالی خدمات انجام دیں۔ وہ بڑی خوبیوں اور کردار کے آدمی تھے۔ ان کی تمام تمنائیں اُن کی زندگی میں تکمیل کو پہنچیں اس طرح وہ خوش نصیب بھی تھے۔ ایوانِ اُردو اُن کے خیالات کا ترجمان اور دکن کی ثقافت کا آئینہ دار ہے۔ اُن کا ادارہ زبردست ادارہ ہے اور

وہ مجسمۂ انسان تھے۔ ادارہ کے قیام کے لئے زورؔ صاحب نے جن ناساعد حالات میں اپنا کام کیا ہے اور اُسے آج اِس منزل پر پہنچایا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ علمی کام کی ابتدا صحیح معنوں میں ڈاکٹر زورؔ ہی نے دکن میں کی۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ "اس ادارہ کو ترقی دینا، قایم رکھنا اور زورؔ صاحب کی یاد کو منانا، اُن کے کارناموں کو بڑھانا ہم سبھوں کا فرض ہے"۔ مختصر اور جامع تقریر کے بعد میر سراج الدین علی خاں صاحب معتمد یوم زورؔ نے شکریہ ادا کیا اور افتتاحی اجلاس برخواست ہوا۔

اتوار ۲۵ ستمبر صبح ½-۱۰ بجے ایوان اُردو کے اُردو میوزیم میں "آثار و تصانیفِ زورؔ کی نمائش" کا افتتاح جناب ایل۔ این گپتا سابق معتمد منصوبہ بندی حکومت آندھرا پردیش نے کیا۔ نمائش کے کنوینر جناب عبدالوحید خاں ناظم آثار قدیمہ نے نمائش کی تفصیلات سے واقف کرایا۔ اس نمائش میں ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی تمام تصانیف، تالیفات، رسائل اور اُن پر لکھے گئے مضامین نظم و نثر، رسائل کے خاص نمبر اور کتابیں، کئی نادر و اہم تصویریں، مضامین، مسودات اور استعمال کی یادگار اشیاء رکھی گئی تھیں۔ جناب ایل۔ این۔ گپتا نے اپنی تقریر میں ڈاکٹر زورؔ کی ادبی خدمات اور اُن کی شخصیت کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے بتایا کہ دکھنی ادب کی ترویج و اشاعت میں زورؔ صاحب کی رہنمائی میں ادارہ نے بیش بہا کارنامے انجام دیئے ہیں اور اس کام کو اور وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ ادارہ کی طرف سے اُردو انسائیکلوپیڈیا کا کام شروع ہوا تھا جو حالات کے ناساعدت کے سبب تکمیل نہ پا سکا۔ میں اس ادبی اجلاس کے صدر جناب محامد علی عباسی سے خواہش کروں گا کہ وہ اس سلسلے میں ادارہ کی مدد فرمائیں کیونکہ انسائیکلوپیڈیا کے کام کی تکمیل ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی عین خواہش تھی۔ اگر ہم اس کام کو دوبارہ آغاز کر کے اُسے تکمیل کو پہنچائیں تو صحیح معنوں میں زورؔ صاحب کی یاد منائی جا سکے گی"۔ جناب گپتا صاحب نے اپنی تقریر میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ "ادارہ کے وافر علمی و ادبی تہذیبی ذخیرہ کے پیش نظر ایوانِ اردو میں توسیع کی ضرورت ہے اور اس کی بالائی منزل کی تعمیر کا کام بھی شروع کیا جانا چاہیئے تاکہ یہاں کا سرمایہ سائنٹفک طریقہ پر محفوظ رہ سکے"۔

نمائش کے افتتاح کے بعد گیارہ بجے صبح ریاستی معتمد فینانس جناب محامد علی صاحب عباسی کی صدارت میں یوم زورؔ کے سلسلے کا ادبی اجلاس منعقد ہوا۔ جناب میر حسن معتمد ادبی اجلاس نے صدر جلسہ کا خیر مقدم کیا۔ اس جلسہ کا آغاز ڈاکٹر زورؔ کی ایوان اُردو کے افتتاح کے موقع پر کی گئی خیر مقدمی تقریر کے ریکارڈ سے ہوا۔ زورؔ صاحب کی گرجدار آواز کو حاضرین نے جب سنا تو کتنوں کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ یادوں کے ان شبنمی لمحات میں راقم الحروف نے اپنی نظم "یادِ زورؔ" سُنائی تو محفل پر عجیب رنگ چھا گیا۔ ان اشعار نے سب کو بے چین کر دیا ؎

زورؔ باقی ہے ترا شہرِ نگاراں اب بھی
یاد کرتا ہے تجھے صحنِ بہاراں اب بھی

تو نہیں بزم میں ہر چیز وہی ہے کہ جو تھی
یہ ادارہ یہ در و بام یہ ایوان یہ کلس

مشہور طنز و مزاح نگار ادیب جناب بھارت چند کھنہ لیبر کمشنر حکومت آندھرا پردیش نے ڈاکٹر زور کی شخصیت اور ان کے کارناموں اور اپنی ملاقاتوں کا شرح و بسط کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ "ڈاکٹر زور کی شخصیت کو اگر ایک جملہ میں بیان کرنا ہو تو میرے خیال میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہر اعتبار سے ایک زوردار شخصیت کے حامل تھے۔ بولتے تو منہ سے پھول جھڑتے اور ان کا شعور اور زبان پر عبور فوراً عیاں ہو جاتا۔ اگر ڈاکٹر زور محمد قلی کے عہد میں پیدا ہوتے تو شاید ان کی عالمانہ صحبت میں شعر و سخن کا دلدادہ بادشاہ اپنی بھاگ متی کو بھی بھول جاتا۔ ڈاکٹر زور کو ملک دکن سے پیار تھا، ہر دکنی چیز بشمول اردو سے انھیں والہانہ محبت تھی۔ مثلاً دکنی زبان اور بیان، قطب شاہی یا دکنی چال اور ڈھال، حیدرآباد کی بریانی، گنڈی پیٹھ کا پانی اور ہمرد کی شیروانی، ملغوبہ آم، میٹھے جام اور لسانیات پر کام۔ بہرحال ڈاکٹر زور اپنی زندگی میں بڑے ٹھاٹھ سے رہے۔ اُن کے علم اور علم دوستی کی وجہ سے شہرت اُن کے قدم چومتی رہی۔ جہاں جاتے اُن کا وہاں احترام ہوتا، ایسا احترام جو کسی عہدہ کا رہین منت نہ تھا۔ اب جبکہ وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں اُن کے کارہائے نمایاں کی وقعت اُن کی عظمت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ جناب کھنہ صاحب کی دلچسپ اور اثر انگیز تقریر کے بعد جواں سال مفکر اور ادیب جناب ضیاء الدین احمد شکیب نے عالمانہ مقالہ "تاریخ اردو میں ڈاکٹر زور کی شخصیت کا تعین" کے زیر عنوان سنایا اور بتایا کہ "ڈاکٹر زور اردو کی ادبی تاریخ میں وہ پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے ایک طرف تو صوتی اور لسانی اصولوں کے مطابق اردو زبان کے مطالعہ کی بنا ڈالی اور اُن کی تاریخ لکھی دوسری طرف اپنی لسانی تحقیقات اور رہبری کے زیر اثر اردو ادب کی تاریخ نویسی کے مسائل پر توجہ دی جہاں تک ڈاکٹر زور کے تنقیدی کارناموں کا تعلق ہے اردو میں ٹھیٹ مغربی طرز کے اصولِ تنقید کو متعارف کروانے کی اولیت کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ اردو زبان اور تاریخ ادب کا وہ تصور ہے جو انھوں نے نئی نسلوں کو دیا ہے۔"

جناب شکیب نے ڈاکٹر زور کی تصانیف اور اُن کے عہد سے متعلق مدلل بحث کرتے ہوئے بڑا ہی ٹھوس مضمون سنایا جسے حاضرین نے بے حد پسند کیا۔ ان کے بعد نواب میر یسین علی خاں نے "ایک خواب" کے نام سے متاثر کن اور رواں نظم سنا کر داد حاصل کی۔

مشہور ادیب اور ریسرچ اسکالر ڈاکٹر انور معظم نے "۲۴ ستمبر ایک دن ' ایک سوال" کے زیر عنوان مضمون پڑھا اور ڈاکٹر زور کے مشن کو آگے بڑھانے پر زور دیتے ہوئے بتایا کہ "زور صاحب کے مشن نے زور کو شہور سے اہم شخصیت میں تبدیل کیا۔ ہم چاہیں تو ان کے قائم کئے ہوئے اداروں کے ذریعہ چند اور شخصیتوں کی تعمیر اور تشکیل کر سکتے ہیں۔ ہمارے دل میں اگر ڈاکٹر زور کا سچا احترام اور اُن کے مشن کی اہمیت کا پورا احساس ہے تو پھر ۲۴ ستمبر ایک دن کا نہیں ایک دور کی تاریخ بن سکتا ہے۔ ڈاکٹر زور بہتے دریا سے نہریں نکال لینے کو بڑا کام نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ چٹان کا سینہ چیر کر جوئے شیر

لانے کے قائل تھے چنانچہ دکنی ادب، لسانیات، صوتیات، اسالیب بیان اور تنقید پر ان کی تصانیف اور تالیفات اسی کوہ کنی کا ثمر ہیں۔ یہ بڑی حد درست ہے کہ دکنی روایات کے برخلاف دکن کے باہر زور صاحب اپنے دکنی ہونے پر ناز کیا کرتے تھے۔ وہ دکن پرست ضرور تھے مگر شمال دشمن بھی نہیں تھے وہ اُردو دنیا کے ممتاز خدمت گزار شہری تھے خلوص اور لگن کے ساتھ انھوں نے دکن میں اُردو کے لئے وہی کام کیا جو کل ہند سطح پر عبدالحق نے انجام دیا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے۔

پروفیسر سید محمد سابق ریڈر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ نے "چند یادیں چند باتیں" کے زیرِ عنوان تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر زور کی یورپ سے واپسی کے بعد شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ سے وابستگی اور جامعہ کے ماحول کے بارے میں دلچسپ باتیں بتائیں۔ ادارہ ادبیات اردو کے قیام کے پس منظر پر روشنی ڈالی اور کہا کہ زور صاحب نے جامعہ عثمانیہ کے طلباء میں اتفاق اور کام کرنے کا حوصلہ پیدا کیا اور اُن کی حوصلہ افزائی کی مضمون نویسی پر توجہ دلائی خود کتابیں لکھیں اور مخدوم و میر حسن اور دیگر طلباء سے کتابیں لکھوائیں اور اپنے ادارہ سے طلبائے جامعہ عثمانیہ کی کئی کتابیں شائع کرائیں اور پھر ان کی شبانہ روز کی توجہ اور کام کرنے والوں کے ایک حلقہ کے سبب ادارہ آج ایوان اردو کی شکل میں سارے ملک سے خراج تحسین حاصل کر رہا ہے۔ ڈاکٹر زور نے دکنی ادب اور تمدن کی حفاظت و صیانت میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں جیسا جیسا زمانہ گزرتا جائے گا اُن کی قدر و منزلت میں اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔ ان کی وفات کے بعد جو کام تشنہ رہ گئے ہیں ارباب ادارہ کو چاہیئے کہ ان کی تکمیل کی طرف توجہ دیں۔

پروفیسر سید محمد کی تقریر کے بعد جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبۂ اُردو ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنی جچی تلی اور لکھی ہوئی تقریر میں زور صاحب کے لسانی کارناموں کا شرح و بسط کے ساتھ ذکر کیا اور اُن کی شخصیت کے بارے میں بتایا کہ ڈاکٹر زور کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ ایک ادبی قائد تھے خود لکھا اور دوسروں سے لکھوایا تحریکیں چلائیں اُردو کیلئے سینہ سپر ہوئے اور آخر کار اُردو کیلئے جاں بحق ہو گئے۔ دکنی اُردو کے سلسلے میں ان کی دلچسپی ایسے ماحول میں پیدا ہوئی جبکہ حیدرآباد میں وحید الدین سلیم اور عبدالحق کے سبب ایک تہذیبی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے بتایا کہ "مسلم یونیورسٹی نے سرسید کے بعد کوئی عمدہ کام نہیں کیا۔ شعبہ اردو علی گڈھ یونیورسٹی کی تمام تر توجہ تخلیقی ادب کی طرف مرکوز ہے لیکن اس کے برعکس جامعہ عثمانیہ نے تحقیقی کام کو آگے بڑھایا ہے۔ جن میں سلیم، عبدالحق اور ڈاکٹر زور کی مساعی کو دخل ہے۔" ڈاکٹر زور کی دکن پرستی کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر مسعود حسین خاں نے کہا کہ "پروفیسر زور نے اپنی لسانیاتی تحقیق کا آغاز "اردو شہ پارے" سے کیا اور اس کا ادبی عرفان دکنی ادبیات پر ہوا۔"

صدر جلسہ مولوی محمد علی عباسی نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے ادارہ سے اپنی وابستگی اور ڈاکٹر زور کی خدمات اور ان کے مشن پر روشنی ڈالی اور کہا کہ "ڈاکٹر زور نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے آخر وقت تک اُردو کی خدمت کیلئے خود کو وقف کر دیا تھا اور اسی جذبۂ خدمت کے تحت کشمیر کا سفر کیا تھا۔ اُن کی حیات کے زمانے میں اُردو زبان و ادب کا بہت سا کام اسی ادارہ کے زیر اہتمام ہوا کرتا تھا۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کام کو پھر سے پوری اسپرٹ اور مخلصانہ جذبے

کے ساتھ شروع کیا جائے۔ ادارہ کے علمی و ادبی اور تحقیقاتی کاموں کا تذکرہ کرتے ہوئے جناب عباسی نے ارباب
علم و دانش سے تعاون عمل کی اپیل کی اور ان کاموں میں ہاتھ بٹانے کی خواہش کی۔ جناب میر حسن معتمد ادبی اجلاس کے
شکریہ پر یوم زورؔ کا جلسہ مقالات ایک بجے دوپہر اختتام کو پہنچا۔

رات کے ساڑھے ۹ بجے ایوان اردو کے بیچ سجائے مشرقی طرز کے آڈی ٹوریم میں ممتاز ترقی پسند شاعر جناب مخدوم محی الدین
(ایم۔ ایل۔ سی) کی صدارت میں غیر طرحی مشاعرہ شروع ہوا۔ باذوق سامعین نے کوئی ڈھائی گھنٹے مشاعرہ کی کارروائی کو سنا
معتمد مشاعرہ محترمہ عائشہ رشادؔ نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر زورؔ کو خراج عقیدت ادا کیا اور کہا کہ "ڈاکٹر زورؔ ایک
عملی انسان تھے، تاریخ ادب اردو میں اُن کا نام سرسید اور مولوی عبدالحق جیسے محسنین اردو کے ساتھ لیا جائے گا۔ ایک اعلیٰ
مقصد سے والہانہ وابستگی، نصب العین کو پانے کے لئے سچی لگن، بے پایاں خلوص اور بے مثال جوش اور استقلال، خود کام
کرنے اور دوسروں سے کام لینے کا عجیب و غریب سلیقہ ڈاکٹر زورؔ کی دلکش اور متاثر کن شخصیت کے ایسے نمایاں اوصاف
ہیں جن کی بدولت انھوں نے خدمت اردو کے راستے کی ہر رکاوٹ پر ہمیشہ قابو پایا اور ان تھک محنت اور لگاتار جدوجہد
سے اپنے بلند ارادوں کی صورت گری کی"۔ مشاعرہ کا آغاز ڈاکٹر زورؔ کے کلام سے ہوا۔ جب ریکارڈ بجایا گیا تو سامعین پر
زورؔ مرحوم کی شخصیت اور کارناموں کے سبب ایک عجیب تاثر طاری ہو گیا۔ اسی فضا میں صدر مشاعرہ مخدوم محی الدین نے
اپنی غزل سے مشاعرہ کی کارروائی شروع کی اور پھر حیدرآباد کے قدیم و جدید مکتب خیال کے شعرا نے نظمیں، غزلیں اور
رباعیات سنائیں، جن میں صابر کمال، علی الدین رید، عباس عابدی، ستار چشتی، مسعود عابد، غیاث متین، فیض الحسن
خیال، رؤف خلش، حسن فرخ، رئیس اختر، اسد انصاری، صلاح الدین نیر، عظمت عبدالقیوم، محمد منظور احمد، وقار خلیل،
روحی قادری، ڈاکٹر غیاث صدیقی، ضیاء الدین احمد شکیب، خیرات ندیم، ابن احمد تاب، اختر حسن، میر یسین علی خاں،
تاج قریشی اور صدر مشاعرہ مخدوم محی الدین شامل ہیں۔ محترمہ عائشہ رشادؔ نے شکریہ ادا کیا۔

۲۲ ستمبر کی شب ساڑھے ۹ بجے ایوان اردو میں محفل سماع زیر صدارت جناب سید شاہ تقی الدین قادری منعقد ہوئی۔
مشہور موسیقار عزیز احمد خاں وارثی اور ان کے ساتھیوں نے سازوں پر نعتیہ کلام پیش کیا۔ مشاعرہ اور قوالی کی
ریڈیائی رپورٹ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے نشر ہوئی اور یوم زورؔ کی یادگار تقاریب نہایت کامیابی کے ساتھ
اختتام کو پہنچیں۔

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء جلد ۲۹ شمارہ ۱۱

نومبر سنہ ۱۹۶۶ء

ماہنامہ
سب رس

نگران
پروفیسر سید علی اکبر

(مجلس مشاورت)
میر حسن ۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ۔ مین راج سکسینہ ۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں

معتمد
محمد اکبر الدین صدیقی

مہتمم
محمد جمال الدین

منتظم
وقار خلیل

زر سالانہ چھ روپے — غیر ممالک سے دس روپے
ششماہی تین روپے — فی پرچہ پچاس پیسے

مہتمم ادارہ ادبیات اردو کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات

نومبر کا شمارہ حسب وعدہ پابندیٔ وقت کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ اس میں بعض ایسے مضامین بھی شریک ہیں جو یقیناً قدر کی نگاہوں سے دیکھے جائیں گے۔ محمد قطب شاہ "ظل اللہ" تھا اور اس ظلِ الٰہی کی وجہی نے جو ہنسی اڑائی ہے وہ اس کے عہد کا رنگ ظاہر کرتی ہے۔ دو تین شعر پیش ہیں ؎

شاہ را سایۂ خدا خوانند	لیکن از شاہ آفتاب جداست

سایۂ از ملکِ ہیچ خبر نیست وجہیہ	کاشکے سایۂ نمی داشت خدایم چو رسول

من بندۂ آں بندہ فنی ام کہ مراد	نے از تو طلب کرد و نہ از سایۂ تو

محمد قلی قطب شاہ کے دور رندی و خراباتی کے بعد سے اچانک وجہی کو زہد و ورع کا خشک ماحول ملا۔ امتناع مسکرات کا جو فرمان جاری ہوا وہ وجہی کے لئے سوہان روح تھا اسی لئے اس نے محمد قطب شاہ ظل اللہ کو ہجو کا نشانہ بنایا۔ فارسی شعرا اس دور میں بھی رہے لیکن کم کم اور دم بخود۔ عبداللہ قطب شاہ کا دور آتے ہی کھل کھیلے شعرا اور مصنفین کی ایک بڑی تعداد، ہمیں اس دور میں نظر آتی ہے۔ شریف کاشی، محمد قطب شاہ کا درباری شاعر ہے جس کے دیوان کا تعارف جناب ڈاکٹر امیر حسن عابدی شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی نے کرایا ہے۔ ابھی کئی شعراء خواہ وہ فارسی کے ہوں یا اردو کے قعر گمنامی میں پڑے ہیں۔ ممکن ہے کہ محققین انھیں منظر عام پر لے آئیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کے ہم ممنون ہیں کہ قطب شاہی عہد کے ایک شاعر کا تعارف سب رس کے صفحات پر کرایا ہے اور متوقع ہیں کہ آئندہ بھی آپ اس سلسلہ کی کڑیاں سب رس کو عنایت فرمائیں گے۔

دوسرا مضمون حضرت جذب عالمپوری پر ہے۔ جذب صاحب خدا رکھے بڑے ہی خلیق، متواضع، منکسر المزاج اور ہنس مکھ انسان ہیں اور اپنی رباعیوں کی وجہ سے خیام دکن کہلاتے ہیں۔ ادارہ ہی کی کوئی محفل نہیں بلکہ حیدرآباد میں اردو کی کوئی محفل ان سے خالی نظر نہ آسکے گی۔ ایسی شخصیت کو میر یٰسین علی خاں صاحب نے پیش کیا ہے۔

تیسرا مضمون جلالی صاحب کا ہے اور چوتھا ڈاکٹر محمد اسلام صاحب کا اور یہ دونوں گذشتہ مضامین کے سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

آخری مضمون ماہیت کا حال ہے۔ ہندوستان نے اپنے روپیہ کی قدر گھٹا دی۔ ایک عامی آدمی نے تو اس کو برا سمجھا لیکن بعض پڑھے لکھے لوگوں نے بھی اس کو قابل تعریف نہ سمجھا۔ پروفیسر بیتاب صاحب نے اس سلسلے میں نہایت تفصیلی مضمون لکھ کر [illegible] کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ — امید ہے کہ ہمارے قارئین اس مضمون کا دلچسپی سے مطالعہ کریں گے۔

ڈاکٹر امیر حسن عابدی
دہلی یونیورسٹی

دیوان شریف کاشی

محمد شریف کاشی کاشان میں یا دقان میں پیدا ہوئے۔ حسب ذیل اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ انکا پورا نام سراج الدین شریف الحق تھا: —

بدیر اندر سراج الدین شریفم　　بکعبہ بر میان زنار بستم
ای شریف الحق سخن آہستہ ران　　گوش دارم بر لب گویائی تو

فہرست اسپرانگر میں تقی الدین کاشانی کے تذکرہ خلاصۃ الافکار و زبدۃ الافکار (نمبر۸) کا ذکر اور خلاصہ ملتا ہے۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ شریف ابتدا میں درزی کا کام کرتے تھے نیز اسکا فہرست میں آسمان سخن (نمبر۱۵) کا خلاصہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ شریف پہلے ایک قلندرانہ زندگی بسر کرتے تھے مگر اسکے بعد بحیثیت تاجر کے زندگی بسر کرنے لگے۔ بہرحال وہ اپنے وطن سے سیستان اور ہرات آئے اور وہاں کچھ دنوں قیام کرنے کے بعد ۹۹۴ ہجری م ۱۵۸۶ عیسوی میں ہندوستان آگئے۔

یہاں سب سے پہلے وہ غالباً سندھ میں خانخاناں[1] کے ملازم ہوئے اس کے بعد گولکنڈہ میں محمد قلی قطب شاہ[2] کے دربار سے متوسل ہوگئے۔ حیدرآباد کی تعریف میں کہتے ہیں: —

تبارک اللہ شہر ہمایوں شہر زرین زمین　　حیدرآباد کہ طاعت بردش خلد بریں

شریف ہندوستان میں بھی کاشان کو یاد کرتے اور اسپر فخر کرتے رہے۔ —

باآنکہ نغمہ سنج شدم در دیار ہند　　ساز نوا بگلشن کاشانم آرزوست
گر ہندوستان شریف از کاہلی دار دشت　　بر سر بادہ سر بازار کاشان خوشتر است
شریف از بہر تحقیق معانی　　مرا از خاک کاشان آفریدند
دارد شریف صد الم از محنت سفر　　آن بار کشد کہ بکاشان نمی رود

مگر غالباً انہیں وطن جانا نصیب نہ ہوا۔

---

[1] ۹۶۴ — ۱۰۳۶ ہجری م ۱۵۵۶ — ۱۶۲۶ عیسوی　[2] ۹۸۸ — ۱۰۲۰ ہجری م ۱۵۸۰ — ۱۶۱۱ عیسوی

حسب ذیل اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ شریف بیس سال سے پچاس سال کی عمر تک سیر و سیاحت کرتے رہے۔

سی کہ داد پس از بستم شریف زمہر — عجب نمود کہ سی سال پس خمار کشد

سی سال راہ فقر سپردم بپای ترک — بودم بپای فقر در آفاق رہ سپہر

بہر حال ۱۰۳۶ ہجری م ۱۶۲۷ عیسوی تک وہ حتماً زندہ تھے۔ اس لئے کہ دیوان شریف کا وہ نسخہ جو انڈیا آفس میں ہے اسے خود شریف نے ۱۰۲۶ ہجری میں[1] محمد قطب شاہ کو پیش کیا تھا۔

"سراج المنیر" کے مصنف ابن شمس الدین محمد شریف ہیں اور مؤلف فہرست انڈیا آفس کو یقین نہیں ہے کہ یہ وہی ہیں جو اس دیوان کے مصنف ہیں۔ بہر حال اگر وہی شریف اسکے بھی مصنف ہیں تو پھر وہ ۱۰۳۰ ہجری م ۲۱-۱۶۲۰ عیسوی تک زندہ رہے اس لئے کہ یہ سال تصنیف "سراج المنیر" ہے۔

شریف کی زندگی کے متعلق تذکروں سے کچھ زیادہ معلوم نہ ہوسکا۔ بہر حال حسب ذیل شعر انکے طرز زندگی کی عکاسی کرتا ہے:- عمر صرف کافری کرد است گمراہی شریف — گر مسلمان ہم صفۂ شائستۂ زنار نیست

نیز اتنا ضرور ہوا کہ ان کو لوگوں کی بے مروتی کی شکایت کرنی پڑی۔

چند از قحط مروت صبر خاکستر شود — عیش گرد تنگ میدان نعمہ ہموار شود

شریف کو اپنی شاعری پر بڑا فخر تھا۔

ہر دو قرم را بایرانیان — کہ ایران بذکر تہمتن خوش است

عجبی نیست کہ بی روشنی گفت شریف — خاک کاشان بدل کحل صفاہان نشود

نیز وہ خسرو[2] اور طوفی[3] نامی شاعر کے مداح نظر آتے ہیں:-

حرز جان کردم شنیدم بہ نزد اسم اعظمی — مطلع خسرو کہ سعدی را درو گفتار نیست

نیست چون قبر بیجائی در ہمہ عالم شریف — ہمچو طوفی بلبلی در گلشن تبریز نیست

دیوان شریف کا ایک بہت خوبصورت قلمی نسخہ انڈیا آفس میں موجود ہے (نمبر ۱۵۱۵) جس کے کاتب خلیفہ ہیں نیز اسکے پہلے ورق پر یہ عبارت ہے:-

دیوان محمد شریف کہ خود بہ رسم تحفہ در دولتخواہ مبارک گذرانده بتاریخ ۲۶ صفر ۱۰۲۶ھ

مگر اس کو بجائے ۲۶ کے ۲۸ اور ۲۹ بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ بہر حال اسپر محمد قطب شاہ کی مہر ہے۔ نیز یہ نسخہ انکے خزانہ میں داخل تھا۔

---

[1] ۱۰۳۵ — ۱۰۸۳ ہجری م ۱۶۱۱ — ۱۶۲۶ عیسوی

[2] امیر خسرو ۶۵۱-۷۲۵ ہجری م ۵۴-۱۲۵۳ — ۲۵-۱۳۲۴ عیسوی [3] محمد طوفی تبریزی۔

اس نسخہ پر یہ عبارت بھی ہے:-

"از مملکات سرکار فیض آثار نواب ممتاز الدولہ مفتخر الملک حسام جنگ میر رچارڈ جانسن بہادر دام اقبالہٗ"

مؤلف شمع انجمن نے شریف کاشی کو قادر الکلام شاعر بتایا ہے نیز ان کے یہ دو شعر نقل کئے ہیں:-

خزاں مباش کہ برگ و بر چمن ریزی ۔۔۔ بہار باش کہ شاخ گلی بہار آری

بعقل کعبہ نوردم بعشق دیر نشین ۔۔۔ چراغ ہر دو زیک قطرہ خون من سوزد

ان میں سے پہلا شعر تو نسخۂ انڈیا آفس میں موجود نہیں ہے مگر دوسرا شعر ملتا ہے۔ بہرحال اتنا یقینی ہے کہ اس تذکرہ نویس نے شریف سے وہی شخص مراد لیا ہے جو اس انڈیا آفس والے دیوان کے مصنف ہیں۔

اس دیوان میں سب سے پہلے غزلیں ہیں جن کے اشعار کی تعداد تقریباً ۲۱۶۴ ہے۔ دیوان اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

بسم اللہ ای شریف رحم بخش نامہ را ۔۔۔ از حمد کردگار علم ساز خامہ را

اب ان غزلوں سے کچھ اچھے منتخب اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں:-

مگذر از آن سفال کہ دارد شراب را ۔۔۔ خالی چہ میکنی قدح آفتاب را

دامن ساقی مدہ از کف کہ ی خوردن خوش ۔۔۔ اندیا عمر از اہدہ صدق برہمن بہر است

خضر جاوید جو بپای تو باشد ۔۔۔ بقا خاک کف پای تو باشد

تا حسن تو گرم امتحان شد ۔۔۔ رخسارۂ عشق ارغوان شد

رنگ رخ صد زاہد دیندار شکستیم ۔۔۔ تا ان توبہ پنہان کہ بپیمانہ شکستیم

خوش آنکہ بمن دست و گریبان شدہ باشی ۔۔۔ بیچارگیم دیدہ و حیران شدہ باشی

امید و فا نیست مدہ بات قریبم ۔۔۔ آن نیست کہ از کردہ پشیمان شدہ باشی

غزلوں کے بعد ۱۲۶ رباعیاں ہیں جن میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بہرحال ایک عمدہ رباعی بطور نمونہ نقل کی جاتی ہے۔

با من ستم غمارہ دیدی کہ چہ کرد ۔۔۔ ہجر بُت خوشگوار دیدی کہ چہ کرد

او توبہ بزور داد و من ہم کردم ۔۔۔ آن شوخ کہ توبکار دیدی کہ چہ کرد

اس کے بعد قصیدوں کی باری آتی ہے جو ناقص ہیں۔ موجودہ صورت میں اس نسخہ میں ۱۶ قصیدے ہیں جن میں تقریباً ۲۷۱۲ شعر ہیں۔ یہ قصیدے محمدؐ، بارہ اماموں، قطب شاہ، شاہ رستم غازی، خانخانان، حکیم ہمام اور میر محمد رفیق کی مدح میں کہے گئے ہیں۔ قصیدوں میں بھی کوئی مابہ الامتیاز چیز معلوم نہیں ہوتی۔ بہرحال بعض قصیدوں سے کچھ اچھے اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

منم موسیٰ وحدت کاردانی ۔۔۔ منزہ ز ارنی و از لن ترانی

لطافت بہر لبریزہٗ نظم آید ۔۔۔ چو منطق کشایم بگوہر فشانی

ز الفاظ من مفتخر روح معنی ۔۔۔ ز معنیم خرم بہار جوانی

دگر مژگان من اختر شناس است ۔۔۔ نہ بیداور ز بیدارم پرنیان است

دلم در تدبیر بلند تانہ سرو یست — کہ رونق بخش باغ دوستاں است

قصیدوں کے بعد ۸ قطعے ہیں جن میں ۷۰ شعر ہیں۔ ان قطعوں کا ذکر انڈیا آفس کی فہرست میں نہیں ہے۔ ایک قطعہ میں کسی کے ہدیہ کئے ہوئے گھوڑے کا ذکر ہے نیز ایک میں کسی کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ وہ بیڑ کے قابل بھی نہیں ہے۔

اس کے بعد ایک چھوٹی سی مثنوی ہے (۱۱۵ بیت) جو شاہ عباسؔ کی مدح میں ہے اور جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔

حریف از رہ آشنائی درآئی — چو مہا زرہ آشنائی درآئی

بیا ای خرابا تی جرم سوز — بہ گنج من شبنم گر زرد روئی روز

بدہ ساقی آں می کہ چوں سر زند — بکفزو بدین آتش اندر زند

مئی دہ کہ بر نام عباس شاہ — سخن را رسانم بخورشید و ماہ

اس کے بعد ایک ترجیع بند ہے (۱۱۶ شعر) جس میں یہ شعر دہرایا جاتا ہے:۔

بنشینیم و حق گذار باشم — در مہر کیا ہزار باشم

اس کے بعد پھر آٹھ قطعے (۲۷ شعر) اور ان کے بعد چار ترجیع بند ہیں (۲۲۵ شعر) جن کے یہ شعر دہرائے جاتے ہیں۔

زاہد ایم و رند مایم — ہر لحظہ بصورتی نمایم

تا خلق بدانند کہ ما ست الستیم — می خوردہ و بد نام خراباتی ہستیم

ما ہمچو شراب کہن از جوش نشستیم — بیش از ہمہ ستیم و ندانند کہ مستیم

بیکر شتافم نی گنجم بہ پوست — بیقرارم بیقرارم دوست دوست

ان میں سے چوتھا ترجیع بند قطب شاہ کی مدح میں ہے۔

ان کے بعد تین ترکیب بند ہیں (۱۲۲ شعر) جو اس طرح شروع ہوتے ہیں:۔

ای پستۂ شور تو شکر ریز — بادام تر تو فتنہ انگیز!

ای فتنۂ آفاق کہ غارت گر دینی — من با تو بہر د تو بمن بر سر کینی

روز عزای شاہ شہیداں تمام است — یا صبح محشر است کہ نامش محرم است

ان میں سے پہلے میں کاشان جانے کے لئے بڑی بے صبری کا اظہار کیا گیا ہے:۔

افغان کہ ز اشتیاق کاشان — بسیار شریف بی درنگ است

تیسرے ترکیب بند میں امام حسین کا مرثیہ ہے۔ ان ترکیب بندوں کا ذکر بھی انڈیا آفس کی فہرست میں نہیں ہے۔

ؔ شاہ عباس اول ۹۸۵—۱۰۳۸ ہجری م ۱۵۸۷—۱۶۲۹ عیسوی

اس کے بعد پھر ایک چھوٹی سی مثنوی ہے جو اس بیت سے شروع ہوتی ہے :—

گر نہ دل بیرون کنم اندوہ را کار دہا جگری از کوہ را

اسپرانگر کی فہرست میں دیوان شریف کے نسخہ کا ذکر ملتا ہے (نمبر ۵۱۲) نیز اس میں ایک مثنوی خسرو و شیریں ہے جو اس نسخہ میں نہیں ہے۔ یہ مثنوی اس بیت سے شروع ہوتی ہے :—

خداوند از طبع عقدہ کشا زنظم لفظ و معنی ربیا رای

انڈیا آفس کی فہرست میں ایک مثنوی خورشید و ماہ ہے (۱۵۱۶) جس کے مصنف کا نام بھی شریف ہے۔ مگر معلوم نہیں یہ کونسے شریف ہیں۔ غالباً یہ وہ شریف نہیں ہیں جن کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔

مآخذ

(۱) سید محمد صدیق حسن، شمع انجمن مطبع رئیس المطابع شاہجہانی

(۲) کتب خانہ شاہ اودھ میں عربی، فارسی اور ہندوستانی مخطوطات جلد اول
مرتبہ اسپرانگر مطبوعہ بپاپ ٹسٹ مشن پریس کلکتہ ۱۸۵۴ء

(۳) فہرست مخطوطات کتب خانہ انڈیا آفس مرتبہ ہرمن ایتھے۔ کلیرنڈن پریس آکسفورڈ

میر یٰسین علی خاں

حضرت راگھوندر راؤ جذب عالم پوری

حضرت راگھوندر راؤ جذب عالم پوری ہمارے ان بزرگوں میں ہیں جن کا نام حیدرآباد کے علاوہ جنوبی اور شمالی ہند کے پڑھے لکھے کسی طبقے میں بھی تعارف کا محتاج نہیں ہے نصف صدی سے زیادہ عرصے سے آپ ملک بھر میں ایک صاحب دل اور صاحبِ نظر رباعی گو شاعر کی حیثیت سے روشناس ہیں آپ کی سیرت کے بہت سارے روشن پہلو ایسے ہیں جن سے خواہ مخواہ محبت کرنے کو جی چاہتا ہے صاف گوئی حلم و انکسار۔ خلوص و محبت۔ تقویٰ و بے نیازی آپکی طبیعت کے خاص انداز ہیں۔ جذب صاحب تعصب مذہبی و لسانی اور رقابت ادبی سے دور ہیں مردم آزاری یا مردم بیزاری سے نابلد۔ دیانت کے دلدادہ۔ صوفی منش ایسے بزرگ ہیں جن کو ہر مذہب و ملت کے خرد و بزرگ دل سے دوست رکھتے اور انکی پاکیزہ نفسی کی وجہ سے انکی بڑی قدر کیا کرتے ہیں۔ حضرت جذب حیدرآباد کی ملی جلی قدیم تہذیب کا ایک انمول داغ اور دلکش مجسمہ ہیں جن کے نام کے ساتھ انکی شرافت اور علم مجلس بھی زندہ ہے۔

جذب صاحب ۱۰ اپریل ۱۸۹۶ء کو تعلقہ گنگاوتی ضلع رائچور (علاقہ کرناٹک) میں ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے دو سال کی عمر میں عالم پور کی ایک شریف خاندان دولت مند بیوہ خاتون سیتا بائی صاحبہ نے ان کو اپنا متبنیٰ بنا لیا۔ تلگو ماں ہی سے سیکھی۔ پنڈت راجہ رام راؤ سے فارسی اور اردو پڑھی۔ تختی اردو وصلی لکھی اور بڑی محنت سے شکستہ اور نستعلیق خط میں مہارت حاصل کی سید مخدوم حسینی صرف خواجہ میاں سے عربی صرف و نحو اور دیگر پنڈتوں سے سنسکرت زبان اور ہندی سیکھی اور حیدرآباد میں بغرض تعلیم قیام پذیر رہ کر ادیب فاضل اور منشی فاضل کی تعلیم حاصل کی۔ مابعد اس زمانے کے سرکاری جوڈیشل امتحان میں کامیابی حاصل کر کے پندرہ بیس برس تک عالم پور میں وکالت کا پیشہ بہ حسن و خوبی انجام دیتے رہے۔ میرے استفسار پر جذب صاحب نے فرمایا۔ بچپن ہی سے مجھے کھیلوں سے دلچسپی نہیں۔ ہی البتہ گلی ڈنڈا خوب کھیلتا تھا مگر میرا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں صرف ہوا کرتا تھا سینما کبھی کبھی دیکھ لیا کرتا ہوں البتہ تلگو ناٹک اور ڈرامے کا بہت شوق رہا ہے۔ ہمیشہ سادہ زندگی۔ سادہ غذا اور سادہ لباس پسند خاطر رہا ہے۔ شیروانی اور پتلون بھی پہن لیا کرتا ہوں۔ ویسے عام طور پر کرتا اور دھوتی ہی میں مجھے آرام ملتا ہے۔ میں تنہائی سے گھبراتا ہوں۔ بال بچوں کے مجمع میں رہ کر کام کرنا مجھے پسند ہے۔

اوائل عمر میں اساتذہ سخن اور ہم عصروں کا کلام پیش نظر رہا لیکن جوں جوں عمر بڑھتی گئی۔ غالب۔ صائب اور سعدیؒ کے کلام سے شغف بھی بڑھتا گیا۔ یوں تو پندرہ سولہ برس کی عمر ہی سے شعر موزوں کرنے لگے تھے لیکن ۲۰ برس کی عمر میں باقاعدہ

شاعر بن گئے۔ اخلاقی غزلوں سے ابتدا ہوئی بالآخر رباعی کی طرف طبیعت خود بخود راغب ہو گئی۔

ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں رہنا پڑا تو ضیغم صاحب کے مشاعروں میں جو چوک میں ہوا کرتے تھے یا کیفی صاحب کے مشاعروں میں جو مختلف مقامات پر ہوا کرتا اور فیض صاحب کے مشاعروں میں جو عزیز یار جنگ مولوی فیض پر منعقد کیا کرتے تھے ضرور شرکت کرتے۔ مابعد ضیا گورگانی کے مشاعروں میں (جو کاروان میں منعقد ہوتے) اور امجد نواز جنگ فانی کے مشاعروں میں جو دیگلہ یوسفین کے احاطے میں ہوتے پابندی سے شریک ہوا کرتے تھے۔ ابتداء میں شوکت میرٹھی سے تلمذ رہا اور کچھ عرصے تک اسحاق جوہری سے بھی مشورۂ سخن کرتے رہے۔

ایک طرف تو وکالت جاری رکھی اور دوسری طرف عالم پور جیسے چھوٹے تعلقے میں مخلص احباب اور خوش سخن کے قدردانوں کے ساتھ اپنی ذات کو مرکز بنا کر نظم و نثر کی محفلیں برپا کرتے ہوئے اردو ادب کی خدمت میں اس طرح منہمک رہے جیسے کوئی عبادت کرتا ہے۔ سنہ ۱۳۴۷ فصلی میں جذب صاحب نے عالم پور میں بزم نہال سخن کی بنیاد ڈالی جس کے معتمد اور روح رواں وہ خود تھے۔

اس زمانے میں مشاعرے منعقد کرنے کا عام رواج تھا۔ اس بزم کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں نظم و غزل کے علاوہ نثری مضامین بھی پڑھے جاتے۔ ابتداءً ۱۰-۱۵ شاعر شریک ہوا کرتے پھر دور دور سے لوگ آنے لگے تو شعرا کی تعداد ۲۰ — ۴۰ تک پہنچ گئی شاعروں کے علاوہ سامعین کی تعداد بھی بڑھتی گئی کیونکہ کرنول اور دوسرے قریب قریب کے مقاموں سے لوگ بڑے شوق سے آنے لگے تھے۔ اس بزم کے انتظامی اراکین کی تعداد ۱۶ تھی۔ ان میں سے چند کے نام میں خاص طور پر اس بات کے ثبوت میں گنوانا چاہتا ہوں کہ اردو شاعری کے ہمہ گیر اور متعدی مرض میں کیسے کیسے لوگ مبتلا ہو سکتے ہیں۔ ان اراکین میں ڈاکٹر حیوانات سے لیکر پٹواری تک کے نام ملتے ہیں۔ مثلاً محمد ہادی - ہادی (ڈاکٹر حیوانات) نجم الدین نجم (حکیم) محمد حسن آزاد (وکیل) پنڈت نارائن راؤ خاتم (ایڈوکیٹ) پنڈت سرینواس نظامی زمیندار عبدالوکیل صاحب وکیل (ایم اے) رامیشور راؤ صاحب پٹواری۔

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ گھر کے حالات سازگار اور آسودگی بخش تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت جذب کا شباب تھا۔ کہتے ہیں کہ جوانی کی عبادت جلد قبول ہوتی ہے۔ جذب صاحب کی یہ ادبی عبادت بھی بہت جلد مقبول ہوئی بزم نہال سخن کے ماہانہ اور سالانہ مشاعروں میں دور دور سے شاعر اور ادیب کھچے کھچے آنے لگے۔ جذب صاحب کی ادبی استعداد اور شخصی جاذبیت نے اتفاقی ملاقاتوں کو دوستی میں اور دوستی کو ادبی محبت کے ناشکستنی بندھنوں میں باندھ دیا۔ جواباً ہر جگہ کے ارباب ذوق نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ہندوستان بھر میں دور دور منعقد کئے جانے والے ماہانہ، سالانہ اور آل انڈیا مشاعروں میں آپکی شرکت باعث مسرت قرار پائی۔ چنانچہ اس سلسلے میں آپکو بمبئی۔ دہلی۔ آگرہ۔ لاہور۔ مدراس۔ میسور۔ بنگلور۔ کولار۔ بیجواڑہ۔ کڈپہ۔ کرنول۔ مچھلی بندر۔ وساکھاپٹنم تک کی سیر بار بار کرنی پڑی۔ اثنائے سفر میں ملک بھر کے قدیم و جدید طرز کے شاعروں۔ ادیبوں۔ دانشوروں۔ صوفیوں اور روحانی بزرگوں سے آپ کو ملنے اور شخصی تعلقات پیدا کرنے کا موقع ملا۔

جگر مراد آبادی۔ اختر تاثر کیفی۔ احسن مارہروی۔ سیماب اکبرآبادی۔ امرناتھ ساحر۔ شیو برت لال ورمن۔ بشیشور پرشاد منور لکھنوی۔ گوپی شنکر لال اختر۔ خواجہ حسن نظامی۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی۔ دیوان سنگھ مفتون۔ مولوی عبدالحق۔ نیاز فتحپوری۔ عبدالوہاب بخاری۔ پنڈت کندرے راؤ۔ آل احمد سرور۔ سید احتشام حسین۔ نورالحسن ہاشمی۔ خواجہ احمد فاروقی۔ ان میں سے اکثر سے آپ کی خط و کتابت جاری رہی اور جو قدر رکھنے زندہ ہیں ان سے آج بھی ہے۔ ملکی شاہیر میں حضرت امجد۔ ڈاکٹر زور۔ علی اختر۔ پروفیسر سروری۔ نرسنگ راج عالی۔ تمکین کاظمی۔ نصیرالدین ہاشمی سے جذب صاحب کے قریبی تعلقات رہے ہیں۔ ڈاکٹر زور مرحوم سے آپکے روابط خاص تھے مجھے معلوم ہے کہ ادارۂ ادبیات اُردو کا کوئی جلسہ چاہے وہ ادبی ہو یا غیر ادبی ایسا نہ ہوتا جس میں جذب صاحب کی شرکت ضروری نہ تصور کی جاتی ہو۔

زور صاحب حضرت جذب کی بڑی عزت و توقیر کیا کرتے تھے۔ جذب صاحب کسی محفل میں دیر سے آتے اور پیچھے کی صفوں میں بیٹھ جاتے اور زور صاحب کی ان پر نظر پڑتی تو اس وقت تک بے چین رہتے جب تک کہ جذب صاحب صف اول میں نہ بیٹھ جاتے اور ہمیشہ دیکھا گیا کہ جب کبھی جذب صاحب واپس جانے لگتے تو ڈاکٹر زور انکو باہر کے دروازے تک رخصت کرنے کے لئے آتے۔

اب جبکہ میں حضرت جذب کی تخلیقات اور تراجم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں تو یہ بات میرے ذہن میں اُبھرتی ہے کہ حضرت جذب کی مادری زبان کنڑی، ساحلی زبان تلگی اور اکتسابی زبانیں سنسکرت۔ عربی۔ فارسی اور ہندی بھی ہیں تو انھوں نے اردو کو اظہار خیال کا ذریعہ کیوں بنایا۔ ایک سیدھی ساری سی بات جو میری سمجھ میں آئی وہ یہ ہے کہ اُردو میں انکو مادری۔ ماحول اور اکتسابی۔ ساری زبانوں کا ایسا دل آویز آمیزہ ملا کہ وہ اس پر ریجھ گئے اور ایسے ریجھے کہ ۹۰ برس کی عمر میں بھی دور حاضر کے لسانی اور سیاسی انقلابات کے دھارے کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں لیکن اردو کا دامن چھوڑنا نہیں چاہتے۔ یا پھر بقول میر بات یوں ہو گی کہ ـــ

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ　　　ان سے بھی تو کوئی پوچھے اتنے کیوں پیارے ہوئے

حضرت جذب کی ادبی تخلیقات میں قصیدہ۔ غزل۔ نظم۔ رباعی اور منظوم ترجموں کے علاوہ نثری سرمایہ بھی ملتا ہے۔ سب کی تفصیل یہ ہے :ــ

مطبوعات :۔ (۱) رباعیات جذب۔ یہ پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۲۹ء میں نظامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس پر خواجہ حسن نظامی نے پیش لفظ۔ نظیر حسن سخا دہلوی نے مقدمہ اور امجد حیدرآبادی نے تقریظ لکھی۔

(۲) ارمغان جذب" یہ رباعیوں کا دوسرا مجموعہ ہے جو ۱۹۳۹ء میں ادارۂ ادبیات اُردو کی جانب سے ماہر القادری کے طویل مقدمے کے ساتھ شائع کیا گیا۔

(۳) "صد بادۂ جذب" یہ رباعیوں کا تیسرا مجموعہ ہے جو ۱۹۶۲ء میں خود جذب صاحب نے شائع کیا۔

(۴) جوہر تمثیلات :- رباعیوں کی شکل میں کسم دیو کی مشہور تصنیف درسناشتک کا منظوم ترجمہ ہے جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔

(۵) منظوم ترجمہ رباعیات حافظؒ - اسے مشورہ بک ڈپو دہلی نے شائع کیا۔ اردو اور دیوناگری حرف رسم خط میں چھپا۔

(۶) خلیستان تخیلات :- رباعیوں کی شکل میں تلنگی کے مشہور شاعر ویمنا کی کسی شتک کا اردو میں ترجمہ ہے جو ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا اس پر ڈاکٹر بی رام کرشن راؤ صاحب سابق گورنر کیرالا و یو پی نے ایک بسیط پیش لفظ لکھا اور اس کی رسم اجرائی نواب مہدی نواز جنگ بہادر کے ہاتھوں سے ایوان وزراء میں آئی جس دن جذب صاحب کی دختر نیک اختر کی شادی بھی تھی۔ یہ دونوں تقریبیں ایک ساتھ انجام پائیں۔

(۷) کنڑی زبان میں اردو ادب کی تاریخ یہ کتاب میسور یونیورسٹی نے شائع کی۔

غیر مطبوعہ سرمایہ یہ ہے۔

(۸) متعدد نظمیں جن میں سے بعض کی سرخیاں یہ ہیں:-

دل ہی تو ہے — اس وقت بھی تم یاد آتے ہو — فصل بہاراں طلوع سحر - شام غربت - نیرنگئ دنیا - حب وطن - فلسفۂ انبساط - اہل دل - متعلم و معلم - قوم میں بچے کی اہمیت - گوتم بدھ - کالی داس — مہاتما - ٹیگور - منشی پریم چند - اکبر الہ آبادی - اقبال وغیرہ

(۹) کنڑی اردو لغت (۱۰) بھرتری ہری کی نیتی شتک کا منظوم ترجمہ - (۱۱) سنسکرت کی امرو شتک کا ترجمہ (جو ابھی نامکمل)

(۱۲) مجموعہ رباعیات - حصہ اول تحفۂ جذب - دوم احساسات جذب - سوم تعلیمات جذب - چہارم غزلیں جولاں زیر ترتیب ہے۔ [illegible]

مذکرہ صدر مطبوعہ کتابوں سے متعلق چند مشاہیر کی رائیں (اس سے پہلے کہ میں کچھ عرض کروں) اختصار کے ساتھ پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) حضرت خواجہ حسن نظامی :- بھائی پنڈت دگمبر راؤ جذب کی رباعیاں میں نے پڑھیں۔ شاعری کی نظر یہی کچھ وقعت میں رکھتی کیونکہ شاعر نہیں ہوں۔ مجھے تو ان کے جذبات و خیالات کی نسبت لکھنا ہے کہ اس مجموعہ میں ایک فلاسفر یوگی کی طرح انھوں نے جذبات خیالات کی تصویر دکھائی ہے۔ حقائق و معارف پر جن کی نظر رہتی ہے وہ اس مجموعہ میں خاص بات پائیں گے اور اسی بات کو اس مجموعہ کی روح تصور کرتا ہوں۔

(۲) نظیر حسن سخا دہلوی :- انسان پر گذرنے والی باتیں ان کی رباعیوں میں لکھی گئی ہیں۔ اُردو سے لچک اور لغزش کے ایسی صاف اور عمدہ گفتگو نہ بے محاورہ نہ اردو لہجہ کے خلاف۔ سبحان اللہ۔ آپ معنوی شاعر نہیں بلکہ فطری شاعر ہیں ان سے بجائے عاشقانہ جذبات کے عارفانہ اور عاقلانہ مضامین کی توقع رکھنا چاہیئے۔

(۳) حضرت امجد حیدرآبادی :- ابتداً جذب صاحب نے جناب سخا کی اصلاح اور مقدمہ کے بعد اپنی رباعیات کا مجموعہ جذبیہ ڈاک میرے پاس یہ کہکر بھیجا کہ اس پر رائے لکھدوں میں بغیر اس بات کو سمجھے ہوئے کہ جذب کون ہیں اور

کیسے آدمی ہیں فوراً دوسری رائے لکھ کر کتاب واپس کر دی۔ اس واقعہ کے چند روز بعد جذب صاحب سچ مچ میرے سامنے آکھڑے ہوئے۔ صورت دیکھی۔ سیرت معلوم ہوئی۔ کلام سے زیادہ کلیم صاحب میں خوبیاں نظر آئیں۔ منکسر مزاج، حلیم الطبع ساکت و صامت، مجسم اخلاق، دیانت کے ساتھ ساتھ فلسفہ تصوف سے بھی واقف۔ ان کو دیکھ کر مجھے اپنی رائے سابقہ بدلنی پڑی اور پچھلی رائے لکھی۔ جذب صاحب کی میں نے نظمیں بھی دیکھی ہیں اور غزلیں بھی لیکن اصناف نظم میں ان کو رباعی سے خاص تناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان میں اکثر رباعیاں ہندی اور سنسکرت زبان کے ترجمے ہیں۔ ترجمہ اور وہ بھی نظم میں۔ نظم اور وہ بھی رباعی کی مرتعش بحر میں۔ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تاہم جذب صاحب نے اپنے امکان بھر اچھی کوشش کی ہے اور ایک حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ مجھے تو بہ نگاہ محبت تمام رباعیاں اچھی ہی معلوم ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کسی اور کو میری رائے سے اختلاف ہو۔

اس کے بعد انتقال سے دو سال پہلے حضرت امجد نے جذب صاحب کیلئے ایک رباعی لکھی تھی وہ بھی سن لیجئے

انساں کی ترقی کیلئے زینہ ہے — اخلاق حکیمانہ کا گنجینہ ہے
سچ تو یہ ہے کہ جذب صاحب کا کلام — جذبات دلی کا صاف آئینہ ہے

۴۔ مولانا عبدالماجد دریابادی :۔ کلام میں پختگی ہے۔ مضمون اکثر رباعیوں کا عارفانہ و درویشانہ ہے اور کلام میں خاصہ رنگ حکیم الشعرا امجد کا جھلک رہا ہے۔ ایک برہمن زادہ کی زبان سے ایسی باتیں اور زیادہ قابل داد ہیں۔

۵۔ ماہرالقادری :۔ جذب صاحب کی رباعیاں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے دل سے نکلی ہوئی باتیں ہیں ان کی رباعیوں کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی، سلاست ہے۔ خیالات سلجھے ہوئے۔ طرز بیان سادہ اور بے تکلف کہ معمولی سمجھ کا انسان بھی سمجھ سکے۔ انسان کی فطرت کچھ اس قدر باغیانہ واقع ہوئی ہے کہ اخلاق و نصیحت کی باتیں اسے روکھی پھیکی معلوم ہوتی ہیں۔

۶۔ آل احمد سرور :۔ اس مجموعے میں فکر کی پختگی اور سچی کے نمونے جابجا ملتے ہیں۔

۷۔ سید احتشام حسین :۔ عمر نے اظہار و بیان ہی میں نہیں خیالات میں بھی گہرائی اور بلندی پیدا کر دی ہے اردو آپ کی زبان ہے برہمن ہونا اس میں کیسے مانع ہوگا۔ برہمن ہونے نے خیالات میں پاکیزگی پیدا کی ہے۔ جسے آپ نے صاف ستھری زبان میں سچائی سے ادا کر دیا ہے۔ اس میں نہ تصنع ہے نہ بناوٹ۔

۸۔ نورالحسن ہاشمی :۔ آپ کی رباعیاں تعریف سے مستغنی ہیں۔ ہر رباعی کلاسکی ادب کی شان رکھتی ہے کیونکہ اس میں رچا ہوا انداز بیان بھی ہے اور صاف ستھری شگفتہ زبان بھی۔

۹۔ خواجہ احمد فاروقی :۔ آپ کا کلام استادانہ ہے اور اس لائق کہ لب ادب سے بوسہ دیا جائے۔ آپ کے خیام دکن ہونے میں کچھ شبہ نہیں ہے۔

حضرت جذب کی شاعری سے متعلق متذکرہ صدر آرا سے مجھے پورا اتفاق ہے اور نہ پورا پورا اختلاف اس لئے کی وقت کو

ملحوظ رکھتے ہوئے بہت ہی اختصار کے ساتھ کچھ اپنی سی بھی کہہ دینا چاہتا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ جذب صاحب قدیم روایات شعر و سخن کو بڑی خوبی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ دیانت اور تصوف کی چاشنی ان کے کلام میں وافر طور پر موجود ہے۔ اخلاقیات کا عنصر بھی غالب ہے نتیجتاً یہ کہنا بھی درست ہے کہ جذب صاحب کے کلام میں اخلاقیات کو بنیادی مرتبہ حاصل ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ ان کے کلام میں تنوع اور تازگی نہیں ہے۔ یا یہ کہ انکی رباعیاں محض اخلاقیات کی خشک اور متواتر گردان ہیں۔ یا ان میں آفاقیت نہیں ہے۔ یا زبان کی خوبی یا موسیقیت کا فقدان ہے اس کے برخلاف ان کی شاعری میں معصومیت۔ سادگی۔ مٹھاس۔ لوچ اور ترنم پایا جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ چیستان گوئی کی بجائے انھوں نے سادہ نگاری کو اپنایا ہے۔ مگر اس سادگی میں بھی ان کی زبان آن بان اور توانائی رکھتی ہے۔ ان کے پاس ذہنی یا لفظی شعبدہ گری کے اشعار خال خال ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زیادہ تر اپنے مقصد کی قطعیت پسند کر دیتے ہیں۔ خواہ وہ اخلاقی ہو روحانی یا جسمانی۔ نیک و بد کی آویزش کے مناظر ان کے کلام میں مختلف النوع اور لطیف پیرایوں میں موجود ہیں مگر وہ ان موقعوں پر مایوسی کی بجائے ان کے حل پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ زندگی سے ہر سمجھوتے میں انسانی عظمت میں اضافہ کے قائل ہیں۔ مگر وہ انسانی پاکیزگی اور عفت کی شکست کو کسی قیمت پر بھی گوارہ نہیں کرتے۔ ان کی "انا" میں مادی حقائق کا انعکاس ضرور ہے۔ مگر بندگی کے عجز و نیاز کے ساتھ عشق مجازی کے کرشمے بھی ان کے اشعار میں خال خال ملتے ہیں۔ ان کے نفس پر ایسا پیراگندہ ہوا نہیں ہے کہ وہ کوئی عاشقانہ بات کہہ ہی نہ سکیں۔ خصوصاً ان کی غزلوں میں جوانی کی ترنگ اور والہانہ جذبات کی دبی دبی سی شورش پائی جاتی ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ عشق کی سوکھی ہڈیوں سے جن کے تر و تازہ جسم کو وابستہ کرنا نہیں چاہتے بلکہ دریائے حسن کے سوتوں تک پہنچکر وہیں ڈوب جانا چاہتے ہیں۔ جہاں عاشقانہ شاعری صرف لچکی شاخوں۔ خوشنما پھولوں اور لذیذ پھلوں کی بات کرتی ہے وہاں جذب صاحب تنے اور جڑ کی بات کرتے ہیں اس کے شاید یہ معنی ہوئے کہ وہ اپنی شاعری کی بنیاد عارضی اور وقتی محسوسات پر رکھنے کی بجائے دائمی جذبات پر رکھنا چاہتے ہیں۔

اب میں حضرت جذب کے کلام سے ایسے اقتباسات پیش کرنا چاہتا ہوں جو انکی شاعری کے موضوع اور خصوصیات کے حامل ہوں

(۱) اس رباعی میں نیک و بد کی آویزش میں فطری حوصلے کی کامیابی کو ملاحظہ فرمائے اور یہ دیکھئے کہ کس انداز سے انھوں نے اپنے مقصد کو عام تشبیہوں کے ذریعہ سے پورا کیا ہے اور نکات شاعری کے لحاظ سے کتنے موزوں قافیے استعمال کئے ہیں۔

کرتا ہے تمیز خیر و شر میں دانا ‏ ‏ ‏ ‏ نادان میں یہ حاسہ کس نے پایا
یہ خاصہ تو بس ہے کہاں ہنس میں ہے ‏ ‏ ‏ ‏ اے جذب کرے دودھ سے پانی کو جدا

(۲) زندگی میں بدی سے سمجھوتا اسی حد تک ہو سکتا ہے کہ عفت انسانی مجروح نہ ہو۔ اس مضمون کو کس قدر سادہ زبان اور نادر تشبیہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دیکھو سوچو کے الفاظ بھی قابل داد ہیں۔ اور یہ تازگی نہیں تو کیا ہے۔

بچئے رہو یار گر یبدوں کی صحبت — ملنے میں بھی اعتدال کی ہے عادت
دیکھو اسرچو از بان نہ زخمی ہو جائے — چونے کی نہ ہو پان میں اتنی کثرت

۳۔ اخوت انسانی سے متعلق کتنی اچھی رباعی لکھی ہے۔

جس میں حب وطن نہ ہو وہ من پیدا کر — اقوام کا خادم ہو وہ تن پیدا کر
وہ شمع جلا کہ جو کبھی بجھ نہ سکے — جسکو نہ خزاں ہو وہ چمن پیدا کر

۴۔ ان کی انا میں بھی عجز و انکسار کی جھلک موجود ہے ۔"دیکھا تم نے" رباعی کی جان ہے۔

ہر اک کی نگاہ دیکھ لیتا ہوں میں — طرز بدخواہ دیکھ لیتا ہوں میں
وسعت نظری کو مری دیکھا تم نے — اپنے بھی گناہ دیکھ لیتا ہوں میں

۵۔ کتنا بلند مقصد حیات اس رباعی میں پیش کیا گیا ہے۔

دنیا میں نہ نام کے لئے آیا ہوں — اور میں نہ قیام کیلئے آیا ہوں
تا مرگ نہ کام ختم ہوگا میرا — اس جذبے میں کام کیلئے آیا ہوں

۶۔ فطرت کی غلامی سے متعلق ایک طنزیہ رباعی سنئے۔ کس قدر مترنم، صاف اور پاکیزہ طرز بیان ہے اور کتنے موزوں الفاظ میں ہے

آہستہ روی رکبک خرامی نہ گئی — کب آئے گی پختگی کہ خامی نہ گئی
سرحد میں فقط ہوئی آزادی ہے — افسوس کہ فطرت کی غلامی نہ گئی

۷۔ تا مرد سخن نگفتہ باشد ۔ عیب و ہنرش نہفتہ باشد ۔ کی کیسی اچھی تصویر اس رباعی میں پیش کی گئی ہے۔

کویل کالی ہے اور کوا کالا — دونوں میں کوئی فرق نہ ہم نے دیکھا
جب موسم گل آئے تو ہوگا معلوم — کویل کویل ہے اور کوا کوا

۸۔ وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے۔ اس کی ایک شاعرانہ تصویر دیکھئے۔

احباب خوش اخلاق کا ہے یہاں پہ کال — کچھ ہر گز آتا نہیں پیشانی پہ بل
کافور کرو و عرق اتار و یا تیل — خوشبو ہی دیا کرتا ہے اپنی صندل

۹۔ ایک عارفانہ رباعی سنئے ۔

تم کو حرم میں کیا شبہ ہے حرم میں کیا ہے — جو رکھ دیا ہے تم نے وہی رکھا ہے
گرکان والوں ہر چیز ہے اس کی مدح — آنکھیں ہوں تو وہ سب میں نظر آتا ہے

۱۰۔ شباب کی یاد سے

یہ عالم عیش و خواب ہم پر بھی تو تھا — یہ سایۂ آفتاب ہم پر بھی تو تھا
تھے ہم بھی کبھی رونق عالم اے جذب — کچھ وہم سا ہے شباب ہم پر بھی تو تھا

۱۱۔ جوانی ــــ　پھر فصلِ نشاط و کامرانی آئی　　پھر تازہ نوید زندگانی آئی
جب آئی تو مستی کو بھی کرنی صدا　　اُٹھے جذبات سمجھا کہ جوانی آئی

۱۲۔ رندی و سرمستی ــــ مستی میں بھی وہ اتنے ہوشیار ہیں کہ اپنی گنہ گاری کو نہیں بھولے۔

میخانے پہ پاک نگاہ کر لیتا ہوں　　پیمانوں سے رسم و راہ کر لیتا ہوں
توبہ کرنے کی ہوتی فرصت جو مجھے　　اک اور نیا گناہ کر لیتا ہوں

۱۳۔ برتھ کنٹرول ــــ　اک نورِ نظر ہو وہ بھی سیرت والا　　کیا فائدہ نادان اگر ہوں صد ہا
اک چاند اندھیرے کو مٹا سکتا ہے　　مجمع تاروں کا کچھ نہیں کر سکتا

۱۴۔ رشوت ــــ　واجب ہے کہ ہر چیز چبا کر کھائیں　　مخلوق کو لیکن نہ ستا کر کھائیں
کھانے کے بھی ہیں قاعدے شرکا سبب　　رشوت بھی جو کھائیں تو چھپا کر کھائیں

۱۵۔ شوہروں کیلئے واجبی نصیحت کا قطعہ ملاحظہ ہو: ــــ

بیوی سے ہمیشہ نہ جھگڑتے رہنا　　اس پر کوئی ناحق نہ لگانا الزام
جس گھر میں چشمِ زن سے آنسو ہوں رواں　　اس گھر سے لٹے دولت و اقبال تمام

وقت کی طوالت سے بچنے کیلئے غزلوں کے صرف چند شعر پیش کروں گا۔ والہانہ جذبات۔ چست بندشیں۔ زبان و بیان کی طلسم کاری اور مضامین کا اچھوتا پن اور تیور ملاحظہ ہوں۔

(۱) .... سنا اور سن کے جس کو رو دئے تم　　وہی اک لفظ میری داستاں ہے
(۲) .... جگنو کو بھی نہ اذن دیا سیرِ گشت کا　　اللہ رے شامِ گورِ غریباں کی احتیاط
(۳) .... ضم خانے کی عظمت کچھ نظر والے سمجھتے ہیں　　یہ بن جاتا ہے کعبہ جب کبھی بیدار ہوتا ہے
(۴) .... یہ کون آ گیا مری حسرت نگاہ میں　　جھک کر کسے سلام کئے جا رہا ہوں میں
تسکینِ زندگی کا ذریعہ وہی تو ہے　　یاد اسکو صبح و شام کئے جا رہا ہوں میں
(۵) .... بازیچۂ وفا ہے شہادت گہِ جنوں　　کہتا ہے زخم زخم نگاہوں سے کھیلئے
یہ کھیل قومیت کی حدوں میں نہ آ سکے　　ہندو سے کھیلئے نہ مسلماں سے کھیلئے

شوخیٔ طبع کے ایک دو نمونے ملاحظہ فرمایئے ــــ

۱ .... مذاقِ جدید پیدا ہو کے رہتا ہے حسینوں کا　　جب انکو دل نہیں ملتے تو غنچوں کو مسلتے ہیں
۲ .... یہ کہتے ہیں کل آؤ گے پھر اس پہ مسکراتے ہو　　چلو بس جاؤ میں سمجھا یہ سب ٹالنے کی باتیں ہیں

دوسرے مصرعہ کے برتے ہوئے محاورے زبان کا چٹخارہ اور لہجہ کی لٹک قابلِ داد ہے۔

حضرت جذبؔ کے خرمنِ سخن سے چند موتی چن کر میں نے آپ کے سامنے پیش کر دیئے۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ اپنی پسند کے اور موتی چن کر اپنی مالا بنالیں۔

حضرت جذب نے اپنی ساری زندگی اردو ادب کی خدمت میں گذاری ہے۔ خود ان کا کلام اور سنسکرت۔ کنڑی تلنگی اور فارسی کی ۶۔۷ سو برس پرانی شہرہ تخلیقات کے اردو منظوم ترجمے اور کنڑی اردو لغت۔ یہ سب ایک ایسا سرمایہ ہیں جس سے اردو کا دامن ہمیشہ مالا مال رہے گا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ آپ کی نمایاں علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۵۶ء میں کل ہند آندھرا اردو مجلس کی جانب سے (یعنی عوام کی طرف سے) آپکو خیام آندھرا کا لقب عطا ہوا اور مابعد حکومت آندھرا پردیش کی سفارش پر حکومت ہند نے بھی آپکی ادبی خدمات کے صلے میں ماہانہ ڈیڑھ سو روپیہ کا وظیفہ جاری فرمایا ہے۔

خدا کرے حضرت جذب تادیر زندہ سلامت رہیں۔ اور ان کا غیر مطبوعہ سرمایہ بھی بہت جلد منظر عام پر آجائے خصوصًا ان کی نظمیں اور غزلیں جن میں بڑی جان ہے۔

میں جانتا ہوں عصرِ نو کے ادبی تقاضے کچھ اور ہیں پھر بھی جذبؔ کے تعلق سے مجھے عصرِ نو سے عرض کرنا ہے

عصرِ نو مجھکو نگاہوں میں چھپا کر رکھ لے
ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا سرمایہ ہوں

جلالی شاہجہانپوری

ہندی تہذیب و ثقافت اور صنعت و تجارت کے مختلف ارتقائی دور

(۱) دراوڑی دور

بسلسلہ گزشتہ ماہ ستمبر ۱۹۶۶ء

مصر کے چوتھے خاندان کے ایک عہدیدار کے مقبرہ پر یہ الفاظ کندہ ملتے ہیں کہ کتابوں کے گھر کا منشی' اس تحریر سے اہل قیاس نے اندازہ لگایا ہے کہ مسیح سے ہزاروں برس قبل سرزمین مصر میں لائبریریاں موجود تھیں۔ جن میں اخلاقیات' جراحی و نجوم' تاریخ و فلسفہ اور مذہبیات کی تصانیف کا وافر ذخیرہ موجود تھا۔ فن انجینیرنگ کی طرح تاریخ نویسی مصر کا قدیم ترین فن ہے ان ظنی اور تاریخی شواہد کی بنا پر یہ بات حقیقت نظر آتی ہے کہ آرین دور سے بہت ہی پہلے دنیا کے مختلف متمدن ممالک میں تصنیفی سلسلہ کا آغاز ہو چکا تھا پھر بھی ان تمدن آشنا ممالک کی کسی تصنیف کو اہل قیاس نے دنیا کی اولین تصنیف نہیں کہا ہے اس سے بدیہی طور پر یہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ دنیا کی پہلی کتاب دراوڑی عہد میں تصنیف ہوئی لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس فن اور موضوع پر تھی۔ علاوہ ازیں ہندی تہذیب' سمیری تہذیب سے بھی قدیم تر ہے اس لئے قیاساً نہیں بلکہ عقلاً بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ تصنیفی قدامت کی فضیلت آرین کے بجائے دراوڑوں کے حصہ میں آئی ہے یعنی دنیا کی پہلی تصنیف کا فخر دراوڑی عہد کے ہندوستان کو حاصل ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ ظن و تخمین بعض متشکک ذہنوں کو متاثر نہ کر سکے لیکن کھدائیوں سے ماہرین آثار قدیمہ نے جو نتائج مرتب کئے ہیں وہ اب عینی شہادت کی حد تک پہونچ گئے ہیں لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ان محققہ نتائج کو تحریری اور دستاویزی ثبوت کے طور پر تسلیم نہ کر لیا جائے۔

صنعتی اور تجارتی ارتقاء:۔ دراوڑوں کا تجارتی اور صنعتی ارتقا کسی خاص فن اور صنعت تک محدود نہ تھا بلکہ اس ارتقا میں ہمہ گیریت کے اوصاف نمایاں تھے' ان کے تعمیراتی ارتقا کے سامنے بابل۔ سمیریہ اور مصر کے تعمیراتی انجینیرنگ کی کوئی حقیقت نہ تھی[1]۔ تعمیرات میں حفظان صحت کے اصول کی پابندی سے اندازہ ہوتا ہے کہ جملہ تعمیرات شعبہ تعمیر کے تحت تیار کی جاتی تھیں[2]۔ چنانچہ پانچ ہزار سال پرانے مدفون آثار دیکھکر مشہور اطالوی ماہر آثار قدیمہ رابرٹ ایکس نے روم میں شائع ہونے والے سہ ماہی رسالہ "ایسٹ اینڈ ویسٹ" میں ہند کے تعمیراتی ارتقا کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ:۔

" مختلف مقامات سے پتھر اور دھات کے زمانہ کے جو تعمیراتی نشان اب تک منظر عام پر آئے ہیں وہ تعمیراتی "

---

[1] عہد قدیم مشرق و مغرب از سید سراج الاسلام ایم اے [2] انڈین ہسٹری از او مدھ بہاری ایم اے۔

منصوبہ بندی کی اعلیٰ صلاحیتوں کے روشن گواہ ہیں اتنے قدیم زمانہ میں تعمیراتی انجینیرنگ کے ایسے بے مثال نمونے مشکل ہی سے کسی اور جگہ نظر آتے ہیں اُس عہد میں جب کہ انسانی شعور میں عام پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی سلسلۂ تعمیرات میں حقوق شہریت اور حفظان صحت کا تخیل تعجبات سے معلوم ہوتا ہے۔

ڈراوڑی معماروں کے ذوق تعمیرات نے استرکاری کے ایسے مسالے بھی تیار کرلئے تھے کہ دیواریں اور چھتیں مرور زمانہ کے باوصف نمی اور تری کے اثر سے محفوظ رہتی تھیں خیال ہے کہ کوہستان آبو کے سنگ بھانی کا چونہ دیواروں اور چھتوں پر لگایا جاتا تھا جس میں مسلسل رگڑ سے استحکام کے علاوہ آئینہ کی طرح جلا بھی پیدا ہوجاتی تھی[1]۔

ظروف و زیور سازی

ڈراوڑوں میں بلا امتیاز مرد و زن زیورات پہننے کا عام رواج تھا بلکہ مرد اس شوق میں نسبتاً کچھ آگے تھے گلوبند، بازوبند اور ہار وغیرہ مردوں کے خاص زیورات تھے، عورتوں میں جھومر، کنگن، چوڑیوں، پہونچیوں، بالیوں، انگوٹھیوں، تھنیوں اور پازیبوں کا استعمال زیادہ تھا نتھنی پہننے کا موجودہ رواج غالباً اسی دور کی یادگار ہے۔ اسی ذوق عام کی بنا پر ڈراوڑی صناعوں نے زیور سازی میں اچھا نام پیدا کیا تھا۔ متعدد بابل اور سمیریہ کے علاقوں میں کھدائیوں کے دوران ہندی زیورات کے جو دلکش نمونے ملے ہیں اُن سے اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے کہ ڈراوڑی کاریگر زیور سازی میں ان علاقوں کے زیور سازوں سے بہت آگے تھے اور زیوراتی میناکاری کے فن سے بخوبی واقف تھے[2]۔ جنوبی ہند کے ضلع ساگر کے موضع ایریان کی کھدائی کے دوران ان ظروف و زیورات کے کچھ ایسے نمونے ملے ہیں جن سے تین ہزار قبل مسیح میں اس صنعت کی ترقی کا پتہ چلتا ہے اور ایسے آثار بھی پائے گئے جن سے جنوبی ہند کی ایران سے تجارت کا ثبوت ملتا ہے اور ہندی ظروف و زیورات کے ساتھ دوسرے آرائشی سامان کے برآمد کی بھی تصدیق ہوتی ہے[3]۔ ان ظروف و زیورات کے نمونے صرف ہندوستان ہی میں دستیاب نہیں ہوئے بلکہ بیرون ہند بھی مختلف مقامات پر ملتے رہے ہیں، حال ہی میں روسی علاقہ ازبکستان میں کچھ اعلیٰ نمونے دستیاب ہوئے ہیں، روسی ماہر آثار قدیمہ "ایم سین" نے شروع دسمبر ۱۹۶۳ء میں تاشقند میں ہندی سفیر مسٹر ٹی این کول کو ان کی دستیابی کی تفصیل بتاتے ہوئے۔ ان کی قدامت پانچ ہزار سال قبل مسیح بتائی ہے اسی کے ساتھ ماہر موصوف نے دو مزید انکشافات کئے ہیں یعنی ازبکستان میں چاول کا بیج اسی دور کے لگ بھگ چین کے بجائے وادی سندھ سے پہونچا اور گھوڑوں کی برآمد بھی اسی علاقہ سے ہوئی۔ ہندوستان میں اچھی نسل کے گھوڑوں کی کمی ہمیشہ بتائی گئی ہے۔ بودھ دور اور زمانہ مابعد میں عربی گھوڑوں کی ہند میں مسلسل درآمد سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے لیکن موصوف کے انکشافات سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈراوڑی عہد میں اچھی نسل کے گھوڑے بھی سرزمین ہند میں کثرت سے پائے جاتے تھے اور ان کی دوسرے ملکوں میں مانگ بھی تھی۔ اس تہذیب کے مٹنے سے جہاں بہت سی چیزیں بے ترجیحی کا شکار ہوئیں وہاں اچھی نسل کے گھوڑوں کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

---

[1] تاریخ گجرات   [2] عہد قدیم شرق و مغرب   [3] روزنامہ الجمعیۃ دہلی و قومی آواز لکھنؤ جنوری ۱۹۶۶ء

زراعت و باغبانی: ۔ زراعت وغیرہ کے اعتبار سے بھی دراوڑی عہد کو بہت کچھ ترقی پذیر کہا جا سکتا ہے اُس زمانہ میں مختلف النوع پھلوں کے علاوہ نیبو کی پیداوار بھی کثرت سے تھی خربوزے وغیرہ بھی کثرت سے پیدا ہوتے تھے وادی سندھ کے یہ قدیم باشندے تجارت پیشہ تھے اور ان کے تجارتی قافلے برابر ہمسایہ ریاستوں اور شہروں کے لئے ضروری اشیاء برآمد کرتے تھے اس لئے بہت ممکن ہے کہ وادی کی ہر قسم کی پیداوار سرزمین ایران اور دوسرے دور دراز علاقوں تک پہونچتی رہی ہو۔ چاول کا بیج بجائے چین کے وادی سندھ سے ازبکستان پہنچنے کی شہادت سطور ماقبل میں تحریر کی جا چکی ہے لیکن ۱۹۶۵ء کی مغربی بنگال کی کھدائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چاول کی کاشت دنیا میں سب سے پہلے بنگال کی وادی اجے یا گیرٹ میں ہوئی۔ آثار قدیمہ کی اس کھدائی کے دوران ہاتھ کے بنے ہوئے دھان کے ایسے پودے دستیاب ہوئے ہیں جن کا رنگ بھدا یا زرد و سُرخ ہے۔ آبادی کی انتہائی نیچی سطح سے چاول بھی کھود کر نکالے گئے ہیں۔ چاول کی تحقیقات کے مرکزی ادارہ کے ماہروں نے جانچنے کے بعد یہ انکشاف کیا ہے کہ یہ دریافت شدہ چیز دنیا کے اس انتہائی قدیم عہد کی یادگار ہے جس کا پتہ چل سکا ہے اس رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ:—

چاول کی ابتدائی کاشت کرنے والے کسان بنگال کے اجے یا گیرٹ کی وادیوں میں رہتے تھے' ایکھ کی کاشت کا آغاز بھی دراوڑی عہد کی بات ہے" پروفیسر کیٹنگس نے اپنی تصنیف "دنیا کی شکر سازی" میں ایکھ کی ابتدائی پیداوار کے متعلق بڑی تحقیق سے لکھا ہے کہ "یہ میٹھا درخت سب سے پہلے ہندوستان کے مقدس دریائے گنگا کے ساحل پر پایا گیا تھا اس کا بیج اور طریقہ کاشت بھی ہندوستان ہی سے دنیا کے اکثر حصوں میں پہنچا' ہندوؤں کے علم الاصنام (دیومالا) گنے کو کام دیو (ہندی کیوپڈ) کی کمان کہا گیا ہے' ہند قدیم کی طبی کتابوں اور مقدس اتھرویدمیں بھی گنے کا ذکر موجود ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ آریوں کی آمد سے پہلے گنا ہندوستان میں موجود تھا۔ ہندوستان کی بہت سی چیزیں بودھ بھکشوؤں کے ذریعہ جنوب مشرقی ایشیا خصوصاً چینی علاقہ تک پہنچیں لیکن ایکھ کا پودا تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے سرزمین چین پہونچ چکا تھا۔ چونکہ اہالیان چین گڑ اور شکر سازی کے فن سے ناواقف تھے اس لئے حضرت مسیح سے تقریباً چھ سو چالیس سال پہلے چینی تاریخ کے مشہور شہنشاہ "تائی کنگ" نے واقف کاروں کا ایک وفد شکر سازی کی معلومات کیلئے ہندوستان بھیجا تھا جو یہاں سے پوری معلومات حاصل کر کے واپس ہوا تھا۔ جاوا وغیرہ کا علاقہ آج نیشکر پیدا کرنے میں مشہور ہے لیکن ہند کے محکمۂ خوراک و زراعت طرف سے جنوری ۱۹۶۳ء میں جو اطلاع نامہ اس بارے میں شائع ہوا ہے اس میں گنے کو ہندوستان کا ایک قدیم تحفہ بیان کیا گیا ہے جو تمام دنیا کو ہندوستان کی طرف سے ملا ہے دنیا کے اکثر حصوں خصوصاً عرب کے مختلف علاقوں میں شکر تیار ہوتی تھی لیکن گنے کی نہیں کھجور کی اور عرب تاجروں کے ذریعہ مصر کے راستہ یورپ تک پہونچا بھی کرتی تھی[1] بعد کو ہند کی صاف ستھری شکر بھی انہی عربوں کی معرفت مغرب پہونچنے لگی تھی جس نے اپنی صفائی اور رنگ و ذائقہ کی خوبی کی بنا پر عربا

---

[1] فلسطین' شرق اردن اور عراق میں ۱۹۳۶ء کی کھدائیوں کے نتیجہ میں ایسے آثار ملے ہیں جن سے حضرت مسیح سے بہت پہلے شکر سازی کا ان علاقوں میں پتہ چلتا ہے۔

عربی شکر کو مغرب کے بازاروں سے باہر نکال دیا تھا لیکن یورپ سکندر اعظم کے حملے سے پہلے گنّے کے نام اور شکل و صورت سے قطعاً ناواقف تھا چنانچہ تین سو ستائیس قبل مسیح سکندری فوجوں نے ایکھ کا درخت اور اس کے رس سے گڑ اور شکر تیار ہوتے دیکھ کر بڑے تعجب کا اظہار کیا تھا اپنی ناواقفیت کی بناء پر سکندر کے سپاہی شکر کو میٹھا نمک یا ہندی نمک کہتے تھے۔ انھوں نے اس کا ایک اور نام ایکھ کا شہد بھی رکھ چھوڑا تھا۔ یونانیوں کے قدیم نوشتہ جات میں تحریر ہے کہ "ہندوستان کا یہ وہ درخت ہے جو مکھیوں کے بغیر شہد پیدا کرتا ہے" اہل روم کا بھی شکر اور نیشکر کے بارے میں کچھ اسی سے ملتا جلتا خیال تھا۔ پرانے ریکارڈوں کے علاوہ پروفیسر لگمن کی بھی یہی تحقیق ہے کہ سکندر اعظم ہند سے واپسی پر گنّے کے پودے اور طریقہ کاشت یورپ لے گیا تھا بیج پہونچنے کے بعد یورپ میں بھی اس کی کاشت شروع ہوگئی یورپ سے یہ امریکہ وغیرہ پہونچا اور خصوصیت سے کیوبا۔ برازیل اور دوسرے ممالک میں اس کی کاشت کافی ترقی کر گئی [1]

کپاس کی پیداوار کے لئے بھی سندھ اور جنوبی ہند کا کالی مٹی والا تمام علاقہ ڈراوڑی عہد سے مشہور چلا آرہا ہے لیکن سندھی کپاس کو اس وقت بین الاقوامی شہرت حاصل تھی سندھی پارچہ باف اس کے باریک ریشے سے اعلیٰ قسم کا باریک سوت کات کر نہ صرف ملک کی ملبوساتی ضروریات کی تکمیل کرتے تھے بلکہ برآمد بھی کرتے تھے [2]

سندھی ساخت کے عام کپڑے عرب حلقوں میں ثوب سندھی کہلاتے تھے' ایک خاص قسم کا کپڑا جو عربوں کے ذوق طبع کی مناسبت سے تیار کیا جاتا تھا عربوں میں سندیا سند کے ناموں سے ——— مشہور تھا [3] ایکھ کے بیج کی طرح اعلیٰ قسم کی کپاس کا بیج اور اس کا طریقہ کاشت بھی یہیں سے باہر کی دنیا میں پہونچا چنانچہ اہل قیاس کی رائے میں سندھی کپاس کی شہرت چار ہزار سال قبل مسیح کسی نہ کسی طرح سرزمین مصر پہنچ چکی تھی اور اسی شہرت سے متاثر ہو کر اہل مصر نے فینیقی عربوں کے تجارتی توسل سے سندھی کپاس کا بیج حاصل کیا تھا۔ سرزمین فراعنہ کپاس کی کاشت کے لئے بہت ہی موزوں تھی اس لئے سندھی کپاس کا بیج اپنے اصل مرکز سے بھی بہتر ثابت ہوا اور مرور زمانہ کے ساتھ مصری کپاس کی شہرت وادی سندھ کی کپاس سے بہت آگے بڑھ گئی۔ وادی کی کپاس اور اس کے باریک دھاگے کی قدر و قیمت کا اندازہ مصر کے ایک قدیم بادشاہ اماسس کے ان دو خاص خلعتوں کے دینے سے لگایا جاسکتا ہے جو خاص سندھی روئی کے دھاگے سے تیار کر کے کسی خاص مقرب کو صلۂ خاص میں دی گئی تھیں' اہل بابل نے بھی باوصف اپنی تمام دنی ترقیوں کے کپاس کا بیج اور اس کا طریقہ کاشت سندھی کاشتکاروں کے توسل سے حاصل کیا تھا [4]

پارچہ بافی کی صنعت صرف وادی تک محدود نہ تھی بلکہ ہند کے دوسرے حصوں میں بھی بڑی کامیابی سے پھیلی ہوئی تھی۔ الہ آباد

---

[1] اطلاع نامہ محکمہ خوراک و زراعت حکومت ہند
[2] معارف اعظم گڑھ اپریل ۱۹۶۶ء
[3] ثقافت الہند' ہند کی ثقافتی کونسل کا عربی رسالہ
[4] عہد قدیم شرق و مغرب

ہائی کورٹ کے جسٹس دھون نے الہ آباد یونیورسٹی کامرس ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسے میں "آریوں سے پہلے ہندوستان کی بحری تجارت" کے عنوان سے ۴ مارچ ۱۹۶۶ء کو تقریر کرتے ہوئے متعدد مستند حوالوں خصوصاً کوٹلیہ کی ارتھ شاستر کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ :—

ڈراوڑی عہد میں ہند کے اعلیٰ اور باریک کپڑوں نے شہرت عام حاصل کرلی تھی کاشی کم (موجودہ بنگال) مدورام (موجودہ مدورائی) نوقل (سوراشٹر) اور بعض دیگر مقامات کی صنعت پارچہ بافی نقطۂ عروج پر تھی اور مشرق و مغرب کے عوام ہی نہیں امراء اکابر بھی یہاں کے باریک اور نفیس ترین کپڑوں کو سر اور آنکھوں سے لگاتے تھے۔

موصوف کے بیان کے مطابق لوتھل اس زمانہ میں نہ صرف ڈراوڑی تہذیب کا ایک بڑا مرکز بلکہ ہند کی بحری تجارت کی وہ مخصوص بندرگاہ بھی تھی جہاں خلیج فارس، عرب اور افریقہ سے تجارت کے بحری قافلوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی اور ہر نوع کا خام و پختہ سامان برآمد ہوا کرتا تھا۔ موصوف کی رائے میں اہل فنیقیہ کے ممکنہ استثنا کے سوا (جو تقریباً ساڑھے تین ہزار قبل مسیح فلسطینی ساحلوں پر آباد اور دنیا کی تجارت کے باوا آدم کہلاتے تھے) ہندی تاجروں اور بیوپاریوں کی تاجرانہ قدامت کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔

ڈراوڑوں کی تجارت کے اخلاقی ضابطوں کے ذکر میں جسٹس دھون نے بتایا کہ ضروری اشیا کی مناسب قیمتوں کو برقرار رکھنے کا تمام کام سرکار کے سپرد تھا کوٹلیہ کی ارتھ شاستر میں غالباً ڈراوڑوں کے اس تجارتی ضابطہ سے متاثر ہوکر عوامی مفاد کے لیے اشیاء کی سرکاری خریداری کا اصول وضع کیا گیا تھا یعنی سرکار کو بازار سے خریداری اس وقت کرنی چاہیے جب کوئی چیز سستی اور کافی مل رہی ہو تاکہ کمی اور گرانی کے مواقع پر سرکاری ذخیرہ کو بازار میں لاکر قیمت گرائی جاسکے لیکن اس سلسلہ میں سرکاری منافع کو انصاف اور عوامی مفاد کے خلاف بتاکر قابل مذمت گردانا ہے۔

جسٹس موصوف کے اس بیان سے ہٹ کر مرکزی محکمۂ آثار قدیمہ کی حالیہ کھدائیوں کے نتیجہ میں نربدا اور تاپتی کی وادیوں میں ڈراوڑی عہد کی صنعت کاریوں کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں اُن سے ان وادیوں کی تہذیبی اور صنعتی ترقی کا ممکنہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انہی وادیوں کے درمیانی حصہ کو لوتھل کا علاقہ کہا جاتا تھا جس کی صنعتی ترقی کی شہرت وادیٔ سندھ سے زائد تھی اسی علاقہ میں متعدد قدیم شہروں کے علاوہ ظروف و زیورات، اوزار و ہتھیار اور دوسری نمائشی اور گھریلو استعمال کی اشیاء کے جو صنعتی نمونے ہاتھ لگے ہیں وہ سندھ کے دستیاب شدہ نمونوں سے ارفع اور اعلیٰ ہیں۔ اسی علاقہ سے اُن سلیمانی پتھروں کا بھی پتہ چلا ہے جو بطور باٹ استعمال کئے جاتے تھے، برتنوں وغیرہ پر مختلف قسم کے جانوروں اور درختوں کی خوش نما تصاویر دیکھ کر اُن کے ذوق مصوری اور اس اُن کے فطری لگاؤ کا پتہ چلتا ہے مینا کاری کے فن سے بھی اہالیان لوتھل بخوبی واقف تھے، انسانی مجسموں کے ساتھ حیوانات کے متعدد مجسمے بھی ملے ہیں جن سے اُن کے ذوق مصوری کی مزید تصدیق ہوتی ہے مجسمہ سازی میں تصاویری خطوط و نقوش کی طرح اعضائی تناسب اور موزونیت کی طرف خاص توجہ مرکوز رہتی تھی۔

اعلیٰ قسم کی کپاس پیدا کرنے کی شہرت اگرچہ وادیٔ سندھ کو حاصل رہی ہے لیکن باریک ترین کپڑوں خصوصاً ململوں کے اعتبار سے کاشی کم یعنی بنگال کو جو شہرت دوام حاصل ہوئی وہ نہ وادی کے حصہ میں آئی اور نہ جنوبی ہند کے بنگال کے اکثر حصوں خصوصاً ڈھاکہ کی مرطوب آب و ہوا باریک سوت کا تنے کے لئے حد درجہ موزوں اور مناسب تھی اسی بنا پر ڈھاکہ کی ململ کو جسے اہل یونان گنجیٹک کے نام موسوم کرتے تھے جو شہرت حاصل ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے اس کی قدامت اور قدر و قیمت کا اندازہ تین ہزار قبل مسیح کے مدفون فراعنۂ مصر کی ان لاشوں سے لگایا جا سکتا ہے جو ہندی ساخت کی اعلیٰ اور باریک ترین ململوں میں لپٹی ہوئی پائی گئی ہیں۔

فولاد و آہن :— خام لوہے کو فولاد میں تبدیل کرنے اور آہنی اوزار سازی میں بھی دراوڑوں نے اچھا نام پیدا کیا تھا بقول پروفیسر وِلسن یہ لوگ لوہا ڈھالنے کی صنعت اور اسپات بنانے کے فن سے بخوبی واقف تھے، مصر و ہندوستان کا پہلا براہ راست تعلق اسی کے ذریعہ قائم ہوا تھا اندازہ ہے کہ ہندی لوہا اور اس کی مصنوعات انسانی نقل مکانی کے ذریعہ سندھ کے راستہ ایران و عراق اور ساحلِ شام ہوتی ہوئی مصر تک پہونچی تھیں تورات کی شہادت سے بھی ڈھائی ہزار سال قبل مسیح خام لوہے کے علاوہ ہندی تلواروں کا مصر پہونچنا ثابت ہوتا ہے[1]۔ حقیقت یہ ہے کہ قدیم زمانہ سے یمن کی بندرگاہوں میں ہندی سامان کی درآمد کا سلسلہ جاری تھا اس تمام علاقہ میں قوم سبا کے علاوہ حمیری اور عاد قوم کے قبائل موجود تھے (قرآن مجید کی سورۂ سبا میں ان قدیم اقوام کا ذکر ہے) ان تمام قوموں کا تجارتی تعلق کسی نہ کسی طرح ہند سے قائم تھا۔ خصوصاً قوم سبا کا۔ اس تجارت پیشہ قوم کے ذریعہ ہندی سامان تجارت سر زمین عرب کے علاوہ مصر اور افریقہ کے دوسرے علاقوں کو پہنچا کرتا تھا۔ حضرت یوسفؑ کو کنویں سے نکالنے والا قافلہ جس کے پاس بخورات کے علاوہ ہندی فولادی تلواریں بھی تھیں یمن میں بسنے والی قوم سبا سے تعلق رکھتا تھا[2] اس کے علاوہ صدہا قافلے ہندوستان کا درآمد شدہ مال مصر کے اندرونی علاقوں تک پہونچایا کرتے تھے اور بقول مورخ الفنسٹن حضرت یوسفؑ کے زمانہ سے مارکوپولو اور واسکوڈی گاما تک ہند کے خام اور مصنوعہ سامان کی تجارت کا سلسلہ انہی عربوں کی وساطت سے قائم تھا فجر الاسلام کے مصنف کے بیان سے بھی ہند سے یمنی باشندوں کے تجارتی تعلقات عہد قدیم کی تائید ہوتی ہے اور انہی کے ذریعہ ہندی سامان تجارت خصوصاً فولادی اشیا شام کے علاوہ مصر تک جایا کرتی تھیں۔ قدیم یونانی مورخ آرمیڈرس کا بیان بھی مذکورہ بیانات سے ہم آہنگ ہے۔

دراوڑی عہد میں لوہے کی اولین دریافت اور سندھ کے راستہ اس کی پہلی برآمد سے اختلاف کرتے ہوئے کسی نے اس کی اولین دریافت کا سہرا مصر، روڈیشیا اور کسی نے فلسطین اور ایشیائے کوچک کے سر باندھا ہے لیکن اس اختلاف کی بنیاد کسی ٹھوس ثبوت کے بجائے صرف ظن و تخمین پر قائم ہے اگر مصر میں لوہا موجود ہوتا تو ان اہراموں میں جن کی تعمیر دھات کے وسطی عہد سے شروع ہو چکی تھی یہ کسی نہ کسی طرح ضرور مستعمل ہوتا۔ علاوہ ازیں اہالیان مصر کا لوہے کی تلاش میں یمنی بازاروں تک

---

[1] مشرق و ہند کے تعلقات [2] قصص القرآن صفحہ ۲۶۰ از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب

سفر کر کے ہندی لوہا اور فولاد خرید کر مصر لے جانا اس کی عدم موجودگی کا بدیہی ثبوت ہے۔ بابلی تہذیب کے زوال کے بعد فلسطینی علاقوں میں آشوری قبائل کی اور ایشیائے کوچک میں حطیوں کی حکومتیں قائم ہوئی تھیں اور ان دونوں نے چونکہ آہنی اوزاروں کی مدد سے فتح پائی تھی اس لئے اس سے متاثر ہو کر ان دونوں میں کسی ایک کے سر اس کی اولین دریافت کا سہرا باندھنے کی کوشش کی گئی مگر ان دونوں حکومتوں کی بنیاد مسیح سے تقریباً ایک ہزار سال قبل پڑی تھی جب کہ ہندی لوہا اور فولاد ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے آہنی اوزار اور ہتھیار اس سے بہت پہلے ان ملکوں میں پہونچ چکے تھے اسی بنا پر کئی مورخین کی رائے ہے کہ ہندی اوزار اور ہتھیار ہی ان ملکوں میں استعمال کئے گئے تھے۔ اسی دور کے لگ بھگ ملکۂ سبا کا حضرت سلیمانؑ کے لئے بہت سی دوسری اشیاء کے ساتھ ہندی فولاد کی مصنوعات کے لے جانے کا ذکر بھی تذکروں میں مذکور ہے[1] اگر فلسطینی علاقہ میں اوزار سازی کی کوئی اجتماعی صورت ہوتی تو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے زمانہ میں اسرائیلی تاجر جنوبی ہند کے ایک ساحلی علاقہ کیرالا سے ہندی تلواریں یمنی اور فلسطینی علاقوں تک نہ لے جاتے۔

آلات جراحی کی صنعت بھی ڈراوڑی عہد میں اچھی حالت میں تھی۔ جدید تحقیق و تلاش کے نتیجہ میں تین ہزار سال قبل مسیح سے بھی بہت پہلے ہندوستان میں آلات جراحی کے استعمال کا ثبوت ملتا ہے چنانچہ شروع اگست ۱۹۶۲ء میں کوچین میں پنڈت نہرو کے ہاتھوں آیورویدک ریسرچ سنٹر کا جو افتتاح ہوا تھا اس میں بمبئی سے قدیم آلات جراحی کے جو نمونے مشہور وید پنڈت شو شرما کے ذریعہ بھیجے گئے تھے وہ قدیم آیورویدک لٹریچر کے بتائے ہوئے طریقوں کے عین مطابق تھے پنڈت شرما نے ان آلات جراحی کی تشریح کرتے ہوئے ڈراوڑی دور کے ویدوں کو سرجری کے فن میں بھی باکمال بتایا تھا۔ آلات جراحی کی نمائش کے موقع پر چین۔ جاپان۔ برما۔ سعودی عرب اور مشرق وسطیٰ کے بعض دوسرے ممالک نے بھی ہند کے ان آلات جراحی کو اس نمائش میں بھجوایا تھا جو کسی نہ کسی طرح عہد قدیم میں ان ممالک میں پہونچے تھے۔

فن جہاز سازی: — ڈراوڑوں کا ذوق جہاز سازی اور جہاز رانی بھی اب پردۂ خفا سے نکل کر منظر عام پر آگیا ہے۔ کھدائیوں کے دوران کشتیوں کے کچھ ایسے نمونے دستیاب ہوئے ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جہاز سازی اور جہاز رانی میں وہ کتنے ماہر تھے۔ جسٹس دھون نے الٰہ آباد یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ایک بہت بڑی بحری گودی کی تصویر بھی حاضرین جلسہ کو دکھائی تھی جو حال ہی میں لوتھل (سوراشٹر) میں کھدائیوں کے دوران برآمد ہوئی ہے موصوف کے نزدیک جہاز سازی اور جہاز رانی کا ذوق اہل ہند کو ورثہ میں ملتا چلا آیا ہے۔ جس کا سلسلہ اٹھارہویں صدی عیسوی تک باقی رہا۔ اس خیال کی تصدیق پروفیسر ڈنکرو کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ :—

اہل ہند مسیح سے ہزاروں سال پہلے جہاز سازی اور جہاز رانی میں یکتائے روزگار تھے۔

ریشم سازی: — ریشم کے کیڑے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آج سے تقریباً تین ہزار سال قبل چینیوں نے ریشم کا کیڑا

---

[1] عہد قدیم مشرق و مغرب [2] عرب و ہند کے تعلقات

دریافت کیا تھا لیکن سنسکرت کے قدیم گرنتھوں میں اس طرح کا ذکر موجود ہے جس سے یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آریوں سے بہت پہلے یہ صنعت سرزمین ہند میں موجود تھی۔ ہند میں ریشم کے کیڑے پالنے کی صنعت سب سے پہلے دریائے برہم پتر کی وادی اور دریائے گنگا کے درمیان واقع خطہ میں قائم ہوئی تھی اس لئے یہ خیال کر لیا گیا کہ ابتدا میں یہ صنعت باہر سے لائی گئی۔ حالانکہ خود چین میں یہ صنعت ہندوستان ہی سے پہونچی یعنی گنگا کی وادی سے یہ صنعت آہستہ آہستہ پچھم کی جانب بڑھتی گئی اور وسطی ایشیا کے اکثر علاقوں میں پھیل کر چین خاص تک پہونچ گئی۔

ڈراوڑوں کو صنعت کاری کا جو ذوق فطرت کی جانب سے ملا تھا وہ اُن کی سیاسی مرکزیت کے ختم ہونے کے بعد بھی کم نہ ہوا۔ اگرچہ آریوں کی آمد کے بعد شمالی اور مغربی ہند میں ان کا اقتدار ختم ہو چکا تھا لیکن انھوں نے جنوبی ہند میں پانڈیا چولا اور چیرا کے ناموں سے تین حکومتیں قائم کر لی تھیں پانڈیا سلطنت کا سب سے زیادہ دَور دَورہ تھا۔ اس حکومت کے کئی شہروں کی صنعتی اور تجارتی شہرت عرب حلقوں سے آگے بڑھ کر مصر اور بحر روم کے ساحلی علاقوں تک پہونچ چکی تھی ان کی مصنوعات کا بڑا حصہ آبی شاہراہوں سے بیرون ہند جایا کرتا تھا۔ چیرا کا سکہ کیرالا کے سمندری ساحل کو کن سے لے کر راس کماری تک جاری تھا۔ کوچین اس علاقہ کی راجدھانی تھی جس کے کھنڈرات آج بھی اس کے دور اقبال کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں بعد کو چیرا حکمرانوں نے ترری کلم کو اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا جو اپنی شاندار عمارتوں اور حسین مناظر کے اعتبار سے مشہور خلائق تھا۔

غرض ڈراوڑ پہلی صدی عیسوی تک جنوبی ہند کا خام اور پختہ سامان خلیج فارس کے راستہ جزیرہ نما عرب کے جنوبی ساحلوں تک لے جایا کرتے تھے اور وہاں سے یہ سامان شام اور اسکندریہ پہنچا کرتا تھا وہاں سے مغربی ممالک کے تاجر اس سامان کو اپنے ملکوں تک لے جایا کرتے تھے۔

اہل روما کو دکھنی ہندوستان کی آبدار تلواریں بہت ہی پسند تھیں، انھوں نے اس دور میں بحر قلزم کے راستہ دکھنی ہندوستان سے تجارتی تعلقات بھی قائم کر رکھے تھے جس کی تصدیق قیصر اغسطس اور قیصر تابریس کے اُن طلائی اور نقرئی سکوں سے ہوتی ہے جو دکھنی ہندوستان کے مختلف حصوں میں پائے گئے ہیں۔ قدیم رومی مصنفین کی مختلف کتابوں سے بھی پانڈیا سلطنت کے ایک راجہ پنڈیون کے قیصر روم کو ہندی مصنوعات کے تحائف بھیجنے کی تصدیق ہوتی ہے۔

ڈاکٹر محمد اسلام

جگر کے نقاد

بسلسلہ گذشتہ ماہ ستمبر ۱۹۶۶ء

شعلۂ طور کے بعد جگر نے جو غزلیں یا نظمیں کہیں وہ اس زمانے کے مختلف رسائل و جرائد میں برابر شائع ہوتی رہیں اور انپر وقتاً فوقتاً تنقید بھی ہوتی رہی۔ "شعلۂ طور" کے بعد جگر کے کلام کا مجموعہ "آتشِ گل" ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا اس کے شائع ہونے سے پہلے اور بعد کو بھی جگر کے پورے کلام یعنی "داغِ جگر" "شعلۂ طور" اور "آتشِ گل" پر خوب خوب تیر و نشتر چلائے گئے صحیح اور غلط دونوں طرح کی تنقیدیں کی گئیں اس لئے اب دیکھنا یہ چاہیئے کہ مجموعی حیثیت سے کس کس نقاد نے منصفانہ اور ایماندارانہ حد تک جگر کے کلام پر صحیح تنقید کی ہے اور کس نے غلط۔ پہلے ان حضرات کی تنقید کا جائزہ لیا جائے جنھوں نے جگر کے کلام پر خلوص دل سے تنقید کی ہے۔

اس سلسلے میں ہم پہلے کلیم الدین کا بیان دیکھیں گے کہ اس میں کس حد تک صداقت ہے ان کا یہ بیان صحیح ہے کہ :—

جگر کے شعر داغ کی صفائی، سادگی، سلاست، روانی، رنگینی تو رکھتے ہیں لیکن داغ کی تازگی، شوخی، معاملہ بندی، بیساختگی نہیں رکھتے ۔ ۔ ۔ ۔ جگر کے یہاں حسن و عشق دونوں کا ایک برگزیدہ تصور ہے محبت ان کے نزدیک ایک تخلیقی اور تعمیری صلاحیت ہے جو زندگی کے جوبن کو نکھارتی اور سنوارتی ہے عشق پرستار ہونے ہوئے بھی لائق پرستش ہے حسن اس وقت تک کامل نہیں ہے جب تک اس میں عشق کی شوخ نگاہیں شامل نہ ہو جائیں محبوب کے بغیر زندگی گذارنا ایک گناہ ہے فیضانِ محبت عام سہی مگر عرفانِ محبت عام نہیں ہے[1]

مجھے کلیم الدین کے اس بیان کے متعلق صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر کلیم الدین صاحب جگر کے یہاں داغ کی تازگی و بیساختگی، و معاملہ بندی وغیرہ نہ تلاش کرتے تو بہتر تھا۔ جہاں تک جگر کے تصورِ محبت کا تعلق ہے اس کی انھوں نے بہت جامع تعریف کی ہے اور انھیں کے اشعار کو نثر میں بیان کر دیا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا یہ بیان بھی صحیح ہے کہ :—

جگر عشق کے غلبہ میں محبوب کی عفت کو کبھی نہیں فراموش کرتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے عام شعرا کے محبوب سے دوستی کرنے کی خواہش ہم میں آپ میں شکل سے پیدا ہوگی جگر کے محبوب کو ہر شخص اپنانا چاہے گا اردو شاعری کو یہ زاویہ جگر نے دیا ۔ ۔ ۔ ۔

---

[1] اردو شاعری پر ایک نظر (حصہ دوم) مطبوعہ ۱۹۵۲ء صفحہ ۲۵۰-۲۵۱

جگر کے یہاں جذبہ کی شدت ہے اسی نے تخیل کی کمی .... جگر کی شاعری کو دیکھ کر مجھے اکثر محسوس ہوا کہ یہ شخص شراب ترک کئے بغیر نہ رہے گا..... ... جگر کی شاعری میں وہ عناصر ہیں جو اس دور کے آشوب دانش میں غزل کو تب و تاب دیتے رہیں گے۔[1]

رشید صاحب کے اس بیان کی صداقت کے لئے شعلۂ طور اور آتش گل سے چند منتخب اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

عشق کو تھا کب سے اپنی خشک دامانی کا رنج — ناگہاں آنکھوں کو اشکوں کا سلام آ ہی گیا

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں آتی — وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

مری رندی بھی کیا رندی مری مستی بھی کیا مستی — مری توبہ بھی بن جاتی ہے میخانہ بجام اکثر

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر — جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

آپڑا کچھ وقت ایسا گردش ایام سے — زندگی شرما رہی ہے زندگی کے نام سے

بہت حسین سہی صحبتیں گلوں کی مگر — وہ زندگی ہے جو کانٹوں کے درمیاں گزرے

مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں آل احمد سرور کا بیان بھی صحیح معلوم ہوتا ہے جس میں انھوں نے آتش گل کے بارے میں لکھا ہے کہ:-

"اس نئے مجموعہ میں جو ایک طرح سے جگر کے عالم ہوش کا کلام ہے جگر کی عشقیہ شاعری میں گہرائی اور حقیقت نظر آتی ہے اس کی وجہ سے ان کی ردانیت و نیم ہوگئی ہے اور ان کا ادبی مرتبہ مستحکم   انھوں نے عشق کیا ہے اور اس عشق کی آگ میں جلنے اور پگھلنے سے ان کی آواز میں لے اور ان کی شخصیت میں گداز پیدا ہو گیا ہے ان کے عشق نے انھیں اس دنیا کے حسن اور حسینوں سے عشق کرنا سکھایا ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس مجازی حسن میں انھیں گہرے ابتدائی نقوش کی وجہ سے ایک حسن حقیقی کی جھلک نظر آتی ہے ... جگر مزاج کے اعتبار سے جمال پرست ہیں وہ حسن کے پجاری ہیں اور حسن کے ادا شناس ان کے عشق نے انھیں زندگی کے ہر قسم کے کامیاب اور ناکامیاب تجربات دیئے ہیں۔ جگر کے یہاں ... چاہنے اور چاہے جانے کی لذت ہے ...."

جگر کی شاعری پڑھے لکھے عوام کی سمجھ میں آسکتی ہے ان کے جذبات کی دھڑکن اس میں موجود ہے ان کی داستان حیات کے نقوش اس میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان کی محرومیوں اور کامرانیوں ان کے عیش و غم سے اس میں زندگی آئی ہے....

جگر کے یہاں جو رنگ مشاعرہ یا رنگ محفل ہے اسے بھی بری چیز نہیں سمجھتا۔ ترقی پسندوں کے ایک بہت بڑے مشاعرے میں جو نومبر ۱۹۴۵ء میں لکھنؤ میں ہوا تھا جگر کی ایک غزل کے سامنے دوسرے شعرا کی نظمیں اور غزلیں بلا وجہ ماند

---

[1] آتش گل مطبوعہ ۱۹۵۸ء صفحہ ۳۲ تا ۳۷

نہیں پڑ گئی تھیں۔ اس غزل کا مطلع یہ ہے ؎

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آجکل　　شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل

اس غزل میں جسے نظم سمجھا گیا ہے جگر نے ایک زندہ احساس کا ثبوت دیا ہے عمر کی پختگی اور جذباتی طوفان کے تھپیڑوں نے جگر کو فرار نہیں سکھایا، اُسے زندگی کے دکھ درد سے قریب کر دیا ان کے غم میں غمِ زمانہ آ گیا..... جگر کے یہاں عشق کی تغیبات بھی ملتی ہیں..... جگر کے یہاں محبت کا تصور ایک پاکیزہ اور لطیف تصور ہے مگر وہ تصور زندگی سے دور نہیں لے جاتا زندگی کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے جگر کا جنوں حوصلہ اور جد و جہد سکھاتا ہے جگر کے شبستان میں محبوب کے لطف و کرم سے روشنی ہے جگر نے خود بھی محبت کی ہے اور اُن سے محبت بھی کی گئی ہے جگر کے لطیف نشتروں سے لطف اٹھانے کے لئے اردو شاعری کی رمزیت اور اشاریت کا علم ضروری ہے جگر کے رومانی تصور سے حقیقت رنگین ہو جاتی ہے[1]

اثر لکھنوی کا یہ خیال ہے کہ :- جگر کا والہانہ انداز فقید المثل ہے[2]

اثر لکھنوی نے جگر کے کلام پر کچھ اعتراضات[3] بھی کئے ہیں جن میں سے بعض صحیح بھی ہیں طوالت سے بچنے کے لئے یہاں صرف ایک شعر پر اکتفا کیا جائے گا جگر کے اس شعر کے متعلق اثر صاحب نے صحیح لکھا ہے ؎

میں شکوہ بلب تھا مجھے یہ بھی نہ رہا یاد　　شاید کہ مرے بھولنے والے نے کیا یاد

اثر :- آپ شکوہ بلب تھے اس حالت میں بھول گئے کہ شاید بھولنے والے نے آپ کو یاد کیا۔ دونوں مصرعوں میں کیا ربط ہے میرے علم سے بالاتر ہے پہلے ہچکیاں آنا کسی کے یاد کرنے کی علامت سمجھی جاتی تھی یہاں زبان پر شکوہ آنا یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ شاید میرے بھولنے والے نے مجھے یاد کیا مگر ہنگام شکوہ یہ بھی یاد نہ رہا۔ شعر اپنی موجودہ صورت میں مہمل اور بے معنی ہے[4]

جگر کے کلام کے گزشتہ انتخاب کی روشنی میں ڈاکٹر محمد عقیل کی یہ رائے بھی ملاحظہ ہو وہ لکھتے ہیں کہ :-

ان کی شاعری میں رجائیت کا پرتو ہے دل گھلا دینے والے الفاظ اور جذبات غزل میں سمو کر جگر مرد رہنے کی صلاح نہیں دیتے بلکہ زندگی کی رنگا رنگ دلچسپیوں سے ہمیں وابستہ کر دیتے ہیں۔ .. جگر کی لذت اور مزہ میں ایک وقار ہے تجسس ملی ہوئی تڑپ ہے جسے صرف وصل کی شادکامیوں تک لے جا کر ختم کر دینے والا جگر کے احساسات اور فن کو نہ صرف نہیں سمجھ سکتا بلکہ ان کی توہین بھی کرتا ہے جگر جذبات کے شاعر ضرور رہیں مگر سستے جذبات کے نہیں[5]

---

[1] آتش گل مطبوعہ ۱۹۵۵ء صفحہ ۴ تا ۲۵ [2] اثر کے تنقیدی مضامین صفحہ ۱۶۰ [3] اثر نے جگر کے کلام پر جو اعتراضات کئے تھے ان کا جواب "مبصر" اور اسلم رضوی کی طرف سے "قومی آواز" مورخہ ۲۶ جنوری ۱۹۵۹ء میں اور ایک دوسری تاریخ کے "قومی آواز" میں جس کی نقل راقم کے پاس محفوظ ہے تاریخ لکھنا بھول گیا تھا) دیا گیا ہے (احمد اسلم واحدی نے ۲ فروری ۱۹۵۹ء کے "قومی آواز" میں جواب الجواب دیا ہے جو حضرات تفصیل چاہتے ہوں مندرجہ بالا اخبارات دیکھ سکتے ہیں۔ [4] "قومی آواز" ضمیمہ ۲۶ جنوری ۱۹۵۹ء صفحہ ۲

[5] "فروغ اردو" فروری و مارچ ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۰۶

اس بیان کے متعلق مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ ڈاکٹر عقیل کا یہ بیان "آتشِ گل" کے لئے صحیح ہے۔ اس سے پہلے کے کلام میں جگر کے یہاں بعض کم درجہ کے جذباتی اشعار بھی ملتے ہیں۔

جگر کی شاعری اور شخصیت پر سب سے عظیم اور زبردست حملہ علامہ نیاز فتحپوری نے کیا ہے نیاز صاحب نے جگر کے کلام پر تنقید تو ۱۹۳۶ء ہی سے شروع کر دی تھی اور جولائی ۱۹۶۱ء میں "نگار" کا جگر نمبر نکال کر دم لیا اس سے پہلے انھوں نے جگر کے کلام پر جو اعتراضات کئے تھے انکو اپنی کتاب " مالہٗ وما علیہ" میں شامل کر دیا تھا لیکن ۱۹۵۸ء کے کراچی کے مشاعرے میں صدارت کے جھگڑے کی بنا پر (جس کا اعتراف انھوں نے خود "نگار" جولائی ۱۹۶۱ء میں صفحہ ۳ پر کیا ہے) ایک جگر نمبر نکالا جو ان کے ایک طویل مضمون کی حیثیت رکھتا ہے اس میں سوائے نیاز کے اس مضمون کے اور کسی کا کوئی مضمون شامل نہیں ہے۔

اس نمبر میں نیاز نے کراچی کے مشاعرے کے عناد کا بڑی سادہ لوحی سے ابتدا ہی میں اعتراف کر لیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ نمبر تنقید کے لئے نہیں بلکہ جگر سے اس عناد کا بدلہ لینے کے لئے نکالا گیا ہے نیاز کے اس جگر نمبر پر بڑے سخت جوابات بھی دیئے گئے خصوصًا ماہر القادری نے تو ان کے جواب میں یہاں تک لکھ دیا کہ :-

> اگر میر انیس کے زمانے میں یا ان کے بعد کوئی ناقد یہ کہتا کہ زبانی ان کا کلام سُن کر مجھ سے داد لیے بغیر نہ رہا جاتا مگر گھر واپس آ کر سوچتا تو مجھے تعجب ہوتا کہ میں نے انیس کے کلام کو کیوں سراہا؛ تو اس قسم کے ناقد کے منہ پر اربابِ ذوق تھوک دیتے [1]

نیاز نے جو تنقید " مالہٗ وما علیہ" میں کی ہے وہ زیادہ قابلِ اعتماد ہے کیونکہ اس زمانے میں جگر اور نیاز سے کوئی ذاتی عناد نہیں تھا اس لئے تنقید میں اسی حقیقت کی زیادہ اہمیت ہے ساتھ ہی ساتھ ایسا بھی نہیں ہے کہ نیاز نے جولائی ۱۹۶۱ء میں جو اعتراضات کئے ہیں سب یکسر غلط ہیں۔ اس میں بھی نیاز کے بعض اعتراضات صحیح ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نیاز کے دونوں اعتراضات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور اعتراض جس حد تک صحیح ہوں انکا اعتراف کر لیا جائے اور اگر اعتراضات غلط ہوں تو ان کی تردید کر دی جائے ۔

نیاز کے اعتراضات میں حقیقت کی تلاش کے لئے بھی ایک کتاب کی ضرورت ہے کیونکہ نیاز نے جو کچھ لکھا ہے اس کا جواب [2] ماہر القادری، رضا انصاری، تسکین قریشی، شہزاد صباحی، سرورش عسکری اور احمد رفاعی نے اتنا طویل دیا ہے کہ ان سب کا جائزہ چند صفحات میں لے لینا کارے دارد ہے اس لئے طوالت سے بچنے کے لئے ہم پہلے نیاز کی معقول رایوں کا جائزہ لینگے

---

[1] فروغ اردو، دسمبر ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۷ - ۱۸

[2] تفصیل کیلئے دیکھئے "نگار" جولائی ۱۹۶۱ء فروغ اردو دسمبر ۱۹۶۱ء و جنوری ۱۹۶۲ء "قومی آواز" ۳۰ جولائی ۱۹۶۱ء ۱۷ جون ۱۹۶۲ء ۲۴ جون ۱۹۶۲ء یکم جولائی ۱۹۶۲ء و ۸ جولائی ۱۹۶۲ء "ترجمان" کا عہد اکتوبر ۱۹۶۱ء اور "تحریک" اکتوبر ۱۹۶۲ء

نیازؔ نے جگرؔ کے بعض اشعار پر بہت ہی مناسب اعتراض کیا ہے مثلاً ان کا ایک شعر ہے ؎

آتے ہیں پھر وہ عزم دل وجاں کئے ہوئے ۔۔۔ پلکوں کی اوٹ حشر کا ساماں کئے ہوئے

جس کے متعلق نیازؔ کی یہ رائے صحیح ہے کہ :-

پہلے مصرعہ میں "عزم دل وجاں" کی ترکیب اس معنی میں جو شاعر کا مقصود ہے، صحیح نہیں عزم کے معنے "ارادہ وقصد" کے ہیں اور ارادہ کسی فعل کا ہوتا ہے جو شعر میں ظاہر نہیں کیا گیا۔

شاعر کا مقصود یہ کہنا ہے کہ وہ پھر دل وجاں کو تباہ کرنے یا لوٹنے کا عزم کئے ہوئے آتے ہیں، اور یہ مفہوم محض "عزم دل وجاں" کہنے سے پورا نہیں ہوتا۔ اگر "عزم غارتِ دل وجاں" لکھتے یا کوئی اور لفظ غارت کے ہم معنی استعمال کرتے تو یہ مفہوم پیدا ہو سکتا تھا اساتذہ فارسی واردو نے عزم کا لفظ بغیر کسی فعل کے اظہار کے کبھی نہیں کیا۔

دوسرے مصرعے میں پلکوں کی اوٹ کا فقرہ بالکل بے ضرورت استعمال ہوا ہے محبوب کی ہر ادا "حشر ساماں" ہوتی ہے۔ "پلکوں کے اوٹ" کی تخصیص کیوں ؟ اور اگر یہ تخصیص کی تھی تو پہلے مصرعہ میں چشم شرگیں یا نگاہِ حجاب آلود کی قسم کا کوئی فقرہ ہوتا تو بیشک پلکوں کی اوٹ کا ذکر مناسب تھا اگر آنے کی رعایت سے جس میں رفتار کا مفہوم پنہاں ہے دوسرا مصرعہ یوں ہوتا :

ہر ہر قدم پہ حشر کا ساماں کئے ہوئے

تو یہ نقص نہ پیدا ہوتا۔[1]

نیازؔ صاحب نے جگرؔ کے ایک دوسرے شعر ؎

جلوۂ دوست یہ آہستہ خرامی تا چند ۔۔۔ ندیاں سوکھ چلیں شوق میں طوفانوں کے

کے لئے صحیح لکھا ہے کہ :-

جلوہ کے لئے "آہستہ خرامی" کا استعمال بالکل غیر مناسب ہے۔ بجائے اس کے "اندازِ تغافل" بہتر ہوتا۔ دوسرے مصرعے میں ندیوں سے شاعر کی کیا مراد ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور انکا طوفانوں کے شوق میں سوکھ جانا اس سے زیادہ ناقابلِ فہم بات ہے اگر یہ کہا جاتا کہ سوکھی ندیاں ابتک طوفانوں کے انتظار میں ہیں تو بیشک مفہوم پیدا ہو سکتا تھا۔[2]

جگرؔ صاحب کا ایک شعر ہے ؎

رگ رگ میں ایک برقِ خراماں لئے ہوئے ۔۔۔ دل ہے ہوائے منزلِ جاناں لئے ہوئے

جس کے متعلق نیازؔ نے صحیح لکھا ہے کہ :-

پہلے مطلع کا دوسرا مصرعہ اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے لیکن پہلے مصرعہ سے کوئی ربط نہیں شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ

۱؎ نگار، اپریل ۱۹۳۶ء صفحہ ۳۷ ۔۔۔ ۲؎ مالہ وما علیہ صفحہ ۵۵

"دل ہوا ہے منزلِ جاناں لئے ہوئے ہے اسی لئے اس کی رگ رگ میں بجلی دوڑ رہی ہے"

جس طرح دوسرے مصرعہ میں ہے کہ اظہار سے جملہ پیدا کیا گیا ہے۔ اسی طرح پہلے مصرعہ میں بھی جملہ مکمل ہونا چاہیئے تھا مثلاً

یوں سرو گلرنگ میں ہے وہ برق خراماں لئے ہوئے۔

اور اسی کے ساتھ دوسرے مصرعہ کو پہلا اور پہلے کو دوسرا کر دیتے لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ برق خراماں کیا چیز ہے برق کی صفت خراماں کبھی نہیں ہو سکتی۔[1]

جگر کا ایک اور شعر ہے سے

ہر لحظہ اک سرور میسر لئے ہوئے   خود زندگی ہے بادہ و کوثر لئے ہوئے

جسکے لئے نیازؔ کی رائے صحیح ہے کہ:۔

تیسرے مطلع میں لفظ میسر کا استعمال درست نہیں اگر یہ "لئے ہوئے" سے متعلق ہے تو میسر لینا کوئی محاورہ نہیں اور اگر سرور میسر کے معنی سرور حاصلہ کے ہوں تو لئے ہوئے کے ساتھ وہ بالکل بے کار ہے۔ عربی میں میسر ذو یسار اور غنی کے معنی میں آتا ہے لیکن اردو میں اس کا استعمال ہمیشہ حاصل شدہ کے مفہوم میں کیا جاتا ہے۔[2]

نیازؔ نے جگرؔ کے کلام کی بعض خصوصیات کو سراہا بھی ہے اور بجا طور پر لکھا ہے کہ:۔

مرے شعر میں نزاکتیں، مری نظم میں ہیں لطافتیں، مری فکر میں کہیں اے جگرؔ ادب کثیف کی جا نہیں

اس سے بے شک میں متفق ہوں اور یقیناً ان کا کلام "سخافت و دنائت" سے بالکل پاک ہے۔ اس میں نزاکتیں بھی ہیں اور لطافتیں بھی، لیکن افسوس ہے کہ لغزشوں کی بھی کمی نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جگر خالص دنیائے حسن و عشق کے شاعر تھے وہ دیارِ حسن کے بڑے پجاری تھے اور گو عشق کی راہیں بھی انھیں بخوبی معلوم تھیں لیکن انکا مسلکِ عشق فتادگی و بیچارگی یا عجز و سپردگی نہ تھا۔

جگرؔ کا عشق گویا ایک مطالبہ تھا استحقاقِ ذاتی کا اور طلب حق پر انھیں اصرار بھی تھا اس لئے ان کے تصورِ عشق میں ہلکی سی خسروانہ کیفیت بھی نظر آتی ہے۔ ... وہ صرف مرنے کے نہیں بلکہ مار رکھنے کے بھی قائل تھے بلکہ وہ حسن سے کبھی "دو بدو" بھی ہو جاتے تھے اور صاف صاف کہہ دیتے تھے کہ۔

محبت میں ہم تو جئے ہیں جئیں گے   وہ ہوں گے کوئی اور مر جانے والے

الغرض جگرؔ کی یہ خود اعتمادی کہ:۔

وہ عشق ہی نہیں ہو وہ دل ہی نہیں جگرؔ   لبیک خود کہا نہ جسے حسنِ یار نے

بڑی دلچسپ چیز ہے اور اپنے ہمعصر شعراء کے مقابلہ میں ان کے یہاں زیادہ پائی جاتی ہے۔ ہر چند یہ تیور ہم کو یاس یگانہ کے

---

[1] مالہٗ و ماعلیہٗ صفحہ ۱۱۰ [2] مالہٗ و ماعلیہٗ صفحہ ۱۵۹

کلام میں بھی نظر آتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ یاسؔ (یگانہ) کے یہاں اس نے ذرا خشونت کی شکل اختیار کر لی ہے اور جگرؔ کے یہاں نرمی و لطافت زیادہ ہے۔[1]

اس تحریر کے بعد نیازؔ نے جگرؔ کے اشعار پر اعتراضات شروع کیے ہیں جن میں سے بعض اعتراضات صحیح ہیں جن کی مثالیں پیشتر دی جا چکی ہیں جگرؔ کا ایک شعر اور ملاحظہ ہو ؎

شورشِ درد الاماں گردشِ دہر الحذر　　بہکے ہوئے سے قافلے سہمی ہوئی سی رہگذر

اس پر نیازؔ نے صحیح اعتراض کیا ہے کہ:—

رہگذر کو سہمی ہوئی کہنا بے معنی بات ہے سہنے کا تعلق صرف احساس سے ہے اور رہگذر میں احساس کہاں۔ اس کی جگہ اجڑی ہوئی لکھ دیتے تو بھی غنیمت تھا۔[2]

جگرؔ کے ایک اور شعر پر بھی نیازؔ کا اعتراض صحیح ہے۔ شعر ہے ؎

کیا قہر تھا کہ پاس ہی دل کے لگی تھی آگ　　اندھیر ہے کہ دیدۂ تر دیکھتے رہے

نیازؔ صاحب کا اعتراض ہے:—

دونوں مصرعے پوری طرح مربوط نہیں۔ اول تو "پاس ہی دل کے" کی جگہ "پاس ہی دل میں" کہنا چاہیے تھا تاکہ یہ معلوم کرنے کی ضرورت نہ ہوتی کہ دل کے پاس کہاں آگ لگی تھی اور دیدۂ تر سے اس کو کیا تعلق ہے علاوہ اس کے "کیا قہر تھا" کہنے کے بعد "اندھیر ہے" کہنے کا موقع نہ تھا شعر یوں ہونا چاہیے تھا۔

کیا قہر ہے کہ پاس ہی دل میں لگی تھی آگ　　اور اس کو میرے دیدۂ تر دیکھتے رہے[3]

جگرؔ کے اس شعر ؎ ہر شے ہے تمام ناتمامی!　　اس میں ہی نہیں فراقِ دیدہ

پر بھی نیازؔ کا اعتراض صحیح ہے کہ:—

تمام ناتمامی بے معنی سی بات ہے اگر رنگِ ناتمامی کہا جاتا تو فراقِ دیدہ سے کچھ مناسبت بھی پیدا ہو جاتی اس مصرع کو یوں ہونا چاہیے:—

ہر شے کو ہے رنگِ ناتمامی[4]

آخر میں انکی یہ رائے بھی حقیقت پر مبنی ہے کہ "جگرؔ اس میں شک نہیں کافی ذہین انسان تھے بلند و پاکیزہ خیالات بھی ان کے ذہن میں آتے تھے لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں وہ بڑے لاابالی قسم کے انسان تھے اور ان کا یہی مزاج ان کی شاعری میں منتقل ہو گیا اس کے علاوہ ان کی ابتدائی تعلیم بھی معمولی تھی مطالعہ بھی وسیع نہ تھا اور اساتذہ کی صحبت بھی انکو میسر نہیں ہوئی . . . ان کے یہاں جوش و سرمستی اور ایک خاص والہانہ کیفیت ضرور پائی جاتی ہے جگرؔ کے یہاں سب سے بڑا عیب نقصِ بیان ہے اور اگر وہ اساتذہ کے کلام کا غائر مطالعہ کرتے یا انھیں ان اہلِ کمال کی صحبت نصیب ہوئی ہوتی جو علم بیان و معانی کے ماہر تھے تو غالباً یہ نقص ان کے کلام میں نہ پایا جاتا۔[5]

---

[1] نگار جولائی ۱۹۶۲ء صفحہ ۶ [2] نگار جولائی ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۱ [3] نگار جولائی ۱۹۶۲ء صفحہ ۹ [4] نگار جولائی ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۰ [5] نگار جولائی ۱۹۶۲ء صفحہ ۵

عمل اور کامیابی کے دس سال

آندھرا پردیش کے قیام کو ایک دہا یعنی دس سال کی مدت مکمل ہونے پر خوشیاں منانے میں ہم سب شریک اور متحد ہیں۔ یکم نومبر ۱۹۵۶ء کو آندھراؤں کی تاریخ میں ایک عظیم یادگار دن تھا اور ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۶ء تک کے دہے میں ریاست میں عزم و ایقان اور عمل کی محرک قوتوں کی بدولت سرگرمی اور ہل چل جاری رہی۔ ہمارے منصوبوں نے عوامی جوش اور جذبے کو بیدار کرتے ہوئے اور عوام کا تعاون حاصل کرتے ہوئے ہمارے فکر و خیال کو نئی وسعتیں بخشی ہیں۔

ہمارے منصوبوں میں اگر ایک طرف زرعی پیداوار بڑھانے پر زور دیا گیا ہے تو دوسری طرف صنعتی ترقی کیلئے بھی ضروری اسباب و وسائل مہیا کیئے گئے ہیں زراعت پر مسلسل زور دینا نہ صرف ریاستی نقطۂ نظر سے ضروری ہے۔ بلکہ اولین قومی ضرورتوں کا بھی یہی تقاضا ہے۔

اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ منصوبوں کے مجموعی رقمی خرچ کے پروگراموں کے لحاظ سے پہلے منصوبے کے تحت ریاست کی کامیابی (۱۰۱) فی صد دوسرے منصوبے کے تحت (۱۰۵) فی صد اور تیسرے منصوبے کے تحت (۱۱۵) فی صد رہی۔ حقیقت میں یہ ریکارڈ فخر و مباہات کے قابل ہے

پچھلے دہے میں جس میں دوسرے اور تیسرے پانچ سالہ منصوبوں کی مدتیں شامل ہیں برقی قوت کی ترقی پر جو زرعی اور صنعتی دونوں طرح کی ترقی کے لیے اولین شرط ہے (۱۰ ، ۱۲۶) کروڑ روپے خرچ کئے گئے۔ اس عرصے میں زراعت اور آبپاشی پر مجموعی طور پر (۴۰ ، ۲۶۶) کروڑ روپے خرچ کئے گئے ہیں۔ ریاست کے چوتھے پانچ سالہ منصوبے کے تحت (عارضی) مجموعی رقمی خرچ (۶۳۵) کروڑ روپے تجویز کیا گیا ہے جس میں زراعت، آبپاشی اور برقی قوت کے پروگراموں پر حسب معمول مسلسل زور دیا جائے گا اب ہم اعتماد اور بھروسہ کے ساتھ روشن تر مستقبل کی توقع کرسکتے ہیں جسکی بنیادیں یقین اور اخلاص کے ساتھ رکھی جا چکی ہیں۔

ہم نئے جوش و ولولے اور طاقت کے ساتھ ریاست کے قیام کے دوسرے دہے میں داخل ہو رہے ہیں اور اپنے آپ کو مادر وطن کی ہمہ جہتی خدمت کیلئے وقف کر لیتے ہیں۔

یہ پہلا کامیاب دہا ایک روشن مستقبل کی ضمانت دے رہا ہے۔

ٹی رام چندر راؤ ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش ! ! !

سلطان احمد صدیقی صاحب
ایم۔ کام

"روپیہ کی قیمت کی تخفیف کا تاریخی اور حقیقی پہلو"

دوسری جنگِ عظیم کے بھیانک اثرات کے بعد دنیا کے اکثر ممالک نے اپنے تباہ حال معاشی نظام کو درست کرنے اور اس کو استحکام بخشنے کے لئے کرنسی کے معاملوں میں باہمی رفاقت کا ارادہ کیا اور اسی نقطۂ نظر سے ایک بین الاقوامی مالی ادارہ قائم کیا جس کا صدر دفتر واشنگٹن میں رکھا گیا۔ اس بین الاقوامی مالی ادارہ نے ایک بین الاقوامی مالی معیار کو جنم دیا۔ اس معیار کا خاص جزو سونا ہی ہے لیکن پھر بھی کسی ملک کی کرنسی کا تبادلہ سونے میں نہیں ہوتا۔ بین الاقوامی مالی ادارہ نے سب سے پہلے اپنے ممبر ملکوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی اپنی کرنسی کی خارجی قدر سونے میں مقرر کریں تاکہ باہمی شرحِ مبادلہ کے مقرر کرنے میں آسانی ہو تجارت کو فروغ ہو۔ بھائی چارہ پیدا ہو اور رقومات کا تبادلہ باسانی ہو سکے چونکہ ہندوستان نے بھی اس بین الاقوامی ادارہ کی رکنیت قبول کر لی تھی اس لئے اس نے بھی حلقہ میں دوسرے ممالک کی طرح اپنے روپیہ کی خارجی قدر سونے میں مقرر کی جو اس وقت ایک روپیہ برابر ۴٫۱۸۶۶۲۱ گرین سونا تھی۔ اس کے بعد بین الاقوامی مالی ادارہ نے ہر ملک کی باہمی شرحِ مبادلہ ایک دوسرے کی کرنسی میں مقرر کر دی جس کے مطابق ہندوستان کا ایک روپیہ انگلستان کے ایک شلنگ چھ پنس اور امریکہ کے ۲۱ سینٹ کے برابر ہوا یا یوں سمجھ لیجئے کہ ایک پونڈ کی قیمت ہندوستان کے تیرہ روپیہ ساڑھے پانچ آنے اور ایک ڈالر کی قیمت ہندوستان کے تین روپیہ پانچ آنے کے برابر مقرر ہوئی اس طرح ہندوستانی روپیہ جو اس بین الاقوامی ادارہ کے وجود سے پہلے اسٹرلنگ کی وردہ کا محتاج تھا۔ سونے کے توسط سے دوسرے ممالک کی کرنسیوں سے راست متعلق ہو کر اسٹرلنگ کی قید سے آزاد ہو گیا۔

نومبر ۱۹۴۹ء میں حکومتِ برطانیہ نے اپنے حالات سے مجبور ہو کر ڈالر میں پونڈ کی قیمت تیس فیصد گھٹا دی جس سے ہندوستان کے سامنے یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا کہ وہ اپنے کو ڈالر سے متعلق رکھے یا اسٹرلنگ یعنی پونڈ سے کیونکہ اس وقت ہندوستان کی بیرونی تجارت زیادہ تر اسٹرلنگ والے علاقوں سے ہوتی تھی اس لئے اس نے بھی اسٹرلنگ کے ساتھ ساتھ چلنے کا فیصلہ کر لیا اور اس طرح ہندوستان نے بھی اسی شرح سے اپنے روپیہ کی قیمت ڈالر میں کم کر دی جس شرح سے اسٹرلنگ کی قیمت ڈالر میں گھٹائی گئی تھی اسی طرح ہندوستانی روپیہ کی قیمت میں بھی تیس فیصدی کی تخفیف ہو گئی۔ جس سے اسٹرلنگ کے ساتھ ہندوستانی روپیہ کی شرحِ مبادلہ وہی رہی جو پہلے تھی اور جو ۱۹۲۷ء سے چلی آ رہی تھی (ایک روپیہ برابر ایک شلنگ چھ پنس یا تیرہ روپیہ ساڑھے پانچ آنے برابر ایک پونڈ) لیکن ڈالر کی قیمت روپیہ میں بڑھ گئی اور ایک ڈالر جو تخفیف سے پہلے تین روپیہ پانچ آنے کے برابر تھا تخفیف کے بعد چار روپیہ چھتر نئے پیسے کے برابر ہو گیا۔

اب شاید یہ بات ... واضح ہو گئی ہو گی کہ روپیہ کی قیمت گھٹانے سے مراد غیر ملکی کرنسی مثلاً ڈالر، پونڈ، روبل وغیرہ کی شرحِ مبادلہ کی

ایسی تبدیلی ہے جس سے ہمیں غیر ملکی کرنسی کے بدلے میں زیادہ روپیہ دینا پڑتے ہیں اس طرح جو ملک بھی اپنی شرح مبادلہ میں ایسی تبدیلی کرتا ہے۔ اس کی کرنسی کی قیمت دوسرے ممالک کی کرنسی میں گر جاتی ہے۔

آزادی کے بعد ہمارے عظیم رہنما پنڈت جواہر لال نہرو نے جو ملک کے حالات اور وقت کے تقاضوں کی پوری واقفیت رکھتے تھے۔ ہندوستانی سماج کے ڈھانچے میں ایک بنیادی تبدیلی کرنے اور ہندوستان کی معاشی حالت بہتر بنانے کے لئے سوشلیسٹ سماج کی تعمیر کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ اور سوشلزم کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھانا شروع کیا۔ منصوبہ بندی اور صنعت بندی کے اقدامات کئے لیکن عملی وسائل کی خرابی کی وجہ سے وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا جو ہونا چاہئے تھا اس سے پہلے کہ ہمارا عظیم اور محبوب رہنما اس کا کوئی حل تجویز کرتا اسے موت کے مضبوط ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ غذائی بحران نے بھی ہمارے لئے مزید دشواریاں پیدا کر دیں اور ہمیں اس صورتِ حال سے نبٹنے کے لئے دوسرے ممالک سے غذائی اشیاء منگانی پڑیں جس سے ملکی مالیات پر بڑا زبردست بار پڑا۔ ابھی ہم اچھی طرح اس مسئلہ کو سلجھا بھی نہیں پائے تھے کہ ہماری سرحدوں پر جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور ہمیں اپنی مدافعت اور ملک کی سالمیت کیلئے دفاعی مورچوں کی ضروریات اور ان کے استحکام پر ایک بڑی رقم خرچ کرنا پڑی جس سے ہمارے پاس غیر ملکی زرمبادلہ خصوصی طور سے ڈالر اور اسٹرلنگ کی کمی پڑ گئی ہماری معاشی حالت پہلے سے زیادہ خراب ہو گئی اور اسکی اصلاح کے لئے پہلے سے زیادہ تیز اور سخت کارروائی ضروری ہو گئی۔

مزید براں منصوبہ بندی کا خرچ بھی ہمارے لئے پریشانی کا باعث ہوا۔ سترہ ارب ساٹھ کروڑ روپیہ کی غیر ملکی امداد اس مد میں ہم وصول کر چکے تھے پھر بھی چوتھا پلان ادھورا تھا۔ ابھی اس پلان کے منصوبوں کی تکمیل کے لئے ہمیں چوبیس[۱] ارب پچاس کروڑ روپیہ کی ضرورت تھی۔ اس طرح کل حساب چھیالیس ارب دس کروڑ روپیہ ہو جاتا تھا۔ چوتھے پلان کی تکمیل کے لئے غیر ملکی امداد حاصل کرنے کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں ان راستوں کو بھی تلاش کرنا تھا جن پر چل کر غیر ملکی امداد کا انحصار ختم ہو جائے۔ اِدھر عام خیال یہ ہو گیا تھا کہ ہندوستانی کرنسی کی قیمت گر چکی ہے۔ اس لئے بین الاقوامی بنک صنعتی اداروں۔ تاجرانہ برادری اور ایجنسیوں میں ہندوستانی معیشت کی طرف سے بداعتمادی پیدا ہوتی جا رہی تھی جس سے غیر ملکی امداد میں تخفیف کا ڈر پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے لئے بھی عملی قدم کی ضرورت تھی ورنہ ہماری معیشت کا گلا گھٹ کر رہ جاتا۔

ایک عام سوال جو اس وقت اٹھ کھڑا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے بیل مشن کی تجویز کو غیر ضروری سمجھ کر ٹال دیا تھا اور کیا ہم اس کو چند ماہ کے لئے ٹال نہیں سکتے تھے۔ اس کا جو جواب وزارت خزانہ کے نوٹ[۲] میں دیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اب ہم اس مسئلہ کو ٹال نہیں سکتے تھے کیونکہ تمام غیر ملکی امداد کی حصولی ہمارے اس فیصلہ پر منحصر ہو گئی تھی۔ ادھر ہمارے زرمبادلہ کی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ اگر ہم کو بڑی مقدار میں غیر ملکی امداد ملنے کی امید نہ ہو جاتی تو ہماری ملکی معیشت کو زبردست دھکا لگتا جبکہ درآمدی پابندیاں پہلے ہی سخت

---

۱ سہ روزہ نامہ دعوت دہلی ۱۷ جون ۱۹۶۶ء   ۲ نیشنل ہیرالڈ ۱۰ جون ۱۹۶۶ء

پیداوار کو بری طرح نقصان پہونچا رہی تھیں اور ہمارے زراعتی پروگرام بیزکھا وکی درآمد کے جو غیر ملکی امداد میں شامل تھی ترقی نہیں کرسکتے تھے ہم غیر ملکی امداد کی طرف سے ایسے وقت میں جبکہ ہیں پرانے قرضوں کی ادائیگی چوتھے پلان کی تکمیل اور دوسرے کاموں کے لئے نئے نئے قرضوں کی ضرورت تھی اس وقت تک کے لئے مایوس ہوگئے تھے جب تک کہ ہم اپنی برآمدی تجارت بڑھانے کے حالات نہیں پیدا کر لیتے اور ملکی معاشیات کے اُلجھے ہوئے گیسو سنوار نہیں لیتے یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ پچھلے دو سال سے ہماری برآمدی تجارت دن بدن کم ہوتی جا رہی تھی کیونکہ ہندوستان کا مال باہر کی منڈیوں میں جا کر دوسروں کے مقابلہ میں مہنگا پڑ رہا تھا۔

یہی وہ حالات تھے جنہوں نے بقول وزیر خزانہ جناب سچیندر چودھری ہمیں مجبور کیا کہ ہم ملکی مفاد کے پیش نظر اس راہ پہ قدم بڑھائیں۔ ہماری حکومت نے کافی غور و خوض کے بعد مجبوراً ۵ جون ۱۹۶۶ء کو اپنے روپیہ کی قیمت میں چھتیس اعشاریہ پانچ فیصد تخفیف منظور کرنے کا اہم فیصلہ کیا جس کا اطلاق ۶ جون ۱۹۶۶ء کو صبح دو بجے سے ہوا اور جس سے اب ایک روپیہ کی نئی قیمت ۱۱۸۵۱ ۰ گرین سونا مقرر ہوئی۔ یعنی ایک ڈالر کی قیمت چار روپیہ چھہتر پیسے سے بڑھکر ساڑھے سات روپیہ اور ایک پونڈ کی قیمت تیرہ روپیہ ساڑھے پانچ آنے کے بجائے اکیس روپیہ مقرر ہوئی۔ وزارت خزانہ کے سرکلر کے مطابق یہ فیصلہ لازمی تھا کیونکہ حقائق کو تسلیم کرنے بین الاقوامی بداعتمادی کو دور کرنے اور ملکی معیشت کو مضبوط کرنے کے لئے اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہ تھا۔[1]

اس فیصلہ کی اہمیت اس حقیقت سے باخبر ہونے کے بعد یقینی بڑھ جاتی ہے کہ یہ قدم اس وقت اُٹھایا گیا جبکہ جنرل الکشن قریب ہے اور جس میں کانگریس کی پوزیشن متاثر ہوسکتی ہے لیکن ہماری وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی نے بڑا ہی مصنفانہ جواب دیا ہے کہ قوم اور ملک الکشن کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہے اور ہمیں اپنی تنظیم (کانگریس) کے مقابلہ میں قوم کا بڑا فائدہ دیکھنا ہے۔[2] کاش یہی اسپرٹ۔ یہ جذبہ حب الوطنی ہمارے رہنمایان ملک و قوم میں بھی پیدا ہوسکتا۔

یہ دانشمندانہ اور سوچا سمجھا ہوا فیصلہ ہمارے ملک کی معیشت میں پڑی ہوئی یوں تو بہت سی گرہیں کھولنے میں معاون ہوگا اور اس سے ہماری معاشی اور اقتصادی حالت بہتر ہوگی لیکن خصوصی طور سے ملک کو روپیہ کی قیمت میں تخفیف کرنے سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوں گے۔

۱۔ ہندوستانی مصنوعات کی مانگ کم قیمت ہونے کی وجہ سے دوسرے ممالک میں بڑھیگی اس لئے یقینی طور سے ہماری برآمدی تجارت (جس کا ٹارگٹ چوتھے پلان میں اکیاون کروڑ ہے) بڑھ جائیگی اور ہمارا وہ مقصد پورا ہو جائیگا جس کی وجہ سے روپیہ کی قیمت میں تخفیف کی گئی ہے۔

۲۔ غیر ملکی تجارت میں کام آنے والی مصنوعات کی صنعتوں کے لئے غیر ملکی سرمایہ باسانی اور زیادہ تعداد میں حاصل ہوسکے گا۔

۳۔ غیر ملکی تجارتی ادارے اور کمپنیاں اپنا نفع اور پونجی ہندوستان سے باہر نہیں لے جاسکیں گی کیونکہ ایسا کرنے میں اُن کو

---

[1] نیشنل ہیرالڈ ۷ جون ۱۹۶۶ء

[2] نیشنل ہیرالڈ ۱۲ جون ۱۹۶۶ء

نقصان ہوگا اس لئے وہ اِس کو ہندوستان میں ہی لگا رہنے دینا پسند کرینگی اور اس طرح ۱۵ سے ۲۰ کروڑ روپیہ کا غیر ملکی زرِ مبادلہ پس انداز ہوسکے گا۔

۴۔ کم رقم سے زیادہ رقم کمانے کے اس اچھے موقع سے بیرونی ممالک فائدہ اٹھانے کے لئے ہماری طرف راغب ہونگے اور نئی نئی رقمیں ہماری ملکی صنعتوں میں لگنے کے لئے آوینگی۔

۵۔ بہت سے وہ صنعتی ادارہ (INDUSTRIAL UNIT) جو کچے مال اور مشینری کے پُرزوں کی درآمد کی کمی کی وجہ سے پوری طاقت سے کام نہیں کرسکتے تھے اب پیداوار بڑھاسکیں گے جس سے بڑھتی ہوئی قیمتوں کو روکا جاسکے گا۔

۶۔ برآمدی اشیاء کی مانگ کی زیادتی کی وجہ سے صنعت کاروں کو اپنی پیداوار بڑھانے، نئی صنعتوں کو شروع کرنے اور بہتر مال بنانے کے مواقع حاصل ہونگے۔

۷۔ زائد پیداوار کی وجہ سے لاگت کے صرفہ کو کم کرنے اور صحت مند مقابلے کے جذبہ کو ابھارنے میں مدد ملیگی۔

۸۔ غیر ملکی سیاح ہندوستان کی طرف راغب ہونگے کیونکہ اُن کا سیاحتی صرفہ کم ہوجائے گا۔

۹۔ غیر سرکاری اور غیر قانونی لین دین ختم ہوجائینگے۔ درآمدی اور برآمدی تجارت کرنے والے ہندوستانی تجار جو غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر ملک سے باہر قائم کررہے تھے وہ اب کم ور ہوجا ینگے۔

۱۰۔ سونے، گھڑیوں، کیمروں اور ٹرانزسٹروں کی جو اسمگلنگ ہورہی تھی وہ اب کم ہوجائیگی۔ کالادھن کم اکٹھا ہوگا اور معاشی نابرابری ختم ہوجائیگی۔ سونے کے گراں ہوجانے سے ملک میں گھریلو استعمال کیلئے سونے کی مانگ بھی کم ہوجائیگی۔

لیکن مندرجہ بالا فوائد کو دیکھکر یہ نتیجہ اخذ نہیں کرلینا چاہیئے کہ روپیہ کی قیمت میں تخفیف سے ملک کو نقصانات نہیں ہونگے نقصانات بھی ہوں گے جن پر پوری طرح سے غور کرلیا گیا ہے اور حکومت کو یہ اعتماد قوی حاصل ہوگیا ہے کہ وہ ان پر غالب آجائیگی جیسے اناج، کھاد، پٹرولیم، مٹی کا تیل وغیرہ درآمد کرنے پر زیادہ خرچ یقیناً آئے گا۔ لیکن حکومت ان مدوں پر ڈیوٹی بالکل معاف کرکے یا کم کرکے ایسا معقول انتظام کریگی کہ صارفین کو موجودہ قیمت سے زیادہ قیمت نہ دینا پڑے۔ اس یقین دہانی کے باوجود اس فیصلہ پر مختلف حلقوں میں جو اظہار خیال ہوا ہے وہ بھی نظر انداز کردینے کے قابل نہیں ہے اس لئے قارئین کے پیشِ نظر ہے۔

تجارتی حلقوں کی رائے[1]

۱۔ ہندوستانی فیڈریشن چیمبر آف کامرس اور انڈسٹری کے صدر جناب رتن بھائی بی ۔ این نے بلگریڈ میں اس فیصلہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ہماری موجودہ معاشی حالت میں یہ قدم بہت ہی حقیقی اور وقتی تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ بھی خواہش ظاہر کی کہ ملک کو غیر ملکی امداد پر انحصار کرنے کی غلطی زیادہ دن تک نہیں کرنی چاہیئے اور اس سے بچنا چاہیئے۔

۲۔ جناب ہیرالال ایچ بھگوتی صدر ایوانِ تجارت گجرات نے حکومت کی اُمیدوں کے مطابق برآمد بڑھنے پر شبہ ظاہر کیا کیونکہ اُن کے کہنے کے مطابق ہمارے پاس برآمدی مال بہت زیادہ تعداد میں نہیں ہے۔

[1] ماخوذ از الجمعیۃ ۱۳ جون ۱۹۶۶ء

۳۔ آل انڈیا یا آمدی ایوان تجارت کے صدر جناب کے۔ کے۔ سیٹھ نے کہا کہ اس کا فوری عمل درآمد ہندوستان کی بیرونی تجارت کرنے والی تجار قوم پر بہت گہرا ہوگا کیونکہ اگر باہری ممالک کے خریداروں نے اپنے فرمائشوں کا مال مہنگا پڑنے کی وجہ سے لینے سے انکار کر دیا تو نقصان کون برداشت کریگا۔

۴۔ جناب ایل۔این۔برلا نائب صدر فیڈریشن آف انڈین چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری نے کہا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سرکاری معاشی پالیسیاں بری طرح ناکام ہوگئی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر اب بھی ہم افراطِ زر کے نتائج سے سبق حاصل کر لیں تو ہمیں زیادہ دیر نہ ہوگی۔

۵۔ جناب جے۔ وی۔ سوامیا تجونو صدر مدراس اسٹاک ایکسچینج نے بھی یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ اس سے عارضی فائدہ ہو سکتا ہے جبکہ قیمتوں کے نرخ میں دوامًا زیادتی ہو سکتی ہے۔ نیز اس کے ذریعہ غیر ملکی امداد کی لگاتار موصولی کی یقین دہانی پر ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ یہ کہاں تک اندرونی پیداوار بڑھا سکیگی اور غیر ملکی امداد کو کہاں تک گھٹا سکیگی۔

۶۔ کانپور کے ایک مشہور دولتمند جناب پدم پت سنگھانیا نے اس فیصلہ کو بڑا ہی جرات آزما بتایا ہے۔

سیاسی حلقوں کی رائے :۔

بقول وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی یہ اختلاف رائے کا معاملہ ہے اس لئے جہاں دوسری پارٹیوں نے اس فیصلہ پر نکتہ چینی کی ہے وہاں کانگریس کے ممبروں نے بھی اس پر بھرپور تنقید کی ہے ملاحظہ فرمائیے۔ اظہار خیال کی آزادی۔

۱۔ شری کرشنا مینن نے کہا کہ اس فیصلہ سے وزیر خزانہ کی طرف سے جس قدر نفع کے دعوے کئے گئے ہیں وہ پورے نہ ہونگے۔[۱]

۲۔ جناب کرشنا چاری سابق وزیر خزانہ نے کہا کہ اس کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا۔

(یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ انھوں نے پہلے یہ صاف لفظوں میں کہا تھا کہ روپیہ کی قیمت میں تخفیف ہمارے مسائل کا حل نہیں ہے)

۳۔ جناب گوپالن کمیونسٹ لیڈر بائیں بازو نے کہا کہ ہندوستان دن بدن امریکی سامراجیت اور عالمی بینک کے دباؤ سے جھکتا جا رہا ہے

۴۔ جناب بھوپیش گپتا ہندوستانی کمیونسٹ لیڈر نے کہا کہ اس اقدام سے ہندوستان کی کھال اتر کر صرف ننگی ہڈیاں رہ جائینگی اور امریکی لوٹ کی رفتار بڑھ جائیگی۔

۵۔ وزیر ریلوے جناب ایس کے پاٹل نے اپنے نشریہ میں کہا کہ روپیہ کی قیمت میں تخفیف ملک کو معاشی کامیابی کی راہ پر زیادہ دور تک لے جائیگی۔ اس کے لئے سماجی اور معاشی نظم وضبط ہونا چاہیئے۔ پیداوار بڑھنی چاہیئے اور لاگت کو کم کرنا چاہیئے۔

۶۔ جناب آر وینکٹا رمن[۳] وزیر صنعتوں مدراس نے کہا کہ یہ فیصلہ سیاسی طور سے غیر معقول ([illegible]) اور معاشی طور سے

۱۔ نیشنل ہیرالڈ ۷ جون ۱۹۶۶ء ۲۔ ملک و ملت دہلی ۹ جون ۱۹۶۶ء ۳۔ نیشنل ہیرالڈ ۸ جون

بہتر نہیں ([illegible]) ہے اس کے نقصانات ظاہری فائدوں کے مقابلہ میں کافی وزنی ہوں گے۔

۷۔ جناب کے۔ کامراج صدر کانگریس کے قریبی حلقوں سے معلوم ہوا ہے کہ انھوں[1] نے بھی اس کی سخت مخالفت کی۔

۸۔ جناب وائی۔ بی چاون نے اپنے نشریہ میں اس کی تعریف[2] کرتے ہوئے کہا کہ یہ قدم ہماری معیشت کی تقدیر میں پڑی ہوئی گرہوں کو کھولیگا۔ پیداوار اور ترقی کی رفتار کو بڑھائیگا۔ اس قدم کے نہ اٹھانے سے ہماری معاشی ترقی رُک جاتی جو لوگوں کے لئے مصائب اور تکالیف کا باعث بنتی۔

۹۔ جناب سی[3]۔ بی۔ گپتا سابق وزیر اعلیٰ اتر پردیش نے بہت ہی سنجیدگی سے اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا انھوں نے اس مسئلہ پر کسی اختلاف میں جانا پسند نہ کرتے ہوئے اور اس کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ جب سے تخفیف ہوئی ہے ہمارے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ ہم اس کو ملک کے بہترین مفاد کے لئے عمل میں لائیں تاکہ ہندوستان کو دوبارہ اس کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

تعلیمی حلقوں کی رائے :۔

پروفیسر ایم[4]۔ وی۔ ماتھر وائس چانسلر راجستھان یونیورسٹی نے کہا کہ روپیہ کی قیمت میں ۳۶٫۵ فیصدی کی یکدم تخفیف بہ نسبت آہستہ آہستہ کے اچھی ہے۔ کیونکہ اگر ہمیں اطمینان ہو چکا تھا کہ اس قدم سے ملک کی معاشی حالت درست ہو سکتی ہے تو یہ اچھا تھا کہ اس کو کافی مدت کے بعد کیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ خود کفیلی اور خود اعتمادی کا یہ ایک آسان راستہ ہو سکتا ہے وہ اس بات سے بھی متفق ہیں کہ یہ قدم ملک کی برآمدی تجارت کو فروغ دیگا اور ملک میں نئے صنعتی اداروں کو جنم دیگا جس سے بیروزگاری کی لعنت کا خاتمہ ہو جائیگا اس سلسلہ میں اُن کا مشورہ ہے کہ اگر ہم اس قدم سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو جلد از جلد اپنی برآمدی تجارت کو اس قدر بڑھا دیں کہ وہ آسمان سے باتیں کرنے لگے کیونکہ دیر ہو جانے پر دوسرے ممالک ایسے حالات پیدا کر سکتے ہیں جس سے روپیہ کی نسبت میں تخفیف کے اثرات ختم ہو جائیں۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ ہمارے قرض کی ادائیگی پر اس فیصلہ کا اثر ضرور پڑیگا اور ہمیں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ روپیہ دینا پڑیگا۔ جس سے ٹیکسوں کی شرح میں اضافہ اور نئے ٹیکسوں کے لگائے جانے کا احتمال ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ہمارے وزیر خزانہ[5] جناب سچیندر چودھری نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس قدم سے غیر ملکی کرنسی کی شکل میں حاصل کئے ہوئے قرضوں کی نہ تو مجموعی رقم بڑھیگی اور نہ ہی سالانہ قسط کی ادائیگی پر کوئی بار پڑیگا۔ لیکن جہاں تک قرض کا تعلق روپیہ کی شکل سے ہے وہاں ضرور ادائیگی کا بوجھ بڑھ جائیگا۔ حقیقتاً درآمد کی قیمت بہ شکل روپیہ بڑھ جائیگی اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے غیر ملکی اخراجات بھی بڑھ جائینگے۔ لیکن جہاں یہ ہوگا وہاں بجٹ بہت سے ذرائع سے فائدہ حاصل کریگا جیسے اُن روایتی اشیاء پر برآمدی ڈیوٹی سے کافی رقم وصول ہوگی جن پر اتنے زائد مارجن ([illegible] Margin) سے بڑھا دینے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح باہری ممالک کی جو امداد ہمیں روپیہ کی شکل میں ملیگی وہ بھی بڑھ جائیگی۔ اس لئے بجٹ پر کوئی بُرا اثر نہیں

---

[1] نیشنل ہیرالڈ ۸ جون ۱۹۶۶ء [2] نیشنل ہیرالڈ ۱۰ جون ۱۹۶۶ [3] نیشنل ہیرالڈ ۸ جون [4] نیشنل ہیرالڈ ۷ جون ۱۹۶۶ء [5] نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ ۹ جون ۱۹۶۶ء

پڑیگا بلکہ درآمدی پالیسی میں اگر ڈھیل دے دی جائے تو بجٹ کو فائدہ ہی ہوگا۔

بنک کاروں کی رائے[1] :-

ریزرو بنک کے سابق گورنر جناب ایچ۔وی۔آر۔ اینگر نے میسور کے ایوانِ تجارت کی گولڈن جوبلی تقریبات میں تقریر کرتے ہوئے حکومت کو خبردار کیا کہ اگر فضول خرچی والے منصوبوں کی جن کے نتیجہ میں گھاٹے کے اقتصادی نظام کا بالکل ہی بے جا استعمال کیا گیا ہے روک تھام نہیں کی گئی تو روپیہ کی قیمت میں مزید تخفیف دو سال میں ضروری ہو جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ ساری صورت حال کا جس کے نتیجے میں روپیہ کی قیمت میں تخفیف ہوئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کیا جائے۔ حکومت کی پالیسیوں اور نظم ونسق میں اب تک کی جانے والی غلطیوں کی اصلاح ہو تاکہ ملک کو روپیہ کی قیمت میں مزید کمی کا کڑوا گھونٹ نہ پینا پڑے کیونکہ یہ مزید تخفیف نہ صرف ملک کیلئے تباہ کن ہوگی بلکہ ملک کو دنیا کے بہت سے دوسرے ملکوں کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا دیگی۔ (یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہماری حکومت نے اب فضول خرچی کے سدباب کا کافی غور پر تہیہ کرلیا ہے)

غیر ملکی پریس اور حکومتوں کی رائے[2] :-

غیر ملکی پریس اور حکومتوں نے حکومت ہند کے اس مدبرانہ فیصلہ کو سراہا ہے۔ اس کی ضرورت اور اس کے فوائد پر روشنی ڈالی ہے۔ خصوصی طور سے جناب چسٹر باولز امریکی سفیر متعینہ ہند کی وہ تقریر جو انھوں نے پریس کانفرنس بمبئی میں کی ہے قابل توجہ ہے۔ انھوں نے بڑی خوبصورتی سے اپنے فرائض کی انجام دہی کی ہے اور اس کے فوائد کی پشت پناہی میں کئی ملکوں کی مثالیں پیش کی ہیں۔ انھوں نے بتایا ہے کہ برطانیہ نے ۱۹۴۹ء میں یہی نسخہ استعمال کرکے نجات پائی تھی۔ یونان نے ۱۹۵۳ء میں اور یوگوسلاویہ نے ۱۹۶۱ء اور ۱۹۶۵ء میں یہی عمل کیا اور فائدہ اٹھایا یونان کی حکومت کے اس فیصلہ کے ٹھیک چار سال بعد اس کی غیر ملکی تجارت دوگنی ہوگئی اور دس سال بعد دوگنی کا دوگنی ہوگئی۔ اس چھوٹے سے ملک نے سیاحوں کی ایک بڑی تعداد کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی اور اس طرح غیر ملکی زرمبادلہ کی یافت یوگوسلاویہ کی تجارت بھی دوگنی سے زائد ہوگئی اور اس کی برآمد امید سے زیادہ بڑھ گئی۔ ان ملکوں نے اس مدبرانہ فیصلہ سے ڈالر کمانے کے سلسلے میں حد سے زائد ترقی کی اور اسی فیصلہ کی وجہ سے آج یوگوسلاویہ کی موجودہ بیرونی تجارت سو ملین ڈالر ہے جو ہندوستان کے مقابلہ میں دوگنی ہے جبکہ وہ بہت چھوٹا ملک ہے۔

لیکن یہ ہماری بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ اتنا مجرب نسخہ استعمال کرنے کے بعد بھی ہماری معاشی بیماری بجائے گھٹنے کے بڑھ رہی ہے یعنی ہماری بیرونی تجارت بڑھنے کے بجائے گھٹ گئی ہے اور اگر مانسون وقت پر نہیں آتا اور اچھی پیداوار

---

[1] نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ ۲۱ر جون ۱۹۶۶ء سیاست جدید ۲۲ر جون ۱۹۶۶ء [2] نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ ۱۱ر جون ۱۹۶۶ء
[3] نیشنل ہیرالڈ ۲۳ر جون ۱۹۶۶ء۔

نہیں ہوتی تو موجودہ مالی سال میں بیرونی تجارت بڑھنے کے بجائے گھٹ سکتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ تجارت برآمد کی متعدد حوصلہ افزا اسکیموں کو جن کو ماہرین اقتصادیات نے بڑی کاوش اور محنت سے تیار کیا تھا اور جن پر عمل بھی ہو رہا تھا فوری طور پر بیک جنبش قلم کالعدم کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ چمڑے اور کھالوں۔ کافی اور چائے۔ پٹ سن اور اس کی مصنوعات اور سیاہ مرچ وغیرہ پر محصول برآمد میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ انڈین موشن پکچرز پروڈیوسرس ایسوسی ایشن (امپا) کے صدر جناب جی۔ پی۔ سپی کے بیان کے مطابق ہندوستان کی فلمی صنعت میں جو درآمدی خام مال کی کلیتاً دست نگر ہے، روپیہ کی قیمت میں کمی ہونے سے لاگت میں راتوں رات پچاس فیصدی سے زیادہ اضافہ ہو گیا ہے اور اس کا ساڑھے تین سو فلموں پر فوری اثر پڑا ہے۔ درآمد شدہ اخباری کاغذ کی قیمتوں میں بھی اضافہ کا یقینی امکان پیدا ہو گیا ہے اور اس سے ہندوستانی اخبارات اور خصوصیت کے ساتھ چھوٹے چھوٹے اخبارات کے متاثر ہو کر ٹھپ ہو جانے کا خطرہ بھی لاحق ہو گیا ہے اور بقول شری [illegible] اس فیصلے سے اخباری صنعت کو تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ملک کے اندر اشیائے صارفین اور غذائی چیزوں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ یہ سب سوچا سمجھا ہے کیونکہ وزیر خزانہ جناب سچیندر چودھری نے روپیہ کی قیمت میں تخفیف کے اعلان کے بعد ہی اپنی پریس کانفرنس میں اعتراف کیا تھا کہ اس اعلان سے دوکاندار نفسیاتی فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور جلد سے جلد زائد منافع کمانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ وقتی اور عارضی اضافے اور مسائل ہوں گے جو درآمد میں اضافہ اور خام اشیاء اور مصنوعات کی تیز رفتار پیداوار میں اضافہ اور وقت کے ساتھ ساتھ خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ انھوں نے یہ بھی اطمینان دلایا ہے کہ اس فیصلہ کے نتیجہ میں اور موجودہ حالات میں ملک کے اندر چیزوں خصوصاً غذائی چیزوں میں اضافہ ہونے نہیں دیا جائے گا حکومت کی طرف سے ایسے اقدامات کئے جا رہے ہیں جن سے اشیائے صارفین مثلاً ڈالڈا۔ بے بی فوڈ۔ سائیکل ٹائر۔ ماچس صابن۔ ضروری مفردات اور دوائیں۔ بسکٹ۔ اسٹیشنری۔ ریڈیو اور بلیڈ وغیرہ کی قیمتوں میں اضافہ نہیں ہو سکے گا۔ یہ تیقن بہر حال اس طبقہ کے لئے حوصلہ بخش اور اطمینان بخش ہے جو پہلے ہی سے سرمایہ دارانہ نظام اور معاشی نابرابری کا شکار ہے۔

آرا کے اس اجتماع ضدین میں ایک عام ذہن آسانی سے بہک سکتا ہے اور اس کو کسی نتیجہ پر پہنچنے میں یقیناً دشواری ہوگی لیکن مجھے امید ہے کہ میرے ملک کے بیدار ذہن اور بالغ شعور اس فیصلہ کا (روپیہ کی قیمت میں تخفیف) وہی نتیجہ اخذ کریں گے جو انھیں کرنا چاہیئے۔ تصورات کی دنیا حقائق کی دنیا سے بالکل مختلف ہے۔ جب ہم اس حسین محفل سے باہر قدم نکالتے ہیں تو بالکل ایک نیا منظر سامنے آتا ہے۔ مصائب اور تکالیف کا روح فرسا منظر۔ پھر بھی اس میں شک نہیں کہ اگر ہمارے دلوں میں جذبۂ خلوص اور آنکھوں میں ایثار و قربانی کی چمک پیدا ہو جائے تو یہی روح فرسا منظر قوس و قزح کی رنگینی اور کہکشاں کی رعنائی کے حسین پیکر اور روپ میں نکھر کر ہمارے سامنے انگڑائیاں لینے لگے

(٭)

ع۱ سیاست جدید کانپور ۱۰ جون ۱۹۶۶ء
ع۲ سیاست جدید کانپور ۱۱ جون ۱۹۶۶ء
ع۳ ملک و ملت دہلی ۹ جون ۱۹۶۶ء
ع۴ ملک و ملت دہلی ۹ جون ۱۹۶۶ء
ع۵ نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ ۸ جون ۱۹۶۶ء

نذرِ ڈاکٹر زورؔ

حضرت قدیرؔ حیدرآبادی (زناعیہ) یادگارِ علامہ ضیاؔر گورگانی دہلوی

نظر آتے نہیں محفل میں کہاں ہیں کچھ لوگ
دل میں بیٹھے ہوئے آنکھوں سے نہاں ہیں کچھ لوگ

صاحبِ فیض و کرم اب جو یہاں ہیں کچھ لوگ
نقش بر آب ہیں یا آبِ رواں ہیں کچھ لوگ

مشربِ عشق میں بے نام و نشاں ہیں کچھ لوگ
شعلۂ آگ ہیں کچھ اور دھواں ہیں کچھ لوگ

تو سلامت رہے اے حسنِ ازل تابندہ
اب بھی محفل میں تری رشکِ جہاں ہیں کچھ لوگ

گرمیٔ شوق و عمل ان کو عطا کر یارب
تھک کے بیٹھے ہوئے مصروفِ فغاں ہیں کچھ لوگ

سارے عالم میں لرزنے لگی انسانیت
وہ ستم پیشہ جفاکارِ جہاں ہیں کچھ لوگ

ملنے دیتے نہیں آپس میں لڑانے والے
فتنہ انگیز وہاں ہیں تو یہاں ہیں کچھ لوگ

زورؔ کی تربت پہ اللہ کی رحمت برسے
فیض سے جس کے یہاں اہلِ بیاں ہیں کچھ لوگ

بزمِ شعرا میں محبت سے بلاتے ہیں قدیرؔ
جان پہچان کے اب بھی تو وہاں ہیں کچھ لوگ

اوج یعقوبی

نذرِ ڈاکٹر زورؔ

سینۂ دہر پہ سچ ہے کہ گراں ہیں کچھ لوگ
نبضِ ہستی کی طرح پھر بھی رواں ہیں کچھ لوگ

تہمتِ بے خبری سارے زمانے پہ نہیں
آنے والی کئی صدیوں کی زباں ہیں کچھ لوگ

منزلِ ترکِ وفا تک نہ پہنچ جائیں کہیں
ورنہ پھر وقت کا سیلاب رواں ہیں کچھ لوگ

کہہ رہے ہیں یہ نئے نقشِ قدم راہ رواں
آج بھی ہم قدمِ وقتِ رواں ہیں کچھ لوگ

ابھی ہر لب سے تبسم نہ طلب کرائے دوست
تیری محفل میں ابھی شعلہ بجاں ہیں کچھ لوگ

لب ہیں خاموش مگر بول رہی ہیں آنکھیں
کس قدر واقفِ آدابِ بیاں ہیں کچھ لوگ

عمر کی رُو سے بہت لوگ جواں ہیں لیکن
عقل کے باب میں مشکل سے جواں ہیں کچھ لوگ

اوجؔ تھک تھک گئی آوازِ ضمیرِ یاراں!
اس طرح محوِ حدیثِ دگراں ہیں کچھ لوگ

معلم بھٹکلی

اسی یقین پہ ہے آمادۂ تپش دلِ زار
نوید صبح مسرت ہے غلبۂ شبِ تار

مرے عروج پہ بیجا ہے رشک اے بلبل
کوئی قتیلِ خزاں ہے کوئی شہیدِ بہار

اٹھو کہ سنتِ منصور پھر کریں زندہ
چلو تو فاش کریں راز ہائے حق سرِ دار

یہیں سے قافلۂ نو بہار گزرا تھا
یہیں ہوئی تھی محبت سے زندگی دوچار

کیا تھا جہدِ مسلسل کا عہد میں نے یہیں
یہی تو ہے مری گل رنگ حسرتوں کا مزار

مصافِ زیست میں چنگ و رباب کیا معنی
خدا کے شیر! اٹھا لے یہ برق وش تلوار

نقوشِ مانی و بہزاد خس بدنداں ہیں
مری بہشتِ تخیل میں ہیں وہ نقش و نگار

کوئی ہے میری طرح کشتۂ تمنا کیا؟
حریمِ شوق میں گریاں ہے کون زار و نزار

نہ بلبلیں مترنم نہ گل تبسم ریز
بہار آئی ہے لیکن خزاں گزیدہ بہار

روانیِ قلمِ خوش رقم کی پرسش کیوں
زبانِ حق کو نہیں کیوں اجازتِ گفتار

حقیقتِ اشکِ حزیں کی ہے آج آئینہ
نہ کہیے سرخ شرارے کو گوہرِ شہوار

بعزمِ نو غمِ ایام سے ہو گرمِ ستیز
نہ جانے اور دکھائیں گے کیا یہ لیل و نہار

وفورِ رنج و محن اعتبارِ قلبِ بصیر
وجودِ آئینہ اعجازِ پردۂ زنگار

بہر قدم نگۂ شوق کو لگی ٹھوکر
عطا ہو کاش معلم کو دیدۂ بیدار

نقد و نظر

رہنمائے اُردو :- جناب غلام ربانی صاحب کی یہ کتاب آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈمی حیدرآباد نے شائع کی ہے۔ صفحات ۱۵۴، قیمت دو روپے۔

یہ کتاب ان لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے اور جو اُسے سیکھنا چاہتے ہیں اور خصوصاً ان الفاظ و مرکبات و مشتقات کو سمجھنا چاہتے ہیں جو اُردو میں فارسی اور عربی سے آئے ہیں۔ یعنی یہ کتاب ان لوگوں کے لیے ہے جو بول چال کی اردو سے کچھ کچھ واقف ہیں لیکن زبان کا مطالعہ گہرائی میں جاکر کرنا چاہتے ہیں۔ مصنف نے اسے جناب بی۔ گوپال ریڈی کے مشورے سے اور ان کی فرمائش پر لکھا۔ اس تحریک کے لئے ڈاکٹر ریڈی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کی وجہ سے اُردو میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا۔ کتاب حروف تہجی کی بحث سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد اسم جنس، فعل، مصدر وغیرہ کے ابواب ہیں۔ کتاب کے باقی حصے میں عربی مادوں کے آٹھ ابواب کو پوری تفصیل سے الگ الگ پیش کیا ہے۔ آخر میں سابقوں اور لاحقوں کو لیا ہے اور ساتھ ہی تشبیہات اور تلمیحات پر بھی معلومات فراہم کی ہیں۔ کتاب نہایت محنت سے لکھی گئی ہے اور غیر مادری زبان کے طلبا کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگی۔ تاہم چند باتیں محل نظر ہیں۔ یہاں ان کی طرف اشارے کیے جاتے ہیں۔ ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کتاب معیاری نہیں ہے۔ اس کی افادیت اور اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے مگر ان چند باتوں کا ذکر محض اس لئے کیا جاتا ہے کہ مصنف اگر پسند فرمائیں تو اگلے ایڈیشن میں ان کی روشنی میں نظرثانی فرمالیں۔

۱۔ صفحہ د۔ سطر ۶ :-

"عربی میں یہ طریقہ نہیں ہے کہ اس زبان میں الفاظ مفرد ہوتے ہیں، مرکب نہیں ہوتے" یہ بیان صحت پر مبنی نہیں۔ عربی میں ایک مادے سے کئی مفرد الفاظ بنائے جاتے ہیں لیکن مرکب الفاظ بھی ملتے ہیں، مثلاً قطاع الطریق (بہ معنی رہزن) طویل النجاد یا طویل القامت۔ کثیر الرماد (بہ معنی سخی) عربی میں تائے مختفی تانیث کے لئے استعمال ہوتی ہے اور اس سے جتنے الفاظ بنتے ہیں، وہ مرکب ہی کہلائیں گے۔ مثلاً جمیل سے جمیلۃ، صغیر سے صغیرۃ، کبیر سے کبیرۃ یا بشیر سے بشیرۃ۔

خود مصنف نے لاحقوں کے ذیل میں صفحہ ۱۰۰ پر عربی الفاظ جبریہ، قدریہ، امامیہ وغیرہ درج کیے ہیں، یہ سب کے سب مرکب الفاظ ہیں۔

۲۔ صفحہ و۔ سطر ۴ :- "تمام علامات فاعلی، مفعولی، اضافت، نسبت وغیرہ ہندی ہیں" لفظ "تمام" غیر ضروری ہے

اردو میں فارسی اضافت بشکل کسرہ بھی رائج ہے۔ اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اضافت پر ایک الگ باب ہونا چاہیئے۔

۳۔ صفحہ ۱ ۔ سطر ۹ :—

"ٹ، ڈ، ڑ خالص ہندی ہیں"۔

یہ آوازیں اصلاً دراوڑی ہیں وہاں سے سنسکرت میں آئیں اور پھر وہاں سے بذریعہ پراکرت ہندی اور اردو کو ملیں۔ صوتیات میں انھیں معکوسی آوازیں کہتے ہیں۔

۴۔ صفحہ ۴ سطر ۵ :—

"ن، ب ۔ پ کے ساتھ کسی کلمہ کے بیچ میں آتا ہے تو میم کی آواز دیتا ہے جیسے منبر"

ہمیشہ نہیں، اردو میں کنبہ واضح طور پر نون سے بولا جاتا ہے، میم سے نہیں۔

۵۔ صفحہ ۵ ۔ سطر ۳ :—

"مرکب الفاظ میں "و" کو پہلے لفظ کے آخری حرف سے ملا کر پڑھا جاتا ہے یعنی آب وہوا"

ہمیشہ نہیں مثلاً کردم و دیدم ۔ گفتم و رفتم و کو ملا کر نہیں پڑھا جاتا۔

۶۔ صفحہ ۵ ۔ سطر ۸ :—

"بعض الفاظ جو "خ" سے شروع ہوتے ہیں، ان میں "و" لکھا تو جاتا ہے مگر پڑھا نہیں جاتا مثلاً خود کو "خُد"...."

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ان میں "خ" پر پیش ضرور ادا کی جاتی ہے جو خفیف "او" کا کام دیتی ہے ۔

۷۔ صفحہ ۶ ۔ سطر ۲ :—

"فارسی میں اضافت ۔ کا، کے، کی، کا کام دیتی ہے ۔ ایسی حالت میں "ہ" ہمزہ سے بدل جاتی ہے جیسے نقشۂ ہند...."

اول تو یہ کہ فارسی میں اضافت صرف کا، کے، کی کا کام نہیں دیتی۔ اضافت توصیفی ترکیبوں میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً گلِ رعنا، زلفِ عنبریں، مژہِ پُرخوں ۔ دوسرے یہ کہ "ہ" ہمزہ میں تبدیل نہیں ہوتی بلکہ ہمزہ اضافت کی علامت محض ہے پھر یہ بھی کہ اضافت ہمیشہ ہمزہ سے نہیں لکھی جاتی۔ اوپر کی مثالیں کافی ہیں مزید یہ کہ "ہ" پر ختم ہونے والے الفاظ میں بھی اضافت کو ہمیشہ ہمزہ سے ظاہر نہیں کیا جاتا مثلاً ماہِ نو، راہِ حق، ان الفاظ کو ماہۂ نو یا راہۂ حق لکھنا غلط ہے۔ یہاں ہائے ہوز اور ہائے مختفی کا فرق نظر میں رکھنا ضروری ہے اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ مصنف کو اضافت پر الگ سے ایک باب لکھنا چاہیئے، اس میں یہ بتانا بھی ضروری ہوگا کہ اردو کے وہ الفاظ جو الف یا واؤ پر ختم ہوتے ہیں، ان میں اضافت یائے سے ظاہر کی جاتی ہے مثلاً نوائے ادب یا اردوئے معلیٰ ۔ ان الفاظ کو ہمزہ سے لکھنا غلط محض ہے۔ ان میں ہمزہ یا کسرہ کی جگہ "ی" نے لے لی ہے۔ البتہ اگر مضاف میں اوپر ہمزہ ہے مثلاً رعنائی تو ترکیب اضافی یعنی رعنائیِ خیال میں اوپر ہمزہ بھی ہوگا اور نیچے زیر بھی "ی" پر ختم ہونے والے الفاظ میں صرف کسرہ استعمال ہوگا مثلاً والیِ رامپور ۔ یہاں ہمزہ لکھنا صحیح نہیں۔

۸- صفحہ ۱۸ — سطر ۹ :— "پنچی" صحیح "پنچھی"۔

۹- صفحہ ۲۷ - سطر ۱۱، ۱۲ :— "اودھ اور بہار"...... جملہ بے ربط ہے۔

۱۰- صفحہ ۴۱ - سطر ۸ :— "اکیلا اسم جملہ نہیں ہو سکتا"۔

جب کسی کو بلانے کے لئے کہتے ہیں "زید!" "لڑکے" "مونٹے" تو اسم بطور جملہ کے ہے۔

۱۱- صفحہ ۵۶ — سطر ۵ :—

"اس طرح ان کو تین بڑے خاندانوں میں تقسیم کیا ہے ایک آریائی، دوسرا سامی اور تیسرا تورانی۔ ان میں آریائی خاندان سب سے بڑا ہے"۔

عالمی زبانوں کے بڑے بڑے خاندان تین نہیں بارہ ہیں اور ان میں سب سے بڑا آریائی نہیں ہند یورپی ہے۔ آریائی خاندان اس کی محض ایک شاخ ہے

۱۲- صفحہ ۵۸ - سطر ۵ :—

"عربی میں ان (سابقوں اور لاحقوں) کا وجود نہیں"

صفحہ ۵۸ — سطر ۱۱ :— یہاں صرف فارسی اسم عربی سابقوں اور لاحقوں کی مثالیں دی جاتی ہیں"

دونوں بیانوں کا تضاد ظاہر ہے۔ عربی میں لاحقوں کی طرف اشارہ پہلے کیا جا چکا ہے

۱۳- صفحہ ۸۰ - سطر اول :—

پرست (امر ہے پرستیدن کا 'پوچھنا سے)' صحیح "پوجنا"۔

۱۴- صفحہ ۹۶ — سطر ۲ :—

جن فارسی الفاظ کے آخر میں "ہ" ہو اس کو "گی" سے بدل دیتے ہیں مثلاً دیوانگی، خستگی"....

"د" کی جگہ "ہ" چاہیئے۔

یہ بات دوبارہ کہی جاتی ہے کہ ان چند باتوں کی طرف اشارہ کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اگر مصنف چاہے تو اگلے ایڈیشن میں ان پر نظر ثانی کر لے، ورنہ کتاب ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے اور جس مقصد کے لئے لکھی گئی ہے، اس میں کامیاب ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

"پت جھڑ کی آواز" :— قرۃ العین حیدر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ سال ۱۹۶۵ء قیمت ۵/۲۵

کتابت : اوسط - طباعت : عمدہ۔

قرۃ العین حیدر صاحبہ کا ادبی قد و قامت ان کی ذہانت، فنکاری، وسعتِ مطالعہ، انسان دوستی اور آفاقی اقدار کی تشہیر کے باعث اونچا ہوتا جا رہا ہے۔

انھوں نے اپنے عمیق مطالعے سے بہت سے کچھ سیکھا سمجھا اور اسے اپنی تخلیقات میں خوبی سے برتا ہے۔

اردو ادب میں انھوں نے اپنے ناول "آگ کا دریا" کے باعث خاص مقام حاصل کیا ہے۔ اب انھوں نے "پت جھڑ کی آواز" میں بعض بے حد خوبصورت افسانے پیش کر کے اپنی اس جگہ کو اور بھی مستحکم کیا ہے۔

خیال سے خیال، بات سے بات اور واقعہ سے واقعہ ان کے افسانوں میں اس طرح ملتا ہے جیسے بنگلے پر چڑھنے کے لیے سیڑھی کے ایک زینے کے بعد دوسرا زینہ ملتا ہے۔ "تلازمۂ خیال" ان کی تخلیقات کا جزوِ اعظم ہے۔ ان کا قلم ان کے تخیل اور تصورات کا پورا پورا ساتھ دیتا ہے۔

قرۃ العین حیدر صاحبہ کے افسانوں کا اہم ترین موضوع۔ انسان دوستی اور عالمی بھائی چارگی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب یہاں کی بولیاں ٹھولیاں مختلف زبانیں تفریحی مشاغل تعلیمی معروفیات کیساتھ یہاں کے مذاہب اور اُن کے ماننے والوں کے عقائد اور افکار شادی بیاہ کے طور طریقے رسومات باہمی تعلقات وغیرہ کا ذکر خوبی کیساتھ کیا ہے۔ آپ کی بعض تخلیقات تو نری صداقت اور حقیقت کا افسانوی روپ ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم کو وہ اس صدی کا ایک عظیم المیہ سمجھتی ہیں۔ اس تقسیم نے جو دلوں کی تقسیم کی ہے اور دو مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان خلیج حائل کر دی ہے اس کا ذکر وہ چبھن اور سسکتی ہوئی آہوں کے ساتھ کرتی ہیں۔ جب بھی وہ اس مسئلے پر آتی ہیں اپنے دل کے گہرے گھاؤ کو قاری کے سامنے لاتی ہیں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انھوں نے اپنے اس زخم سے رستے ہوئے خون کے قطروں سے اپنے افسانے لکھے ہیں۔

"تم تو پاکستانی ہو۔ تمہیں ہم سے نہ کہنا چاہیے" بیگم نے بڑی طنز کے ساتھ کہا میرے اوپر جانو کسی نے برف ڈال دی ہو نے کھسیانی ہنسی ہنس کر دوسری طرف دیکھا۔۔۔ میں نے اسے یہ بھی نہ بتانا چاہا کہ میں پاکستانی نہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے"

(کستوری افسانہ: جلاوطن)

ایک اور جگہ کستوری پوچھتی ہے تم نے کبھی خیال کیا ہے کہ میں کہاں جاؤنگی میرا گھر اب کہاں ہے کیا میں اور میری طرح دوسرے ہندوستانی مسلمان ایسے مضحکہ خیز اور قابل رحم کردار بننے کے مستحق تھے۔

"قلندر" میں ایک ایسا آفاقی۔ اخلاقی اقدار کا حامل کردار پیش کیا ہے جو دوسروں کے سکون اور شانتی کیلئے سب کچھ کر گزرتا ہے۔ اقبال بخت سکینہ کے کردار کی تخلیق کر کے قرۃ العین حیدر نے اپنی بین الاقوامی فکر کا ثبوت دیا ہے۔ اقبال بخت کا مذہب اور مسلک "انسانیت" ہے اور یہی مسلک قرۃ العین حیدر کا بھی۔ وہ اپنے افسانوں میں مختلف مذاہب کے درمیان جو اختلافی خلیج ہے اسے پاٹ دینا چاہتی ہیں۔ کہیں انھوں نے ہندو مرد کی شادی مسلمان لڑکی سے کروادی ہے تو کہیں عیسائی عورت اور مسلمان جوڑے کو پیش کیا ہے۔ کہیں بنگالی ہندو لڑکی اور مسلم لڑکیوں کا میل جول دکھایا ہے تو کہیں ہندوستانی تہذیب سے پاکستان کی نمائندگی کروائی ہے۔

ان کے افسانوں کا ماحول بہرحال الف لیلوی ہی ہوتا ہے۔ کہیں نت نئے جلسے، بنگالے میں تو کہیں لیڈی ہارڈنگ اور سینٹ اسٹیفنز کالج، ہمسفرڈ کلب اور امپیریل جم خانہ کی بہاریں۔ کبھی وہ بی بی سی ریڈیو اسٹیشن پر نظر آتی ہیں تو کبھی اندر پرستھ کالج کے اسٹیج پر۔

ان کے بیشتر کردار اعلیٰ سوسائٹی ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ نچلے درجے کے کردار بھی اب انھوں نے پیش کرنے شروع کیے ہیں لیکن ان میں بھی اعلیٰ طبقے کی خوبو پائی جاتی ہے اور اس کا تعلق اسی طبقے سے ہوتا ہے۔

افسانہ "پت جھڑ کی آواز" کی ہیروئن سید زادی، کالے تمباکو کے بنڈے ہندو جاٹ خشوقت سنگھ کے ساتھ رنگ رلیاں تو منا لیتی ہے لیکن اس سے شادی کرنا نہیں چاہتی وہ خشوقت کے ساتھ وقت گذاری کے بعد بھی کسی حسین وجمیل اونچے گھرانے کے مسلمان لڑکے کا خواب دیکھتی ہے۔ سہرے جلوے اور آرسی مصحف کی تمنا کرتی ہے لیکن یہ سب اس کی قسمت میں کہاں۔ فاطمہ کے روپ میں انھوں نے اس افسانے میں ایک ایسی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کو پیش کیا ہے جس کے "اخلاقی اقدار" آج کے اخلاق سے بہت زیادہ اونچے ہیں وہ اپنی نفسیات کا بھی تجزیہ کرنا نہیں چاہتی وہ صرف تین مردوں کی "مسز" بنی ہے اور چوتھے مرد سے قطعی ناآشنا۔ کہتی ہے "میں نے تو کبھی کسی سے فلرٹ تک نہ کیا۔ خوشوقت، فاروق اور اس سیاہ فام دیوزاد کے علاوہ جو میرا شوہر ہے میں کسی چوتھے آدمی سے واقف نہیں۔ میں شاید بدمعاش تو نہیں تھی نہ معلوم میں کیا تھی اور کیا ہوں"۔ یہ اور بات ہے کہ اندھیری راتوں میں کبھی کبھی وہ اپنے پہلے "یار" کو یاد کرلیتی ہے۔

"خوش وقت سنگھ۔ خوش وقت سنگھ۔ تمہیں اب مجھ سے مطلب" کالے بھجنگ، لیکن مضبوط توانا مرد کی بھوکی ان کی خوبصورت ہیروئن فاطمہ کو انھوں نے بڑی دلیری اور بے باکی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

"یادوں کی اک دھنک جلے" "کارمن" "ڈالن والا" بڑے اچھے نفسیاتی افسانے ہیں۔

مختصر یہ کہ مختلف پودوں سے پھول چننے کے بعد جس طرح کوئی انھیں خوبصورت ڈوری سے باندھکر گلدستہ بناتا ہے۔ اسی طرح قرۃ العین حیدر بھی اپنے مختلف خیالوں، مشاہدات اور تجربات کو کہانی کے مرکزی خیال سے باندھکر اپنے تخیل اور تصورات کا ایک حسین افسانہ پیش کرتی ہیں۔

وہ دن دور نہیں جبکہ قرۃ العین حیدر کا شمار "آفاقی ادیبوں" میں ہونے لگے۔

سید موسیٰ کاظم ریسرچ اسکالر

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ جلد ۲۹ شمارہ ۱۲

ڈسمبر ۱۹۶۶ء

ماہنامہ
سب رس

زر سالانہ چھ روپے غیر ممالک سے دس روپے
ششماہی تین روپے فی پرچہ پچاس پیسے
مہتمم ادارہ ادبیات اردو کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد ۴ سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات

آندھرا پردیش میں گذشتہ ہفتہ بڑا ہنگامہ برپا رہا۔ وساکھاپٹنم میں اسٹیل پلانٹ کے قیام کیلئے عوام کا مطالبہ عرصہ دراز سے ہے۔ حکومتی کمیٹیاں بیٹھتی اور اٹھتی ہیں لیکن بات طے ہو نہیں پاتی۔ سفارش ہوتی ہے۔ لیکن قیام کا اعلان نہیں ہوتا۔ آخر عوام کے جذبات لاوے کی طرح پھوٹ پڑے اور لاوا جس طرح اطراف واکناف میں نقصان رساں ہوتا ہے یہی حال عوام کے جذبات کا بھی ہوا۔ شری امرت راؤ کے برت نے اس کو اور زیادہ تلخ کر دیا۔ کافی نقصانات کے بعد یہ جذبات رکے لیکن مسئلہ حل نہ ہوا اس لئے کہا نہیں جا سکتا کہ اس میں سلجھاؤ کیسے پیدا ہوگا۔ اب نوتقی امداد اور گنجائش کی فراہمی نے مسئلہ کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا ہے لیکن توقع ہے ہماری ہر دل عزیز وزیر اعظم اور چیف منسٹر اس مسئلہ کو کامیابی کے ساتھ حل کریں گے۔

دوسرا مسئلہ جس نے علمی حلقوں میں بہت زیادہ ہیجان پیدا کیا وہ یونیورسٹی کی خود اختیاری کا ہے۔ یونیورسٹی کے مسائل بالکلیہ علمی ہوتے ہیں انہیں حل کرنے کے لیے سیاسیات سے بے تعلق اور بہت ہی بلند و برتر ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے اگر مغربی یونیورسٹیوں کے نظام کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سیاست اور تعلیم کی دو متوازی راہیں ہیں اور یونیورسٹیوں کے معاملات میں حاکم اعلیٰ مداخلت کا مجاز نہیں ہوتا۔ ان حاکموں کے مقابلے میں ارباب جامعہ زیادہ اقتدار اور وقار کے حامل ہوتے ہیں۔ انھیں انتخابات سے بے نیازی ہوتی ہے۔ کوئی آئے کوئی جائے انھیں اس کی پروا نہیں ہوتی اور وہ انتہائی سکون کے ساتھ اپنے مفوضہ فرائض کی انجام دہی میں مصروف رہتے ہیں۔ حکومت کی مداخلت نہ تو علمی ماحول کو برقرار رکھ سکے گی اور نہ اساتذہ میں وہ سکون اور ان کا علمی شغف باقی رہے گا جو ان کا شعار ہے۔ انہی تصورات کو ملحوظ رکھتے ہوئے جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ نے ایک دن کی اجتماعی رخصت بھی لی اور طلبائے بھی ہڑتال کی۔ معاملہ چونکہ عدالت تک پہنچا اس لئے فیصلہ تک سکوت ہو گیا۔ یہ ایک افسوسناک امر ہے کہ علمی مسائل کے تصفیہ کیلئے بھی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ہمارے ہر دل عزیز شاعر ٹریڈ یونین کانگریس کے صدر اور سابق اپوزیشن لیڈر مخدوم محی الدین نے ایک عوامی مسئلہ یعنے چاول کی قیمت کم کروانے کے لیے بھوک ہڑتال کی۔ مخدوم نے آج سے تیس سال پہلے جبکہ ایک روپیہ کو آٹھ سیر چاول اور بارہ سیر جوار ملتی تھی مشرق کی مذمت کرتے ہوئے کہا تھا ؎

جہل، فاقہ، بھوک، بیماری نجاست کا مکان
زندگانی تازگی، عقل و فراست کا مسان

اور آج جبکہ چاول راشن پر اسی پیسے اور چور بازار میں ایک روپیہ فی کیلو ملنے لگے تو اس نے عوام کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دی اور دنیا کے سارے ہی ادیب اور شاعر کانپ گئے کہ اب کیا ہوگا۔ لیکن ارباب اقتدار نے حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے قیمتوں پر غور کرنے کا وعدہ کیا اور ع "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت" ہم توقع رکھتے ہیں کہ ان سب معاملات میں انصاف ہوگا (م۔ ا۔ ص)

سید احتشام احمد ندوی
سری وینکٹیشور یونیورسٹی تروپتی
اے۔ پی

دیارِ دکن ادبی آئینہ میں

دکن اردو شاعری کا اولین گہوارہ

قدیم و جدید تمام محققین و ناقدین اردو کا اس امر پر اتفاق ہے کہ دکن اردو شاعری کا اولین گہوارہ ہے۔ اردو نثر و نظم کا ارتقاء اسی سرزمین میں ہوا۔ چنانچہ مخزن نکات میں قائم رقمطراز ہیں کہ "ریختہ گفتن بزبان دکنی رواج یافتہ" میر حسن نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے "باید دانست کہ ریختہ اول از زبان دکن رواج یافتہ" آزاد اپنے تذکرہ "آب حیات" میں رقم طراز ہیں کہ "اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ نظم اردو نے دکن سے ظہور کیا"۔

اردو کی قدیم شاعری بھی دکن کے ذکر سے خالی نہیں، چنانچہ خدائے سخن میر اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کا کلام دکن میں بھی مقبول ہے فرماتے ہیں۔

سرسبز ملک دکن میں ایسا ہوا کہ میر — یہ ریختہ لکھا ہوا تیرا دکن گیا
کچھ ہند ہی میں میر نہیں لوگ جیبھ بک — ہے میرے ریختوں کا دِوانہ دکن تمام
خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے — معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

ظاہر ہے کہ میر صاحب کی مراد ریختہ سے غزل ہے اس لئے کہ اس دور میں اردو زبان کو بھی ریختہ کہتے تھے اور خود غزل کو بھی اسی نام سے یاد کرتے تھے۔

قائم نے اس کیفیت کو واضح کیا ہے جو اردو نظم یا شاعری کی دکن میں تھی پھر فخریہ طور پر بتایا کہ غزل کو انھوں نے درست کیا ورنہ یہ دکن میں ایک لچر سی زبان تھی۔ فرماتے ہیں۔

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ — اک بات لچر سی بہ زبان دکنی تھی

دکن میں غزل کے ارتقاء پر نظر ڈالتے ہوئے عبادت بریلوی لکھتے ہیں کہ دکن میں شروع شروع غزل کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی بلکہ مثنوی مرثیہ اور قصیدہ وغیرہ اصناف سخن پر دکنی شعراء نے اپنی توجہ مرکوز کی۔ اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی ہے کہ چونکہ دکن میں زندگی میں تنعم و عیش کوشی زیادہ تھی جبکہ غزل کو دل گرفتہ کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے وہ پروان نہ چڑھ سکی۔ ہاں جب مغلوں کی سلطنت میں دکنی سلطنتیں ختم ہوگئیں تو پھر اس ضرب نے وہاں کے شعراء میں غزل کا سوز پیدا کر دیا اور دکن نے ولی اور سراج جیسے شعراء کو جنم دیا۔ غزل کے ارتقا کے لیے عیش پرستی مضر ہے۔ یہ ایک قابلِ غور مسئلہ ہے جب کہ حافظ جیسا شاعر شاہ شجاع جیسے عیش پرست بادشاہ کے دور میں اپنی غزل کو پروان

قطب شاہ اور شاہ کی بلندی کی داد دیتا ہے[۱] ابن قتیبہ عرب ناقد تو یہاں تک لکھتا ہے کہ جب انسان کا دل مطمئن ہو اسی وقت وہ اپنی طبیعت کو ایک مرکز و موضوع پر جما سکتا ہے۔ ورنہ معاشی بدحالی اس کے لئے سد راہ ہوگی[۲]۔

پھر دکن کا دامن غزل سے خالی نہیں قلی قطب شاہ سے لیکر ولی تک برابر غزل گوئی کی مثالیں ہم کو ملتی ہیں بلکہ ایک معنی میں تو یہ ایک صحت مند علامت تھی کہ دکن کے شعراء نے مثنوی کو رواج دیا جس میں وسعت زیادہ ہے اور غزل کی تنگ دامانی نہیں۔

مذکورہ مباحث کی روشنی میں چند امور کی جانب اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ آب حیات میں دکنی شعراء کے ذکر کو مولانا نے نظر انداز کر دیا اگرچہ انھوں نے جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا اس کا اعتراف کیا ہے کہ اردو شاعری کا آغاز دکن سے ہوا۔ عبادت بریلوی نے "آب حیات" کے اہم نقائص میں اس کمی کو شمار کیا ہے کہ مولانا آزاد نے اردو شاعری کا آغاز دکن کے بجائے دلی سے کیا ہے[۳]۔

اس کے علاوہ دوسرا مسئلہ ولی کی "دکنیت" ہے اہل گجرات مدعی ہیں کہ ولی کا وطن احمد آباد تھا اور اہل دکن کا یہ دعویٰ کہ وہ اورنگ آبادی تھا صحیح نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو دلائل ظہیر الدین مدنی نے اپنی کتاب ولی گجراتی میں جمع کر دیئے ہیں ان سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ زیادہ تر اُردو تذکرے ان کے دعویٰ کا ساتھ دیتے ہیں مگر یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ولی کا دکنی مشہور ہونا تذکرہ نگاروں کا اورنگ آبادی لکھنا اور اس کا رواج پا جانا بھی ایک حقیقت ہے[۴]۔ نیز یہ کہ اس سے قبل کسی نے ولی احمد آبادی یا گجراتی کی نسبت نہ دی ہاں یہ ضرور کہا کہ اصل او از احمد آباد است وغیرہ۔ خیر اس موقع پر مجھے یہ ثابت کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں کہ وہ اورنگ آبادی تھا یا احمد آبادی لیکن دونوں صورتوں میں مدنی صاحب کا ولی کو "گجراتی" لکھنا صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ خود ہی لکھتے ہیں کہ گجرات کا علاقہ خود دکن کے احاطہ میں شامل ہے۔

لفظ دکن کا اطلاق گجرات پر بھی ہوتا ہے[۵]۔ تو پھر دکنی جو کہ پہلے سے معروف ہے اور اس سے احمد آبادی ہونے کی نفی نہیں بلکہ اثبات نکلتا ہے اس کو ولی کے نام سے کیوں نکالا گیا اور ان کا نیا نام یعنی ولی گجراتی کیوں رکھا گیا؟

۱؎ حیات حافظ مظفر علامہ شبلی رحمانی پریس دہلی ص ۲ ۲؎ ملاحظہ ہو مقدمہ الشعر والشعراء مؤلفہ ابن قتیبہ ص ۲۴ — ۲۵

۳؎ روایت و بغاوت تالیف عبادت بریلوی انجمن ترقی اردو ص ۴۲ ۴؎ مجھے بیجاپور میں ایک ایسی بیاض دیکھنے کا موقع ملا جس میں آخری تاریخ تحریر ۱۱۳۵ھ ہے (واضح رہے کہ ولی کا سنہ وفات ۱۱۱۹ھ مسلمہ ہے۔) اس بیاض پر ولی کی پانچ غزلیں ہیں جو متفرق صفحات پر لکھی گئی ہیں اور ہر جگہ ابتداء میں میاں ولی محمد سلمہ اللہ تعالیٰ لکھا ہے۔ یہ وہی شخص لکھ سکتا ہے جو ولی سے شخصی طور پر واقف ہو۔ ظہیر الدین مدنی نے ولی کا نام ولی اللہ دیا ہے۔ اس طرح یہ ولی سے الگ کوئی اور شخصیت ہو جاتی ہے۔ ولی کی پانچوں غزلیں اسکے دیوان میں شامل ہیں۔ (الف۔ ۳)

۵؎ ولی گجراتی مصنفہ ظہیر الدین مدنی مطبوعہ انجمن اسلام بمبئی ۱۹۵۰ء ص ۵۶ — ۵۷۔

ــــہ این چہ بوالعجبی است۔

اردوئے قدیم کا جو معیار ہمارے دکنی شعرا نے قائم کیا تھا اس میں چند عناصر بڑے جاندار اور صحت مند ہیں۔ ان کا مطالعہ ہم مندرجہ ذیل عنوان کے تحت کر سکتے ہیں۔

۱۔ دکھنی شاعری نے ہندوستانی عناصر کو پوری طرح اپنایا اور تعجب تو یہ ہوتا ہے کہ ان شعرا نے ہندوؤں کے مذہبی قصوں سے تلمیحات استعمال کرنے میں بھی کوئی تکلف محسوس نہ کیا۔ حالانکہ ان میں سے اکثر مذہبی پیشوا اور صوفی تھے۔ ہندو دیومالا کے بغیر دکنی شاعری پر عبور حاصل کرنا مشکل ہے چنانچہ ڈاکٹر نذیر احمد نے جو کتاب "نورس" کی شرح لکھی ہے اس میں ہندو دیومالا کی مختصراً تشریح بھی کی ہے کہ اس کے بغیر اس کا کلام سمجھنا محال تھا۔[1]

۲۔ ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بلکہ برج بھاشا تک کے الفاظ اس میں مل جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی کے الفاظ بسا اوقات ادق الفاظ تک استعمال ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے سنسکرت اور عربی و فارسی کے الفاظ کی یہ کیفیت شمال کی شاعری میں نہیں ملتی یا یوں کہیے کہ جنوب نے شمالی ہند کو جو شاعری کا تحفہ دیا تھا وہ جب کٹ چھٹ کر دوبارہ جنوبی ہند آیا تو اس میں یہ عنصر بہت کم رہ گیا۔

۳۔ فارسی میں معشوق مذکر ہوتا ہے اس لئے کہ ان کے یہاں مذکر و مؤنث کیلئے الگ الگ ضمیریں اور صیغے نہیں ہیں۔ دکنی شعرا نے جب اردو شاعری کا آغاز کیا تو برج کی رسم کے مطابق اس میں معشوق کیلئے مونث کی ضمیر استعمال کی مگر جب اردو شاعری شمال پہونچی تو وہاں یہ طرز ناپسند کیا گیا اور فارسی کے زیر اثر ضمیر کو مذکر کر دیا گیا۔ اگرچہ اس کی تاویل پروفیسر مسعود حسن رضوی یہ کرتے ہیں کہ ہماری تہذیب اور شرم و حیا کے معیار نے مؤنث ضمیر استعمال کرنے سے باز رکھا[2] لیکن یہ فارسی کا اثر تھا۔

۴۔ دکنی شاعری میں غزل کی بھرمار نہیں ہے بلکہ یہاں مثنوی کا رواج ابتدا میں زیادہ رہا ہے جو اردو شاعری میں ایک صحت مند عنصر ہے بہ نسبت غزل کے۔ اگرچہ غزل سے مرثیہ، قصیدہ اور مثنوی اصناف کا دکن میں رواج تھا مگر مثنوی کے بعد بحر مراثی کا نمبر ہے۔ اس لئے کہ یہاں کے حکمراں شیعہ تھے اور اس کی وجہ سے دکنی میں مراثی کثرت سے ملتے ہیں۔

یوں تو دکنی پر بہت کام ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ابتک اس کے ہندوستانی پن پر کوئی وقیع کام نہیں ہوا اور نہ شعراء کے مجموعی اور انفرادی خصوصیات ہی کو پوری شرح و بسط سے نمایاں کیا گیا ہے۔ دکنی شاعری کیلئے فارسی کے علاوہ برج اور سنسکرت سے واقفیت ضروری ہے اسی بنا پر نورس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر نذیر احمد

---

[1] کتاب "نورس" مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد، دانش محل لکھنؤ ص ۴۲۱۔

[2] ملاحظہ ہو ہماری شاعری از مسعود حسن رضوی۔

لکھتے ہیں اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ نہ صرف دکھنی بلکہ سنسکرت، برج بھاشا اور سب سے بڑھ کر ہندو دیومالا پر اس کو (یعنی ابراہیم عادل شاہ کو) پوری طرح عبور حاصل تھا' واقعتہً یہ خصوصیات قابل غور ہیں اور یہ اس شاعری سے الگ جو شمال میں ملتی ہے ایک دوسرا نقشہ پیش کرتی ہیں۔[۱]

۵۔ دکھنی مثنوی کا مطالعہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس لئے کہ اس میں چند امور خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ایک تو ان میں ہندو دیومالا کے اثرات سے ماورائی اور غیر حقیقی فضا پیدا ہو گئی ہے جن میں جنوں، پریوں، دیوتاؤں اور دوسری مخلوقات کا ذکر ہے اور توہم پرستانہ فضا پائی جاتی ہے۔ پھر دوسری طرف یہ مثنویاں معاشرہ کے لئے اجتماعی زندگی کی تفریح کا بہترین مشغلہ تھیں' اس وجہ سے ان میں عوامی مذاق سے قربت اور ان کے احساسات اور طرز فکر کی ترجمانی بھی یقینی طور پر موجود ہے۔ اس کے علاوہ منقبت کی مثنویوں کی محفلیں الگ منعقد ہوتی تھیں۔ ان مثنویوں سے دکن کی تمدنی' تہذیبی و معاشرتی حالت بھی واضح ہو گئی جو سیاسی تاریخوں سے بہت کم معلوم ہوتی ہے[۲]

شعرائے دکن نہ صرف زبان کی انفرادیت بلکہ خیالات کے امتیازات کے باعث اس اعزاز کے مستحق ہیں کہ ان کو ایک الگ دبستان شاعری قرار دیا جائے۔ بلاشبہ ہم کو ان کے یہاں اس دور کی تہذیب' آداب' معاشرت' اشخاص' سلاطین' مشائخ' علماء' معاشرتی و سماجی رجحانات اور سیاسی انداز فکر کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس نے دور جدید میں بہت سے مفکرین کو اس عظیم ذخیرۂ شاعری کی جانب متوجہ کر دیا ہے جو اب تک کتب خانوں میں مدفون تھا۔

باوجود ضخیم کتابیں لکھنے اور مدون کرنے کے ابتک کوئی ایسا اردو دکنی لغت نہ لکھا گیا جسکی مدد سے دکھنی الفاظ کو آسانی سے دیکھا اور سمجھا جا سکے۔

دکن کی شاعری کو ہم اردو کا قدیم دبستان شاعری بھی کہہ سکتے ہیں جس سے ہم کو اس زبان کے تاریخی ارتقاء کا صحیح پتہ چلتا ہے ساتھ ہی ان رجحانات کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ جو شمال و جنوب میں مابہ امتیاز ہیں۔

دکن کے سلسلے میں دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ جب اپنے مرکز سے دور اردو زبان نے ادبی قالب اختیار کیا اور شمالی ہند میں یہ زبان محض بول چال کی زبان رہ گئی تو اس وقت اہل شمال نے دکن کی زبان کو معیاری اور ٹکسالی زبان قرار دیا اور جن شعراء نے دکھنی طرز بیان سے الگ ہٹ کر شمالی طرز میں لکھنا چاہا ان کو خود اہل شمال میں بھی مقبولیت نصیب نہ ہو سکی۔ ایک شاعر محمد افضل نے جو شمالی ہند کا باشندہ تھا۔ لکھنا شروع کیا تو "ریختہ" مقبول نہیں ہوا تھا۔ اس لیے

---

[۱] کتاب نورس ص ۹۔ [۲] ماہنامہ سب رس' حیدرآباد جلد ۲۹ جنوری ۱۹۶۶ء ملاحظہ ابوالنصر محمد خالدی صاحب کا مقالہ "چند دکھنی مثنویاں" ص ۶۔

اسے مجبوراً "دکنی" ہی لکھنا پڑا۔ افضل کی زبان کا اردو کے باوا آدم امیر خسرو کی زبان سے مقابلہ کرنے کے بعد ان میں جو فرق اور اختلاف نظر آتا ہے۔ اس سے یہ امکان اور قوی ہو جاتا ہے۔ شمالی ہند کی زبان ہر چند دکن کی زبان سے مختلف تھی مگر افضل نے دکنی شعرا کے تتبع میں اس عہد کی ادبی زبان یعنی دکنی استعمال کی اس لئے کہ وہ رائج الوقت سکے کی طرح قبول عام کا تمغہ حاصل کر چکی تھی[1]

دکنی زبان اور شاعری میں جو خصوصیات پیدا ہوئیں وہ در اصل ان بڑوسی زبانوں کے اثرات کی غماز ہیں جن سے اس کو دکن میں سابقہ پیش آیا۔ دکنی زبان کی ناہمواری اسی کیفیت کا نتیجہ ہے[2]

دکنی زبان کی نحوی و صرفی خصوصیات مختصراً یہ ہیں ــــ

۱۔ مذکر و مؤنث کی جمع "ان" سے بنائی جاتی ہے۔ جیسے کتاباں، کاماں، لوگاں۔

۲۔ ایسے متعدی افعال جن کے ماضی میں "نے" آتا ہے اردو میں اس کا فعل مذکر ہے۔ مگر دکنی میں فعل مؤنث میں ہوتا ہے۔ جیسے اس عورت نے کہی۔ لڑکی نے پانی پی۔

۳۔ "نے" کا استعمال کہیں چھوٹ جاتا ہے اور کہیں بلا وجہ بڑھ جاتا ہے۔

۴۔ جمع مؤنث فاعل کا فعل بھی جمع مؤنث ہوگا جیسے "اصل عورتاں اپنے مرد بغیر دوسرے کو اپنا حسن دکھلانے گناہ جانیاں ہیں۔

۵۔ مؤنث کی صورت میں حرف اضافت کی بھی جمع آتی ہے جیسے "دل کے فائدے کیاں بہت باتاں ہیں"۔

۶۔ ایسی، جیسی، جتنی کی جمع ایسیاں، جیسیاں اور جتنیاں آتی ہے۔

۷۔ ایسے مصادر کی ماضی مطلق جن کی علامت مصدر سے قبل "ک" یا "د" نہ ہو اردو میں یا (ے، ی) لگا کر بناتے ہیں جیسے دیکھنا سے دیکھا۔ مگر دکنی میں الف کے بجائے "یا" لگاتے ہیں جیسے دیکھیا۔ ملیا۔ پھریا۔

۸۔ لفظ "سی" دکنی میں مستقبل کے لیے مستعمل ہے۔ جیسے "نظر سوں خدا توں دیکھیں گے تو خدا نظر میں نہ آسی"۔

۹۔ "کر" کا استعمال بطور فعل معطوفہ اس طرح ہوتا ہے جیسے "دانا ہنسا ہنسا کر جاتے گا"

۱۰۔ ضمائر بھی مختلف ہیں۔ مثلاً یہ اور وہ کے بجائے یو۔ وو، انھوں کے بجائے انو، ان کو کے بجائے انوگو، ہم کو کے بجائے ہمنا، جنھوں نے کے بجائے جنوں، جن کو کے بجائے جنوں کو۔ جن کا کے بجائے جنوں کا اور یہ کی جمع یے استعمال ہوتی ہے۔

---

[1] اردو زبان کا ارتقاء مصنفہ شوکت سبزواری طبع اول ڈھاکہ ص ۹۲

[2] اردو زبان کا ارتقاء ص ۹۶

۱۱۔ الفاظ کے آخر میں "چ" تاکید کے لئے لاتے ہیں "ہی" کے معنی میں جیسے خدا منچ کیا سویرے نعلا نچ خاطر لوچ، میچ، کچھ وغیرہ

۱۲۔ مانگنا چاہنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کچھ اونچا چڑھنا مانگتا تو شراب پی۔

۱۳۔ الفاظ کے مذکر و مؤنث میں دکنی اصل یا شمالی اردو سے خاصی مختلف ہے۔ مثلاً شراب، خبر، صورت اور دنیا وغیرہ کو مذکر لکھتے ہیں۔

۱۴۔ عربی الفاظ کے املا کو سادہ کردیا گیا ہے جیسے نفع کو نفا لکھ دیتے ہیں۔

۱۵۔ کسی لفظ میں دو ڈال استعمال ہوئے ہوں تو پہلی کو دال کر دیتے ہیں ڈھونڈھ کو دھونڈھ۔ یا اگر لفظ میں ڈال اور ٹ دونوں حروف استعمال ہوئے ہوں تو ڈ کو "د" کر دیتے ہیں۔ جیسے ڈانٹ کو دانٹ۔ اسی طرح دو "ٹ" اور دو "ڑ" میں پہلی کو "ڑ" اور "ت" کرتے ہیں جیسے مڑوڑ کو مروڑ اور ٹٹیا کو تٹیا۔

۱۶۔ مکرر الفاظ جیسے گھر گھر، در در کو دکنی میں ایک "ے" کے اضافہ کے ساتھ استعمال کرتے ہیں جیسے گھرے گھر درے در۔ کبھی "بن" اضافہ کرتے ہیں جیسے گھر بن گھر [1]

ان خصوصیات کا اندازہ نثر کے علاوہ اس دور کی نظم سے بھی پوری طرح ہوتا ہے۔ انھیں امتیازات کو شروع میں اہل شمال نے معیاری تسلیم کیا مگر جب شمال نے اردو شاعری کو ترقی دی اور اسکو بہ طرز اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد بنایا تو اس وقت دکنی زبان، طرز اور الفاظ کو غیر معیاری قرار دیا۔ یہاں یہ حقیقت واضح کرنی ضروری ہے کہ شاہ سعد اللہ گلشن کی ہدایت کے مطابق یہ اردو کی پہلی اصلاحی کوشش بھی ایک دکنی شاعر یعنی ولی دکنی نے شروع کی بعد میں حاتم، مظہر، سودا اور ناسخ نے اس اصلاحی تحریک کی تکمیل کی جس کا مقصد دراصل اردو کو دکن کے ناہموار اور ثقیل الفاظ سے پاک کرنا تھا۔ جب یہ تحریک اصلاح مکمل ہوگئی تب شمالی اردو معیاری قرار پائی اور جنوب نے شمال کا اتباع شروع کردیا۔ اب ذرا زمانہ کا انقلاب دیکھئے کہ پہلے شمال مقلد تھا۔ مگر اب معاملہ برعکس ہوگیا۔

مغلوں کے زوال اور انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد ہندوستان میں چند ریاستیں اردو شعرا کا مرکز بنیں۔ ریاست حیدرآباد تمام ریاستوں میں سب سے خوشحال، وسیع اور اہل علم کی قدرداں تھی۔ چنانچہ غالب پہلے حیدرآباد پھر رام پور کا ذکر کرتے ہیں ؎

ہند میں اہل تسنن کی ہیں دو سلطنتیں	حیدرآباد دکن رشکِ گلستانِ ارم
حیدرآباد بہت دور ہے اس ملک کے لوگ	اس طرف کو نہیں جاتے ہیں جو جاتے ہیں تو کم

---

[1] سب رس از ملا وجہی مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق طبع دوم کراچی ص ۴۱ تا ۴۴

اہلِ دکن "ہندوستان" سے مراد شمالی ہند لیتے تھے اور اپنے ملک کو "ہندوستان" نہیں بلکہ دکن کہتے تھے

اردو شعراء نے دیارِ دکن میں اپنی امیدیں اور آرزوئیں بر آتے دیکھیں چنانچہ بہتوں نے ادھر کا رُخ کیا مگر اصل اس دور میں درازیٔ سفر سدِ راہ تھی جسکا ذکر غالب نے مذکورہ اشعار میں کیا ہے۔ بیسویں صدی میں کئی اردو شعراء دکن گئے مگر وہاں مستقلاً نہ رہ سکے اور ماشاء اللہ دکن میں کچھ احساس ملکی و ہندوستانی کا بھی تھا۔ بہرحال اکثر شعراء دکن پہنچ کر یہیں پیوندِ زمین ہوگئے مثلاً۔ شاہ نصیر الدین نصیرؔ۔ ظہیر الدین ظہیرؔ۔ داغؔ دہلوی امیرؔ مینائی اور فانیؔ بدایونی وغیرہ۔

ان کی ایک طویل فہرست ڈاکٹر زورؔ مرحوم نے اپنی مرتبہ کتابوں مرقعِ سخن کی دونوں جلدوں اور داستانِ ادب حیدرآباد اور فرخندہ بنیاد میں دی ہے۔

بعض شعراء دکن کی تہذیبی کیفیت سے کچھ گھبرائے اور انھوں نے ہندوستان جانے کی خواہش کی۔ خواجہ خیر الدین خواجہؔ نے مثنوی "حسن و دل" لکھی، وہ میر منور علی خاں کے یہاں مقیم تھے۔ پھر ہندوستان جانے کی تمنا کرتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

دکن سے ہند میں مجھ کو بلالو مرا جاتا ہوں یا مرشد بچالو[1]
معین ہو یا معین الدین چشتی یہ خواجہ عازمِ ہندوستان ہے

فانیؔ بھی اسی طرز کا شکوہ کرتے ہیں ؎

فانیؔ دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا کہ ہم ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

دکن چونکہ سطحِ مرتفع پر واقع ہے موسم میں اعتدال ہے اور اس کی سرزمین، پہاڑ، جنگل اور سمندر کی قربت کے حسن سے حسن زار ہے۔ اس لئے یہاں کے ادباء و شعراء نے اس سرزمین کی محبت اور اس سے قلبی تعلق کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ دکنی شاعری کے پہلے ہی دور میں ملا وجہی فرماتے ہیں ؎

دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہے لگ
دکن ملک بھوتیچ خاصہ اہے تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے[2]

لیکن اس دیار کی عظمت اردو کے شیدائیوں کے لیے ایک دوسرے نقطۂ نظر سے ہے۔ یعنی یہ وہ سرزمین ہے جہاں سے اردو شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ جس نے درحقیقت ہم کو میرؔ و غالبؔ اور اقبالؔ دیئے ہیں۔ اردو زبان کا

---

[1] سب رس۔ ملا وجہی مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق طبع ثانی ص ۱۰ [2] قطب مشتری۔ وجہی

حسن بھی وہی پہنچتا جو دلی کی دوسری زبانوں یعنی ہریانی، کھڑی بولی اور میواتی وغیرہ کا ہوا۔ یہ محض دکن کے فیاض حکمرانوں کا فیض تھا کہ اس ناتراشیدہ زبان میں شعر و شاعری شروع ہوئی گویا ادبی زبان کا آغاز دکن سے اُردو میں ہوتا ہے اور شمالی ہند کو یہ زبان کئی سو سال بعد کہ ادبی زبان کی عظمت حاصل کر چکنے کے بعد پہونچتی ہے جبکہ یہاں ہزاروں تصانیف نظم و نثر میں ہو چکی تھیں۔ ان کی تفصیلات تذکرہ اردو مخطوطات ادارہ ادبیات اردو۔ وضاحتی فہرست کتب خانہ سالار جنگ، فہرست مخطوطات کتب خانۂ آصفیہ اور فہرست مخطوطات۔ انجمن ترقی اردو علی گڈھ اور کراچی پاکستان میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

دیارِ دکن میں جو زبان ظہور پذیر ہوئی کیا وہ خود وہیں کی پیداوار تھی و بعض دکنی ادیبوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملاپ سے شمال میں اردو پیدا ہوئی۔ اسی طرح اس میل جول نے جنوب میں بھی اردو کو جنم دیا[۱]۔ یہ بیان حقیقت کو خلط ملط کرنے کی کوشش ہے اور اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ دکن میں ایک مستقل زبان وجود میں آئی اس کا شمالی ہند سے کوئی تعلق نہیں چنانچہ پنڈت کیفی لکھتے ہیں کہ یہ تخیل صحیح نہیں ہے بلکہ شمالی ہند میں دو زبانوں کے اتصال اور اتحاد سے ایک تیسری زبان پیدا ہوئی تھی جبکہ دکن میں ایک بنی بنائی زبان شمالی ہند سے آئی اور وہاں اس کا رواج ہو گیا[۲]۔

دراصل اردو زبان تو مسلمانوں سے قبل موجود تھی۔ انھوں نے اس کو سنوارا اور ترقی دیکر ادبی زبان بنایا۔ البتہ اس زبان میں جو دکن جا کر پھلی پھولی "مقامی حیثیت اور مرکز سے دوری انقادگی کی وجہ سے جو خصوصیتیں پیدا ہونی لابدی تھیں وہ ہوئیں۔ آس پاس کے کچھ الفاظ آملے اور بس[۳]۔

واقعہ یہ ہے کہ جو اردو شاعری دکن میں پروان چڑھی اس میں مقامی اثرات اور اس کے اپنے خدوخال پوری طرح نمایاں ہیں اس سلسلے میں دکن کی خدمات غیر معمولی ہیں۔ نظم اردو دکن کی پیشانی کا نور ہے۔ اس خطہ میں اردو ادب نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ چنانچہ کیفی صاحب لکھتے ہیں: ۔

"دکن کی خدمات اس بارے میں یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ اردو کی مملکت میں دکن کی حیثیت ایک معزز خلیفہ کی ہے"

بیشک اردو زبان و ادب پر دکن کے بے شمار احسانات ہیں۔ قابل غور امر یہ ہے کہ ادبی زبان اور شاعری کی

---

[۱] دکن میں اردو۔ از نصیر الدین ہاشمی ص ۸ بحوالہ کیفیہ

[۲] کیفیہ۔ از دتاتریہ کیفی انجمن ترقی اردو پاکستان ص ۳۹

[۳] کیفیہ۔ از دتاتریہ کیفی انجمن ترقی اردو پاکستان ص ۳۱

ابتدا دکن سے ہوتی ہے۔ درمیان میں شمالی ہند میں اس کا غیر معمولی عروج ہو جاتا ہے مگر پھر آخر میں نظام کی برکتوں سے دکن پھر ایک بار اردو کی ایسی عظیم الشان خدمت کرتا ہے جو کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی۔ ایک طرف یہ شمالی ہند کے شعراء کا مرکز قرار پاتا ہے۔ نصیرؔ داغؔ ظہیرؔ امیرؔ سالکؔ اور فانیؔ وغیرہ۔ یہاں آکر دولت وسخاوت اور قدر دانی سخن کے جلوے دیکھتے ہیں۔ دوسری طرف یہاں ایک عظیم اور کامیاب تجربہ ایسا کیا جاتا ہے کہ آج حصول آزادی کے بیس سال بعد بھی کسی کو اس پر عمل کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ یعنی اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر ایک یونیورسٹی قائم کر دی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے اردو کی ابتداء اور انتہا دونوں میں اسکی ترقی اور خدمت کا شرف دکن کو حاصل رہا ہے۔

انجمن ترقیٔ اُردو کو بھی یہیں سے بال و پر ملے۔ اور اسی دکن کے سلاطین کی سخاوتوں نے اس کو آب و رنگ دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ دکن نے اردو زبان کو ادبی عظمت عطا کی ہے اور نظم و نثر دونوں میں جنوبی ہند کو شمالی ہند پر سبقت حاصل ہے۔ شمالی ہند سے چھ سو سال قبل دکن میں ادبی نثر و نظم کا ایک ذخیرہ نظر آتا ہے جبکہ شمالی ہند میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی ہے۔ ادبی زندگی سے اردو زبان کو دکن نے آشنا کیا۔ پھر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ درمیان میں ایک جمود سا پیدا ہوا اور اس کے بعد شمال نے جنوب سے روشنی حاصل کر کے اس کی شکل ہی بدل دی۔ ورنہ اگر اردو کے ارتقا میں شمال کو دخل نہ ہوتا تو آج اس کی شکل کچھ اور ہوتی۔

حسرت کاسگنجوی
سندھ یونیورسٹی حیدرآباد پاکستان

عزیز احمد

اس وقت ناول نگاروں میں عزیز احمد کو بہتر تعلیم یافتہ کہا جا سکتا ہے عثمانیہ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے ولایت کی یونیورسٹی سے بھی انگریزی ادب میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں۔ کچھ عرصہ عثمانیہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر رہے۔ انگریزی کا وسیع مطالعہ کرنے کے بعد انہوں نے اُردو کی طرف توجہ کی تنقید نگاروں میں بھی انہوں نے خاصی شہرت حاصل کی طویل اور مختصر افسانے بھی لکھے لیکن بقول جلال الدین احمد ان کا خاص میدان ناول نگاری ہی ہے[1] جلال الدین احمد نے انھیں اس دور کا سب سے بڑا ناول نگار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے[2] اور ان کے ناول "ایسی بلندی ایسی پستی" کو ان کا شاہکار ٹھیرایا ہے۔ لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے اور یہ اختلاف ایک لحاظ سے اصولی بھی ہے۔ عزیز احمد فحاشی اور عریاں نگاری کو حقیقت نگاری سمجھتے ہیں اگر فحاشی اور عریاں نگاری حقیقت نگاری ہو سکتی ہے تو ہم اس حقیقت نگاری کو دور ہی سے سلام کرتے ہیں عزیز احمد محض جنسیات ہی میں دلچسپی لیتے ہیں اور جنسی نگاری ہی ان کا محبوب موضوع ہے۔ ان پر جنسی نگاری بھوت بن کر سوار ہو گئی ہے اور یہ زندگی کا کوئی تعمیری پہلو نہیں وقار عظیم نے شاید اسی سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

> "گریز۔ دوسری عالمگیر جنگوں کے درمیانی وقفے کے پرشورش یورپ اور انگلستان کی زندگی کا ناول ہے اس میں اس عہد کے سیاسی اور معاشی پس منظر پر جنسی حقائق کا غلبہ ہے جنھیں مصنف نے مزے لے لے کر بیان کیا ہے اور اپنے قاری کو اس مزے میں پوری طرح شریک ہونے کی دعوت دی ہے جنسی معاملات کے اس طرح غیر ضروری آزادی اور بے باکی سے بیان کرنے میں بظاہر فرائڈ کی جنسی نفسیات کا سہارا لیا گیا ہے، لیکن اس ناول میں یہ سہارا نفسیاتی یا فنی سہارا ہونے کی بجائے محض اس کا فریب معلوم ہوتا ہے[3]

اور یہ حقیقت ہے جب جنسی حقائق مزے لے لے کر بیان کئے جائیں اور قاری کو دعوت دی جائے کہ وہ بھی

---

[1] گذشتہ دس سال سے عزیز احمد نے ناول نگاری ترک کر دی ہے ان کا آخری ناول "شبنم" ہے

[2] تین ناولیں — نقوش لاہور [3] داستان سے افسانہ تک — وقار عظیم

اس میں شریک ہو تو ذہن پستی کی طرف مائل ہوگا۔ ناول نگاری کا افادی مقصد یہاں فوت ہو جاتا ہے اور ذہنی فرار کی سرحدیں شروع ہو جاتی ہیں۔

عزیز احمد کے ابتدائی ناول "آگ" اور "خون" اور "مرمر" کو چھوڑ کر جو مختصر بھی ہیں اور پورے طور پر ناول بھی نہیں کہے جاسکتے۔ عزیز احمد کی شہرت اور ادبی دائروں میں مقبولیت "گریز" سے ہوئی۔

یہ حیدرآباد کے ایک صاحبزادے نعیم الحسن کی یورپ میں سرگذشت کا قصہ ہے شروع میں حیدرآباد کے کچھ گھروں کا نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے اور نعیم کا بلقیس سے عشق مرکز توجہ ہے نعیم کا مخصوص جنسیاتی رجحان یہیں نمایاں ہو جاتا ہے کیونکہ وہ بلقیس کی والدہ کے جسم کی طرف بھی عجیب عجیب طریقے سے متوجہ دکھایا گیا ہے اس کے ذہن کی عجیب سی کیفیت ہمارے سامنے آتی ہے اس کیفیت سے نعیم بہت لطف اندوز ہوتا ہے وہ آئی سی ایس منتخب ہونے کے بعد انگلینڈ پہنچتا ہے۔ یہاں وہ مختلف لوگوں سے ملتا ہے مگر زیادہ تر اس کی توجہ کا مرکز عورتیں ہی ہوتی ہیں پورے ناول میں اسی کے جنسی تعلقات کی بابت نہایت ہی عریاں اور فحش واقعات یکے بعد دیگرے سامنے لائے جاتے ہیں ناول پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے انگلینڈ محض ایک قہوہ خانے سے کچھ زیادہ نہیں وہاں سوائے عیاشی اور آوارگی کے اور کچھ نہیں۔ جن لڑکیوں سے نعیم ملتا ہے ان میں ایک مس پاول بڑی علم دوست نظر آتی ہے مگر آخر میں جب ہندوستان میں ایک دن اس سے ملاقات ہو جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ دوستی بھی محض حسن فروشی کا ایک ذریعہ تھی بہرحال نعیم ہندوستان واپس آجاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ بلقیس کی شادی ایک اور شخص سے ہو گئی ہے۔

آخر میں نعیم اپنی ملازمت پر چلا جاتا ہے اور اس کے غم انگیز جذباتی سین پر ناول ختم ہو جاتا ہے۔ جب ہم اس ناول کی تکنیک اور فن پر غور کرتے ہیں تو ہمیں عزیز احمد کی فنکارانہ صلاحیتوں کی داد دینا پڑتی ہے لیکن جب ہم اس ناول کے مواد پر دھیان دیتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی محض حسن پرستی، جنسی کشمکش اور جنسی تعلقات ہے۔ اس زندگی میں خودغرضی ہی خودغرضی ہے۔ انسانیت، ہمدردی اور اخلاق کہیں بھی نہیں ہے۔ عزیز احمد کے ہاں ہمیں شاعرانہ تخیل ملتا ہے صنعت گری کے نمونے بھی مل جاتے ہیں نفسیاتی اور جذباتی کیفیات کی تحلیل بھی کہیں کہیں مل جاتی ہے منظر کشی بھی وہ خوب کرتے ہیں مکالمے بھی مختصر اور جامع ہوتے ہیں واقعات اور جذبات کو ہم آہنگ کرتے ہیں بھی وہ اپنی قابلیت کا ثبوت دیتے ہیں یہ سب کچھ ہے لیکن جو چیز وہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اس سے ہماری طبیعت متنفر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ محض مواد کی خرابی ہے اس سے ایک بات یہ بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اچھے ناول کے لیئے اچھے مواد کی بھی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔

"ہوس" اور "مرمر" اور "خون" ان کے طالب علمی کے زمانے کے یادگار ہیں انھیں ہم اس لیے نظرانداز کرتے ہیں کہ اس وقت ان پر جذباتیت غالب تھی لیکن "گریز" "آگ" "ایسی بلندی ایسی پستی" اور "شبنم" میں بھی ہمیں وہی انداز ملتا ہے

"گریز" اور دوسرے ناولوں میں بس اتنا سا فرق ہے کہ "گریز" میں باقاعدہ کوک شاستر کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ بعد کے ناول بھی اسی انداز کے ہیں لیکن ان میں جنسی نگاری عریانی اور فحاشی اتنی زوردار نہیں ہے جتنی کہ گریز میں ہے۔ عزیز احمد کا فن نکھرتا گیا ہے وہ بات کو کہنے کا سلیقہ جان گئے ہیں لیکن جو بات کہہ رہے ہیں وہ خود گری ہوئی ہے بقول ڈاکٹر محمد احسن فاروقی :—

"عزیز احمد تو اس رنگ پر چل گئے ہیں اور باوجود تمام علمیت اور قابلیت یہ نہ سمجھے کہ یہ عریاں نگاری کیا تھی۔ "گریز" کا ذہنی اور فکری پہلو بہت ہی پست ہے"[۱]

ذہنی اور فکری پہلو تو ہمیں ان کے کسی ناول میں بھی نہیں ملتا وہ بغیر عریاں نگاری کے نوالہ نہیں توڑ سکتے۔ ان کے ہیرو اور ہیروئن جنسیاتی پہلوؤں پر ہی زیادہ غور کرتے ہیں بلکہ غور بھی نہیں کرتے محض تکمیل تصور کرتے ہیں اور جذبات کی تسکین کو اپنا مطمع نظر بنا لیتے ہیں۔ یہاں وہ اشتمالیت کا بھی سہارا لیتے ہیں وہ مشرق کو مغرب کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں ان کی جنسی نگاری فرانسیسی جنسیہ نگاری سے بہت قریب آگئی ہے۔ کشن پرشاد کول کہتے ہیں :—

"تحت الشعور کے طوفان میں سیاسی و جنسی کشتیاں سجاد ظہیر اور کرشن چندر نے بھی چلائی ہیں۔ عزیز احمد پھکڑ پن اور فحاشی میں سعادت حسن منٹو کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں"[۲]

نعیم نے اگر کسی جدت پسندی یا ترقی پسندی کا کوئی کارنامہ انجام دیا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اس نے اپنی عیاشی کے تجربے ہندوستان میں نہیں کئے بلکہ لندن اور پیرس میں کیے ہیں عزیز احمد خود ترقی پسند ہیں۔ انھوں نے "ترقی پسند ادب" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے اگر ہم "گریز" کو بقول کشن پرشاد کول اس معیار سے جانچنا چاہیں جو ترقی پسند ناقدین نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے تو "گریز" کا شمار نہ اعلیٰ پائے کے ادب میں ہو سکتا ہے نہ ترقی پسند ادب میں اس ناول کا اثر بالخصوص طبیعتوں پر سچے صحت مند نشاط کا نہیں بلکہ مریضانہ تعیش پسندی کا ہوگا کیوں کہ اس کی عریاں نگاری بلکہ فحش نگاری جس کے داغوں اور دھبوں سے یہ ناول پٹا پڑا ہے[۳] سمجھ میں نہیں آتا جب یہ خود ترقی پسندوں کے اصولوں پر پورا نہیں اترتا تو پھر اس کو کس نظریئے کے تحت پرکھا جائے۔ علی عباس حسینی نے بڑے ضبط و تحمل کے ساتھ صرف ایک جملے میں عزیز احمد کا تجزیہ کیا ہے کہتے ہیں :—

جنس کے معاملے میں وہ نامناسب افراط سے کام لیتے ہیں[۴]

اگر عزیز احمد غور کریں تو کشن پرشاد کول صاحب کا دیا ہوا مشورہ برا نہیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ عزیز احمد اپنے

۱۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی
۲۔ نیا ادب — کشن پرشاد کول
۳۔ نیا ادب — کشن پرشاد کول
۴۔ ناول کی تاریخ اور تنقید — علی عباس حسینی

اس مریض ہیرو کو کسی ماہر نفسیات کی کلینک لے جاکر نفسیاتی طریق علاج سے صحت مند نشاط کا عادی بنواتے لیکن انھوں نے غضب یہ کیا کہ اس کو ننگا نچا کر کے ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے اور ہم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہم اس کو مریض نہیں بلکہ ہیرو قرار دیں۔[1]

کنہیا لال کپور نے تو شاید بڑی سنجیدگی سے کہا تھا کیونکہ وہ بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں۔ ان کی سنجیدگی میں بھی ظرافت کا پہلو نکل آتا ہے۔ انھوں نے نعیم کو مستقبل کا انسان بتایا ہے وہ اپنے اس مختصر سے جملے میں بہت سی باتیں کہہ گئے ہیں۔ نعیم اگر مستقبل کا انسان ہے تو ہمیں انسانیت اور اخلاقی اقدار کو ابھی سے موت کے گھاٹ اتار دینا ہوگا۔ انسانیت کبھی اتنی عریاں نہیں ہوسکتی ہمارے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے فرائڈ کے فلسفے اور نفسیاتی تجزیہ سے بہت فیض اٹھایا ہے اور اب جنسی بھوک کے راگ الاپنا ان کی عادت بن گئی ہے اس سے بڑا ذہنی فرار اور کیا ہوسکتا ہے۔ اب جبکہ ترقی پسندی کی بات نکل آئی ہے تو مجھے عصمت چغتائی کا ترقی پسندوں کے بارے میں ایک خاکہ پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے یہ خاکہ ہمیں ترقی پسندوں کو سمجھنے میں بڑی مدد کرتا ہے۔

> "ہر وہ انسان ترقی پسند بن گیا جس کے بال بے تکے اور آنکھیں وحشت انگیز ہوں لباس ذرا انوکھا اور رنگیا ہو۔ ہاتھ میں اٹیچی کیس جس میں پھڑکتی ہوئی نظمیں اور سسکتے ہوئے افسانے دہکتے ہوئے مضامین۔ لطیف فوٹو کچھ معصوم یادگاریں اور شیریں خطوط ہوں! بات کرتے ہوئے کچھ کھو سا جائے لڑکیوں سے انتہائی بے تکلفی اور بے لاپرواہی اور سختی سے بات کرے چھوٹتے ہی پیار کا نام لینے لگے بھرے سے زنانہ کپڑوں پر ہاتھ ڈال دے، پھر ان کو ایسے دیکھے گویا عمر میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہے۔ پھر ہنسی خیز مسکراہٹ سے جھینپ جائے ان کی ساخت اور اہمیت پر گفتگو کرنے پر آمادگی ظاہر کرے۔ اس کے علاوہ ہر قابل ذکر کرتے وقت اس کی جنسی کشش اور جسمانی ساخت پر روشنی ڈالے اس کی لطیف جنبشوں پر نچھاور ہوچکا ہو اس کے تمام گذشتہ سے پیوستہ عاشقوں کی تعداد اس کے جائز و ناجائز تعلقات اور اس کے ادھورے اور سالم سانحوں کی تفصیل جانتا ہو تمام انقلابی روسی فرانسیسی اور امریکی ادیبوں کے نام اور ان کے تراجم ازبر ہوں۔ ان کے تراجم پیش کرکے ادب کی خدمت بھی کرچکا ہو لازم ہے کہ وہ خود بھی فنکار ہو یعنی شاعر یا مضمون نگار ہو نام کو جوڑ توڑ سے گھما پھرا کر لکھتا ہو۔۔۔ دوستوں کے خرچ سے پیٹ بھر شراب اور نفیس کپڑے پہنتا ہو۔ ڈھٹائی سے میزبانی پر مجبور کرنا اور ان کے حسابوں اشتراکی ہو۔

---

[1] نیا ادب ــــ کشن پرشاد کول۔

جو کچھ تمہارا وہ میرا اور جو کچھ میرا وہ تمہارا نہیں۔ یہی نہیں بلکہ گاؤں کی لڑکیوں کے بھولے پن اور تعلیم یافتہ لڑکیوں کی مکاری کا بھی تجربہ رکھتا ہو مٹی ہوئی عورت جوتیوں میں مسلی ہوئی زندگی کا طرفدار ہو۔ دولت میں شریف زادیوں کے جسم پر تھوکے مگر انہیں رئیس زادیوں کے عشق میں ناکام رہ کر مجذوبیت کا درجہ پا چکا ہو۔ والدین کی ناسمجھی اور غلط طریقہ پہ تعلیم کی وجہ سے کوئی ڈگری حاصل نہ کر چکا ہو۔ اور زندگی کی تلخیوں سے تنگ آکر مفت کی پینے اور نالیوں میں گرنے کا عادی ہو چکا ہو۔[1]

عزیز احمد کے متعلق علی عباس حسینی نے ایک اور بھی چبھتا ہوا اشارہ کیا ہے کہتے ہیں۔ اس کے ہیرو نعیم کا کردار بڑی حد تک خود مصنف کا کردار ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ عزیز احمد ترقی پسند ادیبوں میں شمار کیئے جاتے ہیں۔ ہم اس بات پر یقین سے آئیں جو علی عباس حسینی نے کہی ہے یعنی نعیم کا کردار بڑی حد تک خود مصنف کا کردار ہے تو ترقی پسندوں کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں رہتی کہ وہ ذہنی مریض ہیں۔ عورت ان کی کمزوری ہے اور ان کے خیالات و احساسات کی بنیاد ہیں۔ کوک شاستر پہ استوار ہیں اگر ہم یہ کہیں کہ نعیم کا کردار ترقی پسندوں کی نمائندگی کرتا ہے تو غلط نہ ہوگا کشن پرشاد کول نے ایک جگہ عزیز احمد کا ن۔م راشد سے بھی مقابلہ کیا ہے کہتے ہیں :۔

> "عزیز احمد صاحب نے ن۔م راشد[2] کی پیروی میں نئے ادب کی نثر میں وہ جدت پیدا کی ہے کہ جو راشد صاحب نئی شاعری میں کر چکے ہیں یعنی جذبہ انتقام کے زیر اثر عیاشی کے طرز نو کو رواج دینا۔"[3]

ن۔م راشد نے انگریز عورتوں سے رات کی تاریکی میں جس طرح انتقام لیا ہے۔ وہی چیز عزیز احمد نے بھی دہرائی ہے۔ جب نعیم کی منگنی ایلس کے ساتھ صرف اس لیے ختم کرا دی جاتی ہے کہ اس کے باپ کو یہ کالا رشتہ پسند نہ تھا دوسرے نعیم ایک غلام ملک کی پیداوار تھا نعیم کو اپنی نسل اور اپنی سیاسی غلامی کا شدت سے احساس ہوتا ہے اور اس شدت احساس کا مداوا شراب و شعر جنسیات کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا اس سلسلے میں چک ہروشا اور انگریز کرا کسلے سے تعلقات بڑھتے ہیں اور ہندوستانیوں کو ذلیل سمجھنے کا انتقام کرا کسلے کی بہن سے ایک خاص انداز سے لیا جاتا ہے۔ ہمیں نعیم کے کردار سے کہیں بھی تو ہمدردی نہیں ہوتی اور ہمیں کشن پرشاد کول کے اس قول سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ

> مسٹر نعیم خلقتاً جنسی بھوک کے ایسے روگی ہیں اور غلاظت اور کیچڑ میں لوٹنے کی ان کو ایسی لت پڑ گئی ہے کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر گندی گلیوں ہی میں جاتے ہیں اور جب تک غلاظت کی دلدل میں پھنستے نہیں سیری نہیں ہوتی۔[4]

۱۔ ٹیڑھی لکیر۔ (ناول) عصمت چغتائی ۲۔ ن۔م راشد انگریزوں کی عورتوں سے کس طرح انتقام لیتے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کی نظم "انتقام" سے بخوبی ہوتا ہے ۳۔ نیا ادب۔ کشن پرشاد کول ۴۔ نیا ادب۔ کشن پرشاد کول۔

"گریز" ایک کرداری ناول ہے اور نعیم کا کردار پورے ناول پر چھایا ہوا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ نعیم کا کردار جنسی لذتیت کی مثال ہے تو غلط نہ ہوگا۔ نعیم کے ذہن سے بلقیس فراموش نہیں ہوتی وہ خوب سے خوب تر۔ تلاش میں رہتا ہے۔ اس کے باوجود بلقیس اس کے ذہن پر سوار رہتی ہے وہ نطشے اور مارکس کے فلسفے سے متاثر ہو کر اشتمالیت سے بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ انگلینڈ میں ہی اسے اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ نسلی امتیاز اور سیاسی غلامی کیا چیز ہے اور ایک طرح سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نعیم کی احساس کمتری کا نقشہ عزیز احمد نے بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ اپنی اس احساس کمتری ہی کی بدولت اس نے جگہ جگہ ٹھوکریں کھائیں اس کی زندگی الجھ کر بے معنی ہوتی گئی وہ خود سے غیر مطمئن رہنے لگا اور اس کا مزاج شکی اور چڑچڑا ہو گیا۔ جلال الدین احمد نے عزیز احمد کو ایک بہتر کردار نگار بتایا ہے اور کہا ہے کہ اردو میں ان سے بہتر کردار نگار پیدا نہیں ہوا۔[۱] اس میں شک نہیں کہ اس سلسلے میں عزیز احمد جو طریقہ استعمال کرتے ہیں وہ قابل داد ہے مگر ان کے کرداروں میں کوئی ایسا نہیں ہے جس سے ہم ہمدردی کریں یا یاد رکھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عزیز احمد انسانیت میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے ان کے سب کردار محض وقتی اغراض کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ عزیز احمد ابھی زندگی کو اس سطح سے دیکھ رہے ہیں جہاں بدی ہی بدی نظر آتی ہے وہ اس گہرائی تک پہنچنے سے محروم ہیں جہاں نیکی بھی ہوتی ہے اگر ہم ان کے نقطہ نظر کو "سینی کل" یاسیت کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ ان کے ناولوں کو پڑھنے کے بعد ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ زندگی محض برائیوں کا ایک کھیل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کو محض برائیوں کا کھیل سمجھنا انسانیت کی عظمت کو پہچاننے سے انحراف ہے ایک تخریبی امر ہے جس کی ہمیں کم از کم عزیز احمد صاحب سے توقع نہیں تھی ان کی جنسیات اور عریاں نگاری میں دلچسپی بڑی عجیب و غریب ہے اور ایک بار جب ان سے سید علی عباس حسینی نے سوال کیا کہ وہ آخر اس حد تک فحش کیوں لکھتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ مجبور ہیں ان کا قلم اس طرف نکل جاتا ہے ان کے اس جواب سے ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ وہ ڈی ایچ لارنس کی طرح لاشعور کو محض گندگیوں کا مجموعہ بنا کر ہی پیش کرتے ہیں یا پھر ان کے لاشعور میں گندگی کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ بہرحال گریز کی بابت یہ رائے نہایت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اس کا فن بہت اونچا مگر مواد بہت گندہ ہے۔ ممتاز شیریں نے انہیں فطرت نگار ٹھیرایا ہے۔ کہتی ہیں:۔

"عزیز احمد فطرت نگاری کے قائل ہیں واقعات اور کردار زندگی میں جیسے ہیں جیسے گذرتے ہیں انہیں اس طرح پیش کرنے کی انھوں نے کوشش کی ہے وقت کے سلسلے' واقعات کے تسلسل اور افسانے کی تعمیر میں بھی ان کا انداز فطری ہے گو کبھی کبھی ان کی یہ فطرت نگاری حقیقت معلوم ہوتی ہے۔"[۲]

دوسرے نقادوں کی طرح اس بات کو تسلیم کیا جا سکتا ہے اگر عزیز احمد فطرت نگاری کے سلسلے میں زندگی کے

۱۔ تیسی نادلیں۔ نقوش لاہور ۔ ص۲ معیار ۔ ممتاز شیریں۔

دونوں رخوں کا بغور مطالعہ کرتے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے یہ کیسے سمجھا کہ زندگی محض برائیوں کا ایک کھیل ہے ظاہر ہے جو شخص زندگی کو محض برائیوں کا ایک کھیل تصور کرے وہ پورا فطرت نگار نہیں ہو سکتا ایسا معلوم ہوتا کہ ممتاز شیریں نے اشتراکی ادیبوں کا "جرم" دکھنے والی بات کی ہے۔ عزیز احمد کی اپنی رائے یہ ہے :-

> ہمارے جنس نگار ڈی۔ ایچ۔ لارنس سے متاثر ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی جنس نگاری ڈی۔ ایچ لارنس کو پڑھکر ہضم نہ کرکے ایک کھٹی ڈکار کی صورت میں نمودار ہوئی ہے [1]

ممتاز شیریں نے اس پر یہ حاشیہ آرائی کی ہے کہ ہمارے ادیبوں نے ڈی ایچ لارنس کو پڑھ کر ہضم نہیں کیا بلکہ ہمارے ادیبوں کا رویہ ڈی ایچ لارنس سے قطعی مختلف ہے ہمارے ادیبوں نے سماج کو یوں عریاں کرنا چاہا کہ ساری ڈھکی چھپی گندگی باہر نکل آئے ان کی تحریریں سماج کی اخلاقی قدروں اور پابندیوں اور ان سے منتج سماج کی گری ہوئی جنسی حالت پر بھرپور طنز ہیں مزید زیادتی ہیں۔ لارنس نے بھی سماج کی اخلاقی قدروں پر حملہ کیا تھا اور انہیں بے جا پابندیوں اور مصنوعی قدروں اور سماجی انسان کی ریاکاریوں سے بے پناہ نفرت تھی یہ نفرت ان کی کالمز ودی پر تنقید سے ظاہر ہوتی ہے [2]۔ ممتاز شیریں کا یہ نعرہ کہ لارنس کا مقصد جنسی بے راہ روی اور گناہ کی زندگی پر تنقید نہیں ہے بلکہ ایک صحت مند جنسی توازن کی تبلیغ ہے۔ نرا کھوکھلا نعرہ ہے گندگیوں کو اچھالنا زندگی کی حقیقتوں سے دامن بچا کر چلنا عریانی کو ہر وقت ذہن میں بسائے رکھنا اور معصوم جذبات کو بھڑکا کر جنسی لذت حاصل کرنا۔ زندگی کا مذاق اڑانا ہے۔

عزیز احمد۔ ڈی۔ ایچ لارنس سے متاثر ہیں۔ اس کے ادب کو ممتاز شیریں صحت مند جنسی توازن کی تبلیغ سمجھتی ہیں لیکن جب غور سے ڈی۔ ایچ لارنس کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس کے ہاں صحت مند جنسی توازن کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ جس صحت مند جنسی تبلیغ کے ہمارے ہاں گن گائے جاتے ہیں اس میں نہ صحت ہے نہ توازن وہ تو محض عریانی اور فحاشی کا اشتہار ہے اس اشتہار کو علمیت اور فنکارانہ مہارت سے دلفریب بنایا گیا ہے لیکن اس کی تاثیر میں وہی تخریبی پہلو مضمر ہے جہاں زندگی محض ایک مذاق ہے۔ ڈی ایچ لارنس جنس کے عملی تجربوں کی دعوت دیتا ہے وہ عریانی کے مفہوم کو ہی ختم کر دیتا ہے وہ محض جنسی لذت کو ہی زندگی سمجھتا ہے عزیز احمد نے اس فلسفے کو شعوری یا لاشعوری طور پر اپنا لیا۔ ممتاز شیریں کی نظر میں لارنس کی جنسی تحریریں جسمانی مظاہروں کے ساتھ ساتھ لطیف سے لطیف اور نازک سے نازک احساس کی عکاسی کرتی ہے اور جنس کی پیش کش ہیں جو ان کی نظر میں (لارنس کی نظر میں) زندگی کی قوت ہے اور لارنس جسمانی لذت کے ساتھ حسن مسرت روشنی قوت اور امن کا احساس دلاتے ہیں۔ لارنس نے جنس کو ایک فلسفہ بنا لیا تھا بلکہ ایک مذہب کا درجہ دے دیا تھا انہوں نے خود کو اس کا پیغمبر گردانا اور آخر میں اس کے جیسا کہ مڈلٹن مرے نے اپنی کتاب "سن آف ومین"

---

[1] عزیز احمد۔ بحوالہ ممتاز شیریں۔ معیار۔ [2] معیار۔ ممتاز شیریں [3] معیار۔ ممتاز شیریں۔

میں لکھا ہے صلیب زدہ شمار ہوئے[1]۔ ممتاز شیریں کے اس خیال کو ہم محض عقیدت ہی کہہ سکتے ہیں اس لیے کہ عقیدت ہی ایک ایسا تصور ہے جہاں انسان بہت سی باتوں پر غور کیے بغیر ایمان لے آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک "جنس" کے تصور میں توازن رہتا ہے اس کی اہمیت اور افادیت برقرار رہتی ہے لیکن جب یہی جنس کا موضوع حد سے بڑھ جاتا ہے تو عریانی اور فحاشی کے روپ میں پھیل جاتا ہے کہ انسانیت اور اخلاقی قدروں کے معیار پر عریانی اور فحاشی کبھی پوری نہیں اتر سکتیں انسانیت اور اخلاقی قدریں جو کہ تہذیب کا معیار ہیں فحاشی کو برداشت نہیں کر سکتے ہو سکتا ہے مغرب میں انہیں ایسا ہی سمجھا جاتا ہو جیسا کہ مڈلٹن مرے نے اپنی کتاب میں لکھا ہے لیکن مشرق میں اور خاص طور سے پاک و ہند میں یہ جنس کے عملی تجربے جن پر لارنس کو بڑا ناز ہے پسند نہیں کیے جائیں گے[2] اور جن ناول نگاروں نے انہیں نیا اور اچھوتا موضوع سمجھ کر اپنایا وہ "جنس نگار" قرار دیئے گئے۔ عزیز احمد نے اس فلسفے کو بغیر کسی کھٹی ڈکار کے ہضم کر تو لیا اور اپنے تمام ناولوں میں اس کو برتا بھی (خصوصی طور پر گریز میں) لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی عزیز احمد کے ناولوں کی سب سے بڑی کمزوری بن گئی۔

عزیز احمد کی ناول نگاری کے موضوع محدود اور مقاصد "گریز" ہی سے قائم ہو جاتے ہیں مگر ایسی بلندی ایسی پستی میں وہ ایک خاص زندگی کو اپنا دائرہ بنا کر اپنے مقاصد کو واضح کرتے ہیں اور اپنے فن پر عمل کی مثال پیش کرتے ہیں اس میں حیدرآباد دکن کے امرا کی معاشرت کا خاکہ سامنے لایا گیا ہے جہاں مغربی تہذیب و تمدن کی کورانہ تقلید کی جاتی ہے۔ تن آسانی اور عیش و نشاط کی محفلیں جمتی ہیں ہوس رانی اور میخواری کے علاوہ وہ تمام لعنتیں جو جاگیرداری نظام کی پیداوار ہوتی ہیں معاشقے، کلب، گھڑ، پارٹیاں، درباداریاں، خیانتیں، حصول اقتدار کی ہوس، سماجی تقریبیں، امارت کے مظاہرے، آپس کی ریشہ دوانیاں اور رقابت کے نقشے بڑی خوبی سے پیش کئے گئے ہیں اس ناول میں بجائے کسی مخصوص کردار کو لینے کے ایک پورے معاشرے کو لیا گیا ہے جس میں مختلف مرد اور عورت برابر اہمیت رکھتے ہیں اور ان کا وجود صرف اس لیے اہم ہے کہ وہ ایک خاص معاشرے کے نمائندے ہیں زیادہ تر اس ناول میں حیدرآباد کے جاگیردارانہ طبقے کے نقوش ہیں۔ گھروں میں مستورات کی زندگی ایک طرف اور دوسری طرف مردوں کی زندگی کے بہت سے دلچسپ مناظر سامنے لائے گئے ہیں مگر ان سب سے زیادہ دلچسپ عیش پرستی کی زندگی ہے ان کو کمال کے ساتھ دکھانے کے لیئے ناول حیدرآباد سے ڈیرہ دون پر آجاتا ہے۔ جہاں گرمیوں کے زمانے میں تفریح کے لیے ہندوستان کے ہر طبقے، ہر ملت و مذہب کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ ان سب میں ایک مسز پرنش سب سے زیادہ نمایاں ہو جاتی ہیں۔ کیوں کہ ان کے دو کردار ہیں۔ ایک اس وقت کا جب کہ ان کے شوہر ڈیرہ دون میں ہیں اور دوسرا اس وقت کا جبکہ ان کے شوہر ڈیرہ دون سے کسی کاروباری مقصد کے لیے باہر چلے جاتے ہیں۔ یہاں پھر "گریز" کی فضا قائم ہو جاتی ہے اور عریاں سین سامنے آتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ جوں توں ناول ختم ہو جاتا ہے۔

---

[1] سیاہ۔ ممتاز شیریں [2] ہمارے ہاں ترقی پسند مصنفین باقاعدہ اس بات پر ناز کرتے ہیں۔

یہ "گریز" کی طرح کرداری ناول نہیں بقول محمد حسن عسکری یہ اردو کا پہلا اجتماعی ناول ہے عزیز احمد نے اس میں ایک پورے معاشرے کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عزیز احمد نے کوئی بڑی بات کہنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ضمنی باتوں میں الجھ گئے اور ناول کا دائرہ محدود ہوتا چلا گیا اور جب ناول ختم ہوتا ہے تو ہمارے ذہن پر مجموعی طور پر جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ ویسا نہیں جیسا کہ عزیز احمد کی توقع تھی۔

کرداروں میں سریندر کے کردار میں کہیں کہیں گہرائی پائی جاتی ہے اس ناول کا مرکزی کردار نورجہاں کی کچی مٹی ہے۔ نورجہاں کے کردار کے متعلق ممتاز شیریں کہتی ہیں: —

"نورجہاں کچی مٹی ہے جس طرح اسے ڈھالا جائے ڈھل سکتی ہے۔ نورجہاں کی زندگی خام مواد ہے جو ایک طرف وراثت اور دوسری طرف خارجی ماحول کے زیر اثر تشکیل پاتی ہے۔ اس کے اردگرد کی چیزیں اس کی زندگی میں جذب ہو جاتی ہیں اس کے آباؤ اجداد کی طرز زندگی ان کے کردار کی خوبیاں اور خامیاں ان کی لغزشیں سب نورجہاں کی زندگی پر اپنا اثر چھوڑتی ہیں مگر نورجہاں خود معصوم ہے اور اس کا اپنا کوئی واضح کردار نہیں' نورجہاں کی زندگی اس کے کردار سے نہیں بنتی یہاں تک کہ اس کی سلطان حسین کے ساتھ ازدواجی زندگی کے چھوٹنے سے المیہ کی بھی وہ خود ذمہ دار نہیں بڑے قد کے کرداروں کا المیہ خود ان کے کرداروں سے پیدا ہوتا ہے۔ فرد کے کردار میں نہیں معاشرے میں ہے۔"[۱]

اس ناول میں بھی عزیز احمد کی فکر کا وہی انداز ہے جو ہمیں "گریز" میں ملتا ہے۔

جلال الدین احمد[۲] نے اس ناول کو گالزوردی کے ناول "FORSYTHE SAGA" سے اس بنا پر مشابہت بتائی ہے کہ اس میں بھی ایک پورے خاندان اور اس میں کئی پشتوں سے بھی بدلتے ہوئے حالات مرکز توجہ ہیں مگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس ناول میں بھی صالح اخلاقی مقاصد کی کمی کی بنا پر یہ ناول بہت پست ہی ہو جاتا ہے۔ عزیز احمد کی ہستی اور علم سے جو امیدیں ہونا چاہیئے تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں اور یہ ناول بھی ان کی تنگ خوئی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے بہرحال اختصار انتخاب اور ترتیب کا یہ ناول بہترین مثالوں میں لیا جا سکتا ہے اور اگر اس میں زندگی بھی اپنے مکمل اخلاقی پہلو کے ساتھ دکھائی جاتی تو یہ مقبول خاص و عام بھی ہوتا اور اردو کی کلاسکس میں جگہ پاتا۔ زندگی کے وسیع تاثر کو پیش کرنے کی یہ ناول مثال ہے۔

ان کا آخری ناول "شبنم" اتنا ہی زیادہ محدود ہے جتنا کہ "ایسی بلندی ایسی پستی" وسیع ہے۔ یہ بھی ایک کرداری ناول ہے۔ "شبنم" ایک عام صورت کی مگر نوجوان لڑکی ہے عزیز احمد نے اس کے کردار کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے شبنم میں بہت کم خوبیاں ہیں۔ جو کہ ایک ناول کی ہیروئین کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ ایک طرف تو اس کی دادی یا نانی طوائف تھی اور

---

[۱] معیار — ممتاز شیریں — [۲] تین ناولیں — جلال الدین احمد نقوش لاہور۔

دوسری طرف اس کے نانا کسی نواب صاحب کے ہاں فراش تھے۔ والد منصف تھے اور اب ریٹائر ہو کر پنشن لے رہے تھے۔ شبنم کے درمیان شہور میں تقریباً ہر شخص جانتا ہے کہ وہ نوازش علی خاں سے ایک ناکام عشق لڑا چکی ہے اور پھر جذبات کی رو میں بہہ کر منظور حسین کے ہاتھوں تباہ ہوئی (یہ بات پروفیسر اعجاز حسین سے نوازش نے کہی تھی) اس کی منظور کے ہاتھوں تباہ ہونے کی کہانی ہر شخص کو معلوم ہے بلکہ کچھ لوگ تو یہاں تک سمجھتے ہیں کہ شبنم پڑھی لکھی ذرا اونچے طبقے کی طوائف ہے حتیٰ کہ ایک جگہ زیبا ہیرو ارشد کی پرانی محبوبہ کہتی ہے "پچھلے سال شبنم کا حمل ساقط کرایا گیا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود مدیر "دکن آبزرور" ارشد علی خاں شبنم میں بے پناہ دلچسپی لیتے ہیں اس کے جیسوں جیسے بال ترشے ہوئے ہونٹ انہیں بہت زیادہ پسند تھے وہ خود شرابی ہیں فلرٹ لڑاتے ہیں لڑکیوں میں دلچسپی لینا اور ان کا پیچھا کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے وہ شبنم سے دلچسپی لیتے ہیں پہلے تو شبنم باوجود اس قدر بدنام ہونے کے التفات نہیں برتتی اور ارشد کی ایک ادیب ہونے کی حیثیت سے عزت کرتی ہے۔ ارشد باوجود بے حد آزاد خیال ہونے کے شبنم کے عاشقوں کی برابر چھان بین کرتا ہے اور اس وقت جب کہ شبنم قطعی طور پر ارشد کی ہونے والی تھی تو اس کو محسوس ہوا کہ جسے وہ چاہتا ہے اسے کبھی حاصل نہ کر سکے گا اس کا جواز اس نے یہ پیش کیا کہ جب جسم مل جاتا ہے تو وہ جسم نہیں ہوتا جس کی لو سے عشق کا چراغ جلتا ہے اس کے نزدیک وصال ہو یا فراق دونوں صورتوں میں عشق کا امکان باقی نہیں رہتا اور اس طرح وہ شبنم کو ٹھکرا دیتا ہے کہانی کے لحاظ سے بھی یہ بات کچھ ادھوری سی ہے — شبنم کے بعد سے عزیز احمد نے ناول نگاری بالکل ترک کر دی ادھر دس برس سے زیادہ ہو گئے کہ انھوں نے کوئی ناول نہیں لکھا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر ناول نگاری کی صلاحیتیں ضرور ہیں مگر جیسے انہیں زندگی کی کسی چیز پر خلوص کے ساتھ عقیدہ نہیں ہے۔ ویسے ہی انہوں نے ناول نگاری کو بھی کسی اونچے نصب العین کو سامنے رکھ کر نہیں برتا۔ ان کی فنکارانہ ہستی عمیق نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اور کاموں میں پڑنے پر ان کا ناول نگاری کی طرف رجحان ختم ہو گیا۔ ہم جلال الدین احمد کی رائے کی طرف پھر متوجہ ہوتے ہیں کہ وہ عزیز احمد کو جتنا بڑا ناول نگار منوانے پر تیار ہیں اتنا بڑا ناول نگار ہونے کے لیے عزیز احمد کی خود کی ہستی میں کچھ اخلاقی بلندیاں ہونا بھی لازمی ہیں جن کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کی ناول نگاری اول درجے تک نہیں پہنچ سکی — ناول نگار جب کسی ماحول سے واقف نہیں ہوتا اور اس کو اپنا موضوع بنا لیتا ہے تو اسے بڑی بڑی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ بقول وقار عظیم۔ "ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اور رائے آر خاتون کے فن کا خلوص اس بات سے ظاہر ہے کہ وہ اس موضوع کو اپناتے ہیں جن سے وہ واقف ہوں"[1] — وقار عظیم "عزیز احمد کے ناولوں میں اس قسم کے خلوص کی کمی پاتے ہیں جو پاکستان بننے کے بعد لکھے گئے ہیں۔ وقار عظیم مزید فرماتے ہیں "عزیز احمد جیسا فن کار جو ناول کے فن سے بخوبی واقف ہے اور اسے بڑے حسن کے ساتھ برتنے پر بھی قادر ہے اس نے سوائے سستی قسم کی پسندیدگی حاصل کرنے کے اور کوئی کام نہیں کیا ان کے ناول شبنم کو پڑھ کر قاری کم از کم یہی نتائج اخذ کرتا ہے کہ عزیز احمد کی ناول نگاری عہد حاضر میں فن کے استحصال اور ناقدری کی سب سے نمایاں مثال ہے"

---

[1] داستان سے افسانے تک — وقار عظیم صاحب

اندر جیت وت امرتسری

حسرتِ دیدار باقی ہے

راجہ مہدی علی خاں مرحوم کی شخصیت کا ایک روشن پہلو

اس دنیا کی ہر شے فانی ہے۔ ہر بقا کو ایک دن فنا سے دوچار ہونا ہے۔ اس حقیقت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن اس جہانِ فانی میں چند ایسی شخصیتیں بھی جنم لیتی ہیں جن کی ذات سے ملک و قوم کے بے شمار افراد متاثر ہو کر ان کے کوچ کر جانے پر اپنے اندر کوئی ایٹم سا ٹوٹتا ہوا محسوس کرتے ہیں اور ان کے دل غم سے بھر آتے ہیں — ایسی ہی ایک شخصیت تھی۔ راجہ مہدی علی خاں۔ محبت و خلوص کے بیکراں سمندر طنز و مزاح کی دنیا کے شہنشاہ اور برصغیر ہند و پاک کے عظیم ادیب و شاعر جو آنِ واحد میں ملک کے کونے کونے میں صفِ ماتم بچھا کر خود ایک ایسے پردے کی اوٹ میں چلے گئے جس کے پیچھے جھانک کر آج تک کوئی نہیں دیکھ پایا۔

ایک عرصہ تک میں انھیں عظیم مزاحیہ شاعر اور فلمی دنیا کے ہر دلعزیز گیت کار کی شکل میں دیکھ کر ان کے کلام سے لطف اندوز و فیضیاب ہوتا رہا۔ جب اُن کے طنزیہ مضامین مشہور اہلِ قلم حضرات کے محبوب "شعلے" کی پہلی قسط شائع ہوئی تو مجھے اُن کی ادبی و صحافتی صلاحیتوں سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ مجھے ان کا طرزِ نگارش کچھ اتنا پسند آیا کہ ان کی خدمت میں اپنے دلی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ایک تعریفی خط لکھنے پر مجبور سا ہو گیا۔ یہ رسمی خط میرے اور ان کے درمیان دوستانہ تعلقات کی داغ بیل کا کام کرے گا۔ خیال میرے وہم و گمان میں بھی نہ آیا تھا۔

ایک اچھے فن کار کے لیئے اپنے فن کی داد حاصل کرنا اور پرستار پیدا کرنا ایک قدرتی بات ہے۔ لیکن اپنے پرستاروں کی عقیدت برقرار رکھنا اور ان کے دلوں میں ہم عصری کے جذبات پیدا کرنا کچھ ایسی صفات ہیں جو بیشتر فن کاروں میں شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہیں۔ راجہ صاحب میں یہ اوصاف کس حد تک موجود تھے، جواب میں ملاحظہ اس کا ناقابلِ تردید ثبوت تھا۔

ع "آپ کے ہاتھوں نے سمجھا پھٹکار کے قابل مجھے"

"میری انٹ شنٹ بکواس آپ کو از حد پسند آئی۔ یہ میری انتہائی بدقسمتی ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ عجیب انسان ہے۔ تعریف پر سیخ پا ہو رہا ہے۔ بھئی اس میں خوشی کی بات ہی کیا ہے۔ ایک گھٹیا تحریر کی اتنی تعریف کس سرپھرے کو کل دیوانہ بننے پر آمادہ نہ کر دے گی! نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ اور پاگل پن کا مظاہرہ کر کے کسی دل جلے سے اپنی ہڈی پسلی ایک کروانے کے سامان خود بہم کرے گا۔"

"ایک ادیب کی لیئے اُس کی بری بھلی کاوشوں کا بہترین انعام آپ جیسے ذی ہوش قارئین کے بلند ذوق خطوط سے بڑھ کر اور کیا ہو گا۔ اس پر سے آپ اپنی دلچسپی برقرار رکھ کر آئندہ بھی اپنی گرانقدر رائے کا اظہار فرماتے رہیں گے۔"

مخلص۔ راجہ مہدی علی خاں

دوسری اور تیسری قسط شائع ہونے پر ان کے محبت نامے سے تحریک پاکر دو خط لکھے لیکن جواب ندارد۔ قریبًا قریبًا مایوس ہو چکا تھا کہ اچانک ان کا گرامی نامہ موصول ہوا۔

"شرمندہ ہوں کہ آپ کے دو گرامی ناموں کے جواب نہ لکھ سکا۔ عرصہ دو ماہ سے سخت علیل ہوں۔ دل و گردے متورم ہیں۔ پچھلے ہفتے ہی ہسپتال سے گھر لوٹا ہوں۔ ڈاکٹروں کی طرف سے پڑھنے لکھنے پر سخت حکم امتناعی جاری کئے جانے کے باوجود آپ جیسے چند قرض خواہوں کا قرض چوری چوری ادا کر رہا ہوں۔ امید ہے اب آپ کا دل صاف ہو گیا ہو گا۔"

اب ناظرین اندازہ لگائیں کہ ایک عظیم فن کار کی اس ذرہ نوازی پر کون پتھر دل انسان ہو گا جو دل و جان سے قربان ہونے میں رتی بھر ہچکچاہٹ محسوس کرے گا۔ مزاج پرسی کے خط کے جواب میں موصول ہوئے مراسلے سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

"یاد آوری کے لئے تہہ دل سے مشکور ہوں۔ حالت میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ البتہ اٹھ بیٹھ لیتا ہوں۔ ڈاکٹروں نے سمندری نمک کے بدلے لاہوری نمک استعمال کرنے کی فہمائش کی ہے۔ یہاں چاروں اطراف میں گھوڑے دوڑائے لیکن وہ پر لگا کر کوہ قاف کی پریوں سے ہمکنار ہونے چلا گیا ہے۔ دلی والوں سے بھیجنے کے لئے لکھا لیکن معلوم ہوا کہ وہاں سونے چاندی کے بھاؤ بکتا ہے۔ آپ بارڈر پر ہیں، آپ، آپ کے احباب اکثر پاکستان جاتے ہوں گے۔ ممکن ہو تو تھوڑی مقدار بھجوانے کی زحمت اٹھائیں کار عذاب ہو گا۔"

اتفاقًا میں ان دنوں لاہور سے ہو کر آیا تھا اور اپنی اہلیہ محترمہ کی فرمائش پر ۲/۱ ۲ سیر لاہوری نمک ساتھ لایا تھا۔ تھوڑی مقدار بذریعہ پارسل روانہ کر کے اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان تصور کر رہا تھا۔ راجہ صاحب نے اس حقیر خدمت کو کن بلندیوں پر اچھالا اس کا اندازہ شکریے کے خط سے لگانے کی کوشش کیجئے:۔

"آپ کا بھیجا ہوا پارسل آج ہی موصول ہوا ہے۔ اس پر لگے ٹکٹوں کو دیکھ کر میرے ہوش گم ہونے لگے۔ اس ننگ خلائق کے لئے آپ نے کس قدر زحمت اٹھائی۔ اپنے نوکر ہنی بل کو بلا کر اپنے سامنے پارسل کھلوایا ہے۔ اس سے برآمد شدہ آپ کی انسانیت پرستی کا درخشاں شفاف اور بلوریں ثبوت دلنواز مسکراہٹیں بکھیرتا ہوا میرے دل و دماغ کو روشن کر رہا ہے۔ اور اس میں سے جھانکتا ہوا آپ کا تمسخر آمیز چہرہ بار بار پوچھ رہا ہے۔ کیوں بیٹا! اب تو ہمارے نمک خواروں میں آ گئے ہو۔ کبھی نمک حرامی تو نہ کرو گے! آپ کی اس عنایت کا حق تو شاید ہر دو عالم میں ادا نہ ہو سکے۔ لیکن آپ اس پائی پائی لاگت سے مطلع فرما کر شکریہ ادا کرنے کی توفیق بخش دیں تو تا عمر بے دام غلام رہوں گا۔"

جواب میں لاگت جاننے کے الفاظ پر اظہار ناراضگی اور ایک بھائی کے دوسرے بھائی کے کام آنے پر ولی مسرت حاصل ہونے کے بارے میں لکھنا ایک قدرتی امر تھا۔ اور ان کی جانب سے ایک اور پر خلوص خط ملا۔

ہو مائی ڈیر۔ ڈیر۔ ڈیر۔ ڈیر۔

فیو آر۔ کننگ ویری۔ نیئر۔ نیئر۔ نیئر!

پچھلی گستاخی پر سخت ناراض ہو۔ تمہیں ہونا بھی چاہیے۔ میں انتہائی بے ہودہ دوزخی کیڑا ہوں۔ اگر انسان ہوتا تو کیا ایسی حماقت کرتا اور آپ کے برادرانہ سلوک کی پوری دھجیاں بکھیرتا۔ اچھا اب غصہ تھوک دو میرے ڈارلنگ۔ آیندہ کبھی ایسی فاش غلطی سرزد نہ ہوگی۔ میں نے آج تک کسی سے نمک حرامی نہیں کی۔ کوشش کروں گا کہ تا عمر اس اصول پر کاربند رہوں۔۔۔ آپ کی بھابی بیگم ریحانہ رفیقی سلام بھجوا رہی ہیں۔ اللہ۔ اور ۔۔۔ بچے! دوست صاحب آپ کو یہ جان کر بڑی کوفت ہوگی کہ خداوند کریم نے ہمارا دامن امید ابھی تک اس نعمت جاوداں سے بھرنا مناسب نہیں سمجھا۔

پھر باقاعدہ خط وکتابت کا آغاز ہوا اور ایک مراسلے میں اپنے تعارف کے ساتھ ساتھ ملاقات کی سبیل نکالتے ہوئے لکھتے ہیں۔۔

"میں پچھلے اٹھارہ سال سے بمبئی میں مقیم ہوں۔ میری والدہ بہنیں اور دیگر رشتہ دار لاہور میں ہیں۔ چند در چند معروفیات نے آج تک اُن سے ملاقات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ پاسپورٹ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں ملنے پر مفصل پروگرام آپ کو لکھوں گا۔ اگر بحری راستے سے نہ جا کر ٹرین سے گیا تو راستے میں آپ سے ضرور ملاقات ہوگی۔"

اب ملاقات کا شوق دن بدن بڑھا ہوکر حسرت دیدار کو کسی غریب کی لڑکی کی طرح لمحہ بہ لمحہ جوان کرنے لگا۔ مزید ایک ماہ کے انتظار کے بعد تشریف آوری کے بارے میں استفسار کیا تو جواب ملا:۔۔

آپ سے بڑھ کر یہ نابکار ادھر آنے کے لئے پیچ وتاب کھا رہا ہے۔ لیکن صحت ہے کہ سدھرنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اکثر یوں محسوس ہوا ہے کہ فرشتہ اجل باہر کھڑا دستک دے رہا ہے۔ مرنا تو آخر سب کو ہے۔ پھر مجھے اس کا کیا غم۔ لیکن ۔۔۔۔ اپنی والدہ محترمہ کی قدمبوسی کی حسرت پوری کر لینا چاہتا ہوں ۔۔ ملک الموت کو حکم دینے میں تو اب تک کامیاب رہا ہوں لیکن ان سرخوں (لال فیتے والوں) سے الجھنا بس شیطان کا ہی کام ہے۔ پاسپورٹ حاصل کرنے میں سخت دقتیں ہو رہی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم پاکستان میں کیوں پیدا ہوئے۔ جب میں کہتا ہوں کہ خدا سے پوچھو کہ اس نے مجھے وہاں کیوں پیدا کیا تو یہ جواب انھیں مطمئن نہیں کرتا۔ ایک عزیز نے مجھے انٹرنیشنل پاسپورٹ دے کر ثابت کر چکے ہیں کہ تم انڈین نیشنل ہو۔ وہاں انڈین نیشنل لکھا بھی ہے اب وہ زاید المیعاد ہو گیا ہے۔ اس لئے حکم ہوا ہے کہ پھر ثابت کرو۔ شاید اب باقی عمر یہی ثابت کرتے گزر جائے۔

خدا خدا کر کے انھیں پاسپورٹ ملا تو چرخ کج رفتار نے ایک نئی مصیبت درمیان میں کھڑی کر کے ہماری امیدوں پر پانی پھیر ڈالا۔ یعنی دونوں ممالک میں جنگ چھڑ گئی۔ اب حالات سازگار ہونے تک صبر کے کڑوے گھونٹ پینے کے ماسوا

چارہ ہی کیا تھا۔ اسی دوران میں اپنے ایک نوآموز ادیب و شاعر کے اصرار پر اُسے اپنی شاگردی میں قبول فرمانے کی استدعا کے ساتھ اس کا کلام رسالوں میں چھپوانے کے لئے سفارش کے لئے لکھا تو اُنھوں نے کمال صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے لکھ بھیجا۔

"میں بے انتہا معروف آدمی ہوں۔ میری صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی اس لئے میں نے آج تک کسی کو شاگرد نہیں بنایا ہے۔ ہزاروں نوآموز شاعروں نے میرے دروازے پیٹ ڈالے لیکن میں نے ہمیشہ معذرت کر دی اور کہہ دیا کہ اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ مجھے معلوم نہیں کہ ایڈیٹر لوگ نظمیں اور مضمون بھی سفارش سے شائع کرتے ہیں۔ اس کا تجربہ نہ کبھی بچپن میں ہوا۔ اور اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن آپ کے دوست ایسا سمجھتے ہیں تو ان کا خیال کسی حد تک ٹھیک بھی ہوگا۔ میں ان کے بارے میں کہتا ہوں کہ ہر نوآموز ادیب و شاعر لڑکا اپنے آپ کو غالبؔ اقبالؔ۔ کرشن چندر یا منشی پریم چند سمجھتا ہے اور ہر لڑکی اپنے آپ کو عصمت چغتائی۔ بہرحال جو خدمت مجھ سے ہو سکے گی ضرور کروں گا۔ آپ کی تحریر سے ایک اچھا فن کار بننے کی بو آتی ہے کیوں استاد! کہیں دوسروں کے کندھے پر بندوق رکھکر نشانہ سادھنے کی سازش تو نہیں ہو رہی ہے۔ تم کیوں نہیں لکھتے اس فن کو پالنے میں کیا مضائقہ ہے؟"

کہہ نہیں سکتا کہ میرے دوست پر اس تحریر کا کیا اثر ہوا لیکن اس تحریک نے میرے خیالات کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی۔ شب و روز کی جان ماری کے بعد ایک افسانہ مکمل کر کے جھجکتے ہوئے ماہنامہ "سب رس" کو روانہ کیا گیا۔ جب قابل اشاعت کی اطلاع موصول ہوئی تو میری حیرت و مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ یہ سب راجہ جی کی چوری سے کیا گیا تھا لیکن افسانہ چھپتے ہی اُن کے اس خط سے پتہ چلا کہ پرچہ اُن کے ہاں بھی جاتا ہے۔

"کیوں استاد! پکڑے گئے نا۔ یہ چوری چھپے دل پر تیر چلانے کی ادا کس سے سیکھی۔ (افسانہ کا عنوان "دل اور تیر تھا") میں نہ تو چور ہوں اور نہ ہی چور کا بھائی۔ آج سے تم سے قطع تعلق کا اعلان کرتا ہوں۔ آئندہ کبھی بھولے سے بھی کسی سے یہ مت کہنا کہ کبھی تمہارے اور میرے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات قائم تھے۔ ورنہ تمہارے نام پر اتنی کیچڑ اچھالوں گا کہ بے موت مارے جاؤ گے۔"

صفائی میں اُن کے خط سے تحریک ملنے اور یہ پہلی کاوش ہونے کی دہائی دی گئی اور وہ بمشکل یقین لائے اچھا افسانہ لکھنے اور پہلی کامیابی پر داد دیتے ہوئے کاوشیں جاری رکھنے کی تاکید بھی کی۔ ایک مرتبہ جواب دینے میں ضرورت سے زیادہ تاخیر سے کام لینے کی شکایت کی گئی تو اپنی مجبوریوں کو طنز و مزاح کی لطیف چاشنی میں ڈبوتے ہوئے یوں معذرت خواہ ہوئے۔

"جواب میں کسی قدر تاخیر ہو گئی۔ آجکل کبھی کبھی کھانا کھانے کے لئے بھی فرصت نہیں ملتی۔ بعض نہایت ضروری

ضروری خطوں کے جواب بھی لکھنے پڑتے ہیں۔ اتنے خط آتے ہیں کہ مجبوراً ایسے بیشتر خطوط تلف کرنے پڑتے ہیں۔ کیونکہ بیشتر خطوط بیکار قسم کے ہوتے ہیں۔ عموماً لوگ ۶ پیسے کا کارڈ لکھ کر تصویر مانگتے ہیں ایسے خطوط بڑی بے دردی سے تلف کر دیئے جاتے ہیں — اسی بوکھلاہٹ میں ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ قابل جواب خطوط غلطی سے پرزہ پرزہ کر دیئے اور بے کار مکتوبات جواب دینے کو باقی بچ گئے۔"

اُن کے محبوب مشغلے کچھ اس طرح مقبول عام ہوئے کہ ہر چھوٹا بڑا ادیب و شاعر اُن سے اپنی گت بنوانے کی حسرت دل میں لئے ماہی بے آب نظر آنے لگا۔ ایک مشہور ناول نگار سے ملاقات ہونے پر وہ بھی یہی رونا لے بیٹھے۔ راجہ صاحب نے مجھے اچھی طرح جانتے ہوئے بھی نظر انداز کر دیا۔ میں نے اگلے خط میں اس واقعے کا سرسری ذکر کر دیا۔ جواب ملا۔

"حق بات یہ ہے کہ .. صاحب کے محبوب مشغلوں سے میں واقف نہیں بہتر ہوگا اگر آپ بذات خود اپنے محبوب مشغلوں سے مجھے نوازیں۔ اور بواپسی — اس لئے کہ میں ان مشغلوں کو بند کر رہا ہوں۔ تاخیر کے ذمہ دار آپ ہوں گے"

میں نے اپنی دانست کے مطابق صاحب موصوف کے مشغلے لکھ کر انھیں روانہ کر دیا ہے دیکھتا کیا ہوں کہ اگلی قسط میں وہ مشغلے قدرے رد و بدل کے ساتھ شامل اشاعت تھے ۔

عجیب منحوس اتفاق ہے کہ اُسی جریدے (جس میں راجہ صاحب کے مضامین شائع ہوئے تھے) کے ستمبر کے شمارے میں راجہ صاحب کے محبوب مشغلوں سے متعلق ایک مشہور اہل قلم خاتون کا مضمون (جو شاید راجہ صاحب کی موت سے مہینوں پہلے لکھا گیا تھا) شائع ہوا اُس پرچے میں اُن کی موت پر آٹھ آٹھ آنسو رُلانے والے قطعات اور تعزیت نامے شائع کرنے پڑے — مضمون از راہ مذاق لکھا گیا آخری جملہ "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"۔ تختہ مزاح کے لئے جان لیوا ثابت ہوا — راقم میرے خط کے جواب میں اس حادثے پر اظہار تاسف کرتی ہوئی لکھتی ہیں: —

"مذاق اس درجہ سنجیدگی اختیار کرے گا اس کی خدا کی ذات سے توقع نہ تھی اب تک آس پاس والوں کی رائے تھی کہ میری زبان کالی ہے — لیجئے! زبان قلم نے بھی یہ رنگ اختیار کر لیا۔ راجہ صاحب میرے بھی بہت اچھے دوست تھے ان کی تعزیت کا مجھے بھی انتہائی رنج ہے اور ساتھ ہی ندامت بھی۔ میں خود کو قتل کے مجرم سے کم نہیں سمجھ رہی۔

ع ۔ ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد ۔"

ہند و پاک کے لاکھوں ادب نواز اشخاص کے دلوں میں مسرت کی آتش بازیاں چھوڑنے والا یہ عظیم انسان اور فلمی ادبی اور صحافتی سلطنت کا ہر دلعزیز شہنشاہ دنیائے طنز و مزاح میں ایک نئے دور کا اضافہ کر کے برسوں ادبی محفلوں کو زعفران زار بنائے رکھنے کے بعد عروج کے عین نصف النہار پر پہنچ کر اپنے دل میں اپنی والدہ محترمہ اور بہنوں سے ملنے کی حسرت دید لئے اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ شاید وہ جنت کی بلندیوں سے جھانکتا ہوا میری حسرت دید پوری نہ کرنے کی وعدہ خلافی پر معذرت خواہ ہو سے

دیکھو تو تصویر میں میرا آنکھیں وقف انتظار دیکھتے ہی دیکھتے کمبخت آخر دہ گئیں

غلام رسول کڑپوی
اننامالائی یونیورسٹی

حضرت شاہ کمال (کڑپوی) کا مسلک

جنوبی ہند میں صوفی شاعروں کی کمی نہیں ہے مگر ان کی طرف بہت کم لوگوں کا دھیان گیا ہے۔ ان کی تصنیفات کا مطالعہ دکنی ادب کی تاریخ میں ایک اہم باب کا اضافہ ہوگا۔ ہندی کے ملک محمد جائسی، قطب اور عثمان نے ہندی ادب میں اسلامی تصوف کا دروازہ کھولا۔ اسی طرح دکن کے شاعروں نے دکنی میں تصوف کی ملاوٹ کی۔ ان شاعروں میں حضرت شاہ کمال کا نام ایک خصوصی مقام رکھتا ہے۔

پیدائش :۔ شاہ کمال الدین کے خاندان کا تعلق بخارا سے ہے۔ آپ کی پیدائش کڑپہ (رائی چوٹی) (آندھرا) میں ہوئی آپ حیدر علی کے معاصر ہیں۔ فن شعر و شاعری میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس لئے اہل ادب آپ کو "جامی دکن" کہتے تھے۔ دکنی اور فارسی میں آپ کے کئی دیوان ہیں۔ آپ کی تعلیم و تربیت حضرت سید محمد حسینی شاہ میراول کے پاس ہوئی۔ آپ انھیں کے خلیفہ بھی ہیں اور چھوٹے بھائی بھی۔ اپنے شعروں میں آپ نے اپنے اُستاد کی جا بجا تعریف کی ہے ؎

اسم احمد اسم حق اور اسم احمد جسم پیر — نقش اسم پیر سراپا مری تصویر ہے۔ (دیوان شاہ کمال صفحہ ۲۶۰)

شعر و سخن میں آپ نے کسی کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا۔ یہ آپ میں خداداد قابلیت تھی۔ آپ نے ہر صنف میں طبع آزمائی فرمائی ہے۔ لہذا جامی دکن کا لقب آپ کے لئے موزوں ہے۔

اخلاق :۔ آپ کی زندگی نیک اخلاق کا ایک اعلیٰ نمونہ تھی۔ آپ محبوب عوام تھے اور شریعت پر سختی سے عمل پیرا تھے روحانیت سے الگ ہو کر جو عمل کیا جاتا ہے۔ اس کے آپ سخت مخالف تھے۔

بے تفقہ جسے تصوف ہے — وہ تصوف نہیں تکلف ہے

حضرت خواجہ رحمت اللہ نائب رسول اللہ رحمت آبادی شاہ عبداللطیف وغیرہ آپکے معاصرین میں تھے۔ سراج دکنی سید محمد قاکی عاجز وغیرہ بھی آپ کے ہم عصر تھے۔ آپ کا زمانہ ولی دکن کا آخری زمانہ تھا۔ نواب گرم کنڈھا اور نواب محل آپ کے مریدین اور معتقدین میں سے تھے۔ نواب حیدر علی ٹیپو سلطان شہید آپ کی کافی عزت اور ادب کرتے تھے۔ کڑپہ اور سدھوٹ کے نواب کا ذکر آپ نے جا بجا کیا ہے۔ آپ نے مختلف مقاموں کا دورہ بھی کیا تھا۔ بڑے بڑے لوگ آپ کے حلقہ بگوش تھے۔

جنگ کے زمانے میں انگریزوں نے ٹیپو سلطان کے پاس ایک پیغام صلح بھیجا۔

اگر صلح کنید در حکم اللہ — وگر جنگ جوئید بسم اللہ

ٹیپو سلطان شہید نے یہ پیغام بغرض مشورہ حضرت شاہ کمال کے پاس بھیجا۔ آپ نے اس پر لکھ دیا "دشمن صلح خیر" مگر پیام رساں نے اس کو بدل کر "در صلح خیر" لکھ دیا۔

یہ خط پاکر ٹیپو سلطان نے جنگ کی تیاریاں کیں اور اس جنگ میں آپ شہید ہوئے۔ ۱۲۱۴ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ گرم کنڈہ میں آپ اپنے مرشد کے پائین میں مدفون ہیں۔

سیاسی حالات - جس وقت آپ کی پیدائش ہوئی تب ہندوستان ایک عجیب دور سے گزر رہا تھا۔ ہندوستان میں کمپنی راج کا بول بالا تھا۔ اور اس کے تین مرکز تھے۔ مدراس، کلکتہ اور بمبئی کرناٹک کے نواب مدراس کے رزیڈنٹ کے ماتحت تھے۔ نظام حیدرآباد کمپنی کے دوست تھے اور حیدر علی کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ اس وقت صرف دو طاقتیں نمایاں تھیں۔ ایک میسور کے حیدر علی اور دوسرے مرا ٹھے۔ مرہٹے آپس میں بٹ چکے تھے اسی لئے اُن کی طاقت بکھر گئی تھی۔ صرف حیدر علی کی طاقت انگریزوں کے لئے کانٹا بنی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ادھر اُدھر چھوٹے چھوٹے راجہ اور نواب تھے جو لاٹھی والوں کی بھینس بنے ہوئے تھے۔ اسی طرح چاروں طرف ایک سیاسی بدامنی اور طوائف الملوکی سی چھائی ہوئی تھی۔ ہر ایک طاقت اپنے سیاسی وجود کو بنائے رکھنے میں سرگرم تھی۔ ایسے ہی زمانے میں حضرت شاہ کمال نمودار ہوئے۔ وقت کی پیچیدگیوں اور افراتفری سے الگ ہو کر آپ نے اپنا کام جاری رکھا اور جنوبی ہند کے ادبی اور مذہبی حلقوں میں اپنے لئے ایک نمایاں مقام پیدا کر لیا۔

آپ کی تصانیف جن کی تعداد ۱۳ ہے انھیں ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں :-

دَورِ اول :- اس زمانے کی زبان ٹھیٹ دکنی اور سادگی کے ساتھ پرکاری لئے ہوئے ہے اس میں روحانیت بھی ہے اور پند و نصائح سے بھی مملو ہے۔

دَورِ دوم :- دورِ دوم میں تصوف کا غلبہ نظر آتا ہے۔ تصوف کے جن حقائق کا آپ نے تجربہ کیا ہے اس کے اثرات آپ کی شاعری میں بکھرے پڑے ہیں۔ زبان میں کہیں بھی گنجلک اور مشکل پسندی نہیں ہے۔

دَورِ سوم - تیسرے دور میں تغزل کا رنگ گہرا ہے۔ زبان بڑی لچکدار اور موثر ہے۔ زبان میں عربی اور فارسی الفاظ کی بہتات ہے۔ زبان بوجھل سی نظر آتی ہے۔ اس دور میں انسانی جذبات کی اچھی مرقع نگاری ہوئی ہے، برہ کی کسک کی جھلکیاں کلام میں جا بجا نظر آتی ہیں۔

مخزنِ عرفاں حضرت شاہ کمال کا دیوان ہے۔ مختلف عنوانات کے ماتحت آپ نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔

مُرشد - مرشد کے بغیر روحانی مدارج کو طے کرنا امر محال ہے۔ مرشد اپنے روحانی تجربہ کی روشنی میں مرید کی رہبری کرتے ہیں۔ گرو کے بنا گووند کو پانا ناممکن بتایا گیا ہے۔ جو شخص بغیر پیر کے اپنے مقصد کو پانا چاہتا ہے اس کا مقصد کو پانا مشتبہ ہے

چنانچہ حضرت کمال فرماتے ہیں کہ بغیر پیر کے حصولِ مقصدِ اعلیٰ ناممکن ہے ؎

جیوں خدا کو پونچنا ممکن نہیں　　مرشدِ فیاض کی امداد بن

انسانی تاریخ میں ایسی کوئی مثال ملنی مشکل ہے جبکہ کوئی متلاشی حق بغیر مرشد کے اپنے مقصدِ اعلیٰ تک پہنچا ہو ؎

منزلِ مقصد کو پہنچا جگ میں کون　　رہنمارِ جامع الاضداد بن

مولانا روم بھی اسی نقطۂ نظر کے حامل ہیں ؎

مولوی ہرگز نہ شد ملائے روم　　تا غلامِ شمس تبریزی نہ شد

کبیر داس بھی یہی اعلان کرتے ہیں ؎ بن ست گرو پاوے نہیں کوئی جو یہ راہ بتاوے

بغیر پیرِ کامل کے راہِ سلوک کو طے کرنا اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کی تمنا کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی پرندے کا بغیر پر کے اُڑنے کی کوشش کرنا اور بغیر موافق ہوا کے کسی ناؤ کا کنارے پر لگنے کی کوشش کرنا ؎

کیوں اڑے طایر ہوا میں بے جناح　　کیوں چلے دریا میں کشتی باد بن

زندگی کا راستہ نشیب و فراز سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں مختلف قسم کی رکاوٹیں اور پیچیدگیاں ہیں۔ قدم قدم پر حرص و ہوا راستہ روک دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر سالک کے قدم ڈگمگا جائیں تو تعجب ہی کیا۔ اسی لئے جو اس راستے سے پرامن طریقے پر گزرنا چاہے اسے مرشد کی رہنمائی کا چراغ ساتھ لیکر چلنا چاہئے پھر راستہ صاف ہے نہ پھسلنے کی فکر اور نہ گر پڑنے کا ڈر ؎

مت گزار اوقات پیو کی یاد بن　　مت یہ رہ چل پیر کے ارشاد بن

تنبیہہ۔ حضرت کمال لوگوں کو ڈھونگی پاکھنڈی ناتجربہ کار کچے مرشدوں سے ہوشیار رہنے کی تاکید کرتے ہیں۔ پیر کے لبادے میں جھوٹے پیر چھپے رہتے ہیں۔ ہوشیار! کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دھوکے میں آکر اُن کا شکار بن جاؤ وہ بھی گریگا اور تم کو بھی لیکر گریگا ؎

نے نکو درسِ کتابِ معرفت　　عاشقی کے علم کے اُستاد بن

کبیر فرماتے ہیں ؎ اندھے کو اندھا ملا راہ بتاوے کون۔

پیر سستے نہیں ملتے۔ سب کچھ دیکر ہی پیر کو پایا جاسکتا ہے تم جتنا دوگے پیر بھی تم کو اتنا ہی دیگا۔ جب تم اپنے کو پیر کے ہاتوں بیچ دوگے تو پیر تم کو کوئی انمول شئے بنا دیگا۔ تمہارا علاقہ پیر سے جتنا کم ہوگا اتنا ہی کم تمہارا لگاؤ پیدا ہوگا۔

مرشد سے معرفت کا جسے اکتساب کم　　اس کو علاقہ یاد سے اور اکتساب کم

پیر ہونا آسان ہے۔ اپنا تعلق کسی اونچے خاندان سے باندھنا یہ بھی آسان ہے۔ مگر جس اونچے مقام پہ فائز ہو اس کی ذمہ داریوں کو سنبھالنا بڑا مشکل ہے۔ اس اونچے عہدے کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی اپنے میں لیاقت

پیدا کرنا کارِ مشکل ہے حضرت کمال اس مقام کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہیں ؎

پیر ہو کر نا ہدایت خلق کو　　بہ طریق راست و راہِ خدا

پیر کی اہم ذمہ داریوں میں ایک اہم ترین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بندے کو خدا سے ملا دے، اس کے مدعا رنگ روپ کو دکھا دے اور اس طرح اپنے مرید کی زندگی کے اہم ترین مقصد کو پورا کر دے۔ اگر کوئی پیر اس مقصد اعلیٰ کے حصول میں ناکام رہتا ہے تو اس میں کھوٹ ہے وہ پورا پیر نہیں ہے حضرت کمال ایسے پیر کو پیر ماننے سے انکار کرتے ہیں ؎

کہلا کے پیر حق کو جو نہ دیکھے نہ اور دکھائے　　یا جوج ہے زمین کا نہیں شیخ آسماں

جس نے دیکھا اور دکھایا پیو کو وہ پیر ہے　　ورنہ بت ہے دیو ہے یا غول ہے یا بیر ہے　　(خبیث)

وہ ریاضت اور مشقت سے مرید کے اندر کے نقائص کو ایک ایک کر کے دور کرتا ہے اور پھر اس میں ایک ایک نیکی کو بھرتا ہے اور اس طرح اسے مجموعۂ صفاتِ نیک بنا ڈالتا ہے اور اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ اپنے میں اس کا جلوہ دیکھ سکے اسی لئے حضرت کمال فرماتے ہیں کہ پیر وہی ہے جو خود پیو کو دیکھتا ہے اور مرید کو دکھاتا ہے۔ اس سہارے کے بنا، اس کے درشن کہاں ؎　پیر نے پیو کو ہر شئے میں بتایا ہے مجھے　　ورنہ وہ پیو کہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

پیر کے پانے کے بعد ہی یہ راز مرید پر فاش ہوا ہے ورنہ وہ پہلے کور نابلد تھا ؎

پیو کو پیر سے پانا وگرنہ تو محال　　پیر یوں فیض رساں تھا مجھے معلوم نہ تھا

حقائقِ اصلیہ کے حامل پیر کے پردے میں ہی پیو تھا اس کا انکشاف طالبِ حق پر تب ہوا جب اس نے پیر کے دامن میں پناہ لی ؎

پیو نے پیر کے گھونگٹ میں دکھایا ہے جمال　　ہے عجب راز نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

بے نام و نشان بے روپ اور بے مثال کا تصور دماغ کو چکر میں ڈالنے والا ہے مگر یہ مشکل پیو نما پیر دور کر دیتا ہے بڑی گہری اور حقائق سے پر بات شاہ کمال نے یہاں کہی ہے ؎

پیو نے پیر نما آپ ہوا ہے ورنہ　　پیو بے نام و نشان تھا مجھے معلوم نہ تھا

کبیر داس ہو بہو یہی فرماتے ہیں ؎

نراکار کی آرتی سنتن ہی کی دیہہ　　لکھا جو چاہے الکھ کو انہی میں لکھی لیہہ

طریقۂ صوفیہ میں روحانی ترقی کی دو منزلیں ہیں۔
(۱) نبی کے واسطے حق تک پہنچنا (۲) پیر کے واسطے سے پہنچنا۔

اس طرح شیخ حضور اکرم اور حق تعالیٰ کے بیچ ایک لازمی رشتہ ہے۔ لہٰذا نبی اکرم اور حق کے حصول کے لیے پیر کی ضرورت ہے۔ حضرت شاہ کمال بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اس تعلق پر روشنی ڈالتے ہیں ؎

ہو فنا فی الشیخ اوّل پس فنا ہو فی الرسول   پس فنافی اللہ بقا باللہ ہیں رکعات عشا

حضرت کمال شیخ نبی اور حق کے بیچ کسی طرح کا فرق نہیں دیکھتے۔ اس ایقان کا وہ ببانگ دہل اعلان کرتے ہیں ؎

دو نہیں حق کی نبی کی پیر کی مجھ کو قسم   ایک ہے حق کا نبی کا پیر کا میرا وجود

جس مقام پر کھڑے ہو کر شاہ کمال یہ اعلان کر رہے ہیں وہاں وہ اپنے کو بھی اُن کے ساتھ ملا دیتے ہیں حق الیقین کا یہ وہ مقام ہے جہاں پر کہ دمہ کی رسائی ممکن نہیں۔ جو پہنچے ہوئے بزرگ ہیں وہی اس حقیقت کی اصلیت کو جان سکتے ہیں۔

حضرت کمال کے پیر۔ اوپر کی سطروں میں چند عام باتوں کا ذکر ہوا ہے جو ایک پیر کامل میں ہونی چاہئیں۔ نیچے کی سطروں میں حضرت کمال اپنے پیر کو پیش کرتے ہیں۔

وہ مرید قابل مبارکباد ہیں جن کو پیر کامل ملتا ہے وہ پیر کامل جن کی ایک ساعت کی ملاقات سو سال کی طاعت بے ریا سے اعلیٰ ہے جن کی ایک نگہ کرم سے زندگی کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ اگر مرید ایسے پیر کامل کی تعریف میں رطب اللساں ہے تو تعجب ہی کیا۔ حضرت شاہ کمال کے پیر صاحب دل تھے۔ روحانی حقایق سے آگاہ تھے۔ ایسے پیر کی تعریف مرید کے لیے ایمان افزا شئے ہے۔ حضرت کمال کو اپنے پیر پر فخر ہے وہ اقرار کرتے ہیں کہ پیر کے طفیل سے ہی وہ آج اس اعلیٰ مقام پر فائز نہیں ورنہ دمہ بھٹک گئے ہوتے۔ خدائی قرب ناممکن ہوتا ؎

خود بخود ممکن خدا رسی کہاں   پیر شہ میر رہ نما ہوتا

شاہ کمال نے کتنوں ہی کی جانچ کی ٹھونکا بجایا پر سب کو اندر سے کھوکھلا پایا تو انہیں چھوڑ دیا۔ آخر میں شہ میر اول جیسے رہبر اُن کو ملے۔ اُن کو دلی اطمینان ہوا ؎

کئی ہزاراں ناقص التحقیق رہ گئے اے کمال   فیضِ حق شہ میر کو اس علم کا ماہر کیا

دلی اطمینان تو ملا ہی حصول لقا بھی ہوا ؎

وہ مستحق منصبِ قرب و لقا ہوا   شہ میر سا ملا جسے صاحب کمال پیر

صاحب کمال پیر نے نہ صرف شاہ کمال کو ہی فیضیاب کیا بلکہ ایسے کتنے ہی حق کے متلاشیوں کو اپنے فیض سے سرفراز فرمایا ؎

چاہ خودی سے آوے راہ خدا میں کیوں   شہ میر دستگیری کس کی کیا نہیں

شہ میر اول سے شاہ کمال کو جو فیض حاصل ہوا ہے وہ انتہا ہی ہے کہ اس سے اُن کو اتنی روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے کہ وہ صدق دل سے اپنے کو شہ میر کی درگاہ کا داس بتانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں کی غلامی نے ان کو شاہ کمال بنایا۔

صدق دل عقیدہ جاں سے مجھے کمال   شہ میر دستگیر کی درگہ کا داس بوجھ

شاہ کمال کو جو پیر ملے وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے ایسے پیر کے قدموں پہ سر جھکا کر انھوں نے سب کچھ پا لیا۔ اُن کی نظروں میں دوسرا کوئی راہبر قابل اعتنا نہیں۔ دوسرے پیروں میں حقیقت بینی اور حقیقت نمائی کی کمی دیکھ کر حضرت فرماتے ہیں کہ میرے پیر کے فیض سے مجھ میں اتنی روحانی قوت پیدا ہو گئی ہے کہ عوام کو چھوڑ ئے اپنے کو پیر کہنے والوں کو بھی اپنا مرید بنانے کی صلاحیت میں اپنے میں پاتا ہوں ؎

حضرت شہ میر کے ارشاد کی تائید سے اب کے پیروں کو کروں اپنے مریداں تو سہی

ہر چیز میں اسکا جلوہ - وہ قادر مطلق ہے۔ دنیا و مافیہا کا سرجن ہار۔ اُسی ایک روپ کے یہ مختلف روپ ہیں۔ وہ سب میں رونما ہے۔ سب اُسی ایک حقیقت کے پرتو ہیں۔ ذرہ ذرہ اُسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دنیا کو بنانے والے نے دنیا کے ہر ذرہ پر اپنے کمال کا سکہ بٹھایا ہے۔ ہر پتہ اُسی کا تعارف کراتا ہے۔ ہاں دیدۂ بینا کی ضرورت ہے۔ حضرت کی وسعت نگاہ کی داد دیجئے ؎

اسے روپ ترا رتی رتی ہے پربت پربت پتی پتی ہے

پربت میں ادک کم پتی میں یکسا سارا اس اور رتی میں

یہ کہنا بھول ہے کہ یہ دنیا اس کے پرتو سے خالی ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے تو یہ سنسار بے سار ہے، بے جان ہے غیر حقیقی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ پھول کے روپ میں مسکراتا ہے۔ پرندے کی صورت میں چہچہاتا ہے۔ چاند کی شکل میں ہنستا ہے۔ گویا سب اُس کے مظہر ہیں۔ شاہ کمال بھی اس دنیا کو اِسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ اس روپ کو اندر باہر اور چاروں طرف دیکھتے ہیں۔ ذرہ ذرہ میں اس کا جلوہ نمایاں پاتے ہیں۔ اور اِسی کو ہر چیز میں محرک ؎

صورت اشیا سے اپنی ذات حق ظاہر کیا شکل مرسے پھر اپنا نور جیوں باہر کیا

چندر بدن اور مہیار کی مثال کو اسی مقصد کی وضاحت کے لئے شاعر اپناتا ہے ؎

جب جلوہ نما ہوئے چندر بدن مطلق ذرہ نہ رہے باقی مہیار کی ہستی سے

معرفت نفس معرفت رب ہے۔ اپنے میں گم ہو کر سب کچھ دیکھنا ہر کس و ناکس کی طاقت سے باہر ہے۔ اس کے لئے علم الیقین کا انجن چاہیئے۔ اس انجن کو لگا کر ہی کوئی دیکھ سکتا ہے ورنہ راز نہیں کھلتا ؎

جب چشم کو روشن نہ کرے گیان کا انجن منظر میں نہ منظر کا دسے نور نرنجن

پاکیٔ قلب - قلب انسان کی باطنی طاقتوں کا مرکز ہے۔ قلب کی پاکیزگی انسان کو عام سطح سے اٹھا کر اعلیٰ علیین تک پہنچاتی ہے لہذا روحانی ترقی میں قلب کی پاکیزگی اور اسکا تمام آلائشوں سے منزہ ہونا لازمی ہے۔ اس درپن میں پیو کی جیوتی کو دیکھنے کے لئے اسے صاف ستھرا رکھنا واجب ہے اس کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ حرص و ہوس مکر و فریب سے اپنے کو بچائے رکھنا چاہیئے۔

حضرت کمال اپنے کلام میں صفائی قلب پر کافی زور دیتے ہیں اغیار سے اپنے دل کو پاک رکھنے اور خانۂ خدا کو بتوں کا دیر بنانے سے روکتے ہیں ؎

رکھ اپنے دل میں یار کو اغیار سے تہی   اس خانۂ خدا کو بتوں کا نہ دیر کر

مذہب اور ذات پات کی بنیاد پر کسی سے اختلاف کیا؟ بنی نوع انسان کی حیثیت سے سب مساوی ہیں ایک دوسرے کی محبت کے متقاضی ہیں۔ حقارت اور بیر کے لئے جگہ نہیں۔ بیر انسان سے نہیں اسکی شیطانی حرکتوں سے ہونا چاہیئے۔ نفس اور شیطانی افعال کو کچلنا ہی ہمارا فرض ہے ؎

با خلق حسنِ خلق و ہر جنس صلح کل   مطلوب ہے تو نفس سے البتہ بیر کر

سب کے ساتھ خوش خلقی اور خوش اسلوبی کا برتاؤ کرو۔ اس کے نام کا ذکر کرو۔ ذکر آبِ حیات کا کام کرتا ہے۔ ذکر سے من درپن بنتا ہے۔ خطرات کا میل دور ہوتا ہے۔ یہ معجن منہ کی صفائی کا ضامن ہے ؎

کر ذکر تو خطرات کے دھو میل کو دل سے   اس منہ کی صفائی کو ہے نافع یہی منجن

یہ دنیا عمل کا میدان ہے۔ نیکی وبدی دو بیج ہیں۔ اس دنیاوی میدان عمل میں جیسا بیج بوؤ گے ویسا ہی پھل ملے گا۔

از مکافاتِ عمل غافل مشو   گندم از گندم بروید جو ز جو   (مولانا روم)

جیسی کرنی ویسی بھرنی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس دنیا میں جس نے معبودِ حقیقی کے ساتھ اپنے تعلقات نہیں رکھے تو پھر آخرت میں اس کے دیدار کی تمنا کیسے کرسکتا ہے۔ جب یہاں اس سے دور رہا تو وہاں بھی دور رہیگا ؎

عقبیٰ میں کیونکر پاوے تجھ دیکھ کا مزا   دنیا میں جسکو حاصل تیرا لقا نہیں

یہ دنیا عبث ہے۔ قابل ملامت ہے۔ جو اس میں پھنسا وہ اللہ سے کٹ گیا۔ اس قابل ملامت شئے کو جس نے اپنایا وہ بھی قابل ملامت بن گیا۔ دل والوں کی نظروں سے گر گیا ؎

ولا دنیا و ما فیہا ہے ملعون   نہ ذکر حق مگر بول اللہ اللہ

اللہ کو پانے کی پہلی شرط یہ ہے کہ انسان اپنے غرور اور انا کو چھوڑ دے جب تک آدمی "میں" کے چکر میں رہیگا اس دل میں اسکے لئے جگہ کہاں۔ جب یہ اپنے کو بھول گیا تو اس کی یاد آئیگی ؎

اول ہو فنا اپنی پندار کی ہستی سے   مَن بعد بقا حاصل کر یاد کی ہستی سے

حقیقت بینی کی ابتدائی منزل یہ ہے کہ حقیقت جو اپنی انانیت کو کھودے ورنہ "میں" کہکر حقیقت بینی کی کوشش کار عبث ہے ؎

اوّلاً بوجھ بعد حق کو بوجھ   معتبر نئیں ہے بوجھنا بن بوجھ

من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ کی صحیح تفسیر ہے۔

معرفتِ نفس خیال وقیاس کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ کیفیت وشہود کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایسی معرفت نفس ہی خدا شناختگی میں مددگار ہوتی ہے سے

اس بوجھ کو تو بوجھ ستی بوجھ اے ابوجھ کشف وشہود سے نہ خیال وقیاس بوجھ

شریعت ومعرفت - مذہب اسلام کے مطابق معرفت نفس کے چار مدارج ہیں۔ شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت ان میں شریعت کا مقام اول ہے۔ کوئی متلاشی حق کسی حالت میں بھی شریعت سے اپنا رشتہ توڑ نہیں سکتا روحانی میں شریعت بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر یہ بنیاد مضبوط نہیں تو ساری عمارت کمزور رہیگی۔ کچھ نام نہاد صوفی شریعت کو چھوڑ کر معرفت تک چھلانگ مارنے کی صلاح دیتے ہیں۔ ایسا کہنے والے خود بھی دھوکہ کھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکہ دیتے ہیں۔ مذہب اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کبھی بھی کسی کو شریعت کے بندھنوں کو ڈھیلا کرنے کی اجازت نہیں دیتا حضرت کمال اس حقیقت کو جانتے ہیں لوگوں کو اس خطرے سے آگاہ کرتے ہیں سے

مخالف شریعت ہے جس کا سخن نہیں فی الحقیقت وہ حق کا ودید

تصوف میں حقیقت دو چیزوں سے مرکب ہے۔ سر پہ پگڑی۔ جسم پہ انگرکھا۔ پگڑی تصوف کی مظہر ہے اور انگرکھا شریعت کا دستار کا مختلف پردوں میں چھپے رہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ عوام کی نظر سے چھپی رہے۔ عوام میں اتنی سکت نہیں کہ وہ اسکی گہرائی تک پہنچ سکیں۔

حضرت فرماتے ہیں کہ تصوف کے کشف وعرفاں کے بعد بھی شریعت کی سیڑھی کو مت چھوڑو۔ اسی سیڑھی کے سہارے تم روحانی ترقی کروگے۔ شریعت ناؤ ہے اور طریقت سمندر ہے اس سمندر کو پار کرنے کے لئے ناؤ انتہائی ضروری ہے

جاوے اگر تو کعبۂ تحقیق ہے قریب کشتیٔ شرع بحرِ طریقت کو سیر کر

شریعت اور معرفت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ اسلام شریعت کے ذریعے انسان کو ایک ایسی سرحد تک لیجاتا ہے جہاں حیوانیت ختم ہوجاتی ہے اور ایک مافوق حیوانیت درجہ شروع ہوجاتا ہے۔ یہاں انسان خدا کی صفتوں کا پرتو ہوجاتا ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ شریعت کے بنا تصوف جسم بلا روح اور تصوف کے بغیر شریعت روح کے بغیر جسم ہے۔ چنانچہ حضرت کمال فرماتے ہیں سے

زہد جیہ معرفت ہے بے جاں تن معرفت دوں ہے زہد بے بر شاخ

حضرت شاہ کمال کے کلام پر اس مختصری روشنی سے یہ صریح طور پر واضح ہوجاتا ہے کہ آپ کو زبان پر کیسی قدرت حاصل ہے۔ دقیق سے دقیق مضامین کو کس خوش اسلوبی اور سادگی سے ادا کرجاتے ہیں کامیاب شاعر ہونے کی یہ صحیح نشانی ہے اول سے آخر تک آپ ان کے کلام کو پڑھ جائیے۔ مذہبی منطقی اور لسانی حیثیت سے وہ آپکی گرفت میں نہیں آئینگے۔ آپ کے ذہن میں چیزوں کا واضح تصور موجود ہے۔ اسی لئے کہیں بھی مطلب خلط ملط نہیں ہوا ہے۔ ایسے کامیاب شاعر کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ اردو شاعری کے لئے ایک گراں قدر کارنامہ ہوگا۔

قیصر سرمست

مشکلیں اور ہم

دنیا میں ایسا کون ہے جس کو مشکلیں نہ پیش آئی ہوں جسے مصیبتوں سے واسطہ نہ پڑا ہو۔ زندگی میں ہر شخص کو مشکلیں پیش آتی ہیں لیکن ؏ جو سکھا دیتے ہیں مشکل کو بھی آسان ہونا۔

وہی زندگی کی اس دوڑ میں آگے نکل جاتے ہیں۔ تب یہ لوگ سوچتے ہیں یہ زندگی کتنی مختصر ہے اور جو پیچھے رہ جاتے ہیں وہ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اگر مشکلیں ہوں تو زندگی اتنی ہی طویل ہے ۔ گر ہم اچھی طرح یہ جان جائیں کہ ؏

اس عالم سعی و کاوش میں انسان کیلئے آرام نہیں

تو ہم بڑی سے بڑی مشکل کا مردانہ وار مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس جہان فانی میں جیت اس کی ہے جو مشکلوں میں گھر کر بھی ہنستا رہے ؎

ہے خوشی دہر میں ممکن مگر اک شرط کے ساتھ
یعنی رونے کی جگہ بھی تجھے ہنسنا ہوگا

کیونکہ ایسا کرنے سے مشکلیں آسانی کا قالب بدل لیتی ہیں۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان خود کو مشکلوں کا عادی بنالے ۔؏

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے ۔ مشکلوں کے اگر ہم عادی ہو جائیں تو مشکلیں ختم تو نہیں ہو جاتیں مگر ان کا احساس ضرور ختم ہو جاتا ہے۔

احساس ہی ہے جو ہمیں راحت اور مشکل کا فرق بتاتا ہے ۔ مگر احساس کے ختم ہو جانے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم بے حس ہو جائیں۔ ایسا نہیں بلکہ ہمیں کسی حال میں پریشان نہیں ہونا چاہیئے ۔ خصوصاً مستقبل کے غم میں تو کبھی خود کو مٹا نہیں دینا چاہیئے ۔ پورٹیس کے خیال کے مطابق جو آنے والی مشکلوں کی فکر میں پہلے سے ہی پریشان ہو جاتا ہے اسے دو دفعہ مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یہ قدرت کا احسان عظیم ہے کہ اس نے انسان کو فطرتاً ہنسوڑ پیدا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر حال میں خوشی کا جویا رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں تفریح گاہوں اور تھیٹروں کی جگہ ماتم کدے نظر آتے ۔ دنیا کی ساری رونق آنسوؤں میں بہہ جاتی اور ساتھ ہی انسان بھی ختم ہو جاتا۔ یہ انسان کی بڑی حد تک خوش نصیبی ہے کہ وہ زندگی کے حقائق پر نہیں بلکہ سپنوں پہ جی رہا ہے۔

زندگی کا دوسرا نام مسرت ہے مگر ہم مسرت حاصل کرنے میں اس درجہ آ لجھ جاتے ہیں کہ مسرت کی تمنا مستقل غم

بن جاتی ہے

ایک انسان کو زندہ رہنے کے لئے کتنی مشکلوں سے گزرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ ہر ایک کو بخوبی ہے مگر بعض مشکلیں کچھ اس قدر ظاہر ہوتی ہیں کہ انسان گھبرا کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ؎

رنج کیا کیا ہیں ایک جان کیساتھ زندگی موت ہے حیات نہیں

اگر انسان جی کڑا کر کے مشکلوں کا مقابلہ کرے تو زندگی موت نہیں حیات معلوم ہوتی ہے۔ آپ نے کبھی سوچا کہ مسرت اور مشکلیں کیا ہیں۔ راحت کی ضد مشکل یا مصیبت ہے۔ راحت کی تعریف یہ ہے کہ ہم جس چیز کو حاصل کرنا چاہیں وہ بغیر کسی دقت اور دشواری کے حاصل ہو جائے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مشکل کی کیا تعریف ہو گی۔

مشکلوں کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے اور اس کے روپ بھی بے اندازہ ہیں۔ لیکن دنیا میں ایسی کوئی مشکل نہیں جسکا کوئی حل نہ ہو۔ ہر مشکل کا واحد حل ہے مسلسل اور لگاتار جد و جہد۔ بہت سی مشکلیں ہماری پیدا کردہ اور خود ساختہ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ "آدمی آدمی کا شیطان ہے"۔

موجودہ دور میں ہمیں جن مشکلوں سے واسطہ پڑتا ہے وہ انسان ہی کی لائی ہوئی ہیں۔ "ایٹم" ایک ایسی مصیبت ہے جسکا مقابلہ عام آدمی کے بس سے باہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا کے بیشتر انسان مشکلات میں گرفتار ہیں اور جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر ایٹم کو پرامن مقاصد کے لئے استعمال کریں تو یہی مشکل راحت میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ مگر یہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ آدمی کے اندر جو شیطان جاگ رہا ہے اسے ہمیشہ کیلئے سلا دیا جائے۔

ابتدا میں ہر مشکل بہت سوہانِ روح، حوصلہ شکن، ناقابل برداشت اور ناقابل تسخیر معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اولوالعزمی کی سانسیں چھوٹ جائینگی تدبیر کے ہتھیار کند ہو جائینگے تجربہ جواب دے جائیگا محنت اور عقل مشکلوں کے آگے سرِ خم تسلیم خم کر دیں گے۔ لیکن فطرت نے انسان کو بعض ناقابل فہم اور ناقابل بیان صلاحتیں ودیعت کی ہیں۔ انسان ہر مشکل کو آسانی کا قالب بدلنے پر مجبور کر دیتا ہے اور مشکلیں اپنی سخت جانی کے باوجود آسانی کے سانچے میں ڈھلتی جاتی ہیں۔

فطرت نے انسان کو مشکلوں سے مقابلہ کرنے کے لئے تحمل اولوالعزمی فہم و فراست علم و حکمت تدبیر و جستجو، شجاعت اور بہادری جیسے ناقابل شکست ہتیاروں سے لیس کیا ہے۔ اگر اسکے باوجود ہم مشکلوں میں گرفتار ہوں تو یہ فطرت کی نہیں بلکہ ہماری کمزوری ہے۔ ہمیں یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ ہم نے کہاں اور کس موقع پر کونسے ہتیار سے صحیح طور پر کام نہیں لیا ؏

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

قدرت بھی ہمیں ان ہی مشکلوں سے دوچار کرتی ہے جنھیں سہنے اور جن سے مقابلہ کرنے کی ہم میں صلاحیت اور قوت ہوتی ہے۔ یوں تو ہر مشکل بڑی مشکل معلوم ہوتی ہے لیکن جیسا جیسا ہم اسے سمجھتے ہیں اور اس کا مقابلہ کرتے ہیں وہ نرم پڑنے لگتی ہے اور جب مشکل ٹل جاتی ہے تو ہمیں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ تھی ہی نہیں اور خواہ مخواہ ہم اس سے

خوف زدہ تھے اور یہی حقیقت ہے کہ پہلے تو ہر مشکل ڈراتی ہے لیکن جب انسان اپنے عزم و استقلال سے بھرپور نگاہیں اسکی نگاہوں میں ڈال کر دیکھتا ہے تو مشکل کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اپنی مشکل کا ذکر دوسروں سے نہ کریں اس سے مصیبت کم نہیں ہوتی اور بڑھ جاتی ہے ؎

مصیبت کا اک اک سے احوال کہنا مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ

وہ اسطرح کہ انسان مشکل بیان کر دیتا ہے تو اسے یک گونا سکون ملتا ہے دوسرے لفظوں میں اسکے دل کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ یہ ہماری بھول ہے جو کم ہو گیا وہ ہمارے دل کا بوجھ نہیں بلکہ وہ ولولہ اور حوصلہ ہے جو ہمیں مشکلوں سے انتقام لینے پر اکساتا ہے۔ یہی بوجھ کم ہو کر ہمیں کم ہمت بنا دیتا ہے بعض کام تو ایسے ہوتے ہیں جو بظاہر مصیبت اور مشکل معلوم ہوتے ہیں۔ آگے چل کر یہی مشکل نوع انسانی کیلئے راحت اور آسائش کا سامان فراہم کرتی ہے۔ اگر ہر موجد اپنے تخلیقی کام کو مشکل سمجھ لیتا تو زمانہ ترقی کے ان مدارج تک کبھی نہیں پہنچ پاتا اور آج بھی دنیا گھٹنوں کے بل چلتی نظر آتی۔

انسان جبتک اپنے آپ کو مصیبت کی آگ میں نہ جلائے وہ انسان صحیح معنوں میں انسان نہیں بن سکتا مشکل ایک ایسی کسوٹی ہے جس پر انسان کے کھرے اور کھوٹے کی پہچان ہوتی ہے۔ "ڈیوینیٹ" کہتا ہے کہ مشکلات ایسا آئینہ ہیں جس میں ہم اپنی حقیقت اور سچی تصویر دیکھ سکتے ہیں اور اپنے آپ کو صحیح معنوں میں سمجھ سکتے ہیں' سچ تو یہ ہے کہ جو لوگ سیل تند و بن کر کوہ و بیاباں سے گزر جانے کے عادی ہوتے ہیں انھیں قید و بند کی سختیاں بھی "مشکل" نہیں معلوم ہوتیں یہاں بھی ان کے سمند فکر کی وحشت خرامی" نہیں جاتی۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ "ہوا اور موجیں اس ملاح کیساتھ ہوتی ہیں جس کے ساتھ ارادہ ہو' بلند اور مضبوط ارادے کے آگے ہر مشکل سر جھکا دیتی ہے۔ تب یہی طویل اور خشک زندگی مختصر اور حسین معلوم ہوتی ہے۔ ایک سوئیڈش شاعر نے اپنی نظم "APARABLE FROM NATURE" میں چیونٹی سے زندگی کے متعلق کہلواتا ہے کہ زندگی تاریکیوں میں ایک کشمکش کا نام ہے۔ یہ تاریکی کیا ہے؟ مشکلیں ہی تو ہیں۔ یہ تاریکی اس وقت تک رہتی ہے جب تک کہ ہم "بل" میں سے سر نہ نکالیں "بل" سے نکلتے ہی روشنی ہمارا استقبال کرتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے قید و بند کی سختیاں بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔ مولانا آزاد گرفتاری کے بعد فرماتے ہیں۔

اچانک ایک نئی دنیا میں لا کر بند کر دیئے گئے جس کا پورا جغرافیہ ایک سو گز سے زیادہ پھیلاؤ نہیں رکھتا۔ اسی دنیا میں ہر صبح کی روشنی طلوع ہونے لگی اس میں ہر شام تاریکی پھیلنے لگی ؎

گویا نہ وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں ہے اب

اگر کہوں کہ اس ناگہانی صورت حال سے طبیعت کا سکون متاثر نہیں ہوا تو یہ صریح بناوٹ ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ طبیعت متاثر ہوئی اور تیزی اور شدت کے ساتھ ہوئی۔

یہ یقینی امر ہے کہ انسان مشکلوں میں گھر کر پریشان ہو جاتا ہے اور ان مشکلوں سے آہنی اعصاب رکھنے والے

انسان کے بھی پائے ثبات ڈگمگا جاتے ہیں لیکن یہ حالت ایسے لوگوں میں چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں رہتی وہ فوراً اپنے آپ کو مقابلے کے لئے آمادہ کر لیتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مشکلیں خود مشکل میں گرفتار ہوجاتی ہیں یا عالم بیکسی میں دم توڑ دیتی ہیں۔ مولانا آزاد اپنے متعلق فرماتے ہیں۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ علی الصباح اٹھا اور جام و مینا کا دور گردش میں آیا تو محسوس ہونے لگا جیسے طبیعت کا سارا انقباض اچانک دور ہو رہا ہے اور افسردگی کی جگہ انشراح و شگفتگی دل کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔

اگر ہم بھی حوصلہ و ہمت سے مشکلوں کا مقابلہ کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ راحت اور آسانی دل کے دروازے پر دستک نہ دے۔ مولانا یہ جانتے تھے کہ ؎

غم بھی گزشتنی ہے خوشی بھی گزشتنی

اس لئے انھوں نے غم کو اختیار کیا کہ "گزرے تو غم نہ ہو"۔

حکیم مومن خاں مومن کے خیال میں ہمیشہ رنج اٹھاتے رہنے سے اس کی عادت پڑ جاتی ہے اور رنج عیش بن جاتا ہے ورنہ آسائش کے بعد قلق ہوتا تو بڑی مشکل سے صبر کر سکتے۔

صبر بعد آسائش اس قلق پہ مشکل تھا عیش جاوداں نکلا رنج جاوداں اپنا

میر تقی میر پر ایک ایکٹ کا ڈرامہ

انعامی مقابلہ

یوپیا نے اس سال میر تقی میر پر ایک ایکٹ کے ڈرامے کا انعامی مقابلہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہندوستان کے تمام ادیبوں اور فن کاروں سے گذارش ہے کہ وہ میر تقی میر کی حیات، شخصیت اور شاعری کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک ایکٹ کا دلچسپ ڈرامہ جو ۴۵ منٹ کا ہو اس انعامی مقابلہ کے لئے ۳۰ دسمبر ۱۹۶۶ء تک مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ فرمائیں۔ جانچ کے بعد نتیجہ کا اعلان اخبارات کے ذریعہ کر دیا جائے گا۔ حصہ لینے والے اپنا نام اور پتہ صاف لکھیں تاکہ نتیجہ کے بعد انعام پانے والوں کے پاس نقد روپیہ روانہ کر دیا جائے۔

انعامات دو ہوں گے۔ پہلا انعام ۲۵۰ (دو سو پچاس) روپیہ کا اور دوسرا انعام ۱۵۰ (ایک سو پچاس) روپیہ کا پہلا انعام پانے والا ڈرامہ یوپیا کے سالانہ جلسہ ماہ فبروری کے موقع پر اسٹیج کیا جائے گا۔

سید عبدالحی رضا معتمد اعزازی یوپیا

پتہ:۔ جناب حامد اللہ ندوی، یوپیا (UPIA) اسٹوڈنٹس سرکل انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲ - ڈی - ان - روڈ بمبئی ۱

پروفیسر افتخار احمد

جو دے نہ دل ہی دہائی تو کوئی بات نہیں !
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں !
جو مانگنا ہے تجھے صرف ایک در سے مانگ
یہ دربدر کی گدائی تو کوئی بات نہیں !
اگر ہے خواہشِ منزل جنوں کے ناخن سے
خرد کی عقدہ کشائی تو کوئی بات نہیں
مزہ تو جب ہے تجھے تشنگی بخارِ الم
جنون آبلہ پائی تو کوئی بات نہیں
خود اپنے دل کو بنالے تو آستانِ وفا
حرم کی ناصیہ سائی تو کوئی بات نہیں
ہے گردِ یاس سے ناصاف دل تو کیا غم ہے
اگر نظر ہے رجائی تو کوئی بات نہیں !
نکل گئی تھی مرے منہ سے دل کی بات جو کل
ہوئی وہ آج پرائی تو کوئی بات نہیں
مٹے سخن سے نہ پگھلے جو دل کا آہن
یہ فخر شعلہ نوائی تو کوئی بات نہیں

باقر منظور

وہ دن بھی آئیں رہ و رسمِ دوستاں بدلے
خدا کرے کہ "نہیں" سے کسی کی "ہاں" بدلے
چمن وہی ہے چمن کے مزاجداں بدلے
بہار بدلی نہ ہنگامۂ خزاں بدلے
کبھی تو منزلِ مقصود کا پتہ مل جائے
کبھی تو ذوقِ دلِ میرِ کارواں بدلے
بدل سکا نہ محبت کی داستاں کا مزاج
ہر ایک دور میں عنوانِ داستاں بدلے
کسی کا حسنِ تبسم ہے جلوہ زارِ بہار !
اسی ادا سے کوئی صورتِ خزاں بدلے
عجیب کھیل زباں بندیٔ محبت ہے !
نگاہِ شوق سے لیتا ہے بے زباں بدلے
تمہاری چشمِ عنایت پہ شک نہ کیوں گذرے
یقین نہ آئے یقیں سے اگر گماں بدلے
سکوتِ عشق ثبوتِ خرد کی منزل ہے
خدا کرے نہ کبھی کوئی ہم زباں بدلے
بہ اقتضائے زمانہ ہے دیکھئے باقر
مذاقِ شعر و سخن کون نکتہ داں بدلے

تاج کریم نگری

نظر ملاتے نہیں، مسکرائے جاتے ہیں
بتاؤ! یوں بھی کہیں دل ملائے جاتے ہیں
رسوم بزم محبت ہی کچھ نرالے ہیں
بجائے شمع یہاں دل جلائے جاتے ہیں
ہجوم جلوۂ رنگیں کا مدعا معلوم
ہماری تابِ نظر آزمائے جاتے ہیں
حجاب ہو، مگر ایسا بھی کیا حجاب آخر
جھلک دکھاتے نہیں منہ چھپائے جاتے ہیں
ہجوم یاس، وفورِ الم، باایں عالم
ہمارا ظرف کہ ہم مسکرائے جاتے ہیں
حدودِ کوچۂ جاناں میں آ گئے شاید
قدم قدم پہ، قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
یہ کس کا ذکر ہے اے تاج لب پہ شام و سحر
یہ کس کی یاد میں آنسو بہائے جاتے ہیں

اقبال مہناس

چھا گئی ہے عرصۂ ہستی پہ گہری تیرگی
ڈھونڈ کر لاؤ کہیں سے دوستو اب روشنی
شام ہوتے ہی یہ کس منزل کی جانب چل پڑے
کاش خاکِ راہ مجھ کو روک کر یہ پوچھتی
اس طرح دھڑکا ہے دل اک اجنبی کے سامنے
جس طرح وہ شکل تھی میری کہیں دیکھی ہوئی
تیرے آنے سے ہوا ہے لالہ و گل کا ہجوم
رہگذارِ زیست پہلے کس قدر ویران تھی
کل جہاں ہر موڑ پہ تھے قہقہوں کے جلترنگ
آج اُس بستی میں آہیں بھر رہی تھی خامشی
راستے میں بیٹھ جانے کا صلہ اقبال کیا
پاؤں اُٹھے ہیں تو منزل بھی نظر آنے لگی

صلاح الدین نیّر

کب آپ کے ہونٹوں سے ہنسی مانگ رہا ہوں
میں اپنے ہی پلکوں کی نمی مانگ رہا ہوں

مانوس الم ہوں مجھے مجبور نہ سمجھو،
میں کس سے یہاں کوئی خوشی مانگ رہا ہوں

جو زہر خموشی ہے مری زیست کا قاتل
اُس زہر سے میں زود اثری مانگ رہا ہوں

بات اپنی ہی محفل کی ہے پی جاوں گا آنسو
میں کس سے یہاں تشنہ لبی مانگ رہا ہوں

تپتے ہوئے صحراؤں میں یوں چھوڑ نہ جاؤ
زلفوں کی کہاں چھاؤں گھنی مانگ رہا ہوں

منزل پہ ٹھہر جاؤں کہ رستے ہی میں ٹھہروں
کب آپ کی میں ہمسفری مانگ رہا ہوں

پھر کر زودے آئی مجھے تیری گلی میں
جو کچھ یہاں کھویا ہے وہی مانگ رہا ہوں

جو بھی مجھے ملنا ہے وہ مل جائے گا نیّر
کب آپ کے حصہ کی خوشی مانگ رہا ہوں

ساجد رضوی

دلِ ناکامِ تمنا کی دوا کچھ بھی نہیں
زندگی دردِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

اب تسلی کا بھی الٹا ہی اثر ہوتا ہے
میری قسمت میں ہے غم اُن سے گلا کچھ بھی نہیں

خونِ دل خونِ جگر خونِ تمنا کے سوا
خلشِ دردِ محبت کا صلا کچھ بھی نہیں

آج یہ کہہ کے دلِ زار کو سمجھائیے
ہو اگر قدرِ وفا لطفِ وفا کچھ بھی نہیں

لطف جب ہے کہ اثر خود ہو دعا کا محتاج
جو ہو محتاج اثر کی وہ دعا کچھ بھی نہیں

یہ ہے اک رازِ محبت کوئی سمجھے کیونکر
میں خطاوار ہوں اور میری خطا کچھ بھی نہیں

یہ حقیقت کوئی ساجد مرے دل سے پوچھے
کون کہتا ہے کہ سجدہ میں مزا کچھ بھی نہیں

رونق دکنی سیمابی

جمشید پور

جہدِ ناکام تنگ و تاز تک آپہونچی ہے
زندگی نقطۂ آغاز تک آپہونچی ہے
دیکھکر وقت کی دھڑکن کو ہم آہنگِ حیات
گرمیٔ سوزِ دروں ساز تک آپہونچی ہے
عقل حیراں ہے کہ اب خوئے دلِ امن پسند
جذبۂ تفرقہ پرداز تک آپہونچی ہے
ناز تھا ہم کو کبھی اپنی اڑانوں پہ بہت
بات اب جرأتِ پرواز تک آپہونچی ہے
جس سے روشن تھی بصیرت وہ کرم فرمائی
اب نگاہِ غلط انداز تک آپہونچی ہے
وہ جو اک حسرتِ ناکام ہے گردش کی شکار
جنبشِ چشمِ فسوں ساز تک آپہونچی ہے
کیا کرے اب کوئی تمیزِ حق و باطل میں!
نغمگی شورشِ آواز تک آپہونچی ہے
اختیاراتِ محبت کا سہارا لے کر
بے نیازی نگہِ ناز تک آپہونچی ہے
شوخیٔ حسنِ تکلم کی لطافت رونق
مستیٔ بادۂ شیراز تک آپہونچی ہے

اختر نظمی

اب تک جسے نغموں کا جہاں ڈھونڈ رہا ہے
شاید وہ مرے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے
افسانۂ غم کہیے کہ روداد تمنّا!
ہے بات وہی بات کا انداز نیا ہے
اب کیجیے ایجاد کوئی طرزِ ستم اور
ویسے تو یہ اندازِ تغافل بھی بھلا ہے
تنہا نہیں میں موردِ الزام تمنا!
دنیا نے تمہیں بھی یہی الزام دیا ہے
یہ وہ تو نہیں خضر جسے کہتی ہے دنیا
اک شخص مرے نقشِ قدم ڈھونڈ رہا ہے
جس موڑ پہ منزل کی حدیں ختم ہوئی ہیں
اُس موڑ سے اک قافلہ آگے بھی گیا ہے
اب رندِ غم تشنہ لبی سہہ نہ سکیں گے
اِس بار تو ساقی کا کہا مان لیا ہے
میخانے سے جب رات گئے لوٹا ہوں نظمی
دروازے تک اک سایہ مرے ساتھ رہا ہے

نقد و نظر

پرانے موسموں کی آواز

"پرانے موسموں کی آواز" ایک ایسے شاعر کا مجموعۂ کلام ہے جس نے گذشتہ چند برسوں میں شاعری کے میدان میں اپنے لیے ایک الگ جگہ بنائی ہے۔ کمار پاشی کے اس پہلے شعری مجموعے میں زیادہ تعداد نظموں کی ہے۔ چند غزلیں بھی اس میں شامل کر دی گئی ہیں لیکن وہ بھی موضوع، فضا اور لہجے کے اعتبار سے ان کی نظموں سے قطعی مختلف نہیں۔

اس مجموعے میں شامل نظموں کی ایک بڑی خوبی (میں اُسے خوبی ہی کہوں گا) یہ ہے کہ ان کا آپس میں گہرا ربط ہے۔ احساس کی ایک رو ایسی ہے جو ان تمام نظموں کو ایک ہی دھاگے میں پروئے ہوئے ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کا تنوع نہیں ملتا بلکہ ان کے دو چار ہی محبوب موضوع ہیں جن کے گرد ان کی پوری نظمیں اور شعر گھومتے ہیں لیکن انھوں نے اپنے موضوعات کو اس قدر پھیلا دیا ہے کہ ان کے بے شمار گوشے نمایاں ہو گئے ہیں، ان نظموں کی مدد سے ایک ایسا کردار تخلیق ہوا ہے۔ جو اردو شاعری کے لئے بالکل نیا ہے۔

اس کردار کی تخلیق میں کمار پاشی نے ماضی کے اُس پرانے انسان، اس کی زمین کی خوشبو اور اس کے آسمانوں کے سحر سے بڑا کام لیا ہے، جس کے سر پر دیوتاؤں کا سایہ تھا۔

نئے دور کی تیز رفتاری، مشینی زندگی کے کرب اور ذہنی و جنسی گھٹن کو شعر کے قالب میں ڈھال کر خود کو جدید کہلانا ان دنوں ایک فیشن سا بن گیا ہے۔ ہر نیا شاعر اسی غلاظت میں گرفتار ہو کر ان دنوں اچھا بھلا بہروپیہ دکھائی دینے لگا ہے۔

یہ بات غیر صحیح نہیں کہ اس عہد میں انسان بالکل بونا ہو گیا ہے۔ مشینیں اس پر پوری طرح حاوی ہو چکی ہیں۔ اب وہ یہی سوچ رہا ہے کہ اس بڑی کائنات میں کوئی خدا نہیں ہے۔ جس کے سائے تلے وہ تحفظ محسوس کر سکے۔ اس دور کا انسان اب مسلسل خودکشی کے عالم میں جی رہا ہے اب اس کی کوئی منزل نہیں۔ ایک دھندلا، کالا رستہ ہے، جس پر چلنے کے لئے وہ مجبور کر دیا گیا ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر زندگی کا یہ طوق زبردستی ہم کو پہنا بھی دیا گیا ہے تو کیا ہم جیتے جی موت کی کالک کو اپنے جسم پر پوت لیں اور ایک کربناک تماشے میں کھو جائیں۔

کمار پاشی کی نظمیں پڑھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ان کے شعری کردار نے اس مشینی دور کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔ اس کردار کو بھی خدا کی ذات کا علم ہے، دیوتاؤں کے المیے سے وہ بھی واقف ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس پوری کائنات میں انسان کی

حیثیت کیا ہے، خیال کے طور پر:

گلی کے کونے میں اک گھر
اور گھر کے کمرے کے اندر:
میں بیٹھا سوچ رہا یہ بات
یہ دھرتی، یہ جنگل، یہ کھیت
میں تنہا تنہا سا انساں
سمندر چاروں طرف گمبھیر
کہ جس پر اُڑتی جائے سمیر ——— (گھٹن)

لیکن جب وہ اپنے باطن پر نظر ڈالتا ہے تو اس کے سامنے دیومالاؤں کی دنیا روشن ہو جاتی ہے اور ایک ایسے انسان کا تصور ابھرتا ہے جو زمینوں اور آسمانوں کا فاصلہ چند قدموں میں طے کر سکتا ہے اور پوری کائنات کو اپنے اندر سمیٹ سکتا ہے۔ عمارہ پاشی نے پرانے دیومالائی کرداروں کی مدد سے اپنے شعری کردار کو تخلیق کیا ہے جو جسم کا لباس اتار کر تمام سمتوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

خلا کے سلکوں سے ہم آغوش ہو کر
میں اب بے کراں ساحلوں کی اداسی میں گم ہو رہا ہوں
اور اپنے بدن میں۔
خلا کا بے انت پھیلے بدن میں
جہاں تہہ لہروں کی ٹھنڈک کو محسوس کرنے لگا ہوں ——— (نروان)

یا

دشاؤں کے سائے مرے جسم سے چھو رہے تھے۔
خموشی مری روح میں ہانپتی تھی۔
ہلاک شئے
جہاں بازوؤں کے پُراسرار گھیرے میں
سمٹی ہوئی تھی
——— (دو دائروں کا فرق)

عمارہ پاشی کا یہ شعری کردار جسم کے رشتے کو نہیں مانتا۔ یہ غالباً اس مشینی دور کے المیے کا ردِ عمل ہے کہ وہ جسم کی محدودیت سے نکل کر کھلے آسمانوں تلے آ کھڑا ہوا ہے اور سب کا کائنات کے کبھی نہ ختم ہونے والے فاصلے اسکے بازوؤں کے پُراسرار

گھیرے میں سمٹ آئے ہیں اور وہ ہر شے پر حاوی ہو کر "سکون کے بے کراں دھندلکوں میں کھو گیا ہے۔"

اس ازلی اور ابدی کردار کی تخلیق سے غیر شعوری طور پر جو دیومالائی فضا پیدا ہو گئی ہے وہ اس قدر پُر فسوں ہے کہ قاری اسکا اثر لئے بغیر نہیں رہ سکتا بلکہ اس میں پوری طرح کھو جاتا ہے۔ کمار پاشی غالباً خود بھی اپنے اس کردار کی انفرادیت سے اچھی طرح آشنا ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں (مطبوعہ "شاعر" ماہ مارچ ۶۶ء) انہوں نے اپنے فن سے متعلق چند اہم باتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے:-

> بیشتر نظموں میں آپ کو ایک ایسے آدمی کا کردار نظر آئے گا جو زندگی سے اپنا ابدی رشتہ قائم کئے ہوئے ہے اور نیچر کو اپنے وجود اور اپنے EXISTANCE کے جواز کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یہ کردار کہیں "میں" کے طور پر سامنے آتا ہے اور کہیں دیوتاؤں کے المیے کی صورت میں محض اسکی کتھائیں اور عظمت کے نشانات نظر آتے ہیں۔ . . .

خود شاعر کی ذات اور اس کے کردار میں وہی فاصلہ ہے جو ایلیٹ کے IMPERSONALITY کے تصور میں۔

دراصل یہ کردار کمار پاشی کا ذاتی کردار نہیں بلکہ بقول ان کے یہ شعری کردار ان کے احساس کا وژن ہے۔ اگرچہ شاعری کو ذاتی احساسات کے بے تکلفانہ اظہار کا نام دیا جاتا ہے اور اس عمل میں اگر کوئی کردار سامنے آتا ہے تو وہ اس شاعر کا اپنا ہی ذاتی کردار ہوتا ہے۔ لیکن اس مجموعے کو پڑھنے کے بعد کمار پاشی کا ذاتی کردار کہیں نمایاں نہیں ہوتا بلکہ ایک بالکل مختلف کردار سے سامنا ہوتا ہے مگر شاعر نے چونکہ اس کردار سے احساس کا رشتہ قائم کر لیا ہے اور خود کو اس میں اس قدر مدغم کر لیا ہے کہ ان دو کے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہیں رہ جاتا۔ اس لیے جہاں کہیں بھی یہ کردار اپنا اظہار کرتا ہے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ آواز شاعر کے اپنے ہی دل کی گہرائیوں سے آ رہی ہے۔ مثال کے طور پر:-

میں پرانا سا کوئی انسان ہوں محسوس یہ ہوتا ہے مجھ کو
میں نے ہر ساون میں دھویا ہے بدن کو
اور یہ دھرتی مجھے روزِ ازل سے جانتی ہے۔　　　　　— (جنم دن)

یا

میں سب سورجوں سب زمینوں
کے اسرار سے باخبر ہوں
مرے ہر جنم کی کہانی
خلاؤں کے سینے میں محفوظ ہے

ان ہواؤں کے ہونٹوں پہ اب بھی
میرے گیت کا انترہ ناچتا ہے۔ —نروان

یا

مگر اس سمندر سے پوچھو
جسے ایک ہی گھونٹ میں پی گیا تھا
اگر دیکھنا چاہتی ہو
تو رخسار پہ چاند کے
میرے بوسے کا مدھم نشاں
آج بھی میری جرأت پہ ہیبت زدہ ہے

—(آکاش میں شبد)

اگرچہ اس کردار کے اعمال دیو مالائی کرداروں کے مماثل ہیں اور اکثر اس کا اظہار بھی کچھ اس قسم کا ہو جاتا ہے کہ اس پر کسی دیومالائی کردار کا دھوکہ ہوتے لگتا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس میں کمار پاشی کی شعری صلاحیتوں کو زیادہ دخل ہے۔ جنہوں نے اس کردار کے گرد ایک ایسا پر اسرار ہالا تعمیر کیا ہے اور ایک ایسی اساطیری فضا تخلیق کی ہے جس کا سحر قاری کو صدیوں پہلے کی دنیا میں کھینچ لے جاتا ہے۔

اس پرفسوں اور پراسرار فضا کی بہترین مثال اس مجموعے کی طویل نظم "گندے دنوں کا قصہ" ہے۔ اس نظم میں یہ کردار اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ ہمارے سامنے آیا ہے۔ میرے نزدیک یہ نظم شاعر کے اظہار کا نقطۂ عروج ہے کیونکہ یہ نظم شاعر کے تمام موضوعات کو ان کے مختلف گوشوں کے ساتھ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

"پرانے موسموں کی آواز" کی اشاعت سے اردو شاعری کو ایک ایسا نیا دیومالائی کردار ملا ہے، جو اثر کرنے والا اور زندہ رہنے والا کردار ہے۔

پریم کمار پاشی
ایم اے

خطوط عبدالحق - مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی، لکچرار جامعۂ عثمانیہ چار قندیل آغاپورہ حیدرآباد، صفحات ۲۶۰ + 19
مجلد مع گرد پوش - قیمت پانچ روپے

مولوی عبدالحق صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو کہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا اٹھنا، بیٹھنا، سونا جاگنا اردو کیلئے

وقف تھا۔ اردو ان کا اوڑھنا بچھونا تھی اور انھوں نے پوری زندگی اسی کی خدمت میں کھپا دی۔ اردو پر ان کے احسان ایک نہیں گئی ہیں اور جب تک دنیا میں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے، مولوی عبدالحق کا نام احترام سے لیا جائے گا۔ بزرگوں کی یاد تازہ کرنا، ان کے کام کو سامنے رکھنا، ان کے مقصد کو جاننا اور ان کی خوبیوں کو پرکھنا بعد میں آنے والوں کا اہم ترین فرض ہے۔ اڈمنڈ برک نے کہا ہے کہ وہ لوگ جو اگلوں کو بھلا دیتے ہیں، پچھلے بھی انھیں جاننے کی کوشش نہیں کریں گے خوشی کی بات ہے کہ مولوی عبدالحق سے متعلق ان چند دنوں میں ایک کتاب اور ایک رسالے کا خاص نمبر سامنے آئے ہیں۔ انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) نے رسالہ قومی زبان کا عبدالحق نمبر شائع کیا ہے اور محمد اکبرالدین صدیقی صاحب نے عبدالحق صاحب کے مکتوبات کو خطوطِ عبدالحق کے نام سے۔ حیدرآباد سے شائع کیا ہے۔ اس سے پہلے مولوی صاحب کے مکتوبات کے تین مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ چوتھا مجموعہ ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایسے خط ہیں جو مولوی صاحب نے اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو لکھے تھے۔ ظفرالرحمن کے نام خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کو جوہر قابل کو پہچاننے کی کیسی زبردست صلاحیت تھی۔ مولوی صاحب نے انھیں تصنیفی اور تالیفی کاموں کے لیے ابھارا اور ان سے "فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں" اور "ہماری کہاوتیں" جیسی اہم کتابیں لکھوائیں جن کے لئے اردو دنیا ہمیشہ ان کی ممنون رہے گی۔ ظفرالرحمن کے علاوہ دوسرے خطوط سید ساجد علی، منشی محمد علی، غلام ربانی، ابو محمد عمر بن صلاح اور عبدالرحیم خاں فیضی کے نام ہیں۔ مرتب نے پنڈت ونشی دھر کے نام بابائے اردو کے انگریزی خطوں کو بھی کتاب کے آخر میں شامل کر دیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ کتاب میں شامل کیے گئے خطوں کی کوئی فہرست شروع میں درج نہیں اور نہ ہی کتاب کے آخر میں ناموں کا اشاریہ پیش کیا ہے۔ اس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

مولوی صاحب کو زبان و بیان اور ادائے مطلب پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ ان کے اسلوب کی سادگی، صفائی اور روانی ان خطوں میں بھی موجود ہے۔ جگہ جگہ مولوی صاحب کی پرخلوص شخصیت الفاظ کے پردوں سے جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اردو سے عشق، محنت کی عادت اور مقصد کی لگن۔ مولوی صاحب کی شخصیت کے بنیادی جوہر تھے اور ان خطوں میں یہ اور بھی واضح طور پر سامنے آتے ہیں، اور بعض ایسے واقعات کی تفصیل بھی مل جاتی ہے جو مولوی صاحب کے سوانح نگار کے لیے نہایت اہم ہیں۔

محمد اکبرالدین صدیقی صاحب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ان خطوں کو جگہ جگہ سے تلاش کر کے کتابی صورت میں مرتب کر دیا ہے۔ یہ کام آسان نہیں۔ اس راہ کی مشکلوں کو کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جنھیں ایسے کاموں کا تجربہ ہے۔ کتاب کے شروع میں مرتب کا جامع مقدمہ ہے جس میں ان تمام حضرات کی زندگی اور حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کے نام کے خط اس مجموعے میں شامل ہیں اور ساتھ ساتھ ان خطوں کا ادبی اور سوانحی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ کتاب اہتمام سے شائع ہوئی ہے اور مصنف سے مل سکتی ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (بشکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

اُردو کالج میگزین (اکبرالہ آبادی نمبر)

بزم ادب اور ٹیل اُردو کالج نے ماہ فروری ۱۹۶۶ء میں یوم اکبرالہ آبادی منایا تھا۔ زیر تبصرہ شمارہ اکبرالہ آبادی نمبر ہی ہے جو ایک اچھی کوشش ہے۔

اکبرالہ آبادی کی حیات اور کارناموں کے بارے میں مواد اکٹھا کرنے میں محنت سے کام لیا گیا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر سید احتشام حسین، ممتاز حسین، خواجہ حسن نظامی کے مطبوعہ مضامین ان کی ادبی اور علمی اہمیت کے پیش نظر اس شمارے میں پھر شائع کئے گئے ہیں۔ قابل مدیر نے "اس بات کا اعتراف" اداریہ میں کیا ضرور ہے لیکن ہر مضمون کے ساتھ اگر یہ بھی لکھ دیا جاتا کہ فلاں رسالے یا کتاب سے شکریہ کے ساتھ اخذ کیا گیا ہے تو ادبی اور صحافتی ایمانداری برقرار رہتی۔

گروچرن داس صاحب سکینہ، وزیر حسن صاحب دہلوی، ڈاکٹر رشید موسوی صاحبہ کے مضامین بھی لائق توجہ ہیں۔ اکبرالہ آبادی۔ ایک خط یقیناً اس شمارے کے لئے لکھا گیا۔ سب سے اہم اور خاص مضمون ہے مجتبیٰ حسین نے اپنے اس مضمون میں اپنی ساری ادبی صلاحیتوں کو بروئے کار [illegible] کے کلام کا جائزہ وہی شخص نہایت چابکدستی اور کمال ہنرمندی کے ساتھ لے سکتا [illegible]

[illegible] اپنے مضمون [illegible] تقابلی مطالعہ وغیرہ بھی اچھی طرح پیش کیا ہے۔

[illegible] کتابیات اور توقیت نامہ "بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔

[illegible] عالم علی خاں اور زاہدہ ابوالحسن کے مضامین قابل مطالعہ ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی مضامین ہیں اور شعرا نے اکبر کو خراج ادا کیا ہے۔

اردو کالج کا یہ نمبر دیگر کالجوں سے نکلنے والے عام نمبروں سے کہیں بہتر ہے۔

سید موسیٰ کاظم ایم۔اے ریسرچ اسکالر

مذہبی تحریکات ہند۔ تبلیغی مرکز ریلوے روڈ لاہور۔ کتابت: ناقص، طباعت: اوسط۔

یہ کتاب ایک گمنام مؤلف نے لکھی ہے جس نے اپنے نام کی جگہ صرف دستخط کی ہے۔ عنوان سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں ہندوستان کی تمام مذہبی تحریکوں کا جائزہ لیا گیا ہوگا لیکن مختصر طور پر ان تحریکوں کا ذکر کر کے تفصیل سے قادیانی مذہب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قادیانی مذہب کے ماخذ کا ذکر کرتے ہوئے بعض مہدوی اصولوں کو بھی پیش کیا ہے۔ یہ اصول ایک مخالف مہدوی کی کتاب سے اخذ کئے ہیں۔ اس قسم کی کتابوں سے عوام میں مزید اختلافات پیدا ہوتے ہیں [illegible] جبکہ ہمیں زیادہ یک جہتی اتحاد و یگانگت سے کام کرنا ہے ہماری ادبی خدمت کو بھی اسی رنگ میں رنگا جانا چاہئے۔

سید موسیٰ کاظم ایم اے ریسرچ اسکالر